DUE DATE

Cl. No. ______ *Ac. No.* ______

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day, Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.

ادبی دنیا

ایڈیٹر صلاح الدین احمد

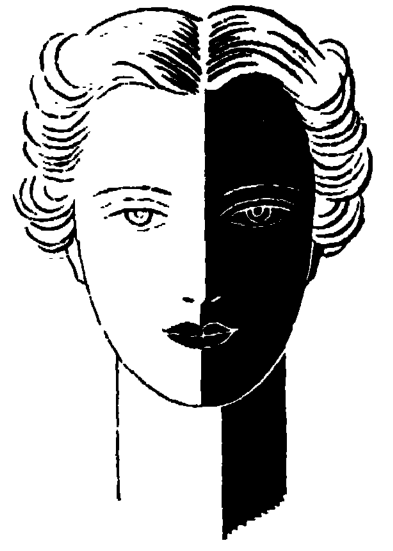
سالنامہ ۱۹۴۱ عیسوی

جائنٹ ایڈیٹر میراجی



سیاہ جلد سفید ہو جاتی ہے

DARK SKIN TURNS WHITE



خوبصورتی کا سب سے ضروری عنصر سفید رنگ ہے اور آپ اسے بآسانی پرلیکس کی مدد سے حاصل کرسکتے ہیں۔
سانولی رنگت جلد میں رنگ کی زیادتی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے پرلیکس وہ جدید سائنٹیفک طریقہ ہے جو اس رنگ کو زائل کرکے آپ کی جلد کو موتی جیسی آب دے دیتا ہے۔ پرلیکس کا استعمال بے ضرر اور دل خوش کن ہے۔
پرلیکس آپ کی خدمت میں گوری رنگت اور اس کے باعث اس سے پیدا ہونے والی وہ کامیابی پیش کرتا ہے جو گوری رنگت والوں کو سوسائٹی میں حاصل ہے۔
پرلیکس کی قیمت پانچ روپے فی بوتل ہے جو ہر جگہ سے مل سکتی ہے۔



PEARLEX

WHITENS THE SKIN

سفید بال ہمیشہ کے لئے رخصت



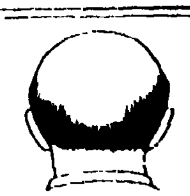
GRAY HAIR GONE FOREVER



سفید بال بڑھاپے کا پیش خیمہ ہیں۔ سفید بالوں کی ایک باریک سی دھاری مرد کی جوانی کو بڑھاپے میں تبدیل کرنے کا موجب ہو سکتی ہے۔ جس سے وہ اپنی طبعی عمر سے برسوں بوڑھا نظر آتا ہے۔ آپ خضاب استعمال کرسکتے ہیں لیکن یہ ضرر رساں ثابت ہوگا۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ عارضی نتائج ظاہر کرے گا سفید بالوں کو ہمیشہ کے لئے سیاہ کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کو وہ اجزا بہم پہنچائے جائیں جو قدرت نے ان کے لئے بنائے ہیں اور یہ اجزا سائنٹفک طور پر ھینول میں جمع کر دیئے گئے ہیں اور سفید بالوں کو مستقل طور پر سیاہ کرنے کی واحد دوا ھینول ہی ہے ھینول لوشن ہے نہ خضاب بلکہ بالوں کے لئے ایک خاص غذا ہے جو ان پر بیرونی طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

ھینول کی شیشی کی قیمت پانچ روپے ہر جگہ سے ملتی ہے

زیادہ سفید بالوں کے لئے



BALDNESS

VITEX revitalizes weakened hair roots, stops hair falling, grows new hair and overcomes baldness.

Rs 5 as per bottle

وائیٹکس
نئے بال پیدا کرتی ہے

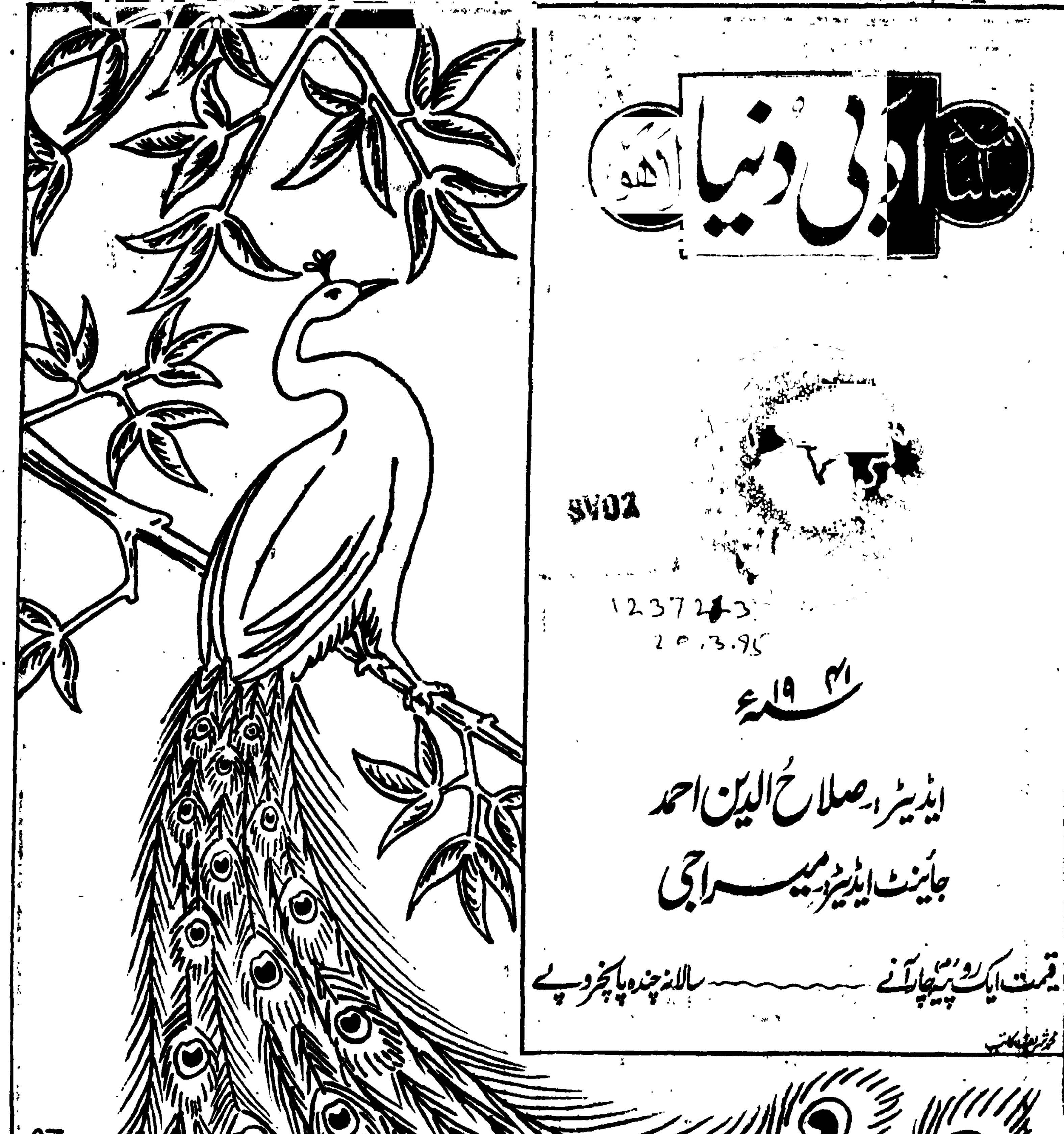
کنسنٹریٹڈ ھینول پومیڈ استعمال کیجئے قیمت فی تولہ چھ روپے

HENNOL

ENDS GRAY HAIR PERMANENTLY.

پرلین پوسٹ بکس نمبر ۴۹۳ بمبئی

PEARLINE. P. O. Box 493. BOMBAY.



سالنامہ ادبی دنیا

سنہ ۱۹۴۱ء

ایڈیٹر ۔ صلاح الدین احمد

جائنٹ ایڈیٹر ۔ میراجی

قیمت ایک روپیہ چار آنے ~~~~ سالانہ چندہ پانچ روپے

سالنامہ ادبی دنیا ۱۹۴۱ء

ادبی دنیا لاہور

سالنامہ ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا


"حفاظت کی جگہہ!"
LAHORE
SAFE DEPOSIT
آج ہی ایک لاکر خریدیئے
کرایہ دس روپے سالانہ
ہم نہایت مسرت سے آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ ہمارے بے نظیر
والٹ کا ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ دس روپے سالانہ کی حقیر رقم کے
خرچ سے آپ اپنی قیمتی اشیاء کیسی محفوظ رکھ سکتے ہیں۔
یہ والٹ خواتین کی خاص دلچسپی کی چیز ہے
مفصل حالات کے لئے ۲۱۳۲ کو ٹیلیفون کریں
لاہور سیف ڈیپازٹ کمپنی لمیٹڈ۔ بالمقابل سنٹرل ٹیلیگراف آفس میکلوڈ روڈ لاہور
LAHORE SAFE DEPOSIT Co. LTD
MCLEOD ROAD LAHORE
OPPOSITE CENTRAL TELEGRAPH OFFICE - PHONE 2132

سالنامے کی تصویریں

"ادبی دنیا" میں عموماً دو طرح کی تصویریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ایک موضوعی اور دوسرے فنی۔ موضوعی تصاویر کے متعلق تو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، فنی تصاویر میں پہلے عکسی آرٹ کے علاوہ مختلف ماہرین کے موقلم کے نمونے بھی شائع ہوا کرتے تھے لیکن وہ اکثر مغرب کے مرہونِ منت ہوتے تھے۔ ہندوستانی مصوروں میں سے صرف چغتائی اور "ادبی دنیا" ہی کا ساتھ ہو کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سلسلے میں ترقی کا قدم بڑھایا جانے لگا۔ اور اگرچہ اب بھی یہ پہلو اپنی ابتدائی منازل ہی میں ہے۔ پھر بھی آپ موجودہ سالنامے میں چار تصاویر ایسی دیکھیں گے جو ہندوستانی ماہرین کی بہترین کوششوں کا نمونہ ہیں فرداً فرداً نظر ڈالنے کے لئے سب سے پہلے رنگین صفحات کو لیجئے۔

پہلی رنگین تصویر (کنول نین کے کرشن کنھیا) رخان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی کی ماہرانہ قلم کاری کا اظہار کر رہی ہے بعض لوگ چغتائی کو غلطی سے صرف مغلیہ تہذیب و تمدن کا ترجمان سمجھتے ہیں لیکن انھوں نے غالباً اس کے خالص ہندوستانی مطالعے نہیں دیکھے۔ کرشن کے موضوع پر اس سے پیشتر چغتائی کی دو تصویریں دیکھنے کا مجھے اتفاق ہو چکا ہے ان میں سے ایک کا عنوان کرشن اور ارجن ہے۔ یہ تصویر تو دراصل گیتا کے موضوع پر تھی اور دوسری رادھے شیام۔ چغتائی کی باریک بینی کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا تصاویر میں اس نے دونوں کرشن یکسانی کے باوجود مختلف بنائے تھے لیکن یہ فرق مادی لحاظ سے اس قدر نمایاں نہ تھا جس قدر روحانی لحاظ سے۔ کورکشیتر اور برندابن کا کرشن اگرچہ ایک ہے لیکن روایات کے لحاظ سے ان میں جو مختلف رنگ نمایاں ہیں چغتائی کی ماہر ذہانت اور فن کارانہ نظافت نے اسے ان تصاویر میں نہایت خوبی سے ظاہر کیا تھا۔ موجودہ تصاویر چغتائی کے قلم سے رادھے شیام کا تازہ ترین مطالعہ ہے۔ اس کا موضوع بھی برندابن ہی کا کرشن ہے جس کی آنکھیں کنول کی ایسی تھیں۔ بنسری کی جان تو ہر کسی کے دل کو موہ لیتی تھی لیکن ان کنول نینوں کے جادو کو کچھ رادھا ہی خوب جانتی تھی۔ موجودہ تصویر میں کرشن کی آنکھ کے جادو کو اس کے ہاتھ میں کنول کا پھول رکھ کر جس کمال سے نمایاں کیا گیا ہے۔ وہ قابلِ غور ہے اور رادھا بچاری بے بس ہے بہوت ہے کنول نین کی سندرتا کے ساگر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تزئین و آرائش کے لحاظ سے بھی چغتائی کی ذہانت اس تصویر میں غور کا مقام ہے پھر اس کی دیواریں سیدھی سادی ہیں۔ کیونکہ کرشن کا افسانہ دیہاتی افسانہ ہے۔ رادھا کے لباس میں دلکشی ہے کیونکہ وہ بھی سجائی اچھوتی روحِ انسانی ہے لیکن کرشن کی آرائشِ جسمانی بھی اس سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ زیادہ ہی ہے کیونکہ اس آرائش سے فن کار کو روحِ ابدی کی دلکشی کا اظہار مقصود ہے۔

اسی سالنامے میں آپ بنگالی کرشن بھگت چنڈی داس کے گیت بھی دیکھیں گے نیز جے دیو کی گیتا گوبند کا ایک سین بھی آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ جن حضرات کے تخیل میں شیام کی روایات کا جزو شامل نہیں۔ انھوں نے جب گیتوں کو پڑھ کر اس تصویر کو دیکھا تو وہ اس پر سے جلد اپنی نظریں نہ ہٹا سکیں گے۔

ہاں چغتائی کے متعلق ایک بات اور کہنی ہے۔ وہ ایک غیر معمولی فن کار ہے۔ اور اس لئے اس کی ذہانت محدود نہیں بلکہ ہمہ گیر ہے —— اور اس لحاظ سے وہ آج مشرق کا سب سے بڑا مصور ہے۔ کیونکہ مشرق کے ہر بڑے تمدن کا عکس اس کی تخلیقات میں موجود ہے۔

دوسری تصویر ایشور سنگھ کی تخلیق ہے ایشور سنگھ نے گزشتہ چند ہی سالوں میں پنجاب کے نوجوان مصوروں میں ایک نمایاں درجہ حاصل کیا ہے موجودہ تصویر کا عنوان غالب کا مشہور مصرعہ ہے "قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں" ——

تصویر میں ایک مرد ہے نوجوان اور ایک عورت ہے (وہ بھی نوجوان) —— دونوں کا قلبی تعلق ظاہر ہے لیکن اس تعلق اور اس یک جائی کے باوجود نوجوان کے چہرے پر ایک ملال سا مترشح ہے نیز اس کے دائیں ہاتھ کی حرکت رقص کے کسی مدرا سے کم نہیں۔ شاید انھیں زندگی میں کوئی غم ناک صورتِ حال درپیش ہے، اور مرد کو کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا لیکن عورت کے چہرے پر اس کے ہم جلیس کی مانند غم کی فراوانی نہیں ہے۔ وہ کچھ مطمئن سی دکھائی دیتی ہے جیسے رونے کے بعد دل ہلکا ہو جاتا ہے۔ شاید اسے تسلی ہے کہ اس غم ناک صورتِ حال میں بھی ایک ساتھی ایک سہارا تو موجود ہے۔ شاید وہ اپنے غم کو ظاہر کر کے اپنے ساتھی کے غم کو بڑھانا نہیں چاہتی۔ اگر یہ جوڑا پریمی پریتم کا ہے تو ملنے سے پہلے انھیں دکھ محسوس ہوا ہوگا۔ اور سنجوگ پر یہ سمجھے ہوں گے کہ اب جیون سکھ ہی سکھ ہے لیکن ان کے اس خیال کو توڑنے کے لئے ایک نیا غم آن موجود ہوا۔ شاید اب پھر جدائی کے دن سامنے نظر آ رہے ہیں۔ شاید یہ نوجوان اپنی دھرتی وطن کو چھوڑ کر پردیس جانے والا ہو۔ اور تسلی کے لئے اپنے غم کے باوجود اپنی محبوب کو سمجھا رہا ہو کہ "قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں" —— دکھ سکھ دونوں جان کے ساتھ ہیں۔

اس تصویر کو دیکھتے ہوئے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ دن آئے گا جب ایشور سنگھ پنجاب چھوڑ کر ہندوستان کے نوجوان مصوروں میں بھی اپنے لئے مناسب جگہ بنا لے گا۔

تیسری رنگین تصویر بھی ایک ہندوستانی مصور کی ہے لیکن یہ فن کار (ایس۔ایم۔ڈین) اپنے وطن سے بہت دور ——— کابل میں مقیم ہے۔ اس تصویر کا عنوان فارسی کا ایک شعر ہے "اے شمع تنگ دتاز نفس گرد سفر شد، اکنوں بجز امیدتاں زیست بسر شد!" ——— [illegible] عنوان ہوتے ہوئے کسی اور بات کے کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ [illegible] جا سکتا ہے کہ ایک ہندوستانی فن کار کے دل پر کابل کی فضا نے جو اثر ڈالا ہے۔ اس کا اظہار بھی اس تصویر میں موجود ہے۔ بوڑھا ہندوستانی نہیں ہے نیز کھڑکی میں سے دور جو منظر دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اگرچہ خاکِ پاکِ ہند میں بھی بعض مقامات پر نظر آسکتا ہے لیکن اس وقت یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ منظر کابل ہی سے نسبت رکھتا ہے۔

ہاں، اس تصویر کے لئے "ادبی دنیا" جناب (شہزادہ) احمد علی دُرّانی کا ممنون ہے جو نقش نواز ہونے کے علاوہ ادب نواز بھی ہیں۔ اور ان کے ذوقِ ادبی کا آئینہ وہ شعر ہے جسے انہوں نے عنوان کے طور پر چسپاں کیا ہے۔

چوتھی رنگین تصویر "کنارِ دریا" ایک جرمن فن کار کی تخلیق ہے اس بات کے باوجود کہ ہندوستان سے بڑھ کر کھلے میدان اور کہاں ہوں گے کھلے میدانوں کا مطالعہ ہندوستانی مصوروں میں عموماً آغاز ہی سے کم یاب رہا ہے۔ موجودہ دور میں بھی مصوروں کی اکثریت اشکال ہی کی طرف مائل ہے۔ ایک کھلا میدان محض ایک منظرِ فطرت ہی نہیں ہوتا بلکہ نگاہ غور اس میں کسی پھیلی ہوئی آسودہ اور کشادہ روح کا عکس بھی دیکھ سکتی ہے۔ امید کرنا چاہئے کہ ہمارے مصور بھی شہری تأثرات سے ہٹ کر جب دیہات کی طرف مائل ہوتے ہیں تو انہیں وہاں بھی چہروں اور شکلوں کے علاوہ وہ زمینیں بھی زیادہ سے زیادہ تحریکِ نقش کاری دیں گی جہاں کی پیداوار وہ چہرے اور وہ شکلیں ہیں۔

فوٹو آرٹ میں سب سے پہلے "تماشائی" کا ذکر مناسب ہوگا۔ یہ تصویر بھی ایک ہندوستانی فن کار کی تخلیق ہے تصویر کی مرکزی شکل کبوتر ہے لیکن دائیں طرف آگے بڑھی ہوئی چھت۔ بائیں طرف کچھ سرکنڈے ہیں اور دور آسمان پر بادلوں کے مختلف سائے ان سب کے امتزاج سے ایک عجیب احساساتی تأثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تصویر "ادبی دنیا" کو مشہور ہندوستانی مصنف جناب دیوانند ستیارتھی کا عطیہ ہے۔ اور جناب ایم۔ آر۔ بھاردواج کی تخلیق "سینۂ صد چاک" بھی "کنارِ دریا" ہی کی قسم کا مطالعہ ہے لیکن ریگستان کا انسان کا اس میں صرف اسی قدر کام ہے کہ اس نے ایک خاص زاویے سے منظر کی گرفت کی ہے۔ باقی کمالات فطرت کے ہیں۔

"نیچر میں آرٹ" بھی اس لحاظ سے ایک ایسی ہی تصویر ہے۔ یہ تصویر جناب وقار انبالوی ایڈیٹر "احسان" کی وساطت سے آپ تک پہنچ رہی ہے جسے وہ اپنے مصر کے سفر سے لائے تھے۔

"وہ مارا" ——— گھر سے باہر کی زندگی کا ایک عکس ہے۔ اور اپنی وضاحت آپ۔

"ایک منظر" ——— دو بالیں سی فضا میں آویزاں ہیں اور صاف آسمان ہے لیکن یہ سادہ سا نباتاتی "مطالعہ" عنوان کے لحاظ سے اگلی تصویر "ایک اور منظر" سے متعلق ہے۔ یہ دوسرا منظر بظاہر جماداتی دکھائی دیتا ہے لیکن اگر تخیل زرخیز ہو تو جس سے کون بہت اُنسے آشنا ہوتا ہے اسے عوام "حیواناتی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس تصویر کے عین مقابل میرقان گورکھپوری کے رذیذ اشعار اس کی لذت میں ایک پھیلتا ہوا اضافہ کر رہے ہیں۔

"تو اور آرائشِ خمِ کاکل" ——— فوٹو آرٹ کے ایک نئے طریقِ کار کا اظہار کر رہی ہے۔ یہ فوٹو کا منفی عکس ہے۔ اور اس انوکھے عمل نے ایک عجیب دلکشی پیدا کردی ہے۔ غالب کے ایک شعر کا پہلا مصرعہ اس کا عنوان ہے لیکن دوراز مفہوم نہیں کیونکہ آرائشِ خمِ کاکل کی پہلی منزل ہی اس تصویر کا موضوع ہے۔

"ایک چہرہ" ——— "ایک اور چہرہ"۔ یہ دونوں تصویریں اپنی باہمی نسبت کی وجہ سے ایک ہی ورق کے دو پہلوؤں کی زینت ہیں ایک میں معصومیت ہے، اچھوتا پن ہے یہاں تک کہ آنکھوں کی سفیدی بھی عصمت اور پاکیزگی کی ایک دوری پیدا کردیتی ہے۔ ایک ایسی خلیج حائل کردیتی ہے جس کے پار ہاتھ بڑھاتے ہم جھجکتے ہیں لیکن اس کا تضاد دوسرا چہرہ ہے۔ جذبات کی گہرائی، تجربات کا اعتماد اور رات کے اندھیرے کا رس اس صورت سے نمایاں ہے۔

"میں ہوں اپنی شکست کی آواز" ——— ایک ٹوٹا ہوا سنکھ زمین میں گڑا ہوا ہے لیکن کیا یہ زمین کروکشیتر کے میدان کی ہے جہاں مہابھارت کے معرکے سے پہلے اعلان کے طور پر پھونکا گیا تھا اور اب اسکے بجانے والے کرشن کنھیا مہابھارت کے ختم ہونے پر اسے یوں چھوڑ کر برندابن یا دوارکا میں جا براجے ہیں؟ ——— اس تصویر کے ساتھ ہی اسی عنوان سے ماپساں کا افسانہ بھی ہے۔ اس افسانے کی ہیروئن کا انجام بھی اس ٹوٹے ہوئے سنکھ سے ملتا جلتا ہے۔

ان گہرے مطالعوں سے ہٹ کر ہم ایک ہلکی پھلکی اور سادہ سی تصویر کی طرف آتے ہیں "بڑا آیا کہیں کا" ——— طفلی کی مختلف کیفیتوں میں سے ایک کا اظہار جو جب پسند اور ناپسند کی ترجمانی صرف اپنی بے بس حرکات ہی سے کی جا سکتی ہے۔

"پشیمانی" ——— آدم کے بیٹے قابیل کی زندگی کے اس واقعے سے متعلق ہے جس نے تاریخِ عالم میں انسانی خون کی ابتدا کی۔

"تعمیر میں تزئین کا عنصر" ——— یہ ایک اطالوی گرجے کا اندرونی منظر ہے ——— فنِ تعمیر کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہے۔ اس لحاظ سے یہ تصویر ادبی دنیا کے پڑھنے والوں کے لئے شعر و ادب کے ساتھ ساتھ (کہ وہ بھی فنونِ لطیفہ میں سے ہیں) ایک متنوع دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔

میراجی

نئی کتابیں

قیمت

ناموران سیاست از عبدالمجید و محمد نسیم مرتبہ آئی ایم ایم جوہر ۱۰/

باقیاتِ بجنوری یہ جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے مضامین، مکاتیب اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ مضامین میں گیتانجلی وضع اصطلاحات اور سیر لکھنؤ خاص ادبی ہیں اور "دامنۂ آید بکار" مرحوم نے اپنے چھوٹے بھائی کے لئے مزو ہدایات لکھی جو اس وقت علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے۔ مکاتیب میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے قیام انگلینڈ و ترکی کے حالات لکھے ہیں۔ مکاتیب کا وہ حصہ جس میں ڈاکٹر صاحب نے ترکی کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ نہایت اہم ہے نظموں کا حصہ مختصر ہے مگر نہایت دلچسپ اور کیف آور۔ کتابت و طباعت اعلیٰ اور روشن ہے قیمت مجلد صرف ع/

مضامینِ سلیمان علامہ سید سلیمان ندوی کی تازہ ترین اہم کتاب۔ موصوف نے ہندوستانی زبان و ادب کے متعلق اب تک جتنی تقریریں کیں اور خطبے دیئے ہیں۔ ان سب کو اس مجموعے میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں ہندوستانی ہماری زبان کا نام۔ اور ہماری زبان بیسویں صدی میں اردو انسائیکلوپیڈیا اردو زبان کی ترقی کا مسئلہ وغیرہ جیسے اہم عنوانات پر اس مجموعے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت مجلد .. .. تے/

مضامینِ محمد علی "حصۂ دوم" مرتبہ جناب محمد سرور صاحب پروفیسر اسلامیات جامعہ ملیہ۔

یہ مجموعہ اس ہنگامہ خیز دور کی تاریخ ہے جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۰ء پر ختم ہوتا ہے۔ سر سید نے کانگریس کی مخالفت کس بنا پر کی؟ وہ مسلمانوں کو تمام سیاسی تحریکوں سے الگ رکھنے پر کیوں مصر تھے مسلم لیگ کا قیام کہاں اور کیسے عمل میں آیا؟ اس طرح کے اہم مسائل پر نہایت مفصل بحث ہے۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے ۲/۸

نور اللغات منظور شدہ محکمہ تعلیم پنجاب۔ مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب نیر۔ ہماری اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مستند اور مفصل لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ شکر ہے کہ ملک کے نامور آدمیوں نے اس طرف توجہ کی۔ امیر اللغات حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ کے نام سے کئی جلدوں میں ایک مفصل لغت لکھی۔ اس کے ایک عرصے بعد حضرت نیر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد ایک نہایت ضخیم لغت تیار کی ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام ایسے اچھے پیمانے پر ایک فرد واحد سے کیسے انجام پا گیا۔ انداز بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ اور حکیمانہ۔ غرض لغت کے سلسلے میں یہ آخری اور مستند کوشش ہے۔ اور عاشقانِ اردو کی قدر دانی کی مستحق ہے۔ مجلد قیمت جلد اول دس روپے۔ دوم چھ روپے۔ سوم دس روپے۔ چہارم چودہ روپے مکمل کی قیمت چالیس روپے .. .. ٘للعہ

خنداں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نئی تصنیف۔ یہ ان مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف نے وقتاً فوقتاً دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیں۔ ان میں آپ کو وہی اعلیٰ قسم کا مزاح۔ لطیف طنز اور خواہ مخواہ دل کو گدگدا کر محظوظ کرنے کی صفات ملیں گی جو مضامین رشید کی جان ہیں۔ خنداں ڈاکٹر بھی ہیں اور شاعر بھی مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان کی ڈاکٹری زیادہ وبال جان ہے یا ان کی شاعری ممدوح نے اسی قسم کے کرداروں نیز زندگی کے دوسرے دلچسپ پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے ۲/۸

مبادیِ سیاسیات مصنفہ پروفیسر ہارون خان شیروانی ایم۔ اے (آکسن) صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔

ہمارے ملک میں لوگوں کی سیاسی معلومات اتنی کم ہیں کہ شاید کسی متمدن ملک میں یہ حالت نہ ہوگی۔ اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی کسی سیاسی مسئلہ پر زیادہ دیر تک جذبات سے الگ ہو کر علمی گفتگو نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خود ہماری مادری زبان میں علم سیاست پر اچھی کتابوں کا فقدان ہے مبادی سیاسیات اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں زیادہ تفصیل سے علم سیاسیات کی ابتدائی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کی خاص کامیابی یہ ہے کہ اس نے اصطلاحات کے اشکال کو تشریح کی مدد سے عام فہم بنا دیا ہے۔ قیمت پانچ روپے .. .. صہ

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی، نئی دہلی۔ لکھنؤ۔ بمبئی

نیا سال

خوشبوؤں کی مہک سی آئی   رُوئے گُل پہ چمک سی آئی
بادِ خزاں کا نرم سا جھونکا
آیا
اور اک سال گیا

تاریکی میں نُور سا چمکا   لرزا موتی سا شبنم کا
آنکھ سی جھپکی، آیا اندھیرا
چھایا،
اور اک سال گیا

اُڑتی اُڑتی گرد سی دیکھی   لب پر آہِ سرد سی دیکھی
عمرِ رواں نے اک جھٹکا سا
کھایا،
اور اک سال گیا

قیوم نظر

بزم ادب

جنگ عظیم کے اثرات سے ادب بھی محفوظ نہیں رہا۔ اور اگر ایک طرف طباعت واشاعت کے معاملات میں سخت مشکلات پیش آرہی ہیں تو دوسری جانب لکھنے پڑھنے والوں کے دل و دماغ ایک غیر معمولی انتشار اور اضطراب میں مبتلا ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ایسے حالات میں بھی ہمیں اپنے ناظرین سے شرمسار نہیں ہونا پڑا اور آج نئے سال کا جو تحفہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری کوششوں اور آپ کی توقعات کی ہر لحاظ سے تکمیل کرتا ہے اور یہ سب کچھ خدائے لایزال کے فضل و کرم اور ہمارے قلمی معاونین کے اشتراک عمل کا نتیجہ ہے۔

سالنامے کے مضمون نگاروں میں ان شخصیتوں کے علاوہ جن سے آپ مانوس ہیں، اور جو گذشتہ تین چار سال سے التزاماً ہماری سالانہ محفل میں شریک ہوتے ہیں۔ آپ کو چند نئے نام بھی نظر آئیں گے۔ ان میں محمد حسن عسکری ہیں جنہوں نے ایک بے نظیر نفسیاتی افسانہ لکھا ہے اور اُسے ایک بے مثال نام دیا ہے۔ نریندر ناتھ سیٹھ ہیں جن کا ڈرامہ ناکامی عہد حاضر کی ایک جاں گداز کش مکش کی آئینہ داری کرتا ہے، ملک عطاء اللہ کلیم ہیں جنہوں نے اپنے دلکش انداز میں موپساں کا ایک ایسا شاہکار پیش کیا ہے جو موجودہ جنگ کے پس منظر پر خوب کھلتا ہے۔ مختارالدین احمد آرزو ہیں، جن کی تحقیقی کاوشوں کا کچھ اندازہ آپ گزشتہ نمبر کے معرکۃ الآراء مضمون "تاریخ ادب اردو پر ایک نظر" سے کر چکے ہوں گے۔ اب ان کا ایک اور مختصر مگر دل آویز مطالعہ مرزا غالب کا کچھ نایاب کلام ملاحظہ فرمائیے حسن یحییٰ عندلیب ہیں، جو ہماری بزم میں پہلی مرتبہ شریک ہو رہے ہیں اور پہلی ہی بار آپ کے سامنے ایک معرکے کی چیز پیش کر رہے ہیں، ہجویات یا طنز نگاری عظیم قریشی ہیں جو ایک زمانے میں اپنے رادھا کے گیتوں کے باعث بہت معروف تھے، درمیان میں غائب رہے اور اب ایک نہایت دل افروز انشاء گیتا گوبند کا ایک سین لے کر آئے ہیں، احتشام حسین رضوی ہیں جنہوں نے اردو میں سوانح نگاری کے اہم اور ضروری بحث پر ایک بیش قیمت مقالہ لکھا ہے،

اور آخر میں ہندوستان کے مشہور افسانہ نگار جناب سید علی عباس حسینی ہیں جن کی مختصر کہانی "بھوک" ترقی پسند ادب کا ایک دلپذیر نمونہ ہے حسینی صاحب ایک مدت سے ممتاز رسائل کے ذریعے اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور ہمیں مسرت ہے کہ ادبی دنیا بھی اب اپنے ناظرین کو اُن کے گراں پایہ افکار سے متعارف کر رہا ہے۔

جہاں ہم ان نئے آنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہیں وہاں سالنامے کی بزم میں ہمیں بعض ایسے گرامی قدر اہلِ قلم کی عدم شمولیت کا دلی افسوس ہے جو ہماری گوناگوں کوتاہیوں اور مجبوریوں کے باعث آج یہاں رونق افروز نہیں ہیں۔ اُن کے قیمتی مضامین کتابت کی منزل طے کر چکے تھے بلکہ بعض کے توپروف بھی پریس سے آگئے تھے۔ لیکن یکایک ہمارے محکمۂ انتظام نے جنگ کے مخصوص اثرات کے پیش نظر فیصلہ کیا کہ وہ ہمیں صفحات کی ایک محدود تعداد سے زائد نہ دے سکے گا۔ اب ہمیں ایک عجیب و غریب مصیبت کا سامنا تھا جس کا بظاہر کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ سب سے زیادہ اذیت دہ بات یہ تھی کہ ہم سالنامے کے فیصلہ شدہ مضامین میں سے کوئی ایسا انتخاب نہیں کر سکتے تھے جس کی رُو سے بعض مضامین رکھ لئے جائیں اور باقی شائع کردیے جائیں، کیونکہ ان میں سے کوئی مضمون ایسا نہیں تھا جو معیار کے لحاظ سے کسی دوسرے مضمون سے کمتر ہو۔ یہ جاں گداز اور صبر آزما کشمکش متواتر دو شب و روز جاری رہی۔ بالآخر یہ طے کرنا پڑا کہ قرعہ اندازی کے سوا انتخاب کی اور کوئی صورت ایسی نہیں ہو سکتی جو ہمیں تسکینِ قلب کا فریب دے سکے۔ چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالنامہ بعض نہایت بیش قیمت مضامین سے محروم ہو گیا۔ اور اس محرومی کا داغ ہمارے جگر پر بڑی دیر تک نمایاں رہے گا۔ لیکن آپ کہیں گے کہ اگر وہ مضامین نہ چھپتے تو لازماً موجودہ مضامین میں سے بعض رکھ لئے جاتے، آپ کا خیال بالکل درست ہے ؎

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

بہر حال ہم اپنے اُن احباب سے جن کی شمولیت سے ہماری محفل رونق نہ پا سکی، بے حد شرمسار ہیں۔ سب سے زیادہ ندامت ہمیں اپنے

محترم بھائی شاہد احمد صاحب مدیر ساقی سے ہے جنہوں نے اپنی شدید علالت کے باوجود ہمارے لئے ہزدنا تھ چٹوپادھیا کا ایک اوّل درجے کا ڈراما کھڑکی اپنے دلنشیں انداز میں ترجمہ کیا اور وقت پر بھیج دیا لیکن ہماری شومئی قسمت سے چھپنے سکا۔ ان کے علاوہ اس ذیل میں ہمارے عزیز دوست اور اردو کے ممتاز ترین افسانہ نگار کرشن چندر ہیں جن کا ایک طویل مختصر افسانہ گرجن کی ایک شام جو اردو میں اپنے رنگ کی ایک نئی چیز تھی، سالنامے کی بجائے اب کسی آیندہ اشاعت ہی میں چھپ سکے گا۔ پھر شیر محمد صاحب اختر ہیں جنہوں نے سبزہ زار کے عنوان سے مشہور امریکی شاہکار THE GREEN PASTURES کو کمال محنت اور شوق سے سالنامے کے لئے اردو میں منتقل کیا تھا، جناب ابوالفضل صدیقی ہیں جنہوں نے اپنی نکھری ہوئی زبان میں ایک بے حد دلچسپ افسانہ سماج کا شکار کے عنوان سے لکھا تھا، جناب علی عباس جلال پوری ہیں جن کی کم نویسی ہمارے تقاضوں کی متحمل نہ ہو کر آخر پورے زور سے رنگ لائی تھی اور انہوں نے بیکار کے عنوان سے ایک نہایت دلکش مقالہ ہمیں عنایت فرمایا تھا اور آخر میں ہمارے محترم و مکرم دوست مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی ہیں جن کا ایک بے حد دلچسپ اور پُر از معلومات مقالہ اردو کی شاہی سرپرستی کتابت اور پروف کی تمام منازل طے کرنے کے باوجود صبح کی روشنی نہ دیکھ سکا۔ مگر اب امید ہے کہ نصف النہار میں ہماری چشمِ تماشا کے لئے سامانِ بصیرت بہم پہنچائے گا۔

گذشتہ سال ترقی معیار کے اعتبار سے جہاں ادبی دنیا کے لئے مبارک ثابت ہوا وہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس سال اردو کی ادبیات میں ایک عام اور مشترک ترقی کے ایسے واضح آثار پیدا ہو گئے۔ جو روز بروز فروغ حاصل کرتے جاتے ہیں اور ہمارا ادب نظم اور نثر دونوں میں زندگی اور حقیقت کے قریب ہوتا جا رہا ہے، مطالعوں میں وسعت اور جامعیت پیدا ہو رہی ہے اور اظہار و بیان کی نئی نئی روشیں دریافت کی جا رہی ہیں ہمیں فخر ہے کہ ادب کے اس عمومی ارتقا میں "ادبی دنیا" کا بھی کچھ حصہ ہے ہم نے اس سال بھی ایسے نئے لکھنے والوں کا خیر مقدم کیا جن کے افکار میں تازگی اور بیان میں ندرت کی جھلک نظر آئی۔ یہ سچ ہے کہ ہم ادب میں ایک ایسی بغاوت اور بے ترتیبی کے مخالف ہیں جو ہماری صدیوں کی محنت اور ہماری زبان کے مسلمہ اسالیب و اصول کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے، لیکن ہم ہر اس انقلابی تعمیر کو خوش آمدید کہنے کو تیار ہیں جو "راہ و رسم" کی پابندیوں کے باوجود ادبی فرسودگی اور کہنگی کے خس و خاشاک کو اپنی بنیادوں میں دفن کرتی چلی جائے۔

گذشتہ سال کے دوران میں نظم و نثر کا جو انتخاب آپ کے سامنے آیا اُس کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ "نام" کی بہ نسبت "کام" کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا۔ بت سازی اور بُت پرستی کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی بت شکنی بھی ہمارے آئین میں داخل ہے۔ ہر صنم اپنی پرستش کا ایک خاص دَور اپنے ساتھ لاتا ہے اور اس دور کے گذر جانے کے بعد صنم خانے میں جمے رہنے کا اُسے بظاہر کوئی حق نہیں رہتا۔ زمانہ بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ اس لئے جو فن کار زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا، اس کے لئے سب سے مناسب اور محفوظ جگہ مشاہیر کی گیلری ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری سوسائٹی کی حد سے گذری ہوئی نام پرستی اور حد سے بڑھا ہوا تقلید کا مرض ان بزرگوں کو کسی گوشۂ عافیت میں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اور انہیں بار بار ادب اور فن کی ایسی محفلوں میں شمولیت کی تکلیف دی جاتی ہے جہاں پرانی بساطیں اُلٹ چکی ہیں۔ اور پرانی باتیں افسانہ بن کر رہ گئی ہیں۔

ادبی دنیا کے صفحات اردو کے ہر ایسے ادیب کے لئے کھلے ہیں جو زبان و ادب کی کوئی نہ کوئی خدمت بجا لاتا ہے۔ اور آپ لوگ گواہ ہیں کہ اس میں کبھی کسی قسم کی صوبجاتی یا فرقہ وارانہ تخصیص کو روا نہیں رکھا گیا۔ لیکن از بسکہ اس پرچے کا خمیر سرزمین پنجاب سے اٹھا ہے۔ اس لئے قدرتاً ہمیں ادبائے پنجاب کی ذہنی نشو و نما سے ایک خاص دلچسپی ہے۔ آج ہم ان سے صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ جہاں ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ نظم میں ایسے نئے نئے تجربے کر رہے ہیں جو شعر کی رومانیت اور زندگی کی حقیقت کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے میں ممد ثابت ہوں گے، اور جہاں ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ پنجاب نے گذشتہ چار پانچ سال میں اردو کو چند ایسے افسانہ نگار دیئے جنہوں نے یقیناً ہماری زبان کو دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھیں ملانے کے قابل کر دیا، وہاں یہ بات ہمیں بُری طرح کھٹکتی ہے کہ پنجاب میں سنجیدہ مقالہ نگاروں کا نہ صرف قحط ہے، بلکہ جو دو چار لکھنے والے ہیں بھی، انہیں عافیت و آرام کی ارزانی نے زبان و ادب کی خدمت کے قابل نہیں رکھا۔ ریڈیو کے لئے پندرہ منٹ کی بات چیت لکھ لینا اور بات ہے اور کتب خانے میں بیٹھ کر تحقیق و تخلیق کی قوتوں سے اس طرح کام لینا کہ دونوں کے امتزاج کا نتیجہ ایک پائدار اور مفید صورت میں ظاہر ہو، اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک گہرے نقش پا کا کام دے، ایک بالکل جدا بات ہے۔ کسی زبان کا سب سے قیمتی خزانہ اُس کی سنجیدہ نثر ہے اور اُس کی تلاش میں جب کبھی ہماری

نگاہیں اٹھتی ہیں تو انہیں گنگ و جمن کی وادی ہی میں آسودگی ملتی ہے۔ محو خواب!
اے کاش!۔۔۔

اور اب آپ سالنامے کے مضامین پر ایک نظر ڈالیں۔۔۔

ہجویات یا طنز نگاری پر جناب حسن عسکری عندلیب نے ایک بسیط مقالہ لکھا ہے اور اس صنفِ ادب کا ایک تاریخی جائزہ لیا ہے۔ وہ اپنے جائزے کی ابتدا عہدِ آفرینش کے اس دھندلکے سے کرتے ہیں جب انسان کا پہلا جذبہ یا جذبۂ عبودیت کی صورت میں ظاہر ہوا اور اس اظہار کی دوسری لہر آدم و حوا کی اولاد کی باہمی جھگڑوں کا آئینہ بنی گویا ان کے خیال میں ہجو اتنی ہی قدیم ہے جس قدر کہ خود اظہارِ انسانی۔ اس کے بعد صاحبِ مضمون نے یونانی، لاطینی، انگریزی اور عربی کی طنزیہ ادبیات پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی ہے اور کیونکہ فارسی بہر لحاظ سے زبانِ اردو کی مورث رہی ہے، وہ کسی قدر تفصیل سے آگے بڑھتے ہیں۔ فارسی شعرا کے ہاں سے انہوں نے خاصہ دلچسپ مواد حاصل کیا ہے۔ اردو میں وہ سودا سے لے کر مرزا فرحت اللہ بیگ تک مزاح کی طنزیہ تخلیقات پر ایک سیر حاصل تبصرہ کر گئے ہیں۔ اس تبصرے میں انہوں نے چند بالکل نئی باتیں بھی کہی ہیں مثلاً وہ نیاز کو اردو کا غالباً سب سے بڑا طنز نگار سمجھتے ہیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ بہت سے پڑھنے والے ان کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں گے۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، اس کے ہر ہر لفظ سے غائر مطالعہ اور بے پناہ علمی تجزیہ کے نشان پیدا ہیں۔ تعجب ہے کہ انہوں نے طنز کی ایک لطیف قسم کا بالکل ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اردو میں اب یہ خاصی رائج ہو چکی ہے۔ ہماری مراد پیروڈی سے ہے۔ اسی طرح دورِ حاضر کے اخباری طنز کو بالکل نظرانداز کر گئے ہیں۔ اودھ پنچ کے طنزیہ مقالات کے ساتھ اگر وہ سالک اور حسرت کے افکار و نکات پر بھی ایک نظر ڈال جاتے تو کچھ ایسا غیر موزوں نہ ہوتا۔

سودا کی ہجو اسپ اردو میں ایک کلاسیکی درجہ رکھتی ہے مگر مشہور فرنگی نژاد اردو شاعر تمکین کا ظم نے راجہ دلسکھ رائے کی گھوڑیا کی جو ہجو لکھی ہے وہ بھی لطافت مبالغہ اور ندرتِ بیان کے لحاظ سے انیسویں صدی کے طنزیہ ادب کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہے۔ افسوس کہ صاحبِ مضمون نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

بہرحال مقالۂ زیرِ نظر اپنی قسم کا ایک نہایت بیش قدر کارنامہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسے نہایت توجہ اور شوق سے پڑھا جائے گا۔

ہمارے فاضل دوست سید بادشاہ حسن حیدرآبادی ڈرامے پر ایک بڑی عمیق اور وسیع نگاہ رکھتے ہیں۔ اردو میں نہ صرف اس صنفِ ادب کی بے حد کمی ہے بلکہ اس میدان میں قدم رکھنے والوں کے لئے رہنمائی کے اسباب بھی مفقود ہیں۔ مقالۂ زیرِ نظر میں سید صاحب نے ڈرامے کے مختلف ضروری عناصر خلا[illegible] عمل، موضوع، منظر، زبان، منظر وغیرہ کے مقابلے میں کردار کا درجہ نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ کردار کی تخلیق اور تدریجی ارتقا کی کہانی خود ڈرامے کی زندگی کا افسانہ ہے اور کردار ہی وہ محور ہے جس پر ڈراما اپنی تمام کثیر خصوصیات کو لئے ہوئے گھومتا ہے۔ اور اسی کی بدولت بقائے دوام حاصل کرتا ہے۔ آخر جب ہمیں شیکسپیئر کا خیال آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی کیوں ہیملٹ، اتھیلو اور میکبتھ کے ذہنی نقوش انسانی شکلیں اختیار کر کے اپنی مخصوص صفات کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آن موجود ہوتے ہیں محض اس لئے کہ شیکسپیئر کی ڈرامائی تخلیقات درحقیقت اس کی کردار نگاری ہی کے معجزے ہیں۔ آج شیکسپیئر اگر زندہ ہے تو اپنے کرداروں میں زندہ ہے، افسانوں میں نہیں۔ افسانے تو اس نے بیشتر اور دل سے لئے تھے، اور کردار اس کی مافوق الفطرت طباعی نے پیدا کئے تھے۔

بادشاہ حسن صاحب نے اس مضمون میں معلومات کو ایسے دلنشیں پیرائے میں پیش کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

اردو کے مشہور محقق مختار الدین احمد صاحب آرزو نے اس اشاعت میں میرزا غالب کا کچھ نایاب کلام پیش کیا ہے۔ جو انہوں نے متفرق طور پر اس وقت کے تذکروں، دواوین اور تاریخی نوشتوں سے جمع کیا ہے، جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اس میں سے صرف ایک غزل ؎ اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں، جس کا پایہ بھی چنداں بلند نہیں اور جو غالب کے معروف رنگ میں بھی نہیں ہے، اس سے پہلے روشنی میں آ چکی ہے۔ باقی کلام جو ایک طویل قصیدے، ایک پوری غزل اور متفرق اشعار پر مشتمل ہے پہلی بار اشاعت پا رہا ہے۔ اہلِ ذوق کو جناب آرزو کا ممنون ہونا چاہئے جنہوں نے نہایت کاوش سے کام لے کر اردو کے سب سے بڑے شاعر کا نایاب کلام ان تک پہنچایا ہے۔ امید ہے کہ دیوانِ غالب کے ناشرین اپنے آئندہ ایڈیشنوں میں اس کلام کو جس کی اصلیت میں قطعاً کوئی شبہ نہیں، شامل کر کے فاضل محقق کی محنت کی عملی داد دیں گے۔

سید تسکین عابدی صاحب ہمارے ان مضمون نگاروں میں سے ہیں جنہیں اردو نظم پر لکھنے کا خاص ملکہ ہے۔ گذشتہ تین چار سالناموں میں اس موضوع پر ان کے ایسے متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں جو بیک وقت ان کے ذوقِ تحقیق اور خوبیٔ بیان کے آئینہ دار تھے۔ زیرِ نظر مقالہ ملک الشعرا حفیظ دہلوی پر لکھ کر انہوں نے نظمِ اردو کی ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے کیونکہ انیسویں صدی کا یہ ممتاز شاعر جو شاہ نصیر، مومن اور ذوق کا ہمعصر و ہمسر تھا محض اس

سلسلہ کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں ملّی چھوڑ کر دکن جا بسا، ہمارے تذکرہ نگاروں کی آنکھوں سے اوجھل رہا بات جہاں ہماری تذکرہ نویسی کی حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے، وہاں یہ الم ناک امکان بھی ہمارے پیش نظر کر دیتی ہے کہ خدا جانے ایسے کتنے جواہرِ گراں مایہ ہماری غفلت کا شکار ہو کر بے نشان ہو گئے ہوں گے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سوانح نگاری کو جو مقام ہمارے ادب میں حاصل ہے، اس پر سیّد احتشام حسین صاحب رضوی نے ایک نہایت فاضلانہ اور دلچسپ بحث کی ہے اور سوانح نگاری کے مختلف عناصر کا ایسا اچھا تجزیہ کیا ہے کہ اس فن کی اکثر باریکیاں اور نکات آئینہ ہو گئے ہیں۔ ہماری زبان میں یہ صنفِ ادب ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ بقولِ صاحبِ مضمون مولانا شبلی کی مذہبی سوانحعمریوں اور حالی کی حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب کے سوا اردو میں اس موضوع پر کوئی اہم و قابلِ ذکر تصانیف موجود نہیں ہیں۔ ہماری ناچیز رائے میں اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی ایسے صاحبِ نظر اور بے خوف لکھنے والے زیادہ تعداد میں پیدا نہیں ہوئے جو اس فن کی ذمہ داریوں اور فرائض کا پورا احساس کر کے اس انداز سے قلم اٹھائیں کہ پبلک اس موضوع سے دلچسپی رکھنے پر مجبور ہو جائے۔

علامہ اقبال کی وفات حال کا واقعہ ہے۔ اس دو تین برس کے عرصے میں ان پر درجنوں کتابیں اور سینکڑوں مقالے لکھے گئے۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُن کی بے لاگ سوانحعمری لکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ سوانح نگار کا کام اُس کے موضوع کے انتقال کے بعد شروع ہو۔ لیکن اس سلسلے میں بھی ایک آدھ ایسی کوشش کے سوا جس میں سوانح نگاری کی بہ نسبت طنز کا رنگ ضرور زیادہ نمایاں تھا کوئی کام نہیں کیا گیا۔ البتہ خواجہ حسن نظامی خدا انہیں سلامت رکھے، روزنامچے کی صورت میں اپنی ایک منظم اور مربوط سوانحعمری ترتیب کر رہے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ان کا سوانح نگار بہت کچھ اُن کے روزنامچے کی مدد سے اور کم از کم ان کے مخالفوں کی تحریروں سے اپنی ضروریات کے لئے کافی مواد مہیا کر سکے گا۔

افسوس کہ مضمون کا آخری حصہ کچھ تشنہ سا رہ گیا ہے، اور صاحبِ مضمون نے الفاروق اور المامون جیسے کارناموں کا بھی جائزہ نہیں لیا۔ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی مرحوم نے بھی اس میدان میں قابلِ ذکر کام کیا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ صاحبِ مضمون اس مقالے کے بعد بھی اپنی تنقیدی کوششوں کو جاری رکھیں گے اور اردو میں سوانح نگاری کی تحریک کو کامیاب بنانے کی سعی فرمائیں گے۔

گیتا گوبند کا ایک سین انشائے لطیف کا ایک حسین نمونہ ہے جسے رادھا کے گیتوں کے مشہور مصنف جناب عظیم قریشی نے اپنے دل آویز انداز میں سنسکرت سے براہ انگریزی اردو میں منتقل کیا ہے۔ رادھا کا پریم تخیل میں بھی رشک کی تاب نہیں لاتا۔ اور وہ کرشن کی جدائی میں جینے پر جمنا کی لہروں میں فنا ہو جانے کو ترجیح دیتی ہے۔ اظہار کی جو کیفیت رادھا کے جذبات کے حصے میں آئی ہے۔ وہ سوز و گداز کی ایک لافانی صورت ہے، اور مصنف کے اعجازِ تحریر اور مترجم کی کاوشِ تمام کی ایک بولتی ہوئی تصویر۔ امید ہے کہ اسے پریم اور بھگتی کے اسی جذبے سے ہم آہنگ ہو کر پڑھا جائے گا جس جذبے کی تحریک اس کی تخلیق کا باعث ہوئی تھی۔

رفیقِ گرامی میراجی نے بنگال کے ملک الشعرا چنڈی داس پر اپنے مخصوص فاضلانہ رنگ میں ایک جامع مضمون لکھا ہے اور اس کے رسیلے گیتوں کی روح کو اردو کے جسم میں اس سحر کاری سے اسیر کیا ہے کہ قفس پر آشیاں کا گماں ہونے لگتا ہے۔ ویشنو شاعری میراجی کا محبوب موضوع ہے اور وہ جب کبھی اس آنند ساگر میں ایک بار کود پڑتے ہیں تو پھر کنارہ انہیں بالکل یاد نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ چنڈی داس سالنامے کا آخری مضمون ہے اور وہ اس کے مسودے پر اُس وقت بھی جھکے ہوئے تھے جب سالنامے کا باقی حصہ طباعت کی سب منزلیں طے کر کے دفتری کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا اسے بھی بھگوان کا ایک کرشمہ سمجھئے کہ آج یہ مضمون آپ کے سامنے ہے، ورنہ ہم تو اس کی شمولیت سے بالکل مایوس ہو چکے تھے۔

کرشن ویشنو شاعری کا محور ہے اور اُس کی ذات پریم اور سندرتا[۱] شکتی اور نیائے[۲]۔ گیان[۳] اور بدھی کی بیک وقت مظہر ہے وہ ایک ہی لمحے میں رزم اور بزم دونوں کا دھنی ہے، اور برندابن میں بانسری کی سریلی تانوں کے ساتھ ساتھ کروکشیتر کے میدان میں سنکھ بھی پھونک سکتا ہے لیکن ویشنو شاعری اُس کے جمالیاتی رنگ کی نغمہ خواں ہے اُسے اُس کے جلال سے چنداں دلچسپی نہیں۔ میراجی آج آپ کے سامنے قدیم بنگال کے اس شاعر کو پیش کرتے ہیں جس نے نہ صرف اپنی شاعری میں بلکہ اپنی زندگی میں بھی کرشن بھگتی اور اُس کے فلسفے کا عملی ثبوت پیش کیا، پریم رس کا یہ پیالہ اب آپ کے لبوں کا منتظر ہے۔

[۱] حسن و عشق [۲] قوت و انصاف [۳] عرفان و دانش

اور اب افسانے۔

بعض احباب کا خیال تھا اور ہم بھی اُن کی رائے سے ایک حد تک متفق تھے کہ افسانوں کا جیسا شاندار مجموعہ گذشتہ سالنامے میں پیش کیا گیا تھا وہ بے مثال ہی رہے گا لیکن ہم چاہے کچھ کہیں زمانہ ہمارا پابند نہیں۔ وہ اپنی دُھن میں برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے جلو میں نئے نئے واردات قلبِ انسانی پر نازل ہوتے رہتے ہیں اور انداز و بیان کے نئے نئے اسلوب ڈھلتے رہتے ہیں۔ ہمارا افسانوی ادب گذشتہ سال جس سنگ میل پر تھا، وہ اب افق کے دھندلکوں میں غائب ہو چکا ہے اور کیا عجب ہے کہ ہم آج جس منزل پر ٹھہرے ہیں اگلے برس یہ محض ایک نشانِ راہ ہو کر رہ جائے۔ یہ اردو ادب کی خوش نصیبی ہے کہ موجودہ دور میں بہت سے ایسے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں جنہیں قلبِ گداز کے ساتھ ذہنِ رسا بھی عطا ہوا ہے اور جو اپنے محسوسات کو موزوں الفاظ کا جامہ پہنانے کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔

شمارۂ زیرِ نظر میں ہمارے دوست ممتاز مفتی صاحب کا "مطالعہ" آیا اُن کے حیرت انگیز تفکر کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔ مفتی صاحب پنجاب کے ایک اور بلند پایہ افسانہ نگار کی طرح اپنا موضوع خانگی معاشرت ہی کو قرار دیتے ہیں لیکن نفسیات کی ایسی ایسی پیچیدگیاں اور فکر کے ایسے ایسے نکتے حل کر کے رکھ دیتے ہیں کہ افسانہ پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ رُوحِ انسانی ادراک و احساس کی رنگین جھلملیاں اٹھا کر اپنی تمام عریانیوں کے ساتھ یکایک آپ کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور جو اسرار اُس نے اپنے سینے کی گہرائیوں میں دفن کر رکھے تھے وہ آپ کی نذر کر رہی ہے۔

ممتاز سرزمین پنجاب کا فلسفی افسانہ نگار ہے اور اگر وہ ہنگ کی مبالغہ آفریں اور تناسب کش ضروریات سے متاثر نہ ہوا تو وہ دن دُور نہیں جب اس کی تخیلات خیال انگیزی اور نکتہ سنجی کا معیار تسلیم کی جائیں گی۔ موجودہ افسانے میں "آپا" کی خاموشیاں اُس سوز و روں کی آخر دم تک پرستار رہتی ہیں جو ہندوستانی عورت کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے لیکن یہ اب کم یاب ہو رہا ہے اور اپنی جگہ "تصاحوا جی" ایسی برق مثال ستم رسیدہ لڑکیوں کو دے رہا ہے، جو ہمارے بدلنے والے سماجی نظام کی بدولت چمکتی بھی ہیں لیکن سماجی دباؤ کے ایک ہی جھٹکے سے بجھ بھی جاتی ہیں۔ خدا جانے تغیر کی یہ سست رفتار اور کرب انگیز قیامت کب تک جاری رہے گی۔

جب سے ہمارے ہاں ترقی پسند ادب کا فیشن چلا ہے، بہت سے ایسے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں جو حقیقتاً ادب کو تنزل کی پستیوں کی جانب گھسیٹ رہے ہیں ان کے خیال میں ادب بھی گویا ایک آلہ ہے جسے ایک خیالی مقصد کے حصول کے لئے پروپیگنڈا کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس بے بنیاد اور بے خلوص تحریک کا ردِ عمل بہت جلد شروع ہو گیا ہے اور اب سچ مچ کے ایسے ترقی پسند لکھنے والے میدان میں آرہے ہیں جو ہر قسم کے نتائج اور مقاصد سے بے نیاز ہو کر زندگی اور ادب میں حقیقی رابطے پیدا کر رہے ہیں۔ ان میں ہمارے کرم فرما جناب محمد حسن عسکری صاحب ایک خاص پایہ رکھتے ہیں۔ اُن کی بے نظیر قوتِ تجزیہ ان کے موجودہ افسانے "حرام جادی" میں اپنے عروج پر ہے۔ مگر یہ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں، ثریا کو کس نے ناپا ہے۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پلاٹ نہ ہونے کے برابر ہے لیکن افسانویت سارے مطالعے پر اپنے پورے زور سے چھا رہی ہے اور ایک اوسط درجے کی شریف عیسائی خاتون کی جُھٹے زندگی کو جس نشیب و فراز سے واسطہ پڑتا ہے، صاحبِ افسانہ نے اُس کی گوناگوں کیفیتیں اس باریکی سے دیکھی اور دکھائی ہیں کہ کمال پر اعجاز کا گمان ہونے لگتا ہے۔ صنفِ مقابل کی صحیح نفسیاتی تحلیل بہت کم فن کاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم جناب عسکری کو قابلِ مبارک باد سمجھتے ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ افسانہ پڑھنے کی چیز ہے۔ بعض جگہ صاحبِ مضمون ایک لفظ سے وہ کام لے جاتے ہیں جو ایک طویل فقرے سے بھی بمشکل نکل سکتا ہے۔ پھر ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ "حرام جادی" اس افسانے کا آخری لفظ ہے، اور ایک ہی بار استعمال ہوا ہے اور افسانے کے واحد کردار کو اس سے دور کا واسطہ بھی نہیں مگر جس ہنر کاری سے افسانہ نگار نے اس لفظ کی روایات اور ماحول کو افسانے پر مسلط کر دیا ہے، وہ داد کے قابل ہے۔ بوڑھی دائی کے جذبات کی ترجمانی کے لئے اس سے بہتر لفظ ملنا ناممکن تھا اور پھر سلاح اپنے تعصبات کی شہرت کر کے اسے اذنِ عام بلکہ القائے دوام دے دیتا ہے۔ عسکری کی ایک اور ممتاز خصوصیت اُس کا تصویری تخیل ہے جس کے کمالات آپ کو اس افسانے میں جا بجا بکھرے ملیں گے۔ وہ ایک غیر معمولی تلازمِ خیال کی مدد سے سینما کی سی تصویریں آپ کے سامنے لائے جاتا ہے اور آپ اس طلسم میں ایسے محو ہو جاتے ہیں کہ افسانے کا آخری لفظ ہی آکر آپ کو چونکاتا ہے۔ عسکری کی یہ شعبدہ کاری یقیناً بے مثال ہے۔

غالبِ مرحوم کا شعر ہے "سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی، تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا"۔ جواں بخت کے سہرے کی نسبت تو آج ایک صدی کے بعد یقینی طور پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے موتی واقعی سات دریاؤں سے فراہم کئے گئے تھے یا نہیں، لیکن مظفر احمد کے اس افسانے کے متعلق جو اشاعتِ زیرِ نظر میں "موتیوں کے ہار" کے عنوان سے شامل ہے کم و بیش یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس میں وادیِ گنگ و جمن کے کم از کم سات شہروں کے موتی منظوم کئے گئے ہیں۔ مظفر احمد صاحب پیشے کے لحاظ سے تاجر سہی لیکن طبیعت کے لحاظ سے صحیح معنوں میں فقیر دوست ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس کسی شہر میں جاتے ہیں سب سے پہلے مقامی فقیروں سے تعارف پیدا کرتے ہیں اور موجودہ افسانہ اُن کی اس فقیر دوستی کے بہترین نتائج میں سے ہے۔

اردو افسانہ نگاری میں ماورائی ادارۂ خیال کے کامیاب فن کار بہت کم ہیں۔ ہماری ذاتی رائے ہے کہ کرشن چندر کو یہ جوہر بڑی فراوانی سے عطا ہوا ہے۔ وہ انشا اور افسانہ کو اس خوبی سے ملاتا ہے کہ اس عمل کے نتیجے کو نہ کہانی کہا جا سکتا ہے اور نہ "ایسے" مگر لطف یہ ہے کہ اس امتزاجیہ مجموعے میں دونوں کی خوبیاں پوری شان سے جلوہ گر ہیں۔ کرشن چندر کے بعد اس میدان کا مرد مظفر احمد ہے۔ وہی ہمدردانہ اندازِ نظر، وہی تلخ ردِ عمل، وہی سرکشی اور بغاوت، وہی طنز اور مسکراہٹ،

اور پھر کردار نگاری میں جزئیات کا گہرا مطالعہ۔ یہ خصوصیات مظفر احمد کی تخلیقات میں بھی اُسی شدت سے پائی جاتی ہیں جس شدت سے وہ کرشن چندر کے ہاں موجود ہیں۔ مظفر احمد کے بیان میں مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی اُسے اور بھی دلکش بنا دیتی ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ خوبی انہیں اپنا ایک مستقل اسٹائل بنانے میں بہت مدد دے گی۔ زیر نظر افسانے میں مدن، بازیگر، اور بی جمیلی کردار نگاری کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ بی جمیلی سارے افسانے میں اگرچہ شاید ایک ہی فقرہ بولتی ہیں لیکن ان کا کردار جس میں نسائیت کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے افسانے کے نقطۂ عروج سے پورا پورا انصاف کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ سال مظفر احمد صاحب اپنے تاجرانہ مشاغل کے باوجود اپنی ادبی صلاحیتوں کو پھولنے پھلنے کا زیادہ موقعہ دیں گے۔ ادبی دنیا کے صفحات ان کے لئے کھلے ہیں۔

زندگی میں کتنی باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم پا کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ جیسے ہم نے اپنے آپ کو پالیا! شاید بے حد کم۔ ہماری جسمانی زندگی کا بیشتر حصہ ایسے مقاصد کی تکمیل میں گذرتا ہے جن سے ہماری روح کو بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ اگر جو زندگی کی پیچیدگیوں اور سماج کی سینہ زوریوں کی بدولت ہم پھنس دیتے جاتے ہیں۔ اس بارے میں شاید صنفِ نازک زیادہ مظلوم ہے۔ اور قربانیوں کے باوجود جو زندگی کا ایک حقیر سا مقصد حاصل کرنے کے لئے اس کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں۔ وہ اپنا آدرش حاصل نہیں کر پاتی۔ ہمارے فاضل دوست دھرم پرکاش صاحب آنند نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور ان کا بلند پایہ افسانہ "سایہ" اس گہرے مطالعے کا ایک کامیاب نمونہ ہے جو آنند صاحب کی فن کاری کا ایک نمایاں پہلو ہے۔

عاشق حسین صاحب بٹالوی اردو کے اُن چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو صاحبِ طرز کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کا داخلی اندازِ خیال بے شمار حملوں کا ہدف بنا لیکن از بسکہ وہ فن سے غداری کرنے پر کبھی تیار نہ ہوئے اس لئے آج بھی وہ اُسی دم خم سے اپنی روش پر قائم ہیں اور مخالفت قدرتی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ عاشق صاحب کا ہیرو بیشتر ایک حساس تعلیم یافتہ اور فکر مند نوجوان ہوتا ہے جسے زندگی کی دہلیز پر ہی افکارِ معیشت کے ساتھ ساتھ ترغیبِ جنسی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور یاد رہے کہ ہماری اوسط درجے کی معاشرت میں یہ ٹائپ کمیاب نہیں ہے۔ ان کے ہر افسانے کی روش ہیرو کی ذہنی کیفیت کا ساتھ دیتی ہے۔ ہیرو کی روحانی بلندی اس کی مادی ٹریجڈی کی بڑی حد تک تلافی کر دیتی ہے۔ موجودہ افسانے میں انہوں نے ایک نیا عنصر داخل کیا ہے اور وہ "قدرت کی گود" ہے جو اگر غور کیا جائے تو ہم سب کا آخری ملجا و ماویٰ ہے۔ انسان، صبحِ ازل سے آج تک قدرت ہی سے متاثر ہوتا رہا ہے اور اُس نے اپنے نفس کی تسلی کے لئے ہمیشہ قدرت ہی کا دامن ڈھونڈا ہے۔ دنیا کے ابتدائی مذاہب اور ہر قوم کی شاعری کو اس حقیقت کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

عاشق حسین عورت کو کبھی ایک خیالی درجہ عطا نہیں کرتے بلکہ وہ اس کی کمزوریوں کو اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ وہ اس کی رعنائی کا زیور بن جاتی ہیں۔ عورت ہمیشہ انصاف کے لئے چلاتی رہی ہے اور وہ اسے انصاف ہی پیش کرتے ہیں لیکن فقط انصاف، بے غرض اور بے لاگ انصاف اس سے زیادہ ذرہ بھر نہیں۔

عاشق صاحب کی زبان، حسنِ انتخابِ الفاظ، بیان کی حسین بندش اور ان کا متین اندازِ بیان اس معیار پر پہنچ چکا ہے کہ ہمارے ادیبوں کے لئے منزلِ مقصود کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر افسوس کہانے کی دشواریوں کے باعث بہت کم نوجوان اس طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

نرندر ناتھ صاحب بھی ادبی دنیا کے نئے رفیقوں میں سے ہیں۔ سیاسی اور اقتصادی مسائل پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے اور اس کے ساتھ اُن کا ادبی ذوق بھی کچھ کم درجہ نہیں رکھتا۔ ادبیات میں انہوں نے ایک ایکٹ کے ڈراموں کا خوب مطالعہ کیا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آج کل کے اقتصادی اور سیاسی مسائل کو بڑی خوبی اور سلیقے سے ادبی رنگ میں پیش کر سکتے ہیں۔ "ناکامی" اُن کی اس اہلیت کی ایک روشن مثال ہے اور ایک اوسط درجے کے تعلیم یافتہ ہندو گھرانے کے مسائل اور ہندو سوسائٹی کے دولتمند طبقے کے رجحانات کی ایک کامیاب تمثیل۔ ہم جس وقت اس ڈرامے کو پہلی بار پڑھ رہے تھے تو رومیش کا کردار مسودے کے صفحات سے نکل کر ہمارے سامنے کی کرسی پر آن بیٹھا تھا۔ وہ حقیقی زندگی میں بھی بسا اوقات شام کو اسی کرسی پر آ بیٹھتا تھا۔ مگر اب وہ ہم سے دُور ہے۔ اور شاید اپنے آدرش کی دنیا سے بھی دُور۔ اے کاش! اے کاش!!

مغربی افسانہ نگاروں میں سے جس فن کار نے ہماری موجودہ نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ فرانسیسی دیوِ ادب ماپساں ہے۔ ادبی دنیا میں ماپساں کے بہت سے بلند پایہ افسانے جناب طاہر قریشی کے سحر کار قلم کے واسطے سے ناظرین کے سامنے آ چکے ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے اس کا ایک نہایت دل آویز افسانہ "بوڑھا" پیش کیا ہے جو بڑھاپے کی نفسیات اور جوانی کی مشکلات کا ایک بے مثال مطالعہ ہے اور ماپساں کی باریک بینی اور حقیقت نگاری کا ایک بولتا ہوا مرقع۔ ادبی حلقوں میں ماپساں اور طاہر کے نام اب ایک ہی سانس میں لئے جاتے ہیں لیکن حسنِ اتفاق سے ادبی دنیا کے فاضل معاون جناب عطاء اللہ صاحب کلیم نے بھی اس دفعہ ماپساں ہی کا ایک اور معرکۃ الآراء افسانہ اپنے دلکش انداز میں ترجمہ کیا ہے "میں ہوں" "اپنی شکست کی آواز" در حقیقت ایک ایسا شاہکار ہے جس کی نظیر بہت کم افسانوی ادب پیش کر سکیں گے۔ پس منظر ایک گذشتہ فرانسیسی جرمن جنگ ہے جس میں جرمن غالب آ چکے ہیں۔ افسانہ نگار نے فرانسیسیوں کی مغلوبی کے اسباب اُن کے شخصی اخلاق کی پستی میں تلاش کئے ہیں اور اپنے بے پناہ طنز کی مدد سے فرانسیسی سیرت کی خامیاں اس خوبی سے واضح کی ہیں کہ پڑھنے والا تاثرات کے ہجوم میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ فن کار نے افسانے کے دسوں کردار ایسی چابکدستی سے ابھارے ہیں اور ان کی سیرتوں کا ایسا بے پناہ مطالعہ کیا ہے کہ کامیاب سے کامیاب ناول نویس بھی شاید اس سے بہتر نتائج پیدا نہ کر سکتا مگر اس کے باوجود یہ شاہکار مختصر افسانہ ہی رہا ہے اور اس کی فنی خوبیوں میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ ہم جناب کلیم کے انتخاب اور حسنِ نظر کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اپندر ناتھ اشک کی تمثیل "جونک" اس مجموعے کی شاید سب سے مقبول چیز ثابت ہوگی۔ اشک کو اس بات کی پروا نہیں کہ نقاد اُس کی نسبت کیا کہتا ہے۔ وہ عوام کے لئے لکھتا ہے اور اپنی تخلیقات میں سب سے زیادہ خیال اُسے عوام ہی کی پسند کا ہوتا ہے۔ اُسے اس بات سے کیا اگر کوئی کہے کہ اس ڈرامے میں کوئی گہرائی نہیں، تخیل کی کوئی پرواز نہیں، جذبات کی کوئی شدت نہیں، نہ ہو، اس کی بلا سے۔ وہ چیز تو ہے جسے پڑھ کر چھوٹے اور بڑے، دانا اور نادان فکر مند

اور بےفکر کے سبھی خوش ہو جائیں گے سبھی چیخ اٹھیں گے سبھی دیوانہ وار تالیاں بجانے لگیں گے مگر اشک کو یہ کھوکھل جاتا ہے تو اُسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں مگر چہ ایک تازہ خط میں اُس نے راقم الحروف کو لکھا ہے کہ اس کی شاید سب سے سنجیدہ اور فکر خیز تخلیق کونپل جو پچھلے سالنامے میں شائع ہوئی تھی، مخصوص حلقوں میں خوب قبول ہو رہی ہے اور اس کی کامیابی میں وہ اڈیٹر ادبی دنیا کو بھی بےسبب شریک کرتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں!

سید علی عباس حسینی کی مقبولیت بنا بریں کہ مدت سے سرزمین پنجاب کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہے، مگر ادبی دنیا کی محفل میں وہ آج پہلی ہی بار شریک ہوئے ہیں "بھوک" ایک مختصر مگر نہایت خیال افروز افسانہ ہے جس میں سید صاحب کی نگاہ دوربین نے سرمایہ داری کی پست ترین منازل کا نظارہ کیا ہے۔ افسانہ پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ داری صرف ایک اضافی چیز ہے۔ وہ بھکاری جس کی کل بضاعت مٹھی بھر چنے ہوں، اس نادار پر جس کے پاس یہ کچھ بھی نہ ہو سرمایہ دار ہی کی ویسی ہی فوقیت رکھتا ہے جیسی ایک لکھ پتی ایک غریب کلرک پر۔ بڑھیا بھکارن کی جنسی آمریت جوان مزدور سے بھی اسی طرح خراج لے کر رہتی ہے جیسے کسی بوالہوس کی دولتمندی کسی دوشیزہ کی مفلسی سے۔ سید صاحب کا روزمرہ اور شستہ طرزِ بیان محتاجِ تعریف نہیں۔

یاؔدشن بخیر سردار راجندر سنگھ بیدی جو اب ایک عرصے سے اپنی معروفیات میں غیر معمولی اضافہ کر چکے ہیں، آخر ادبی دنیا کی سالانہ محفل کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ لے کر آ ہی گئے۔ "بلراں اور پھل" عورت اور مرد کے نازک ترین نفسیاتی لین دین کی ایک نہایت صاف تصویر ہے۔ صاف اس لئے کہ افسانے کی بنیاد سوسائٹی کے نچلے طبقے میں رکھی گئی ہے ورنہ دیہانی طبقے میں تو یہ عاد و ستد خوفناک مضمونوں اور دلدوز آہوں میں ہی دب کر رہ جاتی ہے۔ بیدی جذبات کا نہایت زیرک تماشائی ہے اور پھر ان ذرّوں کی ترتیب سے وہ جیسے دلآویز گھروندے بناتا ہے کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ یہ ظاہر کہ کسی شبیریں زبان ہمدرد کے سامنے اپنا سینہ چیر کر رکھ سکتا ہے لیکن گورمی کی سُرخ واسکٹ پہن کر سونے کی بات وہ کبھی تسلیم نہیں کرے گا مگر اُسے کیا خبر کہ دنیا میں بیدی جیسے غماز بھی ہوتے ہیں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ یہ محفل سجا کر اب آپ سے رخصت ہوتا ہوں، کاش کہ یہاں وہ چہرے بھی نظر آتے جن کی مجھے تلاش ہے لیکن اس اشارے کو کون سمجھے گا؟ عصمت چغتائی کہ محمد علی چودھری؟

صلاح الدین احمد

(۲)

"ادبی دنیا" اور اس میں لکھنے اور اس کے پڑھنے والوں کو نیا سال مبارک ہو لیکن آیئے ذرا ہم دیکھیں کہ گئے سال میں کیا کچھ ہوا، تاکہ سوچا جا سکے کہ نئے سال میں کیا کچھ ہمارے سامنے ہے۔ گزشتہ دو سال سے حصۂ نظم میں خصوصاً ایک خاص رجحان کو قائم رکھنے کی جو کوشش شروع کی گئی تھی گئے سال اس پر نسبتاً زیادہ پابندی سے عمل ہوا لیکن اس کامیابی کے ساتھ ساتھ بعض ایسی باتیں بھی ہوئیں جو مجھے انتخابِ نظم کے متعلق دو ایک اشاروں پر مجبور کر رہی ہیں۔ "ادبی دنیا" کا انتخابِ نظم جدید رجحانات کی طرف مائل ہے خواہ یہ نئی خصوصیات ہیئت میں ہوں یا موضوع میں۔ اور اسی لئے بعض ایسی اچھی چیزیں بھی شائع نہیں کی جاتی رہیں جو فنی لحاظ سے تو پختہ تھیں لیکن اکثر ان کا مطلب ان کی قدامت ہوا۔ اس سلسلے میں زیادہ مشکل غزل کے میدان میں رہی کیونکہ ایسی غزل جس میں خوبیوں کے ساتھ کوئی نئی بات بھی ہو بہت کم لوگوں کا حصہ ہے ——

ایک ماہنامے کے انتخاب کو یوں محدود کر لینے پر انگشت نمائی کی جا سکتی ہے لیکن یہ حد بندی جہاں وقت کے رنگ یعنی زندگی اور عہد موجود کی شاعری کی ترقی کے لئے کی گئی تھی، وہاں اس سے ایک اور مقصد بھی تھا! اور وہ یہ کہ اردو زبان کے اتنے بے شمار ماہناموں میں کسی بھی مجلے کے کارپردازوں نے اپنی پیش کش کے لحاظ سے کوئی خاص اصول وضع نہیں کر رکھے (اگرچہ اب اس سلسلے میں ایک دو استثنیٰ قائم ہو چکے ہیں) —— عموماً ہر رسالہ ہر اچھی (بلکہ ہر اچھی بُری) چیز کو شائع کر دیتا ہے بس صورت حال کے مدِ نظر بہت کم رسائل ایسے ہیں جن کی انفرادیت کم از کم نظم کے لحاظ سے نمایاں نظر آتی ہو۔ اگر رسائل کے سرورق پر "علمی" اور "ادبی" کے الفاظ کو بے سوچے سمجھے نہ لکھا جائے اور ہر رسالے کے لئے رہنمائی کے چند اصول معین کر لئے جائیں تو اس سے رسائل اور ان کے قارئین دونوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ رسائل اظہار و ترجمانی کے علاوہ ادب کی تزئین و آرائش کا ذریعہ بھی ہیں محض تجارتی کباڑ خانے نہیں ہیں۔

گزشتہ پانچ سال میں اردو ادب میں سب سے زیادہ توجہ کے لائق جو تحریک چھڑی ہے وہ ترقی پسند ادب کا نظریہ ہے لیکن پروفیسر فیض احمد کے ایک عنوان سے الفاظ مستعار لیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اس خواب کو کثرتِ تعبیر نے پریشان کر دیا ہے۔ اس تحریک کے اولین علم برداروں کی پہلی اور بنیادی غلط فہمی یہ تھی کہ انھوں نے ترقی پسند ادب کو محض اشتراکی جمہوریت کا ہم معنی سمجھا اور یوں صرف ایک نئی قسم کے اذیت پرستانہ ادب کے محرک بن کر رہ گئے، حالانکہ ہر اس ادبی تخلیق کو ترقی پسند کہا جا سکتا ہے جو خیال انگیز ہو اور جو اپنی ذہنی اور جسمانی زندگی کے کسی شعبے میں ہمیں ایک قدم آگے بڑھ جانے پر مجبور کرے۔

چنانچہ "ادبی دنیا" کے حصۂ نظم میں بھی ترقی پسندی کا یہی مفہوم مشعلِ راہ رہا ہے اس وقت اس بات کا موقع نہیں ہے کہ مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں کئے گئے کام کا جائزہ لیا جائے، اس کام کی طرف یہ ایک دو اشارے ہی کافی ہیں، البتہ موجودہ سالنامے کے حصۂ نظم پر ایک نظر ڈالنا برا نہ ہوگا، کیونکہ یہ سالنامہ جہاں "ادبی دنیا" کے

گزشتہ سال کی آخری منزل ہے وہاں پہلے سال کی نئی منزل بھی ہے۔

یوں تو وقت کا گزرنا ہر سوچ سمجھ والے انسان کے لئے غور و فکر کا موجب ہو سکتا ہے لیکن دو سال کے چند درمیانی لمحوں کو وقت کی رفتار کا ایک استعارہ ہونے کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ زیادہ غور طلب ہیں۔ نئے سال کا پہلا دن کچھ اس قسم کی کیفیت کو ہمارے ذہن میں لاتا ہے کہ "ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے۔ کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی" ۔۔۔۔ بھیدوں سے بھرپور گھٹا میں بجلی چمکتی ہے ۔۔۔۔ یوں ہی پُراسرار وقت کی گھٹا میں نئے سال کا آنا اور گئے سال کا جانا ایک چمک سی ہے۔ قیوم نظر نے اپنی نظم "نیا سال" میں اسی مبہم حرکت کی کیفیت کو لفظوں میں گرفتار کیا ہے "گئے سال" کا لازمی نتیجہ "نیا سال" اور نئے سال سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال جا چکا ۔۔۔۔ ان دونوں کا ساتھ ہے، شاید اسی لئے نظم کا موضوع اگرچہ گیا سال ہے لیکن عنوان نیا سال اور اس پیچ نے پیش کش میں ایک مستزاد دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ ایک اور بات بھی غور کے لائق ہے کہ نظم کی ہیئت نظم سے ہٹ کر گیت کی طرف مائل ہے۔ شاید یہ اس کا اثر ہو کہ شاعر ذہنی طور پر ان پھسلتے ہوئے لمحوں سے متاثر ہو کر ایک نغمہ الاپنا چاہتا ہو، لیکن اس کے دل کا سوچنے والا پہلو اسے نظم کہنے پر مجبور کر رہا ہو۔

سالنامے کی پہلی نظم یوسف ظفر کا "ایک گیت" ہے۔ گیت کا موضوع وصل ہے، وہ سنجوگ جس میں برہا کی تلخیاں بھول چکی ہیں، اس قدر کہ راگی کا غمگین گیت ہی اس کی یاد دلاتا ہے کہ کبھی دکھ بھی سہا تھا لیکن اب وہ باتیں ایک ڈراؤنا سپنا بن کر رہ گئی ہیں ۔ افسانہ بن کر رہ گئی ہیں ۔۔۔۔ شعرا اپنے کلام میں عموماً اور گیتوں میں خصوصاً ہجر کے مصائب ہی کا رونا روتے ہیں لیکن اس گیت کا شاعر زندگی کا ترجمان ہے۔ زندگی میں فراق کے ساتھ ہی ساتھ وصل بھی ہے۔ اور اگر وصل حاصل ہو تو فراق کی بجائے سکھ کی سیج کا گیت اسے قدرتی اور بیتے دکھ کا نغمہ قابلِ فراموشی معلوم ہوتا ہے۔ البتہ وہ اپنے دل کے ان خوش گوار احساسات کو عورت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ شاید یہ من تو شُدم کا اثر ہو شاید یہ گیت کی ہندی روایات کا غیر شعوری نتیجہ ہو ۔۔۔۔ کون کسی کی جانے ہے ۔۔۔۔ ہاں، مجھے تو محسوس ہوتا ہے، کیا آپ کی بھی یہ کیفیت ہے؟ ۔۔۔۔ اس وصل کے گیت میں اردو ادب کے موجودہ رجحانات سے متعلق بھی بعض ٹکڑے ہیں' ۔۔۔۔ نئے دیئے ہیں روشن، نئے ہیں اب پروانے ۔۔۔۔ چھیڑ نہ راگ پرانے! ۔۔۔۔ گیت میں موسیقی اور مفہوم کا جو نفیس امتزاج ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس گیت کو گا کر اس امتزاج کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے!

تابش صدیقی، مہدی علی خاں، اور میراجی سالنامے میں آزاد نظم کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

تابش کی دونوں نظموں میں ایک ہی کردار ہے۔ جو اپنی بے خبر محبوبہ پر اظہارِ حقیقت کا ارادہ رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے دونوں نظمیں موضوع کے لحاظ سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی ایک ہی بحر میں ہیں، کیونکہ شاعر کے ذہن پر ایک ہی کیفیت طاری ہے، اظہارِ حقیقت کی دونوں نظموں میں واقعات کی جن صورتوں کو پیش کیا گیا ہے وہ آجکل کے زمانے میں عام نہیں تو نادر بھی نہیں ہیں۔ زیبِ داستان کے عناصر سے قطع نظر تابش کی ان تخلیقات میں جو سیاسی اور سماجی حقائق موجود ہیں، اگر ان پر سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ آئندہ چل کر وہ ایک خطرے کی صورت میں ظاہر ہوں۔

راجہ مہدی علی خاں کی دو نظمیں معرّا (بلینک) اور باقی چار آزاد۔ مہدی علی خاں کا تخیل چینی یا جاپانی شاعری کی نزاکت کا حامل ہے اور نظموں کا اختصار بھی ان ممالک کی شعری صورتوں سے مماثلت رکھتا ہے۔ ان نظموں میں احساس کی نفاست اور نئی کیفیت انگیز ہے۔ نیز ان کا شاعر ایک ایسا عاشق ہے جو فن کار بھی ہے اور اپنی خیالی دنیا میں کھوئے ہوئے اس کی تمام تر توجہ صرف اپنی محبوبہ اور بیتی یادوں پر مرکوز ہے۔ **"کلرک کا نغمۂ محبت"** شاعری میں حقیقت پرستی کی مثال ہے۔ لیکن شعریت بھی اس میں ہلکے ہلکے کنایوں کی طرح موجود ہے نظم آزاد ہے لیکن خیال پر جگہ جگہ بے ساختہ قوافی پابندی بھی عائد کئے جا رہے ہیں۔ پلاٹ کے لحاظ سے یہ نظم مختصر افسانے سے ملتی جلتی ہے جس میں تصوّرات کے تنوّع کے باوجود وحدتِ تاثر شروع سے آخر تک قائم ہے۔ آخری حصے اور آخری مصرعوں کا مقام عروج اس بظاہر بیانیہ نظم کو ایک ایسی تلخ حقیقت کا ذریعۂ اظہار بنا دیتا ہے۔ جو اگرچہ ازل سے اس دنیا میں موجود ہے لیکن جس پر گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد سے ہی باقاعدگی کے ساتھ غور کیا جانے لگا ہے۔

روشن دین تنویر اپنی نظموں میں اکثر ایک ذہنی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ اور مظاہرِ فطرت سے اس کی دلبستگی ہر نظم میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اور ان ہی مظاہرِ فطرت سے وہ ایک استعارہ سا قائم کر لیتا ہے۔ مظاہرِ فطرت انسان کی توجہ کے قدیم ترین مرکز ہیں اور یہ قدامت ہی تنویر کی نظموں میں بہ نظرِ اوّل ایک بوسیدگی کا احساس دلاتی ہے لیکن اس کی انفرادیت اس کا متعین سا اندازِ نظر اور اس کی فن کاری آخر میں اس قدامت کو تجدید میں بدل کر رکھ دیتی ہے "انتظار" اور "پہاڑی ندی" کو انہی زاویوں سے دیکھئے۔ سب سے پہلی قابلِ توجہ چیز اس میں بحر ہے، اک خاک کا ڈھیلا مفعول مفاعیلن امید میں بیٹھا ہوں مفعول مفاعیلن ۔۔۔۔ بحر ہی میں گویا یہ کیفیت ہے کہ ۔۔۔۔ اٹھتا ہوں، اٹھتا ہوں ۔۔۔۔ لیکن کیسے اٹھوں! ۔۔۔۔ یوں کہئے کہ ہر مصرعے کا ابتدائی حصہ اٹھنے کی کوشش سی ہے اور آخری حصے کی گرتی ہوئی کیفیت اس تکان کو ظاہر کرتی ہے جو اس منظر نامے پر چھائی ہوئی ہے ۔۔۔۔ "پہاڑی ندی" کا پہلا مصرع مخاطب کرنے کے لئے ایک للکار ہے اور پھر شاعر جیسے کسی کو کچھ سمجھا رہا ہو۔ شاعر کو تحریک ہوتی ہے ندی کے بہاؤ سے

کنارے پر بیٹھا وہ ندی کے بہاؤ کو دیکھ رہا ہے، وہ اس بہاؤ کا جوش اور تندی اچانک اُسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ اس سرگرم مسافر کو ایک لمحہ رُک کر آس پاس کے مناظر کو ایک نظر دیکھ کر یہ سوچنے کے لئے کہے کہ دیکھ تو کن چیزوں کو پیچھے چھوڑے جاتی ہے لیکن ندی گویا اس کے بیان۔ اس کے دلائل کو نہیں سنتی۔ ان کی طرف ایک پل کو بھی توجہ نہیں دیتی۔ اور اس کا یہ انہماک شاعر کے ذہن کو پلٹا دیتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ ندی کو اپنی بات کا قائل کرے۔ ندی کا اٹل اصرار اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس کا دل بھی بے تاب ہو جاتا ہے۔ اسے اس بات کی جستجو ہو جاتی ہے کہ کھلے میدان میں کیا کچھ ہوگا۔ مانا کہ "دلکش ہیں پہاڑ کے نظارے" لیکن میدان اسے بھی کھینچتا ہے۔

عباس بیگ محشر بھی تنویر کی طرح ندی کے کنارے کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہے۔ شاید یہ وہی ندی ہے جو پہاڑ سے چل کر میدان میں آن پہنچی ہے۔ شاید کی شاعرانہ روح اب محشر کے قالب میں منظر پر غور کر رہی ہے لیکن وہاں ندی ایک محشر تھی شاعر تنویر تھا۔ یہاں میدان میں ندی تنویر ہے اور شاعر محشر لیکن شاعر کا نام محشر ہے اس کے دل میں منظر کا اثر سکون و کیف کی صورت میں چھایا ہوا ہے محشر کے بیان میں ایک ایسی نزاکت اور نفاست ہے جو اس کے احساسات کا اظہار کر رہی ہے۔ ان احساسات کا جو اس کے دل میں ماحول نے پیدا کر دیئے ہیں۔

خیال ہے کہ اردو شاعری میں غالب ہی نے سب سے پہلے حواس کی الجھن کو پیش کیا اور اسے "شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ" نظر آیا اور "رشتۂ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب" دکھائی دیئے۔ موجودہ دور میں عابد علی عابد کی اس اختلاط حواس کا ممتاز ترجمان ہے۔ غالب ہی کی زمین میں اس کا یہ شعر مجھے نہیں بھول سکتا کہ "ساز کی آواز پر دھوکا ہے موجِ رنگ کا، پھول کی رنگینیوں پر اشتباہِ نغمہ ہے"۔ موجودہ نظم "کیفیت" میں بھی ایک ایسی ہی ذہنی حالت کو پیش کیا گیا ہے لیکن یہ حالت بہ نسبت بصارت ہے۔ اسی تخصیص نے شاید غزل کی ہیئت میں نظم کا رنگ ابھارا ہے۔ اگرچہ اس مصرعے میں کہ "رنگ کے لوچ میں ہے راگ کا اوج ——— شاعر سماعت کو بھی بروئے کار لے آیا ہے اور آخری شعر میں جب "سبز رنگوں کی مہک آنے لگی ہے" تو حسِ شامہ بھی جاگ اٹھی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کی توجہ کا مرکز نظارہ ہے[1]۔

محمد عظمت اللہ کی ایک نظم ہے "دل روٹھ کے آتا ہے۔ دل روٹھ بھی جاتا ہے" ——— عظیم قریشی محبت کے اسی نفسی پہلو کو ایک اور رنگ میں پیش کر رہا ہے "نفسیات" نظم ہے، اور پابند لیکن ہیئت میں ذرا سے سلیقے سے اسے گیت کا انداز حاصل ہو گیا ہے مگر یہ انداز مبہم ہے، واضح نہیں۔ جو عاشق اس نظم کا ہیرو ہے۔ وہ اردو کے روایتی عاشق کی طرح خودداری کو خیرباد نہیں کہہ چکا۔ اسے اس بات کا احساس ہے کہ دل گرفتگی کی کیفیت اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک صحیح اور مناسب موقع پر دلداری بھی شروع ہو جائے، ورنہ یک طرفہ آگ بے اعتنائی کے مسلسل اور متواتر جھونکوں سے بجھ جایا کرتی ہے لیکن شاید نفسیات کی مفکرانہ سرخی کے باوجود یہ سب باتیں تصور ہی کا کرشمہ ہیں۔ اسی تصور کا جس کے متعلق ......

...... **علی منظور** کہتا ہے کہ دنیا میں مجھے اور کوئی شے ملے یا نہ ملے تصور کی دنیا کا باشندہ بن کر میں زندگی آسانی سے گزار سکتا ہوں ....

.... اور یہی تصور **تخت سنگھ** کو ایک "بھولی بسری رات" کی یاد دلاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر اس گزری ہوئی رات کے سمے کو ایک ڈولتی ہوئی رفتار سے ہماری نظروں کے سامنے لاتا ہے۔ اس کا تخیل بعض ایسی خصوصیات کا حامل ہے جو دلشینو شعراء میں پائی جاتی ہیں شاید وہ ہندوستان کے سب سے بڑے آخری دلشینو شاعر ٹیگور سے متاثر ہے۔ اس نظم میں جو ماحول پیشِ نظر ہے وہ ٹیگور کے بنگالی تصور سے بہت ملتا جلتا ہے۔ نرمی۔ نزاکت۔ گداز ——— یہ تین چیزیں اس نظم میں نمایاں ہیں۔ گزری ہوئی باتوں کی یاد میں بھی تو تین ہی چیزیں نمایاں ہوتی ہیں۔

مراتب علی تائب بھی اسی طرح رات کی بجائے ایک گزری ہوئی شام کی یاد تازہ کر رہا ہے لیکن اگرچہ وہ "دسیل" سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر آخر میں دعوتِ شوق دیتا ہے۔ مگر محبوب کو یوں بلانے میں نرمی یا گداز نہیں ہے معلوم نہیں یہ اس کی وجہ شاعر کی انفرادیت ہے یا کہستان کی سطح مرتفع سے بھی بلند تر پتھریلی سرزمین۔ اسی طرح کہستان کی ہیبت اور وقار کا جو پرتو اس نظم میں جھلک رہا ہے وہ بھی اکتسابی نہیں اور یہی ہے شاعر کی اپنی انفرادیت کا عکس ہے تمام نظم اگرچہ ساکن زندگی اور ٹھہرے ہوئے منظر کا مطالعہ ہے لیکن اس میں حرکت بھی ہے۔ یکسر ساکن نہیں ہے "لہلہاتے ہوئے اشجار کو نیند آئی ہے" ——— ہاں اس حرکت میں بھی نیند مائل بہ سکوت ہے "پریشان ہوا کا سکوت مترنم ہے" لیکن اس کے باوجود ایک شورش کدۂ سرمست نظر آتا ہے۔ اور یہ ساکن زندگی ہمیں کس قدر ساکن نظر آتی ہے جب شاعر ان کے متعلق کہتا ہے کہ "یہ وہ لعبت ہے جسے طاقتِ پرواز نہیں"۔

بیان کے لحاظ سے بھی بعض اچھوتی باتیں اس نظم میں موجود ہیں۔ مثلاً اڑتے ہوئے بادل کو "شاہدِ حسن کا گیسوئے مسلسل" کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک جگہ شاعر کو "فطرتِ موجود" میں بھی "نظر آتا ہے کسی گلشنِ نابود کا رنگ" ——— یہ منفی تصور اگرچہ فرانسیسی شاعر میلارمے کے ہاں واضح صورت میں موجود ہے لیکن غالب اُس سے بھی پہلے ایسی بات کہہ چکا ہے مثلاً "ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج، میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں" اور معاف ——— بیہودہ گوئی میں ناصحانِ عزیز دل بدستِ نگار مے نمادہ رکھتی ہیں ——— اسی نہ رہے گئے دل اور نہ بنے ہوئے گلشن کی طرح تائب کا گلشنِ نابود بھی ایک ایسا باغ ہے جو کبھی کہیں موجود نہ تھا۔

[1] عابد ہی کا ایک اور شعر یاد آگیا "نگ و نغمہ کے سوا رکھا ہے کیا عابد کے پاس، ہزار داں نغمہ ہے افسانہ خوانِ رنگ ہے۔" (م)

"رات کی بات" میں مختار صدیقی ایک داستانِ رومانی کے صرف ایک ورق کی جھلک دکھا رہا ہے۔ پہلے مصرعے ہی میں وہ ہمیں بجا طور پر اس مختصر افسانے (بلکہ ایک منظر کہیے) کے آخری حصے سے روشناس کرتا ہے کیونکہ یہیں سے تحریکِ شعری ہوتی ہے۔ اور پھر پہلے اور بعد کے چند مصرعوں میں جو کچھ بیان ہوا ہے۔ وہ سب کچھ ایک لمحے میں اس کے ذہن میں گزر جاتا ہے لیکن ہمیں چاہیے کہ نظم کے پلاٹ کو سمجھنے کے لئے ذرا باقاعدگی سے چلیں۔ تو یوں جانیے گویا ایک عاشق (اس نظم کا شاعر) اپنی محبوبہ کی آمد کا منتظر ہے لیکن ایفائے وعدہ میں دیر ہو رہی ہے ——— زرد بیتابی کر اٹھ اٹھ کے نظر بیٹھ گئی ——— گھر تاریک نظر آ رہا ہے ——— اچانک چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے ——— اور عاشق کو معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ ایفا ہوا ——— یہ قصہ ہے۔ اور یہ بات ہے رات کی لیکن پہلے اور دوسرے مصرعے کے درمیان شاعر کا ذہن پلٹا کھا جاتا ہے اور اس کے باوجود کہ اب اس کی توجہ آنے والے کی طرف ہے۔ ایک لمحے ہی میں وہ اپنے پہلے انتظار کے لمحوں کا جائزہ لے لیتا ہے۔ جب اس کا غم خانہ تاریکی سے عبارت تھا چھاگل کی صدا آتے ہی اسے یہ محسوس ہوا گویا بھیگتی رات جواب جانے کو تھی اور جس کے بعد ایفائے وعدہ کے بغیر صبح ہو جاتی تھی۔ اچانک ٹھٹھک کر رہ گئی ہے یہاں فن کار نے عاشق کے احساس کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ پہلے انتظار کے لمحے گزرتے جا رہے تھے۔ رات ختم ہوتی نظر آ رہی تھی لیکن اب وقت گویا ٹھہر سا گیا ہے' اب وقت کے گزرنے کا احساس نہیں رہا۔ صرف یہی احساس باقی ہے کہ "وہ آ گئی"۔ لیکن اتنی دیر کیوں کی؟ شاعر اپنی محبوب کو دیکھتے ہی جان لیتا ہے کہ اتنی دیر کیوں کی۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ سو کے سے اٹھ کر آئی ہے۔ ماتھے کی بندی ذرا پھیل گئی تھی آنچل سر سے ڈھلکا ہوا تھا۔ لباس شکن آلود تھا ——— ان سب باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس انتظار میں اس کی آنکھ لگ گئی تھی کہ گھر کے لوگ سو لیں تو چھپ کر نکل چلے۔ قصبے میں گھر والوں کی موجودگی ایک اور مصرعے سے بھی ظاہر ہے "چوڑیاں ہاتھوں میں تھامیں چلی ہو لے ہولے" ——— آنکھ تو لگ گئی لیکن کچی نیند میں اچانک وعدے کا خیال آیا بستر سے اٹھی' احتیاط کے ساتھ گھر سے نکلی۔ باہر آسمان پر تارے دمک رہے تھے۔ اپنے چاہنے والے کے گھر پہنچی تو ابھی دروازے کے باہر ہی تھی کہ ایک شوخ خیال ذہن میں آیا۔ اب تک وہ نہایت محتاط انداز میں چلی آ رہی تھی۔ اب اس کے تصور نے شاید اپنے منتظر عاشق کو دیکھا جس کی امید کے مایوسی میں بدل جانے کا خطرہ بھی تھا۔ اچانک جانا درست نہیں' عورت کے دل میں شادیٔ مرگ کے نہ جانے کیا کیا وہم آئے ——— اس نے چوڑیاں چھوڑ دیں۔ پاؤں زور سے رکھا تو چھاگل بھی بج اٹھی ——— اب کوئی خطرہ نہیں ایک طرح کی اطلاع دی جا چکی ہے۔

اس نظم کا شاعر بھی ہمارے پرانے شعراء کی سی قسمت کا مالک نہیں ہے۔ اس کی محبوب اُسے ملنے آتی ہے۔ جیسے رادھا کرشن سے ملنے آیا کرتی تھی ——— ہماری سماج میں آزادی کی نئی صورتوں کا ایک خوش گوار عکس اس نظم میں ہے، اب شاعر فراق کی بجائے وصل کے نغمے گایا کریں گے۔

لیکن المیہ کے مشتاق ناامید نہ ہوں، سلام مچھلی شہری کی نظم "اب کی عید میں" موجودہ سماج کے ایک اور عاشق کا افسانہ پیش کرتی ہے۔ اس عاشق کی مسرت میں اقتصادی دیوار حائل ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر اسے توڑنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اس کی نفسی قوت میں ایک ایسا ڈھیلا پن محسوس ہوتا ہے کہ اس کا یہ ارادہ پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ ——— سادگی اور حقیقت پرستی اس نظم کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ محاکات کے لحاظ سے بھی اس کا درجہ اونچا ہے۔

مجید امجد بھی "خودکشی" میں ایک چاہت کی ناکامی کا افسانہ ہی بیان کر رہا ہے لیکن یہ افسانہ دہرا ہے۔ اس میں ایک عاشق خودکشی کے ایک واقعے سے تحریک لے کر اپنی محبوبہ کو خودکشی کی دعوت دے رہا ہے۔ اس تحریک کی علت کا سراغ ہمیں تمام نظم میں کہیں نہیں ملتا لیکن اس اغلاق میں بھی ایک مبہم سی وضاحت موجود ہے۔ ہمارا ذہن خود بخود یہ اندازہ لگا لیتا ہے کہ شاعر اور اس کی محبوبہ مستقل طور پر مل نہیں سکتے۔ اس لئے وہ زندگی سے اپنا دامن چھڑانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ جس حادثے سے انھیں خودکشی کا خیال آتا ہے۔ اس کی وجہ بھی شاید یہی ہو گی ——— نظم کا یہ کنایہ بہت خوب ہے۔

"رات کی بات" ——— "اب کی عید میں" ——— اور "خودکشی" ——— ان تینوں نظموں میں جس انداز سے شعراء نے افسانے کو سمویا ہے۔ اس سے ہم یہ بھی جان سکتے ہیں کہ اردو مثنوی کن ارتقائی منازل سے گزر رہی ہے نیز اس کا مستقبل کیا ہو گا۔

فیض احمد "انتباہ" میں پکار کر کہہ رہا ہے "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" ——— کس کے لب؟ شاعر کا مخاطب کون ہے؟ ——— نظم کو سمجھنے کے لئے اس کی تلاش ضروری ہے۔ آہن گر کی دکان میں جو زنجیر تیار ہو رہی ہے وہ سمجھاتی ہے کہ شاعر کا مخاطب کوئی قیدی ہے لیکن زنجیر کو تو ابھی تیار ہونا ہے۔ وہ مخاطب قیدی نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص آزاد ہے لیکن اس کی آزادی خطرے میں ہے "جسم و زبان کی موت سے پہلے" ——— یہ مصرع ظاہر کرتا ہے کہ عنقریب اس شخص کی نقل و حرکت اور تقریر پہ پابندی عائد ہو جائے گی۔ اور اسی خطرے سے اسے شاعر آگاہ کر رہا ہے ——— لیکن کیا اس نظم کا موضوع وہ شخص ہے؟ ——— کہیں آہن گر کی دکان ہی تو اس نظم کا موضوع نہیں؟ ——— اس صورت میں قصہ یوں ہو جائے گا۔

شاعر دکان پر بنتی ہوئی زنجیروں کو دیکھتا ہے۔ ایک نہایت معمولی سا واقعہ! لیکن شاعر محبِ وطن ہے۔ ان بنتی ہوئی زنجیروں کو دیکھ کر اس کا تخیل اسے کہتا ہے کہ یہ پابند

کر دینے والی چیزیں وطن کے کسی مجاہد کے لئے تیار ہو رہی ہیں اور تصور میں اس کے سامنے وہ مجاہد آ جاتا ہے، وہ مجاہد کو للکار کر کہتا ہے کہ جب تک "تو آزاد ہے سچ زندہ ہے" —— تیری گرفتاری تیری نقل و حرکت اور تقریر پر پابندی عائد کر دے گی۔ اور وہ سچ کی موت ہوگی اس لئے "بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے —— بول کہ لب آزاد ہیں تیرے!"

یہ تمام شعراء شہری ہنگاموں سے تحریک لے کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے لیکن قیوم نظر "خلش" تاثرات میں اس ماحول سے دور لے جاتا ہے۔ شاید وہ ان ہنگاموں سے تنگ آیا ہوا ہے۔ اور اسی لئے اس کے دل کو سرسبز پہاڑ بھاتے ہیں جہاں چیل کے درختوں کا جنگل دور تک دکھائی دیتا ہے، جہاں بھیڑوں کا گلہ بارش میں تھا۔ ساتھ ہی جہاں قریب ہی کوئی جھیل ہے جس کی سمت سے تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ مرغابی کی آواز آ رہی تھی اور جہاں گہری شام کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی ہر شے پہ چھا رہی ہے۔ شہروں کے اکتا دینے والے ماحول سے رہائی حاصل کرنے کو شاعر اس پرسکون ماحول میں پہنچا تھا۔ اس وادی میں جہاں ہر ذرہ دوسرے ذروں سے ہم آہنگ ہے لیکن شاعر کو یہاں بھی سکون کلی نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے دل کی خلش دور نہیں ہوتی شاید اس کے اپنے پچھلے پرانے اور اس موجودہ ماحول کا باہمی تضاد اس کے ذہن پر ایک گہرا اثر کرتا ہے اور اس جہانِ فطرت کا سکون اس کے دل کی بے تابی اور خلش کو مٹانے کی بجائے اسے اور مضطرب کر دیتا ہے۔ اور یہ گہری شام اور اس کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی اپنے تاثر کی خلش اس کے دل میں پیدا کر دیتی ہے۔

حیات بعد الممات احمد ندیم قاسمی کی نظم کا موضوع ہے۔ اور یہی موت کے بعد کی زندگی اس کی نظم میں "ازلی مسرتوں کی ازلی منزل" ہے۔ نظم میں وہ دو منظر پیش کرتا ہے۔ ایک سمندر کا سین (اور یہی سمندر آنے والی دنیا ہے) اور دوسرے دریا کا منظر جہاں ناؤ پر ایک لڑکی کھڑی ہے۔ یہ لڑکی اس نظم کا شاعر ہے ہماری اس دنیا کا انسان ہے۔ نظم میں ہر شے کا بیان مختصر لیکن واضح ہے۔ سمندر کے تمام بیان پر ایک دھندلکا سا چھایا ہوا ہے کیونکہ وہ اگلی دنیا ہے۔ اس میں پہنچی ہوئی بے شمار روحیں "پتلے سایوں کا ایک جمگھٹ" ہیں جو معبودِ ازلی و ابدی کی پرستش میں مصروف ہے۔

یہ نظم تخیل پرستی کے عکس کی ایک نفیس تخلیق ہے لیکن شاعر نے جو فن کا بھی ہے حقیقت پرستی سے وہیں تک گریز کیا ہے۔ جہاں تک اسے اپنے تصورات کی تزئین کے لئے ضرورت تھی۔

سعید احمد اعجاز کی نظم "پھرتا ہوں آوارہ سا" ایک تلاش ہے۔ ایک جستجو جنسی ہے جنسی یوں کہ ہر بند میں شاعر نے کسی نہ کسی نسائی پیکر کا ذکر کیا ہے سہاگن دوشیزہ حُسن کے خنداں ہونٹ، اور پھر دوشیزہ —— اور جستجو یوں کہ ہر بند میں شاعر نے اپنی ہستی کو ایک ایسی چیز سے مماثلت دی ہے جس میں کوئی نہ کوئی نسائی ہستی کھوئی ہوئی ہو یا اس سے اس کا تعلق ہو، کوئل کے نغمے کو سہاگن سن رہی ہے۔ پانی کا موج دوشیزہ کے پاؤں چوم رہا ہے شاعر کے شیشے کو حسن کے خنداں ہونٹوں سے نسبت ملی ہے اور کرنوں کے قافلے پر ایک دوشیزہ کی تمام توجہ مرکوز ہے ان تمام تصورات کے شاعر کے تطابق کا تواتر ہمیں اس شک میں ڈالتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی میں ایک خلا ہے اور اسی بنا پر اسے اپنی حالت ان چیزوں کی سی محسوس ہو رہی ہے جو مختلف نسائی پیکروں تک پا تو لیتی ہیں لیکن وہ مستقل طور پر ان کو حاصل نہیں کر سکتیں۔ ان کا یہ تعلق پائدار نہیں ہوتا اصلیں شاعر کی زندگی بھی غیر یقینی ہے اور چھلتی ہوئی باتوں کی طرح ڈانواں ڈول رہی ہے۔

کسی شہر میں ایک نوجوان رہتا تھا۔ اسی شہر میں ایک عورت بھی رہا کرتی تھی جو اس کی محبوب تھی (یا بن گئی) اس کے گھر کے رستے سے گزرا کرتا تھا۔ اس راستے پر اونچے مکان محلوں کی شان سے استادہ تھے اور ان اونچے مکانوں کی چھت سے لٹکی ہوئی لہراتی ساریاں اس نوجوان کو دکھائی دیا کرتی تھیں۔ ایک روز ایسی ہی ایک ساری محبوبہ کے مکان سے بھی آویزاں دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر عاشق کے ذہن نے ایک سلسلۂ حرکت کی بدولت ساری کا ڈھلنا اور اس کے پہننے والے کا نہانا کچھ لازم ملزوم سا ہے۔ اس خیال نے اس کے تصور میں غسل خانے کے گپت بھون کا دلکش منظر پیش کر دیا لیکن نہانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ اس خیال نے رقابت کو جگا دیا اور پھر تخیل اور بیداری کے خواب ہی اس سلگی ہوئی آگ کو بجھا سکے —— ان تمام باتوں کو زمانہ گزر گیا۔ محبت کا وہ پرکیف اور سرخوشی کا زمانہ بیت چکا جب نوجوان کسی سحر زدہ انسان کی طرح اپنی محبوبہ کے پیچھے پیچھے یوں چلا جایا کرتا تھا۔ گویا ایک سایہ سائے کا تعاقب کر رہا ہے۔ نوجوان کے جذبۂ دل کی تندی و تیزی اور اس کی آرزوؤں کا تیکھا پن کسی شکاری کے تیروں ایسا تھا یہ آرزوؤں کے تیر چھٹتے تھے لیکن بیکار۔ یہ سب کچھ اب ماضی کا افسانہ ہے۔ بیتی رات کا جادو ہے پہلے جنم کی مایا ہے! —— یہ میراجی کی نظم ہے۔

آوازیں سالنامے کی آخری نظم ہے۔ سماعت کے مختلف سایوں کو شاعر نے اس میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے لیکن مجھے سالنامۂ ادبی دنیا اور اس نظم میں بھی ایک مماثلت سی دکھائی دے رہی ہے۔ ہر سال کا آنے والا سالنامہ ایک آواز ہے۔ لکھنے والوں کے خیالات اور ہماری زندگی کی ترجمانی کی آواز —— وقت گزرتا جاتا ہے اور یہ آواز قریب آتی جاتی ہے یہاں تک کہ ہمارے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اور پھر دور ہوتی جاتی ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے۔ اور یہ آواز ماضی میں روپوش ہو رہی ہوتی ہے لیکن اس دوران میں آئندہ سال کی آواز —— ایک اور سالنامہ ہماری توجہ کا مرکز بن چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ اور ہم منزل بہ منزل سفر طے کئے جاتے ہیں۔ کاش! یہ سفر ہمیشہ یوں ہی جاری رہے!

میراجی

ایک گیت

یہ گانے بیگانے
راگی ـــــ چھیڑ نہ راگ پرانے
سپنے ہیں وہ غم کی راتیں
ٹوٹے وہ پیمانے
وہ باتیں افسانے ـــــ راگی ـــ
چھیڑ نہ راگ پرانے

تار سے ہاتھ اُٹھا لے
میرے ـــــ گیت سے گیت ملا لے
میں ہوں اُن کی پریم پجارن
وہ میرے متوالے
وہ میرے دیوانے ـــــ راگی ـــ
چھیڑ نہ راگ پرانے

بسری یاد دلائی
تو نے ـــــ راگ سے آگ لگائی
دل کی دل میں رہتی تو اپنی
کہی تو بات پرائی
کون کسی کی جانے ـــــ راگی ـ
چھیڑ نہ راگ پرانے

ہار کے جیتے جوگی
دونوں ـــــ دونوں پریم کے روگی
جس کے ایسے ہوں من موہن
وہ دکھیا کیا ہوگی!
وہ دکھ کو کیا جانے؟ ـــــ راگی ـ
چھیڑ نہ راگ پرانے

راگ کے رنگ ہیں گہرے
بدلے ـــــ اپنے غم کے پہرے
تو نے کیوں چھیڑا وہ قصہ
اب کیسے دل ٹھہرے
اب کیسے دل مانے ـــــ راگی ـ
چھیڑ نہ راگ پرانے

ایک ہوئے دو تن من
من کی ـــــ دور ہوئی ہے اُلجھن
وہ شمعیں کافور ہوئی ہیں
نئے دیئے ہیں روشن
تتّے بھی اب پروانے ـــــ راگی ـــ
چھیڑ نہ راگ پرانے ـــ

یوسف ظفر

غزل

آغازِ محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو مسوسے رہتے تھے، اب ہاتھ لگانا مشکل ہے

متوالی رسیلی آنکھوں میں نیند ایسی گھتی ہے کہ بس توبہ
فتنے تو اٹھانا اک جانب، جادو بھی جگانا مشکل ہے

طائر ہے نہ صیدِ وحشی ہے، دل ہے البتہ تڑپتا دل
دیکھو تو اِدھر، کوشش تو کرو، کیا ایسا نشانا مشکل ہے؟

آفت میں، بلا میں گھرتے رہو، سرگشتہ و حیراں پھرتے رہو -
یہ عشق کی وادی ہے، اِس میں آرام تو پانا مشکل ہے

کچھ مشقِ ندامت ہوتی رہے، کچھ عذرِ ستم بھی کرتے رہو -
جانوں کے کھپانے والوں کو ہنس ہنس کے رُلانا مشکل ہے

جو عشق کے فن کے ماہر ہیں اُن سے پوچھو، تم کیا جانو
کب اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے

یہ جان کا خواہاں ہونا ہے، اے دل تو فریب تو اُس کا سمجھ
ہر لحظہ روٹھنے والے کو منّت سے منانا مشکل ہے

کہنے کو تو ہم آزار کشیدہ کہتے ہیں اُس کو کیا کیا کچھ
انصاف یہ ہے، اس جور پہ بھی یوں دل کو لُبھانا مشکل ہے

موسم اور وقت کی باتیں ہیں، راتیں ہیں نہ وہ برساتیں ہیں
رونے میں کبھی طوفان تھے، اب دو اشک بہانا مشکل ہے

کہنے اور طول سے کہنے کی حسرت تھی لیکن جب پوچھا
مُنہ اُس کا تکتے رہ گئے یعنی، حال سنانا مشکل ہے

میں میرؔ کا دم بھرتا ہوں آخر، میں اُس کے کمال کا قائل ہوں
ہاں، شعر تو تم کہہ لیتے ہو وہ "بول بنانا" مشکل ہے

(مرزا) جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

ہجویات یا طنز نگاری

آغازِ ہجو نگاری کا زمانہ متعین کرنا اور وثوق کے ساتھ یہ بتانا کہ اس کی تخلیق کہاں ہوئی، نہایت دشوار ہے بعض مصنفین کی رائے میں یونانیوں نے پہلے پہل اس کی ابتدا کی بعض کے نزدیک اہلِ روما اس کی آفرینش کے ذمہ دار ہیں۔ بہرحال لفظ ہجو جس معنی میں آج تمام موجودہ زبانوں میں استعمال ہوتا ہے اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہ نام صرف ایسی نظم کے لئے مختص ہے جس میں کسی خاص فرد یا جماعت کے معائب کو بے نقاب کیا گیا ہو اور چونکہ نظم کی یہی وہ نوع ہے جس کو ہجو سے تعبیر کیا جاتا ہے اس لئے یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ ہجو نگاری کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود فنِ شعرگوئی۔ انسان نے جب شعر کہنا شروع کیا ہوگا تو ترانۂ حمد سب سے اول لکھا ہوگا لیکن بنی نوعِ بشر میں اپنی جنس کے معائب نمایاں کرنے کا مادہ شدت سے ہے، اس لئے قیاس ہے کہ ہجوگوئی بھی اسی زمانے میں شروع ہو گئی ہوگی۔ جب خداوندِ عالم نے حضرت آدمؑ اور بی بی حوا کو جنت سے نکال پھینکا ہوگا تو مقتضائے بشری کے مطابق اس گناہ کا الزام ایک نے دوسرے کے سر رکھا ہوگا۔ اور بعد میں اُن میاں بیوی کے اس مکالمے کو قدرے شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ شاعروں نے نظم کر دیا ہوگا اس لئے میری رائے میں نہ یونانیوں نے یہ فن کسی دوسرے ملک سے حاصل کیا، نہ اہلِ روما نے یونانیوں کی تقلید کی، بلکہ آدم و حوا کا یہ مکالمہ فن ہجو نگاری کا محرک ہوا۔

لیکن جب ہجو نگاری بطور صنفِ سخن معرضِ بحث میں آتی ہے تو نقادانِ فن میں اس کے متعلق شدید اختلاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسکیلی جر۔ اس کو خالص یونانی اختراع بتاتا ہے اور بطور استدلال لفظ SATIRE (یعنی طنز کا ماخذ (SATYRUS) کو سمجھتا ہے جو ایک ایسے جانور کا نام ہے جس کی نصف شکل انسانی اور نصف بکری نما ہوتی ہے۔ اس کے خلاف کیسابن (Casaubon) اور اس کے متبعین اُس کی رائے سے متفق نہیں ہیں اور اُس کے اس ماخذ کو غلط سمجھتے ہیں۔

شعرگوئی کا جذبہ انسان میں روزِ ازل سے موجود ہے۔ اس لئے اس کے اولین اشعار خداوندِ عالم یا کسی دیوی کی تعریف میں تصنیف ہوئے ہوں گے اس بنا پر شاعری کو مذہب کا رہینِ منت سمجھنا چاہیئے۔ یونانیوں میں اصنام پرستی کی رسم قدیم تھی۔ چنانچہ مختلف دیویوں مثلاً بیکس اور سیریز جیسی دیویوں کے نام پر اکثر اوقات نذر و نیاز کی جاتی تھی۔ اسی طرح اہلِ روما دھرتی ماتا، اور سورج رانی وغیرہ دیویوں کی پرستش کرتے تھے۔ قومی تعطیل کے دن ان دیویوں پر قربانی کی جاتی تھی۔ جانوروں کو ذبح کیا جاتا تھا اور چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ اُن کی تعریف کے راگ گائے جاتے تھے۔ نذر و نیاز کے بعد اہلِ روما دن کا باقی ماندہ حصہ کھیل کود، اور عیش و عشرت میں گزارتے، رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتیں، شرابِ ناب کے دور چلتے، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ہوتی۔ مختصر یہ کہ تعطیل کا نصف دن عبادت میں صرف ہوتا اور نصف شادکامی و بدمستی میں۔ اہلِ روما ان تہواروں کے موقع پر کچھ فی البدیہہ ہجویہ اشعار پڑھتے جن میں طنز کیا جاتا جس شخص کو اس طنز کا ہدف بنایا جاتا، وہ بھی خاموش نہ رہتا بلکہ اپنی ہجو سُن چکنے کے بعد ہاجی کا جواب چند فی البدیہہ اشعار میں دیتا۔

شعرگوئی کی ابتدا ہر جگہ مذہب کی بدولت ہوئی، یونانی اور رومی شاعری بھی اسی طرح شروع ہوئی۔ یونان اور روم دونوں ممالک میں شاعری تہواروں کے موقع پر ہوتی تھی۔ دونوں کا مقصد محض تفننِ طبع اور زیادہ گوئی تھا کیونکہ جو نظمیں ان مواقع پر پڑھی جاتی تھیں وہ تمامتر ہجویہ ہوتی تھیں جن میں ایک دوسرے کا خاکہ اڑایا جاتا تھا لیکن یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اہلِ روما نے اپنی ہجویہ نظمیں اُس وقت لکھنی شروع کیں۔ جب انہیں کوئی تعلق یونانیوں سے تھا، نہ اُن کو کوئی علم اُن کی شاعری اور روایات کا تھا۔ اس لئے اہلِ روما نے یونانیوں کی تقلید یقیناً نہیں کی، بلکہ یہ ہجوگوئی اُن کے اپنے دماغ کی تخلیق تھی۔

اہلِ روما کی ہجویہ منظومات صرف چند فی البدیہہ اشعار پر مشتمل تھیں لیکن کچھ دنوں بعد فارس (مداحیہ تمثیل نگاری) کا فن وجود میں آیا جس کی ابتدا اسب سے

پہلے نہ سکتی ہیں ہوئی۔ یہ طریقہ کچھ زیادہ مقبول نہ ہوا اور کچھ عرصے کے بعد اس کی جگہ اینڈرانی کس کے ڈراموں نے لے لی جس سال اینڈرانی کس نے ڈراما نویسی کی ابتدا کی اُس کے سال بھر بعد این لیس پیدا ہوا۔ جب وہ سن شعور کو پہنچا تو اس نے دیکھا کہ عوام ان ڈراموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس نے نظمیں لکھنی شروع کیں جن کو بجائے اسٹیج پر ایکٹ کرنے کے پڑھا جاتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ لوگ اُس کی یہ نظمیں پسند کریں گے۔ چنانچہ اُس کی یہ توقع پوری ہوئی اور وہ اپنی نظموں کی بدولت بہت مشہور ہوا۔ اس کی ان ہجویہ نظموں میں اینڈرانی کس کے ڈراموں کی لطافت، الفاظ کی تلخی و درشتی، خاص خاص طنزیہ فقرے، عام اخلاقی معائب کے خلاف صدائے احتجاج، غرض کہ سب ہی کچھ تھا۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ اینڈرانی کس کے ڈرامے تھیٹروں میں ایکٹ ہوتے تھے اور اس کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ این لیس کے بعد پیکو دی لیس اور لیوکلی لیس نے ہجویں لکھنی شروع کیں، یہاں تک کہ ہجو نگاری شاعری کی ایک مستقل صنف بن گئی اور آخرکار ایک دن وہ آیا جب ہوریس اور جووینائل نے اس صنف کو اُس معراجِ کمال پر پہنچا دیا کہ ہر ہجوگو شاعر کے لئے اُن کی نظمیں منتہائے نظر بن گئی۔

ہوریس اور جووینائل کی ہجویں از اول تا آخر نظم میں ہیں لیکن قریب قریب انہیں کے زمانے میں ایک شخص ویرن نامی نے ہجو نگاری کی ایک نئی قسم ایجاد کی جو ویرونی ہجو (Varronian Satire) کہلائی۔ اس قسم کی ہجویں نہ صرف مختلف مضامین پر اشعار لکھے جاتے تھے بلکہ بعض اوقات نظم میں نثر کا امتزاج بھی کر دیا جاتا اور بسا اوقات لاطینی ابیات کے ساتھ یونانی اشعار بھی شامل کر دئیے جاتے۔ یہ جدت بالکل نئی تھی۔ اہلِ روما کی ہجویہ منظومات میں صرف انفرادی معائب اور حماقتوں کا مضحکہ نہیں اڑایا جاتا تھا بلکہ شاعر اپنے پیشِ نظر تعمیری پہلو بھی رکھتا تھا اور اُن میں بعض نیک عادتوں کی ترغیب دیتا تھا۔ لیکن یہ طریقہ پرانا تھا۔ آج ہجو نگاری کی صنف جس زبان میں بھی موجود ہے وہ محض اظہار معائب کے لئے وقف ہے اور بس۔

انگریزی زبان میں شروع شروع میں ہجو نگاری کا معیار بہت پست تھا لیکن ڈرائی ڈن نے معیار کو بلند کر دیا اور ادبی ہجو کی بنیاد ڈالی۔ اُس کی نظم (Absalom & Achitophel) انگریزی ادب کا جواہر پارہ ہے ارل آف شافٹسبری اور شہنشاہ انگلستان چارلس دوئم کی جو تصویریں کھینچی ہیں لاجواب ہیں۔ ڈرائی ڈن کے بعد پوپ نے ہجو نگاری کو بلند تر کر دیا جس کی وجہ سے اُس کی عظمت بحیثیت ایک ہجو نگار شاعر کے مسلّم ہو گئی واقعہ یہ ہے کہ اُس کے سے زہر آلود فقرے اور اُس کا اچھوتا اندازِ بیان اس کے بعد کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ پوپ عورت کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ چنانچہ اُس کی نظم "در بیان نسواں" ہجویہ نظم کا عمدہ نمونہ ہے۔ اُس کی دوسری نظم "تبر گیسو" پڑھنے کی چیز ہے اور پتہ دیتی ہے کہ اُس نے انگریزی ہجو نگاری کو کس معراج پر پہنچا دیا تھا ڈرائیڈن کی ضرب ہلکی مگر موثر ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے پوپ کی ضرب اپنے حریف پر اتنی کاری پڑتی ہے کہ اُس کا زخم مشکل ہی سے مندمل ہوتا ہے حقیقتاً پوپ کو ڈرائیڈن سے وہی نسبت ہے جو آگ کو مشت خاک سے ہو سکتی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈرائی ڈن کا درجہ پوپ سے کم ہے۔ ڈرائی ڈن بہرحال پوپ کا پیشرو ہے۔ اسی نے وہ راہ تیار کی جس پر پوپ نے اپنا اشہب قلم بعد کو دوڑایا۔ یہ اور بات ہے کہ پوپ نے اُس راستے میں سے خس و خاشاک صاف کر دئیے۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر جانسن نے چند عمدہ ہجویہ نظموں کا اضافہ کیا مثلاً "وینیٹی آف ہیومن وشز" اور "لندن" جو کافی دلپذیر ہیں۔ اس ضمن میں گولڈ اسمتھ کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے۔ جس کی نظم "ری ٹیلی ایشن" اُن تمام پوشیدہ قوتوں کا اظہار کرتی ہے جو ایک ہجو نگار کے یہاں ہمہ وقت موجود رہتی ہیں۔

لیکن ڈرائی ڈن، پوپ اور جانسن وغیرہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہجو نگاری کے لئے اپنا آلۂ اظہار نظم کو منتخب کیا۔ اسی زمانے میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے جنھوں نے اس صنف کے لئے بجائے نظم کے نثر کو زیادہ موزوں سمجھا ان لوگوں میں سرِ فہرست جن کا نام ہمیں ملتا ہے وہ سوئفٹ اور ایڈی سن ہیں ان لوگوں نے نثر میں ادبی ہجو کی بنیاد ڈالی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ نثر میں بھی نظموں کا زور اور روانی قائم رکھی جا سکتی ہے۔

چونکہ سوئفٹ اور ایڈیسن کا شمار طنز نگاروں میں ہے اس لئے یہاں پر ہجو، طنز اور ظرافت کے اُس نازک فرق کو واضح کر دینا ضروری ہے جو ان تینوں میں ہے۔

طنزیات کو دراصل ہجو کی ایک شاخ سمجھنا چاہئے لیکن عام طور پر طنزیہ تحریروں کے تحت میں تمام ظریفانہ تحریرات شامل کی جاتی ہیں۔ خود ٹھیکرے کی رائے میں ظرافت اور طنز میں کوئی فرق نہیں ہے حالانکہ ان دونوں میں بہت ہی نازک فرق ہے۔ طنز زیادہ سے زیادہ ظرافت کی ایک شاخ ہے جس کا مقصد کبھی محض تفریح و نشاط ہوتا ہے، کبھی اصلاح و تربیت جو ظرافت کے پردے میں کی جاتی ہے۔ عام ظرافت آمیز تحریرات میں جس جگہ سے کسی شخص پر چوٹ شروع ہو یا کوئی چبھتا ہوا فقرہ کسا جائے یا دل کھول کر "مرمت" ہو وہیں سے طنز کی حدود کا آغاز ہوتا ہے لیکن طنز کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُس میں ندرت بیان اور ندرت معنی دونوں ہوں ورنہ وہ ایک نہایت سطحی اور معمولی چیز ہو کر رہ

جائے گی۔ ہجو کی ضد مدح ہے جو قصیدہ کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ کسی شخص کے عیوب کو نظم کر دینا نہ کوئی مستحسن فعل ہے نہ کوئی بڑا کارنامہ تا وقتیکہ انداز بیان میں لطافت اور خیال میں ندرت نہ ہو۔ حقیقت میں یہی وہ مقام ہے جہاں ظرافت اور ہجو کی سرحدیں ملتی ہیں۔ لیکن ہجو میں ظرافت کی چاشنی ہونا ضروری ہے۔ مگر ہر ظرافت میں ہجو کی آمیزش ضروری نہیں ہے۔

انگریزی زبان میں یوں تو چاسر سے لے کر برنارڈ شا تک کم و بیش ہر زمانہ میں چوٹی کے طنز نگار شعرا و نثر نگار موجود رہے ہیں لیکن طنز نگاری کا سنگ بنیاد سوئفٹ اور اڈیسن نے رکھا۔ انہوں نے نہ صرف اپنے اظہار خیال کا آلہ نثر کو بنایا بلکہ انسانی خامکاریوں کو اپنے طنز کا موضوع قرار دیا۔ یہی وہ فرق ہے جہاں سوئفٹ اور اڈیسن، پوپ سے علٰحدہ نظر آتے ہیں۔ پوپ، ڈرائی ڈن اور گولڈ اسمتھ کی ہجو نگاری ذاتیات تک محدود تھی۔ سوئفٹ نے ذاتیات کی قید و بند میں پڑ کر اپنے آپ کو محدود نہیں کیا بلکہ انسان کی عام مذموم حرکتوں پر ضرب لگائی۔ وہ خود کہتا ہے کہ مجھے آدمی سے بحیثیت انسان ضرور نفرت ہے مگر زید، بکر، عمر سے انتہائی الفت ہے۔ چنانچہ انسان سے بحیثیت مجموعی جو نفرت اُس کو ہے اس کا اظہار (Voyge to Honyhunnms) میں کافی طور پر ہوتا ہے۔ اُس کی ہجو میں انفرادیت یا شخصی خصوصیت کا مطلق پتہ نہیں۔ "وا نجز ٹو للی پٹ اینڈ . . . . . ." میں اُس نے انسان کی تحقیر ایک جگہ اُس کو انتہائی طویل القامت اور ایک جگہ انتہائی چھوٹا بنا کر کی ہے لیکن حقیقتاً سوئفٹ نے اپنے اس قصے میں انگلستان کی سیاسی اور مذہبی کشمکش کا مرقع کھینچا ہے۔ للی پٹ کے دربار کی سازشیں دراصل جارج اول کے دربار کی سازشیں ہیں وانج ٹو بردبنگ میں اس نے انگلستان کے سیاسی طریقۂ کار کو بے نقاب کیا ہے اور اس کو سراہا ہے۔ یہ کتاب اُس کی بہترین ہجو ہے جو اُس نے اپنے ملک کے سیاسی حالات کی لکھی ہے۔ اسی طرح اڈیسن نے جب لکھنا شروع کیا تو سوسائٹی کی اصلاح کی اُسے سخت ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے ایک اخبار اسپکٹیٹر جاری کیا جس میں اُس نے لطیف مزاح کا وہ طرز ایجاد کیا کہ اُس کے بعد کوئی اُس کی تقلید نہ کر سکا۔ اس نے لوگوں کے خیالات کو اونچا کرنے میں نرم مگر مؤثر ہجو سے کام لیا جس میں اُس نے اپنے زمانے کی تمام برائیوں اور حماقتوں کو دکھلایا ہے۔

انیسویں صدی کے ادیبوں میں چارلس ڈکنس کا ذکر ضروری ہے، ڈکنس ناول نویس ہے اور اُس کا شمار ہجو نگاروں میں نہ ہونا چاہئے لیکن اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو وہ بھی اپنے عہد کا بڑا طنز نگار ہے۔ ڈکنس نے اپنے ناولوں میں ظرافت کے پردے میں اصلاح و تربیت کا کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر اُس کے ناول نکولس نکل بائی کو لیجئے اُس کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے کے مدرس قریب قریب ایسے ہی ہوتے تھے جیسے آج بھی ہندوستان کے تحصیلی اسکولوں میں ملتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر کم عمر بچوں کو مارنا اُن کا عزیز مشغلہ تھا۔ چنانچہ اس ناول میں مصنف نے ماسٹروں کے اس طرز عمل کے خلاف ظرافت آمیز پیرائے میں صدائے احتجاج بلند کی ہے اسی طرح اُس کے پک وِک پیپرز ہمیشہ یادگار رہیں گے جن کے کردار انیسویں صدی کی بولتی چالتی تصویریں ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ڈرائی ڈن سے قبل انگریزی ہجو نگاری کا معیار بہت پست تھا اسی طرح فارسی زبان میں بھی ہجو نگاری کا مقصد فحاشی کو سمجھ لیا گیا تھا۔ فارسی ہجو نگاروں کی فہرست کافی طویل ہے جس میں عمادی غزنوی ادیب صابر، رشید وطواط، ابوالعلا گنجوی، حکیم خاقانی، حکیم انوری، حکیم سوزنی کمال اصفہانی، شیخ سعدی، عبید زاکانی، حکیم شفائی، سعید اشرف۔ اشرف الدین علی، میر یحیٰی شیرازی، اعجاز ہروی، مفید بلخی، شاقی، فوقی، نعمت خاں عالی، حکیم قاآنی وغیرہ کے نام مشہور ہیں۔ ان ناموں میں بہت سے نام ان لوگوں کے ہیں جن کی ثقاہت مسلمہ تھی اور جن کو معلم اخلاق کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ باوجود متانت و سنجیدگی کے، سعدی اور خاقانی جیسے لوگ بھی "اس حمام میں ننگے نظر آتے ہیں اور کھل کھیلتے ہیں"۔ مولانا روم کی مثنوی میں بھی متعدد ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں انہوں نے اپنے مطالب کو واضح کرنے کے لئے فحش حکایات سے مدد لینے میں دریغ نہیں کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اُس زمانے کی سوسائٹی کا مذاق اس درجہ پست ہو گیا تھا کہ فحش اور رکیک باتوں کا ذکر مذموم نہ سمجھا جاتا تھا۔

افسوس ہے کہ ایران میں ہجو کو بطور تفنن طبع استعمال کیا گیا۔ ایرانیوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس صنف شعر کے ذریعے بھی تعمیری و اصلاحی کام نکالے جا سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے عربی شاعری میں جن لوگوں نے ہجو گوئی کو حصول زر کے لئے اختیار کیا وہ صرف معدودے چند ہیں، ورنہ زیادہ تر ہجو گو شعرا نے اپنے ذاتی یا خاندانی انتقام کی بنا پر ہجو سے اپنا قلم آلودہ کیا ہے۔ حطیئہ اور جریر و فرزدق جیسے فحش گو ہجو نگار شعرا سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو عربی ہجو نگاری کا رنگ بالکل مختلف ملے گا۔ وہ لوگ ہجو اُس وقت لکھتے تھے جب کسی شخص میں قومی اخلاق شرافت، بہادری، مہمان نوازی کی کمی پاتے تھے۔ چنانچہ حطیئہ زبرقان

بن بدر کی ہجو میں کہتا ہے ؎

دع المکارم لا ترحل لبغیتها واقعد فانک انت الطاعم الکاسی

یعنی اخلاقِ حسنہ سے تجھے کیا سروکار۔ اُن کے حصول کی کوشش نہ کر
اور مزے سے گھر بیٹھ۔ تجھے تو صرف کھانے پہننے سے سروکار ہے۔

یا جریر بنی تغلب کے بخل کی مذمت کرتا ہے۔

قوم اذا اکلوا اخفوا کلامهم واستوثقوا من رتاج الباب والدار

قوم اذا استنبح الاضیاف کلبهم قالوا لامهم بولی علی النار

یعنی وہ ایسے کنجوس ہیں کہ جب کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو آہستہ آہستہ
باتیں کرتے ہیں اور دروازے کے کواڑوں کو اچھی طرح بند کر دیتے ہیں
اور جب اُن کے کتے مہمانوں پر بھونکتے ہیں تو اپنی ماں سے کہتے ہیں کہ
آگ کو پیشاب سے بجھا دو۔

یہ بات خیال میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ عرب میں ہر قبیلہ والے رات کو اپنے خیموں کے آگے آگ روشن کرا دیتے تھے تاکہ بھولے بھٹکے مسافر راہ پائیں اور اُن کی مہمان نوازی سے فائدہ اٹھائیں۔ اگرچہ دوسرے شعر میں قدرے رکاکت پیدا ہو گئی ہے لیکن بخل جیسی صفت کی برائی اس سے زیادہ زبردست طور پر نہیں کی جا سکتی کہ آگ بجھانے کے لئے بھی پانی کی جگہ پیشاب استعمال کیا جاتا ہے۔ اور بے تمیز اتنے ہیں کہ یہ کام اپنی ماں سے لیتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور شاعر کسی قبیلہ کی بزدلی اور حرص کی ہجو میں یوں رقم طراز ہے ؎

الستم اقل الناس عند لوائهم واکثرهم عند الذبیحة والقدر

یعنی کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو لڑائی کے جھنڈے کے نیچے سب سے
کم نظر آتے ہو اور ذبح ہو جانے والے جانوروں اور گوشت کی دیگوں
کے گرد سب سے زیادہ۔

مقصد یہ کہنے کا یہ ہے کہ فارسی ہجو میں ذاتی عنصر زیادہ ہے اور عربی ہجو میں اخلاقی عنصر۔ عربی ہجو میں اصلی و واقعی معائب بیان کئے گئے ہیں فارسی ہجو میں دروغ بیانی، بے اعتدالی اور فحاشی سب کچھ ہے۔ ایک عربی ادیب کی رائے میں خیر الهجاء ما تنشده العذراء فی خدرها یعنی بہترین ہجو وہ ہے جس کو ایک دوشیزہ اپنے خیمہ میں بے تکلف پڑھ سکے۔ ابنِ رشیق کی رائے بھی تقریباً یہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شریف مخدرات پر اتہام لگانا اور فحش گوئی کرنا محض گالی گلوچ ہے جس کو شاعر نے موزوں کر دیا ہو لیکن فارسی ہجویہ منظومات ان تینوں اوصاف سے معرّا و مبرّا ہیں۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ ایسے اشعار صرف ذاتی اغراض کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ ایک تو اپنے جذبۂ انتقام کی آسودگی کے لئے اور دوسرے تلاشِ معاش کی خاطر۔ مثلاً حکیم شفائی کا علاوہ عالم ہونے کے سربرآوردہ طبیبوں میں شمار ہوتا تھا اور اسی وجہ سے عباس صفوی اُس کا بہت احترام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی شخص کو اُس نے مسہل دیا۔ مریض نے فیس کا تو کیا ذکر، دوا کے دام بھی ہضم کر لئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شفائی کو غصہ آ گیا اور اُس نے حسب ذیل رباعی لکھ ماری ؎

گر سام نریمانی وگر رستم گرد حلاب مرا مفت نتوانی برد
یا قیمت آنچہ خوردہ باید داد یا در عوض آنچہ ریدہ باید خورد

یا پھر جس طرح بہت سے اخبار نویس امرا و والیان ریاست کو ڈراتے دھمکاتے رہتے ہیں کہ اگر انہوں نے اُن کو خاطر خواہ قسم نہ دی تو وہ اُن کا کچا چٹھا اپنے اخبار میں کھول کر رکھ دیں گے۔ اسی طرح بہت سے ایرانی شعرا امرا و سلاطین کی ہجو کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ لوگ بھی اُن سے لرزہ براندام رہتے اور اکثر اوقات انعام و اکرام سے انہیں سرفراز کرتے رہتے۔ چنانچہ اس کا اعتراف کمال اصفہانی نے خود کیا ہے۔

سہ بیت رسم بود شاعران طامع را یکے مدیح، دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر ورنہ دادِ ہجا ازیں سہ بیت دو گفتم، دگر چہ فرمائی

اس رواج کا یہ نتیجہ ہوا کہ سوسائٹی کی حالت روز بروز پست ہوتی گئی کیا عوام، کیا خواص، سب اس قسم کی خرافات پر تحسین و آفرین کرتے اور داد دیتے۔ ہجو نگار مسخروں کو انعام ملتا ہے اور ان ہجو نگاروں کا قول یہ ہو گیا کہ ؎

ہجا گفتن ارچہ پسندیدہ نبود مبادا کسے کالت آں ندارد
ہر آں شاعرے کو نباشد ہجا گو چو شیرے کہ چنگال و دنداں ندارد

چنانچہ عبید زاکانی جو بڑا صاحب فضل و کمال تھا۔ ایک مرتبہ ایک قصیدہ لکھ کر شاہ ابو اسحٰق اینجو کے دربار میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ اس وقت درباری مسخرے کی بذلہ سنجیوں میں مشغول ہیں۔ اس لئے باریابی حاصل ہونا مشکل ہے۔ لہٰذا اُسی وقت اُس نے اپنا عمامہ و جبہ اتار پھینکا۔ درباری وضع اختیار کی اور آخر کار اپنی فحاشی کی بدولت جلد ہی بادشاہ کے مقربان خاص میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم کاں در طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز تا دادِ خود از مہتر و کہتر بستانی

اگر معاملہ ہجو تک رہتا اب بھی غنیمت تھا مگر ہجو سے دروغ بیانی اور دروغ بیانی سے نوبت فحاشی تک پہنچی جس میں نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ شاعروں کے تذکروں میں ترقی۔ جہاں مہری وغیرہ کے کلام میں متعدد فحش و رکیک شعر ملتے ہیں۔

کی کلیات میں جو ہجویں ملتی ہیں وہ اس قدر فحش ہیں کہ متانت اُن کی تاب نہیں لا سکتی اس لئے چند نمونے بچ بچ کر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ۔

ایک مرتبہ سدید الدین اعور (یک چشم) اور ان کے ہم عصر اثیر میں چشمک ہو گئی اثیر نے یہ رباعی کہی ؎

قلب تو ز نور معرفت عور چراست — بینی تو بروئے تو گو رچراست
ابلیس اگر نیستی اے موکن زشت — پس راست بگو چشم چپت کو رچراست

اس کے جواب میں سدید نے لکھا ؎

گفتی تو مرا کور وہمہ خلق شنید — گفت تو چہ حاجت است چوں پدید
چشم دگرار کور ببے شائستے — تا روئے تو زن جلب بنائستے دید

فردوسی کا شمار ہجو نگار شعرا میں نہیں کیا جا سکتا لیکن محمود غزنوی کی ہجو چونکہ اُس کے زادِ قلم سے یادگار رہ گئی ہے اس لئے اُس کا تذکرہ ضروری ہے ۔ جدید تحقیق نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجو فردوسی کی تصنیف نہیں ہے بلکہ الحاقی ہے لیکن چونکہ یہ موضوع ہماری بحث سے خارج ہے اس لئے ہم اس کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتے ۔ فردوسی نے اگر واقعی تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد بھی محمود کے دربار سے مقررہ صلہ نہ پایا تو اُس کے غم و غصہ کا ہجو کی صورت اختیار کر لینا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا ۔ اشعار ہجو حسب ذیل ہیں ؎

اگر شاہ را شاہ بودے پدر — بسر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادر شاہ بانو بدے — مرا سیم و زر تا بزانو بدے
پرستار زادہ نیاید بکار — اگرچہ بود زادۂ شہریار
سر ناسزایاں برافراشتن — وزایشاں امید بہی داشتن
سر رشتۂ خویش گم کردن است — بجیب اندروں مار پروردن است
ز بد اصل چشم بہی داشتن — بود خاک در دیدہ انباشتن
ازاں گفتم ایں بیتہائے بلند — کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند
کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا
بماند ہجا تا قیامت بجا

ابوالعلا گنجوی منوچہر کے دربار کا شاعر تھا ۔ خاقانی اور فلکی جیسے اس کے شاگرد تھے ۔ علاوہ شاگرد ہونے کے خاقانی سے ابوالعلا گنجوی کی لڑکی منسوب تھی ۔ بایں ہمہ کسی طرح خسر داماد میں رقابت ہو گئی اور ایسی شرمناک اور عریاں ہجویں لکھی گئیں کہ الامان الحفیظ ۔ چنانچہ خاقانی کی شان میں کہتا ہے ۔

تو اے افضل الدین اگر راست پرسی — بجان عزیزت کہ از تو نہ شادم
نام خاقانی

تو خود قرۃ العین و فرزندمائی — منت ہم پدر خواندہ ہم اوستادم
چو رغبت نمودی بشاگردی من — تو تحفہ از وصلہ و سیم دادم
کمر را بہ تعلیم و شفقت ببستم — زبان تو در شاعری بر کشادم
در دگر پسر بود، نامت بہ شروان — بہ خاقانیت من لقب بر نہادم
بمن چند گوئی کہ گفتی سخنہا — کہ من یک شبے در زرا خوش ....
دگر خیرگی مے کنی باز گویم — کہ بیسا سخنہا نباشد بیادم
بگفتم بگفتم بگفتم بگفتم — . . . .

ایک اور قطعہ خاقانی کی ہجو میں ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو نسبتاً قطعہ بالا سے باعتبار رکاکت بہتر ہے ؎

خاقانیا اگرچہ سخن نیک خوانیا — یک نکتہ گویمت بشنو رائگانیا
ہجو کسے مکن کہ زتو مہ بود بسن — شاید زاید ربود و تو نہ دانیا

خاقانی فضل و ہنر میں یکتائے عصر اور موعظت و اخلاق کا استاد تھا ۔ قصیدہ نگاری میں بے مثل اور حسان العجم کے لقب سے ملقب تھا ، مگر ہجو لکھنے پر آتا ہے تو متانت کو سراسر بھلا دیتا ہے ۔ چنانچہ اپنے استاد ابوالعلا کی شان میں کہتا ہے ؎

بینی تنگ گنجہ را دریں کوئے — ہم سرخ قفا و ہم سیہ روئے

انوری قصیدہ گوئی میں استاد مانا گیا ہے لیکن ہجو نگاری کا بھی امام ہے ۔ چنانچہ ایک کنجوس کی ہجو میں کہتا ہے ؎

نانِ تو پارسا تر از زنِ تست — کس ندیدش ز خویش و بیگانہ
نانِ خود را بہ کاخِ خود بنشاں — واں جلب را برون کن از خانہ

ایک مخالف کی ہجو میں لکھتا ہے ؎

ز بیم خیرہ رایسانیے ست برگرد من چو پا — کہ گوئی عنکبوتیم ... گاوشے تنیدستے
سر کہ دار دگل ہر جائے موئے سترہ در ارہم — مگس گوئی بر اطراف کدوئے خشک ریدستے

سوزنی کو شروع میں تحصیل علم کا شوق تھا لیکن دیکھا کہ عام مذاق ہزل کی جانب ہے ۔ چنانچہ زندگی کا بڑا حصہ انہیں مزخرفات میں بسر کر دیا اور دشنام دسیائی میں کامل دستگاہ حاصل کی ۔ ایک مخالف کی ہجو میں کہتا ہے ؎

اے دشمنہ حکمت تو سر گم گشتہ — در خانہ جہل آمدہ در گم گشتہ
از خانہ بروں میائے تا بر نایہ — آوازِ منادیانِ خر گم گشتہ

کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی اپنے زمانے میں خلاق المعانی کے لقب سے ممتاز تھا اور فضل و کمال میں یگانہ روزگار تھا ۔ ہجویں بھی لکھی ہیں لیکن فحش و رکیک اشعار سے پاک ہیں ۔ چنانچہ ایک ممسک کی ہجو میں رقم طراز ہے ؎

سرِ خوان نانِ خواجہ چو خوردم   خواجہ گفتا کہ آہ می مردم
گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر   کہ من ایں لقمہ را فرو بردم

سعدی کو غزل کا استاد مانا گیا ہے اپنے علم و فضل میں جواب نہ رکھتے تھے۔ اخلاق و موعظت اُن کا خاص موضوع ہے مگر ہجو لکھنے سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ گھوڑے کی ہجو میں لکھا ہے ؎

مرکب از بہر راستے باشد   بندہ را اسپ خویش در رنج است
گوشت قطعا بر استخوانش نیست   راست مانند اسپ شطرنج است

ایک بوڑھے کی ہجو میں قطعہ لکھا ہے جس نے پیرانہ سالی میں ایک نوجوان لڑکی کو ہمنام سے شادی کر لی۔ طرفین میں نزاع رہنے لگا۔ آخر نوبت عدالت تک پہنچی۔ سعدی بھی موجود تھے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں ؎

بس از خلاف و شناعت گناہ دختر نیست   ترا کہ دست بلرزد گہر چہ دانی سفت

حکیم نعمت خاں عالی جہاں علوم و فنون میں منفرد تھا۔ وہیں شوخی و ظرافت میں بھی بے مثل تھا بلکہ اس کو اگر اس فن کا مجدد کہا جائے تو بے جا نہیں۔ ایک مرتبہ یہ قطعہ شاہ عالمگیر کی خدمت میں پیش کیا ؎

اے عمر سیرت و عثمان صورت   کہ ابوبکر گہے دار تو باد
روزِ محشر کہ بجو داور مانی   پسرِ بو سفیان یار تو باد

بادشاہ فوراً سمجھ گیا کہ ہجو ملیح کی ہے لیکن فرمایا "اگرچہ ایں کہنہ قرمساق بدانست خود ہجو کردہ است لیکن سعادتِ ماست۔ بنویسند در بیاض خاص۔"

اسی طرح ایک امیر نے ایک مرتبہ اُسے گھوڑا دینے کا وعدہ کیا لیکن ایفائے عہد نہ کیا تو اُس پر عالی نے لکھا۔

گر وعدہ است از غم نہ رہاند ما را   تا عمرِ طبیعی بہ رساند ما را
گفتی اسپے کہ می دوانیم اورا   ایں طرفہ کہ اسپ می دواند ما را

حکیم قاآنی متاخرین میں نہایت ممتاز شاعر سمجھا گیا ہے اور قصائد کا بادشاہ علم و فضل سے آراستہ اور پند و نصائح کا استاد ہے لیکن اس کی فحش ہجویں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے قاآنی کا ایک قطعہ جو ایک ہکلے بوڑھے اور ہکلے لڑکے کی گفتگو پر مشتمل ہے یہاں پر درج کیا جاتا ہے ؎

پیرکے لال سحرگاہ بہ طفلے الکن   می شنیدم کہ بدیں نوع ہمی راند سخن
کاے زلفت صصصبحم ششششامم تاریک   وے زچہرت ششششامم صصصبح روشن
طفل گفتا ممن رانتو تقلید مکن   گگگم شو زبرم اے کلکمتر از زن [۲]

---

[۱] اس مصرعہ کے موزوں ہونے میں شبہ ہے۔ عندلیب۔ [۲] یہ قطعہ نامکمل ہے (ادارہ)

اوپر جو مثالیں درج کی گئی ہیں اُن کو بہت انتخاب کے بعد پیش کیا جا سکا ہے ورنہ بعض کیا معنی بیشتر اشعار ہجویہ منظومات کے ایسے ہیں کہ اُن کو نقل ہی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال اشعار بالا سے بھی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام مذاق فحاشی کی طرف تھا اسی لئے بڑے بڑے متین اور سنجیدہ شعرا کا دامن اس آلودگی سے نہ بچ سکا اور ہجو کو بطور تفننِ طبع کے استعمال کیا گیا ورنہ یہ فحش لٹریچر تخلیق نہ ہوتا لیکن آج جدید ہجویہ لٹریچر کا یہ رنگ نہیں ہے۔ ایران اس وقت ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے اور پرانا ایران استبداد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ چنانچہ آج وہاں بجائے استبداد و حریت کی کشمکش کے ماضی پرستی اور مغربی تہذیب کی تقلید کی آویزش ہے۔ اس کا اثر وہاں کی شاعری پر پڑنا قدرتی بات تھی۔ چنانچہ جدید لٹریچر میں اخلاقی اور اصلاحی عناصر زیادہ ہیں اور دروغ بیانی اور فحاشی سے قطعاً اجتناب پایا جاتا ہے۔ چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

احمد شاہ معزول کی ہجو ؎

فکرِ شاہِ قطعنی باید کرد   شاہِ ما گندہ و گول و خرف است
تخت و تاج ہمہ پامال کردہ   در ہوتل ہائے اروپ معتکف است
نشود منصرف از سیرِ اروپ   ایں ہمہ احمد لا ینصرف است

(ایرج میرزا تبریزی)

کثرت ازدواج کے خلاف ؎

مردے کہ دو زن گرفت دلخوں گردد   حالش زغم و غصہ دگرگوں گردد
ہر کس کہ بدل مہر دو لیلیٰ گیرد   آشفتہ تر از ہزار مجنوں گردد

(فرات یزدی)

میونسپلٹی مشہد کے انتظامات کی مذمت ؎

افتادہ ایم سخت بدام بلائے گل   یارب چو ما مباد کسے مبتلائے گل
آید اگر جہاز زرہ پوش زانگلند   حیراں شود ز تجربۂ منتہائے گل

(بہار مشہدی)

اردو دنیا کی تمام زبانوں میں سب سے زیادہ کم عمر ہے لیکن اس کے باوجود جو کچھ لٹریچر اس میں اب تک تخلیق ہوا ہے، وہ بیک وقت حیرت انگیز بھی ہے اور قابلِ فخر بھی، کیونکہ اس میں آج ہر قسم کا ادب موجود ہے۔ افسانے، ڈرامے، تراجم، نظم، نثر سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔

جس حد تک ہجو نگاری کا تعلق بحیثیت فن کے ہے، ہماری نگاہ سب سے پہلے سودا کی ذات پر پڑتی ہے۔ وہ اس فن کا امام ہے یوں تو سودا کے علاوہ فدوی، مکین، بقا اور میر ضاحک اُن کے ہم عصر، سب ہجو نگاروں میں شمار ہو سکتے

ہیں لیکن اُن کو کوئی خاص درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ سوداؔ کا درجہ ممتاز ہے اور ہجو نگارِ حقیقی کی فہرست میں اس کا نام سر فہرست رکھا جائے گا لیکن یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اُس کی اکثر و بیشتر ہجویہ منظومات رکاکت و سخافت سے اس درجہ ملوث ہیں کہ کسی متین مجلس میں اُن کا پڑھنا اپنے پست مذاق کی غمازی کرنا ہے۔ مگر طنزیہ ادب کا معیار شروع میں پست ہوتا ہی ہے، اس لئے سوداؔ کو اس باب میں زیادہ مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جس طرح ہر صنفِ شعر میں اردو شاعروں نے فارسی شعراء کا اتباع کرنا فرض سمجھا، اسی طرح سوداؔ نے بھی اپنے پیشِ نظر فارسی نمونے رکھے ہوں گے، اور قدیم فارسی ہجویہ منظومات کا جو حال ہے اُس کے متعلق ماسبق صفحات میں کافی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ غرض فارسی کی کورانہ تقلید میں اور کچھ اپنے جذبۂ انتقام سے مجبور ہو کر سوداؔ نے اپنی منظومات میں مغلظات، رکاکت، سوقیانہ پن سب کو روا رکھا۔ چنانچہ میر ضاحک کی ہجو میں کہتا ہے ؎

کام ہر وجہ اپنا کر لیوے　　گلّے بندر کی طرح بھر لیوے
توڑ کھاتا ہے جا کے پاخانے　　یہ بواسیر اہنی کے دانے

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے ؎

جو رو اپنی پہ جب کرے ہے نظر　　اُس سے کہتا ہے تب یہ گیدی خر

بعد میں فرمایا جاتا ہے ؎

نہ سلام علیک نہ کچھ بات　　صاحب خانہ سے کرے بدذات

نشان زدہ الفاظ کو دیکھئے، یہ اگر گالیاں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح گھوڑے کی ہجو میں ایک شعر ہے ؎

ناتوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی　　گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پاد ہے ہربار

غرض اس قسم کی مثالیں دو چار نہیں، متعدد ملیں گی۔ بحیثیت ایک حقیقی طنز نگار کے سوداؔ کو ان فحشیات سے آنکھ بند کئے گذر جانا چاہئے تھا اور اپنی ہجو میں مبالغہ اور دروغ بیانی سے احتراز لازم تھا۔ ضرورت اس کی تھی کہ وہ اپنے حریف کی واقعی مذموم حرکتوں کی ہجو کرتا نہ یہ کہ اپنی طرف سے بھی چند خیالی اور فرضی برائیوں کا ہجو میں اضافہ کر دے۔ لیکن جہاں کہیں سوداؔ نے واقعہ نگاری سے کام لیا ہے وہاں بھی اُس کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے مثلاً اپنے طویل قصیدہ "شہر آشوب" میں جن مشاغل اور معاملات پر اُس نے تبصرہ کیا ہے اُس سے اُس کی جزئیات نگاری کی قوت کا پتہ چلتا ہے۔ اور ماننا پڑتا ہے کہ اُس کی یہ نظم اپنے زمانے کی بہترین طنز ہے۔ ذیل میں چند بند اُس کے درج کئے جاتے ہیں ؎

امیر اب جو ہیں وہ اتنا انہوں کی ہے حالت　　تھوڑے سے ہیں خانہ نشین دیکھ کر زمانے کا حال

نجمی ہے سونی جو جا کر ہے جلسے سر زوال　　حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہل کمال
دھری ہے سامنے اک پیکدان و اک تنبول

جو کوئی ملنے کو ان کے انہوں کے گھر آیا　　ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس بیچ وہ درمیاں لایا　　انہوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

آگے چل کر اُس زمانے کے فوجی سپاہیوں کے حال میں لکھتا ہے ؎

پڑے جو کام انہیں تب نکل کے کھائی سے　　رکھیں وہ فوج جو الٹی پھری لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے　　سوار گر پڑیں سوتے ہیں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری　　سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی کہوں میں کیا خواری　　سوال دستخطی پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آٹو لہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصبدار　　تلاش کرکے۔۔۔۔ انہوں نے ہونا چار
ندان قرض میں بنیوں کے دی سپر تلوار　　گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سوٹا ہے، ہاتھ میں کچکول

آخر میں فرماتے ہیں:۔

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا　　مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقش باطل تھا　　عجب طرح کا یہ بحر جہان میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی وال نہیں روشن تھی جس جگہ فانوس　　پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ سب مایوس
کرو دل پر از امید ہو گئے مایوس　　گھروں سے یوں نجبا کے نکل گئی ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں جو تھے صاحب چوڈول

نجیب زادے یوں کا ان دنوں ہے یہ معمول　　وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول　　اور اُن کے حسن طلب ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول

چونکہ شاعر نے اس نظم میں واقعہ نگاری کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا، نظم میں بلا کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور اگرچہ سوداؔ کا کلام سوز و گداز سے عام طور پر مبرّا ہے۔ لیکن چونکہ اس نظم میں جن حالات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بجائے خود دل میں درد پیدا کرنے والے ہیں، اس لئے خلاف معمول اِن اشعار میں درد اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ سوداؔ کو اگر کسی انگریزی شاعر سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے تو وہ پوپ ہے۔ پوپ کی طرح اس کے اشعار میں بھی بلا کا زور اور روانی ہے۔

اس کی ہجو بھی عام طور پر زہر آلود ہوتی ہے اور پوپ کی طرح ذاتیات تک محدود ہے۔ انسان کے عام اخلاقی معائب پر اُس کی نظر کم جاتی ہے۔ یہ صرف اپنے حریف کے معائب کو دیکھتا ہے اور اُن کو طشت از بام کرتا ہے۔ مشکل پسندی اور ظریفانہ جدت طرازی اُس کا خاص انداز ہے۔ مشکل سے مشکل ردیف قافیہ میں اپنا مطلب روانی کے ساتھ ادا کر جاتا ہے۔ ہاتھی کی تعریف میں کچھ اشعار لکھے ہیں جن کا قافیہ ٹنک۔ فنک وغیرہ ہے۔ اسی طرح ایک قصیدے کا قافیہ ردیف سنگ، ننگ، ڈھنگ، تنگ، رنگ، ڈھنگ وغیرہ ہے۔

الغرض سودا اردو زبان کا پہلا شاعر ہے جس نے اردو ادب میں ہجو نگاری کو بطور فن کے داخل کیا۔ اور اگرچہ اس میں بعض خامیاں بھی ہیں لیکن پھر بھی وہ طنز نگاری کا استاد ہے۔

سودا کے بعد ہجو نگاروں کی فہرست میں انشا اور مصحفی کا نام نظر آتا ہے۔ انشا ظریف طبع اور مصحفی متین آدمی تھا مگر آپس کی شاعرانہ چشمک نے دونوں کو اکثر و بیشتر اوقات ہجویہ اشعار لکھنے پر بھی مجبور کیا لیکن یہ ہجویں محض ہنگامی دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ انشا نے البتہ چند مثنویات زنبور، کھٹمل، مچھر، مکھی وغیرہ کی ہجو میں اور چند مثنویاں ساہوکاروں کی ہجو میں اپنے قلم سے یادگار چھوڑی ہیں۔ مصحفی نے جو کچھ اس قسم کی نظمیں انشا کی ہجو کے جواب میں لکھی ہوں گی اُن کو غالباً ضائع کر دیا گیا ہے — آزاد نے بھی آبِ حیات میں اُن کا نمونہ نہیں دیا۔

اِن سب کے بعد غالب کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے جس نے طنزیہ ادب میں جان ڈال دی۔ اُس کے مزاج میں ظرافت اس قدر ہے کہ غیر محسوس طریقہ پر اُس کی تحریرات میں اُس کا پرتو پڑتا ہے۔ کیا نظم، کیا نثر دونوں میں یکساں طور پر ظرافت کی چاشنی موجود ہے۔ طنز و ظرافت کی داغ بیل سب سے پہلے اردو نثر میں غالب نے ڈالی اور برجستہ و بے تکلف ظرافت کے اوّلین نمونے ہمیں رقعاتِ غالب میں ملتے ہیں۔ یہ نمونے اوّلیں بھی ہیں اور بہترین بھی۔ بہترین اس وجہ سے کہ آج بھی ان کا جواب نہیں ملتا جن لوگوں نے اِن رقعات کا چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے وہ ناکام رہے ہیں۔ اُن میں اور غالب کے مراسلات میں وہی فرق ہے جو اصلی اور نقلی چیز میں ہوتا ہے۔ ایک حد تک اُن کی تحریر میں بے ساختگی تو ضرور پیدا ہو گئی ہے، مگر جس چیز سے خطوط میں تازگی و شگفتگی قائم ہے بلکہ یہ کہیے کہ جو چیز غالب کے خطوط کی جان ہے۔ وہ غالب کا نفیس مزاج ہے اور یہ شے فطرت کی بخشش ہے۔ پیدا کرنے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن غالب کی نثر کے متعلق تفصیل کے ساتھ آئندہ سطور میں لکھا جائے گا۔ یہاں پر ہم کو اُن کی ظریفانہ منظومات کے متعلق عرض کرنا ہے۔

غالب نے اگرچہ شعر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے مگر وہ اوّل غزل گو شاعر ہے۔ یوں اُس نے قصائد بھی کہے ہیں، قطعات بھی، رباعیات بھی اور مثنویات بھی مگر اُس کی لازوال شہرت اُس کی غزل گوئی کے باعث ہے۔ ظاہر ہے کہ غزل کا موضوع صرف حسن و عشق کے جذبات کے اظہار کے لئے وقف ہے۔ اس میں ظرافت و طنز کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے۔ لیکن ذہین طبیعتیں ہزار پابندیوں میں بھی اپنے لئے راستہ نکال ہی لیتی ہیں۔ غزل میں فارسی اور اردو شاعروں دونوں نے زاہد و واعظ پر پھبتی کسنا اپنا خاص شعار بنا رکھا ہے۔ چنانچہ حافظ کا مشہور شعر ہے ؎

واعظاں کایں جلوہ بر محراب و منبر می کنند — چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

ممکن ہے شروع میں ریاکار اور خود غرض دینداروں کو اس لئے سخت سست کہا گیا ہو کہ عوام کے سامنے اُن کی ریاکاری اور خود غرضی کا پردہ چاک ہو مگر بعد کو یہ چیز رسمی ہو گئی۔ بہرحال اردو شاعروں نے بھی اپنے پیشرو ایرانی شعرا کا تتبع کیا اور شیخ کی پگڑی خوب اچھالی۔ اور ولی سے لے کر آج تک شیخ اور واعظ کی ہجو ہمارے اردو شاعروں کا محبوب مشغلہ بنا ہوا ہے لیکن غالب ہر جگہ اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہیں اور دوسروں سے ہٹ کر الگ اپنی شاہراہ بناتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی انہوں نے اپنی روش سب سے علیحدہ اختیار کی۔ رسمی طور پر انہوں نے بھی زاہد کی خبر لی اور ندرت کے ساتھ مثلاً

واعظ! نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

واعظ نے شرابِ طہور کا ذکر چھیڑ کر غالب کو دنیوی شراب پینے سے باز رکھنے کی ترغیب دینی چاہی تھی اور کہا تھا کہ ذرا صبر کیجئے، آئندہ زندگی میں جنت میں آپ کو شرابِ طہور ملے گی جو اس شراب سے لذیذ تر ہو گی مگر غالب تیز تھے، انہوں نے بات کو فوراً تاڑ لیا اور سمجھ لیا کہ یہ محض فریب ہے اور شراب پینے سے باز رکھنے کی ترکیب۔ چنانچہ انہوں نے واعظ کی تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی "کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی" کہہ کر ایسا طنز کیا کہ خود واعظ کو بھی اپنی تقریر کی صداقت میں شبہ ہونے لگا ہو گا۔

یا پھر ایک دوسرے مقام پہ کہتے ہیں ؎

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

بھلا کہاں میخانہ، کہاں واعظ۔ واعظ کو شراب سے نفرت، میخانہ صرف میخواروں کا مرجع۔ ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق نہیں لیکن ان آنکھوں کو کیا کروں۔ انہوں نے تو کچھ دوسرا ہی نظارہ دیکھا ہے۔ یعنی جانے

کے دروازے میں داخل ہی ہوا چاہتا تھا کہ اُس کی بدقسمتی سے میں میخانے سے باہر نکلا اور واعظ عین موقع پر پکڑا گیا۔ کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے" میں وہ طنز ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

لیکن شیخ و زاہد پر چوٹ اکثر غزل گو شعراء نے کی ہے، یہ غالب کی خصوصیت نہیں۔ مگر پاسبان سے چھیڑ چھاڑ صرف غالب کی خصوصیت ہے۔ پاسبان کا ذکر آتے ہی غالب کوئی نہ کوئی ظرافت آمیز بات کہہ جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے ؎

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

یعنی غالب کو محبوب کی کشش نے ایک دن محبوب کے گھر پہنچا دیا مگر ڈیوڑھی میں پاسبان نے اندر جانے سے روکنا چاہا۔ غالب نے نہ مانا، مجبوراً پاسبان نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو غالب جیسے خود دار انسان کے لئے ہتک آمیز تھیں۔ اتفاق سے غالب کے کسی شناسا نے بھی یہ واقعہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیا اور بعد کو طعنہ دیا۔ غالب نے جواب دیا "بھئی تم میرے اور پاسبان کے تعلقات ہی سے واقف نہیں۔ وہ میرا دوست قدیم ہے اور جو کچھ بھی کرتا ہے مذاق دل لگی میں ورنہ اس کا مقصد ہرگز میری توہین کرنا نہیں ہے اس لئے میں آئندہ بھی اُس کی ذلت آمیز باتیں ہنسی میں ٹالوں گا۔ بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا۔"

آپ اندازہ کیجئے اپنی کمزوری کو کس طرح چھپایا ہے اور کیسی ظرافت آمیز بات کہی ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

جب تک شاعر خاموش رہا پاسبان سمجھا کوئی سائل ہے، چلا جائے گا، لیکن حضرت کی جو شامت آئی آپ نے پاسبان کے پیر پکڑ لئے۔ یہ کرنا غضب ہوا پاسبان نے فوراً اپنی غلط فہمی محسوس کی اور وہ سمجھ گیا کہ یہ سائل نہیں عاشق ہے اور پھر جو کچھ گذری وہ شاعر بھی جانتا ہے اور آپ بھی۔

اب دیکھئے کہ پاسبان کے قافیہ سے کتنا اچھوتا اور پُرظرافت مضمون پیدا کیا ہے۔ دل مزے اٹھارہا ہے اور آپ بار بار شعر پڑھنے کے لئے مجبور ہیں۔ اس قسم کی مثالیں دو چار نہیں متعدد آپ کو کلام غالب میں مل سکتی ہیں کیونکہ یہ اُس کی اپنی ذاتی خصوصیت ہے جو کسی دوسری جگہ نہیں ملے گی۔

غالب کے ہم عصر مومن بھی طنز کرتے ہیں اور خوب۔ وہ غالب کے برخلاف حسن و عشق کے علاوہ اپنی منظومات میں اور کوئی بات کہنا جانتے ہی نہیں "تنگنائے غزل" ہی اُن کی محبوب ترین جولانگاہ ہے۔ چنانچہ اُن کی طنزیات بھی غزل ہی میں ملتی ہیں۔ اور اُن کے بھی وہی محدود موضوع ہیں جن پر سب شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً رقیب کی ملامت، واعظ پر چوٹ، ناصح اور محتسب سے چھیڑ چھاڑ لیکن اُن کی طنز میں ایسا مزہ اور ندرت ہے کہ یہ انہیں کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ناصح سے انہیں خاص طور پر محبت ہے۔ اُس کی صحبتوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں، اُس کی معصومیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں حسن و عشق کا ذکر بھی اُس سے کرتے ہیں جس کا مقصد ہمیشہ اُس کا جلانا ہوتا ہے اور آخر میں موقع پاکر اس پر چوٹ بھی کر جاتے ہیں۔ اُن کے انداز بیان میں البیلا پن اور معانی میں دلکشی اُن کی طنز کی خصوصیت ہے۔ مثلاً

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر — مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

خدا کی بے نیازی ہائے مومن — ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

ہوگئے نامِ بتاں سنتے ہی مومن بے قرار — ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے واعظ پر چوٹ کرنا مومن کا خاص فن ہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ — یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

"فرمائے ہے" کا ٹکڑا کس قدر جاندار ہے اور شعر کا مفہوم کتنا لطیف ہے۔

ایک اور شعر ہے۔

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا — ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا

وسعتِ کلام میں وہ سامانِ جراحت ہے جس کے متعلق غالب نے کہا ہے "آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا"۔ ناممکن ہے کہ یہ زخم مندمل ہوسکے۔ وسعت کے ساتھ "جی تنگ آگیا" کی رعایت خوب ہے۔ اُس پر "جان نہ لے" کا ٹکڑا معنی خیز ہے یعنی ایک تو مطلب یہ ہوا کہ اگر میرا دل گیا تو جانے دو خدا کے لئے مجھے پریشان نہ کر۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ دل تو محبوب چھین کر لے گیا۔ اب جان تُو لیتا نظر آتا ہے۔

یا ذیل کے چند شعر ؎

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے — اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح — گر نہیں یقیں حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

میں تو دیوانہ تھا اُس کی عقل کو کیا ہوگیا — قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہوگیا

یعنی چونکہ بجائے دیوانے کے مجھے قیس کہتا ہے، اس لئے ناصح خود دیوانہ ہے۔

یا یہ شعر ؎

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب — غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب

"بھلا صاحب" کا ٹکڑا طنز کا بہترین نمونہ ہے۔

رقیب پر ایک چوٹ کی ہے، وہ اور سُن لیجئے ؎

جب تم کو بڑھی الفت وہ کب دیتا تھا دم تم پر — یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجہ تھام لیتا تھا

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ رقیب سے آپ کو پیار محبت ہو گئی۔ آپ جو اُس کو کلیجہ پکڑے ہوئے دیکھتے تھے تو وہ اس لئے کلیجہ نہیں پکڑتا تھا کہ اُس کو آپ سے کچھ الفت ہے۔ وہ تو محض مجھے آپ کا عاشق سمجھ کر میرے حسد سے اپنا کلیجہ تھام لیتا ہے۔ اِس لئے آپ خواہ مخواہ اُس کی طرف ملتفت ہوتے ہیں۔" یہ کتنا اچھوتا طنز ہے۔

مومن کے بعد داغ بھی اکثر اچھی طنز کر جاتا ہے۔ غزل گو شاعر ہونے کی حیثیت سے اُس کا میدان طنز بھی محدود ہے۔ اپنے پیشرو مومن کی طرح داغ کا ہدف طنز بھی شیخ و زاہد کی شخصیت ہے لیکن داغ زاہد کے متعلق کچھ کہتا ہے تو صاف صاف کہتا ہے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ مومن پہلے موقع محل کو دیکھتا ہے۔ پھر غور کرتا ہے کہ ناصح کو صاف سنانی چاہئے یا الفاظ کے الٹ پھیر سے۔ داغ اس کے برخلاف یہ مطلق پروا نہیں کرتا کہ کیا موقع ہے۔ صاف کہنا چاہئے یا پردے میں چھپا کر۔ یہی مابہ الامتیاز فرق داغ اور مومن کی طنز کا ہے۔ ذیل کی چند مثالیں ہمارے اس دعوے کی شاہد عادل ہیں:۔

دیکھنا پیر مغاں! حضرت زاہد تو نہیں   کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو
تو بھی اے ناصح! کسی پر جان دے ٭ ہاتھ لا اُستاد! کیوں کیسی کہی!
لطف نے تجھ سے کیا کہوں زاہد ٭ ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

داغ کے ساتھ اکبر الہ آبادی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اکبر کی شاعری انیسویں صدی کے آخری سنین میں نمو و ترقی کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن، مغربی معاشرت و اخلاق زندگی کے ہر شعبے میں اثر انداز ہے اور ایک سیلاب تند و کی طرح اپنے ساتھ ہر شے کو بہائے لئے جا رہا ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء کو ابھی لوگ بھولے نہیں ہیں۔ ہندوستان انگریزی جبروت کے سامنے اپنا سر نیاز خم کر چکا ہے۔ اور برطانوی تسلط کی گرفت مضبوط ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ زبوں حال ہے۔ اسلامی روایات و آداب، اسلامی تمدن و تہذیب، اسلامی معاشرت و اخلاق ایک ایک کر کے سب رخصت ہو چکے ہیں۔ اہل ثروت نفس پرستیوں میں مبتلا ہیں تعلیم و تربیت، اتحاد و یک جہتی، ایثار و صداقت، ہمت و استقلال، بلند نظری و حق پرستی سب کا فقدان ہے۔ عقائد کمزور ہو چکے ہیں۔ دہریت، حرص و طمع، مکر و خود غرضی ہر طرف کار فرما ہے۔ برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر ہندوستانی کے دل میں بیٹھ چکا ہے۔ علم و فضل کا معیار انگریزی دانی پر موقوف ہو گیا ہے۔ تہذیب و شائستگی نام ہے انگریزی کھانا کھانے کا، انگریزی لباس پہننے کا، انگریزی زبان بولنے کا۔ غرض یہ فضا تھی جب اکبر کی شاعری کا آغاز ہوا اکبر کی حساس طبیعت ان بدعنوانیوں کو دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں کڑھتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام بدعتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ٹھان لی اور آنے والے خطرے سے اپنی قوم کو آگاہ کیا مگر اشکباری سے نہیں بلکہ تیغ ہجو کی زبان سے، وہ ان تمام غیر اسلامی طریقوں کا طنز کے پیرائے میں مذاق اُڑاتے ہیں اور اتنا ہنساتے ہیں کہ لوگ رو پڑتے ہیں۔ وہ کم و بیش زندگی کے ہر شعبے پر اپنے انداز خاص میں اظہار رائے کرتے ہیں۔ اسی لئے بعض الفاظ اُن کی لغت میں خاص مفہوم کے حامل ہو گئے ہیں لیکن اس طور پر نہیں کہ اُن کی تشریح کے لئے ایک فرہنگ علٰحدہ مرتب کرنی پڑے بلکہ اس نہج پر کہ اُن کا محل استعمال خود اُن کے معانی آشکار کر دے۔ مثلاً بابو۔ کالج۔ کمسریٹ۔ ڈنر۔ بدّھو میاں۔ صاحب شیخ صاحب۔ لاٹ صاحب۔ ڈارون۔ کمیشن۔ ادنٹ۔ نیٹو۔ اسپیچ۔ کونسل وغیرہ وغیرہ۔ ذیل میں چند نمونے ان کی طنز کے پیش کئے جاتے ہیں ؎

فن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب   یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی
نبوت کا زمانہ اور تھا اب اور جھگڑے ہیں   وہاں سینوں میں قرآں تھے یہاں سینوں پہ تمغے ہیں
نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے   تو خوشی ہی اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کہ جج ہے
بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا   پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہو گا
خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں   حجاب ان کو نہیں آتا، انہیں غصہ نہیں آتا
رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں   کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں
ہم نشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا   میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا
نیشنل فیلنگ تو ہم سب میں کبھی تھی ہی نہیں   اتحادِ دیں فقط باقی رہا تھا، اب گیا
پیٹ میں کھانا، زباں پہ کچھ مسائل ناتمام   قوم کے معنی گئے اور روح کا مطلب گیا

بیرسٹری کے لئے معصوم ہندوستانی انگلستان گیا۔ وہاں بتان فرنگ کے حسن صبیح نے اتنا متاثر کیا کہ واپسی پر اپنے ساتھ ایک میم بھی لے آیا۔ اکبر نے فوراً طنز کیا چنانچہ کہتے ہیں۔

اک لعبت چیں کو لندن سے جو بیاہ کے لائے مغلیں ہوا احباب نے تیر مطاعن سے اُن کے دل کو مجروح کیا
باپ اُن کے یہ بولے کتنی مری لٹیا ڈوبی ہائے غضب ہوا اس لڑکے نے صحبت بد پا کر یہ کار بن نوح کیا
تعلیم کو میں نے بھیجا تھا تیز و بح کی اِس نے ٹھہرائی ہا ممدوح تو بننا بھول گئے بس اپنے تئیں منکوح کیا
لڑکے نے جواب میں عرض کیا اے قبلہ و کعبہ سنئے تو!
یہ کون برائی میں نے کی جو فاتح کو مفتوح کیا

اکبر اپنے انداز طنز کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔ بہت سے لوگوں نے اُس کے ظریفانہ رنگ کی تقلید کرنی چاہی ہے۔ مگر انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ اقبال نے بھی کچھ ظریفانہ اشعار کہے ہیں لیکن مولوی مدن کی بات بھلا اُن میں کہاں۔ اکبر نازک سے نازک مسئلے پر اس طرح طنز کرتا ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں لیکن اس ہنسی میں شعر کی تاثیر زائل نہیں

ہو جاتی۔

اکبر کے بعد ریاض خیر آبادی بہترین طنز گو شاعر ہیں۔ وہ فطرتاً ظریف اور بذلہ سنج انسان تھے۔ خانگی پریشانیوں کے باوجود بھی کبھی اُن کی پیشانی پر شکن نہیں پڑی اور مزاج میں درشتی یا چڑچڑاپن پیدا نہیں ہوا لیکن ریاض محض غزل گو شاعر تھے۔ اس لئے اُن کی طنز صرف زاہد و واعظ یا رقیب و محتسب تک محدود ہے۔ اُن کا انداز اس باب میں داغ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے جیسے داغ زاہد پر صاف صاف بوچھاڑ کرتا ہے۔ اسی طرح ریاض بھی شیخ کو کھلے ڈھلے الفاظ میں لتاڑتے ہیں کہتے ہیں ؎

بڑے پاک طینت، بڑے صاف باطن   ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

اگرچہ اس شعر میں خود اپنے اوپر طنز کیا ہے لیکن "کچھ ہمیں جانتے ہیں" کا ٹکڑا کس قدر دلچسپ اور پُر معنی ہے۔

اور شعر لیجئے ؎

وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ   بہادے اتنی کہ ساقی کہیں نہ ماہ ملے

کمر سیدھی کرنے ذرا میکدہ میں   عصا ٹیکتے کیا ریاض آرہے ہیں

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات   اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

مری شراب کی کیا قدر جانے تو واعظ   جسے میں پی کے دعا دوں وہ جنتی ہو جائے

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی   میکدے سے اب پرانی جائے گی

ذیل کے شعر میں کس بلا کی شوخی و ظرافت ہے ؎

کمبخت نے شراب کا منہ کس قدر کیا   واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

محبوب پر طنز کرتے ہیں ؎

قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے   وہ تم سے قد میں کم سن میں بڑی ہے

ایک اور جگہ کیسی اچھوتی اور طنز آمیز بات کہی ہے ؎

کام آئے گی ریاض کے مشق طواف خم   کعبے کے گرد ہوں گے جو سوجھی شراب کی

یا

حشر کے دن ہمیں سوجھی یہ شرارت اچھی   لے گئے چھانٹ کے ہم خلد میں عورت اچھی

اپنے اوپر طنز کرتے ہیں ؎

حنا لگا کے پہنچتے ہیں گلرخوں میں ریاض   کچھ ان کی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

اسی طرح ایک اور جگہ شوخی سے کہتے ہیں ؎

افسردہ جان کر وہ ہمیں چھیڑ لیں ریاض   آجائے گا مزا جو طبیعت سنبھل گئی

غرض کہاں تک مثالیں دی جائیں۔ اس قسم کے ظرافت آمیز اور طنزیہ اشعار ریاض کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں۔

موجودہ دور میں حسرت و اصغر بھی کہیں کہیں شیخ و زاہد پر اچھے طنزیہ اشعار کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً حسرت لکھتے ہیں ؎

رعنائی خیال کو ٹھہرا دیا گناہ   زاہد بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور

اردو کے قدیم شعراء مثلاً میر، سودا، مصحفی، انشا، آتش، ناسخ وغیرہ نے عام طور پر ناصح کے متعلق جو اشعار لکھے ہیں وہ اس قدر سوقیانہ اور تہذیب سے گرے ہوئے ہیں کہ اُن کا پڑھنا بھی ناگوار ہوتا ہے ؎

بن عصا شیخ ایک قدم نہ رکھے   راہ چلتا نہیں یہ خر بے چوب

لیکن غالب نے اس ادبی ہجو کا معیار بلند کیا اور بعد کے شعراء نے شیخ کی خبر چبھتے ہوئے فقروں سے لی مگر حسرت نے اس شعر میں "مذاق سخن سے دور" کہہ کر سب سے علیحدہ اور نرالے انداز میں چوٹ کی ہے جس میں متانت قائم ہے اور فقرہ بازی کا لطف بھی۔ اسی طرح اصغر کا شعر ہے ؎

بہت سمجھے ہوئے ہے شیخ راہ و رسم منزل کو   یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

حضرت جوش کا کلام عام طور پر متین ہوتا ہے لیکن اُن کی طبعی ظرافت کہیں نہ کہیں اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے۔ بعض اُن ظریفانہ منظومات سے قطع نظر کر کے جو انہوں نے ظریفانہ انداز میں لکھی ہی ہیں مثلاً "پیٹ بڑا بدکار" وغیرہ اُن کی ایک نظم طنز کی بہترین مثال ہے۔[1] جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"پیرزن لیگ"

کل رات کو یہ خواب تھا کیا حضرتِ آزاد!   آغوش میں ظلمت کی ہے سہما سا اُجالا

سہمے سے اجالے میں ہے اک پیرزن تند   اوڑھے ہوئے شہباز جوانی کا دوشالا

یوں گرمِ سخن ہے کہ جو اللہ نے چاہا   کر دوں گی میں اسلام کی دنیا میں اجالا

اک بوند میں بہ جائے گی تعمیرِ دو عالم   چھلکے گا مرے صبر کا جس وقت پیالا

ہاں لیگ ہوں، اسلام کی دیرینہ مجاہد   ہر بات مری تیغ ہے ہر سانس ہے بھالا

کافر کو جلاتی ہوں سرِ نارِ جہنم   مومن کو عطا کرتی ہوں جنت کا قبالا

آ ہی نہیں سکتا مرے منہ لالۂ بزدل   میں پاک، وہ ناپاک، میں گوری وہ کالا

کیا اس کا مرا ذکر، وہ دیسی میں بدیشی   میں مصر کی مسجد، وہ بنارس کا شوالا

گنگا کی ہر اک لہر میں علیحدہ ہے لیتی   دجلہ کی ہر اک موج میں رقصاں ہے ہلالا

کفار کے دل اور مرے چند سپاہی   اعدا کے پرے اور مرا ایک رسالا

بھڑکوں تو ابھی سینۂ گیتی کو جلا دوں   گرجوں تو ابھی چرخ کو کر دوں تہ و بالا

ہر فرد حکومت ہے مری آنکھوں کا تارا   ہر خان بہادر ہے مری گود کا پالا

اتنے میں اک انگریز نے اک قصر کے در سے
آہستہ سے پٹ کھول کے سر اپنا نکالا

[1] یہ نظم جوش کے مجموعۂ نظم "حرف و حکایت" میں موجود ہے۔

پیشانی گلرنگ پہ کچھ افسردگی سی ہی — آنکھوں میں فسوں، ہاتھ میں سونے کا نوالا
یہ دیکھتے ہی پیرزن لیگ یکا یک — دوڑی بڑی شفقت سے اٹھائے ہوئے مالا
مالے کو پہناتے ہی بہ انداز محبت — بہرِ نظر لاڑ کے آنچل کو سنبھالا
اور کہنے لگی پیار سے نے لے کے بلائیں
اے نورِ نظر! سلمہ اللہ تعالیٰ!

مسلم لیگی خیالات کی اس سے بہتر پیرائے میں ہجو ممکن نہیں۔

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر اس دور کے طنز نگار شعرا کے ذیل میں حضرت ظریف لکھنوی کا ذکر نہ کیا جائے گا۔ ظریف فطرت کی طرف سے ایک طنز گو کا دماغ لے کر آئے تھے زندگی کے اکثر و بیشتر مسائل پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ ظرافت کے پردے میں اکثر کام کی بات کہہ جاتے ہیں۔ اُن کی زبان میں ایک لطف ہوتا ہے اور انداز بیان میں ندرت۔ بطور نمونہ چند اشعار اُن کی نظم "رجز" سے جو جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے موقعہ پر لکھی گئی تھی منتخب کر کے پیش کئے جاتے ہیں ؎

ہم لوگ افیونی ہیں جب رنگ جما دیں گے — جرمن ترے نشے کو مٹی میں ملا دیں گے
برلن ہی میں دم لیں گے واللہ جو چینہ دوڑے — افیون کی شکل کی جب بانگ اٹھا دیں گے
تو ہم سے بہادر یا ہم تجھ سے بہادر ہیں — پینک سے ذرا چونکیں ہم تجھ کو بتا دیں گے
سُن گولیاں کھانے کی دن رین ہمیں عادت ہے — افیون کی ڈبیا تو دیکھے تو دکھا دیں گے
رستم سے سوا طاقت ہو جائے گی ہم سب کیا — جب چائے میں تھوڑی سی بالائی ملا دیں گے
بے کے چھڑے گد کا جب پیتے ہیں — برلن کے اکھاڑے میں اک دھوم مچا دیں گے
لٹھ لے کے جو جا پہنچے، سر توڑ دیا فوراً — جرمن تری توپوں میں ہم بانس چلا دیں گے
جرمن ہو یا آسٹریا، پانی میں اگر آئیں — ہم اپنے کروزر سے دونوں کو بھگا دیں گے
ہم شہر کا بیس خور، وہ کھائے ہوئے گیدڑ ہیں — تو بھاگ کھڑا ہوگا بھبکی جو دکھا دیں گے
جرمن تجھے دھونے ہو گر چوک میں تو آجا — گت تیری بنا دیں گے اور تجھ کو نچا دیں گے
ہم سے بھی ناخوش تھا اب اس سے بہت خوش ہیں — ٹھیکہ یہ جو آئے گا افیون کھلا دیں گے
بیس برس گزرے طاعون سے لڑتے ہیں — موت آئے تو اک ٹھیکا اس کے بھی جما دیں گے
ہم قحط کے مارے ہیں مرنے سے نہیں ڈرتے — اک دن یہ جو اٹکے دس بیس بھگا دیں گے
تو مار ہی ڈالے گا تو یاد رکھ اے جرمن! — بھتنا تجھے بن بن کر راتوں کو ڈرا دیں گے
ترکوں سے کوئی کہہ دے کیوں لڑتے ہوئے آغا — تم جان ہی کر دو گے، جرمن تمہیں کیا دیں گے
جن لوگوں کے کہنے سے تم جان گنواتے ہو — بھیا ابھی سب مل کر اک روزہ غا دیں گے

واللہ ظریف ایسی لکھی ہے رجز تو نے
ہم سب کا ارادہ ہے چندے سے صلہ دیں گے

مولانا ظفر علی خاں بھی اپنی طنزیہ منظومات کی وجہ سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں مشکل ہی سے کوئی ایسی نظم ہوگی جو ظرافت سے خالی ہو۔ کیا سیاست، کیا معاشرت، کیا اخلاق وہ کونسا موضوع ہے جس پر اُن کی نظمیں موجود نہیں بعض نظم تو بہت ہی چبھتی ہوئی طنز کی حامل ہوتی ہے۔ ایک نظم "شیخ اور برہمن کی چپقلش" پیش کی جاتی ہے:۔

"شیخ اور برہمن کی چپقلش"

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند — اور آ گئے آگے لالہ کے اُن کی بہو گئی
پوچھا جو میں نے لالہ للائن کہاں گئیں؟ — نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی "جو" گئی
میں نے دیا جواب انہیں از رہِ مذاق — کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چو گئی
کہنے لگے کہ آپ بھی ہیں مسخرے عجب — اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی بو گئی
"جو" ہوشیار پور میں ندی سے ہے مراد — بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی
میں نے کہا کہ "جو" سے اگر ہے مراد "جو" — تب یوں کہو کہ تا بہ لبِ آبِ جو گئی
کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ — دھوتی سے آپ کی نہیں ہندی کی بو گئی
لطفِ زباں سے کیا ہو سروکار آپ کو — دامن کو آپ کے نہیں تہذیب چھو گئی
ہندی نے آ کے جیم کو چے سے بدل دیا — "جو" آئی کوہسار میں گلشن سے "جو" گئی
لہجہ ہوا درشت، زباں ہو گئی کرخت — لطفِ کلام و شستگی گفتگو گئی
معنی کو سنبھے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں — شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی
افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر
مستی اُڑی شراب سے پھولوں سے بو گئی

نثر میں بے تکلف تحریر کی ابتدا غالب نے کی۔ مگر اُن کی "سادگی میں پرکاری" اور متانت میں ظرافت کا امتزاج ہوتا ہے۔ اور جہاں تک اُن کی نثر نگاری کا تعلق ہے۔ اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی پر مرزا کے قصرِ شہرت کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے اُن کے خطوط آج بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ طرزِ نگارش کا یہ اسلوب غالب سے پیشتر کہیں دیکھنے میں نہیں آتا پرانے لوگوں کے خطوط پڑھ ڈالئے۔ اول تو القاب آداب اتنے طویل کہ اُن کا پڑھنا اجیرن ہو جائے، پھر مرزا رجب علی بیگ سرور کی سی مقفّیٰ و مسجع عبارت، جس میں مطلب کی بات کم اور الفاظ کا گورکھ دھندا زیادہ ہوگا۔ مگر غالب کے خطوط بیک وقت مختصر بھی ہیں اور پُرلطف بھی۔ اپنے اس طرزِ تحریر پر خود غالب کو ناز ہے اور مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

بات دراصل یہ ہے کہ ہر ذہین طبیعت اپنے لئے نئی راہیں تلاش کر لیتی

ہے پس غالب نے بھی ایک نیا طرزِ انشا ایجاد کیا۔ اپنے بعض خطوط میں انہوں نے ادبی نکات بھی حل کئے ہیں لیکن ظرافت کی چاشنی سے وہ بھی خالی نہیں ہیں۔ جس چیز کو ادبی ہجو کہتے ہیں نثر میں غالب ہی نے داخل کی۔ اُن کے فقرے چھوٹے چھوٹے مگر لطیف مزاح کے حامل ہوتے ہیں۔ بقول مرزا محمد عسکری بی اے جس طرح "اکبر مرحوم ظریفانہ نظم میں اپنا عدیل و نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح غالب بھی شوخ و ظریفانہ نثر میں یگانہ و منفرد تھے۔" ذیل میں ایک خط جو مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ہے اس کو درج کیا جاتا ہے:۔

"لا حول ولا قوۃ کس ملعون نے بہ سبب ذوقِ اشعار کی اصلاح منظور رکھی
اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریقِ قہر
درویش بر جانِ درویش لکھا تھا جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ
مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمہارے ساتھ وہی معاملہ ہے۔"

غالب کی بے مثل نثر کے بعد اردو کی طنز نگاری کی تشکیل میں اودھ پنچ لکھنؤ کا زبردست حصہ ہے۔ اودھ پنچ کی خصوصیت اُس کی ظرافت نگاری تھی۔ زندگی کا مشکل ہی سے کوئی شعبہ اس کے طنز سے بچا ہوگا۔ لیکن یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اودھ پنچ میں ہر قسم کی ظرافت ملتی ہے۔ اچھی بھی، بری بھی۔ مگر بلند کم اور پست اکثر و بیشتر۔ مثلاً گلزارِ نسیم کا مباحثہ اکثر جگہہ مذاقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ بہر حال جو کچھ تھا اور جیسا تھا وہ پرچہ اس دور کی ظرافت کا آئینہ تھا۔ اُس کا اردو ادب پر یہ کافی احسان ہے کہ بہت سی خفتہ قوتوں کو یکایک بیدار کر دیا۔ منشی سجاد حسین، سرشار، مچھو بیگ، پنڈت ترمبون ناتھ ہجر، مولوی عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، احمد علی شوق، اکبر الہ آبادی اور مولوی احمد علی کسمنڈوی وغیرہم کو ادبی دنیا سے روشناس کرانے کا سہرا صرف اودھ پنچ کے سر ہے اور اس کی اس خدمت کا اعتراف کرنا ادب اردو کے مورخ کا فرض ہوگا۔

منشی سجاد حسین اودھ پنچ کے اڈیٹر تھے۔ اُن کی تمام تحریرات ظرافت کے نقش و نگار سے مزین ہوتی ہیں مگر وہ عربی فارسی کے ثقیل اور وزنی الفاظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے فقروں پر جتنا آپ غور زیادہ کریں گے اُن کا لطف اسی قدر بڑھتا جائے گا۔ سرشار کے برخلاف وہ ایجاز و اختصار کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی شہرۂ آفاق کتاب "حاجی بغلول" باعتبارِ ظرافت اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اُن کی ایک ایک پھبتی بعض اوقات پورے دفتر پر بھاری ہوتی ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار پنچ کے خاص نامہ نگاروں میں تھے۔ اُن کی شہرۂ آفاق تصنیف فسانۂ آزاد منصۂ شہود پر آنے کے لئے بڑی حد تک اودھ پنچ کی رہینِ منت ہے۔ سرشار نے کتابیں اور بھی لکھی ہیں مگر جو مقبولیت اس تصنیف کو ہوئی وہ کسی کتاب کو میسر نہ آسکی۔ فسانۂ آزاد ہی میں سرشار کی تحریر کی دلکشی سب سے زیادہ جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرتِ انسانی کا مطالعہ سرشار نے نہایت گہرا کیا ہے۔ ظرافت نگاری اُن کا جزو تحریر ہے اور عبارت آرائی اُن کا طرزِ خاص۔ اسی کے باعث ضرب الامثال اُن کے کلام کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ کچھ ہنسنے ہنسانے والے الفاظ استعمال کر کے وہ اپنے کلام کو اتنا طول دے دیتے ہیں کہ معمولی مطالب صفحے کے صفحے گھیر لیتے ہیں مگر باوجود اس قدر شرح و بسط کے، کیا مجال جو دلچسپی میں کمی آجائے۔ بعض طنزیہ فقرے اس قدر بامزہ اُن کی زبان سے نکل جاتے ہیں کہ اُن کو سُن کر آپ تبسم زیرِ لب نہیں قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جس بے چارے پر فقرہ کسا جاتا ہے، شرمندہ ہو کر چپ ہو جاتا ہے۔ اُن کی یہ خصوصیت ایسی ہے کہ اس میں کوئی بھی اُن کا مدمقابل نہیں۔

ممکن ہے بعض لوگ کہیں آزاد اور خوجی جیسے آدمی دنیا میں تلاش کے بعد بھی ملنے مشکل ہیں۔ یہ درست ہے۔ سرشار کے کردار واقعی غیر معمولی انسان ہیں مگر اُن کی رفتار گفتار سے ایسا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انسانی خون اُن کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اُن کے خیالات میں زیادہ عمق نہ سہی مگر انسانیت کی بو ضرور ہے اور باوجود غیر معمولی ہونے کے سرشار کے کردار اپنی ذاتی خصوصیت کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ نمایاں ہیں۔ خوجی فسانۂ آزاد کا ضروری کیرکٹر ہے۔ ضروری اس لئے کہ اسی کی موجودگی کی بدولت ایک ایک ہزار صفحے کی چار جلدیں آپ پڑھتے چلے جاتے ہیں اور طبیعت منغص نہیں ہوتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب سرشار کا اشہبِ قلم ظرافت کے لئے بے چین ہو جاتا ہے تو فوراً خوجی آدھمکتے ہیں کیونکہ میری رائے میں خوجی کے پردے میں مصنف نے خود اپنے آپ کو چھپا رکھا ہے۔

اودھ پنچ کے دور کے بعد محفوظ علی بدایونی نے "تجاہلِ عامیانہ" کے ذیل میں مولانا محمد علی مرحوم کے اخبار "ہمدرد" (دہلی) میں نہایت دلکش ظریفانہ مضامین لکھے۔ قریب قریب یہ تمام مضامین سید صاحب کے قلم کی تراوش کا نتیجہ ہیں، البتہ کچھ مضامین ہمبوق کے قلم کے بھی ہیں۔ ان مضامین کی ظرافت حد درجہ مسرور کن بلند اور خوش آہنگ ہے۔ جو لفظ جس جگہہ لکھا گیا ہٹایا نہیں جا سکتا لیکن کہیں کہیں رعایتِ لفظی کے دلدل میں بھی سید صاحب پھنس جاتے ہیں اور اسی کی بدولت انہیں اکثر تمثیلیہ کے پھندوں میں بھی اسیر ہونا پڑتا ہے۔

بعض لوگوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی طنز نگاروں میں شمار کیا ہے۔ لیکن سوائے اس کے کہ یہ دونوں بزرگ انگریزی حکومت اور انگریزیت کے خلاف ہیں اور اسی نقطۂ نگاہ کے ماتحت

اُن کے مضامین نکلتے ہیں اور کوئی بات ہم اُن میں ایسی نہیں پاتے جس کے سبب ہم اُن کا ذکر طنز نگاروں میں کریں۔ دونوں کی عبارت متین ہوتی ہے اور دونوں کی تحریر میں خطیبانہ شان پائی جاتی ہے۔ یہی وہ کوتاہی ہے جو کسی طنز نگار میں نہ ہونی چاہئے، کیونکہ اگر قارئین کو یہ معلوم ہو گیا کہ تحریر میں ظرافت کا فقدان ہے اور صرف چند رد کھی پھیکی نصیحتوں کو قرطاس کی زینت بنا دیا گیا ہے تو وہ لکھنے والے کی عبارت کو طنز نہ کہیں گے بلکہ پند و موعظت کا دفتر سمجھیں گے۔ مولانا عبد الماجد کی طرز تحریر میں زور اور روانی ضرور ہے مگر چار سطریں پڑھنے کے بعد ناظرین کے دماغ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ مولانا لکھ نہیں رہے ہیں، منبر پر کھڑے ہوئے تقریر کر رہے ہیں۔ یہی حال مولانا ابو الکلام آزاد کا ہے۔ اُن کی تحریر دلکش ضرور ہے مگر خطابت کا نقص اس میں بھی موجود ہے۔ اور یہ رائے اُن کے قدیم طرز تحریر کے متعلق ہے ورنہ مولانا نے جو نیا ہندی آمیز اسلوب نگارش اختیار کیا ہے اُسے تو طنز سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مضمون "طنزیات اردو" شائع شدہ رسالہ ہندوستانی بابت اپریل ۱۹۳۲ء میں مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابو الکلام اور خواجہ حسن نظامی کا ذکر تو کر دیا لیکن ایم مہدی حسن مرحوم مصنف "افادات مہدی" اور سجاد علی انصاری مرحوم کو قطعاً نظر انداز کر گئے حالانکہ یہ دونوں حضرات طنز نگاروں کی فہرست میں ایک ممتاز جگہ پانے کے مستحق تھے۔ مولانا عبد الماجد اور آزاد کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا لیکن ان مرحومین کا ذکر ناگزیر تھا۔

بہر حال جہاں تک مہدی حسن کی طنز نگاری اور اسلوب نگارش کا تعلق ہے اُن کا طنز اکثر چبھتے ہوئے فقروں میں مستور رہتا ہے، کہیں کہیں صفائی پر بھی آ جاتے ہیں اور ناموزوں الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں جو اُن کے قلم سے اچھے نہیں معلوم ہوتے مگر حسن بیان اور لطف انشاء کی وجہ سے سب کھپ جاتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"افسوس ہے کہ وہ اپنے چھچھورے اور ذلیل اظہار خیال اور بے باکانہ اظہار رائے سے جس کو خبر سے آپ تنقید سمجھتے ہیں، صرف اپنا جہل مرکب ثابت کر سکے"۔

خط کشیدہ الفاظ قابل غور ہیں جو مہدی جیسے ثقہ نقاد کے شایانِ شان نہیں، لیکن بہر حال اس قسم کے خارزار میں کہیں کہیں چمن بندی کے آثار بھی نظر آ جائیں گے۔ اور آپ کہیں گے طنز اعلیٰ درجہ کی طنز ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے چند اقتباسات پڑھئے:۔

"جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے، اردو کو انشاپردازی کے درجہ پر جس نے پہنچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں اور گو اس مسئلے پر ابھی کافی توجہ نہیں کی گئی ہے، لیکن آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے، جس کا فیصلہ خود فلسفہ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔ جن حضرات کی نگاہیں دلی اور لکھنؤ کے اختلافات تک محدود ہیں، یا جن کی قاصر النظری بے سکر اس خیال کی تائید کی مانع ہو وہ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں بلا خوف تردید یہ عرض کروں کہ پروفیسر آزاد کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اُس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفہ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے آسان نہیں ہے"۔

ملاحظہ کیجئے "دوم درجہ کی خلقت" کیسا بلیغ فقرہ ہے۔ نہ کہنے پر سب کچھ کہہ دیا ہے لیکن صرف نکتہ شناس نگاہیں اس کو پہچان سکتی ہیں۔

مہدی مرحوم اپنے ثقہ دوستوں کو اُن کی "مولویت" پر چھیڑتے رہتے ہیں۔ ذرا دیکھئے کیسے لطیف اور پُرمذاق فقرے لکھ جاتے ہیں۔ مولانا شبلی کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:۔

"مدت کی تلاش کے بعد وہ جنس لطیف ہاتھ آئی جو آپ لوگوں کو دوسری دنیا میں ملے گی ..... جناب ماجد ہوں یا آپ دونوں صاحبوں کی مدرسیت میری سمجھ میں نہیں آتی کہ عورت مرد بنا کر پیش کی جائے اور اُس سے انشاپردازی کی سنجیدگی پر استدلال ہو"۔

رسالہ "نقاد" کے متعلق ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"نقاد میں مضامین کیا لکھوں کتنا طوطے کو پڑھایا پر حیوان ہی رہا۔ اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ پہلے ایک خانگی بہم پہنچائی گئی تھی۔ اب ڈنکے کی چوٹ ایک سرائے والی پیش کی گئی ہے یعنی زنانی کی جگہ ایک شگفتہ کلی نے بے بی شاہ صاحب "تصوف" کے دلدادہ، لغزش مستانہ سہارا ڈھونڈھتی ہے۔ موقع ملا اور پھسلے"۔

افسوس ہے مہدی مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ممکن ہے کچھ اور ادبی جواہر پارے اُن کی یادگار رہ جاتے۔

مہدی کی طرح سجاد علی انصاری بھی ادبی دنیا کو جلد مفارقت دے گئے اُن کی یادگار اس وقت صرف چند مضامین کا مجموعہ ہے جو "محشر خیال" کے نام سے شرکت ادبیہ علی گڈھ نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تھا لیکن اُن کی تحریرات آج بھی یہ بتا رہی ہیں کہ زندہ رہتے تو کیا کچھ نہ کرتے۔ اُن کی تحریر سنجیدگی لئے ہوتی ہے مگر انشاپردازی کی شان کے ساتھ۔ ادبی خوبیوں سے اُن کا کلام اس قدر مزین ہوتا

ہے کہ بے ساختہ تحسین وآفرین زبان سے نکل جاتی ہے کبھی کبھی طنز بھی کر جاتے ہیں. مگر ایک نزاکت کے ساتھ۔ بھونڈا مذاق یا پھکڑپن اُن کے بس کی بات نہیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اُن کی تحریرات بہت ہی قلیل ہیں مگر جو کچھ ہیں اور جتنی ہیں سر دُھننے کے لئے کافی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"مجھے حالی کی شخصیت سے کوئی کاوش نہیں۔ اردو شاعری میں اُن کا درجہ بلند ہے لیکن اس اعتراف کا یہ تقاضہ نہیں کہ میں اُن کی شاعری کے ہنر کو تسلیم کروں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ وعظ و تلقین کے سلسلہ میں انہوں نے جس قدر شاعری کی وہ سعی لاحاصل سے زیادہ نہیں انہیں مسائل کو وہ نثر میں ادا کر سکتے تھے اور کامیابی کے ساتھ نظم کی زحمت انہوں نے ناحق گوارا کی۔ میں اُستخوان پرستی کا قائل نہیں کہ ہر اُس شاعر کو پیغمبر سمجھوں جس کے ہر لفظ کو جہلا وحی و الہام سمجھتے ہیں۔"

اب حصۂ نظم کے متعلق سنئے!

"شاعری میں عام طور سے ہرزہ سرائیوں کی گنجائش بہت ہے۔ اس لئے ہر وہ نادان جو اپنے دل دماغ میں خس و خاشاک کے علاوہ کچھ نہیں رکھتا مگر ساتھ ہی ہوسِ اشاعت سے مغلوب رہتا ہے، وہ بلا خوف و ہراس شعر کہنے لگتا ہے۔ آپ باوجود اپنی کاوشوں کے اِس کا علاج نہیں کر سکتے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"سعید انصاری کی نظم پڑھتے ہی میں بدحواس ہو گیا براہِ خدا اُن سے التماس کیجئے کہ کبھی نظم کو مرہونِ منت نہ فرمایا کریں، ورنہ اندیشناک صورتیں پیدا ہو جائیں گی۔

ع "سچ بتا اے بامِ کعبہ کے مکیں کی ہم نسب" یا ع "ہو کا عالم کر رہا تھا سارا جنگل بجائیں بجائیں" وغیرہ وغیرہ۔ یہ شاعری ہے! ان کا ہر شعر خوش دماغ انسان کی توہین ہے۔ ایک صاحب نے کمال کر دیا۔

ع۔ یوں کسی کا مات بھر کہنا کہ ہائے درد ہے

ایک اور مصرعے میں "ہائے درد ہے"۔ یہ نئے قسم کا مد ہے۔ کیا وہ ہمیشہ "ی" کو اسی طرح کھینچ کر بولتے ہیں! بدسلیقگی کی کوئی حد ہونی چاہیئے"

اس اقتباس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سجاد کا طنز جب کبھی ہوتا ہے تو ادیبانہ نکتہ سنجی کے ساتھ۔ خواہ مخواہ اور رکیک فقرہ بازی کو وہ پسند نہیں کرتے۔

عہدِ حاضر کے طنز نگاروں میں ملا رموزی، احمد شاہ بخاری پطرس، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی کا نام آتا ہے لیکن ملا رموزی اکثر پھکڑپن اور سوقیانہ مذاق کی طرف مائل رہتے ہیں۔ شوکت تھانوی بھی بعض جگہ مذاقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں عظیم بیگ چغتائی کا بھی تقریباً یہی حال ہے مثال کے طور پر "لوٹے کے راز" میں انہوں نے ایک ایسے شخص کا کردار پیش کیا ہے جس نے پہلی بیوی کی وفات پر باوجود سنِ کہولت کے دوسری شادی ایک چودہ سالہ دوشیزہ سے کر لی ہے۔ ان بڑے میاں کے جوان جوان لڑکے بھی موجود ہیں جو اپنی سوتیلی ماں کی کمسنی اور حسن دیکھ کر متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور چند سوقیانہ فقرے اپنی ماں پر کس دیتے ہیں۔ یہ بات کتنی ہی مطابق فطرت بتلائی جائے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عظیم بیگ صاحب کو بازاری لوگوں کی زبان سے جو فقرے ادا ہوتے ہیں اُن کو بھی اپنے افسانوں میں داخل کرنے کی اجازت ہے۔ یہ تو سراسر خود اُن کے مذاق کی غمازی ہے[۱] عظیم بیگ صاحب کا کارنامہ جو کچھ ہے وہ صرف "کولتار" کو سمجھنا چاہیئے۔

احمد شاہ بخاری پطرس کا مذاق معیار سے تو نہیں گرتا لیکن اُن کی اِس ظرافت نگاری کو صرف دوسرے درجے میں شمار کیا جا سکتا ہے[۲]۔ رشید صاحب کے مضامین دلچسپ ضرور ہوتے ہیں لیکن اُن کے افسانوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ اصل مبحث سے ہٹ کر بہت سا غیر ضروری مواد بھی اُس میں بھر دیتے ہیں جس کا احساس خود اُن کی زبان میں "سوائے اُن کے سب کو ہے"! اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ظرافت اُن سے مضمون نہیں لکھا رہی بلکہ وہ خود ظرافت کو کھینچ تان کر اپنے مضمون میں ٹھونسنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ حضرت نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مکتوب میں جو نگار میں شائع بھی ہو چکا ہے لکھا ہے کہ لوگ اردو ادب میں ظرافت کی تلاش بے سود کرتے ہیں۔ ظرافت تو اُس ملک کے ادب میں مل سکتی ہے جو فارغ البال ہو اور جہاں دولت و ثروت کی کمی نہ ہو۔ ہندوستان میں مفلسی ہر طرف چھائی ہوئی ہے۔ ایسے ملک کے ادیب اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو وہ مصنوعی ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں چند اردو کے ظرافت نگاروں پر بھی ایک ایک دو دو فقروں میں تبصرہ فرمایا ہے۔ رشید صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ "اب رہ گئے رشید صاحب تو وہ بھی یوں سمجھئے گھسٹ رہے ہیں"!

البتہ جو لوگ واقعی اپنی ظرافت آمیز تحریرات کی وجہ سے کسی بلند جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ اُن میں صرف دو آدمی ہیں۔ ایک حضرت نیاز فتح پوری اور دوسرے مرزا فرحت اللہ بیگ۔

جناب نیاز نقاد بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی[۳]۔ افسانہ نویسی میں وہ زیادہ تر یونانی علم الاصنام سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اُن کے بیشتر افسانوں کا پس منظر یہی ہوتا

۱ه اگر کسی مصنف کے ذاتی مذاق کو پرکھنے کا یہی معیار ہے تو معاف کیجئے پھر دنیا کا کوئی مصنف معزز ہستی کہلائے گا (ادارہ)، ۲ه تشریح کے بغیر یہ دعویٰ بے ثبوت رہے گا (ادارہ)، ۳ه بجا! لیکن مزاح نگار بھی؟ (ادارہ)

ہے۔ تحریر کی شگفتگی اور دلآویزی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ بعض لوگ اُن کی تحریر کی "عربیت فارسیت" سے ناراض ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ اُن کی انشاپردازی کا زور ہی اس سے قائم ہے۔ اپنے افسانوں میں زندگی کے مختلف مسائل پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور جب افسانوی رنگ میں طنز کرنے پر آتے ہیں تو خوب کرتے ہیں مثال کے طور پر نقاب اُٹھ جانے کے بعد میں جھوٹے اور مصنوعی پیروں مریدوں کی زندگی پر خوب ضرب لگائی ہے۔ اسی طرح "مبر بیدانہ" کے عنوان سے جو مضمون جمالستان میں درج ہے۔ اُس میں اُن لوگوں کی اس عادتِ قبیحہ کو طنزیہ انداز میں طشت از بام کیا ہے کہ باوجود کوئی ضروری اور اہم کام نہ ہونے کے جب کسی شناسا سے راہ میں مل جاتے ہیں تو سڑک پر ہی اپنی گفتگو میں گھنٹوں لگا دیتے ہیں۔ "آدھ گھنٹہ دوزخ میں" بھی نہایت عمدہ مزاحیہ مضمون ہے۔

حضرت نیاز کی تحریرات عام طور پر متین ہوتی ہیں لیکن ان میں بھی وہ کوئی نہ کوئی سبک مگر چبھتا ہوا مزاحیہ فقرہ ضرور لکھ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُن کے تنقیدی مضامین بھی اُن کی اس خصوصیت سے محروم نہیں ہیں۔ چنانچہ مولانا سلیمان ندوی کے مجموعۂ مضامین "نقوشِ سلیمانی" پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مولانا سلیمان ندوی کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ کوئی صاحب کتاب کے نام سے یہ نہ سمجھیں کہ تعویذ گنڈوں کا نسخہ ہے۔ حضرت نیاز نے اپنے مکاتیب میں غالب کے اندازِ تحریر کی تقلید کی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں بے ساختگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن غالب کا اچھوتا مزاح، اُس کے چھوٹے چھوٹے طنز آمیز فقرے پیدا کرنے کی چیز نہیں۔ پھر ان خطوط میں تاریخ اور مکتوب الیہ کا نام نہ ہونے کی وجہ سے بھی بہت سے حضرات اُن کی اصلیت و واقعیت میں شبہ کرتے ہیں۔ بہر نوع اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کی مراسلہ نگاری کی تقلید بھی نیاز سے بہتر کوئی نہیں کر سکا۔ ذیل میں اُن کے ایک خط کو درج کیا جاتا ہے جس میں اُن کی تحریر کی جملہ خصوصیات نمایاں ہیں:-

"اے جفاہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں:

یہ تو زمانہ ہے کہ آپنے دیوانِ حیاتی کیا کیا — یہ بھی شکایت نہیں بلکہ بطریقِ لجاجت پوچھ رہا ہوں — آپ کو معلوم ہے کہ یہ نسخہ کمیاب ہے، اور میری ملکیت ہے بھی نہیں۔ اگر اصل مالک مجھ سے مانگ بیٹھا تو کیا میں اُس سے بھی یہی کہہ دوں کہ — ایک "دشمنِ دین و ایمان" لوٹ لے گیا! اور یہ آخر مجھ سے کہا کیونکر جائے گا — خیر میں تو کچھ نہ کہوں گا کہ شروع سے مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو سہا کیجے

لیکن وہ شقی کیوں ماننے لگا۔ آپ کا تو کچھ نہ جائے گا لیکن میں خواہ مخواہ چور بن جاؤں گا۔ اگر آپ کو میری رسوائی میں مزا آتا ہے تو خیر اسے بھی گوارا کر لوں گا لیکن یہ یاد رہے کہ اگر حشر میں میرا آپ کا معاملہ پیش ہوا تو آپ کا یہی ایک ظلم ایسا ہوگا جسے میں کبھی معاف نہ کروں گا اور آپ کے دادا یا نانا سید الشہدا سے التجا کروں گا کہ اس شخص کو کوثر و تسنیم کا ایک قطرہ بھی نہ دیجئے کیونکہ یہ شخص نسباً سید زادہ ہو یا نبی زادہ لیکن اخلاقاً نہایت مکروہ قسم کا یزید — پھر بتائیے آپ کیا کریں گے؟ —

بہرحال اگر اس قضیئے کو زیادہ بڑھانا مقصود نہیں تو اس کتاب کو واپس فرما دیجئے ورنہ آپ جانئے اور آپ کا کام، پھر مجھ سے شکایت نہ ہو کہ —!"

مرزا فرحت اللہ بیگ بھی ظرافت نگاروں کی صفِ اول میں بٹھائے جانے کے مستحق ہیں۔ اُن کی ظرافت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ رکاکت یا فحش و ابتذال سے انہیں سروکار نہیں۔ مضامین فرحت کے صفحے کے صفحے لوٹ جائیے۔ ایک جگہ بھی آپ کو تنغض کا موقعہ نہ ملے گا۔ تحریر کی شگفتگی اور متانت ہر جگہ موجود ہے۔ ظرافت کے پردے میں طنز بھی ہو جاتا ہے۔ مضامین دلچسپ اس قدر ہوتے ہیں کہ ایک دفعہ اٹھا کر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مثال کے طور پر اُن کے مضمون "نئی دہلی" سے کچھ سطور نقل کی جاتی ہیں:-

"..... اور اب کی پھول والوں کی سیر خدا نہ دکھائے شریف تو وہاں کیوں جانے لگے۔ جاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں بین الاقوامی تصادم نہ ہو جائے۔" میں نے کہا "مرزا صاحب بین الاقوامی تصادم نہیں۔ فرقہ وارانہ جنگ" کہنے لگے "چل ہٹ۔ جو بین الاقوامی تصادم وہی فرقہ واری جنگ، نہ اس کے کچھ معنی، نہ اُس کے کچھ معنی، خواہ مخواہ اخبار والوں نے نئے نئے لفظ گھڑ ڈالے ہیں اور تو نے یہاں کی زبان بھی سنی۔ سبحان اللہ کیا زبان ہے اور اسی پر مرجاتے ہیں کہ اُردو ہماری زبان ہے لکھنؤ کا حال تو مجھے معلوم نہیں، ہاں دلّی کی زبان تو اب کچھ نئی زبان ہو گئی ہے، وہ وہ لفظ سننے میں آتے ہیں کہ کیا کہوں اور یاں پڑھے لکھے لوگوں نے تو زبان کو اور بھی غارت کر دیا ہے۔ ایک لفظ اردو کا بولیں گے تو دو لفظ انگریزی کے بھئی مجھے تو یہاں کی زبان سے بھی

نفرت ہوگئی ہے۔ پرسوں جمعہ کو جامع مسجد میں ایک مولوی صاحب وعظ بیان کر رہے تھے۔ ماشاءاللہ کیوں نہ ہو مولوی تھے۔ چھانٹ چھانٹ کر وہ وہ لفظ حلق سے نکالے ہیں کہ سبحان اللہ! میری تو خاک سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ کہہ کیا رہے ہیں یہ تو رہے مسلمان۔ اب ہندوؤں کی زبان سنو تو وہ اس سے بھی عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم ہندی بولتے ہیں۔ جو وہ بولتے ہیں اگر اسی کا نام ہندی ہے تو میاں ہم تو مر بھی جائیں گے یہ زبان نہ آئے گی۔ اچھا بھئی ہم عربی بولیں تم ہندی بولو مگر اس طرح کہ جو لفظ ہماری تمہاری اردو میں نہیں ہے اس کے لئے مولوی صاحب عربی کا لفظ استعمال کریں، پنڈت جی سنسکرت کا لفظ بولیں۔ یہ کیا ہے کہ اردو میں لفظ موجود ہے اور اس کی جگہ ایک صاحب سنسکرت کا یہ موٹا لفظ لائیں اور دوسرے صاحب عربی کا یہ بڑا لفظ قاموس میں سے نکال کر استعمال کریں اور بھئی سنتا ہوں تمہارے ہاں بھی تو اردو کا کوئی بڑا مدرسہ کھلا ہے۔ سب علم اردو ہی میں پڑھایا جاتا ہے" میں نے کہا "جی ہاں کلیہ جامعہ عثمانیہ"۔ مرزا صاحب بڑے زور سے قہقہہ مار کر کہنے لگے "اوہو! یہ نام اور اردو کا مدرسہ۔ معلوم ہوتا ہے وہاں بھی مولویوں کا زور ہے۔ خیر جامعہ تو یہ ہے جیسے جامع مسجد عثمانیہ تمہارے بادشاہ کا نام ہوا اور میاں یہ کلیہ کیا بلا ہوتی" میں نے کہا "آپ اس بحث کو چھوڑیئے۔ دلی کی کچھ اور سنایئے۔۔۔۔"

اس اقتباس میں ملاحظہ کیجئے مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے کردار مرزا چھکڑے کی زبان سے کس لطیف پیرائے میں ہندو مسلمانوں کی کشمکش کو جو زبان کے متعلق ہے اپنے مخصوص انداز میں ادا کیا ہے۔[1]

---

[1] جن کتابوں یا مضامین سے اس مضمون کی تیاری میں مدد لی گئی ہے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) Hugh Walker: Satire and Satirists

(۲) Dryden: The origin & Progress of Satire

(۳) فارسی شاعری اور ہجویات" از پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی شائع شدہ نگار میگزین بابت جنوری تا مارچ ۱۹۳۳ء (۴) طنزیات اردو" از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی شائع شدہ ہندوستانی بابت اپریل ۱۹۳۲ء الہ آباد (۵) "مومن کا طنزیہ کلام" از مسٹر جلیل احمد قدوائی شائع شدہ جامعہ دہلی بابت اپریل ۱۹۳۲ء (۶) "ہیر المصنفین" از محمد یحیٰی صاحب تنہا۔

حسن یحیٰی عندلیب

ایک گیت

اے پیارے پیا اب آ بھی جا سوگند نشیلی آنکھوں کی
پھر مجھ کو وہی دو جام پلا سوگند نشیلی آنکھوں کی

الفت وہ ہوئی میخانے سے دن رات رہی میخانے میں
جو لطف نہ پایا دنیا میں وہ لطف ملا پیمانے میں
جنت تھی نرالی پوشیدہ انگور کے دانے دانے میں

اے پیارے پیا اب آ بھی جا سوگند نشیلی آنکھوں کی
پھر مجھ کو وہی دو جام پلا سوگند نشیلی آنکھوں کی

ایک ایک بوند میں ملتی تھی ایک ایک امنگ جوانی کی
من مندر جس سے چمک اٹھا وہ جوت تھی نورانی کی
دیکھا جو نہ تھا آیا وہ نظر کیا بات تھی رنگین پانی کی

اے پیارے پیا اب آ بھی جا سوگند نشیلی آنکھوں کی
پھر مجھ کو وہی دو جام پلا سوگند نشیلی آنکھوں کی

جیون کا پتہ پیارے پریتم اس شیش محل میں ملتا تھا
کمھلایا ہوا فرقت میں کنول اک چلو بھر میں کھلتا تھا
اس کیف کا تھا کہنا ہی کیا جب خون میں خون یہ ملتا تھا

اے پیارے پیا اب آ بھی جا سوگند نشیلی آنکھوں کی
پھر مجھ کو وہی دو جام پلا سوگند نشیلی آنکھوں کی

اندرجیت شرما

غزل

جس کو وہ اپنی حقیقت کا پتا دیتے ہیں — اُس کو نا قابلِ ادراک بنا دیتے ہیں

حیف! اگر ہم ترے سربارِ وفا بھی ڈالیں — یہی کیا کم ہے کہ تکلیفِ جفا دیتے ہیں؟

کیا یہ معلوم نہیں، جس سے وہ خوش ہوتے ہیں — اُس کو اپنا غمِ اندوہ رُبا دیتے ہیں

جب وہ یہ چاہتے ہیں آپ کو بے پردہ دکھائیں — تو حجاباتِ بصارت بھی اُٹھا دیتے ہیں

کچھ نہ دینا مجھے چاہا تو یہ کہہ کر ٹالا — جا تجھے حوصلۂ صبر و رضا دیتے ہیں

مفت وہ جان کسی کی نہیں لیتے آزادؔ!

جان لیتے ہیں، حیاتِ دوسرا دیتے ہیں!

حکیم آزاد انصاری

رباعیات

معنیٔ اللہ ہے اور نہ صورت اللہ
صورت اللہ ہے اور نہ مورت اللہ
اللہ کیا ہے یہ راز مجھ سے پوچھو
اللہ قوت ہے اور قوت اللہ

کہتے ہیں، کوئی خالق دنیا ہے ضرور
سنتے ہیں کوئی مالک عقبیٰ ہے ضرور
یہ سچ ہو کہ جھوٹ، لیکن اک طاقت خاص
اقصائے جہاں میں کارفرما ہے ضرور

ایمان اگر عمل سے مربوط نہیں
ہر حال میں کمزور ہے، مضبوط نہیں
ایسے ایمان کا مرتبہ کیا ہے، نہ پوچھ
کیا شرط کا فوت، فوتِ مشروط نہیں

اے شخص! کہ تو مرا نیا واقف ہے
اس سمت نہ جا کہ تو ہی کیا واقف ہے
میں اس سے تو واقف ہوں کہ نا واقف ہوں
تو اس سے بھی واقف نہیں، ناواقف ہے

ہر چند ہنوز ناقص العرفاں ہوں
پر اپنی ترقیات پر نازاں ہوں
صد شکر مرا علم یہاں تک پہنچا
یہ جان سکا کہ آج تک ناداں ہوں

اجسام کی محسوس نظر شکلیں ہیں
ارواح کی محجوبِ بصر شکلیں ہیں
وہ مادے کی کثیف تر پیکر ہیں
روحیں اس کی لطیف تر شکلیں ہیں

ساقی! لا جلد لاشعور افزا مے
دل تشنۂ جام علم و آگاہی ہے
کچھ روز سے اک صدائے غیبی مجھ سے
کہتی ہے کہ "علم شئے بہ از جہل شئے"

حکیم آزاد انصاری

انتباہ

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں۔
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے۔
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن۔
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے۔
جسم و زباں کی موت سے پہلے۔
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک۔
بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے۔

فیض احمد

آپا

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آ جاتا ہے جو مدھم سی لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ میں آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ اُن دنوں بدو یہی چھ سات سال کا ہو گا۔ کہنے لگا "امی جان میں بھی بیاہ کروں گا۔"

"اُوہ ابھی سے؟" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ "اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟"

"اُوں ہوں" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں "کیوں۔ آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔" بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں "کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں"۔

"میں بتاؤں کیسی ہے" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا" اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈھ رہا ہو۔ پھر اُس کی نگاہ چولہے پر آ رُکی۔ چولہے میں اُپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اُس کی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی" پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا۔ "اور چھاجو باجی ایسی" اس بات پر ہم سب بہت دیر تک ہنستے رہے۔ اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں ہنسنے لگیں۔ تصدق بدو سے پوچھنا تو کہ آپا کیسی ہیں" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا۔ بدو" وہ بولے۔ "بتاؤں" ۔ بدو چلایا۔ اور اُس نے اُپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اُسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا۔ مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی۔ "اُونہہ" بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں۔ "پگلے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے اس میں چنگاری ہے۔" "وہ تو جلا ہوا ہے اماں" بدو نے بسورتے ہوئے کہا اماں بولیں۔ "نہ میرے لال تمہیں نہیں معلوم۔ اس کے اندر تو آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔" بدو نے بھولے پن سے پوچھا۔ "کیوں آپا اس میں آگ ہے؟" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی "میں کیا جانوں" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات اُبھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسی پتے کی بات کہی تھی گو میں کہا کرتی تھی۔ "آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی" اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اُسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا۔ اور ایک ہی وقت میں اُسے کئی کام کرنے پڑ جاتے ادھر بدو چیختا "آپا میرا دلیا" اُدھر ابا گھورتے "سجادہ ابھی تک چلنے کیوں نہیں بنی؟" بیچ میں اماں بول اٹھتی۔ "بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی۔ مگر اس کے باوجود خدا جانے کیوں۔ اُسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اُسے اِدھر سے اُدھر گردن موڑنے میں بھی بہت دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اُس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں کسی اثر سے بھیگ جاتیں۔ گویا کسی ندی کے کنارے چاندنی میں کوئی کھرج میں سندھی بھیروں الاپ رہا ہو۔ مگر اُن دنوں مجھے چاندنی

اور سنا ہی بھیدوں کا کیا پتہ تھا۔ اس لئے میں سمجھتی تھی کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا انہیں ہنستی اور بن چلے، لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے جیسے کسی نے اُسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے ما درے کی تال پر ناچ رہی ہو۔ اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھ کر میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس ہی رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر نیم آواز میں کہے "نہیں جی۔ کیوں جی؟" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔ ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور دن بھر اُن کا مکان اُن کے قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا۔ ایک "یہ کرو۔ وہ کرو" والی اماں اور دن بھر حقّے پر گڑگڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا۔ سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے "سجادہ کی ماں۔ معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔"

"کیوں؟" اماں پوچھنے لگی۔

کہنے لگے "بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے ہیں۔ جیسے کوئی میلہ ہو۔"

اماں تنک کر بولیں۔ "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابا کہنے لگے "اوہ۔ میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار تک اُس محلے تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں ایک لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا۔ ہماری سجادہ میں یہ بات قطعی نہیں۔" میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے۔ سجادہ جی جلی۔ اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور گڑگڑ کر لیا۔ یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ۔ گٹ مٹ کرنے لگے۔ جیسے کوئی بھٹیاری مکّی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں دے کر صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری سی آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ خدا جانے وہ کونسا شعر تھا ——— ہاں

"چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے۔ نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے۔"

آپا انہیں گاتے ہوئے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدّو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی "بدّو رو نا"۔ اور پھر آپ ہی آپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے کوئی یہی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے۔ پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں۔ اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟ پھر اُن دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہے۔ غرضکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتے کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدّو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ اُن کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدّو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے ہی کیسے۔ جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ سا بن جاتا۔ اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدّت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا اُن کی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدّو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے۔ لیکن صرف اُسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔ پوچھتے "بدّو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟"

"آپا" بدّو لاپروائی سے دہراتا۔ "بیٹھی ہے ——— بلاؤں؟"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے۔ "نہیں نہیں۔ اچھا بدّو آج تمہیں، یہ دیکھو اس طرف، تمہیں دکھائیں۔"

اور جب بدّو کا دھیان اِدھر اُدھر ہو جاتا تو مدّھم سی آواز میں کہتے "ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔"

بدّو چیخ اٹھتا "کیا ہوں میں؟" اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ ڈگمگ ڈگمگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے۔ دیکھا، جسے ڈھول بھی کہتے ہیں۔ ڈگمگ ڈگمگ۔ سمجھے؟ اور آپا اکثر چلتے چلتے اُن کے دروازے پر ٹھہر جاتی

اور اماں کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولھے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اُس وقت اُس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا۔ بالوں کی کوئی لٹ پھسل کر گال پر آگرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولھے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں آپا کے ہونٹ یوں ہلتے۔ گویا وہ گا رہی ہو۔ مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو وہ ٹھٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آ گھسا ہو۔

ایک دن میں آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے بھائی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے اُن کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے "میرے یار ہم تو اُس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے۔ کتابیں پڑھ سکے۔ شطرنج کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے، یوں ڈز، بس ڈز۔ اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے۔ سمجھے؟"

بدو بولا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اونہہ" بھائی نے کہا۔

بدو چیخنے لگا "میں جانتا ہوں۔ تم آپا سے بیاہ کرو گے۔ ہاں" اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے "واہ تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو۔"

بدو نے کہا "ابا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیئے"

وہ بولے "تو وہ اپنے ابا کے لئے پکاتی ہے نا۔ ہمارے لئے تو نہیں!"

"میں کہوں آپا سے؟" بدو چیخا۔

بھائی بولے "اوہ پگلا۔ ڈھنڈورا۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں یہ دیکھو اس طرف ڈھگمگ ڈھگمگ ڈھگمگ" بدو پھر چلانے لگا "میں جانتا ہوں۔ تم بینڈ بجا رہے ہو نا؟" "ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پیٹتا ہے نا" بھائی کہہ رہے تھے "کشتیوں میں۔ اچھا بدو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے۔ آؤ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدو پہلوان لو۔ آؤ۔ ٹھہرو۔ جب میں تین کہوں" اور اُس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز میں کہا "ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے"۔

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ اور اماں نے تو اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے کہنے لگے "کیا پڑھ رہی ہو جہینا" ہاں اُن کے منہ سے جہینا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نورجہاں کیسا پرانا نام تھا! بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزہ آنے لگتا۔ میں تو نورجہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بڑھیا اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں۔ مگر بھائی صاحب کو نام کو بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال حاصل تھا۔ اُن کے منہ سے جہینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور یوں محسوس کرتی گویا میں ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے۔ مگر وہ تو پرانی بات تھی۔ جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اُسے سجدے نہ کہتے بلکہ اُس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دیا "سکول کا کام کر رہی ہوں"۔

پوچھنے لگے "تم نے کوئی برنرڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا "نہیں"۔

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہو گی" غالباً وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم سی آواز میں کہا "نہیں" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی بولے "اوہ کیا بتاؤں جہینا کہ وہ کیا چیز ہے۔ نشہ ہے نشہ، خالص شہد۔ تم اُسے ضرور پڑھو۔ بالکل آسان ہے۔ یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے"

میں نے کہا "ضرور پڑھوں گی"

پھر پوچھنے لگے "میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا "مجھے کیا معلوم۔ آپ خود ہی پوچھ لیجئے"

حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں

انکار کیا تھا۔ کہتی تھی۔ میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ جیسے مطالعے کے بہانے میلہ ہو رہا ہو۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر بیٹھے رہنے کے لئے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چین۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب۔ میں کیا ٹیلیفون تھی۔ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا بیٹھی ہوئی گم صم آپا بھیگی بلی!!

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے۔ "آج فیرنی میں اتنی شکر کیوں ہے! قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ سجادہ بیٹی۔ کیا کھانڈ اتنی سستی ہو گئی ہے۔ ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے"۔

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ پیلا پڑ جاتا مگر اس وقت اس کے گال تمتما رہے تھے کہنے لگی "شاید زیادہ پڑ گیا ہو"۔ یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں وانتی بیس رہی تھی۔ شاید۔ کیا خوب۔ شاید!

اُدھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے۔ "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فیرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے"۔ صحن سے اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں۔ جیسے اُن کی عادت ہے۔ "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں! اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے۔ اس کا تو خیال کرنا چاہیئے"۔ ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ کہنے لگے۔ "اوہ یہ بات ہے۔ مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں" —— اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا تو اُن سے ملنا تو کیا بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اُس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور ہی کوئی بھید ہے اس بات میں کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اُس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بات سے سلسلۂ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں ہی پر اُسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی ابھی تو اتنا کام پڑا ہے۔ اور میں یہاں کھڑی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر آپا جب لوٹ چکی تو کچھ عرصے کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں نے ذکر چھیڑ دیا۔ آج آپا آئی تھی!

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ خدا جانے کیا نام ہے اس کا۔ ہاں۔ ہارٹ بریک ہاؤس"۔

آپا اُس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا۔ رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی — اُسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اُسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر وہ کتاب نکال لیتی اور اُسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر۔ اس کے کیا معنے ہوئے؟" پہلے تو آپا ٹھٹھک گئی پھر وہ سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اُس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اُس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ "اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے"۔ کہنے لگی "میں کیا جانوں!"

میں نے اُسے جلانے کو کہا "ہاں۔ ہماری آپا بھلا کیا جانے"۔ میرا خیال ہے یہ بات ضرور اُس کے دل کو لگی ہوگی۔ کیونکہ اُس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھراتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے "جہینا اچھا یہ تو بتاؤ۔ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے"۔ میں نے کہا "میں کیا جانوں۔ جا کر آپ سے پوچھ لیجئے"۔ ہنس کر کہنے لگے "آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟"

"کیوں میں لڑاکا ہوں؟" میں نے کہا۔

بولے "نہیں ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑاکا ہو جاؤ"۔ اس پہ میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے "دیکھو جہینا۔ مجھے لڑنا بے حد پسند ہے میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے۔ خدا نہ اکتائے" جانے کیوں مگر میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر میں نے پوچھا "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟"

بولے "وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید لال لال کالا کالا نیلا نیلا سا"۔ میں اُن کی بات سن کر بہت ہنسی۔ پھر وہ کہنے لگے۔ وہ مجھے بے حد پسند ہے یہاں تو ہے نا ہم فیرنی کھا کھا کر اکتا گئے "میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور

سُن لی ہوگی۔ چونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اُس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدّو سے کہا۔ "بدّو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے۔ اس میں کیا ہے"۔

بدّو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدّو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدّو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا "بدّو۔ جاؤ تو۔ بھائی جان سے پوچھو کہ اس کھانے کا کیا نام ہے"۔

بدّو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی۔ اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ پہلی مرتبہ آپا نے مجھے یوں گھورا تھا۔ اُس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رزائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اُسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہیں دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے۔ میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں بدّو "چھاجو باجی۔ چھاجو باجی" چیختا پھرتا اور کہتا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے"۔

باجی کہتی "شکل تو دیکھو اپنی پہلے منہ دھو آؤ"۔ پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ اُس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے۔ اور وہ پنچم تان میں پوچھتی "ہے نا بھئی جاآن۔ کیوں جی!"

باجی کے منہ سے "بھئی جاآن" کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا "بھائی صاحب" کہتی تو کیسا بھدّا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو۔ مگر باجی "صاحب" کی جگہ "جاآن" کہہ کر اس سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جاآن" کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ "بھئی جاآن" کہہ کر وہ ایسی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنستی کہ سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اُسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے "بھائی صاحب" اور باجی کے "بھئی جاآن" میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی ہو گیا۔ بدّو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے اردگرد پھرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔ باجی کہتی۔ "بھائی جاآن ایک بورڈ لگے گا" یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدّو سے کہتے۔ "کیوں میاں بدّو کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟" باجی بول اٹھتی۔ "آپا سے پوچھئے۔" بھائی کہتے "اور تم"۔ باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی۔ چہرے میں سنجیدگی پیدا کر لیتی۔ بھویں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی۔ پھر کہتی "اونہہ۔ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے"۔ بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ اور کہتے۔ "کل جو پٹی تھیں بھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی۔ "میں نے کہا چلو بھئی جاآن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے" اور پھر یوں ہنستی جیسے گلے میں گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے ہی میں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولھے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدّو "چھاجو باجی۔ چھاجو باجی" کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اُس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی۔ "بھئی جاآن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا، ہے نا بھئی جاآن" ہم سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا اور کشتی کو اُٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے۔ باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ "لیجئے بھئی جاآن" اُس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔ آپ بھی کہتے ہوں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا: "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے بنایا ہے یہ؟" باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا "ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جاآن کے لئے"۔

بدّو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدّو چلا اُٹھا "میں بتاؤں بھائی جان"—— آپا نے بڑھ کر بدّو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اُسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئیں۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدّو

کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر خدا جانے انہیں کیا ہوا۔ ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں۔ خدا جانے کیوں میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں جھٹ باہر چلی آئی۔ باہر آپا انگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے اپنے کان سے دوپٹہ سرکا دیا پھر باجی کی آواز آئی۔ "چھوڑئیے۔ چھوڑئیے" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں ادھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ کہنے لگی۔ "آج ایک دھندنا بول ڈھونڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جان بولے "واہ یہاں سے بھاگ لگاؤں تو خدا جانے کہاں جا پڑوں۔" غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہوگا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی۔ "واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے رہتے ہیں۔" بھائی جان معاً بول اٹھے۔ "تو کیا ہاتھ سے ـــــ" "چپ چاپ۔ خاموش" باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو بھد بھد دھمک سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا "آپا۔ اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں چلو دکھاؤں تمہیں۔ چلو بھی۔" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا۔ "اماں کہاں ہے" اور وہ کمرے میں اماں کے پاس جانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ کہنے لگی۔ "آؤ تمہیں مٹھائی دوں۔" بدو بسورنے لگا۔ آپا بولیں۔ "آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی ہے میرے پاس" اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی دن شام کو میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ [illegible]

بہر صورت میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ رہی تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن سی چڑھی رہتی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے "بدو سا جو باجی سے بیاہ کرو گے۔"

"اونہہ" بدو نے کہا۔ "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے" اماں نے پوچھا "آپا سے کیوں نہیں" تو کہنے لگا "بتاؤں آپا کیسی ہے۔" پھر چولہے میں ایک جلے ہوئے اوپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "ایسی" اور چھاجو باجی؟ میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا "ایسی" عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں آگ کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ "ہاں یاد ہے" بھائی نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے "خدا جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا ہے۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولہے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا۔ "اف کتنی سردی ہے۔" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولہے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے۔ "ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے۔" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ میرا خیال ہے آپا کا آنسو گرا ہوگا۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے۔"

ممتاز مفتی

شعر

نغمے سے جب پھول گریں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دھن میں گاتا جا

حفیظ جالندھری

کیفیت

(بہ نسبتِ رنگ)

سبز رنگوں سے ہے تعمیرِ جمال — رنگ کی لہر ہے زنجیرِ جمال

رنگ اے گلشنِ ہستی کے فروغ! — رنگ اے خالقِ تقدیرِ جمال!

رنگ ہوتا ہے رُخ آرائے بہار، — رنگ رہتا ہے عناں گیرِ جمال

رنگ سے ہے غازۂ رخسارِ نگار، — رنگ ہے پیکرِ تصویرِ جمال

گردشِ رنگ نشاطِ لرزاں — لرزشِ رنگ پر ہے تیرِ جمال

رنگِ روشن سے ہے یہ رعنائیِ ناز — رنگِ رقصاں سے ہے یہ تاثیرِ جمال

رنگ کے لوچ میں ہے راگ کا لوچ — رنگ ہے موجبِ تشہیرِ جمال

سبز رنگوں کی مہک آتی ہے،

رخِ ہستی پہ چمک آتی ہے،

عابد لاہوری

"حرام جادی"

دروازے کی دھڑ دھڑ اور کواڑ کھولو کی مسلسل اور متدی چیخیں اس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے کسی تاریک کنویں میں ڈول کے گرنے کی طویل کراہتی ہوئی آواز۔ اُس کی پُرخواب اور نیم رضامند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں، لیکن دوسرے لمحے ہی مدھ اندھیرے کے بکلے بلبلے اُجانے، بن ملی ہوئی سرمہ جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بہنے لگی، اور وہ پھر بند ہوگئیں۔ آنکھوں کے پردے بوجھل کمباوں کی طرح نیچے لٹک گئے، اور ڈلوں کو دبا دبا کر سلانے لگے۔ لیکن کان، آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر، بھن بھنا رہے تھے؛ وہ اس سحر خیز تکدّر کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے ـــــ اور پھر بھی وہ بھن بھنا رہے تھے۔

اُمید و بیم کی یہ کشمکش، جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی، زیادہ دیر جاری نہ رہی۔ اب کے تو دروازے کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں، اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت، اور بھرائے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں ـــــ "کھولو" ـــــ "کھولو" یہ آوازیں پتلی، نوکدار تیلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کئے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سُن رہی تھی کہ پکارنے والا "کھولو" "کھولو" کے وقفوں کے درمیان آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا، یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اُسے سڑک کے ڈھیلوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ آخر اُس نے آنکھیں پوری کھول ہی دیں، اور ہاتھوں کو چارپائی پر جھٹکتے ہوئے کہا "نصیبن، دیکھو تو کون ہے؟"

یہ اُس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ جب سے وہ اس قصبے میں مڈوائف ہو کر آئی تھی یہ سب کچھ روز ہوتا تھا ـــــ یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش، یہی جھلاہٹ اور پسپائی ـــــ سب اسی طرح۔ اُسے صبح ہی اٹھ کر جانا پڑتا تھا، اور پھر اس کا سارا دن نو واردوں کو اچھا جانا چیختے چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے میں، کچھ دن کے آئے ہوؤں کی رفتار ترقی کے معائنے میں، اور آمد و رفت کے اندراج کے لئے ٹاؤن ہال کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گزرتا تھا۔ اُسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا، اور وہ بھی یقینی نہ تھا کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع و محل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات کے دو بجے ـــــ ہر گھنٹہ، ہر گھڑی اُسے کوہ ندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اور بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آ رہے تھے جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر۔ ضبطِ تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکے تھے، اور اگر بفرضِ محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انہیں ذرا بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھتے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں، اس میں انسان کا کیا دخل۔ اٹھارہ سالہ لڑکے، پچپن سالہ بڈھے، اٹھڑ لڑکیاں، ادھیڑ عورتیں، سب کے سب حیرت انگیز تندہی اور یکسوئی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کئے چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں۔ اور پھر وہ بچارے کرتے بھی کیا۔ وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرض کہ بچے چلے آ رہے تھے۔ کالے بچے، پیلے بچے، پرنچے مرغ کی طرح سُرخ بچے، اور کبھی کبھی گورے بچے، دُبلے، پتلے، ہڈیوں کا ڈھانچ، یا بعض موٹے تازے بچے، مڑے ہوئے بالوں والے، چپٹی ناک والے، چھچھوندر کی طرح گلگلے، لکڑی جیسے سخت۔ ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔ اکلی نے اپنی دادی سے سنا تھا کہ اُن کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی اور اس وقت اُسے بے ساختہ ہنسی بھی آ جاتی تھی ـــــ کہ یہ بچے وہی برسنے

مینڈک ہیں ـــــ پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک!

اور اُسے اُن ہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرے کو برستے ہوئے
دیکھنے کے لئے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڑوں کی سڑکوں، تنگ و تاریک، سیلی
ہوئی گلیوں، گرد و غبار، کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں، بھونکتے ہوئے لال پیلے
کتوں، اور کسانوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے بھٹکتے ہوئے بازاروں میں
سارا سارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ
ضرور بنا ہوتا تھا، اور پھر نالیاں تو ٹھیک سڑک کے بیچوں بیچ بہتی تھیں جن کی
سیاہی کسی گنوارن کے بہے ہوئے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصہ غصب کئے
رکھتی تھیں۔ صفائی کے بھنگی نالیوں کی گندگی سمیٹ سماٹ کر سڑک پر پھیلا
دیتے تھے جن سے اپنی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایلی کو ہلکے پھلکے فیروزی
سینڈل کے بجائے اونچی ایڑی والا کالا جوتا پہننا پڑتا تھا گو اس صورت میں
سڑک کے اُبھرے ہوئے لاتعداد کنکر اُس کے پیروں کو ڈگمگا دیتے تھے۔ راستے میں گلی
ڈنڈا اور کبڈی کھیلنے والے لونڈوں کا لاابالی پن اُس کے کپڑوں پر ہر دفعہ اپنا نشان چھوڑ
جاتا تھا، مگر خیر یہ شکر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آتی تھی۔
اور یہاں کی گرمی! اُسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینوں میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی
اِن تنگ سڑکوں پر بھی سورج اس تیزی سے چمکتا تھا کہ اُس کے بدن پر چنگاریاں
تلملانے لگتیں، اور اُس کی نیلے پھولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ جب وہ
اپنی اونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، دھوپ میں جلتی بھنتی، سڑکوں پر سے گزرتی
تو اُسے دور سے آنے والی آلھا گانے کی آواز، ڈھول کی کھٹ کھٹ، اور درختوں
کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے، دوپہر کی نیند حرام کر دینے
والی بوجھل مکھیوں کی بھن بھناہٹ کی طرح، بیزار کن اور پراسرار معلوم ہوتے، اور
وہ چاہتی کہ پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت خوابوں کی
وہ سرزمین بن جاتا جسے صبح اُٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا، اور
جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کئے رکھتا ہے۔ اُسے کچھ روشنی سی
معلوم ہوتی ـــــ ایک چمک، ایک کشادگی، ایک پہنائی ـــــ کچھ ہریالی۔ اُس کے
سامنے تیرتی . . . . . اور وہ پھر اُسی تپتی ہوئی کنکروں، نالیوں اور ریت والی سڑک
پر لڑکھڑاتی، سنبھلتی، چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصور تک اس تپش
اور سوزش کو کم کرنے میں اُس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن ہاں، جب کبھی وہ خوش قسمتی
سے رات کو فارغ ہوتی، اور اُسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا تو
اس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں، سینما کے پردے کی طرح پوری روشنی اور صفائی
کے ساتھ، اُس کی نظروں کے سامنے گزرنے لگتیں، اور وہ جس تصویر کو جتنا دیر

چاہتی ٹھہرا لیتی۔ لیکن جب وہ اِن تصویروں سے لطف اٹھانے کے درمیان اُن
مناظر کو یاد کرتی جن سے اُسے ہر وقت دو چار ہونا پڑتا تھا، تو اُس کی خستگی اور بیزاری
آہستہ آہستہ عود کر آتی، گھر کی دیواریں مع رات کی تاریکیوں کے اُس پر جھک پڑتیں،
دل بھنچنے لگتا، سانس گرم اور دشوار ہو جاتا، اور اس کا سر گھٹنی کھا کھا کر نیند کی بے ہوشی
میں غرق ہو جاتا۔ اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اُسی پرانے شہر کے ہسپتال میں
پہنچ گئی ہے، مگر اُن در و دیوار سے بجائے رفاقت کے بے گانگی سی ٹپکتی ہے،
اور خود اُس کے اعضا منجمد اور ناقابلِ حرکت ہو گئے ہیں، اور کوئی نامعلوم خوف
اُس کے دل پر مسلط ہے۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی۔ اور در اصل
اُس کے لئے اِن زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہیئے تھا ایسے ہی اثرات پیدا کرنے
والا۔ مانا کہ شہر میں بھی ایسی ہی سیلی ہوئی گلیاں، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، گرد و غبار،
شریر لڑکے موجود تھے، اور وہ اُن کے وجود سے بے خبر نہ تھی، لیکن وہ تو ہوا کی
چڑیوں کی طرح ان سب سے بے پروا اور مطمئن، تانگے کے گدّوں پر جھولتی
ہوئی ان اطراف سے کبھی دسویں پندرھویں نکل جایا کرتی تھی۔ اُس کی دنیا تو اِن
علاقوں سے دور ضلعے کے صدر ہسپتال میں تھی۔ کتنی کھلی ہوئی جگہ تھی وہ، اور
وہاں کی ہوا کا لطف تو وہ ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ ہسپتال کے سامنے تارکول
کی چوڑی سڑک تھی جس پر دن میں دو مرتبہ جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے
کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ شام کو اپنی سہیلی ڈینا کے ساتھ اس پر ٹہلنے کے لئے
نکلتی تھی تو دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی
ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے،
اس کی ساڑھی پھر پھرانے لگتی، ماتھے پر بالوں کی ایک لڑی تیرتی، اور اُس
کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پرلطف
ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی جون کے جھکڑ بھی ہسپتال کی سفید
اور شیشوں والی عمارتوں پر سے سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گزرتے چلے جاتے
تھے، اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرے میں دوپہر کی سختی اور لُو اسی
اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ پُروقار انداز سے ساڑھی کا پلّہ سنبھالے
گزرتی تھی تو ہسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اُسے "مِیم صاحب" "مِیم صاحب"
کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اُسے لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے، سڑکوں
پر جھاڑو دینے والے بھنگی اُسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے، بلکہ قصبے کے زمیندار
تک اُسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل
ہو سکتی تھی۔ وہ رُعب، وہ دبدبہ، وہ مالکانہ احساس وہاں تو اس کی شخصیت ہسپتال
کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اُس سفید، سرد اور متین عمارت اور اس کے غیر مرئی مگر

اُن قانونوں اور اُصولوں کا ایک زندہ مجسمہ ہسپتال کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجانہ حرکت نہیں کرسکتا تھا، اسی طرح اُس کے حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اُس کی مرضی کا پابند ہو جانا پڑتا تھا۔ جب اُس کا مریضوں کے معائنے کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں، وہ دو روپے روزانہ کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی کیونکہ اُسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بے طرح ڈانٹتی تھی، اور ہمیشہ سب نے تم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں نہ بعیث تھیں۔ وہ اُس سے ہراساں اور خوف زدہ تو ضرور تھیں، مگر اُسے دو بدو جواب دینے سے نہ چوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک اُن پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی، اور اُن کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی۔ صفائی اور سلیقے کی تو ان عورتوں کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ جیٹھ کی گرمی میں بھی فوراً ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف بچھونے، چاول اور دوسری جنسوں کے مٹکے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، برتن، کونڈوں کا ٹکڑا، سوت اور ردّی کی گٹھڑیاں، سب الم غلم بھرے ہوتے تھے، اور ایک انگیٹھی پر گھٹی چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرے میں کوڑا ہونے لگتی تھی جو پیروں سے اکھڑ اکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی، اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں ——— اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتی تھیں۔ اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا اُلٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی کتر تک نہ ملتی تھی۔ اندر کی کھُسر پُسر، کھڑبڑ، کراہوں، "یا اللہ" "یا اللہ"، اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے، اور اپنے آپ کو ماں کے قریب نہ پا کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے تھے۔ اور ان کی بڑی بہنیں چمکار چمکار کر اور تھپک کر اُنہیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ "ارے چُپ چُپ ..... دیکھ بھیا آیا ہے ..... صبح کو دیکھیو ..... مُنّا سا بھیا" مگر صبح کو مُنّا سا بھیا دیکھ سکنے کی اُمید انہیں اس وقت کوئی تسکین نہ دے سکتی، اور اُن کی رُوں رُوں دھاڑوں کی شکل میں بلند ہو کر کمرے کے خلفشار میں اور اضافہ کر دیتی۔ یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا، کثیف بستروں، لیپ چڑھے ہوئے تکیوں، پسینے میں سڑے ہوئے کپڑوں، اور مدتوں سے نہ دُھلے ہوئے بالوں کی بدبو سے جیسے گرمی اور بھی دو آتشہ کر دیتی تھی، اُس کا جی اُلٹنے لگتا تھا۔ وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرے میں ایک گھنٹہ گزارنا گویا جہنم کے عذابوں کے لئے تیاری کرنا تھا۔ یہ مانا کہ خود اُسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا، کیونکہ قصبے کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لئے پیش کرنے، اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی مڈوائف کے جوان ہاتھوں اور مشتبہ آلات سے مسلح تھی، ہاتھوں میں دے دینے کے لئے قطعاً تیار نہ تھیں، انہیں تو قصبے کی پرانی دائی اور چھوٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا۔ تاہم اُن کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اُس کا کام بالکل کم ہو گیا تھا، لیکن آخر ذمہ داری تو اُس کی ہی تھی۔ اور وہ ہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے ہر بھلائی بُرائی کے لئے جواب دہ تھی اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر نوگرفتار لڑکیاں اتنا چیختی چلاتی اور ہاتھ پیر پٹکتی تھیں کہ انہیں قابو میں کرنا دو بھر ہو جاتا تھا، یا پھر بعض ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت تک نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی زیادہ آفت تھیں۔ وہ اپنے تجربوں کے سامنے اس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی انوکھی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آہوں کے درمیان بھی زچہ کروائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں، اور رایکی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا۔ اور دائی تو بھلا اُس کی کہاں سننے والی تھی۔ اُسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نااہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی، مگر اُس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اُس نے رایکی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنا لیا تھا۔ گو رایکی نے اُس کے طنزیہ جملوں کو پی جانے کی عادت ڈال لی تھی، لیکن اُس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرزِ عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں، اُس کی طرف توجہ کئے بغیر وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں، اور رایکی سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اُس کے لئے اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجلا جھنجلا کر پیر پٹخے، اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گزرنے کے بعد اُسے ہر بار اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر جانا پڑتا تھا۔ اُسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں، اور اُن کے پان میں سنے ہوئے کالے دانت نیم تمسخرانہ انداز میں اُن کی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے، اور وہ اُس کی طرف کرسی کھسکاتے ہوئے کہتے۔ "کہو مِیم صاحب، لڑکا کہ لڑکی؟" مونچھوں کے ان گھنے سخت، کالے بالوں کی قربت اُسے ہراساں کر دیتی، اور اُسے ایسا معلوم

ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں یکایک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ سیدھے ہوکر اُس کے چہرے سے آملیں گے۔ وہ نفرت اور خوف سے پیچھے سمٹ جاتی، اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہوئی جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہوئی وہ عموماً آٹھ نو بجے رات کو تھکی ہاری اپنے گھر پہنچتی تھی۔ جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں، سر جھنایا ہوا ہو تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پیر سے کونے میں اچھال دیتی، اور کپڑے اس طرح جھنجلا جھنجلا کر اتارتی کہ دوسرے دن نفیسن کو انہیں دھوبی کے یہاں استری کرانے لے جانا پڑتا۔ الٹا سیدھا کھانا حلق کے نیچے اتار کر وہ بستر پر گر پڑتی۔ تکیے پر سر رکھتے ہی دیواریں، پیڑ، ساری دنیا اس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتے۔ بھیجا دھڑ دھڑا دھڑ دھڑا کر کھوپڑی میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا، سر تکیے میں گھسا جاتا مگر تکیہ اُسے اوپر اچھالتا معلوم ہوتا۔ بازو شل ہو جاتے ہتھیلیوں میں سیسہ سا بھر جاتا اور ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکتے، اسی طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں، اور کمر تو بالکل پتھر ہی بن جاتی۔ وہ اپنے پرانے ہسپتال کو یاد کرنا چاہتی، مگر وہ کسی چیز کو بھی پوری طرح یاد نہ کر سکتی۔ کھڑکی کا کواڑ، مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ، موٹر کے پہیے، نیم کے پیڑ کی چوٹی، پان میں سنے ہوئے کالے دانت اور گھنی، سخت مونچھیں۔ یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکتے میں غائب ہو جاتے۔ وہ کھڑکی کے کواڑ میں ایک کمرہ جوڑنا چاہتی، مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی، بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا پایہ تو ایک کھونٹے کی طرح اُس کے دماغ میں گڑ جاتا اور کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوتا، نیم کی چوٹی کو کبھی تنا حاصل نہ ہو سکتا..... پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک ریت کے حاشیے والی نالی بہنے لگتی، اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مسکراتے اور گھنے سخت بالوں والی مونچھیں بے تابی سے ہلتیں..... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتیں، اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑتی، جھگڑتی، روندتی دوڑتیں..... سیاہ آسمان پر روشن ان گنت تاروں کے گچھے کے گچھے جگنوؤں کی طرح آنکھوں میں گھس گھس کر ناچنے لگتے، اور جلتی ہوئی آنکھیں کن پٹیوں کی خواب آور بھد بھد سے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں.....

سونے کے بعد تو ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جن میں سے ہر ایک باری باری آتا اور اُس کے دماغ پر مسلط ہو جانا چاہتا۔ اتنے ہی میں ایک دوسرا آپہنچتا اور پہلے والے کو دھکے دے دے کر باہر نکال دیتا، ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک تیسرا آدھمکتا، ان سب کی حریفانہ زور آزمائیاں اُسے بار بار چونکا دیتیں، اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی..... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے..... کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں اور اپنی رزم گاہ سے رخصت ہوتیں۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی، اور ایلی نیند میں بالکل بے ہوش ہو جاتی..... مگر اُس کی نیند پوری ہونے سے پہلے کواڑ کھولنے کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں —— وہی چیخیں، وہی دھڑ دھڑاہٹ، فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش، وہی جھلاہٹ اور پسپائی۔

نفیسن باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اُسے شیخ صفدر علی کے یہاں بلایا گیا تھا، اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا "جلدی" —— بلایا ہے —— جلدی —— ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے —— جلدی۔ آخر وہ کیوں جلدی کرے؟ کیا وہ اُن کی نوکر ہے، یا وہ اُسے کوئی دولت بخش دیتے ہیں؟ —— ہونہہ۔ جلدی! وہ نہ پہنچے گی تو کیا سب مر جائیں گے؟ اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اُسے بلا کر؟ —— کہتی ہیں چڑیلیں۔ "اُسے کیا خاک آتا ہے"۔ —— کیا خاک آتا ہے —— کچھ نہیں آتا —— اچھا پھر! بیٹھیں اپنے گھر۔ کون اُن کی خوشامد کرنے جاتا ہے —— کچھ نہیں آتا —— جیسے جیسے آلے اُس نے دیکھے ہیں ان لوگوں کے تو خواب میں بھی نہ گزرے ہوں گے —— چمک دار، تیز، ہاتھی دانت کے دستے والے —— اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ کے لیکچر۔ وہ کیسے نقشے دکھا دکھا کر جسم کے حصوں کو سمجھاتی تھیں —— کچھ نہیں آتا —— ہونہہ!

ایلی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ پہلے تو اُس کا جی چاہا کہ کہلوا دے کہ وہ جلد نہیں آسکتی، وہ بالکل نہیں آئے گی۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل ہی تو ہیں، ان کے بکنے سے اُس کا بگڑا تا گیا ہے، اور آخر ذمہ داری تو خود اس کی ہی ہے۔ چنانچہ اُس نے نفیسن سے کہا "کہہ دو کہ چلو، میں آرہی ہوں"۔ مطمئن ہو کر اُس نے کروٹ لے لی، سر کو تکیے پر ڈھیلا چھوڑ دیا، آنکھیں بند کر لیں، ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا، اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا اُس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کرے، اور ساکت ہو جائے۔ مگر اُس کے دل کی کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ کانوں میں بج رہی تھی، اور تھوڑی دیر بعد یکایک ایک پتھر سا دماغ میں آکر لگتا تھا —— "جلدی" —— جس سے اُس کے ماتھے اور کن پٹیوں کی نسیں تن جاتی تھیں اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں..... اُسے جلدی جانا تھا —— جلدی..... اور اسی بات کے تو وہ ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی تھی —— جلدی جانا تھا۔ ..... لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو نہیں قربان کر سکتی تھی، کل رات ہی

اُسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین ——— اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس کے سر میں درد ہو رہا ہے، کمر بیٹھی جاتی ہے، کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی بائٹھ جانا بہت مضر ہوگا، اور خصوصاً اس قصبے جیسی آب و ہوا میں جہاں اُس کی صحت رفتہ رفتہ بگڑتی جا رہی ہے۔ ابھی آخری مہینے میں اُسے چار دن بخار آ چکا تھا ——— اور پھر وہ وہاں بنا ہی کیا لے گی اُن لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے اُس کی ——— تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہوگا۔

وہ سو جاتی، مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آ رہی تھی، اور اُس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اُس نے ہاتھ آنکھوں پر کھسکا لیا، اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں۔ اب اُسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں، مگر ہر دفعہ "دودھ لو دودھ!" "بے او کلو ہوئے!" "اُٹھ اُٹھ! بابے پڑھنے نہ جانے کا" کی صداؤں اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی ——— سونے کی کوشش کرتے کرتے اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا، سر میں درد ہونے لگا اور ماتھا جلنے لگا، وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی، اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لئے۔ اب اُس کے اعضا اور بھی زیادہ بوجھل اور ناقابل حرکت ہو گئے، اور وہ ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں ——— "جلدی بلایا ہے" ——— اِس صبح کے چاندنے، اس قصبے پر دانت پیسنے لگی۔ وہ چاہتی تھی، کہ کوئی ایسی چادر اوڑھ لے جو اُس کو ان صداؤں، آوازوں، ان تحکمانہ طلبیوں ——— "جلدی بلایا ہے" ——— اس صبح کے چاندنے، اس قصبے سب سے چھپالے، جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہنچ نہ ہو، جہاں وہ ان سب سے ——— اپنے آپ سے غافل ہو جائے ——— اپنے کو کھو دے ..... اُسے محسوس ہوا کہ وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اُس کے جسم کا حلقہ کئے بھینچ رہے ہیں ..... سر کے درد کو گویا کسی نے یکایک پکڑ لیا ..... وہ آنکھیں بھی ذرا کچھ دور چلیں، مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں، اور اُس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا .... جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا، سر ہلکے ہلکے جھکولے کھاتا موجوں پر بہا چلا جا رہا تھا، سکون تھا، خاموشی تھی، اور صرف دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی ..... وہ بازو اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے ..... وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو .....

اُس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کے چاندنے میں چمک آ گئی تھی، نصیبن نے چولھے پر دیگچی رکھی، بکری والا محلے سے جانے والی بکریاں جمع کر رہا تھا، اور کنوئیں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں ...... دھبا دھبا سے سائے اترنے لگے۔ آنکھوں کے پردے پھڑکے، پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں گویا وہ ان سایوں کو پھنسا لینا چاہتی ہیں ..... سائے کچھ دور پر رک سکے۔ وہ ڈگمگائے اور دھندلے ہوتے ہوتے ہوا میں تحلیل ہو گئے ...... آنکھیں صبح کے بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اُس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے ——— وہ مدت کے آشنا بازو ——— مگر وہ یہاں کہاں۔

چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ ولیمسن کو یاد کرنے لگی۔ لمبے لمبے پیچھے اُلٹے ہوئے بال، چوڑا سینہ، سرخ ڈوروں والی جلد جلد پھرتی ہوئی آنکھیں، موٹا سا نچلا ہونٹ، کان کی لو تک کٹی ہوئی قلمیں، سانولے رنگ پر منڈی ہوئی داڑھی کا گہرا نشان، آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیاں، اور مضبوط بازو ...... دن میں کتنی کتنی مرتبہ اُس کے بازو اُسے بھینچتے تھے، اور اُن کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی، اور بعض دفعہ تو جھنجلا پڑتی تھی، مگر اُس کے جواب میں اُس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا .... اور اُس کے دونوں گالوں پر وہ گرم اور نم آلود بوسے ...... اور دن میں کتنی کتنی مرتبہ .... اُس کے منہ سے شراب کی تیز بو ضرور آتی تھی، مگر وہ کیسے جوش سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا تھا، اور پاگلوں کی طرح اُس کے چہرے، ہاتھوں، گردن، سینے سب پر بوسے دے ڈالتا تھا، اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا .... "میری جان .... ہا ہا ہا ہا ..... اے مائی لی ..... ڈی یر ..... ہا ہا ہا!" ——— اور وہ اُس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا، وہ اُس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا "اِس مہینے میں کیسی ساڑھی لاؤ گی، میری جان؟ .... ہیں؟ ..... اس سینے پر تو سرخ کھلے گی! کہو کیسی رہی؟ ہا ہا ہا!" ——— اور وہ اُسے دوپہر میں تو کبھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ اگر اُسے ایسے وقت ہسپتال سے بلایا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز ولیمسن سو رہی ہیں۔ وہ اُس کے اٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اُس کے قریب میز پر لا رکھتا تھا۔ اور وہ اُسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا ——— مگر وہ یہاں کہاں! اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اُسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا، وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کواڑ پیٹ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا ——— لیکن وہ یہاں ہوتا؟ ——— وہ اُس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی۔

لیکن ——— کچھ دوسری شکلیں اُبھریں ——— اچھا ہی ہے کہ وہ اُس کے پاس نہیں ہے ——— اُس کے بال اُلجھے ہوئے اور پریشان تھے، اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا

اور اُس نے اُسے کیسی بے رحمی سے بید سے پیٹا تھا — اور سے گی.... بڑی بن کے آئی ہے وہاں سے وہ.....!" — اگر میم صاحب شور نہ کرنا چاہیں تو نہ معلوم وہ ابھی اور کتنا مارتا — ایلی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی — ایسے ظالم سے تو چھٹکارا ہی اچھا — کیسی خونی آنکھیں تھیں — اور آخر میں وہ شراب کتنی پینے لگا تھا — مگر وہ ہوتا تو اُسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا — مانا کہ وہ روزا کے ساتھ رات کو بڑی دیر تک ٹہلتا رہتا تھا، لیکن ظاہر تو اُس کے ساتھ اُس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا۔ اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی، اور اُسے ہر وقت اُٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی — وہ اُسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا — لیکن وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ وہ روزا کے ساتھ پھرا کرے — روزا — کالا توا سی۔ منہ پہ ہڈیاں نکلی ہوئی۔ سوکھی جیسے لکڑی ہو — اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو۔ بڑی میم صاحب بنتی تھیں۔ چار حرف انگریزی کے آ گئے تھے تو زمین پہ قدم نہ رکھتی تھی مارے شیخی کے — نہ معلوم ایسی کیا چیز لگی ہوئی تھی۔ اُس میں جو وہ اُس پر ایسا لٹو ہو گیا تھا — اُس نے خواہ مخواہ اتنی فکر کی، وہ خود اُسے تھک کر چھوڑ دیتا — وہ اُسے تھوڑے دن یوں ہی چلنے دیتی تو کیا تھا — مگر اُس نے کیسی بے رحمی سے اُسے مارا تھا — ہاں — ارے ایک دفعہ مار ہی لیا تو کیا ہو گیا۔ وہ خود بھی شرمندہ معلوم ہوتا تھا اور اس کے سامنے نہ آتا تھا — اور اگر ڈینا اُسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی بس وہ اپنا ذرا مزا لینے کو اُسے اُکساتی رہی — یہ اچھی دوستی ہے — اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی۔ اگر وہ ملے گی بھی تو وہ مُنہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی۔ اور جو ڈینا خود اس سے بولی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی — ڈینا بگڑ جائے تو بگڑا کرے۔ اب تو وہ شہر کے ہسپتال سے چلی ہی آئی۔ اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے....

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہتی۔ اگر نصیبن اُسے نہ پکارتی۔ "اجی میم صاحب، اٹھو، سورج نکل آیا!" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی، اور چاروں طرف دیکھا۔ اب تو واقعی اُسے چلنا چاہیے تھا۔ مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اُترنے سے پہلے اُس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور تکیے پر سر رگڑا۔

وہ منہ دھو دھا کر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی۔ نصیبن لکڑیوں کو چولھے میں ٹھیک کرتے ہوئے بولی "وہ منشیائن کہہ رہی تھیں کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کبھی آ کے بھی نہیں جھانکتیں...... اجی ہو ہی آؤ اُن کی طرف، میم صاحب، کسی دن۔ بڑا یاد کریں ہیں تمہیں"۔

ہو ہی آئے اُن کی طرف — کیا کرے وہ جا کر؟ میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے، ٹوٹے ٹلٹے — یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے! بس اُنہیں تو یہ قصے سنائے جاؤ کہ اُس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا، اُس کو اتنی تکلیف ہوئی، اس کو ایسی بیماری تھی۔ وہ کہاں تک لائے قصے انہیں سنانے کو؟ اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انہیں...... اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں۔ سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پہ چڑھی جاتی ہیں..... اُسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے، مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا ہے.... جب وہ اُس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہوں.... اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو دیکھتی جاتی ہیں گویا وہ چور ہے، اور اُن کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اڑا دے گی..... یہ اُس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ اُن کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوا ہے؟ — عجب بے وقوف ہیں یہ عورتیں بھی! — اور ہاں جب وہ اُن کے ہاں جاتی ہے تو اُن کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلد جلد بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ اندر سے جھانک جھانک کر اُسے دیکھتی ہیں، اور اگر کہیں اُس کی نظر پڑ جاتی ہے تو وہ فوراً ہٹ جاتی، اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے اور اگر انہیں اُس کے سامنے آنا ہی پڑ جائے، تو وہ بدن چراتی ہوئی اوپر سے نیچے تک خوب دوپٹہ تانے ہوئے آتی ہیں جیسے اُس کی نظر اُن میں سے کچھ چھین لے گی، یا اُس کی نگہ پڑ جانے سے اُن میں کوئی گندگی لگ جائے گی — اُن کی یہ حرکت اُسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انہیں اُس پر اعتبار نہیں، اور وہ اُس پر شک کرتی ہیں؟ — اِس سے تو اُن کے ہاں نہ جانا ہی اچھا۔ بیٹھیں اپنی لڑکیوں کو لے کے اپنے گھر میں — اور وہ گندے بچے، مٹی میں سنے، ناک بہتی، آدھے ننگے، پیٹ نکلا ہوا، وہ سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اُسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں جیسے وہ کوئی نیا پکڑا ہوا عجیب غریب جانور ہے۔ اور جب وہ اُن سے بولتی ہے، تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں — وحشی ہیں بالکل.... جانور.... بالکل — اور یہ خوب ہے کہ اُس کے پہنچتے ہی اُن کے ہاں جھاڑو شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں۔ اور کوئی کیوں اُن کے یہاں جا کر بیماری مول لے؟ — اور اُن کے مرد! کتنی شرم آتی ہے اُسے اُن کی حرکتوں سے وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں، اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہنچ جائے نہیں ہٹتے — ارے حقہ ہٹاؤ، حقہ ہٹاؤ" اُٹھتے اُٹھتے اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے — جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں — ناک کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر

وہاں ــــ اور جب وہ اندر پہنچ جاتی ہے تو اُسے قہقہوں کی آواز آتی ہے عجیب بدتمیز ہیں ــــ انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہے عورتوں کی ــــ وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے، بہت اچھے آدمی تھے بچارے۔ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے بلکہ اُسے تو وہ پہچان گئے تھے۔ سب مل کر جایا کرتے تھے اتوار کو گرجا ــــ وہ خود ــــ ڈینا ــــ کٹی ــــ میری شیلا ــــ او۔ ہاں مرسی ــــ مسز جیمس کا کتنا مذاق اڑاتے تھے سب مل کر سب سے پیچھے چلتی تھیں چھتری ہاتھوں لئے ہانپتی ہوئی۔ اور اُن میں تھا ہی کیا، ہڈیوں کا ڈھانچ تھیں بس ــــ اور گرجا سے لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا۔ سب چلتے تھے آپس میں ہنستے، مذاق کرتے ــــ اور وہ شیلا کس قدر مسوڑی تھی۔ کیسے کیسے مُنہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رُکنے کا نام نہ لیتی تھی ــــ مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں ــــ اب تو وہ جیسے آدمیوں میں رہتی ہی نہیں ــــ اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ ــــ اول تو اُسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا ہے ــــ اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے ــــ جیسے جانور ــــ نہ کوئی بات کرنے کو، نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو۔ بس آؤ اور پڑ رہو ــــ لے دے کے رہ گئی نصیبن، تو اُسے اس کے سوا کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اُس کا بیٹا بھاگ گیا، اُس کی اپنے میاں سے لڑائی ہو گئی، اُس کے یہاں برات بڑی دھوم دھام سے آئی ــــ اُسے کیا ان سب باتوں سے کچھ ہوا کرے، اُس سے مطلب ــــ یا بہت ہوا تو اُسے ڈراتی رہے گی چوروں کے قصے سُنا سُنا کر ــــ ایک دفعہ اُس نے سُنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ کیسے بہکا کر لے گئے تھے، اور اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا ــــ بکتی ہے، بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے ــــ لیکن اگر کہیں اس کے ساتھ ــــ مگر نہیں بے کار کا ڈر ہے جو یوں ہوا کرے تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں۔ بھلا دنیا کا کام کیسے چلے ــــ پاگل ہے بڑھیا۔ بہکا دیا ہے کسی نے اسے ــــ مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو۔ کوئی ساتھ بھی تو نہیں ــــ اگر وہ مڈوائف نہ بنتی تو اچھا تھا۔ اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی، بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے۔ مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہوئیں ــــ کتنے دن ہو گئے پاپا کو بھی مرے ہوئے ــــ بارہ سال۔ کتنا زمانہ گزر گیا اور معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو ــــ کتنا پیار کرتے تھے وہ اُسے ــــ روز اسکول پہنچانے جاتے تھے ساتھ ــــ کلاس میں اُس کی سیٹ میز کے پاس تھی ــــ اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بڑے اچھے آدمی تھے بچارے۔ چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے، اگر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے ــــ اور لڑکے تو نہ جانے اُسے کیا سمجھتے تھے، سارے اسکول میں وہ اکیلی لڑکی تھی نا۔ سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اُس کی طرف دیکھتے رہتے تھے ــــ ارے، وہ موٹا کرم چند۔ بھلا وہ بھی تو اُس کی طرف دیکھتا تھا جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی ہے اُسے ــــ اور ہاں وہ عظیم! ــــ بڑا بھولا تھا بچارا۔ سوکھا سا، زرد، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اُس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اُس کی طرف، مگر جب کبھی وہ اُسے دیکھ لیتی تھی تو فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا، اور رومال نکال کر منہ پونچھنے لگتا تھا ــــ اوہ، اُس دن وہ دل ہی دل میں کتنا ہنسی تھی۔ اُس دن وہ اتفاق سے جلد آ گئی تھی۔ برآمدے میں دوسری طرف سے وہ آ رہا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا، اور وہ گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے پاس پہنچ کر وہ رُک گیا، اور کچھ کہنے سا لگا۔ ڈرتے ڈرتے عظیم نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا۔ اُسے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا، اور اُس نے بڑے گڑگڑا کر کہا تھا "کہیئے گا نہیں" ــــ وہ کتنے دن تک اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی ــــ کتنا سیدھا تھا واقعی وہ ــــ وہ ابھی سکول ہی میں ہوتی تو کتنا مزا رہتا ــــ مگر ــــ وہ زمانہ تو اب گیا۔ اب تو وہ یہاں اکیلی دنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو نہیں ــــ کسی کا خط بھی تو نہیں آتا۔ وہ روز ڈاکئے سے پوچھتی ہے کہ اُس کا کوئی خط نہیں، مگر روز وہی جواب "نہیں" ــــ اور جو آیا بھی تو بس وہی لمبے لمبے بادامی لفافے ــــ آن ہز مجسٹیز سروس ــــ ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں یوں کرو اور یوں کرو۔ کوئی اُس کی ماننے بھی جو وہ یوں کرے۔ خواہ مخواہ کی آفت ــــ اور پھر خط آنے بھی کہاں سے! ــــ اگر اتنی ہی دلی سے خط بھیج کریں تو کیا ہے، مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں ــــ ایک دفعہ جانا اُسے دلی ــــ اچھا شہر ہے۔ کیا چوڑی سڑکیں ہیں ــــ اور سینما کس کس کے ہیں ــــ اور وہ ــــ وہ تو خیر ہے ہی ــــ مگر وہ ــــ

کائیں، کائیں، کائیں نے اُسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اُتر آئی تھی، کوا زور زور سے چیخ رہا تھا، اور وہ بستر پر پیر نیچے لٹکائے لیٹی تھی۔ جلد جانا تھا، اور اُس نے بے کار لیٹے لیٹے اتنی دیر لگا دی تھی۔ وہ نصیبن پر غصہ اُتارنے لگی کہ اُس نے چائے کیوں نہیں لا کر رکھی۔ مگر وہ سمجھ رہی کہ میم صاحب سو رہی ہیں۔ اور واقعی، اُس نے خیال کیا، اس سے وہ اتنی دیر سو ہی لیتی تو اچھا تھا۔ بہرحال اُس نے نصیبن سے جلد چائے لانے کو کہا۔

اُس نے دوبارہ مُنہ دھویا، اور اُلٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کون سی ساڑھی پہنے ــــ سفید

کنارے والی —— مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ —— اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلد ہوتی ہے۔ اُس کی بہار تو بس ایک دن ہے، اگلے دن کام کی نہیں رہتی —— نیلی ساڑھی نیچے چمک رہی تھی۔ اسے ہی کیوں نہ پہنے؟ —— مگر نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے ہو جائیں گے —— وہ جدھر سے نکلتی ہے، سب کے سب اُس کی طرف گھورنے لگتے ہیں۔ اُسے بڑی بُری معلوم ہوتی ہے اُن کی یہ عادت —— اور ان زمینداروں کو دیکھو۔ بڑے شریف بنتے ہیں! —— خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے، جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں، اور طرح طرح کے آوازے کستے ہیں —— کہو یار! —— "ابے مجید ...... ذرا دیکھو!" —— کوئی کھانسنے لگتا ہے —— کیا وہ سمجھتی نہیں؟ —— ذرا شہر میں کر کے دیکھتے ایسی باتیں، وہ مزا چکھا دیتی انہیں —— مگر یہاں وہ کیا کرے، مجبور ہو جاتی ہے —— اُن کی ہی تو وجہ سے اُس نے رنگ دار ساڑھیاں چھوڑ دیں، اور سفید پہننے لگی، مگر پھر بھی نہیں مانتے —— اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے گی، تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے —— تو پھر سفید ہی پہن لے —— مگر روز روز سفید —— اور کیا وہ کوئی اُن سے ڈرتی ہے ہنستے ہیں تو ہنسا کریں، کوئی اُسے کھا تھوڑے ہی لیں گے۔ بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اُس کا؟ —— اب وہ پھر رنگدار ساڑھیاں پہنا کرے گی۔ دیکھیں وہ اُس کا کیا بناتے ہیں؟ —— ہنسیں گے تو ضرور —— مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے —— آج وہ ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی۔

نیلی ساڑھی پہن کر، اُس نے بال بنانے کے لئے آئینہ سامنے رکھا۔ کم خوابی سے اُس کی آنکھیں لال اور کچھ سوجی ہوئی سی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی —— مگر یہ اُس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا، اور کھال بھی کھُردری ہو چلی تھی —— جب وہ لڑکی تھی تو اُس کے چہرے پر کیسی چمک تھی۔ رنگ سانولا تھا تو کیا، چمکدار تو تھا —— اُس کی آنٹی ہمیشہ ماما سے کہا کرتی تھیں۔ "تمہیں بیٹی اچھی ملی ہے!" —— مگر اب ——

اُس نے آئینہ رکھ دیا، اور اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک ایسی حسرت سے دیکھنے لگی جیسے مردہ اپنے پیروں کو —— اُس کے بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے، اور ٹھوڑی بھی موٹی ہو گئی ہے۔ اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں بال بھی سوکھے سوکھے اور ہلکے رہ گئے ہیں اور تیزی تو اس میں بالکل نہیں رہی ہے —— پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی بھاگتی تھی، اور پھر بھی نہ تھکتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی ہی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔

اس نے ایک لمبی سی انگڑائی، اور پھر ایک گہرا سانس لیا —— بے رونق چہرے اور پلپلے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ —— نے بال ایسی بے دلی سے بنائے کہ بہت سے تو ادھر اُدھر اڑتے رہ گئے — سمٹے بال بن چکے تھے، مگر وہ برابر آئینے کو تکے جا رہی تھی، اور اُس کا دماغ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آ گیا تھا، جن میں ایک ہی جگہ ٹھیرے ٹھیرے مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب اُس نے آئینہ رکھا تو اُسے میز کے کونے پر دیوار کے قریب بائبل رکھی نظر آئی۔ یہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اُس کے پاپا نے اُسے دی تھی مدتوں سے اُس نے اُسے کھولا تک نہ تھا، اور وہ گرد سے اٹی پڑی تھی۔ اس کتاب نے اُسے پھر پاپا کی یاد دلا دی، اور وہ اُسے اٹھانے پر مجبور ہو گئی۔ پہلے ہی صفحے پر اُس کا نام لکھا تھا۔ یہ خود اُس کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ لیکن اب اُس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اُس نے پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑی ہنسی آئی کہ اُس وقت وہ کیسے ٹیڑھے میڑھے حرف بنایا کرتی تھی۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ اُس زمانے میں اُس کے پاس ہرا قلم تھا۔ اُس کا ارادہ ہوا کہ اب کے جب وہ شہر جائے گی تو ایک ہرا قلم ضرور خریدے گی۔ مگر پھر اُسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لے کر کرے گی ہی کیا، اب اُسے کون سا بڑا لکھنا پڑھنا رہتا ہے۔

اُس کے پاپا اُسے بائبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اُسے اپنی لاپروائی پر شرم سی محسوس ہوئی، اور وہ بائبل کے ورق اُلٹنے لگی —— پیدائش —— خروج —— اب ورق تیزی سے اُلٹے جانے لگے —— استثنا —— روت —— یرمیاہ —— حیقوق —— متی —— لوقا —— رسولوں کے اعمال —— کہاں سے پڑھے —— آدم —— نوح —— طوفان —— ابراہیم —— کشتی —— صلیب —— مسیح —— یسوع آ جائے —— گرجا کا گھنٹہ —— سب مل کر گرجا جاتے تھے، ہنستے، مذاق کرتے ——

آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سی جگہ سے پڑھے۔ اور پھر اُسے جلد جانا تھا۔ اتنا وقت بھی نہیں تھا لیکن اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اب روز صبح کو بائبل پڑھا کرے گی —— ورنہ کم سے کم اتوار کو تو ضرور —— لیکن دعا تو مانگ ہی لینی چاہئے —— بہت ہی بُری بات تھی۔ ماما کبھی بغیر دعا مانگے نہیں سونے دیتی تھیں —— اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا —— اور لگے بھی تو کیا ہے، دنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں ——

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا، اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر باوجود

گیتا گوبند کا ایک سین

تعارف:- گیتا گوبند سنسکرت زبان کے شاعر اعظم جے دیو کی ایک مذہبی رنگ کی تمثیل ہے جس میں کرشن اور رادھا کے غیر فانی رومان کو پیش کیا گیا ہے۔ نقادوں کی نگاہ میں جے دیو غنائی شاعری کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے کالیداس کی طرح وہ محض فطرت ہی کا والہ و شیدا نہیں بلکہ مرد اور عورت کے باہمی جذبات اور احساسات کا ایک لطیف ترجمان ہے۔

گیتا گوبند کی یہ تمثیل مغربی ادب میں اس درجہ مشہور ہے کہ یورپ میں اکثر اس کو ہندوستانی غزل الغزلات کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ذیل میں اس غیر فانی تمثیل کا ایک منظر ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے !! (ع۔ق)

[رادھا اکیلی بیٹھی ہوئی گنگنا رہی ہے]

رادھا: میرا پریتم ابھی تک نہیں آیا۔
میں اس تنہائی کو کیسے برداشت کر سکوں گی۔ میری چنچلتا میرا روپ اور
میری جوانی سب کچھ بے کار ہے !!
میں اب اپنے آپ کو کہاں لے جاؤں ؟
میری سہیلیوں نے مجھے راستہ بھلا دیا ——— اور مجھے ان سنسان
اور ڈراؤنے رستوں میں لا پھینکا !
.. آہ، پھر اس کا بھی تو کچھ پتہ نہیں ——— جس کی خاطر میں اس
اکیلے ویران جنگل میں بیٹھی ہوں ———۔ جس کے لئے میں نے یہ
کالی اور بھیانک راتیں جاگ جاگ کر کاٹی ہیں !
میں مر جاؤں گی ——— آہ، میں کیوں نہ مر جاؤں ؟
میں اس اداس جنگل میں اکیلی اب نہ رہوں گی !
میرے کرشن نے مجھے جنگل کی ایک بے کار بیل کی مانند سمجھ رکھا ہے،
ایسی بے کار بیل کی مانند جس کی خاموشی پر التفات وہ دھیان ہی نہیں کرتا
——— اسے سنتا ہی نہیں !!
وہ ہرے بھرے بانسوں کے ان سہانے جھنڈوں میں کیوں نہیں آتا ؟
کیا وہ پھر کسی چنچل اور مدھ ماتی گوپی کی مستانہ اداؤں سے اپنا جی بہلا رہا ہے
ناچ رہا ہے۔ اور اس کی نگاہوں کے تیر اپنے سینے میں چبھو چبھو کر خوش ہو رہا ہے ؟
اگر یوں نہیں ——— تو کیا وہ بھی میری ہی طرح راستہ بھول گیا ہے۔ اور اپنی
آہ اپنے دل کی کلی رادھا کو ہی ڈھونڈھ رہا ہے ؟
[رادھا کی سہیلی ایک دوشیزہ داخل ہوتی ہے]

رادھا کی سکھی: آہ، تو ہی بتا، کیا تو نے میرے کرشن کو کہیں ناچتے ہوئے دیکھا ہے ؟ خدا کے لئے اے سکھی بتا ! کیا رادھا کا کرشن کسی ایسی گوپی کی چاہ میں مبتلا ہو گیا ہے ... جو رادھا سے زیادہ اچھی طرح پریم کرنا جانتی ہے ... جو رادھا سے زیادہ اس کی شیدا ہے ؟
آہ، اے میری سکھی کیا تو جانتی ہے کہ چاند [جو محبت کا روحانی دیوتا ہے] آکاش پر کس کی مانند جگمگاتا ہے ؟ یہ چاند سکھی ! رادھا کی جدائی کے سوگ میں روتے ہوئے کرشن کے سنولائے ہوئے چہرے کی مانند جگمگاتا ہے !!
آہ، سکھی، اس چاند کی نرمل چاندنی میں رادھا کے پریم کا پیلا دکھ جھلمل جھلمل کر رہا ہے !!
اس چاند میں کرشن کے اس مکھ کا سپنا ہنس رہا ہے جو میری جدائی میں مرجھا گیا تھا !!
آہ، سکھی ! چاند کی یہ گھاتیں کہیں رادھا کو دیوانہ نہ بنا دیں ؟
[اب یہاں ایک ایسا منظر کھلتا ہے۔ جہاں کرشن گوپیوں کے ہمراہ کھیل رہا ہے۔ یہ منظر رادھا بھی دیکھ لیتی ہے]
[رادھا اپنی سہیلی سے مخاطب ہو کر] سکھی ! وہ دیکھ میرا کرشن جمنا کے چاندنی سے بھرپور کناروں پر ٹہل رہا ہے اور ایک سندر گوپی کے محبت کی شعاعوں سے لبریز چہرے کو اٹھا کر اس کوشش میں ہے کہ اسے چوم لے !!
مگر نہیں، وہ تو اس کی [گوپی کی] پیشانی پر مشک کی بندی لگا رہا ہے۔ گویا وہ چندرماں کے چہرے کے ان سیاہ داغوں کو جن کے ساتھ وہ پہلی بار سنسار میں چمکا تھا دوبارہ رنگ دے رہا ہے !!

پیڑوں کے سائے کے تلے وہ دیکھ! میرا کرشن ایک دوسری گوپی کے سیاہ اور نرم نرم بالوں کو پیار کے ایسے پھولوں سے سجا رہا ہے جو بجلی کی مانند جھلملا رہے ہیں، اور پھر میرا یہ چنچل پیت کا مارا اس پر بھی تو بس نہیں کرتا ―― اس کی آنچ چھلکاتی ہوئی لٹوں کو بھی ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہا ہے جن کے اندر کام دیوتا چھپا بیٹھا ہے!!!

سکھی، دیکھ! اب میرا کرشن ایک اور سندر گوپی کی سانولی چھاتیوں کو موتیوں سے سجا رہا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے گویا دو چاند ہیں جن کے گرد تارے چکر کاٹ رہے ہیں! اُسے چھوڑ کر اب دوسری کے چہرے کو چوم رہا ہے۔ اور اس کے رنگین بازوؤں کے گرد جو شفاف برف اور کنول کے ٹھنٹھلوں کی مانند چمکیلے ہیں۔ ہالہ سا ڈال رہا ہے!! اور اس کے بازو بند جن پر انمول ہیرے جڑے ہوئے ہیں اپنی رنگین انگلیوں سے مسل رہا ہے: یوں نظر آتا ہے جیسے وہ کنول کے شگفتہ پھولوں کو جن پر کالی مکھیاں بیٹھی ہوئی ہیں منتشر کر رہا ہے!!!

اب اُس نے آخری بار ایک اور گوپی کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ اور اُسے ستا رہا ہے .... اس کی مرمریں اور نازک کمر کے گرد۔ اس کمر کے گرد جو کام دیو کی جنم بھومی ہے۔ کمر بند باندھ کر اسے کھینچ کر ڈھیلا کرنے کی کوشش کر رہا ہے!!!

اب دیکھ! وہ سب کی سب گوپیاں آ کر جمع ہو گئیں۔ اور میرے نٹ کھٹ کنھیا کو گھیر کر اُس کے آس پاس ناچنے لگیں!

آہ، سکھی: رادھا کب تک ان نظاروں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہے، اور اس دیوی پیتم کی راہ تکتی رہے۔ جسے رادھا کا کبھی خیال ہی نہیں آتا؟

[رادھا کی سہیلی رادھا سے]

اے پریتم کے درشن کی پیاسی رادھا! اس نٹ کھٹ لڑکے کی بیوفائی سے اپنے دل کو بے حال ہ کر اور اس کی چاہ میں اس طرح آنسوؤں کی ندیاں نہ بہائے جا!! اگر اسے تیری پروا نہیں تو یہ اس کی مرضی!

اس وقت وہ ناچ رنگ کی سیکڑوں محفلوں میں بیٹھا ہوا لطف اندوز ہو رہا ہے میرا جی کس قدر جی چاہتا ہے کہ میں ان محفلوں میں پر لگا کر پہنچ جاؤں جہاں وہ رنگیلا کھلنڈرا اپنے درشنوں سے دھرتی کے سنگار میں مصروف ہے!

اے اپنے پیتم کی متوالی رادھا! آ ہم بھی اس جگہ چلیں جہاں وہ بنسی والا گوپیوں کو پیت کی میٹھی بانی سنا رہا ہے!!

رادھا۔ اے سکھی! بھلا اس گوپی کو کام دیو کی کمان کا کیا ڈر جس نے میرے کرشن کو جس کی گول گول اور بڑی بڑی آنکھوں سے کنول کے پھول بھی شرما جاتے ہیں اپنے پتوں میں چھپا لیا!

جس گوپی نے اس کے سنہرے بستر کے نئی نئے پھولوں سے اپنا بدن چھوا لیا۔ اس کا دل بھلا محبت کی خلش سے کیوں کانپنے لگا؟

جس نے میرے کرشن کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے میٹھے اور سریلے بول سن لئے۔ اس کے تن کو صندل کی ہوائیں پریم کی یادوں سے کبھی بھی جلا نہ سکیں گی!

جس نے میرے کرشن کے رنگین ہاتھوں اور کنول سے پاؤں کو چوم لیا ―― اسے چاند کی شعاعیں گزند نہ پہنچا سکیں گی!!

میرے کرشن نے جسے اپنے ہونٹوں کا وہ امرت پلا دیا جس کا رنگ ساون کی بدلیوں سے بھی زیادہ سرخ ہے۔ اسے برہ کے دکھ کبھی نڈھال نہ کر سکیں گے!!

وہ عورت جس نے میرے کرشن کے پریم کے سپنوں سے اپنا دل بسا لیا وہ جلن سے ہمیشہ دور رہے گی!

وہ عورت جس نے میرے کرشن کی پرستش کی۔ اسے روحانی دیوتا نہیں بلکہ ایک مرد سمجھ کر وہ کام دیوتا سے ہمیشہ محفوظ رہے گی!

میری پیاری سکھی: میں یہ سب کچھ جانتی ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ ایک مرد ہے اور میں ایک عورت!!

میرا دل ہر لمحہ اس کی طرف، صرف اسی کی طرف کھنچتا چلا جا رہا ہے: یہ سرد ہوا مجھے جوالا مکھی سے بھی زیادہ گرم معلوم دے رہی ہے اور یہ چاندنی بس بھری ناگن کی مانند ڈسا ڈسی:

سکھی کتنا انوکھا اور عجیب ہے رادھا کی روح کا یہ نامعلوم اور منوہر جذبہ ―― اپنے پریتم۔ اپنے کرشن کے لئے!!

صندل کی ہواؤ! رادھا کو جی بھر کر ناخوش کرتی رہو!

کام دیو! اپنی کمان سمیت چلا آ۔ اور آ کر میرے بے آس جیون کو مجھ سے لے لے۔

مگر او جمنا! رادھا کی موت کی ہمجولی! تو ہی اپنی ہم جنس کے جذبوں کی قدر کر ―― اور جلد اپنی گونجتی ہوئی لہروں کے ساتھ چلی آ اور رادھا کے بے آرام جسم کو اپنے دائمی سکون کی گود میں بہا کر لے جا!!!

عظیم قریشی

دو نظمیں

ہم راز

کیا خبر اے مری ہمراز تجھے،
مری ناکام محبت کے اُن افسانوں کی،
(دلِ مجروح کے ارمانوں کی)
جن سے معمور ہر اک لمحہ مری زیست کا ہے۔
میری آنکھوں میں چمکتے ہیں ستارے بن کر۔
اور ہونٹوں پہ لرزتے ہیں جو نغموں کی طرح
تیری ہمجولیاں بھی جن سے خبردار ہوئی جاتی ہیں۔

کیا خبر اے مری ہمراز تجھے،
مری ناکام محبت کے اُن افسانوں کی!
تو سمجھتی ہے کہ یہ شاعرِ بدنام ترا۔
تیری اقلیمِ محبت کا جو شہزادہ ہے۔
تیری پاکیزہ و معصوم جوانی کی طرح
آشنا تک بھی نہیں ذوقِ ہوس کاری سے۔
کتنی معصوم ہے تو!
اُف گرفتار ہے تو کیسے حسیں دھوکے میں۔
کیا خبر اے مری ہمراز تجھے۔
راز وابستہ ہیں کیا کیا ترے ناکام کے ساتھ۔
لیکن اک روز تجھے،
راز یہ سارے بتا ہی دوں گا۔
پردہ میں اپنے گناہوں سے اٹھا ہی دوں گا۔
اور تو دیکھ سکے گی مرے عریاں دل کو
کر رہا ہو گا ملامت تجھے جب میرا ضمیر!

آخری پیغام

کھول دو اب تو یہ دروازہ مرا۔
رات بھر دار پہ کوئی یار نہ تھا۔
کھول دو اب تو یہ دروازہ مرا۔
صبح کی نرم ہوا آنے دو۔
اس سے مجھ کو مرے محبوب کی بُو آتی ہے۔
جس کو معلوم نہیں۔
آج میں اُس سے بہت دور ہوں کیوں۔
کام کیا ہے مجھے زنداں کے سیہ خانوں سے۔
پابہ زنجیر میں کیوں آج یہاں بیٹھا ہوں۔
وہ نہیں جانتی یہ راز ہے کیا۔
کھول دو اب تو یہ دروازہ مرا۔
صبح کی نرم ہوا آنے دو۔
آج میں اُس کو سناؤں گا وہ اپنی نظمیں،
اُس کی فرقت میں جو کل رات کہی تھیں میں نے،
ذکر ہے جن میں محبت کے اُن ایام کا جب
زندگی خواب ہوا کرتی تھی۔
اور ہم خوابوں کی دنیا میں رہا کرتے تھے۔
پھر میں یہ راز بتاؤں گا اُسے۔
کس لئے شاعرِ بے باک ترا۔
تری فرقت کا الم سہنے پہ مجبور ہوا۔
اور کیوں اپنی حکومت کے خلاف اس نے بغاوت کی تھی۔
وہ نہ کیوں دیکھ سکا ایسی حکومت کا عروج
جس کا مسلک ہی غریبوں کی دل آزاری تھا
جس کی پاداش میں وہ تجھ سے بہت دور ہے آج۔
میں یہ سب راز بتاؤں گا اُسے۔
کھول دو اب تو یہ دروازہ میرا
صبح کی نرم ہوا آنے دو۔
آج میں آخری پیغام اُسے بھیجوں گا۔
تک رہی ہوگی وہ اب تک مری اُن راہوں کو
ہم کبھی جن پہ پھرا کرتے تھے۔

تابش صدیقی

موتیوں کا ہار

کچھ عرصے سے گورنمنٹ آف انڈیا کی طرح میرا صدر مقام بھی دہلی ہی ہو رہا ہے۔ لیکن یہ صدر مقام بھی سفری ہے۔ یعنی آج یہاں ہوں تو کل کانپور۔ چار دن کے بعد دہلی اور پھر الٰہ آباد، دو دن کے بعد دہلی اور پھر کلکتے یا جھانسی یا بریلی یا لکھنؤ۔ غرضکہ جہاں کہیں بھی جاؤں ہوٹل میں پہنچتے ہی اپنا صدر مقام دہلی لکھا دیتا ہوں۔

لیکن پچھلے جاڑوں میں مجھے صدر مقام پر ٹھہرنے کا زیادہ اتفاق رہا۔ یعنی بجائے اس کے کہ تین گھنٹے دہلی اور چودہ دن بنارس رہوں، میں چھ دن دہلی اور ایک دن کہیں اور رہتا رہا۔

مجھے صحیح طور پر تو معلوم نہیں لیکن ایسی کوئی دلچسپی ضرور ہے جو دہلی والوں کو سرِ شام ہی جامع مسجد کی سیڑھیوں کے پاس جمع کر دیتی ہے۔ ہر شام ایک گھمسان کا میلہ لگتا ہے اور پھر رات کے دس بجے کے قریب خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

یہ بہت ممکن ہے کہ خود میری طرح دہلی والوں کو بھی اس میلے کے برپا ہونے کی وجہ معلوم نہ ہو۔ اس کی نمایاں دلچسپی شاید اُن کبابوں میں مضمر ہو جن کا مزا بجائے گوشت کے دال کی بڑیوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ اور جنہیں کھا کر اگلی صبح استنجے کے لئے ٹھنڈے پانی کے بہت بڑے لوٹے کی خواہش محسوس ہوتی ہے، یا بقول شخصے شربت کے ساتھ استنجا کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر برف کی اُن قلفیوں میں کوئی کشش ہے جو مٹی کے بڑے بڑے کوزوں میں ملتی تو ہیں لیکن ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ یا دو پیسے والی لیمونیڈ کی بوتل میں، دہی بڑے کی چاٹ میں، کباڑیوں کی دو دکانوں میں یا صرف "شاہی حکیم ٹانک" میں، جن کی اسرار و رموزِ جنسی پر مشتمل تقریر اتنی طویل ہوتی ہے۔ کہ ادویہ کی فروخت کی نوبت ہی نہیں آتی۔

ہاں تو مجھے بھی قیام دہلی کے دوران میں شاید یہی دلچسپیاں ہر شام کشاں کشاں جامع مسجد کی طرف لے جاتی تھیں۔

...... دسمبر کے کڑکڑاتے جاڑوں میں ایک صاحب سرِ شام جو ہوٹل میں تشریف لائے تو گیارہ بجے تک اٹھنے کا نام نہ لیا۔ آخر جب رخصت ہی ہوئے تو میں اپنا معمول پورا کرنے کے لئے جامع مسجد کی طرف نکل آیا۔ چاندنی چوک کا موڑ مڑتے ہی ربڑ کے جلنے کی تیز اور ناخوشگوار بُو نے میرا خیر مقدم کیا۔ جس کا سلسلہ مسجد کے پاس والی ڈسپنسری کی بیرونی دیوار تک جاری رہا۔ دیکھا تو ایک لنگوٹ بند فقیر ربڑ کی کترنوں کا ڈھیر لگائے آہستہ آہستہ جلا رہا تھا اور بیٹھا ان کی آگ تاپ رہا تھا۔

فقیر اگر پرانا فقیر ہو تو اس کی عمر کا اندازہ کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ اس کی عمر کا اندازہ اس کے خدوخال سے لگانے کے لئے آپ جوں جوں غور کرتے چلے جائیں گے آپ کا تخمینہ بدلتا چلا جائے گا کیونکہ کبھی تو خاک آلود بکھرے سفید بال کہیں گے۔ کہ اس کی عمر حضرتِ نوح سے کسی طرح کم نہ ہو گی لیکن اس کے بے شکن گال اور بھرے بھرے دست و بازو اس کی نوجوانی کی غمازی کرتے نظر آئیں گے۔ اور کبھی سیاہ بالوں میں آپ کو جھریوں سے بھری ہوئی کھال کے اندر اُبھری ہوئی ہڈیاں یوں نظر آئیں گی جیسے کوئی پانچ ہزار سال کی پرانی ممی مصر کے کسی عجائب خانے سے اٹھ کر چلی آئی ہو۔

میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ فقیر جس طرح وطن کی قید سے آزاد ہوتا ہے اسی طرح وقت کی قید سے بھی آزاد رہتا ہے۔ وہ نہ کبھی بچہ ہوتا ہے نہ جوان نہ ادھیڑ اور نہ بوڑھا۔ وہ صرف پیدا ہوتا ہے اور پھر . . . . مر جاتا ہے۔ یا شاید یہ بھی نہیں بلکہ دنیا پیدا ہوتی ہے، جوانی پر پہنچتی ہے بوڑھی ہوتی ہے اور پھر مر جاتی ہے لیکن وہ ــــ وہ ازل سے ابد تک یونہی اپنی بے نُور سی آنکھوں اور اُلجھے ہوئے دماغ کے ساتھ نیم مدہوشی کی حالت میں دنیا کو حیرت سے دیکھتا ہوا گذرتا چلا جاتا ہے۔

ابھی تک اِکا دکا راہ گیر چل رہے تھے۔ معلوم نہیں کون مسجد سے عبادت کر کے آ رہا تھا۔ اور کون چاؤڑی کو جا رہا تھا۔ میں نے اطمینان سے اُن کے بورئیے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "بابا یہ ربڑ کیوں جلا رہے ہو؟

کہنے لگا "تم لکڑیاں کیوں نہ لیتے آئے؟"

میں نے کہا "اس کی گیس زہریلی ہوتی ہے۔"

کہنے لگا "یہ اور بھی اچھا ہے۔ کیونکہ میرے پاس زہر کے لئے بھی دام نہ تھے۔ تاپنے کے لئے آگ بھی مل گئی اور موت مفت میں رہی۔"

میں نے چند پیسے پیش کرتے ہوئے کہا "اس دنیا میں بے دام چیز حرام ہے۔ چاہے وہ موت ہی کیوں نہ ہو۔ لیجئے زہر کے دام تو حاضر ہیں"——اس پر ہم دونوں ہنس دیئے۔

مدن اور میں چند ہی منٹوں میں اچھے خاصے دوست بن گئے اور پھر رات وہ مجھے اولیاء اللہ کے معجزے سناتا رہا۔ اور میں اس سے دنیا والوں کی ساحری کے قصے کہتا رہا۔

فقیر کی ذات جب تک پردۂ راز میں رہے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے میرے خیال میں کسی فقیر کا ابراہیم ادہم ہونا یا مچھن چور ثابت ہونا، دونوں اس رومان کو کھو دیتے ہیں جو اس کے صرف فقیر ہونے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے باوجود ان طویل ملاقاتوں کے مدن میرے لئے صرف مدن ہی رہا یا پھر جامع مسجد کے ساتھ والی ڈسپنسری کے پاس بیٹھنے والا "فقیر"

کہتے ہیں سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ اس خواب کی تعبیر تو میں نے ابھی دیکھی نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ سفر میں بعض واقعات بڑے دلچسپ رہتے ہیں۔ یا کم از کم ایسے، جو انسان کی زندگی پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

آپ میں سے اکثر کا خیال فوراً عورت، حسن اور عشق کی طرف منتقل ہو گیا ہو گا۔ یا کم از کم ریل گاڑی کے زنانہ ڈبے کی طرف۔ لیکن میرے آج کے مضمون کا موضوع یہ نہیں ہے، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعات سے بھی دوچار ہونا پڑ جاتا ہے۔

مثلاً گذشتہ دنوں جموں سے لاہور آنے کے لئے میں وقت بچانے کے خیال سے لاری میں سوار ہو گیا۔ سیالکوٹ سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت اور تین لڑکیاں سوار ہوئیں۔ بڑی بی کا چہرہ کسی قدر رعب دار تھا اس لئے میں نے احتیاطاً سب کی طرف سے پیٹھ پھیر لی۔ لاری ڈسکے پہنچی تو بڑی بی مع دو لڑکیوں کے اتر پڑیں۔ اور تیسری وہیں بیٹھی رہی۔ معلوم ہوا کہ یہ اُن سے الگ ہیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکی نے اکنی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "ذرا خوانچے والے سے چلغوزے لے دیجئے" میں نے چلغوزے خرید کر ان کی جھولی میں ڈال دیئے۔ وہ بولیں "آپ بھی کھائیے"۔

میں نے تبرکاً دو دانے اٹھا لئے اور چھیل کر کھا گیا۔ وہ بولیں "اور کھائیے"۔ میں نے مسکرا کر دو دانے اور اٹھائے اور کھا لئے۔ اب مسکرانے کی اُن کی باری تھی۔ کہنے لگیں "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میرے ساتھ کھاتے جائیے جب تک کہ یہ ختم نہ ہو جائیں"۔ چنانچہ میں نے باقاعدہ تعمیل ارشاد شکم شروع کر دی۔

چار پیسے کے چلغوزوں کی بساط ہی کیا تھی۔ اور پھر مجھ سے جیسے زود خور کے سامنے جس سے حصہ بٹانے کے لئے میاں قمر دین کو ایک دفعہ چلغوزے مع چھلکوں کے پھانکنے پڑے تھے۔ وہ چار ہی منٹ میں صفایا ہو گیا۔ انہوں نے اپنی جھولی کو جھاڑا اور بولیں "مجھے چلغوزوں سے بڑی محبت ہے۔ بے حد محبت! آپ کو سب سے زیادہ کونسی چیز مرغوب ہے؟" میں نے کہا "تیل کے پکوڑے"۔

اب اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں لیکن آفرین کہیئے ہم دونوں کو کہ ذاتیات پر نہ اُس نے حملہ کیا اور نہ میں نے۔ گوجرانوالہ قریب آ رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کے چلغوزوں کے احسان کا بدلہ کس طرح اتاروں۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک جائیں گی۔ شاید لاہور۔ . . . . "گوجرانوالہ کے ٹکٹ دے دو!!!" لاری کے کلینر کی آواز سنتے ہی دل دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے پہلے میرے چہرے کا جائزہ لیا، پھر ہاتھوں کی طرف دیکھا کہ شاید ٹکٹ نکالوں گا۔ یہی کچھ میں نے کیا۔ یعنی پہلے اس کے چہرے کی طرف دیکھا پھر ہاتھوں کی طرف۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹکٹ نہ اُس نے نکالا اور نہ میں نے۔

اب میرے دماغ میں مٹھائی، سنگترے، کیلے، رس گلے سبھی کچھ گھوم رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کون سی چیز انہیں زیادہ خوش کر سکتی ہے۔ یکایک لاری اڈے میں داخل ہوئی اور "چلو لاہور!!!" کی کرخت آوازیں کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی بلند ہوئیں۔

لڑکی کچھ جھجکی، پھر کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی لاری کی نشست کے نیچے سے نکالتے ہوئے بولی، "آپ نہیں اتریں گے؟ میرا کلیجہ تک کباب ہو گیا اور میں نے جل کر کہا "نیکبخت! اگر میری قسمت میں یہاں اترنا مقدر ہوتا تو تم اس لاری میں سوار ہی کیوں ہوتیں"۔ اور پھر یقین جانئے کہ ایک بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے دماغ میں آپ کے رسالے کا وہ افسانہ پھر گیا جس میں کلکتے کے نزدیک کسی صاحب کو ایک بھیک مانگنے والے چھوٹے سے لڑکے کی ڈیبیہ مل گئی تھی۔ اور انہوں نے چلتی ہوئی گاڑی کو پکڑتے ہوئے

اس کا بوسہ لے کر اپنا فونٹن پن اسے بطور یادگار دے دیا تھا۔

میں نے جلد جلد اپنے جیب کی چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میرا فونٹن پن؟ خود ایک یادگار ہے۔ گھڑی؟ بیس سال کی وفادار خادمہ ہے، پاکٹ بک؟ اس کے لئے بیکار ہے اور میری نہایت قیمتی یادداشتیں اس میں درج ہیں ـ نقد دے دوں؟ شاید بُرا مانے۔

آخر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو سگرٹ کی ڈبیہ سرکی۔ اسی کو نکال پیش کیا۔ کہنے لگیں "یہ کیا؟ میں سگرٹ تو نہیں پیتی"۔ میں نے کہا "اسی لئے تو دے رہا ہوں۔ نہ پیوگی نہ ختم ہوں گے۔ اور میری یادگار تا قیامت قائم رہے گی"۔ اس پر ہم دونوں دل کھول کر ہنسے۔ ڈبیہ اس نے اپنی کپڑوں والی گٹھڑی میں رکھ لی اور . . . . چلی گئی۔

ایک ساتھی مسافر پوچھنے لگے "یہ کون تھیں"؟ میں نے کہا "اپنی ہی تھیں"۔ اُن کی تسلی نہ ہوئی اور پھر کوئی سوال کیا۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ہاں، تو چند روز کے بعد ہی مجھے ایک طویل دورے کے لئے دہلی چھوڑنا پڑی۔ واپس آکر دیکھا تو مدّن ندارد۔ یاالٰہی! اسے میرے پیسوں کی افیم نے ختم کیا یا ربڑ کی زہریلی گیس اُڑا لے گئی۔ ہم ہوٹل کے باسیوں کے لئے دلی کی گلیاں ویسے بھی دلچسپی کا کیا سامان پیدا کرسکتی ہیں۔ لیکن مدّن کے بعد دہلی کی راتیں کچھ بہت ہی بے کیف سی ہوگئیں۔

ایک رات کا ذکر ہے میں دنیا کے دھندوں سے دن بھر کا تھکا ہارا لوٹا گھر آتا ہوا پھر اسی طرف آن نکلا۔ چاندنی چوک سے مڑتے ہی پھر اسی ربڑ کے جلنے کی بُو نے مشام جان کو معطر کر دیا۔ میں بھاگتا ہوا ڈسپنسری کے قریب پہنچا تو مدّن کی لال لال انگارا سی آنکھیں نیم تاریکی میں میری طرف گھورتی ہوئی نظر آئیں ـ ہم دونوں یوں ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں۔

مدّن بولا "تم پوچھنا چاہتے ہو کہ میں اتنے روز کہاں رہا؟ بیٹھو ذرا ہاتھ پاؤں گرما لو۔

"ہماری آخری ملاقات کے تیسرے ہی دن میرا دل دہلی سے اُچاٹ ہوگیا۔ چنانچہ اسٹیشن پر جاکر ایک گاڑی میں سوار ہوگیا۔ صبح کے قریب ایک ٹکٹ بابو میرے ڈبے میں آن دھمکا اُس نے مجھے کچھ یونہی سا تنگ کرنا شروع کیا تھا کہ لنگوٹی کی ایک ہی گانٹھ کھولنے پر وہ مجھے ایک موٹی سی گالی دے کر مطمئن ہوگیا کہ میرے پاس مال و دولت کی قسم میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھے گاڑی سے اتر جانے کا حکم ہوا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ پھاٹک کے بابو نے رستہ روک کر پھر ٹکٹ کا مطالبہ کیا تو میں نے سابقہ تجربے کے مطابق پھر لنگوٹی کی گانٹھیں کھولنا شروع کیں۔ مختصر یہ کہ گاڑی میں ایک گالی اور اسٹیشن کے پھاٹک پر ایک ہی دھکے کے بعد لکھنؤ شہر میں موجود تھا۔ سودا مہنگا نہیں ہے، کبھی تجربہ کرکے دیکھ لینا۔

"یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ بھک منگے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک منہ پھاڑ کر تقاضا کرنے والے اور دوسرے خاموشی سے بیٹھے رہنے والے۔ دوسری قسم کے فقیروں کو خیرات دینے والے ایسے ہی لگے بندھے ہوتے ہیں۔ جیسے غریب دوکاندار یا محلے کی بے رونق دکان کے گاہک۔ اس لئے لکھنؤ پہنچتے ہی میرے لئے کھانے کا انتظام ذرا مشکل تھا۔

"بہرحال میں نے اپنے پرانے قاعدے کے مطابق شہر کے سب سے زیادہ بارونق حصے یعنی امین آباد کا رُخ کیا۔ اگر تم کبھی لکھنؤ گئے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ پارک کے شمال مغربی کونے پر فقیروں کا مستقل اڈا ہے قریباً ۲۰-۲۵ فقیر ہر وقت یہاں موجود رہتے ہیں۔ شام تک تو میں سفر کی تکان اتارنے کے لئے بے حس و حرکت لیٹا رہا لیکن اس وقت نیند اور بھوک دونوں نے یکدم حملہ کیا۔ اتنے میں میرا پرانا یار "بازیگڈ" آن پہنچا اور اس نے میرے پیٹ بھرنے کا سامان فوراً مہیا کر دیا۔ . . . . بے مانگے کے کھانے اور ٹانگیں پھیلا کر بے فکری کی نیند سونے میں کیا لطف ہے!

"لیکن رات خاصی سرد تھی اور کسی قسم کا اوڑھنا ناپید۔ دہلی میں تو کوئینز روڈ کے ٹائر مرمت کرنے والوں کے طفیل بہت سا ربڑ مل جاتا ہے۔ دوسرے فقیروں کی لاعلمی یا اس کی بُو سے نفرت کی وجہ سے مجھے بغیر کسی تگ و دو کے کافی مال ہاتھ آجاتا ہے۔ لیکن لکھنؤ میں یہ نعمت میسر نہ تھی۔ . . . . . . خدا بڑا کارساز ہے۔ انسان کے دُکھ کی دوا اور اس کے عیش و آرام کا سامان کسی نہ کسی صورت میں ہر جگہ موجود رکھتا ہے۔ بس اک ذرا سے حیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

"گھنٹہ گھر کے گھڑیال نے گیارہ بجائے اور سردی کے مارے میری آنکھ کھل گئی۔ بیسیوں جتن کئے۔ گھٹنوں کو ٹھوڑی کے ساتھ ملا دیا، پینترے بدل بدل کر سردی کے دیو پر حملہ کیا لیکن کمبخت کسی حیلے مغلوب نہ ہوا ـ دوکانیں بند ہوچکی تھیں۔ راہ گیر اکا دکا رہ گئے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سارا جسم اکڑ رہا تھا۔ دانت بجنے لگے۔ ربڑ کے جلنے کی زندگی بخش زہریلی گیس

کے لئے جی ترسنے لگا۔

"میرے پاؤں کی طرف ایک چھوکرا ٹاٹ کے ٹکڑے میں گٹھڑی بنا پڑا تھا۔ ایک بڑھیا اپنے پھٹے ہوئے لحاف میں اپنی خراٹے لے رہی تھی اور اس کی نوجوان لڑکی جس پر سے لحاف کا اپنا حصہ کھسک کر اتر چکا تھا اپنے جسم کو گرمانے کے لئے بڈھے حافظ جی کی آغوش میں گھسی چلی جا رہی تھی۔ ایک ننھا سا بچہ ایک اور بچے کے جسم کے نیچے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اوپر والا جس کی آنکھیں نیند کے غلبے سے مچی ہوئی تھیں اپنے ارد گرد ہاتھوں سے کچھ ٹٹول رہا تھا۔ شاید کسی کباڑی کے پاس بیچے ہوئے لحاف کو۔ ایک شخص نے کاغذ کے ایک موٹے تختے میں گریبان سا بنا کر گلے میں پہن رکھا تھا اور اس کے کونوں کو پیٹھ کے نیچے دبائے پڑا تھا۔ نوجوان بازیگر ایک چٹائی میں لیٹا ہوا اپنی ننگی ٹانگوں کو جو سکڑ کر تانتے پڑے ہوئے ہڈی کے ڈھیر میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ شخص ہم میں سب سے زیادہ زندہ دل، ہردل عزیز اور عجیب و غریب تھا۔ پیشہ ور بازیگر تو نہ تھا لیکن بازیگر دل کی سی حرکات کر کے اور لوگوں کو ہنسا کر پیسہ دھیلا پیدا کیا کرتا تھا۔ میں اسے مدت سے جانتا ہوں لیکن اس کا اصلی نام نہ مجھے معلوم ہے اور نہ لکھنؤ کے کسی اور فقیر کو۔ اس لئے ہم اسے صرف بازیگر کے نام سے پکارتے ہیں۔

بازیگر عام لوگوں کے لئے گونگا ہے اور کسی کے ساتھ بات چیت نہیں کرتا۔ صرف اپنے ہم جنسوں سے بولتا ہے۔ اپنی چٹائی کی حفاظت بڑی سختی کے ساتھ کرتا ہے۔ چلتے پھرتے وقت اسے جسم کے گرد لپیٹ لیتا ہے اور بیٹھتے وقت یا تماشا دکھانے کے لئے اسے زمین پر بچھا لیتا ہے۔ وہ اکھاڑہ باندھ کے تماشا بھی نہیں کرتا بلکہ کسی ایک شخص کو دور ہی سے منتخب کر لیتا ہے اور گلے سے کوئی عجیب و غریب آواز نکال کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے پھر لپک کر چٹائی بچھاتا ہے اور اس پر قلابازی لگاتا ہے، ہاتھوں کے سہارے کھڑا ہو کر ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، یا چھلانگ لگاتا ہے۔ اور اگر اور کچھ نہ سوجھے تو ڈنٹر پیلنے لگ جاتا ہے۔ لیکن یہ کرتب دکھاتے وقت لازمی طور پر اس کی کسی ٹانگ یا بازو پر ایک مصنوعی چوٹ آ جاتی ہے اور وہ لنگڑاتا ہوا یا ہاتھ کا ٹنڈ سا بنا کر کھینچتا ہوا دو چار قدم چلتا ہے اور پیٹ کو ڈھول کی طرح بجا کر منہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور پھر قہقہے لگانا شروع کر دیتا ہے۔ ایک دو پیسے اسے اکثر مل جاتے ہیں جن کے عوض قریب کے خوانچے والے سے کوئی شے یا تنور والے سے روٹی لینے کے لئے وہ فوراً چٹائی کو اپنے جسم کے گرد لپیٹتا ہوا دوڑ پڑتا ہے۔ اور پھر اطمینان سے اپنی جگہ پر آ کر چٹائی بچھا کر کھانا شروع کر دیتا ہے۔

جس طرح کسی بیمار کو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مرض کے دورے پڑتے ہیں اسی طرح بازیگر کو بھی کرتب دکھانے کے دورے پڑتے ہیں۔ اگر اسے بھوک نہ ہو اور پیسہ مل جائے تو وہ پیسہ لے کر میرے جیسے کسی کاہل فقیر کی طرف دوڑتا ہے اور اس کے سامنے پیسے کو یوں ہوا میں اچھالتا ہے جیسے روپیہ پرکھنے کے لئے انگوٹھے کو انگلی کے نیچے دبا کر ہوا میں اچھالا جاتا ہے۔ اور پھر پیسہ ہیں گرا کر اور اندھا بن کر راستہ ٹٹولتا ہوا واپس اپنی جگہ پر آن بیٹھتا ہے۔ بازیگر میں ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ایک کرتب کے بعد لنگڑا بنتا ہے تو دوسرے کرتب کے وقت تک لنگڑا ہی بنا رہتا ہے۔ یا اگر اس وقت اس کی کمر ٹوٹ گئی ہو تو اگلے تماشے تک ٹوٹی ہی رہے گی۔

"خیر تو سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے میں نے پاؤں سے بازیگر کو ہلایا اور پھر دو ایک آوازیں دیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ معاملہ وہ خود بھانپ گیا۔ چٹائی بچھا کر دو ایک ڈنٹر پیلے اور پھر پاؤں سے ٹھوکریں مار مار کر سب مردوں کو اٹھا دیا اصل میں سبھی تو جاگ رہے تھے۔ بازیگر بولا چلو ایندھن لائیں۔

"اپنے چیتھڑوں اور بوریوں کو اپنے اپنے جسموں کے گرد لپیٹتے ہوئے آدھے آدمی پارک کے ایک طرف اور آدھے دوسری طرف کو ہو لئے اور قریباً بیس منٹ کے بعد جب لوٹے تو پھلوں کی ٹوٹی پھوٹی ٹوکریوں، ردی کاغذوں، پارسال کی گھاس اور ایسی ہی اور اشیا کا ایک انبار لگ گیا۔ حافظ جی نے دیا سلائی نکالی، عورتوں اور بچوں کو جگا جگا کر الاؤ کے نزدیک کر لیا۔ گیا اور درمیان میں آہستہ آہستہ اس گھاس پھونس کو سلگانا شروع کر دیا۔

"بی چھپکلی، کو بھی جگا کر بلایا گیا۔ چنانچہ وہ اپنے برقعے کو جھاڑتی سنبھالتی، اپنی کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے ہوئے ایک طرف آن بیٹھیں۔ بی چھپکلی کون ہے؟ ...... ایک ادھیڑ عمر کا سن جو ہر وقت برقعہ پہنے رہتی ہے یہاں تک کہ اپنی ٹولی کے فقیروں کے سامنے بھی چہرے سے نقاب نہیں اٹھاتی۔ جب سوتی ہے تو اپنی ٹانگیں گھونگے کی طرح برقعے کے اندر کھینچ کر نچلے سرے کو اکٹھا کر کے رسی سے باندھ دیتی ہے۔ اس کی کپڑوں کی گٹھڑی بھی برقعے کے اندر ہی رہتی ہے

"غرضیکہ ہم لوگ آگ تاپتے رہے اور بیڑیاں پیتے رہے۔ کبھی کبھی ٹولی کا کوئی فرد بات بھی کر لیتا رات یوں ہی مزے سے گذر گئی اور صبح ہم لوگ پارک کی نرم نرم گھاس پر لیٹے ہوئے دھوپ میں خراٹے لے رہے تھے۔

"اور ہاں بازیگر کا ایک دلچسپ واقعہ تو تمہیں سنانا ہی بھول ہی گیا۔

"ایک دن کا ذکر ہے کہ کوئی خیر خیرات کرنے والے حضرت صبح ہی صبح تنور کی باسی روٹیاں بانٹ گئے۔ بعض فقیر جن کے پاس پچھلے روز کا پیسہ دھیلا موجود تھا سالن لے آئے لیکن بازیگر نے ابھی تک کچھ نہ کمایا تھا، اور کسی فقیر کی پیش کی ہوئی چیز لینا تو اس کے اصول کے خلاف تھا ہی۔ اس لئے کسی اور نے بھی اُسے دعوت دینے کی جرأت نہ کی۔ اُس دن اُس کی طبیعت کچھ سست سی تھی، اس لئے کھیل بھی اُس نے اسی طرز کا سوچا۔

"زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اُس نے دونوں ہاتھوں کو زور کے ساتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیا اور اسی حالت میں سڑک کے عین درمیان چلنا شروع کر دیا۔ چونکہ ٹانگیں سختی کے ساتھ جکڑی ہوئی تھیں اس لئے اس کا قدم ایک انچ سے زیادہ نہ بڑھ سکتا تھا۔ لیکن وہ سڑک کے بیچوں بیچ کبھی ادھر اور کبھی اُدھر اپنی لپٹی ہوئی چٹائی کو گردن پر لٹکائے یوں ہی چلا جا رہا تھا۔ اتفاق کی بات، کوئی موٹر والے صاحب بڑی سڑک پر سے اس طرف کو گھومے۔ ایک طرف دو تین تانگے کھڑے تھے، دوسری طرف حضرت بازیگر اس ہیئت کذائی کے ساتھ چیونٹی کی چال بہے تھے۔ صاحب نے بتیرا ہارن بجایا لیکن بازیگر جل بھنے تو راستے سے ہٹنے۔ موٹر والے کو شاید رحم آ گیا اور اس نے ایک پیسہ سڑک پر پھینکا۔ بازیگر یکدم لپکا اور پیسہ اٹھا کر پارک کا جنگلہ پھاند پار ہو گیا۔ صاحب مسکراتے ہوئے نکل گئے اور بازیگر ایک ہی جست میں جنگلہ پار کر کے بجری کے ڈھیر پر پھر اسی طرح آن بیٹھا۔ ایک خوانچے والے سے پیسے کے بھنے ہوئے چنے لئے اور اشارے کے ساتھ اُس باسی روٹی پر رکھوا لئے۔

"میں ذرا فاصلے پر بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ بازیگر نے دایاں ہاتھ ذرا سا ڈھیلا کیا اور سارے جسم کو بائیں طرف جھکاتے ہوئے روٹی کا لقمہ توڑا اور چنوں کے دانے اس میں لپیٹ کر منہ میں رکھ لیا۔ ایک، دو، تین لقمے کھانے کے بعد گلے میں پھندا پڑ گیا۔

"کبھی تم نے مرغی کے گلے میں سوکھی روٹی کا ٹکڑا پھنستے دیکھا ہے! تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ وہ کس طرح گردن کو گھما گھما کر اور پھر سر کو جھٹک جھٹک کر لقمہ نگلنے یا اگلنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور شاید تمہیں یہ بھی معلوم ہو کہ اس وقت مرغی کے حلق سے کیسی ایک چیخ سی نکلتی ہے! بالکل یہی نقشہ اس وقت میرے سامنے تھا۔ بازیگر نے آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ مجھے اُس وقت اور تو کچھ نہ سوجھا بس دوڑ کر اس کی پیٹھ پر دو تین گھونسے رسید کر دیئے۔ ہائے لقمہ حلق سے نیچے اتر گیا۔

"اس کے بعد بازیگر اس بات پر اڑ بیٹھا کہ میں بھی نان چنے بھرے چنوں کے ساتھ باسی روٹی کھاؤں۔ اگر کوئی اور ہوتا تو میں ہرگز نہ مانتا لیکن بازیگر کی بات مجھ سے رد نہ ہو سکی۔ چنانچہ دو ہی لقمے کھانے کے بعد میں بھی مرغا بنا بیٹھا تھا۔ اس کے بعد فوراً ہی تڑاق سے تین گھونسے میری پیٹھ پر آ لگے اور لقمہ حلق سے نیچے اتر گیا اور ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ٹکڑ پر کمیٹی کا نل ہے، وہاں سے ہم دونوں نے سیر ہو کر پانی پیا اور جان سلامت بچنے پر خدا کا شکر ادا کر کے لیٹ گئے۔

ہاں ہاں! وہ بی چھپکلی کی بات رہ ہی گئی تھی۔ وہ اپنی گٹھڑی کی حفاظت ایسے کرتی ہے جیسے کوئی اژدہا اپنے اندوختے کی یا جیسے کوئی بادشاہ اپنے خزانے کی۔ اس کی انہی تدبیروں کی وجہ سے ہم لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ورنہ کسے پڑی ہے کہ کسی کے راز ڈھونڈتا پھرے۔ کوئی کہتا تھا اس میں بی چھپکلی کا اندوختہ ہے۔ کوئی کہتا قیمتی کپڑے ہیں جن پر سچے گوٹے اور سلمے ستارے کا کام ہو رہا ہے۔ اور کوئی بی صاحبہ کا زیور بتاتا تھا۔ مجھے بھی معلوم نہ ہوتا لیکن ایک عجیب اتفاق پیش آ گیا۔

"کسی نواب صاحب کے ہاں نیاز تھی۔ انہوں نے فقیروں کو دیر دولت پر بلا بھیجا۔ سب جا چکے تھے۔ بی چھپکلی ذرا دیر میں اڈے پر پہنچیں۔ میں نے پتہ بتایا۔ شاید اُس روز وہ دیر کی بھوکی ہوں گی، جلد پہنچنے کے خیال سے یا شاید ضعف کی وجہ سے انہوں نے گٹھڑی کو میرے سپرد کر دینا مناسب سمجھا اور پھر مجھے اس کی حفاظت کے لئے تاکیدیں کرتی ہوئی تیزی سے روانہ ہو گئیں۔

"میں ایک دکان کے تختے کے ساتھ سہارا لگائے لیٹا پڑا تھا گٹھڑی کو اٹھا کر میں نے اُس تختے کے پیچھے سرکا دیا۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے اپنے خیالات میں گم سا ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں کس وقت فقیر نواب صاحب کے ہاں سے لوٹے اور کب بی چھپکلی آئیں۔ یہاں تک کہ کسی نے ناگہاں میرے ایک ٹھوکر لگائی اور غصہ بھری آواز میں پوچھا، "ارے موئے میری گٹھڑی کہاں ہے؟"

"مجھے اس قدر غصہ آیا کہ بجائے گٹھڑی دینے کے میں نے کہا کونسی گٹھڑی مجھے دے گئی تھیں؟"

"بس جناب اُس نے تو ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ لوگوں میں آ گئی۔ اس مردود نے مجھے لوٹ لیا! لوگو پکڑو! چور ہے چور! ہائے میں کہیں کی نہ رہی، وغیرہ وغیرہ۔

"آخر جب خوب سے لوگ اکٹھے ہو گئے تو اس نے تختے کے پیچھے سے گٹھڑی نکال کر سامنے رکھ دی۔ اور کہا لو بی چھپکلی! یہ رہی تمہاری گٹھڑی لیکن اسے تب اٹھانے دوں گا کہ یہیں کھول کر اپنا مال پورا کر لو۔

"اس نے بہتیری کوشش کی کہ اسے الگ لے جا کر کھول سکے لیکن اب بی صاحبہ کو دوسروں نے بھی مجبور کرنا شروع کر دیا خصوصاً اپنے حلقے کے فقیروں نے۔ چنانچہ گٹھڑی بی چھپکلی نے اپنے ہاتھوں سے کھولی ...... دو پھٹے ہوئے کرتے، ایک دُھلا ہوا مگر تار تار پاجامہ، جراب کا ایک پیر، ٹیپے کے جوتوں کی ایک سُوکھی ہوئی جوڑی۔ گاڑھے کی ایک مَیلی چادر ...... لیکن ان سب چیزوں کو جلدی سے الگ پھینک کر بی صاحبہ نے ایک ململ سا تھیلا نکالا اور پھر اسے اوپر ہی سے ٹٹول کر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے سب چیزوں کو سمیٹنا چاہا۔ یکایک بازیگر لوگوں کے ہجوم کے اوپر سے جھکا اور بڑی بی کے ہاتھ سے تھیلا اُچک کر بولا "بی چھپکلی! یا تو اسے کھول کر دیکھو ورنہ ہم ایسے نہ دیں گے۔" "ہاں ہاں" کی آوازوں نے پھر اسے کھولنے پر مجبور کر دیا۔ ہم سب نہایت مشتاق نگاہوں سے اس دولت کو دیکھنے کے منتظر تھے جس کی حفاظت اس زبردست طریق پر کی جاتی تھی۔

"اس میں سے کیا نکلا؟ ایک ریشمی رومال جس کے دھاگے تک نکل آئے تھے۔ اور پھر اس کے اندر نہایت احتیاط سے لپٹا ہوا ایک ہار ...... کانچ کے منکوں کا ——— دو پیسے والا جاپانی ہار۔

"اکثر تماشائی مارے ہنسی کے دوہرے ہو ہو گئے، لیکن اس ہار کو دیکھ کر میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ میرا دل اداس ہو گیا۔

"بی چھپکلی کھسانی سی ہو کر ٹولی کے اور فقیروں سے پرے کچھ فاصلے پر جا بیٹھیں۔

"بازیگر بڑا طبیعت دار ہے۔ آج اسے کرتب دکھانے کے دورے پے بہ پے پڑ رہے تھے۔ اور جو پیسہ جو اسے حاصل ہوتا دور ہی سے بی چھپکلی کی طرف پھینک دیا جاتا۔

"معلوم نہیں میرا حلق کیوں سُوکھ رہا تھا۔ گلے میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ خاصا اندھیرا ہو چلا تھا جب میں پانی کے دو گھونٹ پینے کے لئے نل کی طرف آیا۔ امین آباد کی تمام دوکانوں پر بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ پارک کے چاروں طرف یہ مسلسل مشعلیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے ایک بہت بڑا ہیروں کا ہار جگمگ جگمگ کر رہا ہو۔ اور پھر مجھے یوں لگا جیسے یہ ہار خود میرے ہی گلے میں پڑا ہوا ہے اور دم بدم، لمحہ بہ لمحہ سکڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پھانسی کے پھندے کی طرح اس نے میرا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔

"میرے اللہ!" بے ساختہ منہ سے نکلا اور پھر جو میں وہاں سے بھاگا ہوں تو سیدھا اسٹیشن پر آیا۔ دہلی کی گاڑی تیار تھی۔ اور اگرچہ مجھے راستے میں تین جگہ اتار دیا گیا لیکن آج صبح میں نے یہاں پہنچ کر ہی دم لیا۔

"عورت کی محبت بے پناہ ہے۔ لیکن وہ ایک وقت میں صرف ایک ہی چیز سے محبت کر سکتی ہے۔ مرد سے یا پھر ...... زیور سے۔ اور یقین جانو کہ جو عورت ہار سے محبت کرے گی وہ مرد سے کبھی محبت نہ کر سکے گی۔ تمہیں اعتراض ہے؟ ...... ہوا کرے۔ خود میری زندگی میں ......"

یہاں پہنچ کر مدن یکایک رُک گیا۔ اس نے عجیب سی نظروں کے ساتھ، جلتے ہوئے ربڑ کی ہلکی سی روشنی میں میری طرف گھور کر دیکھا اور بولا۔ "رات زیادہ آگئی ہے۔ تمہیں نیند آ رہی ہوگی۔ جاؤ سو رہو!"

اور پھر بغیر میرے اٹھنے کا انتظار کئے، اس نے جلدی سے ربڑ کی چند اور کترنیں آگ میں جھونک دیں۔ اور دائیں بازو کو سرہانے رکھ کر قوس کی شکل میں اپنے الاؤ کے گرد لیٹ گیا۔ چند ہی لمحوں میں اس نے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔

میں مدن کی اس حیلہ سازی اور بناوٹی نیند پر مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ہوٹل پہنچنے تک تمام راستہ میں عورت اور محبت کے متعلق مدن کے فلسفے پر غور کرتا رہا۔ اور مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ بستر پر لیٹتے ہوئے آنکھیں بند کرنے سے کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ جو عورت چلغوزوں سے اسقدر محبت رکھتی ہو اس کے دل میں مرد کی محبت کے لئے کوئی جگہ باقی رہ سکتی ہے یا نہیں۔

اس گتھی کے سلجھانے کے لئے میں اگلے روز پھر مدن کے اڈے پر گیا لیکن اسے خالی پایا۔ ربڑ کی کترنیں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں ......!

مظفر احمد

پھرتا ہوں آوارہ سا!

(۱)

پھرتا ہوں آوارہ سا
ایسے جیسے ساون کے
کالے کالے بادل میں
پھرتا ہو آوارہ سا
کوئی نغمہ کوئل کا
جس کو دُور اِک گاؤں میں
قوسِ قزح کے جھولے پر
ایک سہاگن سُنتی ہو!

(۲)

پھرتا ہوں آوارہ سا
ایسے جیسے ندی میں
پھرتا ہو آوارہ سا
کوئی موجہ پانی کا
جو پنگھٹ کی سیڑھی پر
چاندنی رات میں آکر دھوئے
پاؤں کسی دوشیزہ کا
جو نورانی لہروں میں
دیکھ رہی ہو کھوئی سی
پریم کے سُندر لمحوں کے
دُھندلے دُھندلے سے خواب!

(۳)

پھرتا ہوں آوارہ سا
چھاؤں میں جیسے تاروں کی
پھرتا ہو آوارہ سا
کوئی سپنا شاعر کا
جو تاروں کی دنیا میں
ڈھونڈ رہا ہو رات کے وقت
حُسن کے خنداں ہونٹوں سے
پھول سحر کے کھوئے ہوئے!

(۴)

پھرتا ہوں آوارہ سا
جیسے ابرِ بہاری میں
پھرتا ہو آوارہ سا
کوئی قافلہ کونجوں کا
جس کو دُور اک دوشیزہ
گیسو ڈالے شانوں پر
دیکھ رہی ہو کھڑکی سے
اور دل اُس کا [illegible]
[illegible]

(دہلی)
اردو زبان
سے
کا رُخ پلٹ
ایک مشہور اخبار کے

سایہ

ابھی مسز اُرملا کپور کی زندگی کے تیس سال ختم ہونے میں دو مہینے باقی تھے۔ وہ اس وقت اسپتال میں پڑی تھی۔ آپریشن ختم ہو چکا تھا اور بڑے ڈاکٹر کی رائے کے مطابق اب اُس کی زندگی خطرے سے باہر تھی۔ ہاں اُسے کچھ وقت کے لئے آرام چاہئے، مکمل آرام۔ اُس کے پاس ہی ایک پختہ عمر کی عورت آرام کرسی میں بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ یہ مریضہ کی ماں تھی جو اپنا تیسواں جنم دن بیس سال پہلے منا چکی تھی۔ اور اب شاید اُسی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ مسز اُرملا کپور نے آنکھوں کو تھوڑا سا کھولا اور کچھ دیر تک یاس انگیز ٹکٹکی سے اپنی ماں کی طرف دیکھتی رہی پھر خالی نگاہوں سے چھت کی طرف تکنے لگی۔ اُس کے دونو ہاتھ بے جان سے اپنے سینہ پر ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے پڑے تھے۔ اسپتال کی پرسکون خاموشی میں اُس کے قلب کو قدرے راحت مل رہی تھی۔ کسی بارش کے دن سمندر پر چھائے ہوئے دھندلکے کی طرح مبہم سے خیالات اُس کے دل میں اُمڈ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا مجھے ابھی جینے کی خواہش باقی ہے۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اب اُسے زندگی کی پروا نہیں تھی۔ وہ زندگی کی اُس کیفیت پر پہنچ چکی تھی جب انسان زندگی میں کسی چیز کی اُمید رکھنا بھی ترک کر دیتا ہے۔ دس برس میں چھ بچے! اُس کے جسم میں ایک ٹھنڈی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ کیا یہی اس کی ہستی کا تقاضہ تھا۔ کیا اپنے خاوند کے نزدیک اُس کی یہی قیمت تھی۔ اُس نے تو خود کو شوہر کے لئے اور بھی بہت کچھ بنانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کی بیوی تو تھی ہی مگر اُس کی محبوبہ بھی بننا چاہتی تھی۔ وہ اپنے شریک حیات کو اپنی اُمنگوں، خواہشوں اور ولولوں کا واحد مرکز بنانا چاہتی تھی۔ اُرملا اپنی رومانی بیوقوفی پر مسکرائی۔ ایک ایک کرکے اُس کی سب تمنائیں زمین پر آ رہی تھیں۔ ایک ایک کرکے اُس کی سب خواہشیں مٹی میں مل گئی تھیں۔ اور اب وہ محض اپنی اُمنگوں کی ایک یاد بن کر رہ گئی تھی۔ ایک کھنڈر۔ ......

اُس کو اپنی خواہشوں کا ماتم کرنے کے لئے بہت زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ شادی کے بعد صرف پانچ مہینے کا عیش اور پھر مسٹر کپور نے رات کو دیر سے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے لئے آدھی رات سے پہلے گھر لوٹنا تو ایک غیر معمولی بات ہو گئی تھی۔ اور اُرملا اکیلی گھر بیٹھی اُن کا راستہ دیکھا کرتی تھی اور انتظار کیا کرتی تھی .... راستہ دیکھا کرتی تھی اور انتظار کیا کرتی تھی ...... ہمیشہ ایک ہی بہانا ہوتا تھا "کلب سے چھٹکارا نہیں ہو پاتا، برج کے ساتھی نہیں آنے دیتے۔ رٹ لگائے جاتے ہیں ایک ربر اور کھیلو، ایک ربر اور۔ اُن سے انکار کرنا مشکل ہے۔ کلب اچھی جگہ ہے" مگر مسٹر کپور کہتے "اُرملا تم خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو تم وہاں جا کر کیا کرو گی" .... پہلا بچہ، دوسرا بچہ .... اور اب ایک کوئی مسز کمل اُن کے گھر آنے جانے لگی تھی مگر مسٹر کمل کے کبھی درشن نہ ہوتے۔ مسز کمل بالکل بے ضرر ہے۔ مسٹر کپور کے قول کے مطابق بالکل بے ضرر۔ "تم یونہی شک کرتی ہو، یونہی حسد کی آگ میں جلتی ہو۔ تم بیوقوف اور بھولی ہو۔" اُرملا بھی اپنے آپ کو سمجھاتی، میں ایک ہندوستانی عورت، مجھے حسد سے کیا کام مجھے اپنے خاوند پر پورا اعتماد اور بھروسہ رکھنا چاہئے خواہ وہ مسز کمل کی صحبت کو ہی کیوں نہ زیادہ پسند کرتا ہو۔ صبح کا بھولا کبھی شام کو گھر آ ہی پہنچے گا۔ مگر بدقسمتی سے اُرملا عورت تھی مسز کمل کا اُس کے شوہر سے اتنا ربط اُسے جلائے دیتا تھا اپنی طرف سے مسٹر کپور کی بڑھتی ہوئی بے پروائی اُس کو غمگین بنائے رکھتی تھی۔ کب تک، آخر کب تک وہ ایک بچے پیدا کرنے والی مشین بنی رہے گی۔ آخر کب تک وہ اپنے خاوند کے لئے فقط بیوی ہی بنی رہے گی۔ ذلت، ذلت! اُس کی تمام زندگی ہی ذلتیں سہتے سہتے بیتی تھی۔ اُس کو خیال آیا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ دس سال پہلے اتنی بزدل نہ ہو گئی ہوتی۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیل گئی جب اُس کو ایک ایک کرکے اپنی شادی سے پہلے کے واقعات یاد آنے لگے ....

اُدھر اُرملا نے بی۔ اے پاس کیا اُدھر اُس کی عمر اٹھارہ سال کی ہو گئی اُس کو آگے پڑھنے کا شوق تھا، مگر اُس کے کالج جانے کے نام سے اب اُس کے والدین نے کانوں پر ہاتھ رکھنا شروع کر دیا۔ ایک بی۔ اے پاس لڑکی کے لئے ہی خاوند تلاش کرنا مشکل ہے، ایم۔ اے کو کون بیاہے گا۔ ہاں گھر میں اُس کو آج کل کے ہندوستانی نوجوانوں کے معیار پر پورا اترنے کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ ایک استاد جی ہفتہ میں تین بار آ کر اُسے گانے کی تعلیم دینے لگے۔ ایک آرٹسٹ اُس کی مصوری اور پینٹنگ میں مہارت بڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک اُستانی روز آ کر اُسے کشیدہ اور کڑھائی کا کام سکھانے لگی۔ اُرملا کا اب دن کا زیادہ وقت گھر پر ہی گزرنے لگا۔ ویسے تو اُس کے باہر جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مگر والدین نے اُرملا کو مختلف ہنر سکھانے والوں کے آنے کا ایسا وقت مقرر کیا تھا کہ اُسے زیادہ تنہا رہنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ اور جب کبھی وہ باہر نکلتی بھی تو اُس کی ماں، یا اُس کا بھائی، یا کم از کم ایک نوکر تو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا۔ اُرملا ان نئی پابندیوں کے مطلب کو خوب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ تو آگے ہی اُس عمر پر پہنچ چکی تھی جب سماج کے قانون کے مطابق ایک شریف زادی کو ایک بچے کی ماں ہونا چاہیئے۔

ان دنوں بڑی رات گئے تک اُرملا کے باپ ماں اور بڑے بھائی میں سرگوشیاں ہوتی رہتیں۔ دیوان خانے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا جاتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُرملا کچھ سُن نہ سکتی۔ اُرملا کے باپ کی بھاری آواز کئی بار سرگوشی سے اوپر اُٹھ کر تمام گھر میں گونج جایا کرتی تھی۔ ویسے بھی ان باتوں کا اُرملا کی آئندہ زندگی سے گہرا تعلق تھا۔ اس لئے انہیں چھپ چھپا کر سننے میں اُسے ضمیر کی آواز زیادہ تنگ نہیں کیا کرتی تھی۔ ایک شریف اور مناسب لڑکے کا ڈھونڈنا آسان کام نہیں ہے۔ اس دوڑ دھوپ کا سب سے زیادہ اثر اُرملا کے باپ کی صحت پر پڑ رہا تھا۔ وہ کئی بار شکستہ دل ہو کر بڑی ناامیدی کے لہجے میں اُرملا کی ماں کو بتایا کرتا تھا کہ اُن کے رستے میں کتنے کانٹے تھے۔ پہلے تو کوئی مناسب لڑکا ملتا ہی نہیں، اور اگر نظر آ بھی جائے تو وہ عموماً بے روزگار ہوتا ہے اور اسی انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے کہ کوئی رئیس اپنی لڑکی بھی اُسے دے دے ـ اور کوئی اچھی سی نوکری بھی دلوا دے۔ اور اگر کوئی لڑکا برسر روزگار ہوتا ہے تو وہ اپنی قیمت بہت بتاتا ہے۔ اُسے نہ صرف ایک از حد خوبصورت، صحت مند، پڑھی لکھی، گھر کے کام کاج سے واقف، ہنرمند اور سلیقہ والی لڑکی درکار ہوتی ہے بلکہ ایک اچھی خاصی رقم جہیز میں بھی۔ یہاں تو شوہروں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اس منڈی میں جس لڑکی والے نے نیلامی کے ہتھوڑے کی چوٹ پر سب سے زیادہ رقم کی بولی دے دی، وہ لڑکا اُسی کا ہو گیا۔ اُرملا سوچتی کیا ہماری معاشرتی زندگی ابھی اس پستی اور ذلت کے کیچڑ میں گری ہے یا سماج ازل سے ہی ایسا چلا آیا ہے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ اس خیال کے تصور سے ہی کانپ جاتی کہ جن کے پانچ پانچ قابل شادی کنواری لڑکیاں بیٹھی ہیں، اُن کو رات کو نیند کیسے آتی ہوگی۔ آخر بالکل تنگ آ کر اُرملا کا باپ اپنے آپ کو اور باقی سب کو کوسنے لگتا۔ کئی بار اُس کی زبان سے ایسے لفظ نکل جاتے جو ایک ہندوستانی باپ اپنے مُنہ سے بہت کم نکالتا ہے۔ وہ اپنی پریشانی میں چیخ اُٹھتا اگر یہ کم بخت لڑکی نہ پیدا ہوئی ہوتی تو دنیا کی آبادی کیا کم ہو جاتی۔ اتنا پڑھا لکھا کر بھی خاک چھان رہے ہیں۔ جائے خود جا کر اپنا خاوند ڈھونڈھے۔ پھر خود ہی پشیمان ہو کر اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے چارپائی پر دیوار کی طرف منہ کر کے پڑ رہتا، اور اُرملا کو کبھی کبھی اُس کے چپکے چپکے رونے کی آواز بھی آتی۔ اُس کی ماں البتہ اپنے آپ پر قابو رکھتی تھی۔ جب وہ خاوند کے منہ سے ایسی باتیں سُنتی، تو اپنے امڈتے ہوئے آنسوؤں کو اندر ہی اندر پی جاتی۔ اُنہوں نے اُرملا کو اچھی طرح پالا پوسا تھا، خوب پڑھایا لکھایا تھا۔ اب اُن کا یہ اہم فرض تھا کہ ایک شریف اور اچھا لڑکا ڈھونڈیں تاکہ بیچاری اپنا گھر بار بسا سکے۔ انہیں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیئے ازدواجی زندگی کی خوشی غمی تو خدا کے ہاتھ میں ہے، وہی مالک ہے اچھا خاوند مل ہی جائیگا۔ "خود جا کر اپنا خاوند ڈھونڈے" توبہ، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ عیسائی نہیں ہیں۔

اُرملا کے ماں باپ یونہی پریشان ہو رہے تھے۔ اگر وہ مسٹر منوہن کپور کی باتوں پر ذرا بھی دھیان دیتے، تو اُن کی سب تکلیفیں دُور ہو جاتیں۔ مسٹر کپور بیرسٹر تھے، عمر کے کچھ پختہ لیکن آسودہ حال اور ابھی تک مجرد، سبھی کوسمو پولیٹن سوسائٹیوں اور کلبوں کی جان، سبھی خوبصورت نوجوان لڑکیوں کو جاننے والے۔ مگر جب کبھی مسٹر کپور اُرملا کے ماں باپ سے اُرملا کے سلیقے اور شعور کا ذکر چھیڑتے تو وہ دونوں ہی بات کا رُخ پلٹ دیتے، آنکھوں دیکھے مکھی کون نگلتا ہے۔

آخر تنگ آ کر اُرملا کے باپ نے صوبہ کے ایک مشہور اخبار کے

شادی کے کالموں میں ایک اشتہار نکلوایا۔

اُرملا کو معلوم نہیں کہ اس اشتہار کے کتنے جواب آئے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُرملا کے باپ کے پاس بہت سی چٹھیاں آئیں اور اُس نے بہت سے لوگوں سے خط و کتابت بھی کی کیونکہ چند دنوں کے بعد ہی ہر روز دو چار عورتیں اُرملا سے ملنے کو آنے لگیں۔ اُرملا سمجھتی تھی یہ عورتیں کون ہیں۔ وہ "لڑکی کو دیکھنے" آتی تھیں۔ لڑکی کے بارے میں پہلے اِن گھر کی عورتوں کی تسلی ہو جانی چاہئے، پھر لڑکا اس معاملے پر آگے غور کرے گا۔ اُرملا کے والدین کا اُن کو اطمینان دلانے کی کوشش کرنا کہ ان کی لڑکی میں کوئی عیب نہیں ہے اور وہ پڑھائی لکھائی کشیدہ کاری سلائی موسیقی مصوری، سب میں ماہر ہے، اُن کے لئے کافی نہ ہوتا۔ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنا چاہتی تھیں۔ جو چیز صرف سُنی ہی جائے اُس کا اعتبار کیسا۔ اِن ملاقاتیوں کے آنے کے موقعہ پر اُرملا کی ایک طرح سے باقاعدہ نمائش کی جاتی۔ اُرملا اس ذلت اور پشیمانی سے جل اٹھتی، اُس پر کئی بار یہ پُر زور خواہش غلبہ پا جاتی کہ وہ خودکشی کر کے ایک بار ہی ان ختم نہ ہونے والی ذلتوں کا خاتمہ کر دے۔ . . . .

جب ملاقاتیوں کے آنے کا وقت قریب آتا تو اُرملا کو بڑے سلیقے اور تندہی سے سجایا جاتا۔ اور اِس سجاوٹ میں یہ بات ہمیشہ مدنظر رکھی جاتی کہ لڑکی شوخ اور بھڑکیلی نظر نہ آئے۔ ہر ایک چیز سادہ مگر قیمتی اس کے زیب تن کی جاتی، عمدہ نیلگوں ساڑھی، کانوں میں چھوٹے چھوٹے تکونی کانٹے۔ ہاتھوں میں ایک ایک چوڑی، بائیں کلائی پر اومیگا کی سنہری گھڑی۔ دیوان خانے میں درمیان سے ذرا ہٹ کر ایک کونے کی طرف ایک میز لگائی جاتی۔ میز کے پیچھے اُونچی کُرسی ہوتی، کُرسی پر اُرملا کو بٹھا دیا جاتا، اُس کے آگے "سنگر" سلائی کی مشین رکھ دی جاتی۔ یہ سب اس لئے کہ ملاقاتیوں پر بغیر کہے ہی واضح ہو جائے کہ اُرملا شریف لڑکیوں کی طرح ہمیشہ اچھے کاموں میں مشغول رہتی ہے۔ دیوار پر چاروں طرف اپنے اُستاد کی مدد سے پینٹ کی ہوئی کچھ تصویریں ہوتیں۔ انگیٹھی پر چاندی کے فریم میں جڑا ہوا اُرملا کا ایک مُسکراتا ہوا فوٹو ہوتا۔ کمرے کے ایک کونے میں ہارمونیم کی پیٹی اور دِلرُبا رکھا رہتا۔ یہ اس انداز سے رکھے جاتے کہ کسی کی آنکھوں میں خواہ مخواہ چبھیں بھی نہ اور ایسے چھپ کے بھی نہ رہیں کہ نظر انداز ہی ہو جائیں مقصد ان سب کی طرف ایک لطیف اشارہ تھا۔

ملاقات کرنے والی آتیں، کمرے کا بغور معائنہ کرتیں، خوردبین نگاہوں سے اُرملا کی ہر ایک حرکت کا جائزہ لیتیں۔ اُرملا کو پہلے ہی اپنی ماں کی طرف سے ہدایت مل چکی تھی کہ ایسے اجنبیوں کے سامنے کیسے اُٹھنا بیٹھنا چاہئے۔ وہ مسکین بنی، سر جھکائے، چپ چاپ بیٹھی رہتی، دو سوال ہوتے تو ایک جواب دیتی، وہ بھی صرف "جی ہاں" اور "نہیں" میں۔ کم از کم، دیکھنے میں تو وہ سب نسوانی خصوصیات کا مجسمہ ہونا چاہئے تھی۔ شادی ایک ڈھکوسلا ہے، خصوصاً ہندوستان میں۔ لڑکی کی صفات لڑکے کے معیار کے اشارے پر ناچتی ہیں۔ اگر لڑکے کو تیتری کی مانند بیوی چاہئے، تو لڑکی کو میم کی طرح سجا کر دکھایا جاتا ہے۔ اگر اُس کو پڑھی لکھی مگر سادہ بیوی چاہئے، تو لڑکی کو "سنگر" مشین سے کپڑے سیتی یا کتاب کا مطالعہ کرتی ہوئی دکھایا جاتا ہے۔ قدرت بھی انسان کی ان قلابازیوں پر مسکراتی ہو گی۔

ملاقاتی باتوں باتوں میں اُرملا کو گانے کو کہتے تاکہ اُس کی آواز کی طرف سے بھی وہ اپنا اطمینان کر لیں۔ اُرملا کو موسیقی کا شوق تو بہت تھا سینما میں بھی جو گانا سنتی اُس کی ہُو بہو طرز ہارمونیم پر اُتار لیتی مگر ایسے نازک موقعوں پر چیدہ چیدہ "پکّے" راگ ہی گائے جا سکتے ہیں۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو راگ بلاول "نہیں الیو جیزنم بار مبار" یا راگ آساوری "ہے پربھو پورن ناتھ ہمارے" گاتی، شام کا سماں ہوتا تو کافی راگ "اُدھو کرمن کی گتی نیاری" یا کھماج راگ "اب تو پرگٹ بھئی جگ جننی" کا نغمہ چھیڑتی۔ اُسے ایسے معلوم ہوتا کہ اُس کی آئندہ زندگی کی مسرت کا دارومدار اسی گانے کے زیر و بم میں ہے اِس لئے اس کے لفظوں میں ایک سوز، ایک حسرت پیدا ہو جاتی۔ ایک لڑکی کے لئے کنواری رہ جانا زندہ درگور ہونے کے برابر ہے اُس کے میٹھے خواب ازدواجی زندگی ہی کے تخیل میں مرکوز ہوتے ہیں، اُس کے دماغ کی پرواز مرد کے دماغ کی طرح لامحدود نہیں ہوتی۔ ملاقاتی اُس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے اُسے سینما دیکھنے کا شوق ہے کیا؟ کچھ ایسا تو نہیں، ہاں کبھی کبھی ہو آتی ہے خصوصاً اگر کوئی بہت اچھی تصویر چل رہی ہو مثلاً سنت تلسی داس، "گوپال کرشن" اسے دھارمک تصویروں سے زیادہ رغبت ہے۔ ملاقاتی مذاحیہ باتیں کرتے تاکہ اُرملا ہنسے اور اُن کو اُس کے دانتوں کو دیکھنے کا موقعہ ملے۔ اگر اُس کے دانت ٹیڑھے میڑھے یا نکلے ہوئے یا زرد، یا بہت بڑے بڑے تو بہو کو سندر کون کہے گا۔ اُن کے لاڈلے کو تو

ہوتیوں جیسے دانتوں والی بیوی چاہئے۔ جب اور سب کچھ دیکھ لیا جاتا تو پھر گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جاتی۔ مدعا یہ ہوتا کہ لڑکی کو کھڑی ہوئی اور چلتی دیکھا جائے۔ کئی لڑکیاں بیٹھی بیٹھی دراز قد معلوم ہوتی ہیں مگر اُٹھنے پر پست قد نکلتی ہیں۔ لڑکی کے چلنے میں لوچ ہونا چاہئے۔ ایک مستی آگے ہی کئی لوگ دھوکا کھا چکے ہیں۔ پہلے اچھی طرح کھوج نکالنے میں کوتاہی کی، پیچھے پتہ چلا کہ بیوی تو ایک پیر پر زور دے کر چلتی ہیں۔ نابابا! نہیں لنگڑی بہو نہیں چاہئے۔ جب اُرملا کا ہر ایک پہلو سے معائنہ ختم ہو جاتا تو ملاقاتی مسکرا کر ہنستے کہتے، نوکر چیچ کر تانگا منگوا لئے اور "اچھا جی، اب اجازت دیجئے" کہہ کر اپنا راستہ پکڑتے۔ نہ پھر وہ کبھی خود دکھائی دیتے، نہ ان کی طرف سے کوئی خط موصول ہوتا۔ اُرملا کے ماں باپ روز انتظار میں رہتے سب لاحاصل۔ کوئی واپس آتا تو دکھائی دیتا! کوئی خط بھیجتا تو ملتا!

ہاں دو بار اُرملا کے والدین کی آنکھیں راہ دیکھتے دیکھتے نہیں تھکی تھیں۔ دو بار معاملہ کچھ اور آگے بڑھا تھا۔ دو بار اور اُرملا کو شدید تر ذلتوں کا بار سہنا پڑا تھا۔ عورتیں آئی تھیں۔ اُرملا کو دیکھ گئی تھیں، اُسے پسند کر گئی تھیں۔ اب لڑکے کا لڑکی کو دیکھنا ضروری تھا۔ وہ دیکھے، اُسے بھائے، تو معاملہ طے ہو۔ یہاں درمیانی طبقہ کے لوگ ایک اور پردہ پوشی کیا کرتے ہیں۔ آخر تک یہی سمجھا جاتا ہے، یا کم از کم یہی سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لڑکی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ وہ کسی لڑکے کو "دکھائی" جا رہی ہے نہیں تو اُس کے نازک جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اس طرح وہ بھی بیوقوف بنے رہتے ہیں۔ اور لڑکی کو بھی بیوقوف سمجھتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے نامراد دل میں یہ ناگوار خیال گھر کئے رہتا ہے کہ لڑکی بچہ نہیں ہے وہ سب کچھ سمجھتی ہے، مگر پھر بھی آنکھیں بند رکھی جاتی ہیں۔ جو چیز خوشگوار نہ ہو اُس کی طرف سے چشم پوشی ہی اچھی ہے۔ اگر ایک بار اُس تلخ حقیقت کے وجود کو مان لیا تو ضمیر کا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ضمیر تنگ کرنے لگتا ہے۔ اور درمیانی طبقہ کے لوگ بڑے خوددار واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے ضمیر کا بہت پاس کرتے ہیں۔ اور اس کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کرتے۔

ایک بار یہ انتظام کیا گیا کہ لڑکا ایک سائیکل پر اُس تانگے کا پیچھا کرے جس میں اُرملا اور اُس کی ماں جا رہی ہوں۔ سائیکل سوار اس بے دردی سے تانگے میں بیٹھی ہوئی نوجوان لڑکی پر آنکھیں گاڑے چلا آ رہا تھا، کہ وہ شرم اور پشیمانی سے پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھی۔ اور ساتھ ہی غصہ سے سُرخ۔ خیریت یہی ہوئی کہ اُس نے جوتا اُتار کر لڑکے کے منہ پر نہیں دے مارا۔ اُس کا جی تو بہت چاہ رہا تھا پر اُس نے اپنا ہاتھ تھام لیا۔ اُرملا کی ماں کو چاہیے معلوم نہ ہو کہ اُرملا کو معلوم ہے لیکن اُرملا کو معلوم تھا کہ سائیکل سوار اپنی ہونے والی بیوی کے نقش و نگار کا معائنہ کر رہا ہے .... دُوسری بار ایک اور نوجوان کو چائے کی دعوت ملی تھی۔ اُرملا کے گھر میں چائے وغیرہ کا میز پر رکھنا نوکروں کے سپرد تھا۔ لیکن اُس دن اُرملا سے کہا گیا تھا کہ وہ میز سجائے۔ جُونہی وہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی، دو عقاب کی طرح تیز آنکھیں اُس پر گڑ گئی تھیں، ان نہ ہٹنے والی نگاہوں نے اُرملا کو یکبارگی سر سے پاؤں تک کپکپا دیا تھا، اور اگر اُس نے دیوار کا سہارا نہ لے لیا ہوتا تو چائے دانی وغیرہ سب کچھ زمین پر آ رہا ہوتا۔

دونوں بار نتیجہ نفی ہی میں نکلا تھا۔

اُرملا کا باپ اب مسٹر کپور کی باتیں ذرا زیادہ توجہ سے سُننے لگا تھا۔

آہستہ آہستہ ایک خوفناک ارادہ اُرملا کے دل ہی دل میں پک رہا تھا ....

روز روز جو اُسے درپیش آتا تھا، وہ اُرملا کی خودداری اور خوداعتمادی کو ایک زبردست صدمہ پہنچاتا تھا۔ اُس کو ہر لمحہ ذلتیں سہنی پڑتی تھیں۔ وہ اُس سماج کو کوس رہی تھی جس میں یہ سب باتیں روک ٹوک ہوتی ہیں اور جو پھر بھی غرق نہیں ہوتی۔ لڑکیاں تو ایک طرح سے دُکان پر رکھے ہوئے کھلونے ہیں جن کو خریدار لوگ آ کر دیکھتے ہیں۔ روشنی کے سامنے معائنہ کرتے ہیں، مول چکاتے ہیں اور پھر رد کر کے چھوڑ جاتے تھے کہ "پسند نہیں"۔ کتنی یک طرفہ بات تھی۔ لڑکی سے کبھی کسی نے نہیں پُوچھا کہ تم بھی اپنی مرضی کے مطابق لڑکا چُن لو۔ اُس کو اتنا طیش آتا تھا، مگر وہ اپنے آپ کو کتنا بے کس، کتنا ادنیٰ، کتنا مایوس پاتی تھی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس گندے اور سڑے ہوئے ماحول سے نکل کر کہیں چلی جائے، کہیں دُور بھاگ جائے جہاں کی فضا زیادہ آزاد ہو جہاں عورتیں بھی انسان سمجھی جاتی ہوں، جہاں اُن کی قدر ہو جہاں مردوں میں خودداری اور انسانیت ہو۔ وہ خدا سے دعا کر رہی تھی کاش مجھ میں زیادہ حوصلہ ہوتا۔ لیکن وہ تو کمزور تھی اپنا سہارا کے تھی، صرف ایک ہندوستانی چھوکری تھی ...... لیکن اب نہیں کافی ذلتیں سہہ چکی ہوں، اب اس زندگی کا خاتمہ کرنا ہی ہوگا، اپنے لئے، اپنے لئے نہیں تو اپنے والدین کی راحت کے لئے۔ سماج

کو کیا پڑا ہے۔ دو چار دوست، رشتہ دار آنسو بہالیں گے، باقی کچھ دن سرگوشیاں کریں گے، پھر بھول جائیں گے، دنیا ایسے ہی چلتی رہے گی!....
.... پھر اپنی جان لینے سے فائدہ...... نہیں کچھ فائدہ ضرور ہوگا ہی
..... قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں...... مجھے اس غیر انسانی نظام کے خلاف پروٹسٹ کرنا ہی ہوگا.... ...... اور وہ اپنے خون سے....

رات کی خاموشی میں وہ گھر سے باہر نکلی تو پاس کے گرجا گھر کے گھنٹے نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجائے۔ وہ شام اُرملا نے ایک خط لکھنے میں گزاری تھی جس میں اُس نے اپنے ارادے کو وضاحت سے بیان کیا تھا۔ اب وہ اس خط کو اپنی انگیا میں چھپائے لئے جا رہی تھی۔ رات چاندنی نہ تھی لیکن ویسے مطلع صاف تھا۔ تاروں کی صاف مگر مدہم روشنی میں اُس کا جسم ایک چلتا ہُوا سایہ معلوم ہو رہا تھا باہر ہوا سرد اور بے رحم تھی جس سے اُس کو اپنا دوشالہ بار بار اپنے گرد لپیٹنا پڑتا تھا۔ وہ دریا کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔ وہ کسی خاص جذبے کے ہنگامی جوش میں آ کر گھر سے نہیں نکلی تھی۔ اس وقت جو راستہ وہ اختیار کر رہی تھی اُس کے ٹھنڈے دل اور دماغ کے پختہ فکر و احساس کا نتیجہ تھا، وہ دل اور دماغ جنہوں نے اپنے آپ کو سماج کی بے انصافی سہنے کے ناقابل پایا تھا، وہ تیز تیز چل رہی تھی اور جن کو وہ پیچھے چھوڑ رہی تھی اُن کا خیال اُسے تنگ نہیں کر رہا تھا۔ بجلی کے بے جان کھمبے ایک ایک کر کے اُس کے سامنے سے نکلے جا رہے تھے۔ باہر کی خاموشی اُس کے دل و دماغ پر بھی طاری ہو گئی تھی۔ صرف تیز چلنے کی وجہ سے وہ خط جو وہ انگیا میں سنبھالے لئے جا رہی تھی بار بار اُس کی چھاتی سے لگتا تھا۔ اور اُس میں لکھے ہوئے الفاظ کا خیال اُس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیتا تھا۔ تھوڑا سا پسینہ آنے کی وجہ سے وہ خط گیلا ہو گیا تھا، اُس کا گیلا پن اُس کے دل میں سمائے جا رہا تھا...... ... اور وہ ویسے ہی چلی جا رہی تھی، ایک مشین کی طرح، ایک کے بعد دُوسرا قدم اُٹھائے.... بغیر کسی تکلیف کے، بغیر تھکاوٹ محسوس کئے...... اُس کا جسم سیدھا اُس کا دماغ خالی......

تاروں کی صاف مگر مدہم روشنی میں خاموشی سے بہتا ہُوا ندی کا پانی خود اپنا سایہ معلوم ہوتا تھا اُرملا کو بھی وہ دنیا جس کو اب وہ پیچھے چھوڑے آ رہی تھی، دھندلی سی، سایہ کی طرح بے حقیقت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اُس کے دماغ پر یکا یک ہزاروں مبہم سے سائے چھا گئے تھے، لیکن اُن سایوں میں سے ایک بھی مجسم صورت اختیار نہ کرتا تھا۔ کہ اُرملا اُسے پہچان سکے۔ اُرملا نے کنارے پر پہنچ کر کے اپنے آپ کو سرد ریت پر پھینک دیا اور مُنہ کے بل لیٹ رہی۔ خاموش، زندہ اُرملا کے سایہ کی طرح۔ پھر یکا یک اُس کی تنہا خاموشی اندھیرے میں سایہ کے گم ہونے کی طرح ٹوٹ گئی۔ دُور پُل پر سے ریل گاڑی گزر رہی تھی، سیٹی بجاتی ہوئی، سنگ دل، بے پروا۔ کیا پتہ وہ گاڑی بھی اپنے اندر ایک برات کو لئے جا رہی ہو۔ آہ! ایک اور بد قسمت لڑکی! اُرملا ویسے ہی مُنہ کے بل لیٹے لیٹے سوچنے لگی، شاید یہ لڑکی بھی ایک دن میری طرح ہی اپنی شادی، اپنے خاوند، اپنی ازدواجی زندگی کے سہانے خواب دیکھتی رہی ہو گی۔...... کتنی معیاری بیوی بننے کی خواہش ہوگی اُس کی... .. اُس قسم کی معیاری بیوی جس کا ذکر لوگ داستانوں میں پڑھا کرتے ہیں۔ اپنے خاوند کی طبیعت اور عادات کا مطالعہ کر کے اُسی کے مطابق چلنے والی، اپنے شریک حیات کی خوشی میں ہی اپنی خوشی سمجھنے والی۔ جب وہ شام کو کام سے لوٹیں گے۔ تو کس طرح، میں دروازے پر کھڑی اُن کے استقبال کے لئے اُن کا انتظار کروں گی۔ میری محبت بھری مُسکراہٹ دیکھ کر اُن کی سب کلفتیں دُور ہو جائیں گی۔ جاڑے کی راتوں میں آگ کے پاس بیٹھ کر وہ محبت کے کیا کیا نغمے چھیڑیں گے۔ باہر اندھیری کی سائیں سائیں، اور کھڑکی کے شیشوں پر بارش کی لگاتار آواز، اور میں اپنے زندگی کے ساتھی کا سر گود میں لے کر آہستہ آہستہ اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیروں گی اور جُھک کر اُس کے کان میں میٹھی میٹھی نازک سرگوشیاں کروں گی، ایسی سرگوشیاں جو صرف خوش قسمت میاں بیوی ہی سمجھ سکتے ہیں۔....... خواب، خواب، سب فضول اور لاحاصل خواب... ...... اُرملا نے ایک لمبی آہ بھری اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ خط کو اپنی انگیا میں سے نکالا۔ اُس کو ہاتھ میں پکڑے کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر پُل کی طرف دیکھا کہ کوئی گاڑی تو نہیں آ رہی۔ گاڑی اُس کو زندگی کے طوفان کی یاد دلاتی تھی۔ لیکن اب وہ زندگی کو پیچھے چھوڑنا چاہتی تھی، اس کو خاموشی سے بہتی ہوئی ندی کے سائے جیسے پانیوں میں ملا دینا چاہتی تھی تاکہ اِس بڑے سایہ میں اُس کی چھوٹی سی زندگی کا سایہ بھی گم ہو جائے۔ اب پُل بھی خالی پڑا تھا۔ کسی گاڑی کا شور نہیں تھا۔ فضا بالکل خاموش اور ساکت تھی۔ اُس نے خط کو دوشالہ میں لپیٹا، دوشالہ کو بڑی توجہ سے تہ کیا اور حفاظت سے ایک پاس ہی پڑے ہوئے پتھر پر رکھ دیا۔ وہ سایہ کی طرح خاموش ندی کی طرف بڑھی۔ اب وہ بالکل پاس آ گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی نے اُس کے پاؤں کو چھوا۔ اُس کے جسم میں ایک سرد بجلی سی دوڑ گئی۔

وہ جھٹکے سے پیچھے کو ہٹ گئی۔ تب وہ پھر دھڑکتے ہوئے دل سے آگے بڑھی، اور کود پڑنے کو جھکی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کے دل کی حرکت بھی ساکن ہو گئی۔ اور اُس کے اندر سے آواز آئی "بزدل"۔ اُرملا آہستہ آہستہ سیدھی کھڑی ہو گئی اور بڑبڑائی "بزدل"۔ تب اُس نے آہستہ سے اپنے دوشالہ کو اُٹھایا، خط کو چاک کر دیا اور گھر کی طرف مڑ چلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایک مہینے کے اندر ہی مس اُرملا کھنہ مسز اُرملا کپور بن گئی تھی اور ایک سال کے اندر اُسے اسپتال آنے کی بھی ضرورت پڑ گئی تھی۔

"پریش"

رباعی

خورشید جب آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے
جب تیرہ و تاریک جہاں ہوتا ہے
اُف کتنی لطافت سے یہ پردۂ ابر
رتھ چاندنی کی دیوی کا رواں ہوتا ہے

جگن ناتھ آزاد

غزل

تم نے پریم سکھا کر مجھ کو دنیا سے بیگانہ کیا
لے دے کے اک دل تھا اپنا اُس کو بھی دیوانہ کیا

دل کو اب تنہائی سے کچھ خوف سا آنے لگتا ہے
میں یہ کب کہتا ہوں تم نے بستی کو ویرانہ کیا

آپ نے میرے دل کو نوازا آپ کا احساں ہے مجھ پر
خود بھی دیوانہ کہلائے مجھ کو بھی دیوانہ کیا

صبح ہوئی وہ سورج بن کر چمکا ساری دنیا پر
رات کو شمعِ بزم نے جو آنسو نذرِ پروانہ کیا

ہاں میں اس قابل ہی نہیں ہوں ساقی مجھ پر رحم نہ کر
جب غم کے بادل گھر آئے رُخ سوئے میخانہ کیا

میں رودادِ دل کہہ کر شرمندہ اپنے آپ سے ہوں
میری رودادِ دل کو دنیا نے اک افسانہ کیا

دل کا خوں کر کے جس کو میں نے تعمیر کیا تھا ضیاؔ
ایک ہوا کے جھونکے نے مسمار وہی کاشانہ کیا

ضیاؔ فتح آبادی

کلرک کا نغمۂ محبت

سب رات مری سپنوں میں گذر جاتی ہے، اور میں سوتا ہوں،
پھر صبح کی دیوی آتی ہے،
اپنے بستر سے اٹھتا ہوں، منہ دھوتا ہوں،
لایا تھا کل جو ڈبل روٹی،
اس میں سے آدھی کھائی تھی،
باقی جو بچی وہ میرا آج کا ناشتہ ہے:

دنیا کے رنگ انوکھے ہیں،
جو میرے سامنے رہتا ہے اس کے گھر میں گھر والی ہے،
اور دائیں پہلو میں اک منزل کا ہے مکاں، وہ خالی ہے،
اور بائیں جانب اک عیاش ہے جس کے ہاں اک داشتہ ہے،
اور ان سب میں اک میں بھی ہوں، میں ہوں لیکن بس تو ہی نہیں۔
ہیں اور تو سب آرام مجھے، اک گیسوؤں کی خوشبو ہی نہیں!

فارغ ہوتا ہوں ناشتے سے اور اپنے گھر سے نکلتا ہوں،
دفتر کی راہ پہ چلتا ہوں،
رستے میں شہر کی رونق ہے، اک تانگہ ہے، دو کاریں ہیں،
بچے مکتب کو جاتے ہیں، اور تانگوں کی کیا بات کہوں؟
کاریں تو چھچلتی بجلی ہیں، تانگوں کے تیروں کو کیسے سہوں؟
یہ مانا ان میں شریفوں کے گھر کی دھن دولت ہے، مایا ہے،
کچھ شوخ بھی ہیں، معصوم بھی ہیں،
لیکن رستے پر پیدل مجھ سے بدقسمت، مغموم بھی ہیں،

تانگوں پر برق تبسم ہے،
باتوں کا میٹھا ترنم ہے،
اکساتا ہے دھیان یہ رہ رہ کر: قدرت کے دل میں ترحم ہے؟
ہر چیز تو ہے موجود یہاں، اک تو ہی نہیں، اک تو ہی نہیں،
اور میری آنکھوں میں رونے کی ہمت ہی نہیں، آنسو ہی نہیں!

جوں توں رستہ کٹ جاتا ہے اور بندی خانہ آتا ہے،
چل کام میں اپنے دل کو لگا یوں کوئی مجھے سمجھاتا ہے!
میں دھیرے دھیرے دفتر میں اپنے دل کو لے جاتا ہوں،
نادان ہے دل، مورکھ، بچہ، اک اور طرح سے جاتا ہوں،
پھر کام کا دریا بہتا ہے اور ہوش مجھے کب رہتا ہے،

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے،
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپڑاسی سے بلواتا ہے،
یوں کہتا ہے، ووں کہتا ہے لیکن بیکار ہی رہتا ہے،
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں، تھک جاتا ہوں،
پل بھر کے لئے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں،
اور دل میں آگ سلگتی ہے میں بھی جو کوئی افسر ہوتا!
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا!
اور تو ہوتی!
لیکن میں تو اک منشی ہوں، تو اونچے گھر کی رانی ہے،
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے!

میراجی

میرزا غالب کا کچھ نایاب کلام

ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ہمیں اپنی زیرِ ترتیب کتاب "بہار میں اردو" کے فراہمی مواد کے سلسلے میں ایک خانگی کتاب خانے میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں ہماری نظر سے دیوانِ غالب کا ایک خطی نسخہ گذرا، یہ نسخہ بہت خوشخط ہے، اور پورا لکھا ہوا ہے، بعد کو حاشیہ پر کچھ اشعار اور کہیں پر غزل کی غزل بڑھائی گئی ہے متن کے خط سے حاشیئے کا خط مختلف ہے لیکن یہ خط غالب کا نہیں ہو سکتا۔ آخر سے نسخہ غیر مکمل ہے، یہ نہیں کہ اوراق ضائع ہو گئے ہیں بلکہ صفحہ ۱۲۹ اور ۱۳۰ لکھ کر اور جدول بنا کر صفحے سادے چھوڑ دیئے گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے چاہا تھا کہ بعد کو اور لکھا جائے لیکن اس کا موقع نہ مل سکا، نسخہ کرم خوردہ ہے جسے صحاف نے بڑی مشکل سے درست کیا ہے، خاتم غائب ہے اس لئے کاتب کا نام اور تاریخ کتابت نہیں۔

دیوان کے اس نسخے میں میرزا کے دو قصیدے ہیں ایک سو

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ جنابِ عالی المین برّ و ن والا جاہ

یہ وہ قصیدہ ہے جو میرزا نے شیو نرائن کو لکھ کر دیا تھا (دیکھئے اردوئے معلّٰی صفحہ ۱۵۹) کتاب میں ۲۱ شعر ہیں لیکن زیرِ نظر نسخے میں صرف ۱۹، دو آخری شعر جن میں ایک میں شیو نرائن کا نام بھی تھا حذف کر دیا گیا ہے، یہ قصیدہ عام طور پر مرزا کے دیوان میں نہیں ملتا لیکن اردوئے معلّٰی میں موجود ہے اس لئے نقل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

دوسرا قصیدہ "مسٹر میکلوڈ صاحب" کی جناب میں لکھا گیا ہے، قصیدہ بہت نایاب معلوم ہوتا ہے اور مرزا کے کسی دیوان میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

زیرِ نظر قصیدے کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنا مشکل ہے اس لئے کہ میرزا کی تصانیف اور اُن کے رقعات میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا، غالب پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ بھی اس قصیدے کے متعلق خاموش ہیں۔ پھر بھی قصیدے کے مطالعہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ۱۳ جنوری ۱۸۶۰ء کو کوئی دربار منعقد ہوا تھا جس میں مرزا غالب بھی مدعو تھے، لیکن انہیں مناسب جگہ نہیں ملی اور معلوم ہوتا ہے کہ بہت پیچھے ڈال دیئے گئے، مرزا کو یہ بہت ناگوار ہوا، اس لئے کہ درباروں میں ان کی جگہ خاص متعین تھی۔

مرزا دل جلے ہو ہی رہے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک اخبار نے جلسے کی کارروائی چھاپتے ہوئے مرزا کا بھی ذکر کر دیا، اور اس پر ستم یہ ہوا کہ ان کا نام بھی غلط سلط اور معلوم نہیں کیا لکھ دیا، میرزا نے یہ قصیدہ لکھ کر اپنے دل کے پھپھولے توڑے ہیں۔ اس قصیدے میں لارڈ میکلوڈ بہادر کی مدح ہے اور ان سے استمداد ہے جو اس وقت پنجاب کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ اور جن کا ذکر ان کے مکاتیب میں کئی جگہ آیا ہے (دیکھئے اردوئے معلّٰی صفحہ ۱۲۸ و صفحہ ۱۲۹ وغیرہ)

اس قصیدے کا بارھواں، تیرھواں اور چودھواں شعر قابلِ غور ہے۔ ان کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی نشست کا نمبر متعین تھا لیکن یہاں اس ترتیب سے بٹھلانے کے بجائے "نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام" نذر کی اصل یہ ہے کہ دربار میں تمام لوگ نذریں گذارتے تھے۔ یہ نذریں اشرفیوں اور روپیوں کی صورت میں گزاری جاتی تھیں، لیکن غالب کی نذر ان کا قصیدہ ہوا کرتا تھا مگر اس مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قصیدہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ملی، اور پھر دربار میں غالب کو جو خلعت ملا کرتی تھی وہ بھی نہ ملی، یہ سب مل کر ان کے دل کے خون کرنے کو کافی تھے۔

دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اُن کی عمر ۷۰ سال کی تھی، یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، ان کا سال ولادت ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء ہے۔ اس لحاظ سے یہ ۱۸۶۷ء کے قریب پڑتا ہے جو یقیناً صحیح نہیں، ہمارے خیال میں یہ واقعہ ۱۸۶۰ء کا ہے جب لارڈ کیننگ نے شہر آگرہ میں ایک عظیم الشان دربار کیا تھا، یہ ہو سکتا ہے کہ میرزا کی مراد صحیح عمر بتانی نہ تھی اور ضرورتِ شعری سے ہی ستر سال کہہ دیا۔ تیسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دربار دہلی سے باہر ہوا تھا اس لئے کہ لبِ دریا خیمے کھڑے ہونے کا ذکر ہے اور وہ جگہ آگرہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی، تھی جنوری مہینہ کی تاریخ تیرھویں سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے اس لئے کہ لارڈ کیننگ نے جنوری ہی میں دربار منعقد کیا تھا۔ قصیدہ غالب ہے جس کا نام پر صفحہ ۱۲۸ ختم ہوتا ہے، اور اس کے بعد سادے اوراق ہیں، یہ نہیں معلوم کہ قصیدہ اور آگے بھی تھا یا یہیں ختم ہو گیا ہے قصیدہ بظاہر تو مکمل معلوم ہوتا ہے، صرف یہ کہ قاعدے کے

غالباً سر چارلس میکلوڈ

مطابق آخر میں دعائیہ اشعار نہیں ہیں۔

قصیدہ ملاحظہ ہو:۔

کرتا ہے چرخ روز بہ صد گونہ احترام — فرماں روائے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس — نواب مستطاب امیرِ شہِ احتشام
جم رتبہ منٹگمری بہادر کہ وقتِ رزم — ترکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام
جس بزم میں کہ ہو انہیں آئینِ مے کشی — واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام
چاہا تھا میں نے تم کو سرِ چارہ وہ کہوں — دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا — حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام
سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ کو — دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام
میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر — حق کے تفضلات سے ہو مرجعِ انام
اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی — تحریر ایک جس سے ہوا بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر — کاتب کی آستیں ہے مگر تیغِ بے نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا — جب یاد آگئی ہے کلیجا لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم — نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغ جاں گداز — جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں — استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
اس بزمِ پر فروغ میں اس تیرہ بخت کو — نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام
سمجھا اسے گر آب ہوا پاش پاش دل — دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمکِ عوام
عزت پہ اہلِ نام کے ہستی کی ہے بنا — عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب — تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام
اس کشمکش میں آپ کا مداحِ دردمند — آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
جو واں نہ کر سکا وہ لکھا ہے حضور کو — دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام
ملک و سپہ نہ ہو تو نہ ہو کچھ ضرر نہیں — سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام
وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خواں ہو — شاہانِ عصر چاہیے لیں عزت اس سے وام
حق یہ ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور — بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام

دیوان کے اسی نسخے میں ایک غزل دیکھنے میں آئی جس کے چند شعر بالکل نایاب ہیں اور کسی دیوان میں ہماری نظر سے نہیں گزرے۔

باقی رہی نشاطِ تصور کی سادگی — میں کیا کروں کہ ہیچ میں دل نظر ہی آج
حیرت فروشِ بلند نگاہی ہے اضطرار — سر رشتہ چاکِ جیب کا تارِ نظر ہے آج
کیا فکر ہو فرشِ خیال ہیں فردا و دوش کی — کل تک نظر نہ جائے تو عمر بسر ہے آج
تا صبح ہے یہ منزلِ مقصد رسیدنی — دودِ چراغِ خانہ غبارِ سفر ہے آج
ٹھوکر لگی ہے کیا مری چشمِ غیور کی — کیوں یہ نمودِ جلوۂ نامعتبر ہے آج
ہیں رہروانِ سادہ کی اللہ رے سادگی — کل تک جو راہزن تھا وہی راہبر ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلابِ گریہ دشمنِ دیوار و در ہے آج
دو ماہ فتادۂ چمنِ فکر ہے اسد — مرغِ خیال بلبلِ بے بال و پر ہے آج

دیوانِ غالب کے اس قسم کے قیمتی اور خطی نسخوں کے علاوہ مرزا کے بعض نایاب اشعار ان کی زندگی میں لکھے جانے والے شعرائے اردو کے تذکروں میں بھی ملتے ہیں۔ جو خود بھی مرزا کے اشعار کی طرح کمیاب اور قیمتی ہیں۔ ہم آج کی صحبت میں ان تذکروں سے (جن میں سے دو کے نسخے بہت کم پائے جاتے ہیں) مرزا کے وہ اشعار درج کرتے ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں لیکن سب سے پہلے ہم مرزا کی ایک غزل نقل کرتے ہیں جو ہمیں ایک دیوان کے آخر میں ملی ہے۔

مرزا غالب اور الٰہی بخش خاں معروف دہلوی میں کیا تعلقات تھے۔ یہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں، معروف کے دو دیوان ہیں۔ دیوانِ اول شائع ہو چکا ہے لیکن دیوانِ دوم ابھی نہیں چھپا ہے، دیوانِ معروف میں غالب کی ایک غزل ملتی ہے جو دیوانِ غالب کے مطبوعہ اور متداول نسخوں میں نہیں ملتی۔ اس کی موجودگی کی وجہ یہ ہے کہ معروف نے اس پر تضمین کی ہے، یہ غزل کس سنہ میں لکھی گئی۔ اس کی تعیین مشکل ہے، ہم ابھی صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ معروف کے اس دیوان میں ۱۲۳۳ھ کی لکھی ہوئی ایک مثنوی اور ۱۲۳۶ھ کی لکھی ہوئی تسبیحِ زمرد بھی شامل ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ غالب یہ غزل ۱۲۳۶ھ سے پہلے لکھ چکے تھے لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ۱۲۳۶ھ کے بعد کئی مرتبہ مرزا کی زندگی میں ان کا دیوان چھپا نہ تو یہ غزل اس میں ملتی ہے اور نہ ان کی زندگی میں لکھے جانے والے قلمی نسخوں میں۔ غزل یہ ہے:

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں — ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر — میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں
شکوہ سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو — اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں
اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل — جب نہ پاؤں کوئی غم خوار کہوں یا نہ کہوں
دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا — ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں
میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز — گوش ہیں در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد — حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

"عمدۃ المنتخبہ" جو تذکرہ سرور کے نام سے بھی مشہور ہے اعظم الدولہ

کی تصنیف سے ہے، یہ شعرائے اردو کا ایک نادر و نایاب تذکرہ ہے جس کا ایک بہت اچھا قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔

سرور دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کا تذکرہ تقریباً ۱۲۱۶ھ میں لکھا جانا شروع ہوا اور تقریباً دس برس میں مرتب ہوا گو اس کے بعد بھی اضافے ہوتے رہے یہی وجہ ہے کہ اس میں غالب کا حال بھی درج ہے "عمدۃ المنتخبہ" چونکہ ایک نایاب تذکرہ ہے اس لئے ہم غالب کا تذکرہ درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں:-

"اسد اللہ خاں اسدؔ عرف مرزا نوشہ، اصلش از سمرقند، مولدش اکبر آباد، جواں قابل یار باش، درد مند، ہمیشہ بعیش معاشی بسر بردہ، ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن، غمہائے عشق مجاز، تربیت یافتۂ غم کدۂ نیاز، در فن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا بیدلؔ و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند، بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد، اکثر اشعارش در زمین سنگلاخ مضامین موزوں کردہ رو بہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد"

عمدۃ المنتخبہ میں مرزا کے اشعار بھی درج کئے ہیں، ہم ذیل میں صرف وہ اشعار درج کرتے ہیں جو غیر مطبوعہ ہونے کی حیثیت سے اہم ہیں اور کسی نسخے میں نہیں پائے جاتے اور اس اطلاع کے لئے ہم ہندوستان کے قابلِ فخر نقاد قاضی عبدالودود صاحب بی اے کینٹب بار ایٹ لا اڈیٹر رسالہ "معیار" پٹنہ کے ممنون ہیں۔

جگر سے ٹوٹتے ہوئے ہوگی ہے سناں پیدا — وہاں زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو — آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

شمشیرِ صاف یار جو زہراب دادہ ہو — وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے — یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بیتاب ہے — دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ مے خانہ بولا مے فروش — اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

محفلِ شمعِ عذاراں میں جو آجاتا ہوں — شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہوئے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام — جس گزرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک روئی کے رہنے سے رہو — کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے — رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسدؔ — ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

نیازِ عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر — جو ہو جائے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط — کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے — عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

"تذکرہ سراپا سخن" جو محسن لکھنوی کی تصنیف ہے ۱۲۶۹ھ میں لکھا گیا، اس میں میرزا کا حال اور ان کا نمونۂ کلام بھی موجود ہے۔

"مرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، ولد عبد اللہ بیگ خاں قوم ترک اولاد میں گشتاسب کے، مولد اکبر آباد مسکن دہلی، فارسی اور ریختہ، در پنج آہنگ ان کی طبع زاد ہے۔ مشاہیر شعرائے دہلی میں ہیں۔ مؤلف کو یہ غزل اپنے خط میں شیخ فدا حسین فدائی (خلف شیخ کریم اللہ باشندہ قصبہ دیبائی ضلع بلند شہر، صاحب دیوان، ارشد تلامذہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ) کے ذریعے سے بھیجی تھی"۔

دی سادگی سے جان پڑے کوہ کن کے پاؤں — ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں موجود ہے لیکن ذیل کا شعر دیوان کے کسی نسخے میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی — کعبے میں کیوں نہ بائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں

"تذکرہ عیار الشعراء" بھی ایک بہت نادر تذکرہ ہے اس کا مصنف خوب چند ذکاؔ ہے جو شاہ نصیر کا ممتاز شاگرد سمجھا جاتا ہے۔ اس میں بھی غالب کا ذکر موجود ہے اس سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ غالب مرزا غلام حسین کے نبیرہ تھے اور یہ کہ وہ مولوی محمد معظم کے شاگرد تھے۔

"میرزا اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ المتخلص بہ غالب ولد مرزا عبد اللہ خاں عرف مرزا دولہ نبیرہ مرزا غلام حسین خاں ...... ساکن بلدہ

اکبر آباد، شاگرد مولوی محمد معظم ، شاعر فارسی ہندی . . . . "

اس تذکرے میں بھی مرزا کے دو شعر ایسے ملتے ہیں جو ان کے کسی دیوان میں نہیں پائے جاتے ؎

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے
صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی گرہ رہے غنچۂ گل سوئے آشیاں بھولا جائے

عیار الشعرا کا جو نسخہ پٹنہ میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنہ ۱۲۴۲ھ جلوس شاہ عالم میں لکھا گیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا سال تالیف ۱۲۴۲ھ یا ۱۸۲۶ء ہے، ظاہر ہے کہ ذکا اس کے بعد بھی اس میں بہت دیر تک اضافے کرتے رہے ہوں گے اس لئے علاوہ ۱۲۱۲ھ مرزا غالب کا سال ولادت ہے اس صورت میں ان اشعار کی تعیین مشکل ہے کہ کس سنہ میں لکھے گئے، پہلا شعر تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم سنی میں لکھا گیا ہے، دوسرا شعر بھی بہت ممکن ہے کہ دوران قیام آگرہ ہی میں لکھا گیا ہو۔

خطی کتابیں یا غیر مطبوعہ مکاتیب وغیرہ ہمارے اسلاف کی امانت ہیں اور ہم اس کے امین ہیں۔ اس لئے انہیں ضائع کرنے کا کسی طرح حق نہیں رکھتے، قوم اور ادب کی امانت ہیں انہیں ان کے پاس لوٹا دینا چاہیئے۔ غالب کے مکاتیب ہوں یا ان کا کوئی شعر ضرورت ہے کہ جن کے پاس یہ انمول جواہر ہوں وہ صرف یہی نہیں کہ اپنے پاس محفوظ رکھیں بلکہ عام طور پر شائع کرا دیں تاکہ دوسرے بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔

مختار الدین احمد آرزو

شعر

بہت خجل ہے تیرے درد سے دعا میری
یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری

حسرت موہانی

دو نظمیں

اذان

اندھیرا ابرِ ظلمت بار بن کر زمیں سے آسماں تک چھا گیا ہے
مہ تاباں ہے وقفِ تیرہ بختی ستاروں کا چمن سنولا گیا ہے
منارِ دیں خموشی دم بخود ہے دیا تک بھی کہیں روشن نہیں ہے
چراغِ راہ کا مذکور کیسا! کوئی جگنو بھی ضو افگن نہیں ہے
اٹھا اے بے خبر! شمعِ شبستاں اندھیری رہگذر میں جا کے رکھ دے
عطا کر اُن چراغوں کو تجلّی کہ جن سے نور چھینا ہے ہوا نے

بے نیازی

جب تک میں تھا حقیقتِ دنیا سے بے خبر
آشفتہ اُس کے عشق میں برسوں رہا کیا
وہ اپنے کبر و ناز میں مجھ سے کھنچی رہی
میں اُس کی آرزو میں ہمیشہ گھُلا کیا
اک مرتبہ بھی آہ مگر پا سکا نہ بار
گو سجدۂ نیاز میں ہر دم جھُکا کیا
اب جبکہ اصل روپ میں وہ آ گئی نظر
اب جبکہ بے نیازِ محبت ہُوا ہوں میں
پھرتی ہے التفات کا ارماں لئے ہوئے
حالانکہ دل سے محو اُسے کر چکا ہوں میں
لیکن نہ آؤں گا کبھی اُس کے فریب میں
رازِ طلسمِ ہوشربا پا گیا ہوں میں

تاجور سامری

تصوّر

تصوّر اگر اپنا پھیلائے نور   مٹے امتیازِ غیاب و حضور
کہوں کیا تصوّر کی تابندگی   تصوّر ہے اک پرتوِ زندگی
تصوّر اُنہیں کا جماتا ہوں میں   انہیں کو دل افروز پاتا ہوں میں
جہانِ تصوّر میں کیا ذکرِ غیر   مرے دل سے مٹ کر رہی فکرِ غیر
تصوّر کا اُن کے سہارا ملا   مرا غنچۂ دل یکایک کھلا
انہیں کی مئے عشق پیتا ہوں میں   بہارِ تصوّر میں جیتا ہوں میں
تصوّر کی دنیا ہے کتنی عجیب   نہیں اس میں فرقِ بعید و قریب
تصوّر جو اُن کا ہُوا دل نشیں   زمیں کی طنابیں وہیں کھچ گئیں
وہ پاس آئے میرے ٹہلتے ہوئے   تصوّر کی رو میں مچلتے ہوئے
کمالِ تصوّر جمالِ نظر   کہ نظّارہ ہے حسبِ حالِ نظر
تصوّر نے تصویر دی دوست کی   بہاریں ہیں اس میں "ہمہ اوست" کی
تصوّر نے دکھلا دیا یہ سماں   وگرنہ کہاں میں، وہ ہوش کہاں؟
وہ ہنس ہنس کے مجھ کو ہنسانے لگے   تصوّر کی دنیا بسانے لگے
انہیں کے تصوّر سے دل میرا شاد   انہیں کا تصوّر ہے دل کی مُراد
میں ان کی محبت سے ہوں مطمئن   انہیں کے تصوّر میں کٹتا ہے دن
نہ وہ ساتھ میرے نہ میں اُن کے سات   تصوّر سے پھر بھی سہانی ہے رات
میں ہر شے سے ہوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے   انہیں کا تصوّر جمائے ہوئے
سمجھ میں جب آیا تصوّر کا راز   ہُوا انگساروں سے میں بے نیاز

مجھے جب تک احساسِ فرقت رہے
تصوّر کی دنیا سلامت رہے

(سیّد) علی منظور

قُدرت کی گود میں

آج وہ خلافِ معمول سرِشام ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ سُورج غروب ہونے میں ابھی نصف گھنٹہ باقی تھا۔ تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ لارنس گارڈن میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا ایک ہجوم تھا۔ رنگ رنگ کی ساڑھیاں قسم قسم کے سُوٹ۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے شوخ بھڑکیلے لباس باغ کے نزہت افزا سبزہ زار کے ساتھ مل کر آنکھوں میں طراوت پیدا کر رہے تھے۔ بہار تھی پر چاروں طرف پھول ہی پھول تھے۔ ہوائیں بھینی بھینی خوشبو لیے ہوئی تھی۔ سبک رفتار موٹریں زرق برق لباس والی سواریاں بٹھلائے بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ وہ ان تمام چیزوں کو تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کی برقی رَو اُس کے اعصاب میں داخل ہو ہو کر خون میں حرکت کی ایک نئی لہر پیدا کر رہی تھی اور زندگی کی بجھتی ہوئی چنگاری پھر سے روشن ہو رہی تھی۔ بے فکرے نوجوان ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ترو تازہ گھاس کے زمردیں فرش پر ٹہل رہے تھے۔ وہ ہنستے تو بلند بالا قہقہوں کی گونج ہواؤں میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیتی تھی۔ خوبصورت عورتیں پاس سے گذر جاتیں تو چہروں کی آرائش اور سنگار کی چمک دمک سے آنکھوں میں چکاچوند سی آ جاتی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ زندہ رہنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ طبیعت کی جولانی اور دل کی شگفتگی کو ہاتھ سے نہ دینا بھی کتنا بڑا کام ہے اور زندگی کی جدوجہد میں ہمیشہ سربلند و گردن کشاں بنا بھی کیسی کٹھن منزل ہے۔

وہ آج چھ مہینے کی مسلسل خانہ نشینی کے بعد پہلی مرتبہ گھر سے باہر آیا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ ہر لحظہ فریبِ نشاط میں مبتلا رکھنے والی دنیا ہمیشہ کی طرح اب بھی جوان ہے۔ لوگ اُسی طرح زندگی کے تیز رَو دریا میں سے مسرت و شادمانی کا آبِ حیات پینے میں مصروف ہیں اُس کے دل میں ایک نشتر سا چبھا کہ وہ قبل از وقت ان ہنگاموں سے کنارہ کشی اختیار کر رہا ہے۔ ابھی وہ بالکل نوجوان تھا پچیس سال بھی کوئی عمر ہے۔ پھر وہ کیوں مضمحل و افسردہ

انسان کی طرح زندگی کی گہما گہمی سے منہ موڑ رہا تھا یہ کھلنے پینے کے دِن۔ یہ ناؤ نوش کا زمانہ یہ عیش و مسرت کی راتیں وہ ایک چھوٹے سے قفس نما مکان میں بسر کر رہا تھا۔ جہاں تنہائی، مہینوں کی لگاتار و پیوستہ تنہائی نے اُس کے دل و دماغ کو مفلوج بنا دیا تھا۔ وہ اُس پرندکی طرح جو ابھی ابھی پنجرے سے اُڑ کر باہر آیا ہو کبھی باغ کی ایک روش سے دوسری روش پر اور کبھی پھولوں کے ایک قطعے سے دوسرے قطعے میں جا نکلتا تھا۔ آزادی سے گھومنا خود اعتمادی سے دُوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا، راہ گیروں کے ساتھ کھوے سے کھوا ٹکرا کر چلنا اُسے ایک عجیب و غریب کام معلوم ہوتا تھا۔ گویا اُسے پہلے اِس کا کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ بجلی کی روشنی نے باغ کی خوبصورتی میں اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ جگہ جگہ برقی قمقمے جگمگانے لگے تھے جن کی شعاعیں درختوں کی گنجان شاخوں میں سے چھن چھن کر زمین پر پڑتیں تو سیاہی اور سفیدی کا ایک جال بچھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ خوشبو سے لدی ہوئی ہوا کے جھونکے آ آ کر اُس کے دماغ کو معطر کر رہے تھے۔ اُس کا دِل مدت سے جس بارِ غم کے نیچے دبا ہوا تھا اور جسے راتوں کی مسلسل بے خوابی اور دنوں کی متصل بے آرامی نے بڑھا بڑھا کر اس قدر ہولناک بنا دیا تھا۔ کہ وہ سمجھتا تھا کہ زندگی نے اپنی تمام نعمتوں کے دروازے اُس کے لئے بند کر دیئے ہیں آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوا۔ وہ باغ کے اُس کے گوشے میں کھڑا تھا۔ جہاں سے منٹگمری ہال کی عالیشان عمارت اور اُس عمارت کے سامنے پھولوں سے بھرا ہوا میدان صاف نظر آ رہا تھا۔ چاند اپنی پوری تابانی سے چمک رہا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے نُور کی بارش نے باغ کو ہر قسم کی آلائش سے پاک و صاف کر کے اِس قدر پاکیزگی بخش دی ہے کہ اب اُس منزہ و مطہر فضا میں رنج و مصیبت کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ یکایک اُس کی آنکھوں کے آگے سے گویا پردہ سا ہٹنے لگا۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ دُنیا اپنی وسعت کے باوجود یقیناً اِس

قدر تنگ نہیں ہوئی کہ فرشِ زمین و سقفِ آسمان کے درمیان اُس کے لئے زندہ رہنے کی گنجائش بھی نہ نکل سکے۔

آج سے پندرہ سال پہلے نعیم کے والد کی ناگہانی موت نے اُس کی آئندہ پرورش کا تمام بوجھ اُس کی ماں کے نحیف و نزار کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ نعیم کی عمر اُس وقت دس گیارہ برس کی ہوگی۔ رہنے کے ایک چھوٹے سے مکان کے علاوہ اور کوئی جائداد نہ تھی۔ جو آئندہ بسرِ اوقات کی کفیل بنتی اُس کی ماں نے نوشتۂ تقدیر کے سامنے چُپ چاپ سر جُھکا دیا اور دُنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے لختِ جگر کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہوگئی۔ وہ ایک حد درجہ شریف اور پاکباز خاتون تھی۔ محلے بھر میں اُس کی نیکی اور دینداری کا چرچا رہتا تھا۔ لوگ اُس کے دُکھ درد میں شریک ہونے اور اُس کی موجودہ تکلیف کو کم کرنے کے۔ لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ لیکن وہ تنِ تنہا، قسمت پر قانع، صبر و شکر کے ساتھ زمانے کی سختیاں برداشت کرنے پر آمادہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حالات ساز گار نہیں ہیں اور مستقبل میں غالباً اس سے بھی بدتر واقعات پیش آنے کا امکان ہے مایں ہمہ وہ کسی کے آگے دستِ سوال دراز کر کے اپنے مرحوم خاوند کی روح کو شرمسار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اُس کے اکلوتے بچے کے دل میں ابھی سے یہ خیال راسخ ہو جائے کہ وہ دوسروں کی خیرات پر اپنی زندگی کے دن گذار رہا ہے۔ خودداری، غیرت اور عزتِ نفس۔ اُس کا مرحوم خاوند بس اِنہی تین صفات کا مجموعہ تھا۔ اُس نے اِفلاس اور غربت کے انتہائی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اور جب اُس نے زندگی کے کارزار میں قدم رکھا تھا تو کس مپرسی اور بےکسی کے علاوہ کوئی پُرسانِ حال بھی نہ تھا۔ چند ہی سال میں کسی خارجی امداد پر بھروسہ کئے بغیر وہ زندگی کی جدوجہد میں اپنے ہم عصروں سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اگر اُس کی عمر کا پیمانہ اتنی جلدی لبریز نہ ہو جاتا تو شاید وہ دنیا کو دِکھاتا کہ محنت، جفاکشی، اور صداقت پسندی اِنسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اُس نے جیتے جی اپنی بیوی کو ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ کہ وہ شہر کی امیر کبیر عورتوں سے حیثیت میں بھی کمتر ہے۔ ایک مختصر سے مکان میں جہاں گرد و پیش خوشحال لوگوں کی آبادی تھی اُن کا قیام تھا۔ اِسی مکان میں جب نعیم پیدا ہوا تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ زندگی کے اُفق سے تاریکیاں ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی ہیں اور اب اُن کا مطلعِ حیات کبھی مکدر نہیں ہوگا۔ لاڈ اور پیار میں پلے ہوئے بچے نے ابھی زندگی کی مشکل دس بہاریں دیکھی تھیں کہ سر سے شفیق و مہربان باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ یہ حادثہ اتنا رنج دہ اور تباہ کُن تھا کہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید شدتِ غم سے ہوش و حواس کھو بیٹھتی لیکن نعیم کی ماں نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ قدرت کے کاموں میں دخل دینا بےسُود ہے۔ اب ہر لمحہ اُس کی نظریں اپنے بیٹے کے مستقبل پر جمی رہتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی کہ نعیم پڑھ لکھ کر جوان ہوگا تو اُس کے سب فکر دُور ہو جائیں گے۔ پھر وہ کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جائے گا تو اُس کی تمام مصیبتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ جب تک نعیم تعلیم سے فارغ نہیں ہوتا وہ اپنے لئے آرام و راحت کے ہر قسم کے سامان کو حرام قرار دے لے گی۔ محض جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روکھی سوکھی کھا کر گذارہ کرنا اور تن پوشی کے لئے گاڑھے کے معمولی سے کپڑے پہن لینا اُس نے اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ فرصت کا تمام وقت وہ محنت مزدوری میں صرف کرنے لگی تھی۔ محلے کی اکثر لڑکیاں اُس سے پڑھنے آجاتی تھیں جن سے وہ حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ معاوضہ لے لیتی تھی۔ اُجرت پر سلائی کا کام کر کے بھی وہ تھوڑا بہت کما لیتی تھی۔ جاڑے کی لمبی راتوں میں وہ بیٹھی گرم موزے اور سویٹر بُنتی رہتی تھی۔ گرمیوں کے پہاڑ سے دن وہ مشین پر کپڑے سی سی کر گذار دیتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نعیم کا دل میلا نہ ہو اور وہ یہ محسوس نہ کرے کہ باپ نہ ہونے کی وجہ سے وہ زندگی کی اُن آسائشوں سے محروم ہے جو اُس کے ہم جولیوں کو حاصل ہیں چنانچہ نعیم بھی جب تک اسکول میں پڑھتا رہا تنگدستی کے احساس سے ایک دِن آشنا نہ ہوا تھا۔ دسویں جماعت پاس کر کے وہ کالج میں داخل ہوا تو اُس کی ماں کو مستقبل کی درخشانی کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے۔ اُس کے دل کو حوصلہ ہو گیا تھا کہ زندگی کی کٹھن منزل آہستہ آہستہ طے ہو رہی ہے اور اب چند سال کی بات ہے کہ اُس کے خواب کی تعبیر سامنے آجائے گی۔

نعیم کالج میں داخل ہوا تو اُسے اپنی ماں کی قُربانیوں کا احساس ہوا۔ اب اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے آرام و آسائش کے ایک ایک لمحے کی قیمت اُس کی ماں کی پوری ایک ایک رات کی بےخوابی اور پورے ایک ایک دِن کی مشقت تھی۔ اُس نے دیکھا کہ عیش و آرام کی جن چیزوں کو وہ اپنا حق سمجھ کر طلب کیا کرتا تھا حقیقتاً اُن کے حاصل کرنے میں اُس کی ماں کو خونِ جگر بہانا پڑتا تھا۔ اس اِحساس کے رُونما ہوتے ہی نعیم کے دِل میں اپنی ماں کیلئے تشکر و امتنان کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی اُس کے قلب و دماغ پر ایک ایسی الم انگیز رقت طاری ہوئی کہ وہ بے اختیار چاہتا تھا کہ اپنا سر

اپنی ماں کے قدموں پر رکھدے اور اس شدت کے ساتھ روئے کہ آنسوؤں کی روانی میں اُس کے دِل کا بُخار تحلیل ہو کر بہہ جائے۔ جُوں جُوں دن گذرتے گئے اُس کی یہ کیفیت پُختہ ہوتی گئی۔ اُسے معلوم ہوا کہ جب اُس کا باپ دنیا سے رُخصت ہوا تھا تو گھر میں مشکل سے اتنی رقم تھی کہ سال بھر کا گذارہ ہو سکتا تھا۔ ان نامساعد حالات میں تنہا اس کی ماں تھی جس کی ہمت اور جس کے استقلال نے گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا تھا۔ یہ صرف اس کی ماں کا وجود تھا جس نے پوری قوت کے ساتھ آندھیوں کا مقابلہ کیا اور اپنے نوبنِظر پر آنچ تک نہ آنے دی۔ نعیم نے اپنی ماں کے احسانات کے سامنے، جن سے اُس کا رُواں رُواں بندھا ہوا تھا، جب اپنی عاجزی اور بے بضاعتی کو دیکھا تو اُس کے دِل میں اک ہُوک سی اُٹھی اور پھر اُس نے اندر ہی اندر رنج و غم کے گھونٹ پی کر قسم کھائی کہ اب اُس کی زندگی کا واحد مقصد یہ تھا۔ کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ اپنے آپ کو ایک لائق فرزند بنائے تاکہ اپنی ماں کی خدمت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔

صبح و شام یہ مقصد ستارے کی طرح اُس کے سامنے روشن رہنے لگا تھا۔ اِسی مقصد کی رہنمائی میں اُس نے دُنیاوی کشمکش میں اپنا رستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اور اِسی مقصد کی روشنی میں اُس نے اپنے طرزِ بود و ماند کا نئے سرے سے جائزہ لیا تاکہ یہ دیکھ سکے کہ اُس کے اعمال مجوزہ نصب العین تک پہونچنے کی کفالت کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ ہر بات سے اپنی ماں کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ اور ہر فعل سے اپنی ماں کو یقین دِلانا چاہتا تھا۔ کہ اُس میں اپنے مرحوم باپ کا صحیح جانشین بننے کی صلاحیتیں ہیں۔ چنانچہ اس دُھن میں اُس نے پُورے انہماک کے ساتھ اپنے درسی مشاغل میں حصہ لینا شروع کیا۔ یوں تو وہ پہلے بھی پڑھنے لکھنے سے کبھی غافل نہیں ہوا تھا لیکن اب اُس کے عزم آہنیں نے ایک نئی صورت اختیار کر لی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے وہ اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ اپنی تمام کوششیں حصولِ علم کے لئے وقف کر دے۔ اگر اُس کی محنت بار آور ہوئی اور وہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر کسی مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً اُسے کوئی اعلےٰ عہدہ مل جائے گا۔ اِس طرح گویا ماضی کی ساری کلفتوں کے داغ دُھل جائیں گے اور وہ اپنی ماں کی قُربانیوں کا بخوبی اجر دے سکے گا۔

نعیم نے کالج میں اپنی نیک نامی اور قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اُس کی ماں جب لوگوں کی زبانی اپنے ہونہار بیٹے کی تعریفیں سُنتی تو اُس کا دِل خوشی سے اُچھلنے لگتا تھا۔ وہ مسرت بھری آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتی اور دِل ہی دِل میں دُعا کرتی کہ اُس کا لختِ جگر نظرِ بد سے محفوظ رہے۔ جاڑوں کے موسم میں نعیم رات کے بارہ بارہ بجے تک مطالعہ میں محو رہتا تھا اور اُس کی ماں پاس بیٹھی آنکھ تک نہ جھپکتی تھی۔ نعیم بہتیرا منع کرتا لیکن اُس ممتا کی ماری کو یہ کیونکر گوارا تھا۔ کہ اُس کے جگر کا ٹکڑا تو کڑکڑاتی سردی میں جاگ جاگ کر راتیں بسر کرے اور وہ نرم و گرم بستر میں غافل سوتی رہے۔ جب نعیم کا اصرار حد سے بڑھنے لگتا تو وہ غم خواری کے انداز میں مُسکرا دیتی اور چپکے سے اُون اور سلائیاں اُٹھا کر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر سوئیٹر اور موزے بُننے میں مصروف ہو جاتی تھی۔

نعیم نے ایف اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ جتنی کالج بھر میں دوسرے نمبر پر آیا۔ اب اُس کی شُہرت محلّے کے محدود حلقے سے نکل کر شہر کے دوسرے گھرانوں تک بھی پہونچنے لگی تھی جو براہِ راست اُس سے واقف نہ تھے۔ دل و دماغ کی قابلیت کے ساتھ قُدرت نے اُس کو شکل و صورت بھی ایسی عطا کی تھی۔ کہ وہ حُسن ظاہر و حسن باطن کا ایک قابلِ رشک نمونہ بن گیا تھا۔ اگرچہ لباس کے معاملہ میں وہ زیادہ محتاط نہ تھا۔ اور نہ ہی اُسے بنے ٹھنے رہنے کا چنداں شوق تھا۔ لیکن صاف سُتھرے کپڑوں میں اُس کا مضبوط سڈول جسم عنفوانِ شباب کی دلفریبیوں کا ایک صحیح مرقع نظر آتا تھا۔ بی۔ اے کے دو سال اُس کو بڑی سرگرمی اور محنت سے بسر کرنا پڑے۔ مالی پریشانیاں اِن دو برسوں میں پہلے سے دُگنی ہو گئی تھیں۔ اس لئے نعیم کو مجبوراً کچھ فُرصت کا وقت نکال کر ٹیوشن سے روپیہ کمانا پڑا۔ بہرحال اُس نے بی اے میں اچھے نمبر پائے۔ اگرچہ اُس نے کوشش یہی کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح درجۂ اوّل حاصل کرے لیکن ان مجبوریوں کے باعث وہ یہ اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

بی۔ اے کے بعد وہ اپنے پروفیسروں کے مشورے سے ایم۔ اے میں داخل ہو گیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ ایم۔ اے کے ساتھ ساتھ وہ مقابلے کے کسی امتحان میں شامل ہونے کی بھی سر توڑ کوشش کرے گا۔ اُسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اِسی ایک چیز پر گویا اُس کے مستقبل کی ساری بہبود کا انحصار ہے۔ اس دوران میں اُسے متعدد جگہوں سے ٹیوشن کی درخواستیں آئیں لیکن اُس نے اُن پر کوئی غور نہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بہت بڑے رئیس کے بیٹے کو پڑھانے کا کام مل جائے تو زیادہ مفید ہو گا۔ اس طرح وہ ایک ہی جگہ سے معقول تنخواہ پا لے گا۔ اور مختلف لڑکوں کے ساتھ دماغ سوزی کی زحمت

سے بچ جائے گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انہی دنوں شہر کے ایک چوٹی کے معزز اور متموّل گھرانے سے اُسے ٹیوشن کا پیغام آیا۔ نعیمؔ کو اس دعوت کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ تھا۔ لیکن صرف ایک چیز ایسی تھی جس نے اُس کو اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر بار بار سوچنے پر مجبور کر دیا۔ پڑھنے والا لڑکا نہیں تھا۔ بلکہ لڑکی تھی۔ اتنے بڑے خاندان کی پردہ نشین لڑکی کو پڑھانے کے لئے نعیمؔ کو روزانہ اُن کے مکان پر جانا ہوگا۔ چنانچہ نعیمؔ پورا ایک ہفتہ اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا کہ اس دعوت کو منظور کرے یا رد کر دے۔ لڑکی گھر پر ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ اور اُسے ہر روز شام کو دو گھنٹے کے لئے ٹیوٹر کی امداد کی ضرورت تھی۔ نعیمؔ نے اپنی والدہ سے ذکر کیا تو اُس نے بھی کچھ ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ مشاہرہ ساٹھ روپے ہے آخر ماں بیٹے کی یہی صلاح ٹھہری کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔

نعیمؔ نے اب باقاعدہ ہر شام اپنے کام پر جانا شروع کر دیا۔ اُس کی شاگرد کا نام فردوسؔ تھا اور عمر بیس اکیس برس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس گھرانے میں قدامت پسندی کی وجہ سے اوّل تو عورتوں میں تعلیم جدید کا رواج ہی کم تھا۔ اور پھر لڑکیوں کو تعلیم دینے کا خیال آیا بھی تو فردوس کے والد نے فردوسؔ کو میٹرک کے بعد کالج میں بھیجنا گوارا نہ کیا۔ فردوسؔ کو آئندہ تعلیم جاری رکھنے کا بے حد شوق تھا اس لئے اُس کی والدہ کے اصرار پر فردوس کے باپ نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ اُس کے لئے ایک اُستاد رکھ دیا جائے جو گھر میں آ کر پڑھا جایا کرے۔ فردوسؔ نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ جہاں تموّل، بے فکری، فراغت اور عیش و تنعم کا دَور دَورہ تھا۔ بہتر سے بہتر کھانا اور اچھے سے اچھا پہننا اُس کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ گھر کی چار دیواری میں اُسے بظاہر تفریح کے سبھی سامان میسر تھے۔ اور پھر چونکہ کنبے بھر میں وہی ایک لڑکی تھی جس نے میٹرک کے بعد کالج کی تعلیم میں بھی قدم رکھا تھا اس لئے گھر کے تمام لوگوں پر اُس کا ایک خاص قسم کا تفوّق سا قائم ہو گیا تھا۔ اُسے ایک علیحدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ جسے اُس نے اپنے ذوق کے مطابق بیش قیمت اور خوبصورت سامان سے سجا رکھا تھا۔ اُسے ہر ماہ جیب خرچ کے لئے کافی رقم ملتی تھی۔ جسے وہ اپنی خواہش کے مطابق جس طرح چاہتی صرف کر سکتی تھی۔ اُسے شعر و سخن کے علاوہ موسیقی اور مصوری کا بھی کچھ شوق تھا۔ اسکول کے زمانے میں اُس نے ماں باپ سے چوری ایک سہیلی کی مدد سے شہر کے مشہور فوٹوگرافر سے اپنی تصویر بھی کھنچوائی تھی۔ اُس تصویر کی دو کاپیاں اُس نے اپنی دو سہیلیوں کو دے دی تھیں اور ایک کاپی اُس کے پاس موجود تھی جسے وہ بہت احتیاط سے چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ اُس نے اپنے البم میں مشہور مقامات کے، علاوہ خوبصورت ایکٹرسوں اور ایکٹروں کی بہت سی تصویریں جمع کر رکھی تھیں۔

فردوس کا قد لمبا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ اُس کی رنگت میں تھوڑا سا سانولا پن تھا لیکن چہرے کے نقش بے حد دلکش تھے۔ سیدھی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ اور لمبی لمبی نشہ ریز آنکھیں تھیں جن پر گھنی پلکیں اس طرح جھکی رہتی تھیں گویا کسی جھیل کے صاف و شفاف پانی پر بیدِ مجنوں کی شاخوں نے سایہ کر رکھا ہو۔ اُس کے رُخسار جوانی کی حدت سے ہر وقت تمتمائے رہتے تھے اور نیچے کا ہونٹ دُور سے ایک طرف کو ذرا خم کھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جس سے دیکھنے والے کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے چہرے پر ہمیشہ ایک شرارت آمیز تبسم کھیلتا رہتا ہے۔ فردوسؔ دن میں کئی مرتبہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو ہو کر، پہلو بدل بدل کر، اپنے جسم کا اپنی چال ڈھال کا۔ اپنے لباس کی پھبن کا جائزہ لیتی رہتی تھی۔ اُس کی سنگار میز اعلےٰ درجے کی ولائتی خوشبوؤں، غازوں اور اُبٹنوں سے پٹی پڑی تھی جنہیں وہ ایک صناع کی سی ہنرمندی کے ساتھ استعمال کرنا جانتی تھی۔ وہ بالعموم دن میں دو مرتبہ لباس تبدیل کرنے کی عادی تھی۔ اُس کے کپڑوں کی الماری رنگ رنگ کی ساڑھیوں، قسم قسم کے ریشمی دوپٹوں اور بہترین درزی کے ہاتھ کے سلے ہوئے لباس ہائے فاخرہ سے بھری رہتی تھی۔ وہ جونہی الماری کا دروازہ کھولتی عطرِ حنا کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ مہک اُٹھتا تھا۔ فردوس کے والد کا مکان جسے وُسعت و عظمت کے اعتبار سے ایک محل کہنا کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا چاروں طرف اُونچی اُونچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ بیرونی دنیا کے شور و غوغا کا اُن بلند بالا، عفریت نما، سنگین دیواروں کو چیر کر اندر آنا محال تھا۔ فردوسؔ ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کر رہی تھی جہاں اُس کا تموّل، اُس کا شباب اور اُس کے ارمان اپنے اظہار کا کوئی حیات افروز وسیلہ نہ پا کر چُپ چاپ اُس سمندر کی سی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے جس کی سطح کے نیچے شورش و اضطراب کا ایک محشر بپا ہو اور اُوپر سکون چھایا ہوا ہو۔ کبھی کوئی سہیلی اُس سے ملنے آ جاتی یا کبھی کبھی وہ اپنی ماں کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر باہر جاتی تھی تو اُسے زندگی میں تنوّع کا احساس ہوتا تھا۔ مال پر سے گذرتے ہوئے یا جب انارکلی کی بے پناہ بھیڑ میں سے شوفر بامان

بجا بجا کر بڑی مشکل سے راستہ پیدا کرتا تو وہ برقع میں لپٹی لپٹائی موٹر کی کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر اس گہما گہمی کو دیکھتی تھی جہاں فرزندانِ آدم ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر، جسم سے جسم چھُوا کر چلتے تھے۔ اس ہجوم کو دیکھتے ہی اُس کے اندر زندگی کی چنگاری بڑی شدت سے بھڑک اُٹھتی تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ تنہا آئینے کے سامنے کھڑی اپنے قامت کی رعنائی، اپنے لباس کی خوشنمائی اور اپنے چہرے کی دلکشی کو دیکھ دیکھ کر غمگین سی ہو جاتی تھی۔ اُس کے دل میں بے نام سی خواہشیں سر اُٹھانے لگتیں اور وہ اُن کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے گھبرا کر ایک طرف کو سرک جاتی تھی۔ ایسے لمحوں میں، جن سے اب قریب قریب اُسے ہر روز دوچار ہونا پڑتا تھا، وہ بے اختیار چاہتی تھی کہ کوئی رفیق اُس کے پاس ہو جس کے سامنے وہ رو رو کر اپنے دل کی کیفیت بیان کرے۔ اُس کی رُوح چاہنے اور چاہے جانے کے لئے بے قرار تھی۔ ایک سال ہوا کہ گھر میں اُس کی شادی کا کچھ چرچا ہوا تھا لیکن اب مدت سے اِس موضوع پر کوئی بات سننے میں نہ آئی تھی۔ اُس کے مغرور و متموّل والدین کی نگاہ میں کوئی شخص جچتا ہی نہ تھا۔ فردوس کو یہ اندیشہ ہر وقت مضطرب اور پریشان رکھنے لگا تھا کہ شاید اب اُس کے لئے کہیں سے پیغام آنے کا ہی نہیں۔ کبھی کبھی وہ اس رُوحانی اضمحلال سے تھکی ہاری شکستہ، مغموم، اپنے مکلّف و مطلّا نرم و گداز بستر پر لیٹے آنکھیں چھت کی طرف جمائے ایک خیالی محبوب کی پذیرائی کے خواب دیکھا کرتی تھی جو یکایک اُس کی زندگی کے اُفق سے نمودار ہوگا۔ اور اپنی سحر کار نگاہوں سے ایک ہی وار میں اُس سے صبر و قرار کی دولت چھین کر لے جائے گا۔

نعیم جب اُس کو پڑھانے کے لئے پہلے روز آیا تو اُس کو دیکھ کر فردوس کا دل دھک سے رہ گیا۔ بیس بائیس سال کا ایک حسین و تنومند نوجوان، تہذیب و شائستگی کا مجسمہ، علم و ادب کا پیکر اور شرم و حیا کا نمونہ۔ یہ تھا وہ اتالیق جس کی معیت میں فردوس کو اپنا تعلیمی سفر پورا کرنا تھا۔ نعیم کی یہ حالت تھی کہ آنکھیں کتاب کے صفحے سے اُٹھتی ہی نہ تھیں۔ بات بھی کرتا تھا تو [illegible] نکلتے تھے۔ فردوس خود سر زیرِ ادب اور تمیز کے ساتھ کچھ فاصلہ پر بیٹھی انکھیوں سے یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔ نعیم بولتا تو فردوس کو یوں معلوم ہوتا تھا گویا دُور سے نقرئی گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آ رہی ہے۔ نعیم پڑھا کر چلا گیا تو فردوس کھوئی کھوئی سی نظر آنے لگی۔ اُس کے دل کو اطمینان سا ہو گیا تھا کہ کچھ بھی ہو اب تنہائی ویسی الم انگیز، زندگی ویسی بے کیف اور صبح و شام کا تسلسل ویسا بے آب و رنگ نہیں ہوگا۔ ایک مہینہ تو یہ معمول رہا کہ جب تک فردوس نعیم سے پڑھ کر فارغ نہ ہو جاتی فردوس کی ماں خود اُن کے پاس موجود رہتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اُس کو یہ پابندی گراں گذرنے لگی اور اُس نے خود ہی وہاں بیٹھنا ترک کر دیا۔ یونہی کبھی کبھی جھانک کر اندر دیکھ لیا کرتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ جھانک کر دیکھنا بھی چھُوٹ گیا۔ اب نعیم اور فردوس میں کسی قدر بے تکلفی ہو گئی تھی۔ دونوں ایک ہی میز پر کتابیں رکھ کر پڑھتے تھے۔ کرسیاں بھی دونوں کی بالکل ایک دوسرے کے متصل ہوتی تھیں۔ دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ ایک اُستاد اور دوسری شاگرد۔ اُستاد نوجوان ہونے کے باوجود مصائب کا زخم خوردہ اور زندگی کی تلخ کامیوں کا شکار۔ اور شاگرد حُسن و شباب کی تمام رعنائیوں سے مرصّع ہونے کے ساتھ ساتھ ناز و نعمت کی پروردہ اور زندگی کے روشن پہلو سے لُطف اندوز۔ نعیم کو اپنے فرائض کا بہت احساس تھا۔ اور وہ دو گھنٹے ختم ہوتے ہی وہاں سے رُخصت ہو جاتا تھا۔ فردوس کبھی کبھی اُسے باتوں میں لگا کر روک لینے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ وہ نعیم کے خاندانی حالات سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی اور اب وہ اکثر اُس سے ذاتی معاملات کے متعلق سوال کیا کرتی تھی۔ جن کا جواب دینے کی بجائے نعیم ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیتا تھا۔ فردوس نے ایک روز جرأت کر کے اپنی تصویر نعیم کو پیش کر دی۔ نعیم نے تصویر تو اُٹھا لی لیکن اسکے ہاتھ بُری طرح کانپ رہے تھے اور چہرے کا رنگ جذبات کی شورش سے بالکل بدل گیا تھا۔ اُس نے تصویر کو بڑی احتیاط سے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور اُٹھ کر چلا آیا۔ گھر آ کر اُس نے دیکھا کہ تصویر کی پُشت پر فردوس کے ہاتھ سے ایک فارسی شعر لکھا تھا جس کا مطلب تھا کہ "میرے محبوب، یہ تصویر کا تحفہ قبول کر تاکہ میری آنکھیں ہمیشہ تیری دید سے تسکین حاصل کرتی رہیں۔"

نعیم دیر تک مختلف خیالات میں محو تصویر کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہی لمبی لمبی گھنی پلکوں سے ڈھکی ہوئی مے گسار آنکھیں، وہی گلاب کی پنکھڑی جیسے نرم و نازک ہونٹ جن پر ایک پُراسرار تبسم رقص کرتا معلوم ہوتا تھا۔ وہی جوشِ جوانی سے تمتمائے ہوئے رُخسار جن کو نعیم ہر روز للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ لیکن آج اِس تصویر کو دیکھ کر نعیم کو فردوس کے نقش و نگار میں نئی نئی نزاکتیں، نئی نئی لطافتیں اور نئی نئی قیامتیں نظر آئیں۔ فردوس نے بہترین ساڑھی پہن رکھی تھی اور فوٹو گرافر کی چابکدستی نے اُس کی لمبی عُریاں گردن میں، جس کی شکن بر سینہ تنگ تک پھیلتی چلی گئی تھی، ایک ایسا سڈول اور پُر خم پیدا کر دیا تھا کہ یہی معلوم ہوتا تھا گویا ایک خواب

سے بھری ہوئی صراحی ہے جس میں سے بادۂ تند ابھی ابھی اُبل کر بہنا شروع ہو جائے گا۔ نعیم رات بھر جاگتا رہا۔ اُس نے سو جانے کی بہتیری کوشش کی لیکن اُس کے جذبات میں ایک ایسا طوفان جاری تھا کہ بمشکل پانچ منٹ کے لئے آنکھ لگتی بھی تھی تو دل اس زور سے دھڑکنے لگتا کہ وہ بے اختیار آنکھیں کھول دیتا تھا۔ فردوس کی تصویر اُس کے بستر کے تکیے کے نیچے رکھی تھی۔ وہ کئی مرتبہ اُس کو چوم چوم کر اپنی دیوانگی کم کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ اب پھر اُس نے تکیہ اُٹھایا اور بجلی کی روشنی میں دیر تک تصویر کو دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اِس بے تابی کے ساتھ گویا اُس پر جنون کا دورہ ہوا ہے اُس نے تصویر کو بار بار چومنا شروع کیا اور جب تسکین نہ ہوئی تو اُس کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

نعیم اور فردوس کے درمیان باقاعدہ تعلقاتِ محبت قائم ہو گئے تھے اور اب ہر روز اُن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُستادی شاگردی نے بڑھتے بڑھتے عشق و عاشقی کی صورت اختیار کر لی تھی اور درس و تدریس کے دو گھنٹے آنکھ جھپکنے میں گذر جاتے تھے۔ فردوس کس شدت سے چاہتی تھی کہ نعیم کو اپنے سے جدا نہ ہونے دے۔ وہ چلا جاتا تو دنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیر ہو جاتی تھی۔ رات کو بستر پر لیٹے لیٹے وہ عالمِ خیال میں اُس سے باتیں کیا کرتی تھی شام کو اُس کے آنے سے کچھ پہلے وہ بن سنور کر اُس کی منتظر رہتی تھی گویا ایک نئی نویلی دُلہن اپنے محبوب کے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہے۔ اچھے کپڑے پہننے کا تو اُسے شروع سے شوق تھا۔ لیکن اب اُس نے بڑی کاوش سے اپنے لئے نفیس ترین لباس تیار کرائے تھے۔ ان حسین و جمیل ملبوسات میں غرق، اعلٰے درجے کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی، چہرے کو غازہ و گلگونہ سے اِس قدر مجلّا کئے کہ آنکھیں چُندھیا جائیں وہ نعیم کے لئے آغوشِ شوق وا کئے بیٹھی رہتی تھی۔ نعیم آتا تو گویا شبِ تاریک میں قندیلِ مہتاب روشن ہو جاتی تھی۔ میز پر کتابیں کھول کر، قریب قریب کرسیاں بچھا کر وہ ہم آغوشیوں میں یوں بے خود و مدہوش ہو جاتے تھے۔ کہ شاید اب اس خوابِ شیریں سے کبھی بیدار نہ ہوں گے۔ کبھی کبھی یک لخت، ایک اضطراری جنبش کے ساتھ، نعیم گھبرا کر اُس سے الگ ہو جاتا تھا۔ تو وہ اپنی لمبی لمبی پلکیں اُٹھا کر، نیم وا آنکھوں کو اور زیادہ کشادہ کر کے، حیرت و استعجاب کے ساتھ اُس کو دیکھتی تھی کہ ایسی سرور انگیز ساعتوں کو اپنے ہاتھ سے کیوں ضائع کر رہا ہے۔ نعیم کے دل میں ایک چور تھا جو اُسے کسی گھڑی چین لینے نہیں دیتا تھا۔ یہ خیال کہ وہ راہِ راست سے بھٹک گیا ہے، اُس کے لئے سوہانِ رُوح ثابت ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ جس مضبوط چٹان پر وہ جم کر بیٹھا ہوا تھا وہ ریت کے قلعے کی طرح مسمار ہو رہی ہے۔ آندھی کا ایک ریلا اور آیا تو وہ کسی عمیق غار میں اِس طرح اوندھے منہ گرے گا کہ شاید زندہ بھی نہ بچ سکے۔ اُس کی بیوہ ماں جیسے مستقبل کی کامیابیاں اپنے سامنے یوں سر اُٹھائے نظر آ رہی تھیں جس طرح مطلع صاف ہو تو دُور سے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں دُھوپ میں چمکتی دکھائی دیتی ہیں اپنے بیٹے کے لئے دن رات دعاؤں میں مصروف رہتی تھی۔ نعیم اپنی ماں کے غم زدہ اور متفکر چہرے کو دیکھتا تو اُس کے دل میں درد سے ٹیسیں اُٹھنے لگتی تھیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رات کی تنہائی میں اپنے کمرے کے کواڑ بند کر کے اُس نے بے اختیار آنسو بہائے اور رو رو کر دُعا مانگی کہ خدا اُسے اِس ابتلا سے نجات دے۔ کئی مرتبہ اُس نے تہیّہ کیا کہ وہ ٹیوشن چھوڑ دے گا۔ اور کئی دفعہ تو وہ اس عزمِ مصمم کے ساتھ اپنے گھر سے نکلا بھی تھا کہ جاتے ہی فردوس کے والد سے کہہ دے کہ وہ آئندہ اُن کی بیٹی کو پڑھانے سے معذور ہے۔ لیکن کسی مقناطیسی کشش سے اُس کے قدم سیدھے اُس کو فردوس کے کمرے میں پہنچا دیتے تھے۔ جس کی فضا حجلۂ عروسی کی طرح معطر و منور تھی اور جہاں دُلہن کی طرح سجی سجائی فردوس بہ ہزار ناز و رعنائی اُسے دعوتِ نشاط دینے کو موجود تھی۔ اِس فضا میں سانس لیتے ہی وہ سب ارادے بھول جاتا تھا۔ اور پھر ایک بھوکے اور حریص اِنسان کی طرح وہ حُسن و عشق کی لذتوں سے پوری طرح متمتع ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

ایک روز فردوس نے اُس کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ اپنا مکان چھوڑ کر اُنہی کے ہاں آ جائے۔ اس طرح یکجائی ہو جائے گی اور اُنہیں آپس میں ملاقات کے موقعے شب و روز ملتے رہیں گے۔ نعیم اس تجویز کو کسی صورت بھی منظور کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اُس کے دل میں اپنی ماں کا اب بھی اتنا خوف اور احترام تھا کہ وہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ ایک ہی شہر میں رہ کر اُس سے علیحدہ کسی اور مکان میں زندگی بسر کرے۔ وہ ہر لمحہ محسوس کرتا تھا کہ اُس کے اطوار بگڑتے جا رہے ہیں لیکن اُسے یقین تھا کہ یہ سارا ہنگامہ ایک سراسر عارضی دلبستگی ہے۔ وہ جب چاہے گا طرفۃ العین میں ایک جھٹکے سے اِن زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو جائے گا۔ کئی دفعہ اُس نے ٹٹول ٹٹول کر اپنے دِل کا جائزہ لیا کہ دیکھے کہ فردوس کی محبت کن گہرائیوں تک اثر کر چکی ہے۔ لیکن اُس نے تفحص اور تجسس کے بعد ہر بار یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اُسے فردوس سے ایسا تعلقِ خاطر نہیں ہے کہ محض اُس کی خاطر اپنی زندگی خراب کر لے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے جوانی کا فریب ہے اور وہ جلد ہی اِس خواب سے

بیدار ہو کر اُس مقصد کے حصول کی جدوجہد میں معروف ہو جائے گا جو آج تک زندگی کے طوفانی حادثوں میں روشنی کے بلند مینار کی طرح اُس کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔

ادھر نعیم خیالات کی اس بھول بھلیاں میں گھوم رہا تھا اُدھر غیر شعوری طور پر فردوس کی محبت اُس کے گرد ایک ایسا باریک جال تن رہی تھی کہ وہ کوشش کے باوجود بھی اُس کے تاروں سے رہائی نہ پا سکے۔ وہ ارادے باندھ باندھ کر توڑتا اور روشنی کا مینار دیکھ دیکھ کر بھٹک رہا تھا۔ مسلسل ارادے باندھنے اور پھر اُن کو توڑ دینے سے وہ اپنے نفس کو ہمیشہ فریب دینے کا عادی ہو گیا تھا۔ آخر اُس کی ماں نے محسوس کر لیا کہ اُس کے بیٹے میں تغیر آ رہا ہے اور ایک روز بہت تامل کے بعد اُس نے باتوں باتوں میں اس حقیقت کا اظہار بھی کر دیا۔ نعیم کی تو یہ حالت ہوئی گویا عین چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں اس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے سلامتی کا یہی ایک راستہ باقی ہے کہ فردوس سے اپنا تعلق بالکل منقطع کر لے۔ وہ شام کو جب اُس کے ہاں گیا تو اُسے پختہ یقین تھا کہ آج دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ اُسے اپنی ماں کی زبان سے سرزنش کا خفیف سے خفیف لفظ سننے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔ چنانچہ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ فردوس سے ہر قسم کی راہ و رسم بند کر کے وہ پوری تن دہی سے اپنے درسی مشاغل میں منہمک ہو جائے۔

معلوم نہیں فردوس نے اُس دن آرائشِ جمال میں کیوں اس قدر غیر معمولی کاوش سے کام لیا تھا کہ اُس کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد متاعِ صبر و قرار کا سلامت رہنا محال تھا۔ نعیم نے اُس کو دیکھا اور پھر دیکھتے ہی اُس کی تابشِ نگاہ سے اُس کے ارادے یوں تحلیل ہونا شروع ہو گئے جیسے آفتاب کی پہلی کرن سے شبنم کے قطرے پگھل پگھل کر نابود ہو جاتے ہیں۔ نعیم نے فردوس کے آغوش میں اس طرح منہ چھپا لیا گویا وہ تلخ و ناگوار حقیقت کے اُس بھیانک دیو کی گرفت سے بچ جانا چاہتا ہے جو صبح سے اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔ پھر اُس نے رو رو کر اپنی داستانِ الم سنائی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جدائی کی گھڑی آ گئی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ کیونکر اس مصیبت کی تاب لا سکے گا۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنی ماں کی سرزنش کا سارا قصہ فردوس کے گوش گذار کیا اور کہہ دیا کہ وہ آئندہ اُس کے ہاں نہیں آئے گا۔

فردوس نے اپنی مترنم آواز میں ہلکی سی ہنسی کے ساتھ نعیم کے کان میں کوئی افسوں پھونکا اور وہ بے تابی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ فردوس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "یاد رکھو! میں تم کو اپنے سے کبھی جُدا نہ ہونے دوں گی۔"

نعیم نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کیونکر؟"

فردوس نے نہایت وثوق آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "آؤ ہم لاہور کو خیرباد کہہ کر کسی اور شہر میں چلے جائیں اور لوگوں کی زبانِ تشنیع سے بچ کر کسی گوشۂ عافیت میں چین سے زندگی بسر کریں۔"

نعیم اس نئے خیال سے چونک اُٹھا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی ماں کا حزیں و ملول چہرہ اُس کے اُفقِ خیال سے نمودار ہوا اور پھر فردوس کے حسین و شاداب چہرے کی شعلہ گوں تابناکی سے وہ دُھندلا سا نقش آہستہ آہستہ مٹتا چلا گیا۔ نعیم کی آواز میں خوف و ہراس کی شدت سے لرزش پیدا ہو چلی تھی۔ اُس نے رُکتے ہوئے پوچھا "یہ کیونکر ہو گا؟"

"اِس طرح ہو گا"!

اور فردوس نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اُسے آغوش میں زور سے بھینچ لیا۔

اور پھر کہنا شروع کیا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں گے؟ کون سی طاقت ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کر سکتی ہے؟ میں تو کئی دن ہوئے فیصلہ کر چکی ہوں کہ اب ہمیں لاہور چھوڑ ہی دینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی سر سے گذر جائے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں۔"

نعیم رُک رُک کر کہنے لگا "لیکن ...... فردوس ...... ذرا سوچو تو .... تم اِس قدر ناز و نعمت میں رہنے کی عادی ہو۔ بھلا کیونکر میرے ہمراہ زندگی بسر کر سکو گی ...... اور پھر تمہارے والدین ...."

فردوس نے فیصلہ کُن انداز میں جواب دیا "خدا را اِن اندیشوں کو بالائے طاق رہنے دو۔ تم کیوں اِس قسم کے وہموں میں مبتلا ہوتے ہو۔ یہ دُنیا بہت وسیع ہے اور محبت کرنے والے دو دِلوں کے لئے بحر و بر کا ہر ٹکڑا خلدِ بریں بن سکتا ہے۔"

اس واقعہ کے تیسرے دن نعیم اور فردوس یکایک غائب ہو گئے اور شہر بھر میں عجیب عجیب چہ میگوئیاں، رنگ رنگ کی افواہیں اور قسم قسم کی باتیں آگ کی طرح پھیلنا شروع ہو گئیں۔ فردوس اپنے گھر سے زیور کی صندوقچی اور کچھ نقد روپیہ بھی لے گئی تھی۔ فردوس کے والد نے

جو زخمی سانپ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا پولیس میں اطلاع کر دی۔ اُس کی عزت و آبرو۔ اُس کی جاہ و حشمت۔ اُس کی خاندانی وجاہت آج خاک میں مل گئی تھی۔ وہ شہر میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔ تاہم اُس نے ضبط قائم رکھا اور دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ اُس کی بیٹی خواہ دنیا کے آخری گوشے تک پہنچ جائے وہ اُسے ڈھونڈ کر لے آئے گا اور جب تک نعیم کو جہنم رسید نہ کر لے اُس پر خواب و خور حرام ہے۔

نعیم کی والدہ کو جب اس حادثے کی خبر ملی تو اُسے اعتبار نہ آتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اُس کا مظلوم، معصوم اور بھولا بھالا بیٹا بھلا کیونکر ایسی حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ وہ خیال کرتی تھی کہ یہ سب کسی دُشمن کی کارروائی ہے۔ آخر جب پولیس کا افسر قضا کے فرشتے کی طرح اُس کے دروازے پر آنازل ہوا تو اُسے اس خوفناک حقیقت کا احساس ہوا کہ اُس کا فرزند واقعی قانون کی زد میں آچکا ہے۔

دو مہینے کے بعد نعیم اور فردوس بمبئی میں گرفتار ہو گئے۔ فردوس کے والد کو کسی طریقے سے معلوم ہو گیا تھا کہ اُس کی بیٹی بمبئی میں ہے۔ چنانچہ اُس نے خود وہاں جا کر پولیس کی مدد سے اُنہیں گرفتار کیا۔ جب وہ لاہور آگئے تو فردوس کے ماں باپ نے رو رو کر اُس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ عدالت میں کہہ دے کہ نعیم اُس کو بہکا کر لے گیا تھا۔ فردوس ابتدا میں انکار کرتی رہی لیکن جب اُس نے اپنے باپ کی گریہ و زاری دیکھی اور اُسے اپنی ماں کے بے اختیار آنسو بہتے نظر آئے تو اُس کا دِل پسیج گیا۔ اُس نے عدالت کے روبرو کہہ دیا کہ نعیم اُس کا ٹیوٹر تھا اور اُسے تاریخی مقامات دکھانے کے بہانے سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ فردوس کے والد نے اپنا اور اپنے دوستوں کا پورا اثر و رسوخ استعمال کیا اور نعیم کو تین سال کے لئے جیل بھجوا دیا۔

تین سال کی قید بامشقت بھگتنے کے بعد جب وہ رہا ہوا تو دُنیا ہی بدل چکی تھی۔ وہ ایک گداگر کی طرح خانہ بدوش تھا۔ اُس کی ماں مر چکی تھی۔ دوست احباب منہ موڑ چکے تھے۔ عزیز و اقربا اُس کا نام سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ جیل سے نکلنے کے بعد اُس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ارض و سما کے درمیان اُسے کہاں پناہ مل سکے گی۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اُسے راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس بے بسی کے عالم میں اُس نے محسوس کیا کہ کرۂ ارض کی اس بے پایاں وسعت میں پرندوں اور حیوانوں کے لئے جائے پناہ ہے لیکن انسان کے لئے عافیت کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے لاہور کا رُخ کیا۔ یہیں اُس کے باپ کی ہڈیاں دفن تھیں یہیں اُس کی ماں پیوندِ زمین ہوئی تھی۔ یہیں اُس نے عروج و ترقی کے خواب دیکھے تھے۔ اور یہیں اُس کی عزت و سربلندی کا جنازہ نکلا تھا۔ اُس نے سوچا کہ اسی شہر میں وہ اپنی کھوئی ہوئی دولت تلاش کرنے کی سعی کرے گا۔

لاہور پہنچ کر اُس نے اپنے بوسیدہ اور غلیظ مکان کا جو برسوں سے مقفل پڑا تھا دروازہ کھولا اور چور کی طرح اندر محبوس ہو گیا۔ چھ مہینے وہ اس چار دیواری سے باہر نہ نکلا۔ وہ رہ رہ کر سوچتا تھا کہ تین سال کی قید کاٹ کر بھی اُس کی سزا کی میعاد ختم نہیں ہوئی۔ اب تو وہ گویا عمر بھر کے لئے ایک قیدی تھا جو چھوٹے زنداں سے بڑے زنداں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگر وہ اپنے اعمال کی سزا بھگت چکا تھا۔ تو سماج اُسے کیوں کشادہ دِلی کے ساتھ معاف نہیں کر دیتی۔ جب مقروض اپنا قرضہ ادا کر دے تو ساہوکار کا اُس پر کوئی حق نہیں رہتا۔ ایک مجرم بھی سزا پوری کرنے کے بعد اپنے قرضے سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ پھر کیوں اُس سے وہی سلوک کیا جاتا تھا جو عام طور پر متعدی امراض کے بیماروں سے روا رکھا جاتا ہے۔ لوگ اُس سے ملنا بات کرنا اور اُس کے پاس بیٹھنا گناہ سمجھتے تھے۔ وہ جدھر سے گذر جاتا نفرت اور حقارت سے بھری ہوئی نگاہیں اُس کا یوں استقبال کرتی تھیں گویا وہ طاعون زدہ چوہا ہے جو وبائی جراثیم پھیلانے کے لئے زمین سے نکل آیا تھا۔ چاروں طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی تھی۔ اور لوگوں کے تمسخر آمیز کلمات اُس کے دل میں زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح پیوست ہو جاتے تھے۔ کئی دفعہ محلے کے آوارہ گرد لڑکوں نے اُس کے مکان کے عین سامنے کھڑے ہو ہو کر اُس کو بُرا بھلا کہا تھا۔ اُس نے خوف زدہ ہو کر مکان کا دروازہ بند کر لیا اور دِن کے وقت باہر نکلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ مہینوں گذر جاتے تھے اور اُس کی آنکھیں سورج کی روشنی میں بیرونی دُنیا کے نظارے سے محروم رہتی تھیں۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا تھا۔ لاہور سے چلے جانا اُسے منظور نہ تھا۔ اور یہاں رہنا عقوبت کے اعتبار سے عذابِ جہنم سے کم نہ تھا۔

چھ ماہ کی مسلسل خانہ نشینی کے بعد آج وہ پہلی مرتبہ سورج غروب ہونے سے قبل گھر سے نکلا تھا۔ اُس کا دل بعض معمولی معمولی چیزوں کے لئے بیتاب ہو گیا تھا۔ مدت ہوئی اُس نے پرندوں کے چہچہانے کی آواز

نہیں سنی تھی۔ اُس کی آنکھیں خوش رنگ و خوشبودار پھول دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ وہ ہمیشہ گل و گلزار اور سبزہ زار اور تازہ ہوا کا شوقین رہا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اکثر گھر سے باہر جا کر آبِ رواں کے کنارے بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اب گل و گلزار، آبِ رواں اور سبزہ زار اُس کے لئے ایک بھولا ہوا خواب ہو گئے تھے۔ آج آخرکار اُس نے ارادہ کر ہی لیا کہ وہ زیادہ دیر اپنے آپ کو قدرت کی ان نعمتوں سے محروم نہیں رکھے گا۔ وہ گھٹے بند دل باہر نکل آیا اور دو گھنٹے لارنس گارڈن میں گھومتا رہا۔

رات ہو گئی تھی۔ باغ میں پھول، آسمان پر ستارے اور جھاڑیوں میں جگنو چمک چمک کر تھکی ہوئی نگاہوں کو آسودگی بخش رہے تھے۔ چاندنی روشنی نے سر سے پاؤں تک زمین کو ایک نورانی لباس پہنا دیا تھا۔ نعیم ایک از خود رفتہ انسان کی طرح سب چیزوں کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا پھرتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ باغ سے نکل گیا۔ اُس کی رفتار میں اُس کے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اُس کے پاؤں خود بخود اُسے آگے بڑھائے لئے جاتے تھے۔ وہ دیر تک سڑک پر چلتا رہا۔ برق رفتار موٹریں پاس سے گذر جاتی تھیں۔ لیکن وہ گردوپیش سے غافل اب خیالات میں کھویا گیا تھا۔ کھلی فضا اور تازہ ہوا نے اُس کے دماغ کے بہت سے گوشوں کو جو معطل پڑے تھے از سرِ نو متحرک کر دیا تھا۔ اپنی زندگی کے خوشگوار دور کی کئی بھولی بسری باتیں آہستہ آہستہ یاد آنے لگی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب دنیا کے ہنگامے اُسی شان سے جاری ہیں، نیکی بدی کی باہمی کشمکش اُسی تندی سے قائم ہے، لوگ اُسی جذبۂ رقابت سے مجبور ہو کر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو وہ کیوں گئے گذرے دنوں کا نوحہ خواں بن کر آنسو بہاتا رہے؟ کیوں ماضی کو بھول کر مستقبل کی تعمیر کی طرف متوجہ نہ ہو؟ کیوں گذشتہ سے بے نیاز ہو کر آئندہ کی فکر نہ کرے۔ اُس نے اپنے اعصاب میں زندگی کی نئی حرکت اور خون میں زندگی کی نئی گردش محسوس کی۔

بے خبری کے عالم میں چلتے چلتے وہ نہر پر پہونچ گیا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پتہ ہلنے کی آواز نہیں آتی تھی۔ بلند بالا درخت چپ چاپ کھڑے سنتری بن کر پہرہ دے رہے تھے۔ دائیں بائیں وسیع سبزہ زار گہری نیند سوتے پڑے معلوم ہوتے تھے۔ سامنے نہر آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ اُس کا پانی مہتاب کی روشنی میں پگھلی ہوئی چاندی کے دھارے کی طرح رواں تھا۔ نعیم نے یکایک محسوس کیا کہ اُس کے دل کا تمام بوجھ ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ قدرت کے پاکیزہ حسن سے اس درجہ قریب ہو گیا تھا کہ اُسے دنیا میں کہیں بد صورتی کی جھلک دکھائی نہ دیتی تھی۔ اُس نے اپنی آگ کی طرح تپتی ہوئی پیشانی پر فطرت کے سرد و معطر ہاتھ کا لمس محسوس کیا اور اُس کا مضطرب و بے قرار دل فطرت کی میٹھی لوری کے سحر سے معصوم بچے کی طرح سو گیا۔ اُس کی آنکھیں فضا میں گڑی تھیں اور دماغ آسمان کی سیر میں مصروف تھا۔ خدا جانے وہ کتنی دیر یونہی مبہوت و دم بخود کھڑا رہا۔ پھر ہوش آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی رگ رگ سے مسرت و اطمینان کے چشمے پھوٹ نکلے ہیں، اُس کا دل خوشی سے ناچ رہا ہے اور زبان پر حمد و ثنا جاری ہے۔ اُس کی رُوح نے ماتمی لباس اُتار دیا تھا اور اُس کا غم آن کی آن میں فنا ہو گیا تھا۔

نعیم نے دل ہی دل میں کہا کہ وہ کس قدر نادان تھا کہ یونہی جادۂ مستقیم سے بھٹکتا رہا۔ جب تک فطرت کے خزانوں کے انمول موتی اُس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں دُنیا اُسے کیونکر غریب کہہ سکتی ہے جب تک قدرت کے حسین مناظر دست بستہ غلام کی طرح اُس کا دل بہلانے کو حاضر ہیں وہ کیسے غمگین رہ سکتا ہے۔ جب تک چاند کی پاکیزہ روشنی اُس کی رُوح کی خلوتوں کو منور کرنے کے لئے موجود ہے اُس کا ظاہر و باطن کیوں کر تاریک رہ سکتا ہے۔ گھاس کے زمردیں فرش پر شبنم کے موتی اُس کی ملکیت ہیں، موسم بہار میں بلبل ہزار داستان کی نغمہ پیرائی اُس کی متاع ہے۔ فصلِ گل میں پھولوں کی مہک، کلیوں کی چٹک اور غنچوں کا تبسم اُس کی دولت ہے۔ وہ چاندنی راتوں میں آبِ رواں کے کنارے بیٹھ کر درد و محبت کے گیت گا سکتا ہے۔ وہ ساون کی کالی گھٹاؤں میں بارانِ رحمت سے اپنے دل کے داغوں کو صاف کر سکتا ہے۔ وہ تاروں کی محفل میں دُکھ درد کے ساتھی تلاش کر کے اُنہیں اپنا رازداں بنا سکتا ہے۔ پھر وہ کیوں کہے کہ وہ کارواں سے بھٹکا ہوا مسافر ہے جو یکہ و تنہا مارا مارا پھر رہا ہے۔

وہ انسانوں کی آبادی میں ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر کاسۂ گدائی لئے پھرتا رہا لیکن اُس کی جھولی میں کسی نے خیرات کا ایک ٹکڑا نہ ڈالا۔ وہ جہاں گیا اُس کا خیر مقدم قہر آلود آنکھوں، چبھتے ہوئے طعنوں اور غیظ و غضب میں ڈوبے ہوئے لفظوں کے ساتھ ہوا۔ وہ اپنے دُکھے ہوئے دل کے لئے مرہم کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اُس کی رُوح زخموں سے چور چور تھی اور کہیں سے اندمال نہ ملتا تھا۔ آج قدرت کے شفا بخش ہاتھ نے مادرانہ شفقت کے ساتھ اُن رستے ہوئے زخموں پر ہمدردی و اُلفت کا ایک پھاہا رکھ دیا تھا۔

عاشق حسین بٹالوی

دو غزلیں

(۱)

مرنے دے اگر عشق میں مرتا ہوں تجھے کیا
حدِ غمِ ہستی سے گزرتا ہوں تجھے کیا

الفت میں فغاں ہو کہ تمنا ہو کہ آنسو
جو بات سے بس کی وہی کرتا ہوں تجھے کیا

راس آئے تجھے جینے کی تدبیر مگر میں
مرنے کی تمنا میں جو مرتا ہوں تجھے کیا

یہ تاب کہاں مجھ میں کہ ہو تیری شکایت
شکوہ جو زمانے کا میں کرتا ہوں تجھے کیا

مایوس ہوں دیوار سے سر پھوڑ رہا ہوں
خود اپنی حماقت پہ بپھرتا ہوں تجھے کیا

یہ مان لیا عالمِ پستی سے اٹھا ہوں
پرواز بلندی پہ جو کرتا ہوں تجھے کیا!

تو مجھ کو مٹا زیب اگر دیتا ہے تجھ کو
اختر ہوں میں چھپ چھپ کے ابھرتا ہوں تجھے کیا؟

(۲)

جو غنچہ جس جگہ تھا وہیں کھلکھلا اٹھا
تم مسکرائے کیا کہ چمن مسکرا اٹھا

اے چشمِ مہرباں مجھے اس طرح تو نہ دیکھ
ہر گوشہ میرے دل کا اگر جگمگا اٹھا!

پھر دل کی دھڑکنوں میں کوئی زیر و بم نہیں
للہ آج پھر وہی آوازِ پا اٹھا

خلوت کدے میں نیند کی مستی سی چھا گئی
آنکھیں یہ کون خواب سے ملتا ہوا اٹھا

تم آ گئے تو پھر وہی افسانے چھڑ گئے
تم گنگنا دیے تو سکوں گنگنا اٹھا

خود دار دل کو تیرے بہت ٹھیس لگ چکی
اب آسماں کی سمت نہ دستِ دعا اٹھا

یہ اتصالِ حسن و محبت کا ہے مقام
گا ہے اٹھا گرا کبھی اختر گرا اٹھا

اختر شیرانی

ملک الشعراء حفیظ دہلوی

دکن کا تعلق شعر و سخن اور علم و ادب سے بہت قدیم ہے ایک طرف دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُردو شاعری کا باوا آدم ولی اسی کے دامنِ دولت کا پرورش یافتہ تھا۔ دوسری طرف یہ عزت بھی نصیب ہے کہ اردو کی سب سے پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ماہ لقا بائی چندا اسی کی گود کی پلی ہوئی تھی۔ شاہانِ بہمنیہ۔ سلاطین عادلشاہیہ۔ بادشاہانِ قطب شاہیہ نے ایران سے بڑے بڑے علماء فضلاء اور شعرا کو بلا کر اپنے دربار کو آراستہ کیا تھا۔ نواب نظام الملک آصف جاہ اعظم نے بھی ایران اور ہندوستان کے علماء اور شعرا کو طلب فرما کر اپنے دربار کو زینت دی تھی۔ نواب نظام علیخاں بہادر اور ان کے وزیر باتدبیر ارسطو جاہ بہادر نے بڑی فیاضی سے علماء اور شعراء کی سرپرستی فرمائی تھی اور اپنے زمانے میں چوٹی کے علماء اور شعراء سے دربار کو آراستہ فرمایا تھا۔ نواب سکندر جاہ اور ان کے وزیر کا کیا کہنا۔ بقولِ شیخ حفیظ

شاہ ہے رشکِ سکندر، غیرتِ حاتم وزیر
عرصہ عالم میں ہے کمیاب یہ جوڑا بہت

سکندر جاہ بہادر کو علماء کی صحبت بہت پسند تھی اور راجہ چندو لعل شعرا کے عاشق تھے اور مہاراجہ بہادر نے اپنے دربار کو مشہور اور بے نظیر شعراء سے زینت دی تھی۔ خود بھی شاعر اور قابل تھے اور قدردان سخن بھی۔ ان کے دربار میں علماء اور فضلاء کے علاوہ صرف شعراء تین سو سے زائد تھے اور ایک سو روپے سے ایک ہزار روپیہ ماہوار تک ان شعراء کی تنخواہیں تھیں۔

مہاراجہ چندو لعل ہی نے دہلی سے شاہ نصیر کو طلب کیا تھا۔ شیخ حفیظ دہلوی اور حافظ مشتاق بھی آ گئے تھے۔ اُستاد ذوق بھی تلوا کھا کر رہ گئے۔ دلی کی گلیوں نے نہ چھوڑا مگر مرنے تک یہی کہتے رہے۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بہت قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

شیخ حفیظ دلی کے شرفاء اور سپاہ پیشہ بزرگوں میں سے تھے آبا و اجداد تیغ و جمدھر باندھتے تھے مگر حفیظ نے تیغ زبان کو سان دیکر قلم باندھا اور باضابطہ تعلیم پا کر سند فراغت حاصل کی۔ مولانا عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری اپنے تذکرۂ شعرائے دکن جلد اول میں تحریر فرماتے ہیں "علماء و فضلاء کی خدمت میں ضروری لیاقت حاصل کر کے فنِ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کی طبیعت تیزی میں شعلۂ جوالہ تھی۔ طبع والا و فکر رسا سے "شعر موزون کرنے لگے۔ کلام شیرین و رنگین ہونے لگا۔ معاصرین دیکھکر تعجب کرتے تھے رفتہ رفتہ آپ درجہ اُستادی کو پہنچ گئے۔ سب شعرا" "معاصرین آپکی اُستادی کے قائل ہوئے" صفحہ ۳۵۲۔

افسوس ہے کہ دلی میں حفیظ کو شہرت و ناموری حاصل نہ ہو سکی اور یہ کہہ کر دلی سے چل پڑے۔

ہُوا ہُوں گرم سفر اس لئے برنگِ گہر
کہ آبرو کو کرے ہے مری وطن ٹھنڈا

دِلّی سے چل کر اورنگ آباد پہنچے وہاں راجہ مہپت رام سے انہوں نے آنکھیں بچھا دیں۔ حفیظ بھی وہیں رہ پڑے ۔ مگر جب مہپت رام ہی کا کام بگڑا تو مجبوراً اورنگ آباد چھوڑنا پڑا۔ کشش آب و دانہ نے حیدر آباد پہنچا دیا۔ مہاراجہ چندو لعل نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہزار روپیہ تنخواہ مقرر فرمائی اور بڑے اعزاز و اکرام سے رکھا انتہا یہ کہ

ملک الشعرا بنا دیا[1]۔

خانِ جہان خاں اپنی تاریخ گلزارِ آصفیہ میں شیخ حفیظؔ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مصاحب چندولال مہاراجہ بہادر شدہ پسند خاطر گردیدہ، وخیلی مزاج شدہ وبسیار کساں را نوکر کنانیدہ ممنونِ منت ساخت و سخن خیر"

"درباب ہر آشنا وبیگانہ فروگذاشت نمی کرد، بدر ماہہ یک ہزار روپیہ ماہ بماہے سرفراز بود، ہر روز پوشاک نو بنو حاضر دربارے شد"

"..... ہر ہر شعرش تشنگان مضامین را حکم آبِ سرد وشیرین با گلاب وارد" (صفحہ ۴۴۹)

مولانا ملک لکھنوری کا بیان ہے کہ حفیظؔ نے ۱۲۴۷ھ میں انتقال کیا۔ اس سے زیادہ حالات مل نہیں سکتے۔ حفیظؔ کے خاندان، تلمذ، وغیرہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ شیر محمد خاں ایمانؔ کے کلام کا انتخاب شائع کرتے ہوئے سید محمد صاحب قادری ایم، اے نے حفیظؔ کو ایمانؔ کا شاگرد ظاہر کیا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا کہ کس بنا پر انہوں نے حفیظؔ کو ایمانؔ کا شاگرد تصور کیا ہے۔

میری دانست میں سید صاحب نے کچھ زیادہ چھان بین کی زحمت گوارا نہیں کی ہے یونہی کسی خاص خیال کی بنا پر لکھ دیا ہے حفیظؔ ممکن ہے کہ ایمانؔ کی وفات (۱۲۲۱ھ) سے پہلے حیدرآباد آئے ہوں مگر ان کی شاگردی ثابت نہیں ہے۔ حفیظؔ نے ایمانؔ کی بعض غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور ایمانؔ کا ایک آدھ مصرعہ بھی اپنے مقطعے میں استعمال کیا ہے مگر اس سے شاگردی کا پتہ نہیں چلتا۔ حفیظؔ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "ادبی الحاد" میں مبتلا تھے فدائے سخن میر تقی میرؔ پر انہوں نے کئی جگہ چوٹیں کی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

حفیظؔ اشعار ہیں معجز نما اہل کشش ایسے
کہ گویا گور سے تم نے جناب میرؔ کو کھینچا

حفیظؔ اقبال شاداںؔ سے لکھی ہے وہ غزل تم نے
جسے تعویز کر ڈالیں جناب میرؔ گردن میں

ہے جہانِ سخن بزم جہاں ورنہ پتہ خاک
کیا جانئے کس فکر میں ہیں میرؔ اکیلے

بھلا جو شخص فدائے سخن کو گور سے گھسیٹ لے وہ بھلا ایمانؔ پر کیا ایمان لاتا؟ ممکن ہے کہ درباری تعلقات یا حیدرآباد کے قیام کی وجہ سے حفیظؔ اور ایمانؔ میں دوستی ہوگئی ہو مگر شاگردی اور پھر ایک دکنی شاعر کی شاگردی ایسے "ملحد لوب" کے لئے جو دکن کی اُردو کو خاطر میں نہ لاتا ہو قرینِ قیاس نہیں۔ حفیظؔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

اُردوے خاص کیوں نہ ہو میری زباں پہ اے حفیظؔ
ساکن ملک ہند ہوں اہلِ دکن تو میں نہیں

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی اردو کو اردوئے خاص سمجھتے تھے اور ساکن ملک ہند ہونے کا فخر کرتے تھے اور "اہل دکن" کی زبان کو ہیچ جانتے تھے حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں دکن میں اُردو کا پتلا حال تھا خواص کی زبان پر دلّی کا اثر تھا مگر عوام قدیم دکنی بولی بولتے تھے اور حافظ مشتاق وغیرہ کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان کا اثر بھی دکنی اردو پر پڑنے لگا تھا۔ اسی لئے حفیظؔ نے "اہل دکن تو میں نہیں" کہہ کر اپنی سکونت ہند اور اُردوئے خاص پر فخر کیا ہے۔

حفیظؔ کو شاید مرزا علی لطفؔ (صاحبِ گلشنِ ہند) سے عقیدت تھی چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

حفیظؔ الطاف ہے مرزا علی لطفؔ کا مجھ پر
سبب یہ ہے کہ بندہ ہوں جناب شاہِ مرداں کا

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظؔ اور لطفؔ سے حیدرآباد میں یکجائی رہی ہے اور مراسم بھی دوستانہ یا عقیدت مندانہ تھے۔ مگر کوئی اس شعر سے حفیظؔ کی شاگردی ثابت کرنا چاہے تو ظلم ہوگا۔

افسوس ہے کہ کسی تذکرہ میں بھی شیخ حفیظؔ کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں خصوصاً شمالی ہند کے تذکرے تو حفیظؔ کے حالات سے بالکل معرا ہیں۔ حیدرآباد کے بعض قدیم بزرگوں سے میں نے صرف اتنا سنا ہے کہ حفیظؔ نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئے۔ بیچاروں کی قبر کا پتہ بھی نہیں ملتا۔ ان کے فرزند شیخ حیدر جو حیدرؔ تخلص کرتے تھے حیدرآباد ہی میں تھے۔ حضرت فیضؔ کے معاصر اور مدمقابل تھے۔ دونوں میں خوب چوٹیں چلتی تھیں۔ مشہور ہے۔ کہ ایک دفعہ سرِ مشاعرہ حیدرؔ نے یہ مصرعہ سُنایا۔

فیضؔ ہے جوتیوں میں حیدرؔ کے

---

[1] تذکرۂ شعرائے دکن صفحہ ۳۵۳ جلد اوّل۔

چونکہ غزل منقبت کے رنگ میں تھی اسلئے مصرع فیض صاحب پر چسپاں تو ہو گیا مگر فیض صاحب کو خاموش رہنا پڑا۔ ایسی چوٹیں دونوں میں خوب چلی ہیں مگر افسوس ہے کہ کسی نے ان واقعات کو جمع نہیں کیا اور اگر جمع کیا بھی ہو تو میری پہنچ ان تک نہ ہو سکی۔

مشہور ہے کہ شیخ حفیظ کے چار دیوان ہیں اسوقت دو قلمی دیوان خود میرے پاس موجود ہیں ایک کسی خوشنویس کے ہاتھ کا صاف کیا ہوا ہے اور ایک معمولی خط میں رواردی میں لکھا گیا ہے جس میں جا بجا کاٹ چھانٹ بھی ہوئی ہے۔ دونوں دیوان پر کاتب کا نام ہے، اور نہ سند کتابت۔ یہ دونوں دیوان مکمل و مردّف ہیں۔ ثانی الذکر نسخے کے متعلق مجھے شبہ ہے کہ کہیں یہ حفیظ ہی کے ہاتھ کا صاف کیا ہوا نہ ہو۔ حفیظ کا ایک دیوان کتب خانہ آصفیہ میں بھی موجود ہے جس میں متفرق غزلیں ہیں۔ افسوس ہے کہ باوجود کوشش کے اور دو دیوان مجھے نہیں مل سکے۔

دونوں دیوان کے مطلعے جو حمد میں ہیں نقل کئے جاتے ہیں۔

یہ کون و مکاں عکس ہے آئینہ کُن کا + کیا کیا نظر آتا ہے طلسمات سخن کا

یہ آسماں حباب ہے دریائے ذات کا + خورشید ایک ذرّہ ہے اسکے صفات کا

ان دونوں دیوانوں میں دو ہی شعر حمد میں اور دو ایک نعت اور ایک آدھ منقبت میں ہیں اور بس۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف حفیظ کی دلچسپی زیادہ نہ تھی۔

اسے صلِّ علیٰ راہبر ساکن سدرہ پیدا نہوا کوئی بشر آپ کی دہن کا

ہے غبار اسکا کیمیا جس کو اُلفت بوتراب نے کھینچا

حفیظ کا تعلق نواب سکندر جاہ بہادر کے دربار سے بھی تھا اور سکندر جاہ بہادر کی مدح میں بھی کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ دربار سکندر جاہ کی گدائی پر شکر کرتے ہیں۔

صد شکر حفیظ اِس درِ دولت کا گدا ہوں + دارا جسے کہتا ہے سکندر مرے داتا

مگر حفیظ کا مستقل تعلق [illegible] ہے دونوں دیوانوں کی آدھی سے زیادہ غزلیں ایسی ہیں جنکے مقطعے چندولعل بہادر کے ذکر سے مملو ہیں چند آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

بقول حضرتِ شاداں حفیظ دیکھ لے کل

زمانہ رنگ بدلتا ہے آن آن نیا

حفیظ اب تک بجز دہلیزِ شاداں + تکا ہے آستانِ مفلس نے کِسکا

زرافشاں ہے تمہارا پنجہ خورشید اے شاداں

کہ ہم نے آپ کو اس وقت کا راجہ کرن دیکھا

مقدر ہو تو شاداں موتیوں میں تول دیتے ہیں

دوشالہ چیز کیا ہے مال کیا کمخواب کا جوڑا

شاہ ہے رشکِ سکندر غیرتِ حاتم وزیر

عرصۂ عالم میں ہے کم یاب یہ جوڑا بہت

اس قطعہ کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باریابی کے وقت مہاراجہ چندولعل کو پیش کیا گیا ہے۔

حواہاں ہنر یار ہیں بازار جہاں میں + اسباب مہیّا ہے یہاں بے ہنری کا

تو ہو جو خریدار تو خاطر جمعی ہو + سر مشق ہوں عالم کی پریشاں نظری کا

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے حفیظ کی زندگی افلاس اور سختی میں گذری کہتے ہیں۔

جاتے مئے خوں پیا میکدۂ دنیا میں + مجھ سا تو ایک تو اے چرخ بلا نوش نکال

سختئ لوسے سدا در پیش آیا آسمان + مل گیا ہاتھ اپنا جس سے پنجۂ فولاد تھا

سرگزشت اپنی سناتا کسکو عالم میں حفیظ + جسکو دیکھو شمع ساں سرگرم کار خویش تھا

گردشِ گردوں سے ہے راحت بے نیاز و تکلّے تپش

طفل سو جاتا ہے جب گردش میں آیا پالنا

معلوم ہوتا ہے کہ آدمی غیور اور خوددار تھے مہاراجہ چندولعل کے پاس پہنچنے کے بعد ایک ہزار ماہوار ہو گئی جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ دکن میں ایک ہزار تنخواہ شاعر کی حیثیت سے ابتداً حفیظ کو ہوئی ہے۔ ان کے بعد اُستاد داغ کو اب استاد جلیل پاتے ہیں۔ ان تینوں کے سوا کسی شاعر کو اسکی شاعری کے لحاظ سے ایک ہزار تنخواہ نہیں ملی۔ شمالی ہند میں میر سے امیر تک فاقہ کشی ہی میں مبتلا رہے۔ دربار بہادر شاہ سے بھی اُستاد ذوق کو کچھ نہ ملا۔ ملک الشعرائی کے ساتھ تنخواہ مقرر ہوئی تو پانچ روپیہ[1] غالب بیچارے عمر بھر تنگی و ترشی سے گزارتے رہے۔ دربار شاہ سے انہیں سرفرازیاں بھی ہوتی تھیں تو دال، سیم کے بیج، بیسن کی روٹی اور بس۔

شعرا میں خان خاناں کی فارغ البالی کو بھی شمار کیا جاتا ہے مگر وہ انکی شاعری کی وجہ سے نہ تھی۔ شاعری ان کا پیشہ نہ تھا بلکہ دفع الوقتی کا مشغلہ تھا۔ شعرا میں شاعر کی حیثیت سے انہیں دو تین حضرات نے عروج پایا ہے۔ جن میں سب سے پہلے حفیظ ہیں ان کے بعد شاہ نصیر کا نمبر آتا ہے مگر

[1] یہ بہادر شاہ کی ولیعہدی کا واقعہ ہے بادشاہی میں استاد ذوق کو سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ (ادارہ)

ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ شاہ نصیر کی نہ تھی۔ دیکھئے کہاں سے کہاں بات پہنچی ذکر تھا حفیظ کی غیرت اور خودداری کا یعنی باوجود ایک ہزار تنخواہ کے ملک الشعراء دکن ہونے کے حفیظ کا ضمیر مطمئن نہ تھا کہتے ہیں۔

مردود بارگاہِ قناعت کیا مجھے ۔ خانہ خراب ہو ہوسِ عز و جاہ کا

معلوم ہوتا ہے کہ اس ضوقِ غلامی کو قطعاً ناپسند کرتے تھے اور آزادی کے مشتاق تھے۔

یاد ایام کہ تھا ساتھ سبکسار و نکا ۔ اپنا جوں نکہت گل پھاند نا دیوار و نکا

ظاہر ہے کہ وطن چھوڑ کر جب دربدر کی خاک چھانتے ہوئے سرکاری پاؤں پہنچ کر کے دکن پہنچے ہونگے تو حفیظ کی عمر بھی خاصی ہوگئی تھی ہوگی۔ ان کے دو ایک شعر بھی بڑھاپے کی چغلی کھاتے ہیں۔

دل کو ہے عالمِ پیری میں خیالِ خُوباں
اب بھی اس خاک تلے ڈھیر ہے انگاروں کا

آنکھوں میں تصوّر دمِ پیری ہے بُتاں کا
برخاست قریب آگئی دربار بھرا ہے

مگر اس بڑھاپے نے انہیں "نقادِ حسن" بنادیا تھا اور مذاقِ حُسن بھی ذوقِ نظر کے ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوگیا تھا کہتے ہیں

مَیں جس پر ڈالتا ہُوں آنکھ گر جاتا ہے نظروں سے
خدا جانے مرا دِل کس بُتِ دِل خواہ پر آیا

حفیظ کے متعلق مشہور ہے کہ سنت الجماعت تھے مگر نہایت صُلح کُل اور محبِ اہلِ بیت۔ بعض فقیروں کے پاس حفیظ کے منقبت بھی دیکھے گئے ہیں اور ان لوگوں کا بیان ہے کہ شیخ حفیظ دہلوی ہی کا کلام ہے۔ خود ان کے کلام سے انکی وسیع المشربی نمایاں ہے۔ شیخ و برہمن دونوں بننا چاہتے تھے۔

بود و باشِ حرم و دیر رہی اس ڈھب سے
برہمن شیخ مجھے، شیخ برہمن دیکھا

شیخ حرم سمجھتا ہے ہمسر برہمن مجھے
اور شیخ جانتا ہے دیا سومناتھ کا

مگر آخر میں شیخ و برہمن دونوں سے متنفر ہوگئے تھے فرماتے ہیں۔

نہ دیکھی ہم نے بُوئے دوستی شیخ و برہمن میں
جنیئو مُدتوں ڈالے رہے خرقہ پہن دیکھا

حفیظ کی طبیعت میں اوباشی اور رندی نہ تھی بلکہ اخلاقی عنصر غالب تھا سینکڑوں شعر اخلاقی رنگ میں ڈوبے ہوئے ملتے ہیں۔

وصفِ گہر و لعل پہ کب اس کی نظر ہے
جو شخص خریدار ہے انسان کے گُن کا

آئینہ سے اخذ کر نظارۂ عالم کا لطف
صورتِ ہستی ہے جب تک دیکھنا اور بھالنا

دِلا جو ہے طلبِ آبرو تو مضطر رہ
وہی ہے گوہرِ غلطاں جو بے قرار رہا

وہ لوگ ہیں دُنیا میں حفیظ اہلِ قناعت
مطلب نہ کہیں جو سفر اور نگ سے ملکر

سر نیاز ہے یاں اور غرورِ تاج ہے واں
ہے آسمان و زمین کا گدا و شاہ میں فرق

جب تلک جان ہے تصویر نظر آتا ہے
ورنہ کب دید کے قابل ہے بشر کا خاکہ

غیرت سے جانبِ رُخِ محبوب دیکھنا
ناپائدار ہے یہ چمن خُوب دیکھنا

ہر تنزل کو ہے اِک رنگ ترقی دہر میں
اب جہاں گلشن نظر آتا ہے آگے بیشہ تھا

یہ دُنیا فاحشہ ہے اس پہ مت میلانِ خاطر ہو
ہر اِک شب کوان ہے مردُود کا شوہر نہیں ہوتا

حفیظ کی طبیعت بہت منجھی ہوئی تھی مشقِ سخن خاصی اور دُنیا کے گرم و سرد نے دِل میں ایک گداز بھی پیدا کردیا تھا۔ ملاحظہ کیجئے۔

مَیں جو کُوچے میں گیا شیشہ گروں کے اِک روز
پُوچھا اِک شخص نے کیا دِل ہے تمہارا ٹُوٹا

جب میں دکھلایا تو کہنے لگا افسوس افسوس
اس کی کیا خاک ہو تدبیر کہ سارا ٹُوٹا

ہم عدم میں آپ کو بیٹھے تھے یکسُو کھینچکر
ہستئ فانی کہاں لائی ہمیں تُو کھینچکر

مجھے دین و دُنیا کی کب جستجُو ہے
تری آرزو ہے تری آرزو ہے

ہزاروں رنگ کی نیرنگیوں میں رُوبرو آیا
غرض ہمنے بھی تاڑا یار جس قالب میں تُو آیا

یُوں تو حفیظ کا سارا کلام اُستادانہ اور کہنہ مشقی کا نمونہ ہے۔ مگر

مقطع شعر غضب کے کہے ہیں اس شعر کو پڑھئے کس قدر صاف ہے۔

بٹھے بٹھائے مفت میں کاہش جان مول لی
اے دل ناسخن شنو کا شکے ہو ہُوا ترا

اور سُنئے کتنا صاف شعر کہا ہے۔

ہم کو کنج قفس سے بُو آئی ! کیا نسیم بہار تو آئی ؟

اِس شعر کو ملاحظہ کیجئے۔

ہزاروں نالۂ محشر نُما تہ لب سے تھے
کسی کا پاس ادب تھا کہ میں خموش رہا

نالۂ محشر نُما کی وضاحت یُوں کرتے ہیں۔

خرمن دہر پھونک دُوں برقِ فغانِ گرم سے
نالۂ بے اثر کروں مُرغِ چمن تو مَیں نہیں

شعر ملاحظہ ہو کیا موتی پروئے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہُوں کہ یہ بالکل اچھوتا مضمون ہے۔ ذیل کے پامال خیال کو اس نئے انداز سے ادا کرنا حفیظ ہی کا کام تھا

تجھ سے اَے نیساں مسلسل بن سکے موتی کہاں
سیکھ آنکھوں سے مری سلکِ گُہر کا ڈھالنا

دیکھئے اور ایک پامال مضمون کو کس عمدگی سے اچھوتا بنایا ہے۔

اپنے میں رقیبوں میں اِک فرق سراپا ہے
دستار کے ہم گُل ہیں وہ پاؤں کے چھالے ہیں

دستار کے گُل کہکر اپنی سربلندی ظاہر کی مگر یار کے عزیز خاطر جو رقیب رہے تو پاؤں کے چھالے بنا ڈالے کہ یار انہیں ٹھیس بھی لگنے نہیں دیتا۔ بالکل نیا خیال ہے۔ اشک ریزی کے مضمون میں ایک اچھوتا پن اور بھی پیدا کیا ہے جو بہت خوب ہے۔

بوقت اشک ریزی کب اٹھا سکتے ہیں گردن ہم
کہ جپتے ہیں تمہارے نام کی آنکھوں سے سمرن ہم

آنکھوں سے سمرن جپنا ایک انوکھی تشبیہہ ہے۔ تک کا استعمال حفیظ نے بہت کیا اور نہایت عمدگی سے کیا ہے۔

اُس دستِ حنائی کو کھینچا تو لگے کہنے
تک دیکھ تو اے ناداں یہ پھول کی ڈالی ہے

کل جو تک گھر سے وہ غارت گر ایماں نکلا
دِل لئے ہاتھ میں ہر گبرو مسلماں نکلا

غالب اپنے محبوب کو ڈراتے ہیں کہ

ہم سے کھل جاؤ بوقت مئے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑینگے رکھ کر عذر مستی ایک دن

مگر حفیظ کا محبوب انکے پہنچتے ہی آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو سویا ہُوا ظاہر کرتا ہے اور حفیظ کس مزے سے کہتے ہیں کہ حضور آنکھیں کھول دیں ورنہ کمترین گستاخی کر بیٹھیگا۔

دم چرائے آپ جو لیٹے ہیں مجھ کو دیکھکر
یہ گماں ہے خواب کا اس کو یقیں ہو جائیگا
آپ منہ کھولیں تو کھولیں اپنا اپنے ہاتھ سے
ورنہ پھر گستاخ خدمت کمترین ہو جائیگا

آجتک کسی نے دِل نہیں جھٹکا تھا حفیظ جو دل پکڑ کر جھٹکتے ہیں تو ہر اِک زخمِ دِل سے پیکان نکلتے ہیں یہ بھی نیا مضمون ہے۔

ترکشِ تیر مژہ تھا دِل صد چاک اسیر
دِل جو جھٹکا تو ہر اِک زخم سے پیکاں نکلا

غالب فرماتے ہیں۔

روا ہے کونسے مشرب میں یہ لسے عشقِ نامنصف
دِل پرویز خوش ہو خاطر فرہاد محزون ہو

اور حفیظ اسی مضمون کو یُوں ادا کرتے ہیں کہیں یہ نہ سمجھئے کہ حفیظ نے سرقہ کیا ہے۔ حفیظ کا شعر غالب سے پہلے کا کہا ہُوا ہے۔

جان فرہاد گئی وصل ہُوا خُسرو کو
عقل حیراں ہے مری عشق کے انصاف کو دیکھ

مومن خاں کا ایک مایۂ ناز شعر ہے جس پر غالب اپنا پورا دیوان نثار کرنے کو تیار تھے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا + جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اسی مضمون کو حفیظ نے یُوں ادا کیا ہے۔ مومن کی بات تو پیدا نہ کر سکے مگر خوب شعر کہا ہے۔

شکل آنکھوں سے تِری جاتی نہیں
کروٹیں لیتا ہُوں نیند آتی نہیں

شعر ملاحظہ ہو کس قدر بلند شعر ہے

دلبستگی ہے زندگیِ مستعار سے
میرے خیالِ خام کا اسلوب دیکھنا

چند شعر اور ملاحظہ کیجئے۔

کب جنوں چاہتا ہے خودداری، ہوش آتے ہی عشق کے کھسکا
ہم آ کے یاں چمن مُصلّے میں اُداس رہے، کہ عندلیب نئے گل نیا ہے، باغ نیا
تنگ آغوش میں لیا کس نے، تو جو اے گل عرق عرق ہے آج
اسیری ہے آرائشِ حُسنِ خوباں، لگا کر حنا دست و پا باندھتے ہیں

نہیں خود رفتگی موقوف میخواری پہ اے ہمدم
جو اپنے حال میں ہو مست مستانہ کہا کیجئے

دِل پک گیا ہے اس کا جو تجھ کو چاہتا ہے
پہلو پہ ہاتھ رکھ کر پہروں کراہتا ہے

کیا گلستاں سے کِھلے آفت رسیدہ آدمی
غنچۂ تصویر ہے خاطر کشیدہ آدمی

مکھڑا دِکھا کے وہ جو جھروکے سے ٹل گیا
میں دِل سنبھالتا ہی رہا جی نِکل گیا

سیا چاکِ جگر تارِ نگاہِ یار نے اپنا
بحمد اللہ کہ اِس وحشی کو اندازِ رفو آیا

گلشن ہے مئے ہے ابر ہے، ساقی ہے اے حفیظ
ایسے میں کوئی برق کا پرکالہ چاہیئے

شاہ نصیر اور ناسخ کے تصدق میں اس زمانے کی شاعری الفاظ کا گورکھ دھندا اور قافیہ پیمائی کی حد تک رہ گئی تھی۔ حفیظ کے دکن آنے سے پہلے شاہ نصیر آگرچلے گئے تھے۔ دربار چندو لعل میں بھی ادق گوئی اور مشکل قافیوں میں خیال آرائی معراج شاعری سمجھی جاتی تھی۔ مجبوراً حفیظ کو بھی یہ وتیرہ اختیار کرنا پڑا مگر اُستاد اور واقعی ملک الشعراء تھے ادق زمینوں اور مشکل قافیوں میں بھی وہ وہ غزلیں کہیں کہ معاصرین کے دانت کھٹے کر دیئے چند ادق زمینوں کے شعر تر ملاحظہ کیجئے۔

اپنے سرمایہ کی کرتے ہیں حفاظت خاکسار
دانۂ خرمن ہمارا مور کا انڈا ہوا

ہوا ہوں گرم سفر اسلئے برنگ گہر
کہ آبرو کو کرے ہے مری وطن ٹھنڈا

اونے پونے ٹال دیتا ہوں کہیں دل کو حفیظ
دیدہ و دانستہ کیوں دشمن بغل میں پالنا

میں عدم میں بھی نہ دردِ عشق سے آزاد تھا
داغ جوں لالہ مرے سینے پہ مادر زاد تھا

ہے کس کو تقاضائے جفائے چرخ کہن سے
کرتا ہے جواں مرد کہیں پیر سے جھگڑا!

نجد میں تکیہ بنایا قیس بھی درویش تھا
چھوڑ بیٹھا پہلے ہی دُنیا مآل اندیش تھا

کھنچی ہُنرِ صاحب راحت نہ چھپی
ایک رکھتا ہے ہُوا، لاکھ برس کا پنکھا

واہ رے جوشِ جنوں تیری سلاسل شکنی
حلقہ زنجیر کا کرتے ہی اشارا ٹوٹا

ہے بزرگوں کو رہ انصاف میں سنجیدگی
کوہ میزانِ عدالت کا دھڑا بن جائیگا

عرشِ اعلےٰ پر چڑھا آہِ رسا کا باڈٹا
باندھتا ہے کیا ہُوا، اپنا ہوا کا باڈٹا

ہے برسرِ پرواز سدا مُرغِ معانی
ہر چند اسے پنجۂ ادراک میں داہا

دِل کو منظور ہے اس ابروئے خمدار کی موت
آبرو مرد سپاہی کو ہے تلوار کی موت

لے چل اے جوشِ جنوں جانب صحرائے وسیع
دامنِ دل کو مرے جانب گلزار نہ کھینچ

ہے گرم سوزِ آتشِ عشقِ بُتاں سے دل
جوشِ شرارِ سنگ سے ہے یہ کباب سُرخ

گھوڑے کی اگر باگ لے میداں میں شلوآں
عرصہ نظر آتا ہے ابھی تنگ ہوا پر

تُرش رُوئی سبب قطع ملاقات ہوئی
شاید اُس چینِ جبین کے ہے شکن میں مقراض

زخم گویا ہیں تن عاشق دِل گیر کے پھول
ہیں یہ کترے ہوئے قاتل ترِی شمشیر کے پھول

حق نے بخشا ہے جنہیں پردہ عصمت بعین
باہر آ سکتی نہیں ان کے محل کی مکھی

صانع نے عجب حُسن سے پیوند کئے ہیں
ہر چند ہیں اعضائے بشر خاک کے ٹکڑے

دیکھئے کیسی کیسی سنگلاخ زمینوں میں گلفشانی کی ہے اور کیسے کیسے پھول

لھاتے ہیں۔ قافیوں کی غرابت اور ردیف کی ثقالت کے باوجود اس قدر شستہ اور رفتہ شعر کہنا حفیظ ہی کا کام تھا۔

زبان پر حفیظ کو خاصا عبور تھا محاوروں کا استعمال بھی بہت کرتے تھے روزمرہ نہایت اچھا تھا چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

اُس نے برقعہ اٹھا دیا جونہی ✦ انفعال آفتاب نے کھینچا

آہ پروانہ بیچارا شمع کی لو میں مُوا
عاشق جانباز تھا اپنی تگ و دو میں مُوا

دل کو جب وہ مانگتا ہے جی کہے ہے ٹالنا
اور غیرت کا تقاضا ہے اسے دے ڈالنا

آپ کا عاشق جاں باختہ میں ہُوں ایسا
کہ نہ فرہاد ہی ایسا تھا نہ مجنوں ایسا

دے ہے جناب خضر کو تعلیم رہبری
وا ماندہ کاروانِ محبت کی راہ کا

شبِ فراق مبدّل بہ عیش ہو کیونکر
تم ایک عذر نئے آتے ہو میری جان نیا

چمن میں صبح خراماں جو وہ نگار رہا
نہ گل کو ضبط نہ بلبل کو اختیار رہا

تپش دِلکو نہیں ذوق ہواداروں سے
نمِ مژگاں ہے مرے واسطے خس کا پنکھا

جو سر میں جنوں رہا کرے گا
آنکھوں میں بھی خُوں رہا کرے گا

گر جانتا ہو جا ئینگے دشمن میرے غمخوار
کاہے کو کسی شوخ سے میں آنکھ لڑاتا

ناتواں دل کو محبت کا قرینہ آیا
موز کے ہاتھ سلیماں کا نگینہ آیا

نہ اس وحشت سرا میں کارواں تھمتا نظر آیا
جمایا جس نے بستر آج کل رمتا نظر آیا

مَیں نے چاہا کہ کروں عرض لگے فرمانے
کشف ہیں دِل پہ مِرے آپ کے اظہار تمام

وقت پر آپ نہ آئے تو نہ آئے صاحب
خیر اُنکا نہ رہا بندۂ سرکار کا کام

تا بہ نیا جسل آ چکی تھی دیکھنا برگشتگی
پھیر لائی گردش تقدیر نہ جوں پیچ میں

شراب خوار ہیں خمیازہ آپ کھینچیں گے
ہمارے جُرم کا زاہد تو کچھ کفیل نہیں

دورِ اوّل سے رہیں آخر تلک سرشاریاں
واہ رے جامِ محبّت تیری صنعت کاریاں

گر چڑھائیں آستیں دل سے اُتر جائے چمن
کچھ قیامت دست گل خوردہ کی ہیں گلکاریاں

اگر ابر مژہ یُوں گرم باراں ہو تو پھر اپنا
تن خاکی ہَوا ہو جائے گا دو چار ہی دن میں

ہے تصوّر اس کا ان آنکھوں میں آ جائے نہ خواب
ہم اِسی وسواس میں آٹھوں پہر سوتے نہیں

کیا تعجب ہے کہ ہنستا ہُوا آ جائے وہ شوخ
گدگداتی ہے میری آہ اثر کا پہلو

دل کی خوبی کہوں کہ آنکھ کا وصف
ہائے خانہ خراب ہیں دونوں

فقیر لوگ ہیں بابا جمال کے مشتاق
بھلا ہے دیکھ لیں صورت جو گاہ گاہ تیری

مجھے اے رشکِ گلشن کس نے تنگ آغوش میں کھینچا
برنگ گُل تری مسکی ہوئی سوجاسے چولی ہے

شب کو ہم آغوش تھا رشکِ چمن کوئی حفیظ
بھینی بھینی عطر کی آتی ہے خوشبو ہر گھڑی

تِری طلب سے طلبگار ہے میرا عالم
جو تُو نہ چاہے تو پیارے عزیز ہوں میں کسے

شُکر ہر ایک حال اس کا ہے
جان اس کی ہے مال اُس کا ہے

مَیں تو مریضِ ہجر کی حسرت پہ مرگیا
جو شکل دیکھ یار کی جی سے گزر گیا

آنکھوں سے خواب دِل سے شکیب اور جی سے چین
جاتا رہا وہ جیسے ملا کر نظر گیا

چڑھتا نہیں کسی کی نگاہوں میں زینہار ✦ جو کم نصیب یار کے جی سے اُتر گیا

پی کے پیمانۂ مئے ہوش میں آ !
شمع رُو خانۂ آغوش میں آ !

مشتاقِ غفلت اے دل رہنا نہ اس سرا میں
سُنتا ہے او مسافر سویا یہاں سو چوکا

یہی ہوگا ملوگے غیر سے ہم کو جلاؤگے
اجی بس بخشئے گا بندہ پرور اور کیا ہوگا

جوشِ جنون یہ ہے کہ کسی غمگسار نے
دامن مرا سیا کہ گریبان پھٹ گیا

مَیں نے حفیظ کے اشعار ذرا فراخدلی سے نقل کئے ہیں کیونکہ نہ تو حفیظ کا کلام منظرِ عام پر آیا اور نہ تذکروں ہی میں نقل کیا گیا یہ انتخاب اسلئے زیادہ کیا گیا ہے کہ حفیظ پر پہلا مضمون ہے اور دنیائے ادب میں پہلی بار اس ملک الشعرائے دکن کو پیش کیا جا رہا ہے حفیظ کی طبیعت میں غور و فکر کا مادہ بھی تھا اکثر اشعار فلسفیانہ رنگ کے بھی ملتے ہیں تصوّف کی چاشنی سے بھی بے بہرہ نہ تھے۔

ہر منزل کو ہے اک رنگ ترقی دہر میں
اب جہاں گلشن نظر آتا ہے آگے بیشہ تھا

مانع دیدار تھا پردہ تعین کا حفیظ
اُٹھ گیا جس دم کہ وہ پھر اور ہی نظارہ تھا

دیکھئے فطرت انسانی سے کسقدر گہرے مطالعہ کے بعد کہا ہے۔

مشکور نہ ہو آپ سے مل جائے اگر خلد
یاں حُور بھی اُترے تو چڑھاتا ہے بشر ناک

جہاں تک سخت دِل ہیں فی الحقیقت صاف ظاہر ہیں
کہاں کا فرِ بُتوں کا ہم نے آئینہ بدن دیکھا

مگر اس کے ساتھ حفیظ کی طبیعت میں خشونت نہ تھی بلکہ زندہ دلی اور خوش باشی کا موڈ نظر آتا تھا۔ مذاق بھی خوب کرتے ہیں۔

چلنے پھرنے جب لگا اُن کا مریض عشق کچھ
آپ فرمانے لگے ہنس ہنس کے مشٹنڈا ہُوا

رکھا تھا ہاتھ نبض پہ اس نے کہ ہنس پڑا
بیمارِ عشق دیکھ کے چہرہ حکیم کا

فکرِ دوزخ کچھ نہیں درد و الم پر ہے معاش
ساکن کوئے بتاں بیکنٹھ باشی لوگ ہیں

عجب مستانہ موسم ہے کہ بے باکانہ ہر گارو
اُڑاتا ہے گلال اِک ایک پر کہتا ہے ہولی ہے

حفیظ نے ایک لفظ "گھر بسے" یعنے گھر کے بسنے والے خانہ نشین یا خانگی یا پردہ نشین کے معنی میں نیا تراشا ہے کہتے ہیں۔

کر کے ان گھر بسوں کا عشق حفیظ
دِل مرا مُفت میں خراب ہُوا

اب مَیں حفیظ کے اس قطعہ پر اپنے مضمون کو ختم کرتا ہُوں۔

خط میں کچھ حُسن طلب تھا نہ سوا اسکے جسے
ما بخیر اور سلامت بشما کہتے ہیں
تس پہ تشہیر کیا قاتل بیچارہ کو
آپ فرمائیے قبلہ اسے کیا کہتے ہیں

تسکین عابدی

رباعی

اُٹھے وہ فضا میں ہلکے ہلکے بادل
اُترے ز افلاک سے یہ ڈھلکے ڈھلکے بادل
لو تیار شدہ ہوا سے چھینٹوں سے
ساغر کی چھلک کے ہیں چھلکے بادل

جگن ناتھ آزاد

خلشِ تاثر

خاموش ہوا بھیڑوں کا گلہ چلتے چلتے ممیا کر — جا پہنچا شاید باڑے میں بُو سی رستے میں پھیلا کر
چپ چاپ کھڑا ہے دُور اُدھر وہ جنگل کالی چیلوں کا — سرسبز پہاڑوں کو پُرہول بنانے والی چیلوں کا
آواز نہیں آتی اب جھیل کی جانب سے مرغابی کی — سنسان فضا بے جان ہوا میں ہے لرزاں روح خموشی کی

یوں لائی دوش پہ لاش سی کیا رنگیں دن کی بربادی کی
یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی!

قدرت کے سکوتِ مجسّم کی اس ہیبتِ آرائش سے — وادی کے ذرّے ذرّے کی ہم آہنگی کی نمائش سے
ہر نقش شجر، ہر فیل نما پتھر، دنیا ہے طلسموں کی — حد ہی نہیں آتی کوئی نظر اس طرفہ فسوں کی قسموں کی
ہر شے پر خواب سا طاری ہے اور میں ہوں صرفِ بے خوابی — لینے ہی نہیں دیتی دم مجھ کو میری فطرتِ سیمابی

اے کاش کبھی کم کر سکتی میرے بھی دل کی بے تابی
یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

میں مصنوعات کا پروردہ بلکہ انساں بھی مصنوعی — میرا ساماں بھی مصنوعی میرا ایماں بھی مصنوعی
بسنے والا میدانوں کے ہنگامہ پرور شہروں کا — بے ربط ہکوں سے ناواقف اور شوریدہ سر شہروں کا
میں قدرت کے اسرار و رموزِ نہاں سے آگاہ کہاں — اِس اندھیارے کے اتھاہ سمندر کی میرے دل میں چاہ کہاں

دکھلاتی ہے مجھ کو جلوۂ نورِ حقیقی کی یہ راہ کہاں
یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی

یہ منظر خوش آئند تو ہیں، میں اِن سے مگر کیوں ڈرتا ہوں؟ — کیوں ان کی دلآویزی کو وحشت ناک تصور کرتا ہوں؟
کیوں مجھ کو میسّر سنگ و شجر کا سا بھی سکونِ قلب نہیں؟ — کیوں میری دنیا اِس دنیا سے جا کے بسی ہے دور کہیں؟
کیوں میں نے ڈالا ہے اپنے ہی جی کو آپ ہلاکت میں؟ — کیوں ہو ہی نہیں جاتا میں خود پیوستہ جہانِ قدرت میں؟

کیوں لے ہی نہیں لیتی مجھ کو اپنی آغوش کی وسعت میں
یہ شام، یہ گہری شام، یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تاریکی!

قیوم نظر

ناکامی

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

کردار

پرکاش۔ منورتھ۔ شنکر۔ رمیش۔ پریم ——— کالج کے زمانے کے پانچ دوست

اوشا۔ کانتا ——— رمیش کی بہنیں۔ عمر ۱۵ اور ۱۶ سال حسبِ مراتب

رمیش کی ماں ——— عمر ۵۰ سال

رمیش کا باپ ——— عمر ۵۶ سال

پہلا سین

منورتھ کا کمرہ

کسی اچھے سے کالج کے ہوسٹل کا ایک کمرہ

دروازے سے داخل ہوتے ہی دائیں طرف ایک پلنگ بچھا ہے۔ دروازے کے بائیں طرف دیوار کے ساتھ ایک میز ہے جس پر نہایت بے ترتیبی سے کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ میز اور پلنگ کے درمیان دو تین کرسیاں رکھی ہیں دروازے کے عین سامنے فرش پر چمڑے کے دو خوبصورت سوٹ کیس پڑے ہیں۔ فرش پر دری بچھی ہے۔ اور کمرے کی دیواروں پر خوبصورت عورتوں کی نیم عریاں تصویریں آویزاں ہیں۔

منورتھ اور پرکاش دو کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

پرکاش:۔ رات کو کیبرے میں خوب لطف رہا۔

منورتھ:۔ بھئی ہمیں تو کچھ لطف نہیں آیا۔ کیبرے میں جب تک "کسی" کا ساتھ نہ ہو کیا لطف؟ اور پھر یہ محض دیکھنے کی چیز تھوڑی ہے۔

پرکاش:۔ ارے بھائی ساتھ نہ سہی آس پاس تو دل بہلانے کو بہت سا سامان موجود تھا اور دل کا بہل جانا بھی تو کوئی آسان بات نہیں۔

منورتھ:۔ ٹھیک کہتے ہو دوست، اور پھر تمہارا دل کیوں نہ بہلتا ؟ تمہارے دائیں طرف وہ بھورے بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی ....

پرکاش:۔ کس کا ذکر کیا تم نے! خدا کی قسم لاجواب چیز تھی۔ سارے ہال کی نگاہیں اسی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

منورتھ:۔ کیوں نہ لگی ہوتیں ؟ اُس انبوہِ حسن میں اُس کا حسن اس طرح درخشاں تھا جیسے نیلے آسمان پر ستاروں کے درمیان چودھویں کا چاند۔

پرکاش:۔ اور اُس کی آنکھیں رقص گاہ کی ناچتی ہوئی فضا میں دو منور رقصاں ستاروں کی طرح ناچ رہی تھیں۔

منورتھ:۔ اور لوگوں کے دِل بھی اُس کی نگاہوں کی تال پر دھڑک رہے تھے۔

پرکاش:۔ تم نے اُس کے ہونٹ دیکھے۔ اور اُس کے سینے کا اُبھار؟

منورتھ:۔ ان چیزوں کو دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا لطف تو اس کے ہم رقص سے پوچھو۔

پرکاش:۔ کتنی بھونڈی شکل تھی اُس کی۔

منورتھ:۔ لیکن کتنا خوش نصیب تھا وہ شخص۔ ہمارے ہاں بھی ناچ ہوتے ہیں۔ بس دُور سے دیکھا کرو اور جلا کرو۔

پرکاش:۔ بھئی یہ بات تو میں نہیں مانتا۔ فنی نکتۂ نگاہ سے "مشرق کے رقص" کا بھلا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟

منورتھ:۔ آخر کس کام کا وہ فن جس میں عام انسان شریک نہ ہو سکے۔ اور زندگی کے پُر پیچ مسائل سے لمحہ بھر کے لئے بھی فرار حاصل نہ کر سکے۔ فن کی نمائش اور فن کی شرکت میں کتنا فرق ہے ہم صرف کسی آرٹسٹ کے

فن کو دیکھکر واہ واہ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ فن کار اور اُس کے فن میں ڈوب جاتے ہیں۔ ایک سے ہمیں صرف تنقید کا احساس پیدا ہوتا ہے اور دوسرے سے ایک مسرت، ایک وجد اور سرور۔

پرکاش:- لیکن دونوں کے معیار میں کتنا فرق ہے۔ ایک طرف "کتھا کلی" اور دوسری طرف کیبرے، فوکس ٹروٹ یا مغربی جونڈل کے دوسرے ناچ۔

منورتھ:- مان لیا کہ "کتھا کلی" وغیرہ اچھے ناچ ہیں۔ بلکہ فنی نکتہ نگاہ سے بہترین لیکن یہ بات ہم ایک ناقد کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں۔ ایک ان پڑھ گنوار کے لئے "کتھا کلی" اور ایک بازاری عورت کے تھرکنے میں کوئی فرق نہیں بلکہ اُسے شاید بازاری عورت کا ناچ زیادہ پسند آئے کیونکہ وہاں اُسے زیادہ قرب حاصل ہے۔

پرکاش:- لیکن تم تو ایک ان پڑھ اور گنوار آدمی نہیں۔ تم میں تو فن اور عمومیت میں امتیاز کا احساس ہے۔ کیا تمہیں کسی مشرقی فن کار رقاصہ کا ناچ دیکھکر خوشی حاصل نہیں ہوتی؟

منورتھ:- خوشی تو ہوتی ہے لیکن تسکین نہیں ہوتی۔ بھلا تم خود ہی بتاؤ کہ جو حظ کسی پیکر حسن کو اپنے پہلو میں لے کر اُس کے جسم کی کل رعنائیوں میں مدغم ہوکر ناچ کی فضا میں گم ہوجانے سے حاصل ہوتا ہے وہ کیا کسی حور شمائل کے بہترین رقص کو دور ہی دور سے دیکھنے سے حاصل ہوسکتا ہے؟

پرکاش:- بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ اُس بھورے بالوں والی لڑکی ہی کو لو۔ کہاں اُس کے پہلو بہ پہلو رقص کرنا اور کہاں اُسے رقص کرتے ہوئے دور سے دیکھنا۔ بھئی خوب بات کہی، مجھے تو اس کے خیال ہی سے وجد آگیا (ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے) اوہو! لاؤ یار ایک آدھ سگریٹ ہی نکالو۔ سگریٹ کے دھوئیں میں ہی غم کو منتشر کرنے کی کوشش کریں۔

منورتھ اُٹھکر میز کے دراز سے ایک کریون اے کا ڈبہ نکالتے ایک سگریٹ پرکاش کو پیش کرتا ہے اور دوسرا خود سُلگاتا ہے۔ پرکاش کرسی پر بیٹھے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ کے دھوئیں کے دائرے بناتا ہوا اُن کی طرف دیکھتا ہے۔

وقفہ

پرکاش:- کریون اے نہ پیا کرو منورتھ۔ اس کا تمبا کو بہت تیز ہوتا ہے۔

منورتھ:- اس سے گلا خراب نہیں ہوتا۔

پرکاش:- کیپسن سے بھی تو گلا خراب نہیں ہوتا۔

منورتھ:- لیکن وہ مہنگا بہت ہوتا ہے اور ہماری حیثیت نہیں کہ اُسے پئیں۔

پرکاش:- چھوڑو یار اتنے بڑے زمیندار کے لڑکے ہو اور۔ . . . .

پہلے بوٹوں کی آواز۔ پھر ہاتھ میں اخبارات لئے شنکر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

منورتھ:- لو بھئی کتابوں کے کیڑے آرہے ہیں۔

پرکاش:- کس شان سے رینگتے چلے آرہے ہیں۔

منورتھ:- کہو شنکر کتابوں سے فرصت مل گئی کیا؟

شنکر:- (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) تم نے آج کا اخبار دیکھا!

منورتھ:- جلدی کیا ہے۔ ابھی تو سو کر اُٹھے ہیں۔ اور آج تو اتوار ہے۔

شنکر:- آج کے اخبار میں ای۔ اے۔ سی کا نتیجہ ہے۔ اور تمہارا دوست البرٹ کامیاب ہوا ہے۔

پرکاش:- کون البرٹ؟ وہی نا جو ہمارے ساتھ بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔

شنکر:- ہاں! ہاں! وہی تو!

پرکاش:- (حیرانی سے) وہ تو نرا گنوار تھا، وہ کیسے کامیاب ہوگیا؟

منورتھ:- کالج میں تو وہ مشکل سے پاس ہوا کرتا تھا۔

پرکاش:- بات دراصل یہ ہے کہ ان مقابلہ کے امتحانوں میں قابلیت معیار ہی نہیں ہے۔ یہاں تو سفارش چلتی ہے۔ جس کی پہنچ ممتحن تک ہوئی کامیاب ہوگیا۔

شنکر:- میں یہ بات نہیں مانتا۔ قابلیت کی اہمیت ضرور ہے۔

پرکاش:- اگر ایسا ہی ہے تو تم کیوں کامیاب نہ ہوسکے؟ کیا تم میں قابلیت نہیں؟ تم بی۔ اے کے امتحان میں اول درجے میں پاس ہوئے۔ کالج میں ہمیشہ اول رہے اور ادھر جب آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں شریک ہوئے تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر کیوں؟

شنکر:- قسمت بھی کوئی چیز ہے۔

منورتھ:- نہیں شنکر قسمت پر دوش نہ لگاؤ۔ پرکاش سچ کہتا ہے۔ کہ یہاں سفارش کے بغیر کام نہیں چلتا۔ تم نے جی توڑ کے محنت کی۔ آئی۔ سی۔ ایس میں پاس بھی ہوئے لیکن ناکام رہے۔ اُدھر البرٹ جس نے کبھی محنت کی ہی نہیں۔ جو کالج میں ہمیشہ تم سے پیچھے رہا۔ وہ کامیاب ہوگیا۔

شنکر:- یہ الگ بات ہے۔ ایک تو ای۔ اے۔ سی اور آئی۔ سی۔ ایس کے امتحانوں

میں بڑا فرق ہے اور دوسرے البرٹ عیسائی ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کے لئے مقررہ تعداد میں اسامیاں پہلے سے ہی محفوظ ہوتی ہیں۔

[کمرے کے باہر ذرا دور سے کسی کی باتوں کی آواز آتی ہے]

منورتھ:۔ پرکاش ذرا دیکھنا تو۔ مجھے تو رمیش معلوم ہوتا ہے۔

پرکاش:۔ جانے بھی دو یار۔ مفت میں زحمت سہیڑ لوگے۔ دو گھنٹے لیکچر سننا پڑے گا۔ ان لوگوں نے بھی خوب ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ گاندھی ٹوپی سر پر رکھی۔ ایک دو تقریریں کیں کچھ چندہ اکٹھا کیا۔ تو لیڈر بن گئے۔ اور پھر گلچھڑے اڑائے۔

منورتھ:۔ یہ نہ کہو پرکاش، رمیش ایسا آدمی نہیں ہے۔

[دو آدمیوں کی کمرے کی طرف آنے کی آواز]

ایلو! میرے خیال میں تو وہ ادھر ہی آرہا ہے۔ اور اس کے ساتھ شاید پریم ہے۔

[دروازے پر دو نوجوان کھدر کے پائجامے اور کھدر کے کرتوں پر پٹی کی جیکٹ پہنے نمودار ہوتے ہیں۔ دونوں کے سر پر گاندھی ٹوپی ہے]

منورتھ:۔ ہیلو رمیش! ہیلو پریم! آج صبح ہوسٹل میں کیسے آنا ہوا؟

[دونو پرکاش اور شنکر سے ہاتھ ملاتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں]

رمیش:۔ یونہی آگئے۔ اور اگر سچ پوچھو تو ہم تم سے کچھ اینٹھنے آئے ہیں۔ تم نے اخبار میں تو پڑھا ہی ہوگا۔ کہ بمبئی کے مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی ہے ہم اُن کے لئے چندہ اکٹھا کر رہے ہیں۔ اور تم سے ہمیں کم از کم پانچ روپے کی اُمید ہے۔

پرکاش:۔ باپ رے! پانچ روپے میں تو دو آدمی دو دو دفعہ سینما دیکھ سکتے ہیں۔

رمیش:۔ (پرکاش کو نظر انداز کرتے ہوئے) کہو پھر لکھوں رسید؟

منورتھ:۔ اتنا ظلم نہ کرو رمیش۔ روپے آنے پر دو روپے لے جانا۔

رمیش:۔ اچھا وہی سہی۔ اور آپ مسٹر شنکر؟

شنکر:۔ ہمارے سامنے تو اس بات کا نام تک نہ لو۔ ہم نے تو ابھی کل ہی پی۔ سی۔ ایس کے امتحان کا داخلہ دیا ہے۔ اور اگر ابھی سے سرکار کے خلاف کسی تحریک میں چندہ دینا شروع کر دیں۔ تو بس کامیاب ہو چکے۔

[پریم اور منورتھ ہنستے ہیں]

رمیش:۔ کیا آئی۔ سی۔ ایس بننے کی امید ترک کر دی جو پی۔ سی۔ ایس کا امتحان دینے کی ٹھانی؟

شنکر:۔ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس دفعہ دونوں جگہ قسمت آزمائی کی جائے۔

رمیش:۔ مبارک خیال ہے!

منورتھ:۔ تمہارے آنے سے پہلے ہم انہیں یہی سمجھا رہے تھے کہ ایسے امتحانوں میں سفارش کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ اور ان میں روپیہ ضائع کرنا ایک طرح سے محض السٹریٹیڈ ویکلی کے معمے حل کرنا ہے۔

رمیش:۔ ہاں! لیکن سفارش کے علاوہ یہاں اور بھی تو کئی چیزوں کی ضرورت ہے

شنکر:۔ یہی تو میں کہتا تھا۔ اور مسٹر رمیش بھی اس بات میں مجھ سے متفق ہیں

پرکاش:۔ کیا رمیش صاحب مقابلہ کے امتحانوں کے حق میں کچھ فرما رہے تھے؟ اب تو تمہیں کچھ نہ کچھ چندہ دینا ہی چاہئے۔

رمیش:۔ میں نے ان کے حق میں یا ان کے خلاف تو کوئی بات نہیں کہی۔ کیونکہ درحقیقت سوال ہی یہ نہ تھا۔ لیکن اب چونکہ یہ سوال پیدا ہو گیا ہے۔ تو میری رائے یقیناً ایسے امتحانات کے خلاف ہے۔

شنکر:۔ تمہاری رائے کو پوچھتا ہی کون ہے؟ لو جی! اگر یہاں بھی کوشش نہ کریں تو ہمارے لئے سوائے کلرک بننے کے اور دھرا ہی کیا ہے؟

رمیش:۔ آخر ایک آئی۔ سی۔ ایس اور کلرک میں فرق ہی کتنا ہے؟ میری رائے میں تو صرف تنخواہ کا فرق ہے۔

شنکر:۔ (بلند آواز میں، حیرانی سے چونکتے ہوئے) واہ! یہ کیسے؟

رمیش:۔ آخر دونوں کارندے ہی تو ہیں۔ ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ ہماری سرکار کو ہر وقت ایسے چھوٹے اور بڑے کرائے کے کارندوں کی ضرورت رہتی ہے۔ تاکہ وہ اُن کی مدد سے ہندوستان کی دولت کو لُوٹ سکے اور اگر اس لُوٹ کھسوٹ میں کوئی چون و چرا کرے تو اُسے کچل سکے انہیں کارندوں کی بھرتی کے لئے ان مقابلہ کے امتحانوں کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔ یہاں کامیابی کے لئے قابلیت سفارش۔ اچھی صحت۔ خاندانی وفاداری اور اپنے مُلک سے غداری ان سب چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعلیم کے بعد ہمارے اکثر نوجوانوں کی یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑا کارندہ بنیں۔ اگر کوئی کامیاب ہو جائے تو اُسے زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور اگر ناکام رہے تو وہ ایک شرابی کی طرح اِن امتحانوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے اور بعض اوقات اُسے کھڑا ہونے کو ہی جگہ مل جاتی ہے۔ یعنی

چھوٹے کارندے کی اور تھوڑی تنخواہ پر۔ بہرحال کلرک ہو یا آئی۔ سی
ایس۔ دونوں ایک ہی مشین کے پرزے ہیں۔ پرزے کی قیمت میں فرق
ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔ وہ بہرحالت میں اُسی
مشین کا ایک پُرزہ ہے جو ہندوستانیوں کو اپنے ہی ملک میں قانون ماننے
کے لئے وضع کی گئی ہے۔ اُس مشین کا فورمین ہمیشہ کوئی اور ہوتا ہے
اور یقیناً غیر ہندوستانی۔

پرکاش:۔ کیا تمہارا مطلب ہے کہ شنکر اگر پی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں
شریک ہو رہا ہے تو وہ اپنے ملک سے غداری کر رہا ہے؟ بھئی خوب!

پریم:۔ دیکھو پرکاش تم اپنی عادت کے مطابق لڑائی کرانے کی کوشش
نہ کرو۔

پرکاش:۔ (غصے سے) تو کیا ہم لوگوں کو لڑاتے ہی ہیں؟

منورتھ:۔ چلو جانے بھی دو معمولی سی تو بات ہے۔ اور ہاں رمیش صاحب
مان لیا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے تھے لیکن اس بات کا جواب آپ نے
ابھی تک نہیں دیا کہ تعلیم کے بعد متوسط درجے کا ایک نوجوان آخر
کرے تو کیا کرے۔ اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ کس طرح پالے۔

پرکاش:۔ تمہیں اس کی کیا فکر لگ گئی۔ اول تو ذیلدار صاحب کا اتنا رسوخ
ہے کہ تمہیں فوج یا پولیس میں کوئی نہ کوئی جگہ مل ہی جائے گی، اگر نہ بھی
ملے تو اتنی بڑی زمینداری آخر تمہارے ہی لئے تو ہے۔ اور پھر آج
کل تو پنجاب میں راج ہی زمینداروں کا ہے۔

منورتھ:۔ میں نے یہ بات ذاتی یا انفرادی طور پر تو نہیں کہی تھی۔

شنکر:۔ یہی تو میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے یہ سوال منورتھ اور اُس کی قماش کے
لوگوں کے لئے نہ ہو لیکن سوائے چند ایک کے ہر ایک نوجوان کو یہی
سوال درپیش ہے۔ مسٹر رمیش ہمارے سامنے ایک آدرش پیش کر رہے
ہیں لیکن ہر ایک انسان کسی آئیڈیل کے لئے بھوکا نہیں مر سکتا۔ عام
طور پر آئیڈیل کی بہ نسبت اگر کسی کو زندگی کے لوازمات حاصل کرنے
کے لئے کسی بھی جگہ سے چاندی کے چند سکے مل جائیں تو وہ اُسے
زیادہ پسند کرے گا۔

پرکاش:۔ (دبی زبان سے) چاہے وہ سکے چندے میں ہی ملیں!

[پریم غصے کی نظروں سے پرکاش کی طرف دیکھتا ہے۔ لیکن
پیشتر اس کے کہ وہ اُسے کچھ کہے رمیش اُس کے کندھے پر ہاتھ
رکھ کر اُسے چپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے]

رمیش:۔ تم یہ ٹھیک کہتے ہو شنکر۔ میں یہ مانتا ہوں کہ بیکاری کا مسئلہ نہایت
دقیق اور اہم ہے لیکن تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ یہ مسئلہ ہمارے شکستہ
نظام کے ساتھ وابستہ ہے اور سرکاری ملازمتوں اور مقابلہ کے
امتحانوں سے اس کا حل نہیں ہو سکتا۔ شروع شروع میں ہم میں سے
ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اچھی طرح زندگی بسر کرے اُس
کے پاس موٹر ہو۔ سجی سجائی کوٹھی ہو۔ نمائش کے لئے خوبصورت بیوی
ہو۔ سماج میں اُونچا درجہ ہو۔ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے
ہم اپنی ساری زندگی صرف کر دیتے ہیں لیکن کتنے ہیں جو کامیاب ہوتے
ہیں۔ لاکھوں میں سے مشکل سے ایک یا دو۔ اور باقی کلرک یا بیکار۔
خوبصورت لیکن بھوک سے زرد چہرے والی عورتوں کے خاوند
پانچ چھ بچوں کے باپ۔ پچکے ہوئے گال۔ زرد چہرے۔ چڑچڑا مزاج
لیکن جس کے کہے شائد صاحب کی مہربانی سے کچھ ترقی مل ہی جائے۔
کیا تم اسے بیکاری کے مسئلے کا حل کہتے ہو۔ اور پھر ان تعلیم یافتہ
نوجوانوں کے علاوہ اُن لاکھوں ان پڑھ جاہل ہندوستانیوں کی بیکاری
کا کیا علاج جو سال میں آٹھ ماہ بیکار رہتے ہیں۔ کیا اُن کے لئے
بھی مقابلہ کے امتحان جاری کریں گے آپ؟ مسٹر شنکر! یہ علاج
نہیں محض ڈھونگ ہے۔ جب تک موجودہ سماجی نظام پاش پاش
نہ ہو جائے تب تک بیکاری کا کوئی علاج نہیں۔ اور نہ میں تمہیں کوئی
حل بتا سکتا ہوں۔ میرے سامنے تو وہی چیز ہے جسے تم آئیڈیل
کہتے ہو۔

[شنکر جواب سوچنے کے لئے کھانستا ہے]

پرکاش:۔ چندہ جمع کرنے کا آدرش ۔۔۔ اچھا علاج ہے بیکاری کا!

[طنزاً ہنستا ہے]

پریم:۔ بکو مت پرکاش۔ بہت برداشت کیا ہے ہم نے تمہاری بکواس کو۔
کیا بیکاری کا یہ علاج ہے کہ کسی زمیندار کے بیٹے کے ساتھ چپک گئے
یا پولیس میں ڈائری بھر دی۔

پرکاش:۔ تم بہت بڑھ رہے ہو پریم! میں ایسی باتوں کا جواب زبان سے
نہیں دیا کرتا۔

[پریم اُٹھ کر پرکاش پر جھپٹتا ہے اور دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں
پرکاش گالیاں بھی دیتا ہے۔ لیکن پریم زیادہ تر گھونسوں سے کام
لیتا ہے۔ شنکر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ منورتھ اور رمیش

دونوں کو چھڑاتے ہیں" جانے بھی دو۔ کیوں لڑتے ہوئے۔ پاگل ہوئے ہو کیا پریم! اب چھوڑو بھی" وغیرہ۔ آخر دونوں کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پرکاش گالیاں دئے جاتا ہے۔]

رمیش:۔ (پریم سے) چلو پریم۔ ہم یہاں لڑنے جھگڑنے تو نہیں آئے تھے۔

پریم:۔ (غصے سے) ایسا ہی بکتا.....

رمیش: (بات کاٹ کر) اچھا چھوڑو بھی اب۔ گڈ بائی اچھا سور۔ یہ گڈ بائی۔ میٹ یوا گین۔

[دونوں کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں۔] (پردہ)

دوسرا سین

رمیش کا گھر

وقت دس بجے رات

منظر:۔ [لاہور کے مضافات میں نچلے متوسط طبقے کے کسی ہندو گھر کا ایک کمرہ۔ کمرے کی دیواروں پر مختلف قسم کی چھوٹی اور بڑی دھارمک تصویریں نہائت بے ترتیبی سے لٹک رہی ہیں۔ دروازے میں سے داخل ہوتے ہی کمرے کے دائیں طرف وسط میں دو کھڑکیاں ہیں جو اس وقت بند ہیں۔ کھڑکیوں کے پاس ہی ایک چارپائی بچھی ہے۔ جس پر میلے کپڑے پڑے ہیں۔

دروازے کے بائیں جانب کونے میں ایک میز ہے جس پر اخبار رسالے۔ کتابیں۔ ٹیبل لیمپ۔ پیتل کا خالی گلاس۔ کنگھی۔ شیشہ حجامت بنانے کا سامان مختلف چیزیں نہایت بے ترتیبی سے بکھری ہوئی ہیں۔ میز کے قریب ہی دو تین کرسیاں بھی ہیں۔ میز سے ذرا ہٹ کر دیوار میں ایک الماری ہے۔ جس کے عین اوپر دیوار پر ایک پرانا سا کلاک ٹِک ٹِک کر رہا ہے۔

دروازے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ فرش پر ایک چھوٹی دری بچھی ہے۔ دری پر ایک گاؤ تکیہ رکھا ہے جس کا غلاف سخت میلا ہو رہا ہے۔ دری کے ساتھ ہی فرش پر دیسی طرز کے دو تین مونڈھے پڑے ہیں جن میں سے ایک پر رمیش کی ماں بیٹھی آگ تاپ رہی ہے۔ دری پر گاؤ تکیہ کے سہارے ٹانگیں پھیلائے رمیش کا باپ بیٹھا ہے اور اس کے ساتھ ہی رمیش کی دو بہنیں۔ اُوشا اور کانتا۔ اُوشا رمیش کے لئے ایک نیا سویٹر بُن رہی ہے اور کانتا ہندی کی ایک کتاب پڑھ رہی ہے۔

کانتا کی پشت پر دیوار میں ایک اور دروازہ ہے۔ جو دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔

کلاک دس بجاتا ہے]

اُوشا:۔ پتاجی دس بج گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک رمیش بھائی نہیں آئے۔

رمیش کی ماں:۔ ابھی کھانا بھی تو نہیں کھایا۔

رمیش کا باپ:۔ کبھی وہ دس بجے سے پہلے گھر آیا بھی ہے۔ جو آج تم اتنا فکر کر رہی ہو؟

اُوشا:۔ روز تو ساڑھے نو بجے آہی جایا کرتے ہیں۔

رمیش کا باپ:۔ میں نے تو اُسے کبھی نو بجے آتے نہیں دیکھا۔

رمیش کی ماں:۔ اس وقت تک تو ضرور آہی جایا کرتا ہے۔ آج معلوم نہیں کیوں نہیں آیا۔ ایشور بھلا ہی کریں۔

رمیش کا باپ:۔ نہیں آیا تو میں کیا کروں۔ اس لڑکے نے تو میرا بڑھاپا خراب کر دیا۔ میں نے سوچا تھا۔ ایک لڑکا ہے لائق نکلے گا۔ تو بڑھاپے میں سکھ بھوگوں گا لیکن اس نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ (ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے) ہاں بھئی! اولاد بھی تو قسمت والوں کی ہی اچھی نکلتی ہے۔

کانتا:۔ بھیا نالائق تو نہیں پتاجی۔ وہ امتحان میں کبھی فیل نہیں ہوئے۔ ہر وقت پڑھتے رہتے ہیں اور پھر لکھتے بھی اچھے ہیں۔

رمیش کا باپ:۔ (بیٹی سے) چُپ رہو کانتا۔ تم بھلا ان باتوں کو کیا جانو۔ پڑھنے لکھنے سے کیا بھلا لیاقت آتی ہے۔

رمیش کی ماں:۔ یونہی ناراض ہو رہے ہو۔ سچ تو کہتی ہے۔ بچاری۔ ہمارا رمیش نالائق تھوڑی ہے۔

رمیش کا باپ:۔ تمہاری اس بات نے تو انہیں خراب کر دیا ہے بڑوں کو ہر بات میں ٹوکتے ہیں۔ رمیش نالائق نہیں تو کیا میں نالائق ہوں؟ میں نے تو سترہ برس کی عمر میں نوکری بھی کر لی تھی۔ اور اُس وقت سے کولھو کے بیل کی طرح جُتا ہوا ہوں۔ ان کو پڑھایا لکھایا، پالا پوسا، غرض ساری کمائی انہیں پر صرف کر ڈالی۔ مگر جب مجھے ذرا نوکری سے فراغت ملی تو سوچا کہ اب رمیش کمائے گا۔ اور میں کھاؤں گا۔ لیکن دیکھتا کیا ہوں کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم نے بچوں کی جڑیں پہلے ہی سے کھوکھلی کر

دی ہیں۔

رمیش کی ماں:۔ اب مجھے مفت میں کوسو ہیں نے کب کسی کی پیٹھ ٹھونکی میں تو اُلٹا ہر وقت اُنہیں ڈانٹتی ہی رہتی ہوں۔ لیکن ماں ہی کیسے ڈالیں بچے ہی تو ہیں۔ اور اگر رمیش کو کوئی نوکری نہیں ملی تو اُس میں اُس کا کیا قصور۔ آج کل وقت ہی ایسا آن پڑا ہے۔ تمہارے زمانے میں تو مڈل پاس کو بھی نوکری مل جایا کرتی تھی۔

رمیش کا باپ: نوکری تو اب بھی مل جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی کوشش کرے تو۔ آخر ساری دنیا بیکار نکھٹو ہی پھرتی ہے۔

اوشا:۔ کوشش تو رمیش بھائی بھی کرتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن . . . . .

رمیش کا باپ:۔ وہ خاک کوشش کرے گا۔ اُسے تو اس کا خیال تک نہیں۔ دس۔ دس بجے تک باہر رہنا۔ ہر وقت آوارہ پھرنا بھنگیوں اور تانگے والوں سے میل ملاقات رکھنا۔ بڑا بنا ہے کانگرسی کہیں کا۔ کمینے لوگوں کا چودھری! اس طرح سے بھی کبھی کسی کو نوکری ملی ہے؟ لکھمن لال کے لڑکے کو تو جانتی ہی ہو۔ جج بنا ہوا ہے، جج! تین سو روپیہ تنخواہ پاتا ہے۔

رمیش کی ماں:۔ ہماری ایسی قسمت کہاں؟

رمیش کا باپ:۔ ہماری قسمت میں رام جانے کیا لکھا ہے۔ ان ساٹھ روپوں کی پنشن سے آخر کب تک گذارا ہوگا نہ تو ان سے خرچ چل سکے گا۔ اور نہ قرض بے باق ہوگا۔ مجھے تو ایسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہیں ایک دن بازار میں بیٹھکر بھیک ہی مانگنی پڑے گی۔

رمیش کی ماں:۔ رام رام کہو۔ آج تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہمیشہ ایشور پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ آج ہی کل میں رمیش کو کہیں نہ کہیں نوکری مل رہے گی۔ ہم اُس کا بیاہ کریں گے۔ تب ہماری قسمت بھی جاگ اُٹھے گی۔

رمیش کا باپ:۔ بیاہ ویاہ کا خیال تو تم اب چھوڑ دو۔ اب بھلا ہمیں کون شریف آدمی اپنی لڑکی دے گا۔ پہلے تو پھر بھرم بنا ہوا تھا۔ نوکری تھی۔ چار پیسے پاس تھے۔ لیکن اب . . . . . (ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے) اس لڑکے نے کہیں کا نہ چھوڑا۔

رمیش کی ماں:۔ سنو تو! میری بہن نے ایک رشتے کے لئے کہا ہے۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔

[اُوشا اور کانتا چوکنی ہو جاتی ہیں]

رمیش کا باپ:۔ تم نے مجھے یہ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تمہاری بہن تو سب کچھ کر سکتی ہے۔ اُن لوگوں کا شمار تو اس وقت شہر کے بڑے آدمیوں میں ہوتا ہے۔

رمیش کی ماں:۔ ذکر کس سے کرتی تم تو مجھے ہی ڈانٹنے لگ گئے۔

رمیش کا باپ:۔ اچھا میں ہی بُرا سہی لیکن اب بتاؤ گی بھی۔

رمیش کی ماں:۔ میری بہن نے کہلوا بھیجا ہے کہ سیٹھ رادھا کشن کے ہاں بات بن سکتی ہے۔ اگر کہو تو کوشش کروں۔ وہ بڑے رسوخ والے آدمی ہیں۔ لڑکے کے کام کاج کے لئے بھی وہ خود ہی انتظام کر دیں گے۔ اور ویسے بھی دیں گے۔

رمیش کا باپ:۔ (ہاتھ ملتے ہوئے) سیٹھ رادھا کشن! اگر وہاں کام ہو جائے تو اور کیا چاہیئے۔ کیا تم نے اُس سے کہا نہیں کہ ضرور کوشش کرے۔ کوشش تو کیا بلکہ . . . . . . (خوشی سے منہ سے بات نہیں نکلتی)

رمیش کی ماں:۔ کہہ تو میں نے اُسے دیا ہے۔ لیکن رمیش سے بھی تو پوچھ لوں۔

رمیش کا باپ:۔ (چونک کر) کیا کہا؟ رمیش سے پُوچھ لوں! پگلی کہیں کی۔ اُس کا اِس بات سے کیا تعلق ہے۔

[باہر سے کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے]

اُوشا:۔ رمیش بھائی آ گئے۔

[رمیش کمرے میں داخل ہوتا ہے اور سب کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ رمیش بغیر کسی سے بات کئے کانتا کی پشت والے دروازے سے دوسرے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے]

رمیش کا باپ: (آواز دیتا ہے) رمیش!!

رمیش:۔ (اندر سے ہی) جی ہاں۔

رمیش کا باپ:۔ (آواز میں وقار پیدا کرتے ہوئے) ادھر آؤ۔

[رمیش باہر آ کر خاموش کھڑا ہو جاتا ہے۔]

رمیش کا باپ:۔ آج گیارہ بجے تک کہاں آوارہ گردی کرتے رہے؟

رمیش:۔ (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے) ابھی گیارہ تو نہیں بجے۔

رمیش کا باپ:۔ تو اتنی جلدی کیا تھی۔ گیارہ بجے کے بعد ہی آنا تھا۔

(رمیش چپ رہتا ہے)

وقفہ

رمیش کی ماں:۔ بیٹھ جاؤ نہ بیٹا، بتاؤ نا آخر اتنی رات تک تم کہاں رہتے ہو؟

(رمیش مونڈھے پر بیٹھ جاتا ہے)

رمیش کا باپ:۔ (طنزاً) کیا آج کوئی جلسہ تھا؟

رمیش:۔ جی ہاں!

رمیش کا باپ:۔ جی ہاں! شرم نہیں آتی۔ نہ کھانے کی فکر نہ کمانے کی۔ بس ہر وقت آوارہ گردی کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں۔ ہر وقت جلسے۔ جلوس اور یہی خرافات۔ بھگوان سمجھیں اُس پریم سے جس نے تمہیں یہ راہ دکھائی۔ بڑے آئے یہ آزادی لینے والے، اگر آج انگریز چلے جائیں تو تمہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ مسلمان تمہارے لئے جینا محال کر دیں۔

[کانتا منہ چھپا کر ہنستی ہے]

رمیش:۔ (طنزاً ہنستے ہوئے) آپ پر تو بس ہر وقت مسلمانوں کا ہوّا سوار رہتا ہے

رمیش کا باپ:۔ اور تو ہے بڑا قوم کا بہی خواہ۔ تجھے ان باتوں کا کیا پتہ۔ ہمارے شری گورو گوبند سنگھ جی مہاراج کہہ گئے ہیں کہ یہ قوم......

[رمیش اور کانتا کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں اور اُوشا بھی مسکرا دیتی ہے]

رمیش کا باپ:۔ (غصے سے) تم میرا مذاق اُڑاتے ہو۔ کیا یہی صلہ ہے میری محنت کا تمہیں پڑھایا۔ لکھایا۔ تمہارے لئے اپنا پیٹ کاٹا لیکن تمہیں سکھ میں رکھا۔ تمہارے لئے قرض تک لیا اور اب تم ہی میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔ کیا یہی سیکھا ہے تعلیم سے، کیا کانگرس تمہیں یہی سبق دیتی ہے۔ کہ باپ کی توہین کرو۔ تین سال ہو گئے۔ تمہیں ایم۔ اے پاس کئے۔ لیکن ابھی تک بیکار پھر رہے ہو۔ گھر سے دو وقت کا کھانا کھایا اور رات کو آکر سو رہے۔ اس کے علاوہ گھر سے کوئی تعلق نہیں گھر جائے بھاڑ میں کوئی جیئے یا مرے۔ تمہیں کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ آخر میرے پاس کوئی خزانہ تھوڑا دھرا ہے۔ جو اس طرح کام چلتا رہے گا۔ میں نے تمہیں پڑھایا تھا اپنے سکھ کے لئے، کام کرنے کے لئے، بیکار پھرنے کے لئے نہیں۔

رمیش:۔ (رک کر) مجھے بھی تو کچھ بیکاری سے کوئی خاص رغبت نہیں۔ اگر کوئی کام ہی نہ ملے تو میں کیا کروں؟

رمیش کا باپ:۔ کام تو ملتا ہے لیکن تمہیں کانگرس اور اُن کمینے بھنگیوں اور تانگے والوں سے بھی فرصت ملے۔ آخر لوگوں کو بھی تو کام مل ہی جاتا ہے۔ اپنے چچا کے لڑکے کو ہی دیکھو۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تیس روپے پر کام شروع کیا تھا۔ تین سال کے بعد اب وہ پچاس لیتا ہے اور پھر بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ سبھی طرح کا خرچ چلتا ہے۔ انسانوں کی

رمیش:۔ مجھ سے تو کلرک کی نوکری ہرگز نہیں ہو سکتی۔

رمیش کا باپ:۔ لاٹ صاحب تو تو ہی ہے۔ اگر اتنا ہی گھمنڈ ہے تو کسی مقابلہ کے امتحان میں بیٹھ کر مجسٹریٹ بن گئے ہوتے۔ لکھمن لال کے لڑکے کو ہی لو۔ جج بنا بیٹھا ہے، کیا وہ تم سے زیادہ قابل ہے۔

رمیش:۔ میں مقابلہ کے امتحانوں میں بیٹھنا پاپ سمجھتا ہوں۔

رمیش کا باپ:۔ (حیرانی سے) وہ کیوں؟

رمیش:۔ آپ یہ نہ سمجھ سکیں گے۔ بس یونہی سمجھ لیجئے کہ مجھے یہ کام پسند نہیں۔

رمیش کا باپ:۔ تجھ ایسا دماغ کہاں سے لاؤں ایسی باتیں سمجھنے کے لئے؟ تبھی تو میں کہتا ہوں کہ کام وہ کر سکتا ہے جس کے دل میں کام کرنے کی خواہش ہو۔ (طنزاً) کلرکی انہیں پسند نہیں۔ مقابلہ کے امتحان میں شامل ہونا پاپ ہے۔ ہاں بھائی جسے کچھ کئے بغیر دو وقت کی روٹی مل جائے وہ بھلا کام کیوں کرنے لگا؟ (غصے سے) لیکن آخر میرے ہاں بھی کوئی لنگر تھوڑی لگا ہے۔

رمیش:۔ (غصے سے) لنگر کی روٹی کھانے کو میں بھی تیار نہیں۔ آپ مجھے اجازت دیں میں ابھی......

[کانتا کتاب بند کر کے رکھ دیتی ہے۔ اور اُوشا بھی سوئیٹر بننے کی سلائیاں ایک طرف سنبھال دیتی ہے]

رمیش کی ماں:۔ (بات کاٹ کر اور رمیش کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ایسا نہیں کیا کرتے بیٹا رمیش! وہ تمہارے دشمن نہیں بیٹا۔ تمہارے بھلے کے لئے ہی تو کہتے ہیں۔

رمیش:۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) تو کیا میں ہی سب کا دشمن ہوں۔

رمیش کی ماں:۔ یہ کون کہتا ہے؟ دیکھو نہ بیٹا۔ گھر کا حال تو تم سے چھپا ہوا نہیں۔ آج تک تو ظاہر داری سے نبھتی رہی لیکن اب تو یہ بھی ناممکن ہو رہا ہے۔ جب آمدنی ہی نہ ہو گی تو گذر کیسے ہو گی۔ ساٹھ روپے کی پنشن سے کیا کیا ہو۔ پھر تم جانتے ہی ہو قرضخواہ الگ تنگ کر رہے ہیں۔ گھر کے خرچ میں پہلے ہی ہاتھ تنگ رہتا ہے۔ اسی خرچ کی وجہ سے کانتا کو کالج چھوڑنا پڑا۔ اور پھر اوشا کب تک گھر میں بیٹھی رہے گی۔ اُس کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ آخر یہ سب کیسے ہو گا۔ اگر تم سے بات نہ کریں تو ہمارا اور کون ہے؟

رمیش:۔ کیا میری پچاس ساٹھ روپے کی نوکری سے یہ سب روپیہ فراہم ہو جائے گا؟

رمیش کی ماں:۔ سب کام تو نہ ہوں گے لیکن ہاتھ تو کھل جائے گا۔ اور

رمیش:۔ خوب! اتنے لوگوں کا خرچ تو پہلے ہی سے بمشکل چل رہا ہے۔ اب ایک اَور آدمی بڑھنے سے خرچ کیسے برداشت ہو سکے گا؟

رمیش کا باپ:۔ اس سے تو بس ہر بات کا اُلٹا سا جواب سُن لو۔

رمیش کی ماں:۔ وہ اپنی قسمت ساتھ لائے گی بیٹا۔ اَور جس جگہ میں تمہارا منہ چاہتی ہوں وہاں سے تو مال بھی خوب ملے گا۔

رمیش:۔ مجھے مال سے تو شادی نہیں کرنی ماں۔

رمیش کی ماں:۔ تُو تو بڑا پاگل ہے۔ میں کہتی ہوں لڑکی بی۔ اے میں پڑھتی ہے اُس کے باپ کا نام تو تُو نے سنا ہی ہوگا۔ سیٹھ رادھا کشن! شہر میں کون اُسے نہیں جانتا۔ بڑے بڑے افسروں سے اُس کی واقفیت ہے۔ اگر یہاں کام ہو جائے تو وہ تمہاری نوکری کا انتظام بھی خود ہی کر دے گا۔ دیکھو بیٹا رمیش ایسا موقع بار بار ہاتھ نہیں آتا۔ اب تو تمہاری نوکری کی بدولت یہ کام ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تم اپنی ضد پہ ہی اڑے (آخر وہ ہمارا دیا) تو کھاتی ہی نہیں۔

اُوشا:۔ بھائی صاحب یہ سب باتیں تو آپ کے پسند کی ہیں۔ لڑکی بی۔ اے میں پڑھتی ہے۔ آپ آخر یہی تو چاہتے ہیں۔ اب مان جائیے ہم بھی بھابی والے بنیں گے۔

کانتا:۔ لیکن ماں یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں۔ کہ بھابی کی شکل صورت کیسی ہے۔

رمیش کا باپ:۔ ہٹ پگلی۔ ہم ہندوؤں میں بھلا ایسی باتیں کون پوچھتا ہے۔ آخر ہمارے ہاں بھی تو لڑکیاں ہیں۔ کیا ہم شادی کے لئے اُن کی صورت دکھاتے پھریں گے۔

رمیش کی ماں۔ بات تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن کلجگ کا زمانہ ہے نہ چلو۔ صورت کا بھی میرا ذمہ رہا۔ اور پھر کانتا پر تو رمیش کو پورا اعتبار ہے میں کسی دن اُس کے دکھانے کا بندوبست کر دوں گی۔

کانتا:۔ بس یہ ٹھیک ہے ماں۔ ایک بار تم بھابی مجھے دکھا دو اور پھر بھائی صاحب کو منانا میرا کام رہا۔

اُوشا:۔ اب تو بھائی صاحب آپ کو ماننا ہی پڑے گا۔

وقفہ

رمیش کی ماں:۔ کہو نا رمیش کیا صلاح ہے؟

رمیش:۔ چپ (چہرے پر کچھ سوچ اور پریشانی کے آثار)

رمیش کی ماں:۔ کہو نا بیٹا؟

رمیش:۔ میں اسقدر جلد آپ کو نہیں بتا سکتا۔

رمیش کا باپ:۔ (نقل کر کے) نہیں بتا سکتا۔ لاٹ صاحب تو تو ہی ہے — (رمیش کی ماں سے مخاطب ہو کر) تو اس سے بار بار پوچھتی ہی کیوں ہے خواہ مخواہ سر پر چڑھا جاتا ہے۔ میں نے جو کہہ دیا کہ تم یہاں ہر بات پکی کر دو۔ دیکھوں گا کس طرح انکار کرتا ہے۔

رمیش:۔ آپ میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔

[رمیش یہ کہہ کے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے]

رمیش کا باپ:۔ (غصے سے اونچی آواز سے) ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور کریں گے۔

[اُٹھ کر رمیش کے پیچھے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور بازو پھیلا کر پکارتا بھی جاتا ہے۔

"سُنا تم نے۔ تمہیں ہماری بات ماننی ہوگی ورنہ اپنا کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈ لو۔ اب مجھ سے زیادہ برداشت نہ ہوگا"

رمیش کے باپ کے اُٹھنے پر رمیش کی ماں بھی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اُسے پکڑتی ہے۔ اُوشا اور کانتا بھی اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ اور اُن کے چہرے زرد ہو جاتے ہیں]

رمیش کی ماں:۔ آپ بیٹھ جائیے نہ۔ مانے گا کیوں نہیں۔ آپ کی نہ مانے گا تو اور کس کی مانے گا بیٹھئے تو۔

رمیش کا باپ:۔ تم چھوڑ دو مجھے میں آج اس بات کا فیصلہ کر کے رہوں گا۔ تم نے تو اِسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ (دانت پیس کر) اُلّو کا ......

(پردہ)

تیسرا سین

رمیش کا گھر

وقت دس بجے صبح

پس منظر۔ وہی جو دوسرے سین میں ہے۔

[میز کے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر رمیش بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے ایک کتاب کھلی پڑی ہے۔ جسے وہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن کسی ذہنی کشمکش کی وجہ سے پڑھ نہیں سکتا۔ تھوڑے وقفے کے بعد وہ بلند آواز میں ایک دو فقرے پڑھتا ہے۔ لیکن شاید وہ بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس لئے کتاب کو بند کر کے میز پر پٹک دیتا ہے۔ اور پھر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر مُنہ میں بڑبڑاتا ہے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں"

چند سیکنڈ کے لئے وُہ اسی طرح سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا رہتا ہے۔ پھر دائیں ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑ کر اور اپنی بائیں

[کبھی کرسی کے بازو پر کہنیاں ٹیک کر ہتھیلیوں سے سر کو تھامتے ہوئے پھر منہ
ہی منہ میں آہستہ آہستہ بڑبڑاتا ہے]

رمیش:۔ شادی...... دولت...... نوکری...... اور ماں باپ کی خوشی۔
(زور سے) کیا میں ان چیزوں کے لئے اپنے آدرش اور اپنے ساتھیوں
کو چھوڑ دوں...... ان چاندی کے چند سکوں کے لئے
...... (آہستہ آہستہ گردن ہلاتے ہوئے) ہرگز نہیں...... لیکن چاندی
کے تھوڑے سے سکے بھی تو ضروری ہیں۔ میرے لئے نہ سہی۔ ان لوگوں
کے لئے سہی...... میں تو فاقے بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ لوگ خواہ مخواہ میرے
لئے کیوں تڑپیں...... اُوشا...... کانتا......
اس کی تعلیم...... (پھر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیتا ہے) کچھ
سمجھ میں نہیں آتا۔ (باہر سے آواز آتی ہے) "مسٹر رمیش...... مسٹر رمیش
...... مسٹر رمیش" (تیسری آواز پر رمیش تو چونک کر اُٹھتا ہے)......
کون؟...... (اُٹھ کر دروازے کی طرف جاتا ہے) ہیلو منور تھ!
اندر آؤ نا باہر کھڑے کیا دیکھتے ہو؟

منورتھ:۔ (کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور نہایت گرمجوشی سے رمیش سے ہاتھ
ہاتھ ملاتا ہے۔ پھر دونوں گلے ملتے ہیں) کہو رمیش کیا حال ہے۔

[دونوں کرسیوں پر جا بیٹھتے ہیں]

رمیش:۔ آج تم راستہ بھول کر ادھر کیسے آنکلے۔ کہو چائے وغیرہ تو ہو گی ہی۔

منورتھ:۔ نہیں شکریہ۔ میں چائے پی کر آیا تھا۔

رمیش:۔ تب کچھ اور......

منورتھ:۔ تم بار بار کیوں کہہ رہے ہو۔ یہاں کوئی تکلف تو ہے نہیں۔

رمیش:۔ اچھا تمہاری مرضی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اتنا عرصہ تم گم کہاں رہے؟ آج
شاید دو سال کے بعد تم نے صورت دکھائی ہے۔

منورتھ:۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔

رمیش:۔ ارے بھائی خط ہی لکھ دیا ہوتا۔

منورتھ:۔ میں ایک جگہ تھوڑا ہی رہا۔ بس گھومتا رہا۔ ان دو سالوں میں میں نے
سارے ہندوستان کی سیر کی۔ اور اس عرصے میں وہ وہ حسین صورتیں
اور حسین نظارے دیکھے جن کے نقش ابد تک میرے دل پر قائم
رہیں گے۔

رمیش:۔ اچھا تو آپ سیاحت سے لوٹے ہیں۔ اور اب کیا ارادہ ہے؟

منورتھ:۔ اب کچھ کام کرنے کا ارادہ ہے۔ پتاجی نے تو مجھے سنگاپور میں پولیس
انسپکٹر بھرتی ہونے کے لئے کہا تھا لیکن میں نے پولیس کی نوکری
کرنے سے انکار کر دیا۔ اب میرا ارادہ کوئی فلم کمپنی جاری کرنے
کا ہے۔ اور پتاجی کو میں نے منوا ہی لیا ہے۔

رمیش:۔ تمہارے لئے یہی کام موزوں ہے۔ اس میں تمہیں رومان بھی مل جائے
گا۔ اور کام بھی۔

منورتھ:۔ (ہنستے ہوئے) رومان...... ہا ہا...... ہا ہا...... رومان......

رمیش:۔ اپنے سفر کا کوئی دلچسپ واقعہ یا رومان ہی سناؤ۔

منورتھ:۔ پھر کبھی فرصت کے وقت سہی۔ اب تو میں صرف تم سے ملنے ہی آیا تھا۔

رمیش:۔ تمہارے دوسرے دوستوں کا کیا حال ہے۔ وہ شنکر وغیرہ......

منورتھ:۔ سنا ہے شنکر کسی بنک میں ملازم ہو گیا ہے۔

رمیش:۔ (حیرانی سے) بنک میں! کیا وہ ای۔ اے۔ سی میں بھی کامیاب
نہ ہو سکا۔

منورتھ:۔ ای۔ اے۔ سی۔ چھوڑ اُس نے کئی امتحان دیئے لیکن بیچارہ کسی بھی
جگہ کامیاب نہ ہوا۔ سنتے ہیں۔ اب بھی کسی امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔

رمیش:۔ کیا ابھی تک اس میں دم خم باقی ہے۔

منورتھ:۔ کیوں نہ ہو۔ زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش نا تمام سے

رمیش:۔ بھئی خوب کہا۔

منورتھ:۔ تم اپنی کہو آج کل کیا شغل ہے۔

رمیش:۔ وہی جو پہلے تھا تنظیم و تقریر۔ بحث۔ مباحثے۔ تصنیف و تالیف
بس ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف ہی رہتا ہوں۔ لیکن معلوم نہیں
کیوں لوگ مجھے پھر بھی بیکار ہی کہتے ہیں۔

منورتھ:۔ یہ تو ہوا لیکن میرا مطلب ہے کہ تم کوئی ایسا کام بھی کرتے ہو جس سے
آمدنی کا کوئی ذریعہ نکلتا ہو؟

رمیش:۔ یہی تو مشکل ہے کہ پیسے کہیں سے نہیں آتے۔ کوئی ایسا کام نظر بھی تو
نہیں آتا جس سے آمدنی بھی ہو اور ہم اپنے طور پر بیکار بھی رہیں۔

منورتھ:۔ ایسا کام ملنا تو واقعی مشکل ہے۔

رمیش:۔ اور ادھر گھر والوں کا حال بھی پتلا ہو رہا ہے۔ بس فاقوں کی ہی کسر
ہے۔ گھر والوں کی تجویز ہے۔ کہ میں شادی کروں تو سب ٹھیک
ہو جائے گا۔

منورتھ:۔ اور تمہاری کیا رائے ہے۔

رمیش:۔ تمہارے آنے سے پہلے میں یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن ابھی تک کوئی

فیصلہ نہیں کر سکا۔

منورتھ:۔ کیا کسی جگہ رشتہ طے ہوا ہے۔

رمیش:۔ میری رضامندی کے بغیر ہی پتا جی نے تو اپنی طرف سے بات پکّی کر دی ہے۔

منورتھ۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے پتا جی نے کس جگہ بات پکّی کی ہے

رمیش۔ کیوں نہیں! شاید تم نے اُن کا نام بھی سُنا ہو۔ سیٹھ رادھا کشن بتاتے تھے۔ سُنتے ہیں بڑے رئیس اور بارسوخ آدمی ہیں۔ کہیں کام کاج کا بندوبست بھی کر دیں گے۔ اور لڑکی بھی بی۔ اے میں تعلیم پاتی ہے

منورتھ:۔ تو پھر تم سوچ کیا رہے ہو ایسے موقعے تو زندگی میں بار بار نہیں آتے۔

رمیش:۔ یہی سوچتا ہوں کہ اگر یہ بات مان لوں تو اُن کے رسوخ سے شاید کہیں نوکری بھی مل جائے۔ لیکن اس کے عوض مجھے بہت بڑی قربانی کرنا پڑے گی۔

منورتھ:۔ (حیرانی سے) قربانی! قربانی کس بات کی!

رمیش:۔ اسکے عوض مجھے اپنے ضمیر کو بیچنا ہوگا۔ مجھے اپنے آدرش کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ کر اپنے آپکو اُس نظام کیساتھ وابستہ کرنا پڑیگا جسکے خلاف میں آجتک جہاد کرتا رہا ہوں۔ مجھے اپنی اُس زندگی کا اپنے ہی ہاتھوں گلا گھونٹنا ہوگا جو میں نے آجتک بسر کی۔ مجھے اپنی منزل ادھوری چھوڑ کر ایک نئی راہ اختیار کرنی ہوگی کیا یہ قربانی نہیں!

منورتھ:۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ تم نے تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی کبھی غور کیا۔ بیکاری۔ بُھوک۔ فاقہ مستی۔ اور اِس کے علاوہ کیا تم ذلّت کی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہو۔ کیا تمہیں یہ منظور ہے کہ تم اپنے ہی فارغ البال ساتھیوں سے ہاتھ پھیلا کر زندگی کے لوازم کی بھیک مانگو۔ کیا تمہیں اپنے آدرش کی تکمیل کے ساتھ ساتھ شہرت کی خواہش نہیں۔ کیا تم یہ گوارا کر سکتے ہو کہ تمہارے چند بودے ساتھی صرف اپنی امارت کی وجہ سے ہی تمہارے لیڈر بن جائیں۔ اور تم رہو وہی والنٹیر۔ قومی کارکن یا گویا فوج کے محض ایک گمنام سپاہی!

رمیش:۔ میں شہرت کا بھوکا نہیں منورتھ اور تمہیں اس کا یقین دِلاتا ہوں۔ کہ میں نسبتاً ایک گمنام سپاہی کی زندگی زیادہ پسند کرتا ہوں لیکن میں اتنا بے غیرت بھی نہیں کہ بھیک مانگوں۔

منورتھ:۔ لیکن جب کوئی کام ہی نہ کرو گے تو کھانے کے لئے کہاں سے آئے گا۔ آج تک تو تمہاری زندگی کی ضروریات تمہارے والدین پوری کرتے رہے لیکن اب تو اُن کے پاس بھی کچھ نہیں رہا۔ میں نے تمہارے ہی کئی ساتھیوں کو تم سے کھانے کے لئے پیسے مانگتے دیکھا ہے۔ تم اسے بھیک نہ کہو لیکن کیا تم بھی اُسی طرح مانگنے کے لئے تیار ہو؟

رمیش:۔ ہرگز نہیں۔ میری زندگی میں جب کبھی بھی بھوک اور غیرت کا سوال آئے گا ہمیشہ میری غیرت غالب رہے گی۔ اور میں ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گا۔

منورتھ:۔ بات تو بعید از قیاس ہے لیکن مان لیا کہ اپنے متعلق تمہارا یہ فیصلہ ہے لیکن تمہارے بوڑھے ماں باپ اور جوان بہنوں کا کیا ہوگا۔ کیا تم یہ گوارا کر سکو گے کہ وہ ذلّت اور فاقوں کی زندگی بسر کریں۔ جبکہ اُنہیں اِس زندگی سے بچانا تمہارے اختیار میں ہو؟ کیا تم اپنی تصوّر کی دُنیا میں آباد ہونے کے لئے اِن لوگوں کی بھینٹ چڑھا دو گے۔

[پہلے کمرے کی طرف سے کسی کے آنے کی آواز آتی ہے۔ اور پھر جلد جلد کچھ گھبرایا ہوُا۔ سراسیمگی کی حالت میں پریم کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ منورتھ کو دیکھکر وہ اپنے حواس درست کرتا ہے۔ اور منورتھ سے ہاتھ ملاتا ہے]

پریم:۔ ہیلو منورتھ۔ آج تم یہاں کیسے!

منورتھ:۔ میں کل ہی یہاں آیا تھا۔ کہو اچھے تو ہو؟

پریم:۔ ہاں! مہربانی۔

وقفہ

پریم:۔ بھائی منورتھ معاف کرنا۔ رمیش کو اس وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

رمیش:۔ کہاں؟

پریم:۔ ایشیاٹک ملز میں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں۔ کہ آج ہی وہاں سخت ہنگامہ ہو گیا۔ مل کا سیٹھ زبردستی ہماری ہڑتال توڑنا چاہتا تھا۔ اور پولیس کی مدد سے مل میں نئے مزدور داخل کرنا چاہتا تھا لیکن جب مزدوروں کی پُرامن اور کامیاب پکٹنگ سے اُنہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو پولیس نے لاٹھی چلا دی۔

رمیش:۔ کیا کوئی زخمی بھی ہوُا؟

پریم:۔ بہت سے مزدور زخمی ہوئے بھنخو کی حالت تو سخت نازک ہے۔ میں ابھی اُسے ہسپتال پہنچا کر آیا ہوں۔ میں نے سوچا کہ راستے میں تمہیں بھی ساتھ لے لوں آج ہم مل کے سامنے ایک زبردست

[illegible] رہے ہیں شاید گرفتاریاں بھی ہوں۔

رمیش: ۔ چلو تم چلو میں آرہا ہوں۔ ذرا منورتھ سے ایک بات کرلوں۔

پریم: ۔ اچھا۔ دیکھو دیر نہ لگانا۔

رمیش: ۔ نہیں! نہیں! میں ابھی آیا۔

[پریم جاتا ہے]

منورتھ: ۔ کیا اب گرفتار ہونے کا ارادہ ہے؟

رمیش: ۔ ایک طرح سے تو اچھا ہے کہ اگر گرفتار ہو جاؤں تو اس ذہنی کشمکش سے تو نجات ملے۔

منورتھ: ۔ جیل میں تمہیں تو روٹی مل ہی جائے گی۔ باقی رہ گئے تمہارے بوڑھے والدین سو تمہاری بلا سے۔

رمیش: ۔ کاش کہ میرا دنیا میں کوئی نہ ہوتا۔

منورتھ: ۔ اچھا تو مجھے اب چلنا چاہیئے۔ تمہیں دیر ہو رہی ہو گی۔

رمیش: ۔ تھوڑی دیر تو اور بیٹھو۔

منورتھ: ۔ (کرسی پر سے اٹھتے ہوئے) نہیں اب اجازت ہی دو۔ وہ لوگ بھی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔

[ہاتھ بڑھاتا ہے۔ رمیش اٹھکر منورتھ سے ہاتھ ملاتا ہے۔ اور اُسے دروازے پر چھوڑنے جاتا ہے]

منورتھ: ۔ اگر تم آج گرفتار نہ ہوئے تو پھر ملاقات ہو گی۔ اچھا گڈ بائی۔

رمیش: ۔ گڈ بائی!

[منورتھ جاتا ہے۔ رمیش اُس وقت تک دروازے پر کھڑا رہتا ہے جب تک منورتھ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا پھر وہ آہستہ آہستہ گردن جھکائے میز کی طرف آتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ میز سے ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھتا ہے اور پھر باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف مڑتا ہے۔ لیکن یکدم جیسے کچھ سوچ کر ٹوپی سر سے اُتار کر زور سے میز پر پٹک دیتا ہے۔ پھر کمرے کے اندرونی دروازے کی طرف جاتا ہے۔ لیکن اُس کے نزدیک پہنچ کر پھر ٹھٹک جاتا ہے اور منہ میں بڑبڑانے لگتا ہے "لیکن وہ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ میں گرفتاری سے ڈر گیا ہوں" وہاں سے پھر میز کی طرف مڑتا ہے۔ اور ٹوپی کو ہاتھ میں اٹھا کر کچھ سوچنے لگتا ہے۔

اسی حالت میں کمرے کے اندرونی دروازے کے اندر کی طرف سے اوشا آواز دیتی ہے "رمیش بھائی" رمیش آواز نہیں سنتا تو اوشا دروازے میں سے جھانک کر اور رمیش کو اکیلا دیکھکر اُس کے پاس آجاتی ہے۔ اور اپنا منہ اُس کے کان کے پاس لے جاکر زور سے پکارتی ہے۔]

اوشا: ۔ "بھائی جان!"

رمیش: ۔ (چونک کر اوپر دیکھتے ہوئے) کیا ہوا! اتنے زور سے کیوں چلا رہی ہو؟

اوشا: ۔ تم سنتے جو نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی گہری سوچ میں تھے۔ شاید نئی بھابی کے متعلق ہی کچھ سوچ رہے تھے۔ (شرارت سے ہنستے ہوئے) یہی بات تھی نا؟

رمیش: ۔ ہٹ پگلی۔ تجھے تو ہر وقت دِلگی ہی سوجھتی ہے۔

اوشا: ۔ کیا کہیں جا رہے تھے؟

رمیش: ۔ نہیں تو۔

اوشا: ۔ (ہنستے ہوئے) تمہیں ماتا جی اندر بلا رہی ہیں۔

رمیش: ۔ کیا بات ہے۔ اتنا ہنس کیوں رہی ہو؟

اوشا: ۔ تم اندر تو چلو۔

رمیش: ۔ لیکن بات بھی تو بتاؤ۔

اوشا: ۔ (نفی میں سر ہلاتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے) ہوں! ہوں!

رمیش: ۔ بتاؤ بھی نہ اوشا۔ آخر یہ نئی آفت کیا ہے؟

اوشا: ۔ (جیسے کسی بچے کو ڈرا رہی ہو) بہت بڑی آفت ہے۔ اس سے ہمیں بھابی ملے گی اور تمہیں......

رمیش: ۔ (ذرا خشمگیں ہو کر) چپ رہو اوشا۔ اگر نہیں بتاتی تو نہ بتاؤ۔ جاؤ ماں سے کہہ دو کہ میں باہر گیا ہوں۔

[ٹوپی اٹھا کر باہر جانے کو ہے لیکن اوشا اُس کے پیچھے بھاگتی ہے۔]

اوشا: ۔ اچھا لو سنو۔ میں ابھی بتاتی ہوں۔ سنو بھی۔

رمیش: ۔ (واپس آکر) کہو۔

اوشا: ۔ تمہارے سسرال والوں کی طرف سے تمہیں بلاوا آیا ہے۔ اُن کے ہاں آج کسی انگریز افسر کی دعوت ہے۔ انہوں نے تمہیں بھی بلا بھیجا ہے تاکہ تم سے بھی واقفیت ہو جائے۔

رمیش: ۔ (بلند آواز سے غصے میں) میرے کوئی سسرال نہیں اور نہ مجھے کسی سے واقفیت درکار ہے۔

اوشا: ۔ ذرا آہستہ بات کرو بھائی۔ ابھی شاید اُن کا نوکر یہیں اندر ہے۔

رمیش:۔ (بلند آواز سے) مجھے کسی کی بھی پروا نہیں۔ جاؤ تم ماں سے کہہ دو کہ میں نہیں جاؤں گا۔

اُوشا:۔ (نہایت عاجزی سے) غصہ نہ کرو بھائی۔ چلو اندر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اندر ماں بُلا رہی ہے۔

رمیش:۔ تم لوگ مجھے پاگل بنا کے رہوگے۔ تم میرا گلا گھونٹنا چاہتے ہو۔ لیکن تم یہ نہ کر سکوگے۔

[اندر سے رمیش کے باپ کی آواز آتی ہے "اوشا۔ ری اُوشا"]

اُوشا:۔ (رمیش سے) چلو بھائی، جلدی چلو، پتاجی ناراض ہو رہے ہیں۔

رمیش:۔ ہونے دو۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ تم جاؤ، کہہ دو، کہ میں نہیں جاؤں گا۔

[اندر سے پھر آواز آتی ہے "اُوشا" اُوشا جواب میں پکارتی ہے "آئی جی" اور اندرونی دروازے کی طرف واپس بھاگتی ہے۔ اُوشا کے پیچھے رمیش دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے کھڑا ہے۔ اُس کا چہرہ جوشِ غصے اور استقلال کے ملے جُلے جذبات سے سُرخ ہو رہا ہے۔ اُس کا سینہ تنا ہؤا۔ اور چہرے کے اعصاب کھچے ہوئے ہیں۔ لیکن یکایک اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے اُس کی مٹھیاں آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ اور وہ دھڑام سے کُرسی پر گر پڑتا ہے۔ دوسرے کمرے سے رمیش کے باپ کے کھانسنے اور کھانسی کے دوران میں ہی گالیوں کی آواز آتی ہے۔ رمیش آہستہ سے کُرسی پر سے اُٹھتا ہے۔ اور کمرے کے اندرونی دروازے کے پاس جاکر مری ہوئی آواز میں اُوشا کو پکارتا ہے۔ جیسے تپ دق کا مریض کھانسی کے دورے کے بعد کسی کو دوا لانے کے لئے پکارتا ہے۔ اُوشا بھاگتی ہوئی باہر آتی ہے]

رمیش:۔ (آنکھیں زمین پر ہی گاڑے ہوئے اور نہایت پُرسوز آواز سے) جاؤ ماں سے کہہ دو کہ میں جاؤں گا۔

[اُوشا خوشی سے اندر جاتی ہے اور رمیش ڈگمگاتے ہوئے میز کے پاس پہنچتا ہے۔ اور میز سے ٹوپی اُٹھا کر سر پر رکھ لیتا ہے۔]

(پردہ)

نریندر ناتھ

حج ٹریفک کی ضروری معلومات

۱ ۔ ۱۹۳۰ء کے ابتدائی چھ ماہ تک مغل لائن کے علاوہ دو خالص اسلامی جہاز ران کمپنی نمازی اور شوستری بھی اس ٹریفک میں حصہ لے رہی تھیں لیکن برطانوی جہاز ران کمپنی مغل لائن نے تباہ کن ریٹ وار تخفیف کرایہ کے ذریعہ ۱۹۳۰ء کے اختتام تک شوستری کمپنی کو اور اس کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۳۱ء میں نمازی کمپنی کو بھی اس لائن سے ہٹا کر حج ٹریفک کی واحد اجارہ داری حاصل کرلی۔

۲ ۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء کے آغاز تک اس ٹریفک کی واحد اجارہ داری مغل لائن کو حاصل رہی اور اس دور اجارہ داری میں جن تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان شکایتوں سے تمام اخبارات سیاہ اور حج کمیٹیوں کے دفتر بھرے پڑے ہیں

۳ ۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم زعما، تجار اور عوام کی کوشش اور درخواست پر مشہور ہندوستانی جہاز ران کمپنی سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی لمیٹڈ اس حج ٹریفک میں داخل ہوگئی جس سے مغل لائن کی واحد اجارہ داری کا نظام درہم برہم ہو گیا

۴ ۔ ۱۹۳۷ء کا سال حاجیوں کے لئے نیک فال تھا۔ چونکہ اس سال نہ صرف حجاج آزار مغل لائن کمپنی کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ بلکہ سندھیا کمپنی نے حاجیوں کی گزشتہ شکایتوں کے غائرانہ مطالعے کے بعد زر کثیر صرف کرکے المدینہ جیسے آرام دہ اور تیز رفتار جہاز سے (جو خاص طور پر حاجیوں کے لئے بنایا گیا ہے) اس ٹریفک کی ابتدا کی اور بعد میں جدید جہاز الھند کا اضافہ کیا۔ اور اپنے جہازوں کے ڈیک میں بجلی کے پنکھے۔ لائبریری۔ باجماعت نماز کے لئے علیحدہ جگہ۔ ہواخوری اور مستورات کے لئے اسپیشل جگہ اور وعظ و اعلان وغیرہ کے لئے مائیکروفون وغیرہ کا انتظام کر کے اس ٹریفک کی کایا پلٹ دی اور المدینہ جہاز نے تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کر کے۔ اس طویل بحری سفر کو مختصر کر دیا۔

۵ ۔ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں یعنی سندھیا کمپنی کے داخلے کے تیسرے سال ہی حکومت ہند نے اس ٹریفک کی اپنی نامنصفانہ تقسیم کے فیصلے سے جس کے ذریعے اس ٹریفک کا ۷۵ فی صدی حصہ مغل لائن کو اور اس دیسی کمپنی کو حجاج کی اعلیٰ خدمات کے باوجود ۲۵ فی صد حصہ ملتا ہے۔ سندھیا کمپنی کو مجبور کر دیا کہ اپنے جہازوں کی روانگی احتجاجاً ملتوی کردے۔

۶ ۔ ۱۹۴۰ء میں پھر حکومت ہند نے اس دیسی کمپنی کو اپنے طرزِ عمل سے مجبور کر دیا کہ اپنے گزشتہ فیصلۂ التوائے روانگی جہازات پر بدستور قائم رہے۔

نوٹ:۔ اس بیان کی صداقت کی ذمہ داری کسی صورت میں ایڈیٹر یا پبلشر ادبی دنیا پر نہیں ہے۔

بھولی بسری رات

پچھلی رات کا چاند دکھائی دیتا تھا کچھ یوں تاروں میں
جیسے کوئی جان بوجھ کر کود رہا ہو انگاروں میں

دھرتی سے آکاش تلک کرنوں کا سندر جال بچھا تھا
راج تھا سپنوں کا سب جگ پر چھایا ہوا اک سناٹا تھا

لہروں کی مُنہ زور سلوٹوں میں ندی بس گھول رہی تھی
دھیمے دھیمے مدھر سروں میں شاید وہ کچھ بول رہی تھی

پیڑ کنارے پر بھیگی پُروا سے کانپ رہے تھے تھر تھر
رہ رہ کر اک آدھ ان دیکھا پنچھی چیخ اُٹھتا تھا جن پر

دور اک پربت کی اونچی چوٹی پر اک چھوٹی سی بدلی
کیا جانے پورب کے دھندلے منڈل میں کیا ڈھونڈھ رہی تھی

ایسے میں ہم دونوں اک ہلکی سی ننھی ناؤ میں بیٹھے
جھلمل جھلمل کرتے پانی کی چھاتی پر تیر رہے تھے

تیری رُخ پہ پریشاں کاکل کھیل رہی تھی نرم ہوا سے
روپ میں تیرا سندر مکھڑا کہیں سہانا تھا چندا سے

بجلی ایسا نور آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا کچھ ایسے
جلتے ہوں دو ننھے ننھے دیپک کالی رات میں جیسے

رہ رہ کر ساری کا آنچل کاندھے پر سے ڈھلک جاتا تھا
رہ رہ کر تجھ سے کچھ کہنے کو میرا جی للچاتا تھا

لیکن رُک جاتی تھی ہونٹوں پر جو بات اُٹھتی تھی من میں
پریم کی چنچلتا اُلجھی تھی لاج کی ان سُلجھی اُلجھن میں

جھوم رہا تھا جاگتے سپنوں کا سنسار آنکھوں میں ایسے
اوس کے موتی جھول رہے ہوں پھولوں کے جھولوں میں جیسے

انگ انگ بے چین تھا، جیسے ہاتھوں سے چھوٹا جاتا تھا
اور یوں میرے صبر کا پیالا رہ رہ کر چھلکا جاتا تھا

ایکا ایکی تو نے بھری اک ٹھنڈی سانس انگڑائی لے کر
چُپ کی تھکن سے تنگ آئی تھی سر کو رکھا میرے کاندھے پر

پھر کیا تھا دل ایسے مچلا اپنے آپ کو بھول گیا میں
زور سے تجھ کو بھینچ کر اپنی باہوں میں کچھ بول اُٹھا میں

الگ میں کیا، آکاش کے تارے بھی وہ رات نہیں بھولے ہیں
جس کو گذرے آج تو لگ بھگ چار مہینے بیت گئے ہیں

اب بھی اُس کی یاد مچا دیتی ہے اک ہلچل سی من میں
ایسی رات نہیں آتی ہے پلٹ کر کیوں میرے جیون میں!

تخت سنگھ

سکھ سنچارک

چون پراش

ویدک پستکوں میں تو اس بیش بہا طاقت کی دوا کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ لیکن ایسے ڈاکٹروں کی بھی کمی نہیں ہے جنہوں نے اپنے مریضوں پر اس مستقل فائدہ پہنچانے والی دوا کا تجربہ کیا ہے اور اپنے ہم پیشہ دیگر ڈاکٹروں سے اپنے مریضوں پر اس کا تجربہ کرنے کی سفارش کر رہے ہیں حال ہی میں مدراس کے ایک مشہور ڈاکٹر مسٹر جیسوستہ نے Rejuvenation یعنی دوبارہ جوانی حاصل کرنے پر ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب میں کایا کلپ کا ذکر کرتے ہوئے چون پراش کے فائدوں پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"یوں تو ویدک پستکوں میں گئی ہوئی
جوانی کو دوبارہ حاصل کرنے کے
بہت سے طریقے بیان کئے گئے ہیں
لیکن ذیل کے تین خاص طور پر مشہور ہیں

۱۔ برہم رسائن۔ ۲۔ چون پراش۔ ۳۔ آملک کلپ

چون پراش کی کتھا اس طرح بیان کی گئی ہے۔ کہ گذشتہ زمانہ میں ہمالیہ پربت کی ایک گپھا میں چون نام کے ایک رشی رہا کرتے تھے۔ ان کے کئی استریاں تھیں۔ اور وہ بڑے کامی تھے۔ آخر وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے اور ان کی قوت مردمی جاتی رہی۔ وہ ایک روز اشونی کمار کے پاس گئے اور اپنی ساری کتھا سنائی ان کے علاج سے وہ ایسے جوان ہو گئے کہ لوگ پہچان نہ سکے اس کے بعد مدت تک پر لطف زندگی بسر کی جس مہا رسائن سے چون رشی کو دوبارہ جوانی حاصل ہوئی آخر انہی کے نام پر اس کا نام چون پراش مشہور ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف مسٹر بیتھوریج چون پراش کے گنوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ میں نے مغربی ہند کے تقریباً تمام ویدوں سے بات چیت کی۔ سب نے بتلایا کہ وہ ہر سال اپنے ہزاروں مریضوں کو چون پراش استعمال کراتے ہیں جن میں سے ۹۰ فیصدی کو اس سے پورا پورا فائدہ پہنچتا ہے۔ بہت سے مریض قاعدہ کے مطابق اس کو استعمال نہیں کرتے۔ تب بھی ان کو اس سے فائدہ پہنچا

ہے اسلئے یقین کیساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ صحت اور تندرستی پر چون پراش کا نہایت اچھا مستقل اثر پڑتا ہے دو ہفتے کے استعمال سے اس کا چمتکار نظر آنے لگتا ہے اور تین ماہ تک باقاعدہ استعمال کرنے سے تو ان کی کایا پلٹ ہی ہو جاتی ہے چہرہ پر رونق آ جاتی ہے جسم میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ قوت مردمی بڑھ جاتی ہے۔ عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بڑھاپا آ جانے پر بھی انسان کے ہمت اور حوصلہ میں کمی نہیں آتی۔ بلکہ بہت سے آدمیوں کا تو پہلے ہی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اور کمزوری دور ہو جاتی ہے بہت سے آدمیوں کا وزن بھی بڑھ جاتا ہے تندرست آدمی کو دو چمچہ چون پراش دن میں تین بار استعمال کرنی چاہیئے۔ لیکن جو آدمی باقاعدہ اس کا استعمال کرنا چاہیں ان کو وید کی ہدایت کے مطابق استعمال کرنی چاہیئے۔ کمزور آدمیوں کو ایک تولہ سے شروع کرنا چاہیئے۔ اور بعد میں آہستہ آہستہ بڑھا دینا چاہیئے۔ چون پراش میں ایک بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ یہ بڑی سستی۔ خوش ذائقہ اور سہج استعمال کی چیز ہے۔ ہر جگہ مل جاتی ہے۔ اس کی قیمت تقریباً پانچ چھ روپیہ سیر ہوتی ہے۔ اور ایک سیر ایک ماہ کیلئے کافی ہے۔

ایک بات ہم بھی بتا دینا چاہتے ہیں۔ کہ یہ طاقت کی دوا بڑی مشہور ہے۔ اس وجہ سے بہت فروخت ہوتی ہے جو آدمی آیورویدک طریقہ پر علاج کرتے ہیں۔ وہ ضرور اپنے ہاں بنا کر رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ جن کو آیور وید کا ذرا بھی واقفیت نہیں ہے۔ وہ بھی بیوپار کی غرض سے جیسے تیسے بنا لیتے ہیں۔ لیکن شاستروں کے مطابق بنانے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس لئے جو آدمی رسائن کو استعمال کرنا چاہیں۔ ان کو اس بات کا اندازہ لگا لینا چاہیئے کہ چون پراش کسی کامل وید کی یا اس کی نگرانی میں بنائی گئی ہے یا نہیں۔ لمبے چوڑے اشتہار ہی کافی نہیں ہوتے۔ اسوقت سکھ سنچارک کمپنی متھرا جو چون پراش تیار کر رہی ہے۔ وہ قابل اعتبار اور سفید منید ہے خالص آیورویدک طریقہ پر تیار کیا ہوا شرطیہ دنگ یکتا ہے یہ باتیں بازاری چون پراش میں نہیں پائی جاتیں اس کو سب اچھا اور ذائقہ دار ہے۔ بھرتے آدمی نمونہ مفت منگا سکتے ہیں

۵۰ سال کے بعد

متواتر زبردست کوشش و جانفشانی اور کافی روپیہ صرف کرنے کے بعد ہم کو اس بیش بہا دوا کے ایجاد کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

یوبن شکتی

یہ بیش قیمت دوا بالکل سائنسدانوں کے اصولوں پر تیار کی گئی ہے۔ کمزوری دور کرنے کی سب سے بہترین دوائیاں جو کہ آج تک سائنسدانوں نے مہیا کی تھیں۔ ان سب کا مرکب کر کے یہ دوا تیار کی گئی ہے۔ اس سے ہر قسم کی کمزوری دور ہو جاتی ہے جسم میں جوانی کی تمام خوبیاں پیدا کرنے میں یہ دوا لاثانی ہے۔ جسم میں طاقت پیدا کرنے والی ایسی دوا جو کہ قابل سائنسدانوں نے تلاش کر کے اور ہندوستان کی آب و ہوا کو مد نظر رکھتے ہوئے دو سنہری گولیوں کی شکل میں زبردست تجربہ کیساتھ تیار کی ہے۔ جس سے کمزوری اور بد ذائقہ دوا سے بچنے والے بھی آسانی سے اس دوا کو استعمال کر سکیں۔ جو اپنی جوانی کو وقت مقررہ سے پہلے ہی برباد کر چکے ہیں۔ یا جن اشخاص کو اپنے جسم کے اندر اور زیادہ طاقت کی ضرورت ہے یا بڑھاپے کی وجہ سے جسم کمزور ہو گیا ہے۔ اور جوش جاتا رہا ہے۔ جن لوگوں نے جوانی سے قبل ہی اپنے ہاتھوں اپنی طاقت کو برباد کر کے زندگی کو ہیچ سمجھ رکھا ہے اور روزانہ آئے دن کمزوری کے باعث ان کے سر میں درد ہاتھ پیروں میں جھنجھناہٹ اور کسی کام کے کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی ہو۔ دماغ کی کمزوری وغیرہ خرابیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان سب کے واسطے یہ دوا آب حیات ہے۔

مذکورہ بالا تکالیف کے دور کرنے کی اس میں عجیب طاقت ہے۔ یہ گولیاں استعمال کرتے ہی روز بروز جسم میں قوت پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح رسائنک طریقوں کے ذریعہ پیدا ہوئی طاقت ہمیشہ قائم رہنے والی ہوتی ہے۔ یہ دوا جسم کو تندرست اور توانا و چست بناتی ہے۔ تمام نسوں کی کمزوری نیز اعضا رئیسہ کے بے حس و حرکت و کمزور ہونے کو دور کرتی ہے۔ اور چہرہ کو بارونق بناتی ہے۔ ہر حالت میں عورت مرد دونوں کو یکساں مفید ہے۔ امید ہے۔ کہ ایک مرتبہ ضرور منگا کر ہماری محنت کو کامیاب بنانے کی غرض سے اس دوا کی آزمائش کیجئے۔ اس دوا کی ۲۵ گولیاں بھی

قیمت صرف ڈھائی روپیہ (عہ۲)

اس غرض سے رکھی ہے۔ کہ ہر شخص خرید کر استعمال کر سکے۔ اس میں بیش قیمت اشیاء ہونے کی وجہ سے اس کی یہ قیمت کم سے کم ہے۔

سکھ سنچارک کمپنی لمیٹڈ متھرا (یو۔پی)

دومیل کی ایک شام

شامِ فردوس سے کچھ کم نہیں دومیل کی شام
یہ بھی ہے نقش گرِ حسن کا اک نقش تمام

اک جہاں حسن کا دیکھا ہے بیابانوں میں
ہیبت افروز ہے اک خلد کہستانوں میں

میکدہ ہے نہ چمن پھر بھی کوئی محفل ہے!
جانِ رنگ و مے و نغمہ ہے، یہ کس کا دل ہے!

مطربِ شام! یہ کیا زمزمہ آرائی ہے
لہلہاتے ہوئے اشجار کو نیند آئی ہے

ایک شورش کدہ سرمست نظر آتا ہے
یہ مکاں میکدۂ ہست نظر آتا ہے

چھپ رہے ہیں پسِ کہسار شفق کے منظر
اک پہاڑی پہ ہیں دامانِ افق کے منظر

مترنم ہے پریشان ہواؤں کا سکوت
متبسم ہے دھندلکے میں فضاؤں کا سکوت

قابلِ دید ہے یہ منظرِ تابانیٔ شام
رقص تاریکیوں میں کرتی ہے عریانیٔ شام

کھو گیا دیکھ کے میں فطرتِ موجود کا رنگ
نظر آتا ہے کسی گلشنِ نابود کا رنگ

دل میں ہو عشق تو دنیائے محبت ہے یہی
دیدۂ حسن نگہ چاہیئے جنت ہے یہی

قلۂ کوہ پہ اِس وقت کھڑا ہے کوئی
فرطِ حیرت سے چٹانوں میں گڑا ہے کوئی

یہ وہ لعبت ہے جسے طاقتِ پرواز نہیں
یا وہ انساں جو کبھی زمزمہ پرداز نہیں

یہ نہیں محفلِ فطرت کے ادب سے آگاہ
یہ نہیں حُسن کی رونق کے سبب سے آگاہ

یہ گوالن ہے اسے فکرِ نگہبانی ہے
گلّہ بانی ہی فقط اس کی پریشانی ہے

سرِ کہسار سے جویائے تمنائی ہے
حُسنِ صحرا کو یہ کہتے ہیں کہ ہرجائی ہے

یہ توحش، یہ تحیّر، یہ خموشی، یہ جمود
میں کھڑا دیکھتا ہوں رنگِ تماشائے وجود

نظر آتی ہے مجھے یہ کوئی موہوم سی شے
یہ مگر میرے تخیّل کی کوئی دیوی ہے!

دیکھو دیکھو وہ پسِ کوہ سے بادل سرکے
کن حسینوں کے یہ چھوٹے ہوئے آنچل سرکے!

جسمِ فطرت میں مچلنے لگی روحِ معصوم
کوہ کی گود میں ہونے لگا پریوں کا ہجوم

وسعتِ کوہ پہ اُڑنے لگا بادل کا دھواں
دامنِ نیل پہ یا سیم کے گالے ہیں رواں

دیکھ اے چشمِ نظارہ تراکاجل ہے یہی
شاہدِ حُسن کا گیسوئے مسلسل ہے یہی

آگ برسی ابھی صحرا کی فضاؤں میں کہیں
سانس دریا کے رُکے جا کے ہواؤں میں کہیں

کوہ کے سینۂ سنگیں سے بھی آہیں اُٹھیں
جل گیا دل تو دھواں بن کے نگاہیں اُٹھیں
حسنِ فطرت کے تماشا کی اسے تاب کہاں
اس کی پتھرائی ہوئی آنکھ میں یہ آب کہاں

سیل در سیل ہے ہنگامہ روانی پانی
زہرۂ برق و دلِ رعد میں پانی پانی
لے چلا سوئے فلک دامنِ دریا کوئی
آبناؤں میں سمندر اُمڈ آیا کوئی
ابرِ نالاں کی فضا کوہ سے کیوں لڑتی ہے
کوئی طوفاں ہے کہ بھادوں کی جھڑی پڑتی ہے
شبہ ہوتا ہے کہ غربالِ فلک ٹوٹ گئی
دیکھ اے بحر تری نبض کہیں چھوٹ گئی!

جا بجا رنگ کے مینار ہیں اس پانی میں
مضطرب حسن کے افکار ہیں اس پانی میں
کاسۂ نور ہے ہر جامِ حبابِ جہلم
کہکشاں بھی نہیں اس وقت جوابِ جہلم
کوئی دیکھے تو دمِ شوق حجابِ جہلم
کرشن گنگا سے ہم آغوش ہے آبِ جہلم
دونوں کس سمت سے آتے ہیں کہاں جاتے ہیں
اشک ہیں دیدۂ حسرت سے رواں جاتے ہیں
تا دمِ وصل وہی گریہ وہی شیون ہے
شوق ان کا ہے کہ ہر لحظہ سکوں دشمن ہے

ہائے اس شور کے پردے میں کوئی گاتا ہے
آرزوئے دلِ پُرشوق کو لہراتا ہے
دل کا گریہ بھی یہی، روح کا نالہ بھی یہی
ہمنشیں اب مری دنیا مری دنیا نہ رہی
وطن ہے پردیس کی یا ہے کوئی فریاد آہ اس
دشت و کہسار میں پھرتی ہے کوئی یاد اُداس
یاد تیری نے مجھے پھر پایہ رسوائی ہے
پھر مرے داغِ تمنا پہ بہار آئی ہے
آ کہ یہ بزم ہے عشاق کی دنیائے بہار
آ کہ حاصل ہے یہاں حسن و جوانی کو قرار
آ کہ بڑھتا ہے یہاں ذوقِ محبت کا خمار
آ کہ تائب بھی ہے یاں توبہ کشِ جامِ بہار
آ کہ دومیل میں اک بار بنائیں سنگم
اہلِ فطرت کو محبت کا دکھائیں سنگم

مرا تب علی تائب

شعر

شبِ وصل آخر ہوئی، جلد جاؤ
یہاں اور ساماں ہوا چاہتا ہے

داغ

ڈراما میں کردار کی اہمیت

(۱)

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیج پر ڈراما کی کامیابی کے لئے ایک دلچسپ اور الجھا ہوا پلاٹ کافی ہے۔ پرانے ڈراما نگار اور نقاد زیادہ تر پلاٹ پر ہی تکیہ کرتے تھے اور ڈراما کی کامیابی اور ناکامی کا دار و مدار پلاٹ ہی پر سمجھتے تھے۔ پرانے زمانہ میں چونکہ عام طور پر ڈراما اسٹیج سے جدا نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ اسٹیج سے ڈراما کو الگ کرنا گوشت سے ناخن کا جدا کرنا تصور کیا جاتا تھا اس لئے یہ خیال ایک حد تک درست بھی تھا لیکن اب اسٹیج کے سوا ڈراما کتابی صورت میں بھی قارئین کی نظروں کے آگے آتا ہے اس لئے ڈراما ایک وقتیہ نہیں بلکہ ادب کی دیرپا صنف ہو گیا ہے۔ معمولی سے الجھے ہوئے پلاٹ کی دلچسپی اب تجسس اور غور و فکر سے کام لینے والی نظروں کو لبھا نہیں سکتی۔ پڑھنے والا کہانی کی دلچسپی کے علاوہ افراد ڈراما کی نبضوں کو بھی ٹٹولتا ہے، انسانی فطرت کی تلاش کرتا ہے اور کرداروں کے نفسیاتی ارتقا کی توقع کرتا ہے۔ اگر یہ چیزیں ڈراما میں نہ ہوں تو اس کا اب مقبول ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسلئے ضروری ہو گیا ہے کہ افسانہ کی دلچسپی کے سوا افرادِ ڈراما بھی قارئین اور ناظرین دونوں کی ٹوہ لگانے والی نظروں کو مطمئن کر سکیں۔

کہانی کا مذاق مختلف اشخاص اور مختلف ممالک و اقوام کے رجحانات ان کی ذہنیتوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے اولتا بدلتا رہتا ہے۔ جس طرح دونوں کی نفسیات ایک سی نہیں ہوتیں اسی طرح دو قوموں کا مذاقِ افسانہ ایک سا نہیں ہوتا۔ تھوڑے بہت فرق کے سوا بعض اوقات عمیق اختلافات بھی ہوتے ہیں اور اس کا بھی امکان ہوتا ہے کہ ایک چیز ایک قوم کو پسند آتی ہے اور وہی چیز دوسری قوم کو ناپسند ہوتی ہے۔ پھر اس کے سوا طرفہ تماشا یہ ہے کہ وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ مذاق بھی بدلتا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف انسانی فطرت میں اتنا تغیر مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت نہیں ہوا۔ نہ فطرت انسانی ملکوں کی جغرافیائی تقسیم سے بدلتی ہے اور نہ وقت کے گذرنے سے متغیر ہوتی ہے۔ قدرت اور فطرت جس ڈگر پر چل رہے ہیں اگر اس میں فرق رونما ہو جائے تو نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ اس لئے جزئی فرق کے سوا جو بعض صورتوں میں ناگزیر ہوتا ہے عام طور پر فطرت انسانی میں آئے دن نت نیا فرق رونما نہیں ہوتا رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو ڈراما فطرت انسانی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرے گا وہ نسبتاً دیرپا اور عالمگیر ہوگا۔ اس کے لئے ڈراما نگار کو پلاٹ سے زیادہ افراد ڈراما کی سیرت نگاری پر توجہ کرنی پڑتی ہے اور جب تک کردار فطرت انسانی کے عین مطابق اور اُن میں زندگی کے آثار نہوں سیرت نگاری مکمل نہیں ہوتی۔

پرانے ڈراما نگاروں نے جب کبھی دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر بہرحال سیرت نگاری پر زیادہ توجہ کی تو ڈراما کو بقائے دوام کا تاج حاصل ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر شیکسپیئر کو لیجئے اس کے ڈرامے آج بھی دنیا کے سارے ڈراما نگاروں سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں لیکن پڑھنے والوں سے ان ڈراموں کے افسانوں سے متعلق گفتگو کیجئے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بہت سوں کو تو افسانے پسند ہی نہوں گے اور بہت سوں کو پسند ہوں گے پھر بھی وہ سب کے سب شیکسپیئر کے ڈراموں کو پسند کرتے ہیں، یاد رکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں ——— کیوں؟ صرف اس لئے کہ شیکسپیئر کے افراد ڈراما بے حد جاذبِ نظر اور غیر معمولی دلچسپ ہیں۔ "مرچنٹ آف وینس" آپ نے بارہا پڑھا ہوگا افسانہ کی پیچیدگیوں سے آپ نے لطف اُٹھایا ہے یا "شائی لاک" کے کردار سے؟ "اتھیلو" کو آپ نے پسند کیا ہوگا۔ کیا آپ کو اس کا افسانہ یاد ہے یا ایک کالے کلوٹے رشک و حسد کرنے والے انسان کا کردار؟ آپ نے افسانہ کی گتھی کو سلجھانے کے لئے اس ڈراما کو ایک ہی نشست میں پڑھا ہے — یا اتھیلو کا انجام معلوم کرنے کے لئے؟ "لیئر" ! اُف ! آپ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں گے۔ کیا اس کا پلاٹ اتنا خوفناک ہے یا "لیئر" کا کردار؟ دو بیٹیوں کی دنیا طلبی کے لئے جھوٹی خوشامد، ایک بیٹی کی حقیقت شناس صاف گوئی، اور باپ کی غلط فہمی! ——— یہ افسانہ نہیں روزمرہ کے واقعات ہیں جو شیکسپیئر سے پہلے بھی گذر چکے ہیں، شیکسپیئر کے زمانہ میں بھی گذرے ہیں اور اب شیکسپیئر کے بعد

بھی گذر رہے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس وجہ سے کہ فطرت انسانی کے عین مطابق سیرت نگاری کا کمال دکھایا گیا ہے۔ انسانی کمزوریوں کو فطرتی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ اس میں افسانوی دلچسپی سے زیادہ سیرت نگاری کا کمال مضمر ہے اس لیئے ان کی شہرت دائمی اور مقبولیت عام ہو گئی۔

یہ خیال رہے کہ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ڈراما میں سوائے کردار کے کچھ اور نہیں ہوتا یا یہ کہ پلاٹ اہمیت نہیں رکھتا بلکہ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جو ڈرامے پلاٹ کی خوبی کی وجہ سے شہرت حاصل کرتے ہیں ان کی زندگی اتنی دیرپا نہیں ہوتی جتنی کہ اُن ڈراموں کی ہوتی ہے جو کردار کی وجہ سے مقبولیت حاصل کرتے ہیں۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ بات ظاہر ہو سکتی ہے کہ ڈراما اسٹیج کے لئے ہے اور اسٹیج کردار کے لیئے۔ خصوصاً آج کل کے ادبی نقادوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح جم چکی ہے کہ ادب کا زندگی سے جو گہرا تعلق ہے۔ اس کی وضاحت کے لیئے اسٹیج کا دائرہ بیحد تنگ ہے۔ کیونکہ اسٹیج کی محدود گنجائش میں زندگی کی متحرک تصویروں کو تماشائیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکے بغیر نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اسٹیج کو وسیع کرنے کے مختلف ذرائع آئے دن مختلف مقامات میں ہوتے رہتے ہیں پھر بھی بولتی تصویریں افسانے کو جس رنگ میں پیش کرنے میں کامیاب ہوئیں ہیں اس طرح وسیع ترین اسٹیج پر ڈراما کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر نقاد سمجھنے لگے کہ ڈراما میں افسانے سے زیادہ کردار کو کامیابی ہوتی ہے کیونکہ سیرت نگاری کیلیئے مناظر کی وسعت اور ماحول کی رنگینیاں نسبتاً کم ضروری ہیں افسانہ تو ان چیزوں کے بغیر لقمہ تر ہی نہیں سکتا اور اسکی کامیابی ان لوازم کے بغیر معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔ ان ہی نقادوں کی بدولت تماشائی جو ڈراما دیکھنے جاتے ہیں تو افسانہ کی دلچسپی سے زیادہ کرداروں کی دلچسپی کی توقع رکھتے ہیں۔

یہاں یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ موجودہ تنقید ڈراما میں عمل Action کو غیر ضروری چیز سمجھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عمل ڈراما میں بہت ضروری ہے۔ خواہ وہ اسٹیج پر ہو خواہ فلم پر، حتیٰ کہ بعض نقاد تو ریڈیو ڈرامے میں بھی عمل کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں لیکن یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ ڈراما کا عمل افسانہ کے عمل سے فنی نقطۂ نظر سے مختلف ہوتا ہے۔ افسانہ کے عمل میں مناظر اور ماحول کی جزئیات اور ان کے اثر سے پیدا شدہ رنگینیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ برخلاف اس کے ڈراما میں کردار کی نشو و نما افسانہ اور افسانہ کا عملی پہلو اختیار کر لیتا ہے۔ ڈراما میں کردار سے افسانہ الگ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کردار کی نشو و نما کا ہی نام افسانہ اور عمل نہ بھی ہو تو ان کی اہمیت مسلم ہوتی ہے۔ اور ڈراما نگار جب تک کرداروں کی زندگی کی فکر نہ کرے اسے ڈرامہ میں کامیابی مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن آپ نے ایسے کئی افسانے اور ناول پڑھے ہوں گے جن میں کرداروں کو دانستہ طور پر سرراہ چھوڑ دیا گیا ہے اور اس انتہائی لاپروائی کے باوجود افسانے کی دلچسپی جانے نہیں پائی۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ، ناول میں کردار محدود نہیں ہوتے۔ مجمع اور شہروں کے خاکے پیش کیئے جا سکتے ہیں اور ناول نگار کو ظاہر ہے کہ ایسی صورتوں میں کرداروں کے ہجوم کی وجہ سے افراد کی طرف فرداً فرداً توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ڈراما کا اصول اس سے جدا ہے۔ ڈراما نگار کو اتنے ہی افراد ڈراما پیش کرنے کی اجازت ہے جتنے کہ وہ پوری توجہ کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن افراد کی نشو و نما اور ارتقا کی طرف ڈراما نگار توجہ نہیں کر سکتا اُن کو وہ اصولاً منظر عام پر لا بھی نہیں سکتا۔ یوں تو مجمع اور ہجوم کو وہ زیر بحث لا سکتا ہے لیکن ان کی نمائش اور انکی پیشکش محض ضمنی ہوگی۔ ڈرامے کا دار و مدار اصولاً غیر محدود افراد پر نہیں رکھا جا سکتا البتہ ذیلی طور پر ان کو پیش کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی جا بکدست ڈراما نگار ان سے کسی خاص کردار کی وضاحت چاہتا ہے۔

اس سلسلہ میں ناظرین کہیں اُن ڈراموں کو میرے متذکرہ بالا بیان کی مخالفت میں نہ پیش کر دیں جو محض افسانہ کی خوبی کی وجہ سے مقبول ہیں یا ان ناولوں کو روشنی میں نہ لے آئیں جو صرف کرداروں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ کیونکہ ہر دو صورتیں مستثنیات میں سے ہیں۔ ورنہ جدید نقد و نظر کا عام اصول ناول میں افسانہ اور ڈراما میں کردار کی تلاش کرتا ہے۔

یہیں سے ناول اور ڈراما کے کرداروں کا فرق بھی رونما ہوتا ہے اور اس ضمن میں ان کی طرف اگر میں اشارے کرتا چلوں تو بے موقع نہ ہوگا ناول نگار کو اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے کرداروں پر خود ہی تنقید اور تبصرہ کر کے ان کی نشو و نما میں اپنے ذاتی رجحان اور اپنی شخصیت کو داخل کرے۔ ایسے موقع پر ناول نگار کو سیرت نگاری میں بڑی سہولت ہوتی ہے اور ناظرین بھی بہت آسانی سے کرداروں کو سمجھ بوجھ لیتے ہیں اس کے سوا ناول نگار کو اس بات کا راست طور پر موقع ملجاتا ہے کہ وہ اپنے کردار پر خود ہی تبصرہ کرے برخلاف اس کے ڈراما نگار کو ایسا موقع نہیں ملتا۔ ڈراما میں اس بات کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ مصنف اپنی ذاتی رائے کرداروں کے متعلق خود ہی ظاہر کر سکے۔ یا تو دو کرداروں کے تصادم سے سیرت نگاری کی تکمیل کرنی پڑتی ہے یا پھر مکالمہ ہی کے دوران میں اشارے اور کنایہ پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ڈراما نگار کی فن کاری محدود اور محصور ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ

ناول نگار کی بہ نسبت ڈراما نگار کا کام زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اس مشکل کے باوجود بھی ڈراما میں کردار کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس لئے ڈراما کی کردار نگاری ایک خاص فن لطیف ہو گیا۔

ڈراما کے کردار اسٹیج پر اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہوتے ہیں نہ انہیں مصنف کی تشریحوں کا سہارا ہوتا ہے اور نہ فٹ نوٹ کا تکیہ۔ وہ اپنی زبان سے بولتے ہیں، اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی حرکات سے اپنی سیرت کو تماشائیوں پر ظاہر کرتے ہیں۔ ادب کے جملہ اصناف میں کردار نگاری کا فن مشکل سمجھا گیا ہے اور اس میں بھی ڈراما کی کردار نگاری مشکل ترین۔ اس لئے ڈراما نگار کو بڑی چابک دستی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسٹیج پر افرادِ ڈراما کا بہروپ کردار نگاری میں ایک حد تک مدد کرتا ہے۔ لیکن چونکہ کسی اور صنفِ ادب میں تمثیلی پہلو نہیں ہوتا اس لئے نقادوں نے تمثیل کو کردار نگاری کا زبردست معاون سمجھ لیا حالانکہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے۔ تو ظاہر ہوگا کہ بہروپ معاون تو ضرور ہے لیکن ڈراما کے کردار محض بہروپ پر بھروسہ نہیں کر سکتے کسی فردِ ڈراما کا محض بہروپ سے مسخرا ہونا تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کا مکالمہ اور اس کی گفتگو میں مزاح و ظرافت کا چٹخارہ نہ ہو۔ اسی طرح محض رونی صورت بنانے سے فردِ ڈراما کا حزن و ملال ظاہر نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے الفاظ تیر و نشتر کی طرح دل میں چبھ نہ جائیں بلکہ بعض جدید اسٹیج کے ماہرین کا خیال تو یہ ہے کہ فردِ ڈراما خارجی ماحول سے زیادہ داخلی ماحول سے متاثر ہو۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ فرد ڈراما کو اپنے الفاظ کے ماحول میں ہی گم سم رہنا چاہئے کہ دراصل وہی اس کی تخلیق کا باعث ہیں اور ان ہی کے ذریعہ مصنف اس کو زندہ رکھتا یا مار ڈالتا ہے۔

ڈراما اور ناول کے کرداروں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ناول میں اکثر و بیشتر کردار کی زندگی از ابتدا تا انتہا نہ صرف ناول نگار کے ذہن میں ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اس کو ناظرین کی آنکھوں کے آگے بھی پیش کر دیتا ہے۔ ناول کے سب کرداروں کو اگر وہ اتنا وقت اور اتنی توجہ نہ دے سکے تو نہ دے۔ لیکن ہیرو، ہیروئن کی طرف خاص طور پر اور دوسرے اہم کرداروں کی طرف عام طور پر اس کو متوجہ ہونا پڑتا ہے اور ان کی اگلی پچھلی زندگی کی تفصیل پیش کرنی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ڈراما نگار اپنے کرداروں کو اس دنیا کے شور و شغب سے چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے ہی پکڑ لیتا ہے۔ اور ان کو جوں کا توں ڈراما میں پیش کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں اس کو نہ کردار کی پچھلی زندگی سے واسطہ ہوتا ہے اور نہ اگلی زندگی کی فکر۔ جہاں تک ڈراما کے افسانہ، عمل اور مواقع کا تعلق ہوتا ہے بس اسی حد تک وہ کرداروں کی زندگی کو منظر عام پر لاتا ہے اور باقی زندگی پر نہ وہ روشنی ڈالتا ہے اور نہ تماشائی اس کو جاننے کی کھوج میں ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں بھی ڈراما نگار کو اپنی فن کاری میں ناول نگار کی بہ نسبت زیادہ ماہر ہونا پڑتا ہے کیونکہ ناول میں کردار کی تفصیلی زندگی پیش کرنے میں مصنف کو سیرت کی تکمیل کے بہت سے مواقع ملتے ہیں اور وہ اپنے خاص مطمح نظر کو پیش نظر رکھکر کردار کی نشو و نما خود حسب مرضی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ناظرین بھی ناول نگار کی مدد سے کردار کو اچھی طرح سمجھ بوجھ لیتے ہیں۔ اور اس طرح ناول نگار کا کام ایک طرف تو ہلکا ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کی اپنی فن کاری کی پوری پوری داد آسانی سے مل جاتی ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ بعض نامور ناول نگار اپنے کرداروں کے سوانح حیات مکمل طور پر پہلے مرتب کر لیتے تھے اور بعد میں پلاٹ کے رشتہ میں منسلک کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کا کام بھی آسان ہو جاتا تھا۔ اور سیرت نگاری بھی مکمل ہو جاتی تھی۔ آج بھی آپ شاید بعض ناولوں کے کرداروں کی زندگی کے حالات پیدائش سے وفات تک ایسے ہی مرتب کر سکیں گے جس طرح سے کہ آپ اس مادی دنیا کے حقیقی موجودہ یا گذشتہ شخصیتوں کے سوانح حیات مرتب کر سکتے ہیں۔ لیکن ڈراما نگار کو اپنے محدود دائرہ میں کردار کی پیدائش سے موت تک کی زندگی مرتب یا پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ اس کی زندگی کے اہم اور قابل نمائش مواقع کو چنتا ہے اور بس ان ہی کو اجاگر کرتا ہے زندگی کے دوسرے واقعات گذرے ہوئے یا آنے والے، اس کے لئے بیکار ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات تو وہ اختصار کا کمال کر دکھاتا ہے یعنی یہ کہ جس موقع کو وہ پیش کرنے کے لئے چنتا ہے اس کا بھی صرف اہم رُخ دکھاتا ہے اور باقی کو پسِ پردہ ہی رکھتا ہے یا یہ کہ اس کو ناظرین کے ذہن کی رسائی کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور بلاشبہ اگر ڈراما نگار کسی کردار کی ایک خصوصیت بھی موقع کے لحاظ سے کامیابی کے ساتھ پیش کر دیتا ہے تو ناظرین کردار کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی تاڑ جاتے ہیں۔ ڈراما نگار تفصیلات میں نہیں جاتا بلکہ اشارے اور کنایوں میں کام چلاتا ہے۔ ناظرین کی ذہنی جولانیوں کو وہ چھوڑ دیتا ہے کہ "قیاس کن زگلستان من بہار مرا"۔

(۲)

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ناول کی طرح ڈراما میں بھی بعض کرداروں کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے مثلاً ہیرو اور ہیروئن۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی ولن

(بدمعاش) کی شخصیت بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ بہرحال ان کرداروں کا تعلق ڈراما کے موضوع اور ڈراما نگار کے قلم کا رہین منت ہوتا ہے۔ بعض ڈرامے آپ نے ایسے پڑھے ہوں گے۔ جن کو بڑی حد تک ایک ہی کردار کے ڈرامے کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ شیکسپیر کے ڈراموں میں کنگ لیئر، اتھیلو، ہیملٹ وغیرہ ہیں۔ ان میں اور اس قسم کے ڈراموں میں ہیرو ہی ڈراما کی جان ہوتا ہے اور نہ صرف دوسرے افراد ڈراما اس کے جلو میں ہوتے ہیں بلکہ پلاٹ بھی ہیرو ہی کے حرکات و سکنات کا ایک مربوط اور منضبط سلسلہ ہوتا ہے۔

ہیرو المیہ بھی ہو سکتا ہے اور طربیہ بھی۔ قدیم زمانہ میں یونانیوں کے نزدیک المیہ ڈراما خاص وزن اور وقعت رکھتا تھا اس لئے المیہ ہیرو کے کردار میں خاص متانت، سنجیدگی اور بلندی ضروری تھی۔ طربیہ ڈراما ادنیٰ اور طربیہ کردار چھچھورے سمجھے جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ پرانے نقادوں نے المیہ اور طربیہ کرداروں کی نشو و نما کے اصول الگ الگ پیش کئے ہیں لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور تماشائی اور نقاد دونوں زیادہ سے زیادہ بالغ النظر ہوتے گئے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ چونکہ ڈراما کا زندگی سے گہرا تعلق ہے اور زندگی آہ اور واہ کے درمیان ہے اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایک پہلو کو وقعت دی جائے اور دوسرے کو نظر انداز کیا جائے۔ زمانہ وسطیٰ میں یورپ اور انگلستان میں طربیہ کا زور رہا۔ دور جدید میں ایک نئی مصیبت آن پڑی۔ تماشائی اور نقاد اس دور میں مختلف المذاق ہو گئے۔ تماشائی طربیہ بلکہ مذاقیہ کے دلدادہ ہو گئے اور نقاد متانت اور سنجیدگی کے دامن تلے پناہ گزین ہوئے۔ وہ مذاقیہ کو محض ہنسنے اور ہنسانے کا آلہ مثل عام تماشائیوں کے نہیں سمجھتے بلکہ وہ کسوٹی پہ کس کر سوقیانہ اور رکیک مذاق کو پاکیزہ مزاح اور لطیف ظرافت سے الگ الگ کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوا کہ بیچارا ڈراما نگار دوہری مصیبت میں مبتلا ہوا۔ ایک طرف تو اُسے عام تماشائیوں کو خوش کرنا ہوتا ہے جو محض تفریح طبع کے لئے تھیئٹر آتے ہیں اور دوسری طرف خشمگیں نقاد کی عیب جو نظروں سے پناہ مانگنا پڑتا ہے چونکہ مزاح اور سوقیانہ پن میں ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے اس لئے ڈراما نگار کو بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ حالیہ زمانہ میں طعن اور طنز کو بشرطیکہ وہ لطیف اور پاکیزہ ہو خاص وقعت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے مکالمہ کی دو خوبیوں برمحل اور مختصر کے ساتھ ساتھ تیسری خوبی یہ تسلیم کی گئی کہ وہ تیز اور چبھتا ہوا ہو۔

جس ڈراما میں ایک ہی کردار مرکزی ہو گا وہاں ڈراما نگار ذیلی کرداروں کو اسی کے گرد گھمائے گا۔ ذیلی کرداروں کی نشو و نما سے مقصد یہ ہو گا کہ وہ مرکزی کردار کو تقویت پہنچائیں۔ اس طرح یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ذیلی کردار مرکزی کردار ہی کے لئے وجود میں لائے جاتے ہیں، نشو و نما پاتے ہیں حتیٰ کہ مٹ بھی جاتے ہیں۔ ان کی انفرادی حیثیت نہیں ہوتی اور سب کے سب اپنے آپ کو مرکزی کردار کی شخصیت میں گم کر دیتے ہیں۔ اگر وہ کسی نہ کسی طرح کسی ذریعہ سے یا بغیر ذریعہ کے مرکزی کردار کو سہارا دے سکیں تو سمجھا جاتا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

پرانے زمانہ میں تماشائی اور نقاد دونوں ڈراما نگار سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ڈراما کے موضوع کو زیادہ اہمیت دے گا۔ اور یہ پابندی بھی ایک حد تک اس پر عائد کی جاتی تھی کہ وہ قدیم افسانوں سے اپنے ڈراموں کا مواد حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کرداروں کی ذیلی اہمیت ہوتی تھی اور افسانہ کو مرکزی اہمیت۔ اس کے سوا زیادہ مشکل یہ تھی کہ افسانہ کی شخصیتوں سے لوگ واقف ہوتے تھے اور ڈراما میں بھی وہی شخصیت اسی روپ میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اور چونکہ ڈراما نگار کو نہ کرداروں کے انتخاب میں آزادی حاصل تھی اور نہ ان کی نشو و نما میں اس لئے کرداروں کے فنی ارتقا میں بہت مشکل درپیش ہوتی تھی۔ پھر بھی بعض ڈراما نگاروں نے جنہیں غیر معمولی اور فطری صلاحیت قدرت نے ودیعت کی تھی کمال کر دکھایا۔ مثال کے طور پر شیکسپیر کے المیہ ڈراموں کے کرداروں، ہیملٹ، لیئر، اتھیلو، میکبتھ وغیرہ کو لیجئے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے بڑے عمیق مطالعے وسیع مشاہدے اور شخصی گہرے تجربے کے بعد ان کو خلق کیا ہے لیکن شیکسپیر کے ڈراموں کے ماخذات کی فہرست پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ سب کردار کسی نہ کسی قدیم افسانے سے اخذ کئے گئے ہیں۔ شیکسپیر انہیں وجود میں لانے کا باعث نہیں ہوا بلکہ اس نے صرف ان کا انتخاب کیا۔ باوجود اس تنگ دامانی کے شیکسپیر کا کمال ظاہر ہو کر رہا اور خود کردار منہ سے بول اٹھے کہ ان کی زندگی کی اصل جگہ قدیم افسانوں میں نہیں بلکہ شیکسپیر کے ڈراموں میں ہونی چاہئے۔

کردار نگاری کے حدود میں آج وسعتیں تو ضرور پیدا ہو گئی ہیں لیکن بے شمار ڈراما نگاروں کی جولانیوں کے باعث بہرحال ایک قسم کی حد بندی موجود ہو گئی ہے۔ آج ڈراما نگار کو اس بات کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ کہ ساری دنیا کی آبادی میں سے اپنے کردار کے لئے شخصیت کا انتخاب کرے خاندان، عمر، شخصی وجاہت یا اس قسم کے دوسرے پرانے اصول سنگ راہ نہیں ہیں اور مصنف جس طرح کا چاہے کردار پیش کر سکتا ہے مگر اس سے آپ کو یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ اس وسعت کے ساتھ ساتھ ڈراما نگار کے فن میں بھی وسعت ہو گئی ہے۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ پہلے محدود

تھا اس لئے وہ اپنی فنی مہارت کو یک جا سمیٹ سکتا تھا اور اپنا پورا دھیان ایک ہی نقطہ پر مرکوز کر سکتا تھا لیکن آج جب کہ کرداروں کے انتخاب میں وسعت پیدا ہو گئی ہے ڈرامانگار کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ لامحدود ہو گیا ہے اور ڈرامانگار کو جتنی وسعت اس خصوص میں حاصل ہو گی اتنا ہی فنی کمال وہ کردار نگاری میں دکھا سکے گا۔

چونکہ ڈراما اور زندگی کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے موجودہ نظریوں کے بموجب کرداروں کا زندہ، چلتے پھرتے۔ ہنستے بولتے اور حساس اور جذباتی دل رکھنے والے افراد دکھایا جانا ضروری ہے اور یہ عملی طور پر جتنا بھی مشکل ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ المیہ ہو کہ طربیہ یہی اصول برسرکار ہے۔ نقاد اور تماشائی دونوں اسی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ڈرامانگار کو اس سلسلہ میں ادبیات، لسانیات اور ڈرامانگاری کے اصول کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا بھی گہرا مطالعہ کرنا پڑ رہا ہے ورنہ کرداروں میں جان پڑنی نہ صرف مشکل بلکہ ایک حد تک ناممکن ہے۔

انسانی نفسیات کے مطالعہ کے سلسلہ میں بعض ڈرامانگاروں نے تصادم میں جو کہ ڈرامائی عمل کا ایک لازمہ ہے جدتیں پیدا کیں۔ قدیم زمانہ اور ازمنۂ وسطیٰ تک عموماً تصادم خارجی ہوتا تھا۔ یہ تصادم یا تو کرداروں میں ہوتا تھا یا پلاٹ کے مواقع میں بہرحال اس کی مدد سے ڈرامائی عمل پیدا کیا جاتا تھا۔ دورِ جدید کی ابتدار کے ساتھ جبکہ کرداروں کی نفسیاتی ارتقار کا آوازہ بلند ہوا تو کرداروں کے تصادم پر پھر نظر ثانی کی گئی۔ بعض حالیہ ڈرامانگاروں نے جن میں مارس ترلنک زیادہ نمایاں ہے داخلی تصادم کا نظریہ بطور تجربہ کے پیش کیا۔ کرداروں کا یہ داخلی تصادم تحت الشعور اور نفسیات کے مختلف اہم مگر نازک شعبوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈرامانگاروں کا ایک دوسرا گروہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی کی طرف متوجہ ہوا اور تحلیل نفسی کو کرداروں کی نشو و نما میں جگہ دینے کی کوشش میں مبتلا ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ کردار نگاری کے یہ دونوں پہلو نہ صرف بہت ہی دشوار ہیں بلکہ عملی نقطہ نظر سے غیر معمولی فن کاری اور چابکدستی کے طلبگار ہیں اور اسی وجہ سے بہت کم ڈرامانگاروں نے اس روش پر قدم اٹھایا ہے لیکن پھر بھی اگر دنیا ادبیات کے نئے شعبوں میں سرگرم عمل رہی اور عالمی ماحول کو قتل و خون اور جنگ و جدل کے افکار سے نجات ملی تو وہ دن دور نہیں جب کہ یہی چیزیں کردار نگاری میں خصوصی اہمیت اختیار کر لیں گی۔

(۳)

عام طور پر ڈرامانگار اپنے عہد کی ڈرامیٹک کمپنیوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوتے ہیں کیونکہ بغیر ان کی وساطت کے ڈراما پیش نہیں کیا جا سکتا اسی وجہ سے ڈرامانگار کو اپنے پیش کنندہ کے رجحانات، اسٹیج کے حدود، ایکٹروں کی صلاحیتوں وغیرہ کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ کسی بھی ڈرامانگار کی تصانیف دیکھئے۔ ان میں اکثر کردار ظاہری خصوصیات کے اعتبار سے ملتے جلتے نظر آئیں گے۔ شیکسپیئر کے ہاں دو نوجوان لڑکیاں، ایک مسخرا، اور ایک ہیرو عام ہیں۔ جستجو کرنے والوں نے پتہ چلایا کہ شیکسپیئر کے ڈرامے کرنے والی کمپنی میں اسی قسم کے اداکار تھے اور وہ ایک حد تک مجبور تھا کہ ان ہی کی مناسبت سے کردار پیش کرے۔ شیریڈن کا بھی یہی حال تھا۔ "لیڈی ٹیزل" کا کردار "اسکول فار اسکینڈلس" میں پیش اس لئے کیا گیا کہ "مسز ابینگٹن" اس کو ادا کرنے کی خاص صلاحیت رکھتی تھی۔ مولیر اور رشانک سب ہی کو اپنے زمانہ کی تھیٹریکل کمپنیوں کا خیال رکھنا پڑا۔ بعض ڈرامانگاروں نے خود اداکاری میں حصہ لیا، بعضوں نے دورِ آموزی کے فرائض انجام دیئے اور بعض نے پیش کنندہ کا ہاتھ بٹایا۔ بہرحال ڈرامانگار ہمیشہ کسی نہ کسی طرح سے ڈرامیٹک کمپنیوں کے دامن سے وابستہ رہا۔ البتہ چھوٹا ڈرامانگار کمپنیوں کا دست نگر ہو کر رہا اور بڑے ڈرامانگار نے کمپنیوں کو اپنے زیر اثر رکھا۔

ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا لحاظ رکھکر جب ڈرامانگار کردار پیش کریگا تو یقینی طور پر اس کی آزادی محدود ہو جائے گی۔ وہ کوئی ایسا کردار پیش نہیں کر سکتا جس کو ادا کرنے کی صلاحیت وہ اداکاروں میں نہیں دیکھتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں اداکاروں کی صلاحیتوں کی ترقی پر بہت کچھ دارومدار ہے، لیکن عام طور پر کمپنیوں میں غیر معمولی اداکار چند ہی ہوتے ہیں اور وہ بھی بعض المیہ کردار پیش کرنے میں خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور بعض کو طربیہ اداکاری میں ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے۔ کچھ اداکار ایسے ہوتے ہیں جن کو خاص قسم کا پارٹ ہی موزوں ہوتا ہے۔ ڈرامانگار ایسی صورت میں مجبور ہوتا ہے کہ اسی قسم کا کردار اپنے ڈراما میں پیش کرے خواہ وہ اس کی نمائش میں اپنی مہارت دکھا سکتا ہو یا نہیں۔ اس کے سوا ہر کمپنی میں ایک آدھ اداکار یا ایکٹرس بہت ہی مقبول عام اور مشہور ہوتی ہے اس کی خاطر نہ صرف پیش کنندہ کو ملحوظ ہوتی ہے بلکہ ڈرامانگار کو بھی اس کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ پیش کنندہ اور تماشائی چاہتے ہیں کہ اس اداکار یا ایکٹرس کو بڑا پارٹ ملے اور وہ بھی ایسا جو موزوں ہو۔ ایسے میں ڈرامانگار بیچارے کی مجبوریوں کا کسی کو لحاظ نہیں ہوتا بس اس کی کامیابی اس پر موقوف ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف پیش کنندہ اور تماشائیوں کو خوش کرے بلکہ اداکار یا ایکٹرس کو بھی اس کی پسند

کا پارٹ دے کر خوش کرے۔

تماشائیوں کی پسند کا ذکر آگیا ہے تو ان کے رجحانات کے بارے میں بھی دو ایک باتیں مختصراً سن لیجئے۔ تماشائی ہمیشہ ہیرو کو نوجوان، باہمت، وفادار ایثار کرنے والا نیک نفس اور بہادر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح ہیروئن کی خوبصورتی ان کو لبھاتی ہے۔ وہ کم عمر ہو البڑ ہو اور نہ صرف ہیرو کے لئے محبت کئے جانے کے قابل ہو بلکہ اس میں یہ صلاحیت بھی ہو کہ ہر تماشائی اس کا گرویدہ ہو سکے۔ پھر کرداروں کے مکالموں میں بھی تماشائیوں کو خاص دخل ہے۔ ان کا مذاق خاص قسم کا ہوتا ہے اور وہ جس طرح کے کردار اسٹیج پر دیکھنا چاہتے ہیں اگر ویسے کردار پیش نہ کئے گئے تو کم خرچ بالانشین، تماشائی سیٹیوں اور تالیوں سے کان بہرے کر دیتے ہیں۔

غرض یہ کہ کردار نگاری میں ڈراما نگار کو جتنی مشکلات کا قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے اتنی دشواری مصنف کو ادبیات کی کسی اور صنف میں نہیں ہوتی۔ عام طور پر ڈراما دیکھنے والے، پڑھنے والے یا تنقید کرنے والے ان تمام دشواریوں کو پیش نظر نہیں رکھتے لیکن ان سے زیادہ ستم وہ نومشق اور نوجوان مصنف کرتے ہیں جو ڈراما نگاری کو ادبیات کا آسان ترین صنف سمجھ کر خامہ فرسائی کا شوق کرتے ہیں اور کردار نگاری کے میدان میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھا کر شاہراہ کو لہو لہان کر دیتے ہیں۔

سید بادشاہ حسن

غزل

متاعِ شوق بہت ہے، قرار ہو کہ نہ ہو
غمِ بہار سلامت، بہار ہو کہ نہ ہو

نہیں ہوا ابھی تاثیرِ شوق سے مایوس
ترے کرم پہ مجھے اعتبار ہو کہ نہ ہو

فراغِ یاس مناسب، مگر بتا اے دل!
حیات میں یہ زمانہ شمار ہو کہ نہ ہو!

ہوئے ہیں کشمکشِ روزگار کے خوگر
ہوائے خلد ہمیں سازگار ہو کہ نہ ہو

یہ سب فریبِ ہوس تو نہیں ہے اے ہمدم
بتا کہ دل پہ مجھے اعتبار ہو کہ نہ ہو!

بقا کی راہ یہیں ڈھونڈ جائیے حقّی
قضا کے ہاتھ سے تکمیلِ کار ہو کہ نہ ہو

م ۔ ش حقّی دہلوی

دو نظمیں

لذائذِ دیروز

ابتدائے شوق کی وہ طُرفہ کاری کے مزے
کچھ یقیں کا لطف، کچھ بے اعتباری کے مزے
کچھ زمانے کے حوادث، کچھ تری نظروں کا پھیر
اتفاقاً اک مسلسل بے قراری کے مزے
کچھ ترے وعدوں کی رنگینی کا ہلکا سا نشا
کچھ مری بڑھتی ہوئی بے اعتباری کے مزے
آہ وہ اک مہ جبیں کے گیسوؤں کے سائے میں
چاندنی راتوں کی عشرت، بادہ خواری کے مزے
وہ ہر اک رنگین دھوکے کی پرستش کا جنوں
وہ جنوں کی خوبصورت خام کاری کے مزے
موج جیسے جھوم کر ساحل سے ملتی ہے گلے
وہ کسی کی بے تکلف ہمکناری کے مزے
گفتگو میں ایک بے ترتیب موسیقی کا رس
گیسوؤں میں لرزشِ بادِ بہاری کے مزے
وہ امیدوں کا تلاطم، وہ تمناؤں کا جوش
وہ جوانی کے مزے، وہ بے قراری کے مزے
وہ کسی کی دلنشیں نظروں کی گہری پرسشیں
میٹھی میٹھی سی کسک، سینہ فگاری کے مزے
وہ صنم خانے کی محرابوں کا کافر بانکپن
شوق کی بہکی ہوئی سجدہ گزاری کے مزے
وہ مسلسل احتیاطوں کی شکستِ ناگہاں
وہ مکرر شوق کی بے اختیاری کے مزے
پھر طبیعت ڈھونڈتی ہے ایک ہنگامہ عدمؔ
آہ وہ آوارگی کا لطف، خواری کے مزے

انفاسِ بہار

اے نوبہارِ حُسنِ نظر، اک نگاہ اور
لایا ہوں تازہ قلب و جگر، اک نگاہ اور
احساسِ بےخودی بھی ہے مستی پہ ایک طنز
ہے ہوش کو ذرا سی خبر، اک نگاہ اور
اک مست حال و مست طبیعت نظر پرست
آیا ہے لے کے ذوقِ نظر، اک نگاہ اور
کل کائنات ایک نظر کی ہے منتظر
اے مست چشم و مست نظر، اک نگاہ اور
ہاں! بے دریغ جام بہ جام ایک اور جام
ہاں! جھوم کر نظر بہ نظر، اک نگاہ اور
مے ہنس رہی ہے، شیشہ کھنکتا ہے، بزم مست
چھا تو چلا ہے رنگِ نظر، اک نگاہ اور
ہے گردشِ زمانہ بھی اس رقص میں شریک
جاگا ہے مے کدے کا بھنور، اک نگاہ اور
جھانکی ہیں کہکشاں کے دریچے سے حسرتیں
اے ساقیِ ستارہ نظر، اک نگاہ اور
ظلماتِ غم کو چیر کے ہنس بھی پڑی کرن
کھل بھی گیا صدف کا جگر، اک نگاہ اور
شبنم کا فرش، مے کی فضا، رنگ کا خرام
اے خالقِ بہار نظر، اک نگاہ اور
بنتے ہیں اتصالِ نظر سے عدم کے شعر
اے جانِ شعر و جانِ نظر، اک نگاہ اور!

عدم

بوڑھا

ملوں دکھائی دیتا تھا جیسے ابر آلود آسمان بادامی رنگ کے کشادہ میدان پر ابھی بارش کی بوچھاڑ دینے لگا۔ موسم خزاں کی خوشبوؤں نے — عرملی بھیگی ہوئی زمین جھڑے ہوئے پتوں اور مردہ پھولوں کی خوشبوؤں نے — شام کی ساکن ہوا کو کثیف اور ناخوشگوار بنا دیا تھا۔ کسان ابھی تک کھیتوں میں ادھر اُدھر بکھرے، کام میں لگے تھے۔ اور دعا کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

سڑک کے کنارے پر ایک ننھا سا بچہ، اپنی ٹانگیں کھولے، کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھا، ایک آلو سے کھیل رہا تھا۔ قریب کے کھیت میں پانچ عورتیں کھڑی ہو کر، گوبھی کے چھوٹے چھوٹے پودوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ نہایت آہستگی سے، ایک خاص انداز میں، شیاڑوں پر جھک جاتیں، اور لکڑی کی ایک نوکیلی چھُری کو زمین میں گھونپ دیتیں اور ایک طرف جھکے ہوئے مردہ ننھے پودے کو سوراخ میں بو کر اس کی جڑوں کو مٹی سے ڈھانپ دیتیں۔ اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا۔

ایک آدمی جس کے ہاتھ میں ایک کوڑا تھا۔ اور جس کے پاؤں لکڑی کی بنی ہوئی کھڑاؤں نے ڈھانپ رکھے تھے جلدی سے بچے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور چومنے کے لئے اسے اوپر اٹھا لیا۔ اسی وقت ایک عورت نے اپنی کمر سیدھی کی اور اس شخص کی طرف بڑھی۔ یہ ایک گرانڈیل، سرخ چہرے، بڑے بڑے کولھوں، اور موٹی کمر والی جوان عورت تھی جس کے بال سنہری تھے۔ اور جلد کی رنگت صاف تھی۔

اس نے ایک فیصلہ کن انداز میں کہا: "ہیلو، سی سیپئر، خوش تو ہو؟"

اس غم آلود چہرے والے آدمی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا: "قسمت ابھی نہیں کھلی۔"

"وہ نہیں مانتا؟"

"نہیں۔"

"تو اب کیا ارادہ ہے؟"

"کیا بتاؤں!"

"جاؤ پادری سے ملو۔"

"بہت اچھا۔"

پھر دونوں کھڑے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بچہ ابھی اس کے بازو پر تھا۔ سی سیپئر نے اسے پھر چوما اور کپڑوں کے ڈھیر پر بٹھا دیا۔

دو کھیتوں کے درمیان، دور فاصلے پر، ایک آدمی گھوڑے سے جتا ہل چلا رہا تھا۔ جانور، ہل اور مزدور شام کی تاریکی میں آہستہ آہستہ بے تکلف حرکت کر رہے تھے۔

"تو تمہارا باپ کہتا کیا تھا؟"

"وہ کہتا ہے یہ کام نہیں ہو سکے گا۔"

"کیوں"؟

ایک اشارے سے آدمی نے عورت کی توجہ بچے کی طرف دلائی جسے اس نے ابھی کپڑوں پر بٹھایا تھا، اور پھر اس آدمی کی طرف نظر دوڑائی جو دور ہل کے پیچھے کھڑا تھا، اور آہستہ سے کہا: "کیونکہ یہ اُس کا چھوکرا ہے۔"

لڑکی نے کندھے اُچکا کر کہا: "اے خدا کیا سب لوگ نہیں جانتے کہ یہ بچہ وکٹر سے ہے۔ یہ کونسی بڑی بات ہے۔ مجھے ہی تو تکلیف اٹھانا پڑی اور میں ہی کیا، میری ماں بھی تو اسی قسم کی تکلیف میں مبتلا ہوئی اور تمہاری ماں بھی، جب ابھی اس نے تمہارے باپ سے شادی نہیں کی تھی۔ کون ہے وہ جس نے یہ تکلیف مول نہ لی ہو۔ وکٹر کے ساتھ میں نے بداخلاقی کا کام کیا مگر اس نے تو مجھے خود ہی کوٹھے پر سوتے میں پکڑ لیا۔ اور پھر ایک دفعہ وہی غلطی بیداری کے عالم میں بھی ہوئی۔ میں اس سے شادی کر لیتی اگر وہ ہمارا خادم نہ ہوتا۔"

آدمی نے جواب دیا: "میں تو اس بچے کے ہونے یا نہ ہونے کی پروا نہیں کرتا۔ میرا باپ البتہ اس بات کے خلاف ہے۔ میں تو تمہیں دل سے چاہتا ہوں۔ اچھا یہ مہم بھی سَر ہو جائے گی۔"

لڑکی نے کہا: "جاؤ اور ابھی پادری سے ملو۔"

"تو لیس میں جا رہا ہوں۔"

اور وہ دیہاتیوں کی سی بھدی چال کے ساتھ چل پڑا۔ اور لڑکی

اپنے ہاتھ کو کمروں پر رکھے گوبھی کے پودے بونے کھیت کو واپس چلی گئی۔

بات یہ تھی کہ یہ نوجوان جو ابھی ابھی یہاں سے گیا تھا بوڑھے بہرے ایملی کا بیٹا تھا۔ یہ سیلیسٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ سیلیسٹی کے ہاں وکٹر لیکاک سے یہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ وکٹر ان کے کھیت میں نوکر تھا۔ اور اسی جرم کے باعث نکالا گیا تھا

توسی سیزر اپنے بازو کے نیچے کوڑا دبائے اور خیالات میں غلطاں، اپنے کیچڑ سے لت پت لکڑی کے جوتوں کو باری باری اٹھاتے روانہ ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ سیلیسٹی سے شادی کرے گا۔ کیونکہ یہی وہ عورت تھی جسے وہ چاہتا تھا۔ اس یقین کے لئے اس کے پاس کوئی وجہ نہ تھی۔ یقین ہی تھا جس کے بل بوتے پر وہ کہتا تھا میں ضرور سیلیسٹی سے شادی کر لوں گا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر وہ ازسرتاپا تبدیل ہو جاتا، اس کے جذبات مرتعش ہو جاتے اور وہ فرطِ مسرت میں دیوانہ سا ہو جاتا۔ یہاں تک کہ بچے کو چومنے سے بھی اسے خاص مسرت حاصل ہوتی۔ کیونکہ وکٹر کا یہ لڑکا سیلیسٹی ہی کے پیٹ سے تو پیدا ہوا تھا۔ اور وہ دور افق کے قریب وکٹر کو بھی ہل چلاتے ہوئے ایک نظر دیکھ لیتا۔

مگر بوڑھا ایملی شادی میں حائل تھا۔ وہ بہرے آدمیوں کی طرح ایک خنزیری اکڑ کے ساتھ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اور غصے میں آپے سے باہر ہوا جاتا تھا۔ سی سیزر نے بے سود اس کے کان میں جس میں ابھی تک سننے کی تھوڑی بہت قوت موجود تھی، چلا چلا کر کہا: "باپ، میں تمہاری خوب خدمت کیا کروں گا۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے، اور گھر کا انتظام بھی اچھا کرتی ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا: "جب تک میں زندہ ہوں، میں تمہیں شادی نہیں کرنے دوں گا۔"

اسے کوئی بات بھی راضی نہیں کر سکتی تھی۔ اور نہ اس کے وحشیانہ مصمم ارادے کو بدل سکتی تھی۔ سی سیزر کے لئے اب صرف ایک امید باقی تھی۔ وہ یہ کہ ایملی پادری سے بہت ڈرتا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ موت کا وقت اب بہت قریب پہنچ رہا ہے۔ وہ مہربان خدا، شیطان، جہنم یا مقامِ کفارہ سے، جن کے متعلق اس کے تصور میں دھندلے سے نقوش تھے، کم ڈرتا تھا۔ مگر جس طرح ایک مریض اپنی بیماری کی دہشت کے باعث ڈاکٹر سے ڈرنے لگتا ہے، ایملی کے دل پر پادری کا خوف چھایا رہتا۔ اور پچھلے ہفتے سے سیلیسٹی، جو بوڑھے کی اس کمزوری سے واقف تھی، سی سیزر کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ اس بارے میں پادری سے ملے۔ مگر سی سیزر ہمیشہ تامل کرتا رہا تھا۔

اب اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ اور پادری کے گھر جاتے ہوئے اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح پادری کے سامنے رکھا جائے۔

باپ ریفن، چھوٹے قد اور پتلے جسم کا چست پادری، جس کی داڑھی اور مونچھیں ہر وقت صاف رہتی تھیں، کھانے کے انتظار میں اپنے پاؤں انگیٹھی کے سامنے رکھے، تاپ رہا تھا۔ اس نے ایک نوجوان کو اندر آتے دیکھ کر چہرے کا رخ اس کی طرف کر کے کہا: "ہاں، توسی سیزر تم کیا چاہتے ہو؟"

"باپ میں آپ سے ایک بات کرنی چاہتا ہوں۔"

سی سیزر ایک ہاتھ میں اپنی ٹوپی تھامے اور دوسرے میں کوڑا پکڑے خوفزدہ ہو کر کھڑا تھا۔

"تو کہو۔"

اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا: "سمجھو یہ ایک قسم کا "اقرار" ہے۔"

باپ رلفین نے کسان کی طرف ذرا توجہ سے دیکھا۔ اور اس کے متوحش چہرے اور بے چین اور پریشان آنکھوں کا جائزہ لے کر کہا: "میری، ذرا پانچ منٹ کے لئے اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں سی سیزر سے بات کر لوں۔" خادمہ نے سی سیزر پر ایک غضب آلود نگاہ ڈالی اور بڑبڑاتی ہوئی چل دی۔

پادری نے کہا: "تو اب سناؤ اس کے متعلق سب کچھ۔"

سی سیزر ابھی تک تامل کی حالت میں تھا۔ وہ اپنی کھڑاؤں کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور ٹوپی کو مروڑ رہا تھا۔ یکایک اس نے ارادہ کر لیا اور کہنے لگا: "بات یہ ہے کہ میں سیلیسٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، تو، اس میں کونسی رکاوٹ ہے؟"

"میرا باپ نہیں مانتا۔"

"تمہارا باپ۔"

"تو وہ کیا کہتا ہے۔"

"وہ کہتا ہے کہ سیلیسٹی ایک بچے کی ماں ہے۔"

"تو دنیا کے آغاز سے وہ پہلی عورت نہیں جس کے ہاں کوئی بچہ ہو۔"

"یہ بچہ اس کے خادم وکٹر سے ہے۔"

"تو تمہارا باپ یہ نہیں چاہتا؟"

"نہیں۔"

"کسی طرح بھی نہیں؟"

"تمہارے کہنے کے علاوہ اور کسی طرح بھی نہیں۔"

"تم نے اسے منانے کی خاطر اس سے کیا کیا کچھ کہا تھا؟"

"میں نے اس سے یہ کہا تھا کہ یہ لڑکی بڑی اچھی ہے اور منتظم بھی اعلے

وہ چپ کی ہے۔"

"۔۔اور اس بات سے وہ متاثر ہوا۔ تو اب تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس سے بات کر دوں۔"

"یہی تو۔ آپ اس سے ضرور بات کریں۔"

"مگر بات کس طریقے سے کروں؟"

"جس طرح آپ پیسے لینے کی خاطر ہمیں وعظ سناتے ہیں۔"

دیہاتی ذہنیت کے مطابق مذہب سے مراد یہ ہے کہ اس کے نام پر آدمی دولت کے تھیلے لوٹے اور غریب انسانوں کی خالی جیبیں کاٹ کر جنت کے خزانے بھرتا چلا جائے۔ مذہب ایک بڑا وسیع تجارتی ادارہ ہے جہاں پادری بے حد چالاکی اور عیاری کے ساتھ شاطرانہ انداز میں آسانی چیزیں فروخت کرتے ہیں اور لوگوں کی دولت سے خدا کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔

سی تیسر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ پادری لوگ اگر غریبوں اور مریضوں کی خدمت کرتے ہیں، اور مرتے وقت انہیں اطمینان دلاتے اور نصیحتیں کرتے ہیں تو محض دولت کی خاطر، اور چمکتے ہوئے خوشنما سفید سکوں کے بدلے یہ لوگ عوام کی حفاظت، ان کے گناہوں اور غلطیوں کی بخشش، ان کی نجات اور جنت کا ذمہ اٹھاتے ہیں، اور اس طرح گنہگار کی سخاوت اور فیاضی پر گذارا کرتے ہیں۔

باپ رلفین جو بوڑھے ایمیلی کو جانتا تھا، ہنسنے لگا "میں تمہارے باپ کے پاس جاؤں گا۔ اور تمہاری مختصر سی کہانی اس سے کہہ ڈالوں گا لیکن تمہیں گرجے میں ضرور آنا پڑے گا۔"

سی تیسر نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور قسم کھا کر کہا "باپ اگر تم یہ کام کر دو تو ایک غریب آدمی کی زبان پر اعتبار کرو کہ میں ضرور گرجے میں آؤں گا۔"

"بہت اچھا، مگر میں کس وقت تمہارے باپ سے ملنے آؤں؟"

"جس قدر جلد ہو سکے اتنا ہی بہتر ہے۔ آج رات اگر آپ وقت نکال سکیں ——!"

"تو رات کے کھانے سے آدھ گھنٹہ بعد۔"

"آدھ گھنٹہ بعد۔"

"تو فیصلہ ہو چکا۔ خدا حافظ میرے بیٹے۔"

"باپ۔ خدا حافظ۔ آپ کا شکریہ۔"

"شکریہ کاہے کا؟ میرے بیٹے۔"

اور سی تیسر گھر واپس آگیا۔ اس کے سینے پر سے گویا ایک بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔

سی تیسر اور اس کے باپ کا گذارا نہ چلتا تھا اس لئے انہوں نے اپنی زمین کا کچھ حصہ ٹھیکے پر دیدیا۔ ان کے ہاں ایک پندرہ سال کی لڑکی خادمہ کا کام کرتی تھی یہ لڑکی ان کے لئے شوربا طیار کرتی۔ پالتو پرندوں کی نگہداشت کرتی گایوں کو دوہتی اور مکھن نکالنے کے لئے دودھ بلوتی۔ اور اس طرح ان کا بمشکل گذارا ہوتا۔ ان کے پاس زمین اور ذخیرے کی دوسری چیزیں محدود تھیں اور بڑی مصیبت سے اپنی آمد و خرچ کو پورا کرتے۔

بوڑھے ایمیلی نے اب کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہرے آدمیوں کی طرح ہر وقت مغموم دکھائی دیتا تھا۔ اس کا جسم درد کے باعث شکستہ ہو چکا تھا۔ اور وہ اپنی چھڑی پر سہارا لئے کمر جھکا کر کھیتوں میں پھرا کرتا تھا۔ اور انسان اور حیوان کو ایک سی حقارت آمیز نظر کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کھائی کے ایک کنارے پر بیٹھ جاتا اور سکوت کے عالم میں گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اس وقت اس کے خیالات میں وہ چیزیں ہوتیں جن پر اس کی زندگی کا انحصار تھا۔ اناج اور غلے کا بھاؤ، حرارت یا بارش جس نے فصل کو تباہ کر دیا ہو یا اس کی نشوونما میں مدد دی ہو —— اس کے درد زدہ ضعیف اعضا اب تک زمین کی نمی سے اسی طرح متاثر ہوتے تھے، جس طرح وہ ستر سال پہلے نیچی چھت والی جھونپڑی کی نمدار دیواروں اور نمدار چھتوں سے ہوا کرتے تھے۔

وہ جھٹپٹے میں گھر کو لوٹا۔ اور باورچی خانے میں ایک میز کے سامنے بیٹھ گیا اس نے اپنی خمیدہ انگلیوں سے شوربے سے بھرا ہوا مٹی کا برتن مضبوط پکڑ لیا۔ سردی اور گرمی کے موسم میں وہ اسی پیالے سے اٹھتی ہوئی بھاپ پر شوربا پینے سے پہلے اپنے ہاتھ سینکتا رہتا۔ تاکہ حرارت کی ایک معتبر سی مقدار بھی جسے حاصل کرنے کے لئے ایندھن پر اتنے پیسے صرف ہوئے۔ اور شوربے کا ایک قطرہ جسے طیار کرنے کے لئے اتنا نمک اور اتنا گھی صرف ہوا —— اور روٹی کا ایک ٹکڑا جس پر اتنا غلہ صرف ہوا ضائع نہ ہو۔

پھر سیڑھیوں پر سے ہو کر وہ اپنے چوبارے میں پہنچ جاتا جہاں اس کا گدیلا بچھا ہوتا۔ اس کا لڑکا نچلے کمرے میں سوتا۔ اس کونے میں جہاں انگیٹھی بنی تھی، اور اس کا خادم ایک قید خانہ نما اندھیرے کمرے میں سوتا جو کبھی آلو جمع کرنے کے لئے مخصوص تھا۔ کام کرنے والی لڑکی اپنے گھر چلی جاتی۔

سی تیسر اور اس کا باپ شاذ ہی ایک دوسرے سے بات کرتے۔ اور وہ بھی فصل بیچنے یا کوئی بچھڑا خریدنے سے تعلق رکھتی۔ اس بارے میں نوجوان بیٹا بوڑھے باپ سے صلاح مشورہ لے لیتا۔ ان مواقع پر سی تیسر بلجے کی شکل میں اپنے ہاتھوں کو گول بنا کر بڑھے کے کان میں دلائل پیش کر دیتا۔

اور بوڑھا ایسی دھیمی اور مدھم آوازیں، جو اس کے پیٹ کی گہرائیوں سے نکلتی معلوم ہوتی تھیں، تجویز کو منظور یا نامنظور کر دیتا۔

ایک شام سی سیزر، حسب معمول اس سے ملا۔ گویا وہ کسی گائے یا گھوڑے کی خرید کا معاملہ تھا، اور بلند ترین آواز میں سیلیسٹی سے شادی کے متعلق اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

یہ بات سن کر بوڑھا بہت ناراض ہوا۔ کیوں؟ اخلاقی بنا پر؟ نہیں۔ دیہات کے لوگوں میں عورت کی پرہیزگاری کی بہت قدر کی جاتی ہے بلکہ اس کا لالچ اور اس کا عمیق دہقانیانہ جذبۂ بخل۔ یہ برداشت نہ کر سکا کہ اس کا بیٹا خواہ مخواہ ایک ایسے بچے کی پرورش کا کفیل بنے جو اس کا اپنا نہیں۔ اس کا خیال فوراً اس بات کی طرف چلا گیا کہ یہ بچہ سارا شوربا چاٹ کر جایا کرے گا، اس سے بہت قبل کہ وہ کھیتی باڑی کے کام میں ہاتھ بٹا سکے۔ اس نے اسی وقت اندازہ کر لیا کہ وہ چودہ سال کو پہنچنے تک کتنے پونڈ ڈبل روٹی کھائے گا، کتنے گلاس سیب کی شراب کے پی لے گا۔ اور اس کا دل سی سیزر کے خلاف جذبۂ تنفر سے بھر گیا، جس نے ان تمام باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔

اس نے ایک غیر معمولی تیز آواز میں کہا "سی سیزر! کیا تمہاری عقل تمہیں جواب دے گئی؟"

مگر سی سیزر، سیلیسٹی کی خوبیاں گنوانے، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیلیسٹی بچے کے اخراجات کی بہ نسبت بہت زیادہ بچت کرے گی۔ مگر بوڑھے کو ان خوبیوں پر شک تھا۔ اور بچے کے ہونے والے اخراجات کے بارے میں ذرہ برابر بھی شک نہ تھا۔ اس لئے اس نے اپنے پہلے فیصلے کو بغیر مزید مباحثے کے، جوں کا توں رہنے دیا۔ کہنے لگا "میں شادی کبھی نہیں ہونے دوں گا، میں یہ شادی کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ جب تک میں زندہ ہوں تم کبھی اس سے شادی نہیں کر سکو گے۔" اور تین ماہ تک یہ جھگڑا چلتا رہا اور ان میں سے کوئی بھی اپنے ارادے سے ذرہ برابر نہ سرکا۔ ہفتے میں ایک بار، وہ انہیں دلائل، انہیں الفاظ، اور انہیں اشارات کے ساتھ انہیں بے سود نتائج پر پہنچ جاتے۔

تو یہ تھے حالات جن کے پیش نظر سیلیسٹی نے سی سیزر سے کہا تھا کہ جاؤ پادری سے مدد لو۔

جب نوجوان کسان گھر پہنچا۔ اس نے اپنے باپ کو دیکھا کہ میز کے قریب بیٹھا ہے۔ انہوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد کچھ مکھن استعمال کیا اور ایک ایک گلاس سیب کی شراب کا چڑھا لیا۔ پھر وہ آپس اپنی کرسی پر سکون کے ساتھ بیٹھے رہے۔ خادمہ روشنی لے کر آئی کہ کٹورے اور گلاس صاف کرے اور صبح کے لئے ڈبل روٹی کی بڑی بڑی قاشیں کاٹے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ فوراً کھل گیا اور پادری نمودار ہوا۔ بوڑھے نے اپنی اعتبار نہ کرنے والی آنکھیں بے چینی سے اوپر اٹھائیں گویا وہ خطرے سے آگاہ تھا۔ اور سیڑھی پر چڑھنے لگا۔ مگر پادری رفلین نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور اس کے کان میں چلا کر کہا۔

"بوڑھے امیبل! میں تم سے ایک بات کرنے آیا ہوں۔"

سی سیزر، دروازہ کھلا دیکھ کر غائب ہو گیا۔ وہ فیصلہ سننے سے اس قدر خائف تھا کہ وہاں ٹھیر نہ سکا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بوڑھے امیبل کے ہر انکار پر اپنی روح کو اذیت پہنچنے دے۔ اس نے اس بات کو ترجیح دی کہ وہ بعد میں، امید افزا یا مایوس کن فیصلے سے ایک ہی لفظ میں آگاہ ہو جائے اس لئے وہ اندھیرے میں کہیں چلا گیا۔ اس شام آسمان پر نہ چاند تھا۔ اور نہ ستارے اور یہ ان شاموں میں سے ایک شام تھی جب نمی کے باعث ہوا کثیف سی ہو جاتی ہے۔ باغیچے سے سیبوں کی دھیمی دھیمی خوشبو آ رہی تھی۔ کیونکہ یہ اس پھل کا موسم تھا۔ سی سیزر گایوں کے چھپر کے قریب سے گذرا جانوروں کے سانس کی گرم گرم بو تنگ کھڑکیوں میں سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے گھوڑوں کے سموں اور دانہ کھلانے کے برتنوں میں سے ان کے دانہ کھانے کی آواز بھی سنی۔

سیلیسٹی کا خیال دل میں بٹھائے وہ ان کے پاس سے گذر گیا۔ اس کے سادہ اور کم فہم دماغ میں، جہاں نظر اور چہرے کے براہ راست اتصال سے نقوش پیدا ہوتے تھے، صرف اسی وقت محبت کے جذبات جاگ سکتے تھے۔ جب وہ اپنے تصور میں ایک گرانڈیل، سرخ بالوں والی لڑکی کو لاتا تھا جو اپنے ہاتھ کولھوں پر رکھے، کچی سڑک پر کھڑی ہنس رہی ہو۔ اور یہ وہ انداز تھا جس میں اس نے پہلی مرتبہ سیلیسٹی کو دیکھا تھا۔ وہ اسے تب سے جانتا تھا جب وہ دونوں ابھی کمسن تھے۔ مگر اب سے پہلے اس نے کبھی اچھی طرح اس کا جائزہ نہ لیا تھا۔ انہوں نے کچھ منٹ باتیں کیں پھر وہ چلا آیا۔ اور آتے ہوئے اپنے دل میں یہ سوچنے لگا کہ ہے تو یہ لڑکی خوب! مگر مصیبت یہ ہے کہ وکٹر سے خراب ہو گئی۔

وہ اس خیال کو دوسرے روز تک دل میں بٹھائے رہا۔ جب اس نے سیلیسٹی کو دوبارہ دیکھا۔ تو وہ اپنے گلے کی جڑ کے قریب ایک قسم کی گدگدی سی محسوس کرنے لگا گویا گلے کے راستے ایک پَر اس کے سینے تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو ہمیشہ سیلیسٹی کے قریب تر

پایا۔ اور گدگدی کے "حملے" زیادہ ہوتے گئے۔

تین ہفتے بعد اس نے سیلیسٹی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس قدر از خود رفتہ ہو رہا تھا۔ وہ بیان تو نہیں کر سکتا تھا کہ کسی جذبے نے اس میں یہ خواہش پیدا کر دی تھی البتہ وہ اس چیز کا اظہار یوں کیا کرتا تھا کہ اس نے مجھ پر قابو پا لیا ہے۔ اسے اس بات کی پروا نہ تھی کہ اس کی عصمت ضائع ہو چکی ہے۔ یہ تو ایک مصیبت تھی جو اس پر نازل ہوئی اور بس مگر اس مصیبت نے اسے تباہ نہیں کر دیا تھا۔

اسی طرح اس کے دل میں دیگر لمحات میں بھی کوئی مہلک خیالات جاگزیں نہ تھے۔

اگر پادری بھی اس کے باپ کو منوانے سے قاصر رہا تو وہ کیا کرے گا وہ اس خیال کو اپنے دل میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اضطراب کا یہ عالم تھا وہ گرجے میں چلا آیا۔ اور چوبی جنگلے کے قریب بیٹھ کر پادری کا انتظار کرنے لگا۔

اسے وہاں بیٹھے ایک گھنٹہ ہوا ہو گا کہ سڑک پر سے قدموں کی چاپ اس کے کانوں میں پڑی۔ اور رات کی تاریکی کے باوجود اس نے پادری کے سیاہ جبّے کو پہچان لیا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ جس طرح کچھ کہنے سے ڈرتا تھا۔ اسی طرح کچھ سننے سے بھی ڈرتا تھا۔

پادری نے اسے دیکھا اور خوشی سے کہا: "بیٹا، سب کام ٹھیک ہو چکا ہے"!

سی سیزر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا: "بالکل ٹھیک —— ؟ یہ ہو نہیں سکتا"!

"ہاں تو، مگر کافی تکلیف اٹھانا پڑی۔ تمہارا بوڑھا باپ بھی عجیب ضدی گدھا ہے"۔

سی سیزر نے پھر کہا: "یہ ہو نہیں سکتا، باپ"!

"نہیں تو، سب کچھ ہو چکا ہے۔ کل دوپہر کے وقت آ جاؤ اور شادی کا انتظام کر لو"۔

سی سیزر نے پادری کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسے اچھی طرح بھینچا۔ اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہنے لگا: "ہاں، ہاں، باپ! ایک ایماندار آدمی کی قسم پر اعتبار کرو۔ میں آئندہ اتوار کے روز گرجے میں آپ سے ملوں گا"۔

---

(۲)

شادی دسمبر کے وسط میں ہوئی۔ یہ ایک سادہ قسم کی شادی تھی کیونکہ دولہا دلھن کے پاس روپیہ نہ تھا۔ سی سیزر نئے لباس میں آراستہ ہو کر صبح اپنی منگیتر کو رخصت کرا کے لانے کو تیار ہو بیٹھا۔ مگر ابھی بہت سویرا تھا وہ باورچی خانے کی میز کے قریب بیٹھا ان دوستوں اور عزیزوں کا انتظار کرنے لگا، جنہیں اس کے ہمراہ جانا تھا۔

ایک ہفتے سے برف پڑ رہی تھی۔ اور بادامی رنگ کی زمین جو خزاں کی فصل سے بانجھ ہو چکی تھی، برف کی تہہ سے مردہ سی ہو گئی تھی۔

جھونپڑیاں، جن کی چھتوں نے سفید ٹوپیاں پہن رکھی تھیں، سردی سے خستہ ہو رہی تھیں۔ باغوں میں سیب کے درختوں پر برف کے ذرّے یوں دکھائی دیتے تھے گویا ان میں پھول آ رہے ہیں۔

آج شمالی جانب کے بوجھل بادل، جو سفید اونی رنگ کے قطرے چھپائے کھڑے سے تھے، غائب ہو گئے تھے۔ اور نیلا آسمان نمودار ہو گیا۔ اور سفید زمین پر سورج کی نقرئی کرنیں پڑنے لگیں۔

سی سیزر کھڑکی میں سے سائے کی جانب نظر دوڑا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں کوئی خیال نہ تھا اور وہ بہت زیادہ خوش تھا۔

دروازہ کھلا۔ دو عورتیں اندر آئیں۔ یہ گاؤں کی عورتیں جنہوں نے اتوار کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ دولہا کی چچی اور نانی تھیں۔ پھر اس کے تین چچا آئے ان کے بعد ایک ہمسایہ عورت۔ ان تمام کو کرسیاں مل گئیں اور وہ خاموشی اور سکوت کے عالم میں بیٹھ گئے۔ عورتیں ایک طرف اور مرد دوسری طرف۔ ایک نے پوچھا۔

"کیا وقت ابھی نہیں ہوا؟"

سی سیزر نے جواب دیا: "یقین تو یہی ہے کہ ہو چکا ہے"!

"تو چلو۔ پھر چلیں۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سی سیزر کچھ بے چین سا ہو رہا تھا۔ وہ اٹھتا اور چوبارے کی سیڑھی پر چڑھتا یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کا باپ ابھی طیار ہوا ہے یا نہیں۔ بوڑھا پہلے تو صبح سویرے ہی اُٹھ بیٹھا کرتا تھا۔ مگر آج ابھی تک باہر نہ نکلا تھا۔ سی سیزر نے اسے گدیلے پر پایا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس کے چہرے پر کینے کے آثار نمایاں تھے۔

سی سیزر نے اس کے کان میں چلا کر کہا: "چلو۔ ابا۔ اٹھو۔ شادی پر جانے کا وقت ہو چلا ہے"!

بہرے نے ایک مردہ سی آواز میں کہا "میں نہیں جا سکتا۔ سردی نے تو میری کمر اکڑا دی ہے۔ میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا"۔

سی سیئر نے خوفزدہ ہو کر غور سے اس کی طرف دیکھا "اٹھو، طیار ہو جاؤ"۔

"میں نہیں اٹھ سکتا"۔

"تو لو میں تمہیں اٹھاتا ہوں"۔

اور وہ بوڑھے پر جھکا۔ رزائی ایک طرف کی۔ بازو سے اس کو پکڑا اور اٹھا دیا۔ مگر بوڑھا چلانے لگا "ہائے، ہائے، ہائے درد۔ درد۔ میں نہیں اٹھ سکتا۔ میری کمر میں بل پڑ گئے ہیں"۔

سی سیئر نے محسوس کیا کہ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اپنے باپ سے زندگی بھر میں پہلی مرتبہ گستاخ ہو کر بولا "اچھا تو پھر تمہیں آج کھانا بھی نہیں ملے گا۔ میں پالٹ ہوٹل میں کھانا کھاؤں گا۔ اب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ انسانیت سے کس طرح پیش آنا چاہیئے"!

اور وہ سیڑھیوں پر سے تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اور اپنے عزیزوں اور مہمانوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

مردوں نے اپنی پتلونوں کو ذرا اوپر کھینچ لیا، کہ برف سے لگ کر میلی نہ ہو جائیں۔ عورتوں نے اپنے لہنگے خوب سنبھال لیے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے ٹخنے، خاکستری رنگ کی اونی جرابیں، اور دبلی پتلی ٹانگیں، جو جھاڑو کی تیلیوں کی طرح سخت تھیں، نمودار ہونے لگیں۔ یہ جماعت خاموشی سے چلتی گئی۔ راستہ برف کے لامتناہی سلسلے کے نیچے دب چکا تھا۔ اور وہ ایک دوسرے کے پیچھے بڑی احتیاط سے چلتے گئے۔ کہ کہیں لسے کھو نہ بیٹھیں۔

ہر کھیت پر ایک دو کسان ان میں شامل ہونے کے لیے ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے۔ اور اس طرح برات کے افراد بڑھتے ہی گئے۔ وہ نظر نہ آنے والے راستے پر چلتے گئے۔ وہ کالے منکوں کی ایک زندہ تسبیح کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ جو برف کے سفید کھیتوں پر پھسلتی چلی جا رہی ہو۔

دلہن کے مکان کے دروازے پر کچھ لوگ کھڑے دولہا کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کا استقبال کیا۔ سیلیسٹی فوراً اپنے کمرے سے نکل آئی۔ اس نے نیلا گون پہن رکھا تھا۔ اس کے کندھوں پر سرخ شال پڑا تھا۔ اور سر نارنگی کے پھولوں کے ایک ہار سے مزین تھا۔

مگر ہر شخص سی سیئر سے سوال کرتا "تمہارے ابا کہاں ہیں؟"

اور وہ پریشان ہو کر جواب دیتا "وہ بیچارے تو درد ریح کے باعث حرکت نہیں کر سکتے"۔

کسانوں نے اپنے سر ہلائے اور اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ رجسٹرار کو ہلانے گئے۔ ایک عورت وکٹر کا بچہ پہنے والے مماں بیوی کے پیچھے لیے کھڑی تھی۔ اور دہقان بازو میں بازو ڈالے، دو دو کی قطار میں، برف پر سے کسی مستول کشتی کی طرح چلنے لگے۔

میئر نے ٹاؤن ہال میں ان کی شادی کا اندراج کیا اور پھر پادری نے خدا کے متبرک گھر میں ان کا نکاح پڑھا اور اُن کے لیے برکت چاہی۔

جونہی یہ جوڑا گرجے کی دہلیز پر نمودار ہوا۔ قبرستان کی چار دیواری میں سے بندوقوں کے دھماکے سنائی دیئے۔ اس وقت بندوقوں کی نالیوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نالیوں میں سے دھوئیں کے مرغولے بسرعت نمودار ہو رہے تھے۔ چار دیواری میں سے ایک سر نظر آیا۔ یہ وکٹر کا سر تھا۔ جو اپنی محبوبہ کی شادی منا رہا تھا۔ اور ہر دھماکے کے ساتھ اپنی مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے فائر کرنے والے پانچ چھ آدمی اُجرت پر منگوا رکھے تھے۔ ہر براتی اس بات پر متفق تھا کہ وکٹر کا مستحسن رویہ تعریف کے قابل ہے۔

کھانا کھانے کا انتظام پالٹ ہوٹل میں کیا گیا۔ کھانے کے بڑے کمرے میں بیس نشستوں کا انتظام تھا۔ وہ دوپہر کو دسترخوان پر بیٹھے پلیٹوں میں شوربا انڈیل دیا گیا۔ سب کے چہروں میں جان پڑ گئی۔ ہونٹوں سے مزاح کے شرارے چھوٹنے لگے، اور آنکھیں ایک مصنوعی مسرت سے چمک اٹھیں۔

دروازہ کھلا۔ بوڑھا ایملی نمودار ہوا۔ وہ بہت زیادہ غصے کی حالت میں تھا اور ہر کسی سے متنفر نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو لکڑی کے سہارے کھینچا۔ وہ ہر ایک قدم پر کراہتا، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اُسے بے حد تکلیف ہے۔

باراتی بوڑھے کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ مگر یکایک مالی وائر اُس کا ہمسایہ ایک موٹا خوش باش آدمی، جسے ہر شخص کی نقل و حرکت کا علم ہوتا تھا، سی سیئر کی طرح، تالی بجاتے ہوئے، چلا کر بولا "ہاں تو بوڑھے کھوسٹ! تمہاری سونگھنے کی قوت اتنی اچھی ہے، کہ تم گھر بیٹھے ہی پالٹ ہوٹل کے تمام کھانوں کی خوشبو سونگھ سکتے تھے"۔

تمام مہمان قہقہے لگانے لگے۔ مالی وائر اپنی پہلی بات کی کامیابی سے متاثر ہو کر بولا "اس کالے حلوے کے پلستر سے بہتر درد ریح کو آرام دینے والی اور کوئی چیز نہیں۔ تمہارے کلیجے کو برانڈی کا ایک گلاس گرم کر دے گا"۔

سب آدمی میز پر ہاتھ مارتے ہوئے چلانے لگے۔ قہقہے پر قہقہہ لگنے

لگا۔ ان کے جسم کبھی سیدھے ہوتے اور کبھی ہنستے ہنستے پھر جھک جاتے، اور ایسا معلوم ہوتا گویا وہ پمپ سے پانی نکال رہے ہیں۔ عورتیں مرغیوں کی طرح گٹ گٹ گٹ گٹ کرنے لگتیں اور نوکر دیوار کے قریب کھڑے ہنسی سے لوٹ لوٹ جاتے۔ بوڑھا ایمیلی بالکل نہ ہنسا اور انتظار کرنے لگا کہ کب اسے کوئی جگہ ملے۔

انہوں نے اُسے، اس کی بہو کے عین سامنے، میز کے وسط میں ایک جگہ دے دی۔ اور جگہ پاتے ہی اس نے کھانا شروع کر دیا۔ کیوں نہ ہو، آخر اس کے بیٹے ہی کو تو کھانے کا خرچ برداشت کرنا تھا۔ اب کیوں نہ اپنا پورا حصہ لے لے۔ شوربے کا ہر چمچہ جو اس کے پیٹ میں جاتا تھا، روٹی یا گوشت کا ہر لقمہ، جو اس کے سوڑے چباتے تھے: انگور اور سیب کی شراب کا ہر گھونٹ جو اس کے حلق سے نیچے اترتا تھا، وہ محسوس کرتا تھا گویا وہ اس روپے کا، جو بیٹے مہمان دعوت کی شکل میں کھا رہے تھے، کچھ حصہ اپنے مصرف میں بھی لا رہا ہے۔

وہ خاموشی سے کھاتا چلا گیا۔ اس کنجوس کی طرح، جو کوڑی کوڑی چھپائے رکھتا ہے۔ مگر یکایک اس نے سیلیسٹی کے لڑکے کی طرف دیکھا، جو ایک عورت کے گھٹنوں پر میز کے قریب بیٹھا تھا۔ بوڑھے ایمیلی کی آنکھیں مسلسل اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ وہ کھا رہا تھا مگر اس کی نظر بچے پر مرکوز تھی۔ اس کی دایہ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے منہ میں ڈالتی اور وہ انہیں کتر کتر کے کھا لیتا۔ اور بوڑھا بہ نسبت ان تمام کھانوں کے جو دیگر مہمان سیر ہو کر کھا رہے تھے۔ ان لقموں کو دیکھ دیکھ کر زیادہ پریشان ہو رہا تھا جو یہ ننھا بچہ نگل رہا تھا۔

ضیافت شام تک جاری رہی اس کے بعد مہمان رخصت ہو گئے سی سیئر نے بوڑھے ایمیلی کو کھڑا ہونے میں مدد دی۔

اس نے کہا: "آؤ، ابا، گھر جانے کا وقت ہو چکا ہے!" اور اس نے چلنے کی دونوں لکڑیاں اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ سیلیسٹی نے بچے کو اپنے بازوؤں میں لیا اور وہ تاریک رات میں، جو چمکتی ہوئی برف سے منور ہو رہی تھی، چل دیئے۔ بوڑھا، جو مخمور ہو رہا تھا۔ آگے بڑھنے سے انکار کر رہا تھا۔ کئی بار وہ زمین پر بیٹھ گیا کہ شاید اسی طریقے سے اس کی بہو کو سردی لگ جائے۔ وہ بغیر کوئی لفظ منہ سے نکالے، آہ و بکا کرنے لگتا۔ اور دیر تک اس میں مصروف رہتا۔

جب وہ گھر پہنچے، بوڑھا فوراً اپنے چوبارے پر چلا گیا۔ سی سیئر نے اس جگہ بچے کے لئے بستر بچھا دیا، جہاں وہ خود سونے والے تھے۔ سی سیئر اور سیلیسٹی دیر تک جاگتے رہے اور دیر تک وہ بوڑھے کو گدیلے پر پہلو بدلتے سنتے رہے کئی بار وہ اونچی آواز میں کچھ کہتا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے اور از خود رفتہ ہو کر بول رہا ہے۔

دوسری صبح جب وہ سیڑھی پر سے نیچے اترا اس نے دیکھا کہ اس کی بہو جلد جلد سب کام کاج کر رہی ہے۔

وہ چلا کر بولی: "آؤ۔ یہ دیکھو، تمہارے لئے شوربا طیار ہے۔"

اور اس نے میز کے ایک سرے پر مٹی کا سیاہ برتن، ابلتے ہوئے شوربے سے بھرا، رکھ دیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور بیٹھ کر گرم پیالے کو اٹھا لیا اور اس پر حسب معمول ہاتھ گرم کرنے لگا۔ اُس روز اتنی سردی تھی کہ وہ پیالے کو اپنی چھاتی کے قریب لے آیا تاکہ اپنے جسم کو، جو کئی جاڑوں سے یخ بستہ ہو رہا تھا، اس کی تیز حرارت سے گرمائے۔

پھر وہ اپنی لکڑیاں لئے منجمد کھیتوں میں چلا گیا اور دوپہر کے کھانے کے وقت تک وہاں رہا۔ اس نے سیلیسٹی کے بچے کو سوپ بکس میں سوتے دیکھ لیا تھا۔ اور وہ گھر میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے صرف اپنا ہی خیال تھا۔ وہ اسی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ مگر اب وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اس کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اور اپنے بیٹے، اپنی بہو اور اس کے لڑکے کو ایسے اجنبی سمجھتا تھا، جن سے وہ واقف نہیں۔ وہ ان لوگوں سے کبھی کلام تک نہ کرتا تھا۔

موسم سرما گذرتا گیا۔ اس سال جاڑے کچھ زیادہ سخت اور طویل معلوم ہوتے تھے بہار کے ابتدائی ایام نے بیجوں میں جان ڈال دی۔ اور کسان پھر جفاکش چیونٹیوں کی طرح، اپنا وقت کھیتوں میں گذارنے لگے۔ وہ پو پھٹے سے شام تک، شمال مشرقی تیز ہوا اور بارش میں، اس خاکستری زمین کے شیاروں میں کام کرنے لگے، جس کے سینے میں انسان کے لئے قوت لایموت محفوظ ہے۔

یہ سال دولہا دلہن کے لئے مبارک ثابت ہوا۔ فصل کثرت سے پیدا ہوئی۔ اور برفباری بھی نہ ہوئی۔ سیب کے درختوں میں پھول آنے لگے۔ اور غیر معمولی طور پر اچھی پیداوار کے ضامن ہونے لگے۔

سی سیئر بہت زیادہ محنت کرتا۔ صبح سویرے اٹھ بیٹھتا اور رات کو دیر تک کام میں مشغول رہتا تاکہ اس آدمی کا خرچ نکال سکے جو اس نے تنخواہ پر نوکر رکھا ہوا تھا۔

گاہے گاہے اس کی بیوی اس سے کہتی: "بالآخر تم بیمار پڑ جاؤ گے۔"

وہ جواب دیتا: "نہیں تو، میں اتنی محنت کا عادی ہو چکا ہوں۔" مگر ایک

شام وہ اس قدر تھکا ماندہ گھر پہنچا کہ کھانا کھائے بغیر لیٹ گیا۔ وہ صبح حسب معمول اٹھ بیٹھا مگر رات کے فاقے کے باوجود اسے بھوک نہیں لگی تھی اور دوپہر کو وہ آرام کی غرض سے گھر واپس چلا آیا۔ رات کو اسے کھانسی ہونے لگی۔ وہ اپنے گدیلے پر بےچینی سے پہلو بدلنے لگا۔ اب اسے حرارت محسوس ہونے لگی۔ اس کا سر درد کی شدت کے باعث پھٹنے لگا۔ اور پیاس کے مارے زبان خشک ہونے لگی۔

ان تکالیف کے باوجود بھی وہ دن چڑھتے ہی کھیتوں کو چلا گیا مگر دوسرے ہی روز ڈاکٹر کو بلانا پڑا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اس کے پھیپھڑے متورم ہو گئے ہیں۔

اب وہ اپنے بستر ہی پہ پڑا رہتا۔ اور اس تنگ سے کمرے کی گہرائیوں میں وہ کھانستا، ہانپتا اور بےچینی سے پہلو بدلتا سنائی دیتا۔ گھر کے لوگ شمع کی روشنی میں اسے دوا دیتے یا سینکی لگاتے۔ اس کا اندر کو دھنسا ہوا چہرہ داڑھی بڑھ آنے کے باعث بےڈول سا نظر آتا تھا۔ اور اس کے بیمار ہاتھ، جو خاکستری رنگ کے بستر پہ پڑے رہتے تھے، مردہ سے معلوم ہوتے تھے۔

سلیسٹی بڑی احتیاط اور سرگرمی سے اس کی تیمارداری کرتی۔ دوائیں پلاتی، پلستر لگاتی، کبھی اندر کبھی باہر جاتی۔ بوڑھا ایمیلی بھی چوبارے پہ سے اس تاریک کمرے میں نظر دوڑا لیتا جس میں اس کا بیٹا پڑا بیماری کی تکلیف جھیل رہا تھا، مگر نفرت کے باعث قریب نہ آتا۔ اور ایک کینہ ور کتے کی طرح وہیں پڑا رہتا۔

چھ روز گزر گئے۔ سلیسٹی، جو گھاس پھوس کے انبار پر پڑی سو رہی تھی۔ یکایک اٹھی اور سی سیئر کو دیکھنے آئی۔ اس نے اس کے بستر میں جلد جلد سانس لینے کے کوئی آثار نہ دیکھے۔ خوفزدہ ہو کر وہ پوچھنے لگی "سی سیئر! تم رات بھر کیسے رہے؟"

سی سیئر نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے اسے چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اور اس کے چہرے کو ٹھنڈا پایا۔ ایک طویل چیخ اس کے منہ سے نکلی ــ ایسی چیخ جو آہ و بکا کرتے وقت ایک عورت کے منہ سے نکلتی ہے ــ وہ مر چکا تھا۔

اس کی چیخ سن کر بوڑھا اپنی سیڑھی کی چوٹی پر نمودار ہوا، اور سلیسٹی کو طبی امداد کے لئے باہر جاتے دیکھ کر، وہ جلدی سے نیچے اترا اور اپنے بیٹے کے چہرے کو محسوس کرنے لگا۔ وہ حقیقت سے آشنا ہو گیا اور اس نے اندر سے دروازہ بند کر دیا کہ بیٹے کی موت کے بعد پھر کہیں سلیسٹی اس کے گھر میں آ کر چیزوں پر قبضہ نہ جما لے۔

وہ اپنے مردہ بیٹے کے قریب بیٹھ گیا۔ ہمسائے پہنچے اور چلا چلا کر دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ بوڑھا ان کی آواز تک نہ سنتا تھا۔ ان میں سے ایک نے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اندر گھس گیا۔ دوسرے لوگ اسی طرح اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ سلیسٹی بہت زیادہ روتی ہوئی آئی۔ اس کے گال سوج رہے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ بوڑھا ایمیلی اپنے چوبارے میں، کوئی لفظ کہے بغیر، چلا گیا۔

دوسرے روز سی سیئر کو دفن کر دیا گیا۔ اور اب خسر اور بہو ننھے بچے کے ساتھ مکان میں رہنے لگے۔

کھانا حسب معمول پک جاتا۔ وہ آگ جلاتی، شوربا پکاتی، میز پہ پلیٹیں رکھتی۔ اور بوڑھا کرسی پہ آ کر بیٹھ جاتا اور سلیسٹی کی طرف نظر اٹھائے بغیر اس کا انتظار کرنے لگتا۔

جب کھانا بالکل طیار ہو جاتا۔ وہ اس کے کان میں چلا کر کہتی "آؤ کھانا شروع کریں"

وہ اٹھتا، میز کے ایک طرف آ بیٹھتا، مکھن بھری ڈبل روٹی کو چباتا، سیب کی شراب کے دو گلاس پیتا اور باہر چلا جاتا۔

ان دنوں میں سے ایک خوشگوار مرطوب دن تھا۔ جب زندگی میں ہیجان اور جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ بوڑھا ایمیلی کھیتوں میں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے جوار اور مکی کی کونپلیں دیکھیں اور خیال کیا کہ اس کا نوجوان بیٹا بیسیوں من مٹی کے نیچے سویا پڑا ہے؛ اور وہ کھیتوں میں تنہا، تن تنہا، نیلے آسمان کے نیچے، شاداب فصلوں کے درمیان، پھر رہا ہے۔ چنڈول اس کے سر پہ منڈلا رہا ہے، مگر وہ اس کا لطیف نغمہ نہیں سن سکتا۔ اس کی آنکھیں نمدار ہو گئیں۔

پھر وہ ایک جوہڑ کے قریب بیٹھ گیا اور شام تک چھوٹے چھوٹے پرندوں کا نظارہ کرتا رہا جو وہاں پانی پینے آتے۔ رات کے وقت وہ گھر لوٹ آیا اور کھانا کھا کر اپنے چوبارے میں چلا گیا۔

اور اس کی زندگی اسی طرح بسر ہوتی رہی جس طرح پہلے بسر ہوتی تھی۔ اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی سوائے اس کے کہ اس کا بیٹا قبرستان میں سویا پڑا تھا۔

اور اس سے ہو بھی کیا کچھ سکتا تھا؟ وہ اس قابل ہی نہ تھا کہ کوئی کام کر سکے۔ وہ تو صرف شوربا پی سکتا تھا جو اس کی بہو اس کے لئے طیار کرتی تھی۔ اور وہ صبح و شام خاموشی سے اسے پی لیتا۔ سلیسٹی کا بچہ میز کی دوسری طرف بیٹھا کھانا کھاتا اور وہ اس کی طرف غضبناک نگاہوں سے

دیکھتا رہتا۔ پھر وہ باہر چلا جاتا۔ کھیتوں میں بے مقصد پھرتا رہتا کبھی غلے کے کوٹھے میں اپنے آپ کو چھپا لیتا گویا وہ ڈرتا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اور شام کو گھر واپس آجاتا۔

مگر سلیسٹی کے خیالات پریشانیوں کے بوجھ تلے دبنے لگے کھیتوں کی دیکھ بھال اور وہاں کام کرنے کے لئے کسی آدمی کی اشد ضرورت تھی۔ ایسے آدمی کی نہیں جو اجرت پر کام کر سکے۔ بلکہ ایک ماہر کسان، ایک آقا کی جو کھیتی باڑی میں حقیقی دلچسپی رکھتا ہو۔ ایک عورت اتن تنہا، زراعت کا کام نہیں کر سکتی۔ غلے کی بڑھتی گھٹتی قیمتیں نہیں معلوم کر سکتی۔ اور فروخت کے ذرائع مہیا نہیں کر سکتی۔ ساری ساری رات اس کے دماغ میں سادہ اور قابل عمل خیالات آتے رہتے۔ وہ ایک سال سے پہلے دوبارہ شادی نہیں کر سکتی تھی، اور فوری ضروریات کی طرف توجہ دینا بھی لازمی معلوم ہوتا تھا۔

صرف ایک شخص اس پریشانی میں اس کے کام آسکتا تھا۔ اور وہ وکٹر تھا جو اس کے بچے کا اصل باپ تھا، وہ مستقل مزاج تھا اور زراعت میں ماہر تھوڑے سے روپے میں بھی وہ کھیتی کی حالت سنوار سکتا تھا۔ سلیسٹی نے اسے اپنے باپ کے کھیت پر کام کرتے دیکھا تھا۔

تو ایک صبح، اسے کچھ کھاد اٹھائے، سڑک پر جاتے دیکھ کر وہ اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ جب اس نے اسے دیکھا تو اپنے گھوڑے کھڑے کر لئے اور سلیسٹی اس سے اس طرح مخاطب ہوئی گویا ابھی ایک ہی روز پہلے وہ اس سے متعارف ہوئی تھی۔

"صبح بخیر، وکٹر، مزاج کیسا ہے آج"

اس نے جواب دیا "اچھا ہوں کہو تم کیسی ہو؟"

"میں اچھی ہوتی اگر مجھے زمین کی فکر نہ ہوتی"

وہ بڑی دیر تک بھاری چھکڑے کے پہیئے سے ٹیک لگائے، باتیں کرتے رہے۔ گاہے گاہے وکٹر اپنی ٹوپی کے نیچے اپنی پیشانی کو ٹھونکتا اور کچھ یاد کرتا۔ وہ خلوص سے باتیں کرتی رہی۔ اور اس کے سامنے اپنے دلائل، تمام حالات، اور قسمت کو بہتر بنانے کی تجاویز، پیش کرتی رہی۔ آخر کار اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں یہ کام ہو سکتا ہے"

سلیسٹی نے ایک کسان کی طرح، جب سودا چک جائے، اپنا ہاتھ بڑھایا، اور پوچھا "تو فیصلہ ہو چکا نا"

وکٹر نے بڑھے ہوئے ہاتھ کو زور سے دبا کر کہا "ہاں ہو چکا"

"تو پھر اتوار کے روز"

"ہاں اتوار ہی کے روز"

"بہت اچھا، خدا حافظ، وکٹر"

"خدا حافظ، مادام سلیسٹی"

(۳)

اتوار کا ایک دن، گاؤں میں تہوار کا دن تھا۔ اس روز کسان اپنے مذہبی رہنما کی یاد تازہ کر رہے تھے۔

ایک ہفتے سے ہر ایک سڑک پر سے عجیب و غریب چھکڑے آتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور تماشہ کرنے والے مرد، جوئے، فنکار، اور دیگر تفریحات کے مکمل سامان لئے اور عجیب و غریب چیزوں کے ساتھ تماشہ کرنے والی عورتیں، جن کے متعلق کسانوں میں مشہور تھا کہ تماشائی ذرا اپنے آپ کو سنبھال کر بیٹھیں، جمع ہو رہی تھیں، اور ایک ہفتے سے ان کے ٹھہرانے کا سامان ہو رہا تھا۔

میلے کچیلے کسانوں کے گروہ کے گروہ، گاؤں کی تفریح گاہ میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ان کے ساتھ سر نیچے کئے ہوئے غمگین کتے بھی موجود تھے جو چھکڑے کے دو پہیوں کے درمیان چلتے ہیں۔

تہوار کے دن صبح سویرے ہی تمام دکانیں کھل گئیں۔ اور شیشے اور چینی کے برتنوں سے جگمگا اٹھیں۔ کسان نماز کے لئے گرجے کو جاتے وقت ان دکانوں کی طرف، جو سال کے بعد ہی اس شکل میں جلوہ گر ہوتی ہیں، حریص نگاہیں ڈالتے جاتے تھے۔

کھیل کا میدان تیسرے پہر ہی سے بھر گیا۔ گرد و نواح کے دیہات کے کسان اپنے بیوی بچوں سمیت دو پہیوں والے چھکڑوں پر، جو لوہے کی طرح کھڑکھڑاتے اور جھولے کی طرح چیں چیں کرتے چلے آتے تھے، پہنچ گئے، انہوں نے جانوروں کو اپنے دوستوں کے گھروں میں آکر کھول دیا۔ اور احاطے عجیب و غریب چھتوں والے، خاکستری رنگ کے اونچے۔ تنگ چھکڑوں سے بھر گئے۔ اور ہر ایک کنبہ، آگے بچے اور پیچھے بڑے، جلد جلد تفریح گاہ کو چل دیا۔ ان کے چہرے متبسم تھے اور ہاتھ — سرخ، خوفناک، محنت کے عادی ہاتھ، جو اس وقت فارغ ہونے کے باعث بے چین سے نظر آ رہے تھے — آزادی سے نیچے لٹک رہے تھے۔

آہستہ آہستہ چلنے والا گروہ مکانوں کے قریب سے، آہستہ آہستہ نکلنے والی جیپ کی طرح، یا ان بیکار جانوروں کی طرح جو ایکا ایک کھلے چھوڑ دیئے

جائیں، گذرتا چلا گیا۔

لڑکیاں، جن کے بازو بندھے ہوئے تھے، پانچ پانچ، چھ چھ کی قطاروں میں چہچہاتی اور گیت گاتی چلی جاتی تھیں۔ اور لڑکے کانوں پر ٹوپیاں رکھے اور لمبی لمبی قمیصیں پہنے جو کلف سے سخت غباروں کی طرح پھول رہی تھیں، مذاق کرتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔

سب دیہاتی —— آقا، مزدور، خادم —— وہاں موجود تھے۔

بوڑھا ایملی بھی، ایک پرانا سبز فراک کوٹ پہنے، تفریح گاہ میں آ پہنچا۔ اس نے کبھی یہاں آنے سے ناغہ نہیں کیا تھا۔

وہ "جوا گھر" اور "شکار گھر" کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور نشانچیوں کے نشانوں پر لے دے کرتا۔ وہ ایک کھیل میں بہت دلچسپی لیتا۔ یہ کھیل لکڑی کی ایک بڑی گیند کو ایک مصنوعی موٹے آدمی کے کھلے منہ میں پھینکنے پر مشتمل تھا۔

یکایک کسی نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ یہ بوڑھا مالی آوار تھا۔ جو چلا چلا کر ایملی سے کہہ رہا تھا: "چلو تو ذرا ایک بازی مجھ سے بھی کھیلو"۔

اور وہ شراب والی دکان میں جو کھلی ہوا میں تھی، ایک میز کے قریب بیٹھ گئے۔ پہلے انہوں نے برانڈی کی ایک بوتل منگائی۔ پھر دو اور پھر تین بوتلیں چڑھا گئے۔ اور بوڑھا ایملی پھر تفریح گاہ میں چلنے پھرنے لگا۔ اس کے خیالات پریشان ہو گئے۔ وہ ہنسنے لگا یہ جانے بغیر کہ وہ کیوں ہنس رہا ہے۔ وہ جوا گھر کے سامنے، .... چوبی گھوڑوں کے سامنے، اور سب سے زیادہ ناریل کے ساتھ نشانے لگانے والی دکان کے سامنے کھڑا ہو کر ہنسنے لگا۔

وہ واپس آ کر شراب کی دوکان میں داخل ہوا اور سیب کی شراب کے ایک گلاس سے اپنے آپ کو تازہ دم کیا۔ دیر ہو چکی تھی اور رات کا وقت تھا۔ ایک ہمسائے نے اطلاع کے طور پر اسے بتایا: "بوڑھے، کہیں رات کے کھانے میں دیر نہ ہو جائے"۔

وہ گھر کو روانہ ہوا۔ شام کا خوشگوار سماں تھا۔ بہار کی کیف انگیز شام آہستہ آہستہ زمین پر چھانے لگی۔

جب وہ دروازے پر پہنچا، تو اس نے روشن کھڑکی میں سے مکان میں دو سائے دیکھے۔ وہ حیران ہو کر ٹھیر گیا۔ پھر اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ ڈکٹر میز کے قریب آلو کی پلیٹ سامنے رکھے ٹھیک اسی جگہ رات کا کھانا کھا رہا ہے جس جگہ کبھی اس کا بیٹا کھایا کرتا تھا۔

وہ یکایک مڑا گویا وہ باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ رات بالکل تاریک تھی سیلیسٹی نے چلا کر کہا: "آؤ جلدی سے آؤ دیکھو، ضیافت کا دن منانے کے لئے ہم نے کیسا اچھا کھانا پکایا ہے"۔

اس پر اس نے سلیسٹی کا کہا مان لیا۔ اور عورت، مرد اور بچے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ پھر وہ حسب معمول اطمینان سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔

ڈکٹر بھی بڑے اطمینان سے سیلیسٹی سے باتیں کرتا رہا۔ اور بچے کو اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر اسے پیار کرتا رہا۔ بوڑھا ایملی ٹکٹکی باندھے ان کی جانب دیکھتا رہا۔ وہ ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ جب وہ کھانا کھا چکا —— اور وہ اپنی پریشانی کے باعث سیر ہو کر نہ کھا سکا تھا —— تو سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور حسب معمول چوبارے پر جانے کے بجائے وہ باہر کھیتوں میں چلا گیا۔

جب وہ چلا گیا تو سیلیسٹی نے ذرا بے چین سی ہو کر پوچھا: "اب کیا کرنا چاہیئے؟"

ڈکٹر نے لاابالیانہ انداز میں جواب دیا: "کوئی فکر کی بات نہیں۔ جب وہ تھک جائے گا۔ تو خود بخود واپس آ جائے گا"۔

سیلیسٹی نے کمرے میں چیزیں سلیقے سے رکھیں۔ پلیٹوں کو صاف کیا۔ اور میز کو پونچھا۔ اتنے میں ڈکٹر نے کپڑے بدل لئے۔ اور اس تاریک کمرے میں چلا آیا۔ جہاں سیلیسٹی کبھی سی سیزر کے ساتھ سویا کرتی تھی۔

احاطے کا دروازہ کھلا۔ بوڑھا ایملی پھر نمودار ہوا۔ اندر داخل ہو کر اس نے ایک بوڑھے کتے کی طرح جو کسی چیز کی تاک میں ہو، چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ ڈکٹر کی تلاش میں تھا۔ اس نے لالٹین لی اور اس تاریک کمرے کے قریب لے گیا۔ جہاں کبھی اس کا بیٹا سویا کرتا تھا۔ درزوں میں سے اسے ڈکٹر بستر پر دراز ہوا دکھائی دیا۔ وہ واپس چلا آیا۔ لالٹین کو نیچے رکھ دیا اور احاطے میں آ گیا۔

سیلیسٹی نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ اس نے اپنے بچے کو بستر پر سلا دیا تھا۔ اور ہر چیز قرینے سے رکھ دی تھی۔ اور اس انتظار میں تھی کہ کب اس کا خسر واپس آئے۔ اور وہ ڈکٹر کے پہلو میں نیند کے مزے لے۔

وہ بے کار کرسی پر اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھی رہی۔ مگر وہ واپس نہ آیا اور یہ سٹپٹا کر کہنے لگی: "یہ بوڑھا نکھٹو، اس کی خاطر بتی کا چوتھا حصہ جل گیا"۔

ڈکٹر نے بستر پر سے جواب دیا: "وہ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ عرصے سے باہر ہے۔ جاؤ دیکھو کہیں ڈیوڑھی میں پڑا نہ سو رہا ہو"۔

"میں جا رہی ہوں"۔ سیلیسٹی نے اٹھتے ہوئے کہا اور لالٹین پکڑ کر

باہر نکل آئی۔

اُس نے دروازے کے سامنے کچھ نہ دیکھا۔ اور نہ گو اس بڑے جہاں کبھی کبھی خوشگوار دنوں میں بوڑھا بیٹھا کرتا تھا۔

مگر وہ گھر واپس آنے ہی کو تھی کہ اس کی نظر اتفاقاً سیب کے اُس بڑے درخت پر پڑ گئی جو احاطے کے دروازے پر سایہ کئے رہتا تھا۔ اور دو پاؤں، انسانی پاؤں اُسے دکھائی دیئے، جو اوپر سے لٹک کر اس کے چہرے تک پہنچ رہے تھے۔

وہ خوف سے چلا اٹھی " وکٹر! وکٹر! وکٹر!"

وہ دوڑتا ہوا باہر آیا بیٹی ڈر کے مارے بول بھی نہ سکتی تھی۔ اور اپنے سر کو دوسری طرف پھیر کر کہ دوبارہ اسی منظر کو نہ دیکھے۔ اس نے انگلی سے سیب کے درخت کی جانب اشارہ کیا۔

وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ اور لالٹین کی مدد سے دیکھنے لگا کہ بات کیا ہے۔ سبز پتوں میں سے اس نے دیکھا کہ بوڑھا ایسی کافی بلندی پر اصطبل کے ایک رسے سے بندھا لٹک رہا ہے۔

سیب کے درخت کے ساتھ ایک سیڑھی لگی تھی۔

وکٹر کلہاڑی لینے بھاگا۔ اور درخت پر چڑھ کر اُس نے رستے کو کاٹ ڈالا۔ مگر بوڑھا سرد پڑ چکا تھا۔ اس کی زبان خوفناک انداز میں باہر کو نکلی ہوئی تھی۔

(موپساں) **طاہر قریشی**

شعر

ہم پر بھی مثل غیر ہیں کیوں مہربانیاں
اے بدگمان عبث ہیں تری بدگمانیاں

حسرت موہانی



اب کی عید میں

نیم کی اس ڈالی کے اُوپر اُس کوٹھی کی چھت سے ہٹ کر
نازک۔ نازک۔ ہلکا۔ ہلکا!
سونے کی چوڑی کا آدھا!
اس انگلی کے ناخن کا سا!
وہ دیکھو۔۔۔ کچھ ہٹ کے افق سے۔ چاند کی رعنائی کا منظر!

مہندی۔ خوشبو۔ ہلکا سُرمہ!
اک کھڑکی پر جانے کیا کیا!
مسجد تو کاٹے کھاتی تھی، میں بھی کھویا کھویا سا تھا!
آج تو میں ہر ہر سجدے میں جانے کیا کیا سوچ رہا تھا!!

. . . .

نیم کی اس ڈالی کے اوپر۔ اس کوٹھی کی چھت سے ہٹ کر!!
ہاں ہیں، جیسے بھول گیا تھا اچھا، عید کا چاند مبارک!
اس کو جو ہے میرا پیارا پیارا عید کا چاند مبارک!
"کون؟" ارے یہ بھی نہیں سمجھا! "زہرا!" عید کا چاند مبارک!
اچھا، آؤ چھت سے چل کر نیچے کوئی بات کریں!
کل تو عید کا پیارا دن ہے، آؤ ختم یہ رات کریں!
"دیر بہت ہو گی!" میں سمجھا۔ ملنے کی امید ہے نا؟
صبح کو ہم جی بھر کے ملیں گے، سمجھیں تم؟ کل عید ہے نا۔

ہاں، اب کی کپڑا مہنگا تھا۔
میرا پہلے کا رکھا تھا!
لیکن میری "سلک کی اچکن" اوروں سے کیا کم اچھی ہے؟
دیکھو تو، یہ ہلکی زردی کتنی دلکش ہے، پیاری ہے!
میں کب کہتا ہوں ان لوگوں کے کپڑے معمولی سے ہیں!
یہ تو ظاہر ہے وہ مجھ سے دولت۔ ثروت میں اچھے ہیں!
خیر ہنسی کی باتیں چھوڑو! اچھا۔ اب تو جاتا ہوں میں!
ہاں، تم کب آؤ گی؟ بولو! روز یہ آس لگاتا ہوں میں!

. . . .

ہاں، میں نے بھی صبح کو تم کو اگلی کھڑکی پر دیکھا تھا!
تم نے بھی دیکھا تھا جب میں مسجد کی جانب جاتا تھا!
جامہ نیلا۔ سُرخ دوپٹہ!
بازو کنگن۔ چھاگل۔ توڑا!

سوچ رہا ہوں جب تھوڑے ہی دن میں نوکر ہو جاؤں گا۔
اب کی عید میں زہرہ کو میں اپنی سج دھج دکھلاؤں گا۔

سلام مچھلی شہری

ازلی مسرتوں کی ازلی منزل

مٹیالے مٹیالے بادل گھوم رہے ہیں میدانوں کے پھیلاؤ پر
دریا کی دیوانی موجیں ہمک ہمک کر ہنس دیتی ہیں اک ناؤ پر

سامنے اودے اودے پربت کی ابر آلودہ چوٹی پر ہے ایک شوالا
جس کے کلس کی تابانی سے پھیل رہا ہے چاروں جانب ایک اُجالا

جھلمل کرتی اک مشعل سے محرابوں کے گہرے سائے رقصیدہ ہیں
ہر سو پریاں ناچ رہی ہیں جن کے عارض رخشاں نظریں دزدیدہ ہیں

عنبر اور لوبان کی لہریں دوشیزہ کی زلفوں ایسے بل کھاتی ہیں
چاندی کے ناقوس کی تانیں دھندلے دھندلے نظاروں میں گھل جاتی ہیں

ہاتھ بڑھائے، سر نیوڑھائے، اپنے سایوں کا اک جھرمٹ گھوم رہا ہے
پوجا کی لذت میں کھو کر مندر کے تابندہ زینے چوم رہا ہے

ایک بہت پتلی پگڈنڈی ساحل دریا سے مندر تک کانپ رہی ہے
ناؤ چلانے والی لڑکی چپو کو ماتھے سے لگائے ہانپ رہی ہے

دیوانی کو کون بتائے اِس مندر کی دھن میں سب تھک ہار گئے ہیں
سائے بن کر گھوم رہے ہیں جو بےباک چلانے والے پار گئے ہیں

وہ جب ناؤ سے اُترے گی مٹیالے مٹیالے بادل گھر آئیں گے
میدانوں پر، کہساروں پر، دریا پر، ناؤ پر، سب پر چھا جائیں گے

اوّل تو پگڈنڈی کھو کر گر جائے گی کالے غاروں میں بےچاری
بچ نکلی تو ہو جائے گی اُس کے نازک دِل پر اک ہیبت سی طاری

ہوش میں آئی تو رگ رگ پر اک نشہ سا بےہوشی کا چھایا ہوگا
جسم کے بدلے اُس مندر میں دھندلا دھندلا اک لچکیلا سایا ہوگا

احمد ندیم قاسمی

رات کی بات

چوڑیاں بجتی ہیں، چھاگل کی صدا آتی ہے!

فرطِ بےتابی سے اُٹھ اُٹھ کے نظر بیٹھ گئی — تھام کر آس ہر آہٹ پہ جگر بیٹھ گئی
میرا غمخانہ عبارت رہا تاریکی سے — موجِ مہتاب کہاں خاک بسر بیٹھ گئی؟
شبنم آلود ہوا جاتا ہے شب کا داماں — تارے چپکے ہیں کہ اب گردِ سفر بیٹھ گئی
بھیگتی رات نہا کر مرے اشکِ خوں میں — جانے کو اُٹھی ہی تھی اُٹھ کے مگر بیٹھ گئی!

اُس نے دیکھا کہ مری رانی لجاتی آئی — آنکھیں ملتی ہوئی فتنوں کو جگاتی آئی!

سر سے ڈھلکا ہوا آنچل، شکن آلود لباس — چڑھی آنکھوں میں مچلتی ہوئی نیندوں کی جھلک
سو گئی تھی ذرا خود، سب کو سلاتے شاید! — نیند کچی تھی کہ دی وعدے نے دل پر دستک
چونک کر اُٹھی تو دیکھا کہ ستارے بن کر — اوجِ افلاک پہ ہے مانگ کی افشاں کی دمک
شیشۂ مہ سے چھلک کر مئے تند و بےدرد — اُس کے ماتھے سے چرا لیتی ہے سونے کی ڈلک
چوڑیاں ہاتھوں میں تھامیں، چلی ہولے ہولے — کر دے غمازی مبادا کہیں چھاگل کی جھنک
سرخی ٹیکے کی جبیں پر ذرا پھیلی پھیلی — جس طرح جام سے کچھ تھوڑی سی مئے جائے چھلک
"زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی ناگنیں نضیں دل — جس طرح ایک کھلونے پہ ہٹیں دو بالک!"
مرے غمخانے پہ پہنچی تو کچھ آیا جو خیال — چوڑیاں چھوڑ دیں، چھاگل بھی ہنسی، چھا، نا، چھنک!

شکر ہے آئی تو ہے، نیند کی گو ماتی ہے!
چوڑیاں بجتی ہیں۔ چھاگل کی صدا آتی ہے!

مختار صدیقی

جونک

(ایک مزاحیہ ڈرامہ)

افراد

(۱) بھولاناتھ۔ (۲) پروفیسر انند۔ (۳) بنواری لال (۴) کملا۔

اور

ایک پنجابی۔ ایک ہندوستانی۔ ایک مارواڑی اور کچھ دوسرے لوگ

منظر پہلا

وقت ۔ دس بجے صبح

مقام ۔ بھولاناتھ کے مکان کا ایک کمرہ

(کمرہ بہت بڑا نہیں اور نہ بہت کشادہ ہے۔ کمرے میں دو چار پائیاں بھی بچھی ہیں اور دو کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز بھی رکھی ہے۔ اِس لئے اِسے آپ سونے کا کمرہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ڈرائینگ روم بھی۔

کمرے میں سامان وہی ہے جو کسی عام کلرک یا اخبار نویس یا ایسی ہی پوزیشن کے کسی شخص کے ہاں ہو سکتا ہے۔

پردہ اُٹھنے پر ہم آنند کو میز کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک اخبار کی ورق گردانی کرتے دیکھتے ہیں۔

پروفیسر آنند شکل صورت سے پروفیسر معلوم ہوتے ہوں، یہ بات نہیں۔ جب سے ہندوستان میں تعلیم کا رواج زیادہ ہوا ہے اور خوراک کا کم۔ تب سے کالجوں میں ایسے طلبا آنے لگے ہیں جنہیں بقول پطرس آسانی سے ان کی مائیں نصف ٹکٹ لے کر اپنے ساتھ زنانے ڈبے میں بٹھا سکتی ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر آنند شاید اسی قسم کے طالب علم تھے۔ حال ہی میں ایم۔اے کی ڈگری لے کر انہوں نے پڑھانے کا شغل اختیار کیا ہے۔ اِس لئے اُن کی عمر یا شکل میں کچھ خاص فرق ظہور پذیر نہیں ہوا پہلی نظر میں انہیں کوئی بہ آسانی میٹرک کا طالب علم سمجھ سکتا ہے۔ اور اِس وقت آپ وہ پروفیسر کی پوشاک میں بھی نہیں ہیں۔ ایک تہمد اور قمیص پہنے ہوئے شاید حجامت بنا کر بیٹھے ہیں۔ کیونکہ صابن کی سفیدی ابھی تک ان کے چہرے پر لگی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور میز پر پڑا ہوا حجامت کا کھلا سامان بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔

پردہ اُٹھنے کے کچھ لمحہ بعد بھولاناتھ دائیں طرف کے کمرے سے داخل ہوتا ہے۔ جدھر شاید رسوئی ہے۔

شکل صورت سے بھولاناتھ پروفیسر صاحب سے کچھ موٹا تازہ ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب کے چہرے سے جو دانشمندی ٹپکتی ہے۔ اس کا وہاں فقدان ہے — سیدھا سادہ سا آدمی ہے۔ کندھے جھٹکنے کی عادت ہے۔ ایسے مردوں کو بارہا لوگ زن مرید بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ اس وقت اس کے چہرے پر گھبراہٹ جھلک رہی ہے۔

(آنند بدستور اخبار دیکھنے میں محو ہے)

بھولاناتھ ۔ (پریشانی سے) یہ پھر آ گیا تم میری امداد کرو۔ آنند خدا کے لئے!

آنند ۔ (اخبار میز پر رکھ کر) آخر بات کیا ہے؟ گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

(بھولاناتھ پریشان سا چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے)

بھولاناتھ ۔ یہ ایکبار آ جاتا ہے تو جانے کا نام نہیں لیتا۔

آنند ۔ آخر معلوم بھی ہو کون ہے یہ؟

بھولاناتھ ۔ ارے کون کیا، راہوں کا باشندہ ہے۔

آنند ۔ راہوں کا، پھر تو تمہارا ہموطن ہوا۔

بھولاناتھ ۔ (طنز سے) اب راہوں کے ہزاروں آدمی میرے ہموطن ہیں اور کمرے (کندھے جھٹک کر) میرے پاس صرف یہی دو ہیں۔

(مجبور ہنسی ہنستا ہے)

آنند ۔ (حیرانی سے) تو کیا ان سے جان پہچان بھی نہیں۔

(اُٹھ کر کمرے میں گھومتا ہے)

بھولاناتھ ۔ بس اِسی بات کا چور ہوں کہ اپنے چھوٹے بھائی سے کبھی ان کے

کارہائے نمایاں سُنتا رہا ہوں۔ یا پھر اپنے شہر کے ڈاکٹر بھگوانداس...

آنند (قطع کلام کرکے) لیکن تم نے کہا نا۔ کہ پھر آگیا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے بھی یہ صاحب تمہیں مہمان نوازی کا شرف بخش چکے ہیں۔

بھولاناتھ - اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ تم... تم... (کندھے جھٹکر) ذرا بیٹھو تو تفصیل سے کچھ بیان کروں۔

(آنند چارپائی پر بیٹھنا چاہتا ہے)

.....ارے.....رے - یہاں کیا بیٹھتے ہو۔ وہ کُرسی لے لو۔

(کُرسی گھسیٹتا ہے)

آنند - میں یہیں اچھا ہوں۔ تم کہو!

بھولاناتھ - پھر ذرا ہنسکر) بات یہ ہے کہ وہ میرا چھوٹا بھائی ہے نا پرسرام جیسا وہ خود آوارہ ہے۔ ویسے ہی اس کے دوست ہیں۔ اُن ہی میں سے ایک کا نام سوم یا سوم، یا جانے کیا تھا۔ وہ جب کبھی آتا تھا اپنے اس بھائی کی تعریف کے پُل باندھ دیا کرتا تھا

آنند - دیش بھگت ہیں۔

بھولاناتھ - خاک!

آنند - شاعر.....

بھولاناتھ - اس کی سات پشتوں میں کسی نے شعر کا نام نہیں لیا۔

آنند - تو مقرر۔ سدھارک۔ حکیم۔ وید۔ ڈاکٹر۔

بھولاناتھ - (چڑکر) تم سُنتے تو ہو نہیں اور لے اُڑتے ہو۔ وہ تھے نہ مشہور ایکٹر ماسٹر فطرت۔ یہ ان کے ساتھ رہ چکا ہے۔

آنند - (قہقہہ لگاکر) تو یوں کہو کہ یہ صاحب ایکٹر ہیں۔

بھولاناتھ - اب ماسٹر فطرت کے مشہور ڈراموں "عشق کی آگ" اور "دردِ جگر" میں اس نے کوئی کام کیا ہے یا نہیں، اس سے میں بالکل بے خبر ہوں۔ اتنا سُنا تھا کہ یہ ماسٹر فطرت کا دایاں ہاتھ ہے۔

آنند - لیکن اس بات سے تمہیں کیا دلچسپی تھی۔

بھولاناتھ - (ہنسکر) ارے بچپن تھا۔ اور کیا۔ جب ہم میٹرک میں پڑھتے تھے تو ان کے ناٹک پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

آنند - عشق کی آگ۔ دردِ جگر....... (ہنستا ہے)

بھولاناتھ - ارے بھائی اِن دنوں ہمارے لئے ماسٹر فطرت ہی کالی داس، اور شیکسپیئر تھے۔ اگرچہ ہمیں ان کے دیکھنے کا اتفاق نہ ہُوا۔ تھا لیکن ان کے ناٹکوں کو پڑھ کر اور محلے کے ایک لڑکے سے ان کے گانے سُنکر ہی ہم انکے آرٹ کا اندازہ لگا لیا کرتے تھے۔

آنند - (ہنسکر) اور ان کے غیبی مداحوں میں سے تھے۔

بھولاناتھ - تم اچھی طرح جانتے ہو۔ مشہور مصنفوں، لیڈروں، ایکٹروں ادیبوں کو لوگ عام انسانوں سے کچھ اُونچا ہی سمجھتے ہیں۔ اور ان سے تو ایک طرف، ان کے ساتھ رہنے والوں سے بات کرکے پھولے نہیں سماتے، پھر یہ تو ماسٹر فطرت کا دایاں ہاتھ تھا۔

آنند - تو ان سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی۔

(پھر اُٹھ کر گھومنے لگتا ہے)

بھولاناتھ - ملاقات (کندھے جھٹک کر) تم اسے ملاقات کہہ سکتے ہو۔ ہمارے شہر کے ہیں نہ ڈاکٹر بھگوان.......

آنند - شہر نہیں۔ قصبہ کہو۔ راہوں قصبہ ہے۔

بھولاناتھ - ہاں ہاں قصبہ، قصبہ، تو میں نے اسے ڈاکٹر بھگوانداس کی دُکان پر بیٹھے دیکھا۔ اسکی باتیں دلچسپی سے سُنیں۔ اور شاید ایک دو باتوں کا جواب بھی دیا۔ بس......

آنند - پھر تم انہیں اپنے گھر لے آئے۔

بھولاناتھ - ارے کہاں، تم مجھے بھی بات کرنے دوگے۔ اِس بات کو دس برس بیت گئے۔ اسکے بعد یہ گذشتہ برس ملے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ گذشتہ برس، میں کس مصیبت سے دن کاٹ رہا تھا چنگڑ محلے کا وہ پیپل ویڑا۔ اور اس میں لالہ جوالاداس کا وہ جہنمی مکان اور اس کی دو اندھیری کوٹھڑیاں جن میں نہ کوئی روشندان ہے نہ کھڑکی۔ گرمیوں میں باہر گلی میں سونا پڑتا تھا۔

آنند - لیکن تم بات تو ان سے ملنے کی کر رہے تھے۔

بھولاناتھ - ہاں۔ ہاں، اُنہی دنوں جب میں وہاں رہتا تھا اور دن بھر نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا۔ یہ ایک دن پیپل ویڑہ کے پاس ہی چنگڑ محلے میں مل گئے۔ اور انہوں نے دُور ہی سے نمسکار کی میں جلدی میں تو تھا لیکن لمحہ بھر کے لئے رُک گیا۔

آنند - تو کہنے کا مطلب......

بھولا ناتھ - (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) انہوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اور کہا کہ ڈاکٹر بھگوانداس آپکی بڑی تعریف کیا کرتے ہیں آپ مجھے پہچان تو گئے ہیں؟ میں نے کہا "ہاں ہاں ماسٹر فطرت..... " کہنے لگے "بیمار ہے بیچارہ درد گردہ سے"!

آنند - دردِ جگر سے نہیں۔

بھولا ناتھ - (آنند کے طنز کی طرف دھیان نہ کر کے) میں نے افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ سنایئے کیسے آئے؟ کہنے لگے۔ مجھے بھی دردِ گردہ کی شکایت ہے۔

آنند - (قہقہہ لگا کر) کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔

بھولا ناتھ - میں نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ کہنے لگے "کرنل بھڑوچہ کو دکھلانے آیا ہوں کل چلا جاؤنگا" میں نے کہا۔ تو آیئے کچھ پانی وانی پیجئے۔ ہنسکر کہنے لگے۔ لالہ سندر لال انتظار تو کر رہے ہونگے لیکن چلئے۔ اپنے ہموطن کا کہنا کیسے رد کیا جا سکتا ہے۔

آنند - اپنے ہموطن کا کہنا — خوب!

(ہنستا ہے)

بھولا ناتھ - میرے تو پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ ضروری کام کے لئے جا رہا تھا۔ اور میں نے رسمی طور پر ہی اسے صرف پانی کے لئے پوچھا تھا۔ خیر گھر لے آیا اور حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے بیوی سے صرف ٹھنڈے پانی کا گلاس لانے کے لئے کہا۔ (صرف پر زور دیتا ہے) پانی پی کر یہ مہاشہ وہیں گلی میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ گئے۔ مجھے جلد جانا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ مجھے..... آ..... ذرا جلدی ہے۔ آپ کدھر جا رہے ہیں؟ ساتھ ساتھ ہی..... لیکن جناب ٹانگیں پسارتے ہوئے میری بات کاٹ کر بے پروائی سے بولے۔ ہاں ہاں آپ شوق سے ہو آیئے۔ میں ذرا تھک گیا ہوں۔ یہیں آرام کرونگا......

آنند - (ہنسکر) خوب!

بھولا ناتھ (کندھے جھٹک کر) تم ہوتے تو میری صورت دیکھتے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی اور یہ ہمارے ہموطن......

(آنند پھر قہقہہ لگاتا ہے)

بھولا ناتھ - مرتا کیا نہ کرتا مجھے تو جلدی تھی۔ ناچار چلا گیا۔ واپس آیا تو آپ مزے سے بستر بچھوا کر خراٹے لے رہے تھے۔ اور بیوی بیچاری اندر گرمی میں مر رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوا تو کہنے لگی۔ آپ کا ایسا بے تکلف دوست تو کوئی دیکھا نہیں۔ آپکے جانے کے بعد کہنے لگا تم تو شاید نواں شہر کی ہو۔ میں چپ رہی تو بولا۔ پھر تو ہماری بہن ہوئی۔

آنند - بہن! (ہنستا ہے)

بھولا ناتھ - اب کملا مجھ سے پوچھنے لگی۔ یہ ہے کون؟ میں کیا بتاتا؟ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا کہ ہمارے دیس کے ہیں۔ چارپائیاں ہمارے پاس صرف دو تھیں۔ آخر وہ غریب سخت گرمی میں اندر فرش پر سوئی۔ خیال تھا دوسرے دن چلے جائینگے۔ لیکن پورے سات دن رہے۔ اور جب گئے تو میں نے قسم کھا کر کملا سے کہا۔ کہ اب کبھی نہیں آئینگے لیکن پھر آدھمکے ہیں اور کملا......

(کملا داخل ہوتی ہے)

کملا - میں پوچھتی ہوں۔ آپ چپ چاپ اِدھر آ کر بیٹھ گئے ہیں اور وہ مجھے اس طرح حکم دے رہے ہیں جیسے میں انکی کوئی زرخرید لونڈی ہوں۔ کملا پانی لادو۔ کملا ہاتھ دھلا دو (منہ بنا کر) کملا یہ کر دو، کملا وہ کر دو۔ میں پوچھتی ہوں۔ یہ ہیں کون۔ آپ تو کہتے تھے۔ میں اسے جانتا تک نہیں پھر یہ کیوں منہ اٹھائے اِدھر چلے آتے ہیں۔ کوئی اور ٹھور ٹھکانہ اُن کے لئے نہیں کیا؟ کون ہیں یہ......

بھولا ناتھ - (بالکل گھبرا کر کندھے جھٹکتے ہوئے) اب بتاؤں......

(اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

آنند - تم ٹھہرو بھابی! مجھے سوچنے دو۔

کملا - لیکن آپ سوچکر کرینگے کیا؟ یہ کوئی ان کا پرانا یار غار ہوگا - مجھے اسی بات سے تو چڑ ہے کہ آخر یہ مجھ سے چھپاتے کیوں ہیں! کیا میں ان کے دوستوں کو گھر سے نکال دیتی ہوں!

(چارپائی کے کنارے پر بیٹھ جاتی ہے)

آنند - دیکھو بھابی۔

کملا - میں کچھ نہیں دیکھنا چاہتی۔ دیکھئے آپ سے کوئی پردہ نہیں۔ کمرے ہمارے پاس یہی دو ہیں اور بستر بھی کوئی فالتو نہیں

اور پھر آپ بھی یہاں ہیں۔ ان کے یہ دوست تو مزے سے بستر بچھوا کر سو رہینگے۔ اور میں پڑی ٹھٹھرا کروں گی باہر برآمدہ میں۔

آنند - دیکھو بھابی۔ وہ ان کے دوست نہیں۔ اس بات کا میں تمہیں یقین دلا دیتا ہوں۔

کملا - تو پھر یہ صاف جواب کیوں نہیں دیتے۔

آنند - اگر ان سے یہ ہو سکتا۔ تب نا ......

بھولاناتھ (جو اس دوران میں برابر اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ رُک کر اور کندھے جھٹک کر) ہاں ہموطن ہیں ......

کملا - ہموطن ہیں تو ......

(انگارہ سی آنکھوں سے شوہر کی طرف دیکھتی ہے)

آنند - دیکھو جھگڑنے سے کچھ نہ بنے گا۔ اس آدمی کو دھتا بتانی چاہیئے

کملا - یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔

آنند - لیکن یہ ان سے ہو چکا۔ ان صاحب کی مہمان داری تو کسی دوسری طرح ہی کی جائے گی۔

(کچھ لحہ کے لئے خاموشی، جس میں آنند سوچتا ہے اور بھولاناتھ انگڑائی لیتا ہے، پھر۔)

آنند - (دھیمی آواز میں) میں پُوچھتا ہُوں۔ وہ کر کیا رہا ہے؟

کملا - شاید باہر گیا ہے۔ جاتے جاتے پُوچھتا تھا کہ آج کیا سبزی پکانے کا ارادہ ہے، بازار سے ......

آنند - (جیسے اس دوران میں تدبیر سوجھ گئی ہے) میں کہتا ہوں، تم لحاف لے لو اور چُپ چاپ لیٹ جاؤ، اور اگر کراہ سکو، تو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کراہتی بھی جاؤ (بھولاناتھ) دیکھو بھائی کھانے کا ذکر آئے تو تم کہہ دینا کہ مجھے بھُوک نہیں، اور میں بہانہ کر دُونگا کہ گرانیِ طبع کے باعث میں آج فاقہ کر رہا ہوں اور بس (جوشکی بہاتا ہے)

(سیڑھیوں سے پاؤں کی چاپ آتی ہے)

ــــــ (مُڑکر) میں کہتا ہُوں۔ جلدی کرو (ایک ایک لفظ پر زور دے کر) جل - دی - کرو - ابھی سمیت لیٹ جاؤ۔

(کملا جلدی سے بستر پر لیٹ کر لحاف لے لیتی ہے - ہاتھ میں دو لوکیاں لئے بنواری لال داخل ہوتا ہے)

بھولاناتھ آیئے آیئے، کدھر چلے گئے تھے آپ؟ یہ ہیں میرے دوست مسٹر آنند جالندھر میں ریاضی کے پروفیسر ہیں یہاں پرنسپل گردھاری لال سے ملنے آئے ہیں (بنواری لال کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہیں مسٹر بنواری لال میرے ہموطن کسی زمانے میں مشہور ایکٹر ماسٹر فطرت کے ساتھ ....

آنند }
بنواری لال } آپ سے ملکر بہت خوشی ہوئی۔

(دونوں ذرا ہنستے ہیں)

بھولاناتھ - یہ آپ کیا اُٹھا لائے اتنی لوکیاں؟ ......

(کملا دھیمے سے کراہتی ہے)

بنواری لال - باہر بک رہی تھیں (ہنسکر) میں نے کہا چلو ......

(کملا ذرا اور زور سے کراہتی ہے)

بنواری لال - (مُڑکر اور ذرا چونک کر) کیا بات ہے، کیا بات ہے (آواز میں تشویش)

بھولاناتھ - اسے دفعتاً دورہ پڑ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے ہوش آیا ہے .. عموماً پڑ جایا کرتا ہے ...... ہسٹیریا۔

بنواری لال - تو آپ علاج ......

بھولاناتھ - علاج بہت کرایا، کرنل (پھر بات کے رُخ کو بدل کر) یہ تو بیمار پڑ گئیں اور (ذرا ہنسکر) لوکیاں آپ اتنی اُٹھا لائے۔ پھر (آنند سے) کیوں بھائی آنند تم تو کہتے تھے ....

آنند - میں تو آج فاقے سے ہوں طبیعت بھاری ہے۔

بھولاناتھ اور میں خود کھانے کے مُوڈ (Mood) میں نہیں۔

بنواری لال - (رسوئی کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے) تو بھابی۔ میرا مطلب ہے کہ لوکی ...... یعنی لوکی کی کھیر ہسٹیریا میں بے حد مفید ہے، اور کھیر میں بنا بھی اچھی لیتا ہُوں۔ ساتھ ہی میں اپنے لئے بھی دو روٹیاں اُتار لُونگا۔ اور بھابی بھی .... لوکی کی ہی بنجائیگی۔ میرا تو خیال ہے۔ آپ بھی کھائیں۔ لطف نہ آجائے تو نام نہیں اندرانگیٹھی تو ہوگی ہی۔ کوئلوں کی آنچ مجھے پسند ہے دُھوئیں سے آنکھیں نہیں نِکلتیں اور پھر کوئلوں پر لوکی کی کھیر بنتی بھی ایسی ہے کہ کیا کہوں ......

(رسوئی میں چلا جاتا ہے)

آنند - (دھیرے سے) یہ اِسطرح نہیں جائے گا۔

بنواری لال - (رسوئی سے) کیوں بھئی مسالہ کہاں ہے؟

کملا - (بیٹھے بیٹھے) کہہ دو ختم ہو گیا ہے۔

بھولا ناتھ - (ذرا اُونچے) مسالہ تو یار ختم ہو گیا ہے۔

بنواری لال - (اندر سے) اور گھی کہاں ہے؟

کملا - (دھیرے سے) کہہ دو ختم ہو گیا ہے۔

بھولا ناتھ - (کندھے جھٹک کر) اب یہ کیسے کہہ دوں؟

آنند - (اُونچی آواز میں) ارے گھی نہیں لائے تم علے الصباح ہی تمہیں بھابی نے کہا تھا کہ گھی ختم ہو گیا ہے - کیسے گرہستی ہو تم؟

(دھیرے سے شرارت کی ہنسی ہنستا ہے)

بنواری لال - (دروازے سے جھانک کر) اچھا ایک آنے کا گھی کم سے کم آج کے لئے تو دیتا آؤں۔ مسالہ بھی نہیں ..... اور کھانڈ بھی ..... میرا خیال ہے ...... نہیں! میں جا کر چند منٹوں میں سب کچھ لایا۔ یہ جب تک کچھ کھائینگی نہیں۔ کمزوری دُور نہیں ہو گی۔

(چلا جاتا ہے)

آنند - (حیرانی سے) یہ عجیب مہمان ہے تمہارا۔ جو مہمانی کے ساتھ میزبانی کے فرائض بھی سر انجام دے رہا ہے اور اپنی جیب سے ....

بھولا ناتھ - میں کہتا ہوں، آنند، یہ جونک ہے جونک۔ خدا کے لئے کوئی اور ترکیب کرو۔ کیا ہوا جو آج جیب سے پانچ آنے خرچ کر دیگا۔ گذشتہ سال جاتا جاتا مجھ سے پانچ روپے لے گیا تھا۔

کملا - (ایک دم اُٹھ کر زور سے) دیئے آپنے پانچ روپے .....

بھولا ناتھ (کندھے جھٹک کر) اب میں ....

کملا - اور میں پانچ پیسے مانگتی ہوں تو مجھے نہیں ملتے۔

بھولا ناتھ اب ہم وطن کو ......

کملا - تو بڑے بھگتیے، پانچ کیا، میری طرف سے پانچ سو دے آئیے، بس مجھے میکے چھوڑ آئیے ......

آنند - اوہ! (خوشی سے تالی بجا کر) سپلینڈڈ (Splendid) میکے ..... ٹھیک! (بھولا ناتھ سے) جلدی کرو، بھابی کو لے کر کسی پڑوسی کے ہاں چلے جاؤ۔ وہ آیا تو میں کہہ دونگا۔ بھابی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ آخر بھائی صاحب اُنہیں میکے چھوڑنے چلے گئے۔ کیوں؟

(داد کی خواہش سے دونوں کی طرف دیکھتا ہے اور ہنستا ہے)

بھولا ناتھ - بھئی۔ تدبیر تو خوب ہے۔ (بیوی سے) تم ذرا اندر پڑوسن سے باتیں کرنا۔ میں کچھ دیر کے لئے انکے شوہر کے پاس بیٹھ جاؤنگا۔ (آنند سے) لیکن یار، میں کہتا ہوں، اگر وہ نہ گیا۔

آنند - جانے گا کیسے نہیں۔ تمہارے جاتے ہی تالا لگا کر میں بھی سٹک جاؤنگا۔ وہ کیا اس کا باپ بھی جائے گا۔

کملا - واہ تالا لگا کر آپ کھسک جائینگے اور جو برتن وہ لے گیا ہے۔ وہ؟ نہیں، آپ یُوں کہئیے گا۔ کہ وہ چلے گئے ہیں اور میں بھی جا رہا ہوں۔ بس اُنہیں نکال کر گھاس منڈی تک چھوڑ آنا۔

بھولا ناتھ - گھاس منڈی تک۔ یہ ٹھیک ہے۔

(قہقہہ لگاتا ہے)

آنند - ہاں۔ ہاں۔ لیکن تم جلدی کرو۔ وہ آ جائے گا۔

بھولا ناتھ - ہاں۔ ہاں جلدی کرو۔ (کملا کو ٹرنک کھولنے کے لئے جاتے دیکھ کر) میں کہتا ہوں۔ نئی ساڑھی پہننے کی ضرورت نہیں۔ تم سچ مُچ میکے نہیں جا رہی ہو۔ اور ہمارے پڑوسی تمہیں اس حالت میں کئی بار دیکھ چکے ہیں۔

کملا - (ٹرنک کو زور سے بند کرتے ہوئے) میں پوچھتی ہُوں ......

آنند - ہاں ہاں وہیں پوچھنا۔ چلو چلو ....

(دونوں کو دھکیلتا ہُوا لے جاتا ہے)

پردہ

منظر دوسرا

وقت - ایک گھنٹہ بعد۔

مقام - اسی مکان کا برآمدہ۔

(برآمدہ، ایک طرف سے جدھر حاضرین بیٹھے ہیں۔ کھلا ہے۔ اِس طرف بڑی لمبی لمبی چقیں لگی ہوئی ہیں۔ جو کھول دی جاتی ہیں تو یہی برآمدہ ایک لمبا سا کمرہ بن جاتا ہے۔ اس وقت چونکہ چقیں لپٹ کر چھت کے ساتھ لٹک رہی ہیں اسلئے برآمدے میں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے ناظرین بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔)

دو اُن کی سیدھی کرسیاں برآمدے میں بائیں طرف رکھی ہیں۔ ان پر دو سال سے روغن نہیں کیا گیا جسکی وجہ سے ان کی سعیدی نظر آنے لگی ہے کرسیوں کے آگے ایک سیدھی سی تپائی رکھی ہے جس پر میلا سا اُکریوں کے رنگ کا کپڑا بچھا ہے

بائیں طرف ایک دروازہ ہے جو سیڑھیوں میں کھلتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں دو دروازے ہیں جو بالترتیب پہلے منظر کے کمرے اور اسکے ساتھ کے کمرے میں کھلتے ہیں۔ دروازے پرانی طرز کے ہیں۔ ان کے اوپر روشندان ہیں۔ جن کے شیشے شاید ابھی تک نہیں ٹوٹے اور جو ٹوٹ گئے ہیں ان کی جگہ گتے کے مستطیل ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ دو خالی چارپائیاں دیوار کے ساتھ کھڑی ہیں۔

ایک کرسی پر پروفیسر آنند بیٹھے ہیں دوسری پر ان کے پاؤں ہیں ان کے دائیں طرف تپائی پر جوٹھے خالی برتن رکھے ہیں۔

اس وقت جب پردہ اُٹھتا ہے وہ سگرٹ سلگانے کی فکر میں ہیں)

آنند - (اس دیاسلائی کو جو بجھ گئی ہے۔ زمین پر پٹک کر) اونہہ!

(بھولا ناتھ سیڑھیوں کے دروازے سے جھانکتا ہے)

بھولا ناتھ - میں کہتا ہوں ہمیں وہاں بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ اور تم نے ابھی تک آواز نہیں دی۔

(اُچھل کر پروفیسر آنند اسکے پاس جاتے ہیں)

آنند - ارے دھیرے بولو، وہ ادھر رسوئی میں بیٹھا کھا رہا ہے۔

(دونوں برآمدے کے درمیان آجاتے ہیں)

بھولا ناتھ (برتنوں کی طرف دیکھ کر) اور یہ تم ....؟

آنند - میں نے بھی روزہ افطار کر لیا ہے۔ کمبخت لوکی کی کھیر بڑے مزے کی بناتا ہے۔

بھولا ناتھ - لیکن ......

آنند - لیکن کیا۔ جو طے ہوا تھا۔ میں نے اسی کے مطابق سب کچھ کیا۔ لیکن وہ بھی ایک ہی شیطان ہے۔

بھولا ناتھ - (سوچتے ہوئے) تو گیا نہیں۔

آنند - وہ ایسی آسانی سے نہ جائیگا۔ ایسوں کو صاف جواب ....

بھولا ناتھ - لیکن اخلاق بھی تو ...... (کندھے جھٹک کر) ...... تم سمجھتے نہیں آنند!

(سر کھجاتے ہوئے کمرے میں گھومنے لگتا ہے)

آنند - صاف جواب نہیں دے سکتے تو گفتگو ...

بھولا ناتھ - تم نے اُس سے کہا نہیں کہ بھابی کی طبیعت ...

آنند - کہا کیوں نہیں جب وہ سب چیزیں واپس لے کر آیا تو میں نے بڑا سا منہ بنا کر کہا۔ بھابی کی طبیعت بڑی خراب ہو گئی تھی۔ اُنہوں نے اصرار کیا کہ میں تو میکے جاؤنگی اور وہ ٹھہرے زن مرید۔ فوراً تیار ہو کر چلے گئے۔

بھولا ناتھ - (غضبناک ہوکر) زن مرید......؟

آنند - (ہنسکر اور بھی آہستہ سے، رازدارانہ انداز میں) ارے وہ تو میں نے صرف بات بنانے کے لئے کہا تھا۔

بھولا ناتھ - (دل ہی دل میں غصے کو پی کر) ہُوں!

آنند - یہ کہہ کر میں قفل اُٹھانے کے لئے بڑھا اور وہ اندر رسوئی میں چلے گئے۔ میں نے تالے کو ہاتھ میں اُچھالتے ہوئے کہا۔ میں تو جا رہا ہوں کہنے لگے۔ کھانا تو کھاتے جائیگا۔ لوکی کی کھیر کا مزا ....

بھولا ناتھ - اور تمہارے منہ میں پانی بھر آیا۔

آنند - نہیں۔ میں نے کہا۔ میں تو جاؤنگا۔

بھولا ناتھ - پھر-

آنند - انہوں نے بیفکری سے انگیٹھی میں کوئلے ڈالکر انہیں سلگاتے ہوئے کہا۔ اچھا تو ہو آیئے لیکن آجایئے گا جلدی۔ ٹھنڈی کھیر کا کیا مزا آئے گا؟

بھولا ناتھ - (غصے سے دانت پیسکر) ہُوں!

آنند - تب میں نے دل میں سوچا کہ یہ اس طرح نہ جائینگے کوئی دوسری ترکیب ہی کرنی پڑیگی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ میں قفل لگا کر انہیں باہر برآمدے میں ہی بلاتا۔ لیکن بھابی کی وہ طشتریوں نے ......

بھولا ناتھ - (جلدی سے) پھر ... پھر ....؟

آنند - پھر کیا۔ میں نے سوچا کہ انہیں یہاں چھوڑ جانا بیوقوفی ہی ہوگی۔ نہ جانے کوئی چیز ہی اُٹھا کر چمپت ہو جائیں۔ اس لئے جھٹ بات بدل کر میں نے کہا۔ نہیں کوئی خاص جلدی تو نہیں مجھے۔ یہ آپ نے

ٹھیک کہا کہ کھیر کا مزا گرم گرم نہیں ہی ہے لائیے دیکھیں
تو سہی آپ کیسی بناتے ہیں۔ بس اُنھوں نے کھیر تیار کی لوکی
ہی کی بھاجی بنائی اور پھر ہلکی پھلکی روٹیاں پکائیں۔ ابھی
ختم کرکے اُٹھا ہوں۔ کمبخت غضب کی رسوئی بناتا ہے
میں پوچھتا ہوں یہ ماسٹر فطرت کا باورچی تو نہیں تھا۔

(دباہوا قہقہہ لگاتا ہے)

بھولا ناتھ - (مایوسی سے) اب ......

(چارپائی میں دھنس جاتا ہے)

آنند - تم بھی بلا تکلف کھا لو۔ بھوکے پیٹ کیا خاک سوجھے گا
تر مال اندر جائے تو ....

(بنواری رومال سے ہاتھ پونچھتا ہوا رسوئی کی طرف سے داخل ہوتا ہے)

بنواری لال - ارے گئے نہیں آپ؟

بھولا ناتھ - (بے تعلقی سے) گاڑی مس کر گئے۔

بنواری لال - اور کملا جی؟

بھولا ناتھ - (چڑچڑے پن کے ساتھ) اُنہیں پھر دورہ پڑ گیا تھا۔

بنواری لال - (نہایت سنجیدگی سے) اوہ! تو کہاں .....

بھولا ناتھ - ویٹنگ روم میں بٹھا آیا ہوں۔ دوسری گاڑی دیر سے
جاتی تھی۔ اسلئے ......

بنواری لال - (افسوس کے لہجے میں اندر کو مڑتا ہوا) ایک ڈبے میں کھیر ڈال
کر بند کئے دیتا ہوں یقین کیجئے۔ لوکی کی کھیر ہسٹیریا کے
دورے میں بڑا فائدہ کرتی ہے۔ اور پھر وہ صبح سے بھوکی
بھی تو ہونگی۔

بھولا ناتھ - (غصہ کو چھپاتے ہوئے) جی نہیں تکلیف نہ کیجئے۔ میں دوا کے
ساتھ تھوڑا سا دودھ پلا آیا ہوں۔

بنواری لال - تو آپ ہی لیجئے (آنند کی طرف دیکھکر) کیوں پروفیسر صاحب
اِنہوں نے بھی تو صبح کا ....؟

بھولا ناتھ - میں کھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔

بنواری لال - (خفیف ہوئے بغیر) کیوں نہ ہو (ذرا ہنسکر) ہو تو ایکبار کسی نے
حکیم سے پوچھا تھا۔ کھانے کا ٹھیک وقت کونسا
ہے؟ اُس نے جواب دیا تھا امیر کی جب طبیعت ہو
اور غریب کو جب ملے۔ سو بھائی آپ ٹھہرے امیر آدمی
اور ہم ....غریب! اچھا۔ پان تو لیں گے نا؟

بھولا ناتھ - (چڑکر) میں پان نہیں کھاتا۔

بنواری - (مسکراکر) اور پروفیسر صاحب؟

آنند - (جس نے خوب سیر ہوکر کھایا ہے) مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں۔

بنواری - اچھا میں ذرا نیچے، پنواڑی سے پان لے آؤں۔

(بے پروائی سے ہنستا ہوا چلا جاتا ہے)

بھولا ناتھ - (کمرے میں ٹہلنا شروع کرتا ہوا) میں کہتا ہوں اب ....

آنند - چُپ۔

بھولا ناتھ - (بے صبری سے) میں کہتا ہوں۔ آخر اب کیا کیا جائے۔ وہ کب
تک پڑوسی کے یہاں بیٹھی رہیگی۔ تم تو مزے سے کھانا کھا کر
کرسی پر ڈٹ گئے ہو۔ اور ہماری آنتیں ....

آنند - بھئی کھانا کھانے کے بعد میری سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں سلب
ہو جاتی ہیں۔ میں تو ذرا سوؤنگا۔

(اُٹھتے ہیں)

بھولا ناتھ - لیکن تم تو کہتے تھے کہ اُس سے نبٹوں گا۔

آنند - (پھر بیٹھکر) وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر دو چار منٹ ذرا آنکھ لگ
جائے۔ تو کچھ سوجھے۔

(خمار آلودہ آنکھوں سے بھولا ناتھ کی طرف دیکھتا ہے اور ہنستا ہے۔ بھولا ناتھ
بے بس سا۔ ہاتھ کمر کے پیچھے رکھے سوچتا ہے اور گھومتا ہے)

بھولا ناتھ - اُٹھو یہ کام ہو چکا۔ مت سنا باہر تالا لگائے دیتے ہیں خود ہی رو
پیٹ کر چلا جائے گا۔ ہم دونوں کسی ہوٹل میں کھانا کھا
لیں گے۔

(پھر گھومتا ہے)

آنند - (کرسی پر پیچھے کی طرف کو لیٹ کر اور جماہی لیکر) تو پھر مجھے کیوں گھسیٹتے ہو
مجھے نیند آ رہی ہے۔

(پھر کرسی سے اُٹھتا ہے)

بھولا ناتھ - (جو بہت تیزی سے کمرے میں گھوم رہا ہے اچانک رک کر) کیا مطلب ہے
تمہارا؟

آنند - (پھر کرسی میں دھنس جاتا ہے) ارے بھائی۔ تم باہر تالا لگا کر
جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ اس کمرے کو اندر سے بند کر جاؤ۔
اور اس میں باہر سے تالا لگا جاؤ مجھے صبح نو بجے پرنسپل

گردھاری لال سے ملنے جاتا ہے۔ تب اس کمرے سے نکلکر باہر سے تالا لگاتا جاؤنگا۔ اب جلدی کرو۔ نہیں تو وہ آجائے گا۔

(اُٹھ کر بائیں طرف کے کمرے میں چلا جاتا ہے)

(اندر سے) لو میں تو لیٹ گیا۔ اب پان خواب میں ہی کھاؤنگا

(بھولا ناتھ کچھ لمحہ تک تیز تیز گھومتا ہے۔ پھر تیزی سے وہ بھی اندر چلا جاتا ہے۔ اس کی غصہ سے بھری چڑ چڑی آواز آتی ہے۔)

تالا کہاں ہے؟ میں کہتا ہوں۔ تالا کہاں ہے؟.....

کمبخت تالا..... مل گیا..... مل گیا.....

(تالا ہاتھ میں لئے آتا ہے اور چابیوں کی زنجیر انگلی میں گھماتا ہے)

آنند - (اندر سے) ارے دیکھو، یہ اس کا بیگ باہر رکھتے جاؤ - نہیں تو ابھی بہانے آجائے گا۔

(بھولا ناتھ پھر اندر جاتا ہے۔ اور کپڑے کا ایک پرانا سا پھٹا ہوا ہینڈ بیگ لیکر آتا ہے اور دروازے کے نزدیک باہر دیوار کے ساتھ رکھ دیتا ہے۔ اور دروازہ بند کرکے قفل چڑھانے لگتا ہے کہ اندر سے پروفیسر آنند کی آواز آتی ہے:-)

ـــــ ارے سنو سنو۔

بھولا ناتھ - (پھر جلدی سے کواڑ کھول کر) کہو۔

آنند - ارے برتن تو اندر رکھتے جاؤ۔

(بھولا ناتھ جلدی سے برتن اُٹھا کر دیتا ہے)

آنند - اور یہ تپائی اور کرسیاں بھی دے دو۔

(بھولا ناتھ جلد جلد کرسیاں اور تپائی دیتا ہے پھر جلد جلد تالا لگاتا ہے۔ جلدی میں چارپائی سے ٹھوکر کھاتا ہے۔ اور بڑبڑاتا ہوا چلا جاتا ہے)

(کچھ لمحے خاموشی)

(جس میں پرے کوئی گھڑیال ٹن ٹن بارہ بجاتا ہے)

پھر کچھ لمحوں کے بعد بنواری لال گال میں پان دبائے اور ہاتھ میں اپنی پان کی ڈبیا اور گٹھری لیکر ہاتھ میں تھامے داخل ہوتا ہے

کمرے میں قفل اور اپنا بیگ باہر پڑا ہوا دیکھ کر چونکتا ہے۔ بھولا ناتھ کا نام لے کر دو بار آواز دیتا ہے۔ ذرا گھومتا ہے۔ پھر مسکراتا ہے اور اپنے آپ سے کہتا ہے۔ "خیر میں تو ابھی سوؤنگا"۔

چارپائی بچھاتا ہے جو دوسرے کمرے کے دروازے کو بالکل روک لیتی ہے

اس پر لیٹ کر سگرٹ سُلگاتا ہے اور ایک دو کش لگا کر کروٹ بدل لیتا ہے

پردہ گرتا ہے

(کچھ لمحہ بعد پردہ پھر اُٹھتا ہے۔ بنواری لال گہری نیند میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے خراٹوں کی آواز صاف سُنائی دیتی ہے)

(پردہ پھر گرتا ہے)

منظر تیسرا

(پردہ آہستہ آہستہ اُٹھتا ہے۔ منظر وہی۔ بنواری لال کروٹ بدلتا ہے۔ باہر کہیں گھڑیال بجتا ہے۔ وہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے پھر)

ـــــ اوہ ۔ تین بج گئے۔

(دروازے کے اوپر روشندان کا تختہ ہلتا ہے۔ اور پھر کسی کا ہاتھ باہر نکلتا ہے۔ بنواری لال چونکتا ہے پھر چپ چاپ کروٹ بدل لیتا ہے)

آہستہ آہستہ بُوٹ سُوٹ پہنے پروفیسر آنند روشندان کے تختے کو ہٹا کر بڑی مشکل سے نیچے اُترنے کی کوشش کرتے ہیں)

بنواری لال - (جیسے کسی آہٹ سے چونک کر) کون ہے؟ (پھر چونک کر اور اُٹھکر) کون، کون روشندان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے (شور مچاتا ہے) دوڑیو ۔ بھاگیو۔ چور ۔ چور ۔

آنند - میں ہوں آنند (آواز گلے میں پھنسی ہوئی ہے)

بنواری لال - (بدستور گھبرائی ہوئی آواز میں) چور..... چور..... دوڑیو..... بھاگیو.......

(ایک مارواڑی ۔ ایک ہندوستانی اور دو ایک پنجابی ۔ بھاگتے ہوئے سیڑھیوں سے داخل ہوتے ہیں)

مارواڑی - (جس کی سانس بھی پھُول رہا ہے) کائیں چھے بابو جی - کائیں چھے*

ہندوستانی - کیا بات ہے بھیا۔ کیا بات ہے؟

پنجابی - (اکڑ کے پیچھے ہٹا ہوا) کی گل اے، کی گل اے۔ کتھے چوری ہوئی اے، کدھر؟

بنواری لال - (آنند کی طرف اشارہ کرکے) یہ دیکھئے آج کل کے جنٹلمین بیکار۔ کوئی کام نہ ملا تو یہی پیشہ اختیار کر لیا۔ چلن دن دہاڑے ڈاکہ

---

* کیا بات ہے بابو جی کیا بات ہے۔

ڈال رہے ہیں میرے دوست ہیں نا۔ پنڈت بھولا ناتھ۔ میں ان سے ملنے کے لئے آرہا تھا۔ دیکھتا ہُوں تو آپ اندر داخل ہو رہے ہیں۔ یہ بیگ شاید پہلی بار نکال کر رکھ چکے تھے۔ (آنند کی طرف دیکھ کر طنز سے) انگریزیئے صاحب اب ذرا چند دن بٹھ گھر کی روٹیاں توڑیئے۔

ہندوستانی ۔ (آگے بڑھ کر) یہ بیگ اُٹھا رہے تھے؟

بنواری لال ۔ نہ نہ اسے ہاتھ نہ لگائیے گا۔ اِس میں سب گہنے بند ہونگے۔ پولیس ہی آکر کھولے گی اسے

آنند ۔ (وہ بالکل گھبرا گیا ہے) میں ..... میں ....

مارواڑی ۔ ا۔بے شالے، میں میں کیا ہے؟ نیچے اُتر مار مار کر بھرکس نکال دینگے۔

ہندوستانی ۔ (فلسفیانہ انداز میں) آج کل کی بیکاری نے نوجوانوں کو چور اور ڈاکو بنا دیا ہے۔

پنجابی ۔ اوئے۔ اُتر اوئے۔ اوتھے ای کی ٹنگیا گیا ایں۔ ہوش تا ویکھو۔ جویں ناڈو خاں دا ساں ہوندا اے۔

(آگے بڑھ کر پروفیسر آنند کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہے۔ وہ دھم سے زمین پر آگرتے ہیں۔ وہ پنجابی نوجوان دو چار گھونسے اور تھپڑ ان کے رسید کر دیتا ہے)

آنند ۔ (غصے اور بےعزتی سے جل کر) میں پنڈت بھولا ناتھ کا دوست پروفیسر آنند ....

پنجابی ۔ چل چل پروفیسر دا بچہ۔ جا کے تھانے والیاں نوں دسیں کہ توں پروفیسر ہیں کہ ڈپٹی۔

(سب قہقہہ لگاتے ہیں)

بنواری لال ۔ میں بھی ان کا دوست ہُوں۔ لیکن ان کی غیر حاضری میں چوری تو نہیں کرتا پھرتا۔

مارواڑی ۔ آج کل جمانو ایسوئی چھے۔ بابو جی۔ کائی کریو جائے؟*

بنواری لال ۔ (گرج کر) کیا کیا جائے؟ میں ابھی پولیس کو ٹیلیفون کرتا ہُوں۔ آپ اسے پکڑ رکھیں (جاتے ہوئے) اور دیکھئے بیگ کو ہاتھ نہ لگائیے گا۔

(کئی اور لوگ داخل ہوتے ہیں اور "کیا ہوا" "کیا ہوا" کا شور مچ جاتا ہے)

مارواڑی ۔ (نو واردوں سے) یہ چور چوٹے دہاڑے چوری کر رہیو چھو شاب۔

ہندوستانی ۔ (طنز سے) جنٹلمین چور!

آنند ۔ میں کہتا ہُوں ....

پنجابی ۔ (ایک اور تھپڑ رسید کر کے) توں کی کہنا ایں، نالے چور، نالے چتر۔

(بھیڑ کو چیرتا ہُوا بھولا ناتھ آتا ہے)

بھولا ناتھ ۔ کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟

مارواڑی ۔ بچ گیا چھے شاپ۔ تھا کے چوری کر رہیو چھو

ہندوستانی ۔ سمجھئے بچ گئے۔ آپ کے دوست نے اسے عین موقعہ پر چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا۔

آنند ۔ (جس کا حوصلہ بھولا ناتھ کے آنے سے بڑھ گیا ہے) میں کہتا ہُوں..

مارواڑی ۔ (لپک کر) توں کائیں کہے چھے؟

ہندوستانی ۔ (ادا سے) یہ کہتا ہے ....

پنجابی ۔ ایہہ کہندا اے (چبا چبا کر) نالے چور، نالے چتر۔ ایہہ ہینڈ بیگ کتھے لے چلیا سُو ....

(سب ہنستے ہیں)

بھولا ناتھ ۔ (بڑھ کر پنجابی کی گرفت سے آنند کو چھڑاتا ہُوا) چھوڑیئے چھوڑیئے آپ سب جایئے۔ یہ میرے دوست ہیں۔ میں ان سے نبٹ لُونگا۔

ہندوستانی ۔ لیکن چور ....

بھولا ناتھ ۔ میں کہتا ہُوں۔ اُنہوں نے کوئی چوری نہیں کی آپ جایئے۔ میری بیوی آ رہی ہے۔ اور آپ سیڑھیاں روکے کھڑے ہیں۔

(سب بڑبڑاتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

پنجابی ۔ (رک کر) پر اوہ بابُو

بھولا ناتھ ۔ (چیخ کر) وہ بدمعاش گیا نہیں۔

(پنجابی جلدی جلدی چلا جاتا ہے)

آنند ۔ وہ تو پولیس میں رپورٹ لکھوانے گیا ہے۔

بھولا ناتھ ۔ آخر ہُوا کیا؟

---

* آجکل زمانہ ایسا ہی ہے بابو جی، کیا کیا جائے۔ سیٹھ صاحب چور دن دہاڑے چوری کر رہا تھا

آنند ۔ ہوتا کیا تھا سب اس کی بدمعاشی ہے۔

بھولا ناتھ ۔ آخر بات کیا ہوئی؟

آنند ۔ ہوتی کیا، تمہارے جانے کے بعد میں لیٹ گیا تو کچھ ہی دیر بعد وہ آیا۔ پہلے شاید تمہیں آوازیں دیں، پھر تالا دیکھ کر بڑبڑایا۔ پھر چارپائی گھسیٹ کر دالان میں ہمارے آگے لیٹ گیا۔ میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بھولا ناتھ ۔ تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ کہا جو تھا۔ چلو ہمارے ساتھ۔

آنند ۔ ساڑھے تین بجے مجھے پرنسپل صاحب سے ملنا تھا۔ آخر انتظار کر کر کے میں تیار ہوا لیکن جاؤں کدھر سے؟ دروازے کے شگاف سے میں نے دیکھا کہ سو رہا ہے تب تپائی پر کرسی رکھ کر میں روشندان تک چڑھا پھر دھوتی باندھ کر اترنے لگا تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بھولا ناتھ ۔ اور وہ تمہارا بھی استاد نکلا۔ میں نے کہا تھا نا کہ اوّل درجے کا بدمعاش ہے۔

آنند ۔ اس نے تو چور چور کا شور مچا دیا۔ اتنے آدمی اکٹھے کر لئے۔ اور اس پنجابی نے تو کئی تھپڑ مجھے رسید کر دیئے۔

(بنواری لال داخل ہوتا ہے)

بنواری لال ۔ (جیسے کچھ جانتا ہی نہیں) یہ عجیب دوست ہیں آپ کے۔ یہ تو سب کچھ اٹھا کر ہی لے چلے تھے۔

بھولا ناتھ ۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔ یہ تو اندر ہی تھے۔

بنواری لال ۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا۔ میں نے آوازیں دیں۔ یہ بولے تک نہیں۔

بھولا ناتھ ۔ سو رہے ہونگے۔

بنواری لال ۔ تو جب بیدار ہوئے۔ تب مجھے آواز دیتے۔ روشندان سے اترنے کی کیا ضرورت تھی۔

بھولا ناتھ ۔ اچھا چھوڑیئے اس قصے کو۔ کملا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں ابھی گاڑی سے اسے گورداسپور لے جاؤنگا چلو آنند تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اب پرنسپل صاحب سے کل مل لینا۔

بنواری لال ۔ آپ گورداسپور جا رہے ہیں۔ آپ کا سسرال تو فلاں شہر ہے۔

بھولا ناتھ ۔ (بے پروائی سے) وہاں کملا کے بڑے بھائی رہتے ہیں۔

بنواری لال ۔ بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بھولا ناتھ ۔ میونسپل کمیٹی میں ہیڈ کلرک ہیں۔

بنواری لال ۔ میونسپل کمیٹی میں (مسرت سے چٹکی سی تالی بجا کر) یہ آپ نے اچھی خبر سنائی۔ وہاں میونسپل کمیٹی میں مجھے کام ہے میں خود پریشان۔ سوچتا تھا۔ کہاں ٹھہرونگا۔ کیسے ہیڈ کلرک سے ملاقات کرونگا۔ وہاں میرا کوئی واقف نہیں۔ اب آپ ساتھ ہونگے تو سب کچھ بہ آسانی ہو جائے گا۔ ٹھہریئے میں بیگ اٹھا لوں۔

(بڑھ کر بیگ اٹھاتا ہے)

پردہ

اپیندر ناتھ اشک

نظمیں

انتظار

اک خاک کا ذرہ ہوں امید میں بیٹھا ہوں
رستے کے کنارے پر
جاتا ہے جو گلشن کو پھولوں کے نشیمن کو

محسوس یہ ہوتا ہے پابند ہے ہر اک شے
آئین تمنا کی، جو شمع ہے دنیا کی
اور چرخ کی ہر گردش کرتی ہے یہی کوشش
گل ذروں میں مل جائیں
جو ذرے ہیں کھل جائیں

دل اس لئے کہتا ہے (اور تاک میں رہتا ہے)
ممکن ہے کوئی جھونکا ہمدرد ہو جو میرا
لے کر مجھے اڑ جائے اُس باغ میں پہنچائے
میں بھی کبھی کھل جاؤں
اور پھولوں میں مل جاؤں

اک خاک کا ذرہ ہوں اس تاک میں بیٹھا ہوں
رستے کے کنارے پر
جاتا ہے جو گلشن کو پھولوں کے نشیمن کو

پہاڑی ندی

ستالے، ذرا تو دم لے ندی! دلکش ہیں پہاڑ کے نظارے
یہ منگجے، سنگلاخ ٹیلے یہ بھورے چٹان کے کنارے

بادل کے یہ جھلملاتے سائے کیوں تجھ کو نہیں پسند آتے!
غاروں کے یہ نیلگوں اندھیرے کیوں من کو ترے نہیں بھاتے؟

کیوں چھوڑ رہی ہو آہ ندی! یہ نور سحر کی مسکراہٹ؟
پھولوں کا یہ رقص بے تحاشہ یہ گھاس کی نرم سرسراہٹ؟

ستالے، ذرا تو دم لے ندی! کہسار کی دلکشا فضا میں،
ہے کتنی لطیف پاک شیریں آتی ہے جو سانس ان ہواؤں میں!

اُف، اُف ترا اشتیاق ظالم طوفان ترے دل میں کیا بپا ہے!
رگ رگ مری موج بن گئی ہے بیتاب مجھے بھی کر دیا ہے؛
میدان سے مجھے بھی کھینچتا ہے!

روشن دین تنویر

اہتمام بہار

سنتے ہیں اہتمام ہے! کیا اہتمام ہے؟ — کیوں؟ آج اذنِ عام ہے؟ کیا اہتمام ہے!
میخانہ خوش نظام ہے، میخوار شادکام — جلووں کا اژدہام ہے! کیا اہتمام ہے!
ساغر چھلک رہے ہیں بہ اندازِ چشم مست — ساقی کا فیض عام ہے! کیا اہتمام ہے!
ہر ذرہ ماہتاب بہ دامن ہے، دیکھنا! — ہر قطرہ شعلہ فام ہے! کیا اہتمام ہے!
مے اس قدر لطیف، ہوا اس قدر خنک — ابر اتنا خوش خرام ہے! کیا اہتمام ہے!
مستوں سے اجتناب نہ ساقی سے اجتناب — رندانہ رقص جام ہے! کیا اہتمام ہے!
ساغر چھلک رہے ہیں ستاروں کی بزم میں — ساقی مہِ تمام ہے! کیا اہتمام ہے!
مستوں میں میرا ذکر بھی ہے! اے خوشا نصیب! — رندوں میں میرا نام ہے! کیا اہتمام ہے!
رندی کی زد پہ کانپ رہا ہے نظامِ دہر — تقوے خیالِ خام ہے! کیا اہتمام ہے
دنیا بھی بے حقیقت و بے پایہ چیز ہے — عقبےٰ بھی نذرِ جام ہے! کیا اہتمام ہے!
ہر ذرہ آفتاب ہے، ہر پھول گلستاں، — ہر قطرہ آج جام ہے! کیا اہتمام ہے!
یہ رنگ و نور و حسن و شراب و نوا و رقص — یہ کونسا مقام ہے! کیا اہتمام ہے!
روئے منیر گیسوئے مشکیں کے سائے میں، — خورشید زیر دام ہے! کیا اہتمام ہے!

ساقی کے حسنِ دید سے فطرت کے دل کا داغ
رشکِ مہِ تمام ہے، کیا اہتمام ہے!

عبدالعزیز فطرت

سوانح نگاری

اُردو ادب میں سوانح عمریوں کی کمی

ہندوستان کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی حالات کا تقاضا تھا کہ اُردو نظم تو ترقی کر جائے لیکن نثر کی ترقی رُکی رہے یہی وجہ ہے کہ جس وقت اُردو میرؔ، سوداؔ اور غالبؔ جیسے مستند شاعر پیدا کر چکی تھی اُردو نثر میں انشاؔ کی رانی کیتکی کی کہانی سرورؔ کی فسانۂ عجائب اور فورٹ ولیم کالج کی ابتدائی نثری کوششوں کے سوا قابلِ ذکر اور کچھ نہ تھا۔ نثر کے دیر میں پیدا ہونے اور بڑھنے کے کیا اسباب ہیں، عین الدین گنج العلم کے رسائل میں کیا تھا اور وہ کیا ہوئے، گیسو دراز نے کون کون سی کتابیں لکھیں، صوفیائے کرام کے ملفوظات میں کتنے الفاظ اور جملے ایسے ملتے ہیں جنہیں اُردو کہا جا سکتا ہے، فیروز تغلق کے زمانے میں تعلیم کی بہت ترقی ہوئی تھی، مدرسوں میں ذریعۂ تعلیم کون سی زبان تھی، ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں جامع مسجد دہلی کے جن خطبات کا ذکر کرتا ہے اور جن کے لئے یہ بھی لکھتا ہے کہ ان کے سننے کے بعد کبھی کبھی لوگ اسلام بھی قبول کر لیتے تھے وہ کس زبان میں ہوتے تھے ــــ یہ اور اس قسم کے مباحث اس وقت پیش نظر نہیں ہیں بلکہ صرف یہ حقیقت کہ اُردو نثر کی ترقی میں اتنا عرصہ لگا کہ آج بھی ہم نثر نگاری میں اُس منزل پر نہیں پہنچے ہیں جہاں نظم میں ایک صدی پہلے پہنچ چکے تھے۔ یہ بات صرف تعداد اور مقدار کے لحاظ سے نہیں بلکہ معیار اور خصوصیت کے لحاظ سے بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب اُردو نثر کی ترقی ہی رُکی ہوئی تھی تو پھر سوانح عمریاں کیا لکھی جاتیں دکن کی ابتدائی شاعری میں ہم کو منظوم سوانح عمریاں ملتی ہیں۔ جو زیادہ تر دمباعوں میں لکھی گئیں اور جن میں نصرتی کے علی نامہ کو ایک اہم جگہ دی جا سکتی ہے لیکن نثر کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جسے ہم رعایتاً بھی سوانح عمری کہہ سکیں، ہاں ایسی نیم تاریخی کہانیاں، ایسے تاریخی واقعات جو کسی ایک شخص کو مرکز قرار دے کر لکھے جاتے ہیں اُنہیں بھی اگر ہم سوانح عمری میں شامل کر لیں تو البتہ چند ایسی کتابوں اور تذکروں کا پتہ چلتا ہے جن میں افراد کا ذکر ہے لیکن اس کے لئے پہلے ہمیں یہ دیکھ لینا چاہئے اور کسی قدر تفصیل سے دیکھنا چاہئے کہ سوانح عمری کا اطلاق کس پر ہو سکتا ہے۔ سیرت نگاری کسے کہتے ہیں ؟

یہ موضوع جس قدر دلچسپ ہے اُسی قدر سیماب صفت بھی ہے، افسانوں کے اصول بنائے گئے، ڈراما لکھنے کے قاعدے مقرر ہوئے، نظموں میں اصناف کے علیحدہ علیحدہ قاعدے مرتب کئے گئے، تاریخ کے لئے چند چیزوں کی موجودگی ضروری ہے ورنہ اُس کے بغیر تاریخ تاریخ نہ رہے گی، لیکن سوانح عمری کے لئے اب تک باقاعدہ کوئی ایسا اصول نہیں بنایا جا سکا جسے سامنے رکھ کر ہم سوانح عمریوں کی جانچ کریں، تنقید لکھتے وقت جن سے مدد لیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو سوانح عمری اچھی لکھی گئی ہے وہ اچھی سوانحعمری ہے، کیوں ایک بہت بڑے اور مشہور آدمی کی سوانح عمری ہمیں بعض اوقات بالکل متاثر نہیں کرتی اور کیوں ڈاکٹر عبدالحق کے قلم سے ایک معمولی سپاہی نور خاں کا تذکرہ پڑھ کر ہم اپنے گرد و پیش ایک نئی فضا پاتے ہیں؟ غالبؔ کی بہت سی سوانح عمریاں لکھی گئیں لیکن اب بھی ہم یادگار غالب میں کوئی ایسی چیز دیکھتے ہیں کہ اُس کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ نور خاں میں کیا ہے، یادگار غالبؔ میں کون سی خصوصیت ہے تو ہم باتیں تو بہت سی بتاتے جائیں گے۔ لیکن شاید لفظوں میں اُس چیز کو قید نہ کر سکیں گے جس نے ہمارے انتخاب میں مدد دی ہے۔

سوانح نگاری بہ ظاہر جتنی آسان چیز معلوم ہوتی ہے اُتنی ہی مشکل بھی ہے پھر جب اپنے بارے میں لکھنا ہو تو یہ کام اور آسان معلوم ہوتا ہے لیکن جب انسان اپنی زندگی کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہے کہ اُسے دنیا کے

سامنے پیش کرے، جب وہ اپنے جذبات اور تجربات کے تمام چھوٹے بڑے، رنگین اور سادہ نقوش کو سامنے سجا کر اس لئے بیٹھتا ہے کہ اس میں سے اُن چیزوں کا انتخاب کرلے جنہیں وہ سب کو دکھا دینا چاہتا ہے تو اُس کی دقتیں لامتناہی ہوتی ہیں۔ ارادہ اور عمل، اعمال اور "ناکردہ گناہ" واقعات اور محسوسات سب ایک دوسرے میں اس طرح گتھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اُن کا ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہم کسی شخص کو اُس کے بتلائے ہوئے اصول یا اُس کے اپنے لکھے ہوئے حالات سے اسی لئے جانچتے ہوئے گھبراتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی رائے جو اُس کے بارے میں ہے اُس سے مدد لے کر کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ہر شخص اپنا تجزیہ ضرور کر سکتا ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر شخص اپنے جاننے والے کی ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے پوری طرح واقف ہو اور قلم لے کر اُس کے بارے میں لکھنے بیٹھ جائے۔ فطرتِ انسانی سے زیادہ پیچیدہ کوئی مشین نہیں اور نئے دن ہمیں نفسیات کے نئے نئے تجربوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کی بنیاد پر انسانوں کے شعوری، نیم شعوری اور غیر شعوری احساسات کا جائزہ لیا جاتا ہے، نئی تشریحیں کی جاتی ہیں جو کچھ انسانوں پر تو پوری اُترتی ہیں، اور کچھ پر نہیں اُترتیں۔

کوئی لکھنے والا چاہے اپنی سوانح عمری لکھ رہا ہو یا کسی اور کی اُس کے لئے سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ وہ لکھتے وقت اپنے محسوسات، اپنے قلبی تعلقات اور اپنی رسائی کی وجہ سے اپنے ذاتی تجربات کو حقیقتوں سے ملا بھی سکتا ہے یا نہیں۔ بالکل بے جوڑ سی بات یاد آئی لیکن چونکہ اسی نفسیاتی کیفیت کی جانب اشارہ کرتی ہے اس لئے کہہ دینا چاہتا ہوں چکبست مرحوم کو پنڈت بشن نرائن در مرحوم سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس کا اظہار انہوں نے دو نظموں میں کیا ہے جو چیز اس سلسلہ میں قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ وہ چند ایسی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جسے دُنیا میں اُن کے سوا اور کوئی نہ جانتا تھا اور چکبست کا خیال ہے کہ جب تک اُن باتوں پر نظر نہ رکھی جائے گی "بشن نرائن" کی شخصیت کا صحیح راز نہ معلوم ہو سکے گا۔

سب یہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا ۔۔۔ جس سے دُنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

. . . .

دو نگینے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر ۔۔۔ ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر

ظاہری حُسنِ لیاقت کے یہ دیوانے ہیں ۔۔۔ شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

نقطۂ نظر کے یہ حدود ہمیں بعض اوقات اِس پر بھی مجبور کریں گے کہ ہم جس کی سوانح عمری پڑھ رہے ہیں اُس کے ساتھ اُس شخص کی سوانح عمری بھی پڑھیں جس نے وہ کتاب لکھی ہے۔ بات کسی قدر عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بعض حالات میں ہمیں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اُردو میں تو ابھی بہت کم سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں لیکن دنیا کی دوسری زبانوں میں اُن کی کمی نہیں۔ مثال کے طور پر ہم اگر نپولین ہی کو لے لیں تو بات کسی قدر واضح ہو جاتی ہے ایبٹ نے نپولین کی جو سوانح عمری لکھی ہے اگر اُس کو پیشِ نظر رکھ کر ہم مقدمہ (Rose) کی لکھی ہوئی اُسی شخص کی سوانح عمری پڑھیں، یا ایچ جی ویلس نے اپنے تاریخ عالم کے خاکے میں نپولین کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے اُسے دیکھیں تو ہمیں نقطۂ نظر کے فرق سے ایک ہی شخصیت کی ترجمانی میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے اُس کا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا۔ پھر آگے بڑھ کر فشر کی لکھی ہوئی نپولین کی سوانح عمری اور ایمل لڈوگ جرمن لکھنے والے کی کتاب نپولین کو دیکھیں تو ہمیں اور عجائبات سے دوچار ہونا پڑے گا انگریز وہ ہیں جن سے زیادہ نپولین کا کوئی دشمن نہ تھا۔ جرمن وہ ہیں جنہیں نپولین نے غلام بنا لیا تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی انگریز اور جرمن دونوں نپولین کا تذکرہ اس جذبہ سے بلند ہو کر کرتے ہیں۔ اس معمہ کو ہم اُس وقت تک پوری طرح نہ سمجھیں گے جب تک ہم کئی چیزوں کو ایک ساتھ نہ دیکھیں۔

غالباً ایڈمنڈ گاس نے کہا ہے کہ سوانح عمری لکھنے والے ایک بہت بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ زندگی اور زمانہ کو ملا دیتے ہیں، باوجود غور کے یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ایڈمنڈ گاس کا حقیقتاً مقصد کیا ہے کیونکہ افراد خلا کی پیداوار نہیں ہوتے اور جب اُن کے لئے سماجی نظامِ عمل سے متاثر ہونا ضروری ہے تو پھر دنیا کا کوئی لکھنے والا اس سماجی عمل یا ردِ عمل کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے۔ یہیں سے لکھنے والے کے نقطۂ نظر کی بنیاد کا مسئلہ بھی کسی قدر حل ہو جاتا ہے۔ سوانح نگار، ڈرامہ یا ناول لکھنے والے کی طرح کوئی تخلیقی چیز نہیں پیش کرتا بلکہ ایک دیئے ہوئے مواد کی ترتیب اپنے خیال کے مطابق کرتا ہے اور اُس کا اپنا خیال بہت سے نفسیاتی اور معاشرتی رجحانات سے بنتا ہے۔ غالب کی ایک سوانح عمری وہ ہے جو حالی نے لکھی اور دوسری وہ ہے جو ڈاکٹر عبداللطیف نے مرتب کی، غالب کا ایک تنقیدی جائزہ وہ ہے جو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کیا اور دوسرا وہ ہے جو غالب نامہ کے مصنف یا قتیل اور غالب کے مصنف

نے کیا۔ نقطۂ نظر کے فرق سے ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے اس لئے ہمیں ضرور لکھنے والے کے رجحانات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

کسی ایسے شخص کے بارے میں جسے ہم کسی قدر جانتے ہیں یا جس کے بارے میں ہم جاننا چاہتے ہیں خود اُسی شخص کے قلم سے یا اُس کے جاننے والے کے قلم سے اُس کے بارے میں کچھ دیکھنا عجیب دغریب کیفیت رکھتا ہے لیکن کبھی وہ تحریر اُس شخص کے بارے میں ہماری رائے کو مضبوط بنا دیتی ہے کبھی بالکل بدل دیتی ہے اور کبھی کچھ سمجھنے نہیں دیتی۔ بعض پہلو لکھنے والے کو اہم معلوم ہوتے تھے اُنہیں پر اُس نے سارا زور دیا اور پڑھنے والا ممکن ہے اس سے کچھ زیادہ جاننا چاہتا ہو۔ اس کی ایک علیحدہ مثال پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی ہے۔ اُن کی خود نوشت سوانح عمری ہندستان کی سیاسی کشمکش کا بیان بن کر رہ جاتی ہے جس میں جواہر لال کا ہاتھ بھی مضبوطی کے ساتھ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن اُن کی شخصیت کے اور عناصر تشنۂ اظہار رہ جاتے ہیں اور اُن کے بارے میں ہمیں تقریباً کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ ظاہر ہے کہ خام مواد کی ترتیب اور انتخاب کا حق لکھنے والے ہی کو ہوتا ہے اور وہ اپنے لکھنے کے مقصد سے شعوری یا غیر شعوری طور پر واقف بھی ہوتا ہے ایسی حالت میں ہم فرد اور زمانہ کو الگ کر کے کیسے دیکھ سکتے ہیں!

یہ بات یہیں سمجھ لینا اچھا ہے کہ اس مقالہ میں سوانح عمری کو خاص طور سے اُس کے ادبی تعلق کی وجہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس لئے اچھی اور بُری سوانح عمری میں ادبیت کے تصور کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا۔ بعض یوروپین نقادوں نے کہا ہے کہ سوانح عمری کبھی اچھا ادبی نمونہ پیش نہیں کرتی لیکن یہ بات کچھ زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ادب کے ہر شعبہ کے بارے میں یہی بات کسی قدر احتیاط کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ ہر ادب میں ناول، ڈرامے، افسانے، مقالات، نظمیں اور تنقیدی مضامین کثرت سے ایسے پائے جاتے ہیں جن میں ادبی شان کم و بیش مفقود ہوتی ہے۔ لیکن صرف اس بنا پر ہم انہیں ٹھکرا نہیں سکتے کہ کچھ سوئم درجہ کے فنکاروں نے ان اصنافِ سخن میں بُری چیزوں کا انبار لگا دیا۔ اچھی سوانح عمریاں جن میں ادبی شان بھی موجود ہے بڑی تعداد میں پائی جا سکتی ہیں۔

خیر یہ تو ایک درمیانی بات تھی ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ سوانح عمری لکھنے والے کے فراہمیٔ مواد اور انتخاب میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں اُن کی وجہ سے اُس کی ادبی اور علمی شان پر کتنا اثر پڑتا ہے دوسرے کی سوانح عمری لکھتے وقت اگر دقت ہی کو سامنے رکھئے تو آپ کو یہ اندازہ ہوگا کہ ہم عصروں کے بارے میں لکھتے ہوئے مواد کی فراہمی میں تو اتنی دقت نہیں ہوتی جتنی شخصیت کی صحیح پرکھ میں ہوتی ہے۔ لیکن مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب میں صحیح سوجھ بوجھ بھی ایسی آسان بات نہیں ہے۔ سیرت نگار اپنے خیال میں صداقت اور حقیقت سے کام لیتا ہے لیکن بڑی پرانی بحث کا دروازہ کھل جاتا ہے کہ انسانی زندگی میں صداقت اور حقیقت کہتے کسے ہیں۔ ایک ہی ذات کے دو سیرت نگار بڑا اختلاف رکھتے ہیں اور ظاہر ہے اُنہوں نے اپنی ہمدردی جہاں بین اور خلوص کے اظہار میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ حقیقت دونوں نے اپنے خیال میں پیش کی ہے۔ صداقت دونوں کے پیشِ نظر رہی ہے۔ پھر بھی اختلاف ہوتا ہے اور شدید اختلاف ہر شخص کی زندگی میں ایک مرکز ہوتا ہے، ایک شاہراہ ہوتی ہے اور باوجود شخصیت کے مختلف مظاہر کے وہ ایک ہی شخص رہتا ہے۔ سیرت نگار اُس عنصر کو تلاش کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ہیرو کا دِل ڈھونڈھنا چاہتا ہے۔ کسی کے دِل کا پانا زندگی میں دشوار ہے اور مرنے کے بعد تو اکثر اور دشوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کبھی کبھی سیرت نگار جھنجھلا کر اُس فرد کی تصویر اپنے آئینے میں دیکھنے لگتا ہے اور نتیجہ میں ہمیں اچھی کتاب مل جائے تو مل جائے لیکن اچھی سیرت یا سوانح عمری مشکل سے ملتی ہے۔

اس سے ملتی جلتی ایک بات یہ بھی ہے کہ سیرت نگار اکثر ایک ایسا کردار تلاش کرتا ہے جس کی زندگی کے کسی رُخ میں اُسے ایسے عناصر مل جائیں جو وہ مثال کے طور پر دُنیا کے سامنے پیش کر سکے اس لئے اُس کی نگاہ میں توازن کی کمی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ہیرو کو مثالی کردار بنانے کی دُھن میں کبھی کبھی بہک جاتا ہے۔ پھر لکھنے والے کے معیارِ اخلاق اور سماجی تصور کو بھی اُس میں شامل کر لیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے کوئی صحیح اور سچی سیرت نہیں پڑھی۔ عیوب پر پردہ ڈالنے کی کوشش، کمزوریوں کو چھپا جانے کی سعی میں فن کے ساتھ ساتھ حقیقت کا خون بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کون کہہ سکتا ہے کہ جو حقیقت چھپائی گئی ہے وہی دُنیا کے کچھ انسانوں کے لئے مثال نہ بن جاتی۔ اِسے کمزوری یا بداخلاقی کا نام دے کر پردہ میں رکھ دیا گیا وہی انسانی فطرت کے معمہ کو حل نہ کر دیتی، کوئی ایسا اچھوتا نفسیاتی تجربہ پیش کرتی جو ہمیں اُس فرد سے ہٹا کر بڑے مسائل کے سامنے لا کھڑا کرتا! اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ چاہے ہم کتنا ہی منہ بنائیں، کتنا ہی خفا ہوں لیکن وہ سوانح عمری جو کمزوریوں کا بھی تذکرہ کرتی ہے ہماری

صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کیونکہ ہم انسان کی سوانح عمری کو فرشتہ کی سوانح عمری نہیں سمجھنا چاہتے۔ ہمیں اس میں اپنی لغزشوں کا جواز ملتا ہے اور کون ہے جو اس طرح خود تسلی کی فکر میں نہیں ریاکار رہتا!

حقیقت نگاری ادب کے ہر شعبہ میں الگ الگ حیثیت رکھتی ہے اور صرف لفظ کے معنی متعین کر کے ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہاں حقیقت اور صداقت ہے یہاں نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ہمیں سماج کی بدلتی ہوئی قدروں کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے اور طبقات کی تقسیم میں جو جس جگہ ہے اور وہاں اخلاق اور زندگی کی حقیقت کا جو معیار ہے اُسے ذہن میں رکھ کر غور کرنا چاہئے۔ سارا دارومدار سیرت نگار کے صحیح نقطۂ نظر کی تلاش پر ہے۔ اس میں اُسے یہ کرنا پڑے گا کہ ایک اچھے مصور کی طرح واقعات کی ترتیب، زور اور اہمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے رنگ کی آمیزش اور اختلاف کو سامنے رکھنا ہوگا تاکہ وہ عقبی منظر جو شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کر سکتا ہے۔ بیان کی نزاکت اور ترتیب سے پیدا ہو جائے۔ سوانح عمری لکھنے کا آسان طریقہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ زندگی کے نمایاں واقعات تاریخی ترتیب سے ادبی رنگ میں پیش کر دیئے جائیں۔ بس سوانح نگاری کا حق ادا ہو گیا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کبھی کبھی فطرت انسانی کے ہلکے ہلکے تاثرات جنہوں نے زمانہ پر بظاہر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا، شخصیت اور کردار کے فکر و عمل کی بہت سی تہیں کھول دیتے ہیں۔ ایسے واقعات کا نظرانداز کر دینا، سیرت کی بہت سی دلکشی کے کم کر دینے کے برابر ہوگا۔ نمایاں واقعات ہی اگر لئے جائیں تو اُن میں بھی تعلق تلاش کرنے کی ضرورت ہوگی ورنہ وہ ہم آہنگی جو اثر پیدا کر سکتی ہے مفقود ہو جائے گی۔ بڑے بڑے واقعات کے بعد درمیان میں جو خلا پڑے گا۔ وہ ایسا ہوگا جیسے کسی پہاڑ کی تصویر کہرے میں لی گئی ہو کہ اُس پہاڑ کی اونچی اونچی چوٹیاں تو دکھائی دیتی ہوں لیکن پورے پہاڑ کی عظمت کا احساس نہ ہو سکے۔ پھر ہر موقعہ پر چھوٹے چھوٹے واقعات کا چھوڑ دینا مفید بھی نہیں ہو سکتا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک واقعہ، ایک معمولی اشارہ، ایک جملہ ایک شخص کی خصوصیت کو زندہ کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ اور بڑے بڑے واقعات، احول اور زمانہ کے بڑے بڑے مسائل میں کھو جاتے ہیں

اچھی سوانح عمری ایک فرد کو مرکز بنا کر بھی ہمیں زندگی کے ایک بڑے خاکہ سے روشناس کر سکتی ہے۔ کیونکہ واقعات کے تعلق اور اُن کی وضاحت سے مکڑی کے جالے کی طرح مرکزی حقیقت کی باگ ڈور دُور دُور کی حقیقتوں سے ملائی جا سکتی ہے۔ توازن اور تناسب ہر آرٹ کے لئے لازمی ہے۔

پھر اگر سوانح نگار نے اس کا خیال نہ رکھا تو سیرت میں کوئی کمی یا کوئی زیادتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لکھنے والا بعض اوقات ہیرو پرستی کے جذبات کا شکار ہوتا ہے اس لئے توازن اور تناسب میں فرق آ جاتا ہے لیکن پڑھنے والوں کو اتنا تو ذہن میں رکھنا ہی چاہئے کہ کوئی بھی لکھے وہ اُس ذہنی، جذباتی، سماجی یا روحانی تعلق کو یکسر فنا نہیں کر سکتا جو صاحب سیرت اور سیرت نگار کے درمیان قائم ہے۔ مولانا حالی کی حیات جاوید پر علامہ شبلی جیسے سنجیدہ صاحب نظر نے "مدلل مداحی" اور "کتاب المناقب" ہونے کا الزام لگایا ہے لیکن خود اُن کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں اس جذبہ کا پتہ دیتی ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ ایک جگہ مذہبی تعلق نے جذبات پیدا کئے ہیں دوسری جگہ معاشرتی تعلقات نے۔

سوانح عمری یا سیرت کیا ہے اس کا ایک دھندلا سا خاکہ اوپر کی سطروں سے مل سکتا ہے۔ ایک اچھی سوانح عمری میں کن باتوں کی ضرورت ہے اُس کا پتہ بھی کسی قدر چل جاتا ہے اب چند سطروں میں انہیں خیالات کی روشنی میں اُردو زبان کی کچھ کتابوں کا نام لے لینا چاہئے۔ اُردو زبان و ادب پر مذہب کا اتنا گہرا اثر رہا کہ اب تک چلا جا رہا ہے اور جتنی سوانح عمریاں آج بھی مذہبی پیشواؤں کی لکھی جا رہی ہیں اُتنی دوسرے قسم کے لوگوں کی نہیں۔ شروع میں منظوم سوانح عمریاں بھی ہوتی تھیں اور ترجمے بھی کر لئے جاتے تھے یہ بالکل صحیح نہیں بتایا جا سکتا کہ سب سے پہلی کتاب جسے سوانح عمری کہہ سکیں کب اور کہاں لکھی گئی۔ مجموعۂ قصص کے نام سے کتب خانہ انڈیا آفس میں ایک کتاب ہے جس میں نیم تاریخی اور تاریخی واقعات افراد کو مرکز بنا کر لکھے گئے ہیں لیکن جیسا کہ خود اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے لکھنے والے کے پیش نظر "قصہ پن" تھا سیرت نگاری وغیرہ نہ تھی اگر فضلی کی دہ مجلس کو امام حسین کی سوانح عمری مان لیں تو پھر ایک کتاب ۱۷۳۲ء کے قریب بھی ہمیں مل جاتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ روضۃ الشہدا میں جس کا یہ ترجمہ ہے امام حسین کی سیرت سے زیادہ واقعات کربلا کو مجموعی حیثیت سے پیش نظر رکھا گیا ہے۔ پھر حیدر بخش حیدری نے ۱۸۱۲ء میں اس کتاب کا خلاصہ گل مغفرت کے نام سے شائع کیا۔

اس درمیان میں تذکرے کئی لکھے گئے تھے لیکن اُن میں سیرت نگاری کی خوبیاں مفقود تھیں۔ ہاں ۱۸۱۹ء میں محمد خلیل اللہ اشک نے اکبر نامہ کا ترجمہ واقعات اکبر کے نام سے البتہ کیا اگرچہ اس کی اہمیت تاریخی زیادہ ہے۔ جن کتابوں کا اوپر ذکر ہوا نہ انہیں سوانح عمری کہا جا سکتا ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں کے بطن سے سوانح عمری پیدا ہوئی ہوگی۔ دہلی سوسائٹی کے

قائم ہونے کے بعد ترجموں کی رفتار ترقی کر گئی اور اس زمانہ میں تزک تیموری اور اور سوانح عمری علی حزیں کے ترجمے شائع ہوئے۔

سدا سکھ لال نے تذکرۃ المشائخ تیار کیا۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے علی حزیں کی سوانح عمری کے ساتھ پہلی دفعہ شعوری طور پر یہ لفظ استعمال کیا گیا۔

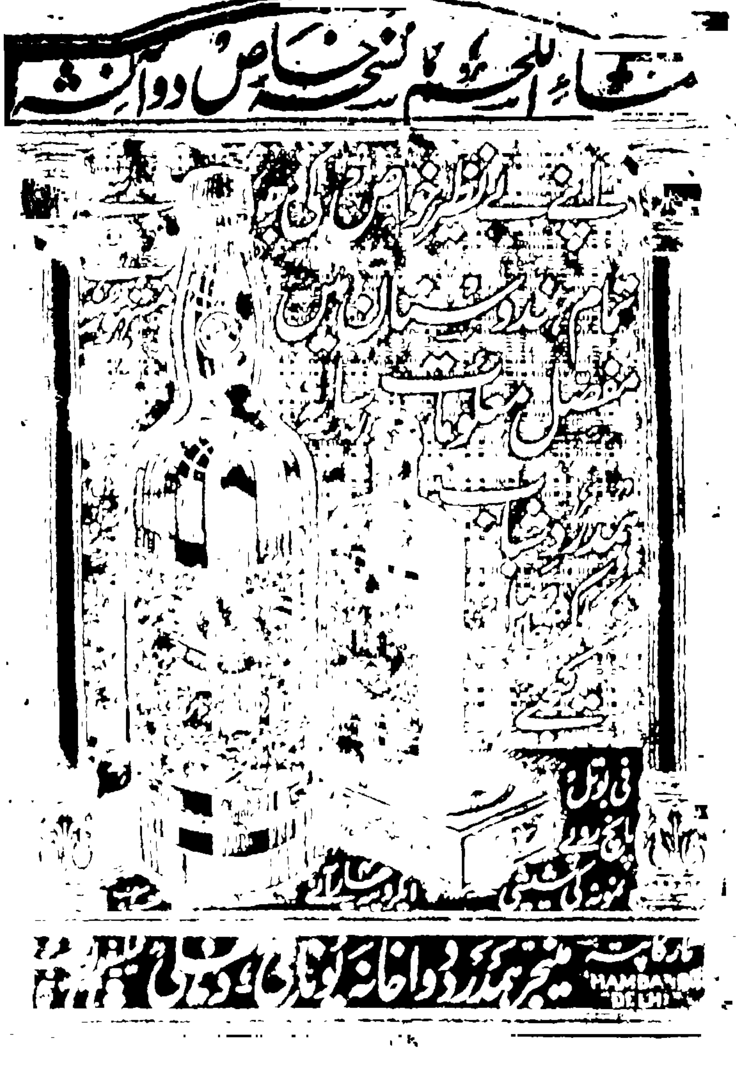
اس کے بعد اردو نثر نگاری کا وہ دور آجاتا ہے جو کئی حیثیتوں سے آج کی نثر نگاری پر بھی بھاری ہے۔ مولانا ذکاء اللہ نے مولوی سمیع اللہ کی کی سوانح عمری لکھی، حالی نے حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی کے ذریعہ سوانح نگاری اور سیرت نگاری کے صحیح تصور سے لوگوں کو آشنا کیا اور پہلی دفعہ ان کتابوں کے دیباچہ میں اس فن پر روشنی ڈالی۔ آج سوانح عمری لکھنے میں ہندوستان کے باہر بڑی ترقی ہو چکی ہے لیکن اردو میں ابھی تک مولانا حالی ہی کا معیار معلوم ہوتا ہے اور اس وقت جو چند کتابیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ بعض ایسے نقائص رکھتی ہیں کہ انہیں معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا شبلی کی مذہبی سوانح عمریاں بہت مشہور ہیں، انہیں کے اثر سے نہ جانے کتنی اور سیرتیں لکھی گئیں جن میں سے صرف چند قابل ذکر ہیں۔ اولاد حیدر فوق بلگرامی نے آئمہ معصومین کی سوانح عمریاں لکھیں اور پھر بعد میں مولانا شبلی کی سیرۃ النبی سے اختلاف کرتے ہوئے اسوۃ الرسول کے نام سے رسولِ اسلام کی سیرت پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی۔ ادھر شعراء، مشاہیر اور دوسرے لوگوں کی سوانح عمریاں لکھی جانے لگی ہیں لیکن ابھی ان میں وہ تناسب، وہ اعتدال، وہ نفسیاتی تحلیل اور وہ ادبی لوچ نہیں پیدا ہو سکا ہے جو سیرت کو ادب کا جزو بنا سکے۔ جب تک تاریخ، سیرت، افسانہ اور تذکرہ کا فرق اچھی طرح نہ سمجھا جائے گا اس وقت تک اچھی سوانح عمری کا لکھا جانا مشکل ہے۔

احتشام حسین

شعر

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو میں

حفیظ جالندھری



ندی کنارے

شفاف ندی چھلک رہی ہے — مستوں کی طرح بہک رہی ہے
ہو کر سرشار جھومتی ہے — ساحل کے لبوں کو چومتی ہے
امواج کے دل ربا ترنم — ماحول کا دل نشیں تبسم
ساحل کے شجر کا عکس رقصاں — نظروں کے لئے نشاط ساماں
قازوں کے پرے اتر رہے ہیں — موجوں پہ گہر بکھر رہے ہیں
یہ کشتیِ مرمریں کے بیڑے — کھا کر امواج کے تھپیڑے
موجوں پر ڈگمگا رہے ہیں — پیراکی کا حظ اٹھا رہے ہیں
موجوں پہ ہوائیں دوڑتی ہیں — قازوں کی صدائیں دوڑتی ہیں
قازوں کا طوق گوہریں ہے — ندی کا گلوئے مرمریں ہے
مرغابیاں پھڑپھڑا رہی ہیں — موجوں پہ گہر لٹا رہی ہیں
کچھ غول سے ہٹ کے جا رہی ہیں — کچھ غول کے پاس آ رہی ہیں
ان کے خطِ رہگذر کے حلقے — ہیں گیسوئے سیم بر کے حلقے
یا کوئی حسین جل پری ہے — زلفیں بکھرائے تیرتی ہے
اک غول اڑا فضا میں چھایا — سارا ماحول سنسنایا
بجنے لگا ارغنوں ہوا میں — چھانے لگا کیف سا فضا میں
ہلکا سا اک ابر آگیا ہے — سایہ سا ندی پہ چھا گیا ہے
لہراتی ہیں چھیڑ سے ہوا کی — زلفیں معشوقۂ فضا کی
اس عالمِ کیف و خوش فضا میں — اس منظرِ حسنِ دل کشا میں

پھولوں کی حیات جی رہا ہوں
ساغر میں بہار پی رہا ہوں

مرزا عباس بیگ محشر

نفسیات

ہاں تیری طرح
تیری ہی طرح
اُلفت بھی تو ہے مغرور!
چھین لئے گر تُو نے اِس سے،
اِس کی رُوح کے شیریں نغمے،
توڑ دیئے گر تُو نے اِس کے،
خوابوں کے رنگین کھلونے،
دیوانہ پن سارا اپنا،
مستانہ پن سارا اپنا،
اپنے دل کے غم کی دولت!
اپنی جنّت، اپنی نکہت!

اک دم تجھ سے لوٹا لے گی،
جانا بھی کچھ،
پھر کیا ہوگا!
ایک مسلسل فرقت ہوگی
تجھ سے میری میرے دل کی
ایک خلا سی حائل ہوگی
سازِ اُلفت ہوگا چُور
تیری طرح
تیری ہی طرح
اُلفت بھی تو ہے مغرُور!

عظیمؔ قریشی

میں ہوں اپنی شکست کی آواز

روآن کے شہر میں متواتر کئی دن سے شکست خوردہ فوج کے پیچھے پیچھے سپاہیوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ضبط و علم کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ سپاہیوں کی داڑھیاں غلیظ اور بڑھی ہوئی تھیں۔ وردیاں پھٹ کر چیتھڑے ہو رہی تھیں۔ کسی کے حواس بجا نہ تھے۔ محض عادت کے تقاضے سے گرتے سنبھلتے جا رہے تھے۔ ان میں سے اکثر نازوں کے پلے شہری تھے جنہیں جبری بھرتی کے قانون نے میدانِ جنگ میں دھکیل دیا تھا۔ یہ بیچارے اپنی رائفلوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ کس جوش و خروش سے گھروں سے نکلے تھے اور کس بے سروسامانی سے پسپا ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ کہیں کہیں باقاعدہ فوج کا اکا دکا سپاہی بھی اپنی سرخ وردی سے پہچانا جاتا تھا۔ پانچ سات توپچی بھی تھے مگر توپیں ندارد اور رسالہ کے سپاہی بھی تھے لیکن پیدل، وزنی جوتے پہنے بڑی مشکل سے پیادہ فوج کے ساتھ قدم بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ان کے پیچھے رضا کار تھے جو شکل و صورت سے اوباش معلوم ہوتے تھے لیکن نام اور القاب سکندر اور نپولین کو شرماتے تھے: "جیشِ انتقام"، "شہیدی جتھا"، "جاں نثار" سب باری باری گذرے۔ ان کے افسر جو زرق برق وردیاں پہنے تھے، اصل میں بنئے، بزاز اور بساطی تھے لیکن ردیبہ یا لچھے دار مونچھوں کے رعب سے افسر منتخب ہو گئے تھے۔ یہ شیر قالین یوں تو فوجی نقل و حرکت کے معاملات پر اس جسارت سے بحث کر رہے تھے گویا نیم جان فرانس انہی کے سہارے جی رہا ہے لیکن جی میں اپنے غنڈے ہمراہیوں سے بھی ڈر رہے تھے۔ جو اپنے ہی اہلِ وطن کی دولت اور عصمت پر ڈاکہ ڈالنے سے باز نہ آتے تھے۔

شہر میں یہ افواہ گشت لگا رہی تھی کہ جرمن روآن میں داخل ہوا ہی چاہتے ہیں۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی سب سے پہلے "قومی فوج" بھاگی جو پچھلے دو مہینوں سے دشمن کی تلاش میں جنگل جنگل چھان چکی تھی، اگر کسی خرگوش کے چلنے سے پتہ بھی کھڑکتا تھا تو اس کے سپاہی تیار و ہوشیار ہو کر ہتھیار سنبھال لیتے تھے لیکن اب وہ گوشۂ عافیت میں جا چھپے اور ان کے اسلحہ، وردیاں۔

وہ تمام بہروپ کا سامان جس سے انہوں نے گو سواں تک لوگوں کو دہشت زدہ کر رکھا تھا گویا جادو کے عمل سے غائب ہو گئے۔

فرانسیسی فوج پسپا ہوتی دریائے سین کو عبور کر گئی۔ سب سے پیچھے فوج کا جرنیل دو افسروں کے ساتھ سر جھکائے جا رہا تھا۔ اس کا دل نہ صرف اپنی ناکامی کے غم سے لبریز تھا۔ بلکہ اپنے وطن کی مصیبت پر خون ہو رہا تھا۔ فرانس کا فوجی وقار، اسکی شاندار عسکری روایات سب خاک میں مل چکی تھیں۔

اب شہر پر لرزہ کی حالت طاری ہو گئی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ شہر کے موٹے سوداگر جنہیں تجارت نے نامرد بنا دیا تھا حملہ آور کے ڈر کے مارے کونوں میں دبکے جاتے تھے۔ ان کا خون اس خوف سے خشک ہو رہا تھا کہ مبادا فاتح کو ان کے چاقو چھری پر اسلحہ کا شبہ ہو۔ تمام کاروبار بند تھا بازار سنسان تھے۔ کہیں کہیں کوئی اکا دکا راہ گیر دیوار کے سائے میں سہما ہوا جا رہا تھا۔ اضطراب کی یہ کیفیت تھی کہ غنیم کی آمد ان انتظار کی گھڑیوں کے مقابلے میں راحت معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے دن سہ پہر کے وقت جرمن سواروں کا ایک دستہ برق کی سرعت سے شہر میں داخل ہوا۔ پھر جرمن فوج سیلاب کی طرح چاروں طرف سے شہر میں امڈ آئی اور سب دستے سرکاری دفتروں کے سامنے مربع میدان میں آملے۔ مرکز کی طرف جانے والی سب سڑکیں قدم ملا کر چلنے والے سپاہیوں سے رک گئیں۔

جرمن افسر اپنی غیر مانوس زبان میں احکام نافذ کر رہے تھے ان کی کرخت آوازیں سنسان مکانوں سے ٹکرا کر ایک دہشت انگیز کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ مکانوں میں موت کی خاموشی چھائی تھی اگرچہ مکین بند کھڑکیوں کی درزوں سے دزدیدہ نگاہوں سے اپنے فاتحین کو دیکھ رہے تھے۔ جو قانونِ جنگ کی رو سے نہ صرف شہر کے مالک تھے بلکہ شہر والوں کی جان و مال کے مختار بھی تھے مفتوحین کے لئے صبر و رضا کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ مصیبت سماوی حادثات کی طرح تھی جن کے سامنے انسان کی طاقت اور عقل کی

کوئی پیش نہیں جاتی۔ جس طرح ایک زلزلہ امیر و غریب معصوم و گنہگار سب کے مکانوں کو برباد کر دیتا ہے اور بچوں بوڑھوں زن و مرد کو انہیں کے مکانوں کے تلے دفن کر دیتا ہے۔ یا ایک دریا اپنے کناروں کو توڑتا ہوا کسانوں کے جھونپڑوں، قصبوں اور مواشی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ اسی طرح ایک فتحمند فوج جس کا قانون تلوار کا قانون اور جس کا مذہب توپ کا مذہب ہے مقابلہ کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتارتی اور بقیۃ السیف کو غلام بناتی لوٹ مار کرتی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ واقعات ہیں جو انسان کے اس عقیدہ کو متزلزل کر دیتے ہیں کہ ہمیشہ انصاف کی فتح ہوتی ہے اور بیگناہ ہمیشہ رحمت ایزدی کے طفیل محفوظ و مامون رہتے ہیں۔

سپاہیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے مکانوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہو گئے۔ فتح کے بعد مفتوح ملک پر اسی طرح قبضہ کیا جاتا ہے اور اس حالت میں مفتوح کا فرض ہوتا ہے کہ ہر طرح فاتح کے آرام کا خیال رکھے اور اس کی خوشنودی میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔

جب عوام کے دلوں سے دہشت کا اثر جاتا رہا تو امن کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جرمن افسر اور فرانسیسی میزبان میں دوستانہ مراسم قائم ہونے لگے۔ جرمن افسر ازراہِ اخلاق فرانس والوں سے ہمدردی اور جنگ سے نفرت کا اظہار کرنے لگا اور فرانسیسی میزبان بھی مصلحت کو مدِنظر رکھ کر اس کی خوشامد کرنے لگا۔ یہ طریق کار دو صورتوں میں مفید تھا۔ ایک یہ کہ اگر جرمن افسر خوش ہوا تو وہ میزبان پر تھوڑے آدمیوں کا خرچ ڈالے گا۔ دوسرے اس کو خفا کرنے سے کچھ فائدہ بھی نہ تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ فرانسیسیوں کی زندگی اور موت کے احکام صادر کر سکتا ہے۔ اس سے جھگڑا مول لینا نہ صرف جرأت بلکہ حماقت کا فعل ہوتا اور اس قسم کی جرأت روآن کے لوگوں کے اوصاف میں نہ تھی۔ فرانسیسی اخلاق اور مہمان نوازی کا بہانہ رکھ کر انہوں نے جرمن افسروں کی خوب خاطر مدارت کی۔ اگرچہ وہ سرعام جرمنوں سے غیریت کا اظہار کرتے تھے۔ مگر اپنے گھروں میں ان کی اس طرح تواضع کرتے تھے کہ جرمن ان کے گھروں کو اپنا گھر سمجھنے لگے۔ اور پہروں ان کی انگیٹھی کے پاس بیٹھے دل کو گرمانے لگے۔

آہستہ آہستہ شہر کی اصلی رونق لوٹ آئی۔ اگرچہ ابھی فرانسیسی گھروں سے کم نکلتے تھے۔ لیکن بازاروں میں جرمن سپاہیوں سے کافی چہل پہل رہتی تھی۔ فرانسیسی اور جرمن کا اختلاف بھی رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔ کیونکہ جرمن افسروں کا سلوک پچھلے سال کے فرانسیسی افسروں سے برا نہ تھا بلکہ فرانسیسی افسر ہوٹلوں میں شراب اور طعام کے معاملات میں جرمن افسروں سے زیادہ دست درازی کا ثبوت دے چکے تھے۔ البتہ کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ زندگی بے مزہ ہے۔ کھانے پینے کا لطف نہیں۔ فضا مکدر ہے اور وطن میں رہ کر جلاوطنی کا گمان ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی کسی غیر ملک میں وحشیوں کا قیدی ہو۔

جرمن روپیہ کا تقاضا کرتے تھے اور فرانسیسی بے چون و چرا دیئے جاتے تھے اور روپیہ کی ان کے پاس کمی بھی نہ تھی لیکن روآن والوں کا خاصہ ہے کہ جتنے امیر ہوتے ہیں اتنا ہی انہیں روپیہ دینا گراں گزرتا ہے۔ بعض ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آئے کہ ماہی گیر دریا سے مچھلیاں پکڑنے گئے اور جال میں مچھلی کی بجائے جرمن سپاہی کی لاش نکلی۔ دریا کی کیچڑ نے انتقام کے ایسے کئی واقعات پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ بہادری کے ایسے کارنامے جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اور ان سے شہرت اور انعام کی بھی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن کوئی محب وطن جوش میں آ کر ایسے کام کر ہی گزرتا ہے۔ اور جان پر کھیل جاتا ہے۔

حملہ آوروں سے جن مظالم کی توقع تھی محض ایک ہیبت ناک خواب ثابت ہوئے۔ وہ سخت گیر ضرور تھے لیکن میدان جنگ سے باہر درندے نہ تھے۔ جب عوام پر یہ حقیقت افشا ہوئی تو ان کے دلوں سے خوف جاتا رہا۔ حوصلے بڑھ گئے اور حب وطن پر تجارتی مفاد غالب آنے لگے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کا کاروبار ہاور میں بھی تھا جس پر ابھی فرانسیسی قبضہ تھا۔ اس لئے وہ اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو خشکی کے راستے ڈیپ کی بندرگاہ تک جائیں اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر ہاور جا پہنچیں۔ مقامی جرمن افسروں کی وساطت سے جرنیل کا پروانہ حاصل کرنا مشکل کام نہ تھا۔

اس سفر کے لئے چار گھوڑوں کی ایک گاڑی کرایہ پر لی گئی۔ دس اشخاص نے اپنا اپنا کرایہ پیشگی ادا کر کے جگہ روک لی اور طے ہوا کہ منگل کو پو پھٹنے سے پہلے ہی گاڑی چل دے تاکہ لوگوں میں بات زیادہ نہ پھیلے۔ چند دنوں سے کہر بہت پڑ رہی تھی۔ پیر کی شام کو کالے کالے بادل گھر آئے اور تمام رات برف پڑتی رہی۔ ساڑھے چار بجے کے قریب جب ہر طرف اندھیر چھایا تھا مسافر سرائے نارمنڈی میں جمع ہوئے جہاں سے گاڑی کو روانہ ہونا تھا۔ سب نیند کے غلبہ سے اونگھ رہے تھے اور سردی کے مارے چغوں میں سمٹے جاتے تھے۔ دو مسافروں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور بات چیت ہونے لگی۔ ان کی آواز کو پہچان کر ایک اور مسافر گفتگو میں شریک ہو گیا۔

ایک نے کہا:- میری بیوی بھی میرے ساتھ جا رہی ہے۔

دوسرا بولا:- میں بھی اپنی بیوی کو ساتھ لایا ہوں۔

تیسرے نے کہا:- میری بیوی بھی ہمراہ ہے۔

پہلے نے کہا:- میرا رودآں واپس آنے کا ارادہ نہیں اگر جرمن بادر تک بڑھتے چلے گئے تو میں انگلستان چلا جاؤں گا۔ دوسرے بھی اس کے ہم نوا ہو گئے سب کا ایک ہی ارادہ تھا۔

گھوڑے ابھی کہیں نظر نہ آتے تھے۔ نفن والا لالٹین ہاتھ میں لئے کبھی ایک پراسرار دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے سے غائب ہو جاتا تھا۔ گھوڑے کے سم کی آواز اصطبل کی لید میں دب کر نکلتی تھی۔ اصطبل کے پرلے سرے سے گاہے گاہے کوچبان کی آواز آتی تھی جو کبھی گھوڑوں کو چمکارتا اور کبھی گالیاں دیتا تھا۔ گھنگھرو دوں کی جھنکار سے معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑوں پر ساز ڈالا جا رہا ہے۔ تھوڑے سے وقفہ کے بعد یہ آواز گھوڑوں کے چلنے کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی گئی۔ اس کے بعد اصطبل کا دروازہ بند ہوا۔ اور چند لمحوں کے لئے کامل خاموشی چھا گئی۔ کانپتے۔ ٹھٹھرتے مسافر سلسلۂ گفتگو کو قطع کر کے ہمہ تن توجہ ہو گئے۔ برف کی ایک سفید چادر زمین پر گر رہی تھی جاندار اور جمادات سب نے یہ براق چادر اوڑھ لی۔ شہر جاڑے کی تاریکی میں سنسان پڑا تھا۔ صرف برف کے گالوں کی زمین سے سرگوشیاں سنائی دیتی تھیں۔ بلند و پست سب نے برف کا لباس پہن لیا تھا۔

لالٹین والا ایک اڑیل مریل قسم کے گھوڑے کو گھسیٹتا نکلا۔ گھوڑے کو نتھ میں جوتتے وقت بہت دیر لگی کیونکہ کوچبان کا صرف ایک ہاتھ کھلا تھا۔ دوسرے میں لالٹین تھی۔ جب دوسرے گھوڑے کو لینے چلا تو برف میں ٹھٹھرتے مسافروں پر نظر پڑی اور ان سے کہا آپ گاڑی میں چل بیٹھیے۔ کم از کم برف سے تو آرام رہے گا۔ مسافروں کو یہ بات نہ سوجھی تھی۔ سب کے سب ایک جست کر کے گاڑی کے پاس جا پہنچے۔ بیویوں والوں نے پہلے انہیں آرام دہ جگہ پر بٹھایا اور پھر آپ بھی بیٹھ گئے۔ دوسروں کو جہاں جہاں جگہ ملی خاموشی سے بیٹھ گئے۔

گاڑی میں سوکھی گھاس بچھی تھی لیکن خواتین ، جو اپنے ساتھ کانگڑیاں لائی تھیں انہیں سلگا کر پاؤں گرم کرنے لگیں۔ اور بہت دیر تک کانگڑیوں کی تعریف کرتی رہیں اور ان کے فوائد اس طرح بیان کرتی رہیں گویا کہ یہ کوئی اہم ترین انکشاف ہے۔

آخر گاڑی تیار ہو گئی۔ چار گھوڑوں کی جگہ چھ گھوڑے جوتے گئے کچھ سڑکوں کی بری حالت کو دیکھتے ہوئے اور کچھ گھوڑوں کی حالت کو دیکھتے ہوئے۔ پھر باہر سے کسی نے کہا "سب بیٹھ گئے؟" اندر سے آواز آئی "ہاں"! اور گاڑی چل دی۔

گاڑی رینگتی چلی۔ پہیے برف میں دھنسے جاتے تھے اور گاڑی کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی ہی دور جا کر گھوڑے پسینے میں شرابور ہو کر ہانپنے لگے تو کوچبان کا چابک ہوا میں لہرایا۔ کبھی آگے اور کبھی پیچھے کے گھوڑوں پر چابک برسا اور گاڑی کی رفتار میں کسی قدر تیزی آ گئی۔

صبح ہونے لگی۔ برف باری بند ہو گئی۔ گہرے بادلوں میں سے زرد زرد روشنی جھلکنے لگی۔ بادلوں کی سیاہی برف سے ڈھکے ہوئے درختوں اور مکانوں کے مقابلے میں عجب منظر پیدا کر رہی تھی۔ گاڑی کے اندر مسافر دھندلی روشنی میں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔

سب سے آرام دہ جگہ پر موسیو اور مادام لوئیسیو قابض تھے۔ موسیو لوئیسیو رودآں کی مشہور شراب کی دوکان کا مالک تھا۔ اس کی ابتدا ایک کلرک کی حیثیت سے ہوئی لیکن جب مالک دیوالیہ ہو گیا تو موسیو لوئیسیو نے تمام کاروبار سنبھال لیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت مالدار ہو گیا۔ اس کی شہرت اس امر پر مبنی تھی اور اس کی تجارت کا راز یہ تھا کہ وہ بہت گھٹیا قسم کا ٹھرا گھٹیا قسم کے دوکانداروں کے ہاتھ بہت ارزاں نرخ پر فروخت کیا کرتا تھا۔ لوئیسیو کے دوست اس کی عیاریوں اور ستم ظریفیوں سے اچھی طرح واقف تھے وہ کسی حرکت سے باز نہ آتا تھا۔ اسی وجہ سے محفلوں میں بھی اس کی ابلہ فریبیوں کے چرچے تھے لوئیسیو خود بذلہ سنجی اور مذاق میں کسی سے کم نہ تھا۔ اگرچہ اس کے مذاق کو مذاقِ سلیم سے وہی نسبت تھی جو اس کے ٹھرے کو شراب سے۔ بایں ہمہ اسے ہر مجلس کی روح رواں اور جانِ ظرافت سمجھا جاتا تھا۔ موسیو لوئیسیو کی ہیئت ہی سے مسخرہ پن ٹپکتا تھا۔ اس کا پست قد نمایاں توند اور سرخ چہرہ جس پر کھچڑی کی طرح مونچھیں عجب بہار دکھا رہی تھیں اس کی گوناگوں صفات کا مکمل اشتہار تھا۔ مادام لوئیسیو اس کے مقابلہ میں بلند قامت، بارعب، بلند آواز اور سنجیدہ تھی۔ ہنسوڑ میاں اور سنجیدہ بیوی کا جوڑا کاروبار کے لئے بہت موزوں ثابت ہوا تھا۔

موسیو لوئیسیو کے ساتھ جو صاحب تن کر بیٹھے تھے وہ روئی کے مشہور سوداگر موسیو کا ہے لا ما دون تھے جو نہ صرف روئی کے تین کارخانوں کے مالک تھے بلکہ خطاب یافتہ اور کونسل کے رکن بھی تھے۔ سیاسیات میں وہ کسی تحریک کی صرف اس لئے مخالفت کرتے تھے تاکہ اپنا ووٹ مخالف کے ہاتھ زیادہ سے زیادہ قیمت پر بیچ سکیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ میری

مخالفت عناد پر مبنی نہیں ہوتی اس لئے مجھے اپنے مخالفین سے راہ و رسم رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ مادام کالسے لامادون جو عمر میں اپنے شوہر سے بہت چھوٹی تھیں روآں میں اعلیٰ خاندانوں کے فوجی افسروں کے لئے تفریح کا سامان بہم کرتی رہتی تھیں۔ اب وہ جسم نازنین کو سموروں میں چھپائے اپنے شوہر کے سامنے بیٹھی تھیں اور فٹن کی تاریک فضا میں چیں بجبیں ہو رہی تھیں۔

موسیو کالسے لامادون کے ساتھ کاؤنٹ ہوبرٹ دابریول بیٹھے تھے، جو ایک قدیم خاندان کے فرد تھے۔ کاؤنٹ نے جن کی شکل سے بڑھاپے میں بھی وجاہت کے آثار نمایاں تھے بہت کوشش سے اپنے خدوخال میں شاہ ہنری سے مشابہت پیدا کی تھی۔ ان کے خاندان کے متعلق یہ قصہ مشہور تھا اور کاؤنٹ فخریہ انداز میں اس کا ذکر کیا کرتے تھے کہ شاہ ہنری نے ان کی جدۂ محترمہ کو خلوت میں سرفراز فرمایا تھا۔ اور اس کے صلہ میں ان کے جدامجد کو کاؤنٹ کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ کاؤنٹ موسیو کالسے لامادون کی طرح کونسل کے رکن تھے۔ جب انہوں نے ایک معمولی تاجر کی لڑکی سے شادی کی تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا لیکن ان کی بیوی کا حسن و جمال، سلیقہ اور مہمان نوازی دیکھ کر خاموش ہو گئے اور پھر جب یہ سنا کہ ایک شہزادے کی نظر انتخاب بھی ایک زمانہ میں کاؤنٹس پر پڑ چکی ہے تو سب کی گردنیں جھک گئیں کاؤنٹس کی دعوتیں اس علاقہ میں سب سے زیادہ بارونق ہوا کرتی تھیں عوام کے لئے وہاں رسائی بہت مشکل تھی۔ صرف اسی کے گھر میں پرانی شاہانہ رسوم کا رواج تھا۔ کاؤنٹ کی جاگیر سے لاکھوں روپیہ کی آمدنی تھی۔

یہ چھ اشخاص جن کا اوپر ذکر ہوا سماج کے ممتاز نمائندے تھے۔ انہیں اپنی دولت، رسوخ اور اعلیٰ نسب پر ناز تھا اور ان میں سے ہر ایک اپنے آپ کو شرافت، عزت اور تہذیب کا اجارہ دار سمجھتا تھا۔

اتفاق سے سب عورتیں ایک ہی طرف بیٹھی تھیں۔ کاؤنٹس کے ساتھ دو راہبہ عورتیں تسبیح خوانی میں مصروف تھیں۔ ان میں سے ایک جو زیادہ عمر کی تھی چیچک رُو اور کریہہ المنظر تھی دوسری دبلی پتلی اور مدقوق معلوم ہوتی تھی گویا مذہب کے جنون میں گھل گھل کر جی رہی ہے۔ ان کے سامنے ایک مرد تھا اور ایک عورت جنہیں سب گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ مرد کا نام کارنوڈے تھا وہ اپنی انقلاب پسندی اور آزاد خیالی سے بہت رسوا ہو چکا تھا۔ شرفا اس کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ اس کی سیاسی زندگی رندی سے وابستہ تھی اور اس کی رندانہ زندگی سیاست سے۔ بیس سال سے وہ اپنی داڑھی بیئرے سے تر کرتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ انقلاب کا درس بھی دیتا رہا تھا۔ اس کا باپ جو سرمایہ چھوڑ گیا تھا وہ ان مشاغل کی نذر ہو گیا۔ اب کارنوڈے کی زندگی کا سہارا یہ تھا کہ جلد سے جلد انقلاب برپا ہو اور جمہور اسے صدر حکومت منتخب کر لیں۔ ایک دفعہ یار لوگوں نے اسے دارالحکومت میں بٹھا کر اس کے انتخاب کا اعلان بھی کروا دیا تھا مگر جب صدر کارنوڈے عنان حکومت سنبھالنے لگا تو بادست دگرے دست بدست دگرے نکال دیا گیا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ جب روآں پر جرمن فوج کی یورش ہوئی تو کارنوڈے نے بزعم خود تمام دفاعی انتظامات مکمل کر کے جرمن فوج کو حیران کر دیا۔ جابجا خندقیں کھودیں، درخت کاٹے، سڑکوں کو مسدود کیا اور یہ سمجھ لیا کہ اب جرمن فوج ہرگز روآں میں داخل نہیں ہو سکتی لیکن جب یہ اندازہ غلط ثابت ہوا اور جرمن فوج شہر میں داخل ہو گئی تو کارنوڈے نے سوچا کہ اب جا کر اداروں کی حفاظت میں حصہ لینا چاہئے۔ اگر وہاں کے لوگوں کو مجھ سا تجربہ کار انجینئر نہ ملا تو معلوم نہیں ان کا کیا حشر ہو!

عورت اس طبقہ میں سے تھی جسے اصطلاح عام میں ارباب نشاط کہتے ہیں۔ وہ اٹھتی جوانی ہی میں بھاری بھرکم ہو گئی تھی اور "ڈبنی" کے نام سے مشہور تھی۔ پست قد ہونے کی وجہ سے وہ بالکل گول دکھائی دیتی تھی۔ تنگ نما ہونے کے باوجود آثار شباب غیر معمولی طور پر نمایاں تھے اہل نظر اُسے چربی کا تودہ بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس "چربی کے تودے" میں بھی وہ کشش تھی کہ زبان سے چاہے کچھ کہہ لو دل اس کی طرف بے اختیار کھنچا جاتا تھا۔ اس کی غزالی آنکھوں اور لمبی پلکوں میں ایک سحر تھا۔ اس کے رخسار گلاب کے پھول کی طرح شگفتہ تھے اور ہونٹ ایک کلی کی طرح جو کھل کر بلبل کو دعوت دیا ہی چاہتی ہے۔ ہونٹوں کے کھلتے ہی آبدار موتیوں کی دو قطاریں نظر آتی تھیں۔ اس کا حسن غارت گر، اس کا کافر شباب زہد و ایمان پر بے پناہ بجلیاں گرا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس سے بعض اور اوصاف بھی منسوب کئے جاتے تھے جو بیان سے باہر ہیں۔

صد شیوہ ہاست حسن بتاں را کہ نام نیست

طوائف کو پہچانتے ہی سہاگنیں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ "بیسوا" "عصمت فروش" اور اسی قسم کے چند الفاظ طوائف کے کان تک بھی پہنچے۔ اس نے ایک بیباک نگاہ سب پر ڈالی تو مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ سب نے گردنیں جھکا لیں صرف لوئیسو دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

ابھی زیادہ وقت نہ گذرنے پایا تھا کہ ساتھنیں پھر اتحاد ثلاثہ قائم کر کے طوائف کے خلاف ایک مشترک محاذ کے لئے گفت وشنید میں مشغول ہو گئیں۔ وہ اسے اس لئے حقارت سے دیکھتی تھیں کہ ان کی محبت کو سماج کی اجازت حاصل تھی۔ اور طوائف کی محبت سماج سے بغاوت تھی۔ اسی طرح تینوں "میاں" بھی کارنوڈے کے خلاف متحد ہو گئے۔ وہ سماج کے اجارہ دار تھے۔ اور کارنوڈے باغی۔ کاروبار کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ان کے ہر لفظ سے غرور کی بو آتی تھی۔ کاؤنٹ ہیوبرٹ نے جنگ میں فصلوں اور جانوروں کی تباہی کی شکایت کی لیکن اس انداز سے کہ اپنی کثیر آمدنی کا اظہار مقصود تھا جس کے مقابلہ میں فصلوں کا نقصان ہیچ تھا۔ موسیو کارے لاما دوں نے کہا میں نے چھ لاکھ فرانک انگریزی بنک میں جمع کرا دیئے تھے۔ تاکہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔ لوئیسیو نے کہا۔ میں نے بھی جنگ کا انتظام پہلے ہی سے کر لیا تھا۔ جتنی ارزاں شراب میرے پاس تھی میں نے فوجی محکمہ کو بیچ دی تھی۔ اب حکومت میری قرضدار ہے۔ میں ہاور جا کر قرضہ جمع کروں گا۔ اسی طرح دوستانہ گفتگو ہوتی رہی۔ اگرچہ ان تینوں کے مراتب میں فرق تھا لیکن سب دولت کی سنہری زنجیر میں جکڑے تھے سب کا تعلق اس آسودہ حال برادری سے تھا جس کے فرد پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دبائے روپوں کی چھن چھن سنا کرتے ہیں۔

فٹن اتنی آہستہ جا رہی تھی کہ دس بجے تک وہ بمشکل دس میل سے آگے بڑھے۔ مرد بیٹھے بیٹھے اکتا گئے تو گاڑی سے نکل کر چلنے لگے۔ تین مرتبہ پہاڑیوں کے چکر کاٹے مگر پریشانی بڑھتی ہی گئی۔ پہلے ارادہ تو یہ تھا کہ توتس پہنچ کر دوپہر کا کھانا کھائیں گے لیکن موجودہ رفتار سے وہاں شام تک پہنچنے کی امید بھی نہ تھی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ کوئی سرائے نزدیک ہو تو وہیں چل کر کھانا کھائیں۔ دوسری طرف فٹن تھی کہ برف میں دھنس گئی اور دو گھنٹے کی کشمکش کے بعد نکلی۔ میلوں تک کوئی شراب کی دکان یا سرائے نظر نہ آتی تھی۔ جرمنوں کے ڈر سے بہت لوگ بھاگ گئے تھے۔ باقی بھوکے فرانسیسی فوجیوں کے تقاضوں سے گھبرا کر دکانیں بند کر گئے تھے۔ کسانوں سے گوشت روٹی کے لئے درخواست کی جائے تو وہ سوکھے ٹکڑے سے بھی انکار کرتے تھے۔ بھوکے سپاہیوں کے ڈر سے انہوں نے کھانے کی چیزیں چھپا رکھی تھیں۔ بیچارے مسافروں کو مجبوراً صبر کرنا پڑا لیکن ایک بجے کے قریب لوئیسیو بیقرار ہو گیا اور کہنے لگا میرے پیٹ میں ایک بہت تکلیف دہ خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اسکے ساتھیوں کو بھی یہی شکایت تھی لیکن بھوک نے سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیا تھا کبھی ایک جمائی لیتا تھا اور دوسرے اسکی تقلید کرتے تھے اپنی تربیت اور اطوار کے لحاظ سے ہر ایک بھوک کا اظہار کرتا تھا لیکن کوئی جمائی لیتے ہی منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیتا تھا اور کوئی مسلسل اور پرشور جمائی لیتا تھا غرض کہ معدے کا بخار سب منہ سے خارج کر رہے تھے اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا تھا۔

طوائف نے کئی مرتبہ جھک کر ادھر ادھر دیکھا گویا کسی چیز کو ڈھونڈ رہی ہے اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ رہی۔ سب مسافروں کے چہرے زرد اور پژمردہ ہو گئے تھے۔ لوئیسیو نے کہا اگر ایک سیر گوشت ایک ہزار فرانک میں بھی ملے تو خدا کی قسم لوئیسیو نہیں جو خرید نہ لوں۔ اس کی بیوی نے یہ سن کر غضبناک نظروں سے اس کی طرف دیکھا مگر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے فضول خرچی پر بہت طیش آتا تھا یہاں تک کہ وہ مذاق میں بھی اس کی روادار نہ تھی۔

کاؤنٹ نے کہا مجھ سے بھی کیا غلطی ہوئی کوئی کھانے کی چیز ساتھ لے آتا تو کیسا اچھا ہوتا۔ ہر ایک نے اس فروگذاشت پر اپنے آپ کو برا بھلا کہا البتہ کارنوڈے اپنے ساتھ ایک صراحی میں ٹھرا بھر لایا تھا۔ اس نے سب کو پیش کیا۔ کاؤنٹ اور موسیو کارے لاما دوں نے حقارت سے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا لیکن لوئیسیو نے غٹ غٹ آدھی صراحی چڑھا لی اور ٹھرے کی خوب تعریف کی۔ "یار واہ رے یہ، واہ رے بھوک کی دوا!" پھر جوں جوں نشہ چڑھتا گیا اس کی مسخرگی عود کرنے لگی۔ "سنو، یارو! تم نے وہ کہانی تو سنی ہو گی۔ چند آدمی ایک کشتی میں جا رہے تھے۔ کنارہ تھا بہت دور اور بھوک ستا رہی تھی اور کھانے کو پاس کچھ تھا نہیں۔ آخر تدبیر یہ ہوئی کہ مسافروں میں جو سب سے موٹا ہو وہ قربانی کا دنبہ بنے۔ خوب تجویز ہے کہ نہیں۔ ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی۔" کارنوڈے مسکرایا۔ کاؤنٹ اور کارے لاما دوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ طوائف نے جس پر یہ پھبتی کی گئی تھی باوقار خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔ راہبہ عورتیں تسبیح خوانی ختم کر کے گٹھڑی بنی بیٹھی تھیں اور فاقہ کو روزہ سمجھ کر ثواب کی امید لگائے ہوئے تھیں۔

اسی طرح دو گھنٹے اور گذر گئے لیکن دور تک آبادی کا کوئی پتہ نہ لگتا تھا۔ طوائف نے جلد جلد سیٹ کے نیچے سے ایک بڑا سا دیگچہ دسترخوان میں بندھا ہوا نکالا۔ دیگچہ میں انواع و اقسام کے کھانے چھوٹے بڑے خوانچوں میں بند تھے۔ ان کے علاوہ پھل، چٹنیاں، مربہ، اچار غرض قسم قسم کی نعمتیں تھیں جو تین دن کے سفر کے لئے کافی تھیں۔ عمدہ شراب کی چار بوتلوں کی جھلک بھی کام و دہاں کو دعوت دے رہی تھی۔

طوائف ایک بھنا ہوا مرغ نان کے ٹکڑے کے ساتھ کھانے لگی۔ کھانے کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ تمام نگاہیں وہیں جم گئیں۔

نتھنے پھول گئے، منہ میں پانی بھر آیا اور جبڑے میں خفیف سی حرکت پیدا ہو گئی۔ سہاگنوں کے غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ اس نا شدنی کو پیالے اور دیگچے سمیت اٹھا کر گاڑی سے باہر برف میں پھینک دیں۔

لوئیسیو بھوکی نظروں سے مرغ کو دیکھ رہا تھا۔ آخر رہا نہ گیا تو کہنے لگا، مادام! آپ تو ہم سب سے زیادہ ہیش بین نکلیں"۔ اس نے جواب دیا۔ "آپ بھی شوق فرمایئے۔ روزہ رکھ کر تو سفر نہیں کیا جا سکتا!"

لوئیسیو نے کہا، تسلیم! انکار کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ میں تو جاں بلب ہو رہا ہوں۔ طوفان میں کوئی بندرگاہ بھی ہو لنگر انداز ہونے کے لئے اچھی ہے"۔ "پھر چاروں طرف دیکھ کر"۔ اور مصیبت میں آپ ایسا رفیق تو بسا غنیمت ہے"۔ یہ کہہ کر گھٹنوں پر اخبار بچھایا اور جیب سے ایک چاقو نکال مرغ کی ایک ٹانگ اس صفائی سے کاٹی کہ دوسروں کو اس وقت معلوم ہؤا جب وہ آدھی ٹانگ چبا چکا تھا۔ بیچارے آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

طوائف نے نرم و لطیف آواز سے دونوں راہبہ عورتوں کو شرکت کی دعوت دی۔ انہوں نے جھٹ قبول کر لی۔ نیچی نظریں کئے شکریہ ادا کیا اور دست و دہاں کی عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ کار نوڈے نے بھی کوئی عذر نہ کیا۔ اخبار کو دسترخوان کی طرح بچھا کر مرغوں پر جھپٹ پڑے۔ لوئیسیو نے اپنی بیوی کو چپکے سے شامل ہونے کو کہا۔ پہلے تو وہ رضامند نہ ہوئی لیکن جب آنتوں میں درد محسوس ہونے لگا تو مجبور ہو گئی۔ لوئیسیو نے اپنے مخصوص انداز میں طوائف کی "فیاضی" کی تعریف کرتے ہوئے اپنی بیوی کو شریک کرنے کی اجازت چاہی۔ اس نے بخوشی بھرا خوان مادام لوئیسیو کو پیش کر دیا۔

شراب کی تقسیم میں یہ مشکل پیش آئی کہ پیالہ ایک ہی تھا لیکن سب نے باری باری پینا شروع کیا اور کار نوڈے نے اپنی "فیاض رفیق سفر" کے ہونٹوں سے تر کئے ہوئے پیالہ کو کمال اشتیاق سے بوسہ دیا۔

اِدھر اکل و شرب کا شغل جاری تھا۔ اُدھر کاونٹ بریول اور کاونٹس اور موسیو کارے لامادوں اور اس کی بیوی کا بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے مادام کارے لامادوں غش کھا کر گر پڑی۔ میاں نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو برف کی طرح سرد۔ سب سے امداد کے لئے درخواست کی۔ باقی تو ہکا بکا ہو گئے لیکن بوڑھی راہبہ نے جلدی سے طوائف کا پیالہ اٹھا کر "مریضہ" کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو گھونٹ حلق تک پہنچے ہی تھے کہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر کہنے لگی اب میں بالکل اچھی ہوں۔ راہبہ نے احتیاطاً اسے شراب کا پورا پیالہ پلایا اور کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں بھوک سے ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔

"دبنی" نے چاروں عالی قدر مسافروں کی طرف دیکھا جو اب تک بھوکے تھے اور ڈرتے ڈرتے کہا کاش میں اس قابل ہوتی کہ شرفا کو دعوت دے سکتی..... اتنا کہہ کر وہ رک گئی کہ کوئی جھڑک نہ دے۔

لوئیسیو کی بذلہ سنجی اس موقع پر کام آئی۔ اس نے خواتین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ایسے موقع پر تو ہمیں سب امتیاز بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ ہمارا تعلق ایک ہی برادری سے ہے۔ تکلف اور وضعداری کا خیال ترک کیجئے۔ اور یہ پیشکش قبول کیجئے۔ اب ساتھ کھانے میں عذر ہے معلوم نہیں رات کو سونا بھی نصیب ہو یا نہیں۔ پڑے اس رفتار سے تو ہم کل دوپہر سے پہلے تونس نہ پہنچ سکیں گے۔

خواتین جھجک رہی تھیں۔ پہلے "ہاں" کون کہے۔ کاونٹ نے یہ مشکل حل کر دی۔ اس نے شاہانہ انداز اختیار کر کے طوائف سے کہا "مادام! ہم آپ کی پیشکش شکریہ کے ساتھ قبول کرتے ہیں"۔

ابتدائی مرحلہ ہی سب سے دشوار تھا۔ جب دسترخوان پر بیٹھ گئے تو تکلف بر طرف خوان کے خوان خالی ہونے گئے اور سوائے اچار چٹنی اور ہڈیوں کے کچھ بھی نہ رہا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ طوائف کا کھانا کھائیں اور اس سے بات نہ کریں۔ پہلے کچھ حجاب رہا لیکن پھر بے تکلفی سے گفتگو ہونے لگی۔ کاونٹس اور مادام کارے لامادوں زمانہ شناس تھیں۔ اس لئے گفتگو میں تہذیب اور اخلاق کا لحاظ رکھتی تھیں۔ خصوصاً کاونٹس نے مشفقانہ اور مربیانہ لہجہ اختیار کر رکھا تھا۔ لیکن مادام لوئیسیو گنوارن تھی۔ منہ سے ایک لفظ نہ نکالتی تھی کہ ایک لقمہ کم نہ ہو جائے۔

قدرتی طور پر گفتگو کا موضوع جنگ ہی تھا۔ جرمنوں کے مظالم اور فرانسیسیوں کی بہادری کے تذکرے ہونے لگے۔ لطف یہ کہ خود بھاگ رہے تھے اور نہ بھاگنے والوں کی تعریف کا راگ الاپ رہے تھے۔ جب ذاتی تجربات کی طرف رجوع ہوا تو طوائف نے اس جوش اور فصاحت سے جو اس کے طبقے کا خاصہ ہے اپنے روآن چھوڑنے کے وجوہ اس طرح بیان کئے:۔

حب شہر پر دشمن کا قبضہ ہؤا تو پہلے میں نے یہی سوچا کہ جلاوطنی میں جنگل جنگل چھاننے سے تو شہر میں رہنا بہتر ہے۔ گھر میں کھانے پینے کا سامان اتنا زیادہ تھا کہ مہینوں ختم نہ ہوتا لیکن جب میں نے وحشی جرمنوں کو دیکھا تو میرا خون کھولنے لگا۔ غیرت کے مارے میں دن بھر روتی رہی۔

کاش میں مرد ہوتی تو ان بدمعاشوں کو مزا چکھاتی۔ کھڑکی میں سے ان موٹے سؤروں کو اکڑ اکڑ کر چلتے دیکھتی تھی تو یہی جی چاہتا تھا کہ کرسی اٹھا کر ان کے سر پر پھینک دوں۔ میری خادمہ نے مشکل سے مجھے اس حرکت سے باز رکھا۔ پھر چند جرمنوں کی رہائش اور خوراک کا انتظام میرے سپرد ہوا۔ میں نے ایک جرمن کو گلے سے دبوچ لیا اور قریب تھا کہ اس کا کام تمام کر دیتی لیکن دوسرے جرمن مجھے بالوں سے کھینچ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ بہت مصیبتوں کے بعد میں ان کے پنجے سے نکلی چند دن روپوش رہی پھر موقع ملتے ہی روآں سے راہِ فرار اختیار کی۔ بعد کے حالات تو آپ جانتے ہی ہیں۔

ہر طرف سے احسنت و مرحبا کی صدا آئی اور سب نے اس کی جرأت اور قومی احساس کی تعریف کی لیکن کارنوڈے صرف مسکرا دیا۔ جس طرح ایک برخود غلط پادری کسی سادہ لوح شخص کو مصروفِ عبادت دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ کارنوڈے کی قسم کے لیڈر اپنے آپ کو اسی طرح وطن پرستی کے واحد علمبردار سمجھتے ہیں جس طرح پادری مذہب کے اجارہ دار بنے پھرتے ہیں۔ "ڈبی" کی جرأت کا اعتراف کرنے کی بجائے اس نے ملوکیت پسندوں کے خلاف ایک دھواں دھار تقریر شروع کر دی۔ "ڈبی" کا رجحان شاہ پسندوں کی طرف تھا۔ کارنوڈے کی تقریر سن کر اس کا چہرہ غصّے سے تمتما اٹھا۔ آنکھیں آگ کی طرح روشن ہو گئیں۔ منہ سے شعلے لپکنے لگے۔ اس نے کارنوڈے کو غدار، بدمعاش اور اسی قبیل کے دو چار اور القاب سے مخاطب کرتے ہوئے کہا "اگر تم ایسے لفنگے فرانس میں برسرِ اقتدار ہوئے تو فرانس کا خدا حافظ" لیکن کارنوڈے کی یہ مثال تھی چکنے گھڑے پر بوند پڑی اور پھسل گئی۔ وہ گالیاں سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ "ڈبی" کا غصّہ اور تیز ہو گیا۔ وہ کارنوڈے کی شان میں ایک اور منثور قصیدہ کہنے کو تھی لیکن کاؤنٹ نے حکمتِ عملی سے کام لے کر اس کے غصّہ کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ اور کہا ہمیں ایک دوسرے کے سیاسی عقائد کا احترام کرنا چاہیئے۔ اور اگر کسی کا اختلاف نیک نیتی پر مبنی ہو تو اسے ہدفِ طعن بنانا درست نہیں۔ کاؤنٹس اور مادام کارے لامادوں کے احساسات کاؤنٹ کے برعکس تھے۔ عورتیں قدرتی طور پر ملوکیت پسند ہوتی ہیں کیونکہ انہیں دربار کی شان و شوکت میں اپنے حسن کی نمائش کا اچھا موقع ملتا ہے اس لئے وہ ملوکیت کی حمایت اور جمہوریت کی مخالفت میں طوائف کی ہمنوا تھیں۔

یہ سیاسی بحث زیادہ طول پکڑتی اگر کھانا ختم نہ ہو جاتا سب کو یہی افسوس رہا کہ "ڈبی" دیگچے کی بجائے دیگ کیوں نہ پکوا کر ساتھ لائی۔ طعام کے بعد کلام میں وہ پہلی سی گرمی نہ رہی اور تھوڑی دیر بعد سلسلۂ گفتگو بالکل منقطع ہو گیا۔ اب دن ڈھل چکا تھا رات کی تاریکی کے ساتھ سردی اپنا اثر زیادہ دکھلانے لگی اور اب کھانے کے بعد قدرتی طور پر سردی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ کاؤنٹس بریول نے "ڈبی" کو اپنی کانگڑی پاؤں گرم کرنے کے لئے پیش کی۔ اس کے پاؤں برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ اس لئے اس نے جھٹ کانگڑی لے لی۔ مادام کارے لامادوں اور مادام لوئیسیو نے اپنی کانگڑیاں راہبہ عورتوں کو دے دیں۔

کوچوان نے فٹن کی بتیاں جلائیں۔ ان کی روشنی گھوڑوں کی عرق آلود پشت اور برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر پڑی لیکن فٹن کے اندر بالکل اندھیرا تھا۔ کارنوڈے اور طوائف میں کچھ چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ لوئیسیو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو کارنوڈے چندیا سہلاتا دکھائی دیا۔

دور اندھیرے میں چراغ ٹمٹماتے نظر آئے یہ توتس کا شہر تھا۔ تیرہ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ توتس میں داخل ہوئے اور تجارتی سرائے کے سامنے رکے۔ سڑک پر نیام کے گرنے کی آواز آئی۔ مسافر خوف کے مارے کانپنے لگے۔ کسی نے جرمن زبان میں انہیں مخاطب کیا۔ مسافروں کو گاڑی سے اترنے کی ہمت نہ ہوئی گویا اترتے ہی قتل کر دیئے جائیں گے۔ کوچبان نے لالٹین لے کر سب مسافروں پر روشنی ڈالی۔ وہ بیچارے یاس و حسرت کی تصویر بنے دو طرفہ بیٹھے تھے۔ لالٹین کی روشنی میں ایک نو عمر اکہرے بدن کے جرمن افسر نے مسافروں کا ملاحظہ کیا۔ اس نے فرانسیسی زبان میں مسافروں کو گاڑی سے اترنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلے بوڑھی راہبہ اور اس کی چیلی نے تعمیل کی کیونکہ انہیں فرماں برداری کی تعلیم دی گئی تھی۔ پھر کاؤنٹ اور کاؤنٹس اور روئی کا تاجر اور اس کی بیوی اترے۔ پھر لوئیسیو اپنی بیوی کو آگے دھکیلتے ہوئے نکلا۔ اس نے اترتے ہی ازراہِ اخلاق نہیں بلکہ ازراہِ خوشامد جرمن افسر کو سلام کیا لیکن اس نے ایک رعونت آمیز نگاہ ڈالی اور کوئی جواب نہ دیا۔ کارنوڈے اور "ڈبی" جو دروازہ کے قریب بیٹھے تھے سب کے بعد اترے اور باوقار متانت سے جرمن افسر کے مقابل ہوئے۔ "ڈبی" نے اپنے غصہ کو بجبر دبایا۔ کارنوڈے نے اپنی سرخ داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ یہ سوچ کر کہ ایسے موقع پر ایک فرد کی بزدلی تمام قوم کے لئے بدنامی کا باعث ہوتی ہے وہ قومی وقار کے تحفظ کے لئے باوقار رویہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی روباہ مزاجی دیکھ کر انہیں

بہت افسوس ہوا۔ طوائف سہاگنوں سے بہتر مثال قائم کرنا چاہتی تھی۔ اور کارنوڈے اس وقت کو یاد کرکے جب اُس نے رواں کی حفاظت کے لئے خندقیں کھودی تھیں ہر ممکن طریقہ سے ملازمت جاری رکھنا چاہتا تھا۔

سب مسافر سرائے کے باورچی خانہ میں جمع ہوئے جہاں جرمن افسر نے ان کے پروانۂ راہداری کا بغور ملاحظہ کیا۔ اس نے ان کا نام پیشہ اور کیفیت پڑھ کر ہر ایک کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور "بہت اچھا" کہہ کر چلا گیا +

سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ سرائے کی خادمہ کو کھانا لانے کو کہا۔ اس نے کہا ابھی آدھ گھنٹہ میں حاضر کرتی ہوں۔ وہ کھانا پکانے میں معروف ہوئی اور یہ اپنے اپنے کمرے دیکھنے گئے۔ کمرے سب ایک قطار میں تھے۔ اور ان کے سامنے ایک برآمدہ تھا۔

جب کھانا کھانے کو بیٹھے تو سرائے والا آیا۔ وہ بھاری جسم کا آدمی تھا لیکن دمہ کا مارا ہوا۔ بات کرتے ہوئے گلا صاف کرتا، کھانستا اور تھوکتا تھا۔ اس نے آتے ہی پوچھا کیا مادموزیل ایلز بتھ روسے یہاں تشریف رکھتی ہیں؟ "دبنی" نے کہا "ہاں"

مادموزیل! جرمن افسر نے آپ کو اسی وقت ملاقات کے لئے بلایا ہے،

"مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں اگر آپ ہی مادموزیل ایلز بتھ روسے ہیں!"

چند لمحوں تک "دبنی" خوف کے مارے کچھ کہہ نہ سکی پھر تن کر بولی۔

"وہ مجھے ہزار بار بلائے میں نہیں جاؤں گی"۔

مجلس میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر ایک نے اپنے فہم کے مطابق بلاوے کے وجوہ پر رائے زنی کی۔ کاؤنٹ نے "دبنی" کو بہت سمجھایا۔ دیکھئے مادام! ایسے معاملات میں انکار کرنا بڑی غلطی ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف آپ کے بلکہ آپ کے رفقا کے حق میں بہت بُرا ہوگا۔ کبھی حکام بالادست کی مخالفت نہ کرنا چاہئے تعمیل حکم میں کوئی نقصان نہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے پروانۂ راہداری میں کوئی معمولی فروگذاشت ہو۔

سب نے اس پر زور دیا کہ ضرور جرمن افسر سے جاکر ملنا چاہئے۔ آخر ان کے اصرار سے مجبور ہو کر وہ چلنے پر راضی ہوگئی لیکن یہ کہتی گئی۔ کہ آپ کے کہنے پر جا رہی ہوں ورنہ ہرگز نہ جاتی۔ کاؤنٹس نے سب کی طرف سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی واپسی تک کسی نے کھانا نہ کھایا۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ ملاقات کا اعزاز اسی کو حاصل ہوتا۔ دس منٹ کے بعد ایلز بتھ ہانپتی کانپتی واپس لوٹی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ گلا خشک ہو رہا تھا اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "پاجی! حرامزادہ!"

اس کے رفقا سفر ملاقات کی تفصیل سننے کے لئے ہمہ تن شوق تھے لیکن وہ ایک لفظ بھی کہنے کو تیار نہ تھی۔ جب کاؤنٹ نے اصرار کیا تو اس نے اکڑ کر کہا آپ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں آپ کو ہرگز نہیں بتاؤں گی +

اس ناخوشگوار واقعہ کے باوجود ایلز بتھ کے سوا سب نے مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد سیب کا شربت آیا۔ موسیو اور مادام لوئیسیو اور راہبہ نے کفایت شعاری کے خیال سے اسے پسند کیا۔ باقی سب نے شراب منگائی۔ صرف کارنوڈے نے بیئر کے لئے فرمائش کی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بوتل کھول کر گلاس میں انڈیلی اور گلاس کو روشنی میں لاکر رنگ کی تعریف کرتا رہا پھر گلاس کو ہونٹوں سے اس طرح لگایا کہ تمام داڑھی تر ہوگئی۔ ہر گھونٹ کے ساتھ داڑھی کے ہلنے کا منظر قابلِ دید تھا۔ بیئر پینا اور انقلاب کے خواب دیکھنا۔ اس کی زندگی کے یہی دو مقصد تھے اور دونو لازم و ملزوم تھے۔

سرائے کا مالک موسیو فالنوی اور اس کی بیوی میز کی دوسری طرف کھانا کھا رہے تھے۔ فالنوی دمہ کا مریض تھا اس لئے کھاتے ہوئے باتیں نہ کر سکتا تھا لیکن اس کی بیوی گراموفون کی طرح رکنے میں نہ آتی تھی۔ اس نے جرمنوں کو جی بھر کر گالیاں دینا شروع کیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اسے ان کا خرچ اٹھانا پڑتا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس کے دو بیٹے فوج میں ملازم تھے اور اسے ان کی سلامتی کی فکر تھی۔ مادام فالنوی کی تمام تر توجہ کاؤنٹس پر مرکوز تھی کیونکہ ایک عالی مرتبہ خاتون سے ہمکلام ہونا اس جیسی عورت کے لئے باعثِ فخر تھا۔ موسیو فالنوی نے اُسے فاتح فوج کی مذمت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ گراموفون کی طرح لگاتار کہتی گئی ان جرمنوں کو کھانے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اب آلو کھا رہے ہیں۔ پھر کباب منگاتے ہیں پھر کباب کھا چکتے ہیں تو آلو منگاتے ہیں اور پھر کبابوں کی فرمائش کرتے ہیں۔ کھانے اور قواعد کے سوا انہیں کوئی کام نہیں۔ کاؤنٹس صاحبہ! ان سپاہیوں سے آخر ملک کو کیا فائدہ ہے؟ کھیتی باڑی یہ نہیں کرتے، تجارت یہ نہیں کرتے۔ ہم غریبوں کو مفت ان کا بار اٹھانا پڑتا ہے۔ کسان اور تاجر مفید کام کرتے ہیں اور یہ ہیں کہ فصلوں کو برباد کرتے ہیں تجارت کو تباہ کرتے ہیں۔ دوسرے ملک کے لوگوں کو بے وجہ قتل کرتے ہیں۔ اگر

کسی نے ان کے باپ یا بھائی کو قتل کیا ہو اور یہ انتقام لیں تو کوئی بات بھی ہے لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو سب سے زیادہ انسانوں کو قتل کرے وہی تمغہ کا مستحق قرار دیا جاتا ہے"۔

کارنوڈے نے بلند آواز میں کہا۔ ایک پرامن ہمسایہ کے خلاف جنگ کرنا ایک مذموم فعل ہے لیکن اپنے وطن کے تحفظ کے لئے جنگ کرنا ایک مقدس فرض ہے۔ مادام نالنوی نے کہا۔ ہاں! وطن کی حفاظت اور بات ہے لیکن جو بادشاہ اپنی شہرت اور ہوسِ ملک گیری کے لئے جنگ کرتے ہیں، میرے خیال میں واجب القتل ہیں۔ کارنوڈے کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ موسیو کارے لامادوں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ تمام بیکار سپاہی روئی کے کھیتوں اور کارخانوں میں کام پر لگا دیئے جاتے۔ کپڑے کی تجارت کو کتنا فروغ حاصل ہوتا۔

لوئیسیو چپ چاپ سرائے والے کے ساتھ باہر کھسک گیا اور باتوں باتوں میں اسے اپنے ڈھب پر لگالیا۔ نالنوی اس کے چٹکلوں پر بہت ہنسا اور اس سے شراب کی چھ پیٹیاں خریدنے کا وعدہ کیا۔

دوسرے مسافر تو تھکے ماندے تھے کھانا ختم کرتے ہی سو گئے۔ لیکن لوئیسیو دروازے کی درزوں سے جھانکتا اور کان لگا کر سنتا رہا کہ شاید کوئی رازِ درون پردہ منکشف ہو جائے۔ قریب آدھ گھنٹے کے گزرا تھا کہ سرسراہٹ سنائی دی اور طوائف نیلا کشمیری لباس (جو رات کے وقت پہنا جاتا ہے) پہنے ہاتھ میں بتی لیئے باہر نکلی۔ ایک اور دروازہ کھلا اور کارنوڈے اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ دو چار منٹ سرگوشیاں ہوئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ لوئیسیو تمام گفتگو نہ سن سکا لیکن اتنا سمجھ گیا کہ طوائف کارنوڈے کی اس حرکت پر معترض ہے کہ اس کی خوابگاہ میں کیوں داخل ہوا ہے۔

کارنوڈے حصولِ مقصد کے لئے اصرار کر رہا تھا۔ "ماں بھی جاؤ، تمہارا اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

طوائف نے برافروختہ ہو کر جواب دیا۔ "چلے جاؤ! یہ وقت اس و کنار کا نہیں ہے۔"

کارنوڈے نے کہا "یہی تو وقت ہے!"

طوائف نے چیخ کر کہا "دیکھتے نہیں یہاں جرمن مقیم ہیں۔ انہیں خبر ہو تو فرانسیسیوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں؟"

کارنوڈے کی رگ حمیت بھی پھڑک اٹھی۔ حسرت و ارمان دل میں دبائے دبے پاؤں اپنے کمرہ کی طرف واپس چلا گیا۔

لوئیسیو اس منظر سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اور ایک قلابازی لگا کر اپنے بام لوئیسیو کے پاس پہنچ گیا جو خواب شیریں میں مدہوش تھی۔ وہ اسے ایک بوسے سے جگا کر اس نئے رنگ سے آگاہ کرنے کو تھا کہ ایک ناخوشگوار صدا نے جو انجن کے دودکش کے شور سے مشابہ تھی راز و نیاز کا لطف کرکرا کر دیا۔ یہ موسیو نالنوی کے خراٹوں کی آواز تھی جو ایک دلخراش تسلسل کے ساتھ صبح تک جاری رہی۔

دوسرے دن آٹھ بجے روانگی کا ارادہ تھا۔ وقت سے پہلے ہی مسافر باورچی خانہ میں جمع ہو گئے۔ فٹن صحن میں کھڑی تھی۔ اس کی چھت برف سے ڈھکی تھی مگر نہ گھوڑے تھے نہ کوچبان۔ گھوڑے تو خیر اصطبل میں تھے لیکن کوچبان نہ اصطبل میں تھا نہ سائیس گھر میں۔ سرائے کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن بیسود۔ آخر یہ طے ہوا کہ شہر کی سیر کو نکلا ہو گا وہیں چل کے ڈھونڈھنا چاہیئے۔ اس پر مرد شہر کے بڑے بازار کی طرف گئے تو عجیب منظر دیکھا۔ دکانوں سے ہٹ کر ایک گرجا تھا جس کے نواح میں چھوٹے چھوٹے دورویہ مکان تھے جن میں جرمن سپاہی مقیم تھے۔ ان میں سے ایک آلو چھیل رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک اور جرمن حجام کی دکان دھو رہا تھا۔ تھوڑی دور اور چل کر ایک داڑھی والا جرمن سپاہی ایک فرانسیسی بچے کو لوریاں دے رہا تھا۔ فرانسیسی عورتیں جن کے خاوند جنگ کی وجہ سے گھر سے باہر بھیجے جا چکے تھے جرمن سپاہیوں سے خانگی امور میں مدد لے رہی تھیں۔ کوئی لکڑیاں کٹواتی تھی۔ کوئی مسالہ پسواتی تھی کوئی روٹیاں پکواتی تھی اور ایک نیکبخت تو اپنے میلے کپڑے دھلوا رہی تھی۔

کاؤنٹ نے متعجب ہو کر گرجے کے پادری سے پوچھا "یہ کیا معاملہ ہے؟" بوڑھے پادری نے جواب دیا "یہ جرمن سپاہی بہت نیکدل ہیں۔ یہ دوسرے سپاہیوں کی طرح نہیں ہیں۔ یہ گھر بار بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ آخر انہیں یہ احساس تو ہے کہ ان کے بیوی بچے بھی اسی طرح روتے ہوں گے۔ جس طرح فرانسیسی سپاہیوں کے مصیبت زدہ بچے اور بیویاں رو رہی ہیں۔ اس وجہ سے کسی کو ایذا نہیں پہنچاتے بلکہ فرانسیسی عورتوں اور بچوں کی اسی طرح خدمت کرتے ہیں جس طرح اپنی بیویوں اور بچوں کی کرتے۔ غربا مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آتے ہیں لڑائی تو بڑے بڑے لوگ کرواتے ہیں۔"

کارنوڈے فاتح اور مفتوح کے دوستانہ تعلقات دیکھ کر بہت جھلایا اور اسی وقت واپس چلا گیا۔ لوئیسیو نے اس موقع پر اپنے مخصوص انداز میں یوں تبصرہ کیا "جنگ کی وجہ سے آبادی کم ہو گئی تھی۔ اب شہر کو پھر

آباد کیا جا رہا ہے۔

موسیو کاسے لاماد وں نے اپنی مخصوص متانت سے کہا یہ تلافیِ مافات ہے۔

کوچبان ایک قہوہ خانے میں جرمن افسروں کے ملازموں کے ساتھ خوش گپیاں کرتا دکھائی دیا۔ کاؤنٹ نے کہا تمہیں ہم نے حکم نہیں دیا تھا کہ آٹھ بجے سے پہلے گاڑی تیار ہو جانی چاہیئے! میں نے کہا "حضور! حکم تو آپ نے دیا تھا لیکن اس کے بعد دوسرا حکم ملا۔" "کیسا حکم؟" "یہ حکم کہ گاڑی تیار نہ کی جائے۔" "کس نے حکم دیا تھا؟" "جرمن افسر نے۔" "وجہ؟" "اسی سے چل کر پوچھیے۔ مجھے حکم ملا تھا کہ گاڑی تیار نہ کی جائے سو گاڑی تیار نہیں کی۔" "اس نے خود حکم دیا تھا؟" "نہیں حضور! سرائے والے نے اس کا حکم سنایا تھا۔" "کب کی بات ہے؟" "رات کی، جب میں سونے چلا تھا۔"

پریشان حال مسافر سرائے کو واپس پہنچے۔ موسیو فالنوی سے ملنے کی کوشش کی لیکن خادم نے کہا وہ دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی انہیں دس بجے سے پہلے جگانے کی کوشش کرے ہاں آگ لگ جانے کی صورت میں انہیں اطلاع دی جا سکتی ہے۔ یہاں سے مایوس ہو کر وہ جرمن افسر کی ملاقات کو گئے لیکن معلوم ہوا کہ موسیو فالنوی کی معرفت ہی اس تک رسائی ہو سکتی ہے۔ آخر ہر طرف سے ہار کر بیٹھ گئے۔

کارنوڈے باورچی خانہ میں آتشدان کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے میز پر بیئر کا ایک گلاس تھا اور ہاتھ میں اس کا مشہور پائپ جسے قوم پرستوں کے حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ پائپ بہت خوبصورت اور قیمتی تھا اگرچہ اس کا رنگ کارنوڈے کے دانتوں کی طرح سیاہ تھا۔ پائپ کے بغیر کارنوڈے کی تصویر نامکمل رہ جاتی ہے یہ خادمِ قوم آتشدان کے پاس بیٹھا کبھی بھڑکتی آگ کو دیکھتا تھا کبھی بیئر کی جھاگ کو۔ کبھی اپنی لمبی پتلی انگلیوں کو اپنے غلیظ بالوں میں پھیرتا تھا اور کبھی اپنی مونچھوں سے شراب کی جھاگ کو چاٹ چاٹ کر بادہ نوشی کی داد دیتا تھا۔

لوئیسیو سیر کے بہانے بیوپاری فروشوں کے پاس جا پہنچا اور انہیں اپنا گاہک بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ کاؤنٹ اور سوئی کا تاجر سیاسیات اور فرانس کے مستقبل پر بحث کرنے لگے۔ کاؤنٹ شاہ پسند تھا اور تاجر چاہتا تھا کہ مرشدے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ کوئی نپولین اعظم یا ڈان والک ظاہر ہو کر فرانس کی بگڑی تقدیر بنا دے۔ کارنوڈے ان دو لوسرمایہ داروں کی باتیں سنتا تھا۔ اور پائپ کا کش لے کر جی میں کہتا تھا۔

محرم رازِ درونِ روزگارم کردہ اند

دس بجے موسیو فالنوی جاگے۔ مسافروں کے سوالات کا صرف ایک جواب اس کے پاس تھا۔ جرمن افسر نے مجھ سے کہا تھا موسیو فالنوی! دیکھو یہ مسافر میری اجازت کے بغیر یہاں سے جانے نہ پائیں۔ کوچبان کو حکم دے دو کہ صبح ہرگز گاڑی تیار نہ کرے۔

اس پر کاؤنٹ اور ملک التجار جرمن افسر کی ملاقات کو گئے۔ کاؤنٹ نے اپنا کارڈ بھیجا جس پر موسیو کاسے لاماد وں نے اپنا نام اور اعزازات لکھے تھے لیکن فرعون مزاج جرمن نے کہلا بھیجا دوپہر کے کھانے کے بعد ملاقات ہو سکتی ہے۔

اس پریشانی کے باوجود بیا بیتا عورتوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا طوائف البتہ بہت مغموم اور رنجیدہ خاطر تھی۔ کھانا ختم ہوتے ہی جرمن افسر کا چپڑاسی سلام لے کر آیا۔ لوئیسیو بھی کاؤنٹ اور موسیو کاسے لاماد وں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ کارنوڈے کو بھی ساتھ ملانا چاہتے تھے مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں جرمنوں سے عدم تعاون کی حکمت عملی پر کاربند ہوں اس لئے جی حضوری بن کر ان کے سامنے نہیں جا سکتا۔ وہ جرمن کے پاس گئے اور یہ بیئر پینے بیٹھ گیا۔

وفد کے اراکین سیڑھیوں سے چڑھ کر جرمن افسر کے دیوانِ خاص میں پہنچے۔ وہ آرام کرسی پر دراز تھا۔ اور ساؤں ملاقاتیوں کی طرف تھے۔ اس نے لبادہ اوڑھا ہوا تھا جو لوٹ کا مال معلوم ہوتا تھا۔ ارکان وفد نے سلام کیا۔ اس نے نہ ان کے سلام کا جواب دیا نہ ان کی طرف دیکھا وہ فاتح فوج کی بے تمیزی کا مجسم نمونہ تھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا: "یہاں آنے کی غرض؟"

کاؤنٹ نے وفد کی طرف سے جواب دیا: "ہم روانگی کی اجازت چاہتے ہیں۔"

جرمن نے اکڑ کر کہا۔ ہم اجازت نہیں دیتے!

کاؤنٹ۔ کیا میں اس کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟

جرمن۔ ہماری مرضی!

کاؤنٹ۔ میرا مؤدبانہ التماس ہے کہ سالارِ اعظم نے ہمیں پروانۂ راہداری

دیا ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ پروانہ کے حامل کو ڈیپ تک جانے کی اجازت ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ہم پر یہ سختی کیوں کی جا رہی ہے۔

جرمن۔ ہماری مرضی! بس ہم اس سے زیادہ نہیں کہنا چاہتے! چلے جاؤ

تینوں نمائندوں نے جھک کر سلام کیا اور بے نیل و مرام واپس آ گئے۔

مسافر تمام شام فکرمند رہے متلون مزاج جرمن افسر کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا تھا قسم قسم کے بے بنیاد وسوسے رہ رہ کر ستاتے تھے۔ باورچی خانہ میں جمع ہو کر سب اپنا اپنا قیاس دوڑانے لگے۔ کسی نے کہا ہمیں بطور یرغمال قید کر لیا جائے گا۔ کسی نے کہا نہیں زیادہ ممکن یہ ہے کہ ہمیں زرفدیہ کے لالچ میں گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہ سن کر امیروں کو تو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ دولت کی بربادی کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ جرمن افسر کہتا ہے تھیلیوں کے منہ کھول کر یہاں ڈال دو۔ ورنہ جیتے جی آزادی نصیب نہ ہوگی تینوں سرمایہ دار دماغ لڑانے لگے کہ کوئی اچھا سا جھوٹ گھڑ کر جرمن کو یہ یقین دلائیں کہ ہم حقیقت میں نادار اور مفلس ہیں۔ لوئیسیو نے گھڑی کی طلائی زنجیر اتار کر جیب میں رکھ لی۔ اندھیرا زیادہ ہوا تو سرمایہ دار اور بھی گھبرائے۔ طبیعت بہت پریشان تھی مادام لوئیسیو نے کہا تاش کی ایک بازی ہو جائے تو طبیعت بہل جائے سب نے یہ تجویز پسند کی۔ کاؤنٹ نے تاش تقسیم کی۔ طوائف پہلی بازی میں ہار گئی کھیل کی دلچسپی میں تفکرات محو ہونے لگے لیکن کارنوڈے نے تاڑ لیا۔ کہ لوئیسیو اور اس کی بیوی دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کھیل دو گھنٹہ میں ختم ہوا۔ اس کے بعد کھانے کی میز پر بیٹھے ہی تھے کہ موسیو فالنوی جرمن افسر کا قاصد بن کر آیا۔ اور یہ پیغام لایا کہ مادموزیل ایلزبتھ روسے رضامند ہے تو اطلاع دے۔

طوائف کا چہرہ زرد ہو گیا۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی پھر یک لخت آگ بھبوکا ہو کر بولی اس حرامزادے سے کہہ دو مجھ سے یہ امید نہ رکھے سنتے ہو! میں ہرگز ہرگز اس کی بات نہ مانوں گی۔

سرائے والا تو یہ سن کر چلا گیا لیکن دوسرے لوگ طوائف کو سوالات سے دق کرتے رہے۔ آخر یہ کیا اسرار ہے؟ کونسی چھپانے کی بات ہے؟ جرمن افسر کس لئے بیقرار ہے؟ پہلے تو وہ ضبط کرتی رہی، مگر جب ان کا اصرار حد سے زیادہ بڑھا تو چلا کر بولی "تم پوچھتے ہو۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟ وہ مجھے اپنی خوابگاہ میں بلانا چاہتا ہے اور کیا چاہتا ہے؟"

فرانسیسیوں کی آتش غیرت بھڑک اٹھی۔ کارنوڈے کے ہاتھ سے بیئر کا گلاس گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اس بد طینت جرمن افسر پر سب نے لعن طعن کی اور اس کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہر ایک نے قسم کھائی کہ ہم ہر ممکن قربانی کر گذریں گے اور کسی صورت میں اس توہین کو برداشت نہ کریں گے۔ کاؤنٹ نے جرمن کے رویہ پر نفرین کرتے ہوئے کہا اس شرمناک واقعہ نے قرون وسطی کے وحشیوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ خواتین نے بھی ایلزبتھ کے ساتھ کمال فیاضی سے ہمدردی کا اظہار کیا البتہ بوڑھی راہبہ اور اس کی چیلی جو صرف کھانے کے وقت ان سے ملتی تھیں، چپ سادھے تسبیح گردانی میں مصروف رہیں۔

جب غصہ کی آگ قدرے فرو ہوئی تو سب نے کھانا کھایا لیکن کسی نے سلسلۂ گفتگو چھیڑنے کی کوشش نہ کی۔ کھانا ختم کرتے ہی عورتیں تو اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو رہیں۔ مرد کچھ دیر پائپ اور سگرٹ کے کش لگاتے رہے پھر تاش کا کھیل شروع ہوا۔ موسیو فالنوی کو شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ مطلب یہ تھا۔ کہ اسے باتوں میں لگا کر یہاں سے نکلنے کی تدبیر پوچھی جائے۔ لیکن وہ پتے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتا تھا۔ نہ ان کے سوالات سنتا تھا۔ نہ ان کی باتوں کا جواب دیتا تھا۔ اسے کھیل کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ وہ ان سے یہی کہے جاتا تھا میں آپ کے کھیل میں خلل انداز نہیں ہونا چاہتا۔ آپ کھیل جاری رکھیے میں دیکھ دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہا ہوں۔ وہ کھیل میں اتنا محو ہو گیا۔ کہ کھانسنا بھی بھول گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اس کے سینے سے باجے کی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس کی بیوی انتظار سے اکتا کر اسے بلانے آئی۔ تو اس نے انکار کر دیا۔ اسے جلدی سونے کی عادت تھی۔ اس لئے وہ اسے وہیں چھوڑ کر چلی۔ فالنوی نے اس سے کہا۔ میرے لئے انڈے تل کر سوتا۔ یہ کہہ کر وہ پھر کھیل دیکھنے لگا۔ مسافروں نے دیکھا کہ اس کے پھوٹے منہ سے تو کام کی بات نہیں نکلتی۔ ناچار وہ بھی کھیل ختم کر کے سونے چلے گئے۔

دوسرے دن وہ سویرے ہی جاگے۔ سب یہی دعا مانگتے اٹھے کہ الہٰی تو کارساز ہے۔ اس منحوس سرائے سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کر۔ لیکن بدقسمتی سے گھوڑے اصطبل میں بندھے رہے اور کوچبان حسب سابق غائب رہا دوپہر کا کھانا بہت بے لطفی سے کھایا گیا۔ طوائف کی جانب سے دکھاپن ظاہر ہونے لگا۔ سرمایہ داروں اور پارسا عورتوں کے خیالات میں گذشتہ رات کے وقفے میں۔ انقلاب عظیم پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دل میں اسے کوس رہے تھے۔ کہ اس نے رات کے پردہ میں جرمن افسر کی خواہشات کیوں پوری نہ کر دیں۔

کسی کو خبر بھی نہ ہوتی - اور صبح مسافروں کو روانگی کی اجازت بھی مل جاتی - وہ افسر کے سامنے یہ بہانہ پیش کر سکتی تھی - کہ میں اپنے ہموطن مسافروں کی خاطر تمہاری خواہشات کی تکمیل کر رہی ہوں - اور اس کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی - یہ خیالات ابھی اُن کے ذہن میں پراگندہ تھے - اور ابھی انہوں نے الفاظ کی صورت اختیار نہ کی تھی ۔

سہ پہر کو عورتیں اور تین مرد بیٹھے بیٹھے اُکتا کر سیر کو نکلے - کارنوڈے آگ کے پاس بیٹھا رہا - اور راہبہ تسبیح گردانی کے لئے الگ بیٹھ رہیں - چاروں عورتیں آگے آگے چلیں - اور تینوں مرد کچھ فاصلے پر رہے - موسیو نے صورت حال پر تبصرہ کیا - ہمیں کب تک اس رنڈی کی وجہ سے نظر بند رہنا پڑے گا - کاؤنٹ نے اپنی شرافت اور عالی دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا - ہم ایک عورت کو اپنی عزت قربان کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتے - ہاں اگر وہ خود رضامند ہو جائے تو اور بات ہے -

لوئیسو نے پیادہ پا بھاگ چلنے کی رائے دی - لیکن کاؤنٹ نے کہا - ایسا اقدام مصلحت کے خلاف ہو گا - برف میں اپنی بیویوں سمیت بھاگ نکلنا ہمارے لئے ناممکن ہے - دس منٹ میں جرمن ہمارا تعاقب کر کے ہمیں گرفتار کر لیں گے - اور پھر ہماری خیر نہیں - لوئیسو سے کوئی جواب بن نہ پڑا - اور چند منٹ تک مکمل خاموشی رہی - اس عرصہ میں خواتین تازہ ترین فیشن کے متعلق باتیں کرتی رہیں - موجودہ حالات میں ان کی گفتگو میں شگفتگی تو پہلے ہی نہیں تھی - اچانک جرمن افسر ان کے پاس سے گزرا - تو رہا سہا سکون بھی جاتا رہا - وہ خواتین کو دیکھ کر مسکرایا اور تعظیماً سر جھکا کر چل دیا - لیکن مردوں کے قریب پہنچا تو ایک حقارت کی نظر ڈالی - اور ان کے سلام کا انتظار نہ کیا - ایلز بتھ کا منہ سُرخ ہو گیا - اور بیاہتا عورتیں اس خیال سے جھینپ گئیں - کہ انہیں اس گستاخ عورت کے ساتھ دیکھ کر خدا جانے کیا کیا شکوک جرمن افسر کے دل میں پیدا ہوں - جب جرمن افسر دور چلا گیا - تو اس کی ہیئت کذائی پر تنقید ہونے لگی - مادام کارے لا مادوں نے دوسروں سے اتفاق نہ کیا - اور کہا وہ قطعاً بدصورت نہیں ہے - اس نے اپنے تجربہ کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی - کہ اگر وہ فرانسیسی ہوتا تو کوئی عورت بھی اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی ۔

سیر کے بعد سرائے میں واپس آئے - تو جی نہ لگتا تھا - بات بات پر جھگڑتے تھے - پھر چپ چاپ کھانا زہر مار کیا اور سیدھے اپنی اپنی خوابگاہ میں چلے گئے - کہ شاید نیند سے طبیعت بہل جائے - سو کر اُٹھے تو سب کے چہرے اترے ہوئے اور مزاج برہم تھے - عورتیں طوائف سے کنارہ کش نظر آتی تھیں - اور اس سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتی تھیں - وہ بھی گھبرا کر چلی گئی - گرجے میں کسی بچے کے بپتسمہ لینے کی رسم تھی - اسے بھی اپنا بچہ یاد آ گیا - جو ایک عرصہ سے اس سے بچھڑا ہوا تھا - اور ایک کسان کے گھر میں پرورش پا رہا تھا ۔

طوائف تو گرجا کو چل دی - اور اس کی پیٹھ پھیرتے ہی اس کے رفقا میں اشارے ہونے لگے - گویا کہ اس بدبخت عورت کے خلاف سازش کرنے کا یہی وقت ہے - غیب سے کسی نے لوئیسو کے کان میں پھونکا کہ طوائف کو جرمن افسر کے حوالے کر کے چل دو - موسیو فالنزی کی وساطت سے یہ پیغام جرمن افسر تک پہنچایا گیا - لیکن قاصد اُنہی قدموں واپس آیا تو سمجھ گئے کہ تیر خطا گیا - جرمن افسر نے جواب بھیجا کہ جب تک میں اپنا مدعا حاصل نہ کر لوں - تم میں سے کسی کو شہر چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے -

یہ جواب سُن کر مادام لوئیسو سے نہ رہا گیا - اس کی باطنی خباثت آتش فشاں پہاڑ کے مادے کی طرح پھوٹ پڑی - اس بیسوا کی وجہ سے یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی ہے - کوئی اس فاحشہ سے پوچھے کہ تجھے اس جرمن سے کیوں شرم آ رہی ہے - تیرے لئے تو زید بکر عمر سب ایک جیسے ہیں - تجھے مردوں میں تمیز کرنے کا کیا حق ہے - روآں میں تو تو شارع عام بنی تھی - کوچبانوں تک کو تو کھلی اجازت تھی - کتنے کوچبانوں کو تو میں جانتی ہوں - جو اس کے مستقل گاہک تھے - یہ لوگ ہم سے شراب خریدنے آتے تھے - اس لئے مجھ سے کوئی بات چھپی نہیں - اب جو ہمیں اس مصیبت سے چھڑانے کا سوال آیا - تو یہ لگی گرہستنوں کی طرح رونے چلانے - سچ پوچھو تو میں تو جرمن افسر کی تعریف کرتی ہوں - کہ وہ مہینوں سے عورت کو ترس رہا ہے - لیکن گرہستنوں پر ہاتھ نہیں ڈالتا - اس نے شرافت سے کام لے کر ایک پیشہ ور عورت کو پسند کیا ہے - ورنہ کیا ہم اس عورت سے کسی طرح کم ہیں - وہ ایک اشارہ کر دے تو ہم میں سے جس کو چاہے اپنی ہوس کا آلۂ کار بنا سکتا ہے ۔

یہ سن کر دوسری خواتین تھرا اُٹھیں اور مادام کارے لا مادوں کا چہرہ زرد ہو گیا - گویا وہ حقیقت میں اس مرحلہ سے گزر رہی ہے - اس موقع پر مرد بھی گفتگو میں شریک ہو گئے - لوئیسو نے اس پر زور دیا - کہ رنڈی کو دست و پا بستہ قربانی کے لئے جرمن افسر کے حوالے کر دیا جائے - لیکن کاؤنٹ جس نے سیاست میراث میں پائی تھی حکمت عملی سے کام لینا چاہتا تھا - اس کی یہ رائے تھی - کہ طوائف کو پچکار کر منا لینا چاہیئے - اس کے بعد مشورہ ہونے لگا کہ کونسی تدبیر کی جائے - کہ طوائف خود اپنی خدمات رفاہ عام کے لئے پیش کر دے -

عورتیں سرجوڑ کر باتیں کرنے لگیں۔ ہر ایک نے اپنی اپنی رائے دی۔ تشبیہ واستعارہ کے پردے میں راز کی باتیں ہونے لگیں۔ شرم کا مصنوعی پردہ اس شرمناک بحث میں حائل نہ ہوا۔ عورتیں اس دلچسپ مضمون سے اس طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ جس طرح ایک باکمال باورچی مزیدار کھانے پکاتے وقت چکھنے کے بہانے ان سے جی بھر کر لذت اندوز ہوتا ہے۔

اس شگفتہ مضمون نے مصیبت زدہ مسافروں کی کلفت دور کر دی۔ کاؤنٹ نے مہذبانہ پیرایہ میں اس غیر مہذب موضوع پر ظریفانہ تبصرہ کیا۔ لوئیسو نے اپنے مخصوص انداز میں تہذیب واخلاق سے بے نیاز ہو کر دادِ ظرافت دی۔ لیکن کسی مدعی اخلاق نے اسے نہ ٹوکا۔ سب مادام لوئیسو کے اس فقرے کو دہرا رہے تھے۔ کہ یہ تو اس کا پیشہ ہے۔ اسے مردوں میں تمیز کرنے کا کیا حق ہے۔

مادام کارے لامادون تو ہونٹ چبا کر جی میں کہہ رہی تھی۔ کاش طوائف کی بجائے نظرِ انتخاب مجھ پر پڑتی۔ طوائف کے خلاف ایک گہری سازش کی گئی۔ تاکہ بندی کے مختلف پہلوؤں پر بحث وتمحیص کے بعد ہر ایک کو اپنے فرائض سے آگاہ کیا گیا جس طرح ایک جرنیل کسی مستحکم قلعہ کی تسخیر کے لئے اپنے افسروں سے مشورہ کرتا ہے۔ اور ہر ایک کو ضروری داؤ گھات بتاتا ہے۔ اسی طرح کاؤنٹ نے اپنی فطری دانشمندی سے کام لیتے ہوئے طوائف کی مدافعت کو ختم کرنے کے لئے تدابیر سوچیں اور اپنے رفقا کو اس مہم میں اپنا شریک کر لیا۔

جب طوائف واپس آئی۔ تو سازش مکمل ہو چکی تھی۔ کاؤنٹ نے سب کو اشارہ کیا۔ کہ خاموش ہو جاؤ۔ مبادا شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ عورتوں نے اچانک طوائف کو موجود پایا۔ تو کچھ حیران سی ہو گئیں۔ کانفرنس یک لخت بند ہو گئی۔ اور کسی کو طوائف سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن کاؤنٹس جو ریاکاری میں طاق تھی۔ ایک منٹ میں سنبھل گئی۔ اور طوائف سے بے تکلف باتیں کرنے لگی۔ گرجا میں خوب رونق ہو گی۔ تمہارا عبادت میں جی لگ گیا ہوگا طوائف نے کہا ہاں! جب موقع ملے خدا کو یاد کر لینا اچھا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ دوپہر تک خواتین نے طوائف سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ تاکہ اس کا اعتماد کر لیں۔ جب میز پر کھانا آیا۔ تو طوائف کا محاصرہ شروع ہوا۔ پہلے جذبہ ایثار کی تعریف ہوتی رہی۔ پھر تاریخ سے قربانی کی مثالیں پیش کی گئیں۔ قدیم زمانے کی ان عورتوں کی تعریف کی گئی جنہوں نے جان ومال وآبرو کو خطرہ میں ڈال اپنی قوم کو دشمن کے پنجے سے چھڑایا تھا مصر کی ملکہ کی مثال پیش کی گئی کہ آیا جس نے فاتح روم جرنیلوں کے دلوں کو اپنے حسن سے مفتوح کر لیا تھا۔ اس کے بعد ایک رنگین افسانہ تراشا گیا کہ کس طرح خاندان کی روکن عورتوں نے حملہ آور ہینیبال اور اس کے سپاہیوں کو اپنی متاع حسن نذر کر کے اپنے ملک کی آزادی خریدی تھی۔ اس افسانہ سے اور افسانے پیدا ہوئے۔ ہر ایک نے اپنے تخیل کی بہار آفرینی کا ثبوت دیا۔ ان تمام اخلاق آموز افسانوں کا ایک ہی موضوع تھا۔ کہ اگر عورت حسن فروشی پر اتر آئے۔ تو ملک اور قوم کی بہترین خدمات سرانجام دے سکتی ہے۔ اور کوئی اعلیٰ مقصد نہیں جو اپنی آبرو کے عوض خرید نہیں سکتی۔ یہ داستانیں سناتے وقت خواتین کی متانت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ وہ ہر طرح اپنے خلوص کے مصنوعی آثار پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ اس اثنا میں راہبہ عورتیں عبادت میں مصروف رہیں اور طوائف خاموشی سے سنتی رہی۔

سہ پہر کے وقت طوائف کو دعظ نہ سنایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اسے سوچنے کا موقع ملے تو شاید "راستی" پر آ جائے۔ گفتگو کے دوران میں البتہ وہ اسے مادام کی بجائے مادموزیل کہہ کر مخاطب کرتی رہیں غالباً اس لئے کہ اسے احساس ہو جائے۔ کہ وہ بیاہتا عورت نہیں ہے۔ شام کو وہ کھانا کھا رہے تھے تو موسیو فالنوی پھر آیا اور حسب معمول پوچھا جرمن افسر کا ارشاد ہے کہ مادموزیل ایلزبتھ روسے نے اپنا ارادہ بدلا ہے یا نہیں۔

طوائف نے روکھا پھیکا جواب دیا "نہیں"۔

اس پر سازشیوں کی تھوتھنیاں لٹک آئیں۔ لوئیسو نے اپنے ساتھیوں کو ہنسانے کی ناکام کوشش کی۔ کسی کو ایثار کی نئی مثال نہ سوجھتی تھی۔ کاؤنٹس نے اس لئے بوڑھی راہبہ کی طرف رجوع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بزرگان مذہب سے بعض ایسے واقعات منسوب کئے گئے ہیں جو مہذب ملکوں میں جرائم سمجھے جاتے ہیں اور جن کو عام طور پر ہر شخص ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن بزرگانِ مذہب کے بارے میں ان واقعات سے اس لئے چشم پوشی کی جاتی ہے کہ ان اعمال کا محرک خدمت خلق یا حکم ربانی کی تعمیل کا جذبہ تھا۔ ہمارے ہاں بھی پادری اور بزرگانِ ملت اپنے مذموم افعال کی انہی تاویلوں سے پردہ پوشی کیا کرتے ہیں۔ اور اپنی غلطیوں کے بارے میں "روح کی آواز" اور اپنی سادگی کا بہانہ پیش کر کے معصوم بنے رہتے ہیں۔ کاؤنٹس نے اس حقیقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ بوڑھی راہبہ آسانی سے کاؤنٹس کے جال میں پھنس گئی۔ اس نے غیر معمولی فصاحت سے وہی باتیں کہیں جو کاؤنٹس اس سے کہلانا چاہتی تھی یعنی خدا کو کوئی فعل ناپسند نہیں جو نیک نیتی سے کیا گیا ہو۔ اس پر کاؤنٹس نے کہا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ جو گناہ خلوصِ نیت سے کیا جائے خدا اسے معاف کر دے گا۔

راہبہ نے کہا۔ اس میں کسے شک ہو سکتا ہے؟ اگر نیک نیتی سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو مجھے بھی کارِ ثواب کہنا چاہیئے!

یہ مذہبی بحث نہایت متانت سے جاری رہی۔ اس کے دوران میں ہر قسم کی غیر متعلق اور بیہودہ باتیں خدا سے منسوب کی گئیں۔ اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ گنہگار طوائف کو نئے گناہ پر مائل کیا جائے۔ راہبہ کا ہر لفظ مدافعت کے حصار میں رخنہ پیدا کر رہا تھا۔ جب گفتگو کا موضوع بدلا تو راہبہ نے کہا میں زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کے لئے جا رہی تھی لیکن اس متلون مزاج جرمن افسر نے ہمیں یہاں روک رکھا ہے۔ معلوم نہیں اس کی اس حرکت سے کتنے سپاہیوں کی جان پر بن رہی ہوگی۔ بڈھی راہبہ کو صیا، اٹلی اور آسٹریا میں ہزاروں سپاہیوں کی تیمار داری کر چکی تھی۔ جب اس نے ان واقعات کا ذکر کیا تو اس کا جھرّیوں سے مستور چہرہ جنگ کی تباہ کاریوں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے سب اس حد تک متاثر ہوئے کہ جب اس نے اپنا تذکرہ ختم کیا تو کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کھانا ختم ہوتے ہی سب اپنے اپنے کمروں کو واپس ہوئے اور دوسرے دن دیر سے اٹھے۔ دوپہر کا کھانا سب نے خاموشی سے کھایا کہ جو بیج پچھلی شام کو بویا گیا ہے اسے پھوٹنے کا موقع ملے۔

سہ پہر کو کاؤنٹس کے کہنے پر سب سیر کو نکلے۔ دوسرے تو آگے نکل گئے لیکن میاں بمصلحت کو مدِنظر رکھ کر طوائف کا بازو پکڑے پیچھے رہ گیا۔ اس نے موقع پا کر بزرگانہ انداز میں طوائف سے کہا "بیٹی! تم اب بھی راہِ راست پر آ جاؤ تو اچھا ہے۔ سوچو تو اگر تم اپنی ضد پر قائم رہیں تو ہماری حالت میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ ہماری عزت کوڑی کی نہ رہے گی۔ ہماری آبرو برباد ہو جائے گی۔ تم اس جرمن افسر کو کیوں اپنا ممنونِ احسان نہیں بنانا چاہتیں جب ہر کس و ناکس کو سرفراز کرنا تمہارا ہر روز کا کام ہے؟"

اس طرح نرمی، لجاجت، خوشامد، ہر طرح سے طوائف کو راضی کرنے کی کوشش کی۔ جب کوئی حیلہ کارگر نہ ہوا تو اس نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور نہایت بے تکلفی سے "وینی" سے کہا۔ اگر تم مان جاؤ تو جرمن افسر تمام عمر اس واقعہ پر فخر کرے گا اور کہا کرے گا کہ مجھے ایک ایسی نازنین نے سرفراز فرمایا ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے اور جو تمام جرمن عورتوں سے حسین ہے!

"وینی" نے کوئی جواب نہ دیا وہ مجروح ہو کر اس سے الگ ہو گئی اور دوسری عورتوں سے جا ملی۔ سرائے پہنچ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور بہت دیر تک باہر نہ نکلی اس کے رفقائے سفر گھبرائے کہ اگر وہ اب بھی اپنی ہٹ پر قائم رہی تو کوئی چارۂ کار نہیں۔

کھانے کا وقت آیا۔ سب اس کا انتظار کرتے رہے لیکن بے سود۔ اتنے میں سرائے والے نے آ کر کہا آپ کھانا کھائیے ان کی طبیعت ناساز ہے۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ کاؤنٹ نے آہستہ سے موسیو فالنوی سے پوچھا "سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا؟" اس نے کہا "ہاں"۔ کاؤنٹ نے دوسروں کو بتانا مناسب نہ سمجھا لیکن اس کے چہرے سے حقیقت کا اظہار ہو گیا اس پر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور کھلائے ہوئے چہرے شگفتہ ہو گئے۔ لوئیسو نے اچھل کر کہا اس تقریب پر میں آپ سب کو شمپین کی دعوت دیتا ہوں بشرطیکہ سرائے میں شمپین موجود ہو۔ اتفاق سے سرائے والے کے پاس شمپین کی چار بوتلیں نکل آئیں۔ مادام لوئیسو نے اپنے شوہر کی فضول خرچی دیکھی تو بہت جھلائی اس کے پیٹ میں رہ رہ کر مروڑ اٹھتا تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مادام لوئیسو کے سوا سب نے دادِ مے نوشی دی اور اس کے بعد کاؤنٹ نے مادام کارے لاما دوں اور موسیو کارے لاما دوں نے کاؤنٹس سے اظہارِ محبت کیا۔ ہر فرد مسرور اور مخمور ہو گیا۔ بیباک قہقہے اور نقرئی نغمے فضا میں گونجنے لگے۔

لوئیسو نے یک لخت ہاتھ اٹھا کر کہا "خاموش" سب حیران رہ گئے۔ کہ یہ کیا بات ہے۔ اس نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر ہمہ تن توجہ ہو کر چھت پر نظریں گاڑ دیں اور کوئی آواز سننے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا گھبراؤ نہیں سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔" اس کے رفقا کو یہ اشارے سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ لیکن جب اس کا مطلب کھلا تو سب محظوظ ہوئے اور مسکرانے لگے۔

دس پندرہ منٹ کے بعد لوئیسو نے پھر اسی طرح اشارے کئے اور اس عمل کو کئی بار دہرایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اوپر کی چھت والوں کو کوئی مشورہ دے رہا ہے۔ کبھی نرمی سے کہتا تھا "بس کافی ہو چکی! اب مجھے جانے دو"۔ پھر افسوس کرتے ہوئے کہتا تھا "جرمن درندہ اس نازنین کی جان لے کر ٹلے گا"۔

اگرچہ یہ حرکات انتہائے بدمذاقی کی آئینہ دار تھیں لیکن شرفا اور باحیا عورتیں ان سے بہت لطف اندوز ہوتی رہیں۔ اور کسی مدعی اخلاق و تہذیب کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ سچ یہ ہے کہ تہذیب و اخلاق پر ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے۔ اس رات سرائے کی فضا حد درجہ مکدر ہو چکی تھی پھر شراب کے نشے میں مردوں کا تو کہنا ہی کیا باحیا عورتیں بھی شرم کو بالائے طاق رکھ کر بوس و کنار کی باتیں کرنے لگیں۔

کاؤنٹ نے اس طوفانِ بے تمیزی میں اپنی وضعداری اور متانت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ہماری حالت قطبِ شمالی کے ان

مسافروں کی طرح ہے جن کی راہ برف باری سے بند ہو گئی ہو اب خوش قسمتی سے برف کا تودہ کٹ گیا ہے اور راہ صاف ہو گئی ہے۔" لوئیسیو اس اچھوتی تشبیہ پر اچھل پڑا شراب کا گلاس بلند کرتے ہوئے اس نے کہا میں اپنی نجات کی تقریب پر یہ گلاس پیتا ہوں۔ سب نے اس کی تقلید کی یہاں تک کہ بوڑھی راہبہ جس نے کبھی شراب کو نہ چھوا تھا مفت کی شراب یہ کہہ کر غٹ غٹ پی گئی کہ ہے تو لیمونیڈ کی طرح لیکن کچھ نشہ آور ہے۔

سب کو یہ حسرت رہی کہ کاش پیانو ہوتا تو گاتے بجاتے اور رقص کرتے +

کارنوڈے اس دوران میں بالکل خاموش رہا تھا اور گہری سوچ میں پڑا تھا۔ کبھی زیادہ پریشان ہو کر اپنی لمبی داڑھی کو نوچتا تھا۔ آدھی رات کے وقت جب مجلس برخاست ہونے کو تھی لوئیسیو نے شرارتاً اسے گدگدا کر کہا آج خیریت تو ہے یا زبان بندی کا حکم ملا ہے۔ کارنوڈے نے اکڑ کر کہا "تم سب نے ایک شرمناک حرکت کی ہے۔ چلو بھر پانی لے کر ڈوب مرو" یہ کہہ کر اُس نے دروازے کا رُخ کیا اور باہر نکلتے وقت دوبارہ کہا "ڈوب مرو!"

سب کو غصہ آیا کہ اس نے ہماری توہین کی ہے بالخصوص لوئیسیو پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ جب کچھ سنبھلا تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ یار جو کہو بجا ہے۔ لیکن انگور کھٹے ہیں +

دوسرے اس کا مطلب نہ سمجھے تو اُس نے وضاحت کے لئے تمام واقعہ من وعن کہہ سنایا۔ رازِ درون پردہ سن کر سب کھل کھلا کر ہنس پڑے لیکن کاؤنٹ کو یقین نہ آیا۔ اس نے لوئیسیو سے دوبارہ سہ بارہ پوچھا کیا یہ سچ ہے؟ لوئیسیو نے کہا سنی سنائی بات نہیں اپنی آنکھوں کی دیکھی بات ہے۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ طوائف نے اس وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ کہ جرمن کو خبر ہوئی تو فرانسیسیوں کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔ اب آپ سمجھے کہ کارنوڈے صاحب آج کیوں اتنے مغموم تھے؟ یہ کہہ کر لوئیسیو پھر ہنس پڑا اور کاؤنٹ اور کارے ماماددں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے پھر مجلس برخاست ہوئی اور سب اپنے اپنے کمروں کو چلے۔ مادام لوئیسیو نے موقع پا کر اپنے خاوند سے کہا۔ مادام کارے لاماددں آج مصنوعی ہنسی ہنس رہی تھی وہ تو فوجی افسروں پر مرتی ہے اور اس کے لئے فرانسیسی اور جرمن کی کوئی تخصیص نہیں۔ اسے تو ارمان ہی رہا کہ جرمن نے اسے کیوں پسند نہ کیا۔

مخمور فرانسیسیوں کی سرگرمیاں صبح تک جاری رہیں۔ شمپین تمام رات اپنا اثر دکھاتی رہی۔

اگلی صبح گاڑی دروازے پر تیار کھڑی تھی۔ مسافر بھی سامان باندھ کر تیار ہو گئے سب آگئے سوائے "دبنی" کی وجہ سے تھی۔ وہ سب سے آخر میں شرماتی لجاتی آئی۔ اسے دیکھ کر سب نے پیٹھ موڑ لی جیسے دیکھا ہی نہیں۔ کاؤنٹ نے اپنی بیوی کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف کو ہٹا دیا تاکہ نجس طوائف کہیں اس کے لباس سے چھو نہ جائے۔ "دبنی" ایک منٹ کے لئے ٹھٹک کر رہ گئی۔ پھر دل کڑا کر کے کاؤنٹس کو سلام کیا۔ اس شریف زادی نے فرطِ غرور میں سر ہلایا اور غضب آلود نظروں سے اس دخترِ گناہ کو دیکھا۔ دوسرے مسافر بھی اپنے اپنے کام میں اس قدر منہمک معلوم ہوتے تھے کہ کسی کو اس سے بات کرنے کی فرصت نہ تھی۔ دوسرے انہیں یہ ڈر تھا کہ اس کے ساتھ لگ کر ملوث نہ ہو جائیں۔ سب کے سب دوڑ کر فٹن میں جا بیٹھے تاکہ انہیں اس آبرو باختہ عورت کے ساتھ نہ بیٹھنا پڑے۔ سب سے آخر میں "دبنی" اسی جگہ آکر بیٹھ گئی جہاں وہ سفر کی پہلی منزل میں بیٹھی تھی یعنی بیاہتا عورتوں سے الگ سماج کے باغی کارنوڈے کے ساتھ۔

بیاہتا عورتوں کے رویہ سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو انہوں نے طوائف کو دیکھا نہیں اور اگر دیکھا ہے تو پہچانا نہیں۔ البتہ مادام لوئیسیو نے اپنی بلند آواز میں شوہر سے کہا اچھا ہوا کہ وہ بیسوا میرے پاس نہیں بیٹھی۔ فٹن آہستہ آہستہ چل دی۔ پہلے تو سب خاموش رہے۔ پچھلی شب کی ذلت کے بعد طوائف کی آنکھیں نہ اُٹھتی تھیں اور اسے اپنے رفقائے سفر کی منافقت پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا۔ کہ انہی کی خاطر میں جرمن درندے کی خواہشات کے آگے جُھک گئی اور یہی مجھے حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

کاؤنٹس اور سوداگر کی بیوی اپنی عالی نسب سہیلیوں کی باتیں کرنے لگیں اور کاؤنٹ اور موسیو کارے لاماددں سرمایہ، سود، منافع اور حصص کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے لگے۔ لوئیسیو جو چلتے وقت سرائے سے تاش کا ایک دستہ چرا لایا تھا اپنی بیوی کے ساتھ بزیق کھیلنے لگا۔ راہبہ اور اس کی چیلی تسبیح گردانی اور تسبیح خوانی میں منہمک ہو گئیں۔ ان میں مقابلہ ہو رہا تھا کہ کس کی دعائیں جلد ختم ہوتی ہیں۔ کارنوڈے اپنے خیالات کے سیلاب میں گم ہو گیا۔

اسی طرح تین گھنٹے گذر گئے۔ لوئیسیو نے تاش سنبھال کر کہا مجھے تو بھوک لگی ہے۔ مادام لوئیسیو سرائے سے گوشت بھنوا کر ساتھ لائی تھی دونوں میاں بیوی اکٹھے کھانے لگے۔ کاؤنٹس نے اپنے شوہر سے کہا آؤ ہم بھی کھانا کھا لیں۔ اُس نے کہا دیر ہی کیا ہے۔ کاؤنٹس اور مادام کارے لاماددں نے سالم

خرگوش پکوائے تھے۔ سرمایہ دار اپنی بیویوں کے ساتھ کھانے میں شامل ہو گئے۔ بوڑھی راہبہ نے بھی کباب نکالے اور اپنی چیلی کو دعوتِ طعام دی۔ کارنوڈے نے دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنی جیبوں سے سامانِ رسد نکالا۔ اس کے پاس چار ابلے انڈے اور ایک روٹی کا ٹکڑا تھا۔ وہ اپنی طبعی بے تکلفی سے انڈے کھاتا گیا۔ اور سالن کی زردی سے داڑھی کو رنگین کرتا گیا۔

پچھلی رات کے ہنگامے نے "دنبی" کی قوتِ فکر کو معطل کر دیا تھا۔ صبح اُسے سدھ بدھ نہ تھی اور زادِ سفر کا خیال نہ رہا تھا۔ اپنے رفقا کو دادِ کل و شرب دیتے دیکھ کر وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ غصے سے دیوانی ہو گئی تھی اُس نے ان منافقوں کی کمینگی وا نکشاف کرنے کے لئے منہ کھولا۔ جی چاہتا تھا کہ گالیوں کا ایک تار باندھ دے لیکن جذبات کے امڈتے ہوئے طوفان نے زبان بند کر دی۔ کسی نے اس کی پروانہ کی اور نہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ ان کمینوں کے رویّے سے زندہ درگور ہو رہی تھی۔ ان شریف کمینوں نے اسے قربانی کا دنبہ سمجھ کر ہوس ران جرمن کے حوالے کر دیا تھا۔ اور اب ایک نجس مردار کی طرح ایک طرف کو پھینک دیا۔ وہ اس خیال سے جل رہی تھی کہ چند دن پہلے انہی مہذب وحشیوں نے اس کے دیگچے پر خوانِ یغما کی طرح ہاتھ صاف کیا تھا۔ اس کی بھنی مرغیوں کو چٹخارے لے لے کر کھایا تھا اور اس کی شراب کو شیرِ مادر سمجھ کر اپنے اوپر حلال کیا تھا۔ بہت مشکل سے اپنے غصّے کو دبایا مگر آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن آنسو تھمنے ہی میں نہ آتے تھے اس کے سرخ رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ آنسوؤں کے قطرات اس کی پلکوں اور رخساروں پر چمکنے لگے۔ اور چند قطرے اس کے لباس پر ڈھلک آئے۔ اس نے آنسو پونچھ کر دوسروں سے اپنی حالت چھپانی چاہی لیکن کاؤنٹس نے دیکھ لیا۔ اور اپنے شوہر کو آگاہ کیا۔ اس نے اس طرح سر ہلایا گویا ہمیں اس سے کیا؟ ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ مادام لوئیسو نے طنزاً کہا "یہ اشکِ ندامت ہیں۔" راہبہ عورتوں نے بچے کھچے کباب احتیاط سے کپڑے میں لپیٹ لئے اور عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ کارنوڈے انڈے ہضم کر رہا تھا۔ اس نے پاؤں پھیلائے اور انقلابی گیت گانے لگا۔ جمہوری ترانہ سن کر سرمایہ دار جھلا اٹھے اور آستینیں چڑھا کر لڑنے کو تیار ہو گئے لیکن کارنوڈے بےخوف و خطر گاتا گیا"

کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو — ہلا دو۔ ہلا دو

آزادیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

مٹا دو۔ مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جلا دو۔ جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

اٹھا دو۔ اٹھا دو

برف جم کر سخت ہو گئی تو فٹن زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔ کارنوڈے کا گانا زیادہ بلند ہو گیا۔ جتنی دیر سفر جاری رہا وہ اس انقلابی گیت سے اراکینِ شرفا کی سمع خراشی کرتا رہا گویا ان کے متکبرانہ رویہ کا انتقام لے رہا ہے۔ وہ اس گیت کا ہر مصرع اور ہر لفظ ایک میخ کی طرح ان کے دماغ میں ٹھونک دینا چاہتا تھا۔ اس دوران میں "دنبی" لگاتار روتی رہی اور جب کارنوڈے کا تانگا تار رک جاتا تھا تو اس بدقسمت عورت کی دلخراش آہیں تاریکی میں سنائی دیتی تھیں۔

(مولسیاں) — عطاءاللہ کلیم

خودکشی

ہاں میں نے بھی سنا ہے تمہارے پڑوس میں
کل رات ایک حادثۂ قتل ہو گیا!

ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ اک جام زہر کا
دو جیونوں کی ننھی سی نَو کا ڈبو گیا!

کوئی دکھی جوان وطن اپنا چھوڑ کر
اپنی سکھی کے ساتھ کسی سمت کو گیا!

دنیا کے خارزار میں سو ٹھوکروں کے بعد
یوں آخر اُن کا قصۂ غم ختم ہو گیا!

یوں طے کیا اُنہوں نے محبت کا مرحلہ
ایک ایک گھونٹ! — اور جو ہونا تھا ہو گیا!

کچھ کہنے پائی ہی تھی کہ خاموش ہو گئی
کوئی جواب دینے ہی کو تھا کہ سو گیا!

پیمانۂ اجل کا وہ تلخابہ اس طرح
روحوں کے زخموں سینوں کے داغوں کو دھو گیا!

اکثر یونہی ہوا ہے کہ اُلفت کا امتحاں
دشواریوں میں موت کی آسان ہو گیا

عشق ایک اور چیز ہے زیست ایک اور چیز
ہاں وہ جو اِس کو پا گیا وہ اُس کو کھو گیا،

آؤ کہ ہم بھی توڑ دیں اس دامِ زیست کو!
سنگِ اجل پہ پھوڑ دیں اِس جامِ زیست کو

مجید امجد

چھ نظمیں

نقشِ پا

بتاؤں کیا تجھے ہمدم،
میں اکثر چاندنی راتوں میں کیوں بےتاب رہتا ہوں۔
مرے دل کی تمنّا ہے،
ہزاروں میل کی یہ دوریاں اک پل میں طے کر کے
کوئی اُس ساحلِ دریا پہ جا پہنچے؛
جہاں اب تک نشاں ہوں گے،
مری محبوبۂ اختر جبیں کے شوخ قدموں کے۔
کوئی اے کاش لے آئے
وہ ذرّے،
جن پہ ہیں اب تک نشاں اُن شوخ قدموں کے۔
وہ نقشِ پا — وہ دلکش پھول — وہ گوہر اُٹھا لائے

محبّت کی خوشبو

چھوٹی سی ندّی کے کنارے
سامنے میرے تو بیٹھی تھی
بید کی اک پتلی سی ٹہنی
ہلکی ہلکی سرد ہوا میں
تیرے سر پر جھوم رہی تھی
اور تیرے لب کے پھولوں کی
نازک نازک شرمیلی سی
الفت کی خوشبو اے پیاری
میری وفا کو چوم رہی تھی

خوبصورت ہمنشین

اُٹھ مرے ہمراہ چل اے خوبصورت ہمنشیں!
چاند کی کرنوں کی بارش میں مرے ہمراہ چل!
دیکھ جنگل کی بہار،
بیدِ مجنوں کے تلے،
تھام لے اپنا ستار،
گیت اُلفت کے سنا نغمات کی ندّی بہا،
میرے غم کو میرے دُکھ کو آج طوفانِ مسرّت میں بہا،
پھینک دے پھر ساحلِ دریا پہ تو اپنا ستار،
مضطرب ہو کر گلے میں میرے باہیں ڈال دے،
یک بیک پھر مجھ سے ہو جا ہمکنار۔

تیرے دل کی دھڑکنیں سینے میں میرے جذب ہوں،
سرسراہٹ ریشمی ملبوس کی،
ہو مجھے فردوسِ گوش،
تیری شبنمیں سانس میری سانس سے آ کر ملے،
میرے لب،
تیرے لب کی شکّریں خوشبو سے لذّت یاب ہوں
خوبصورت ہم نشیں!
تو کہاں ہے خوبصورت ہمنشیں؟
آہ میں اور میرا مونس یہ چراغ،
کس قدر تنہا ہیں ہم!
سائیں سائیں کر رہی ہے ماگھ کی ٹھنڈی ہوا۔

ستارۂ صبح

صبح کے روشن ستارے
یہ بتا،
کیا ہے تو
میری محبوبہ کی پیشانی کا عکسِ خوشنما؟

خطوط

مرے دل کی تمنّا ہے،
مجھے تو اتنے خط لکھے،
کہ جتنے نیلگوں آکاش پر
روشن ستارے ہیں۔
مرے دل کی تمنّا ہے،
تجھے میں تیرے ہر خط کے،
جواب اتنے لکھوں جتنے،
عرب کے بے کراں صحرا میں روشن ریت کے ذرّے۔

نگاہ کا پھول

اے کاش اُستوار ہو پھر رشتہ چاہ کا
جی تیرے التفاتِ نظر کو ترس گیا،
کب مجھ پہ کوئی پھول گرے گا نگاہ کا؟

مہدی علی خاں

بھوک

"کام ملا؟" بوڑھی بھکارن نے دھوئیں سے کھانستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! جمعدار کہنے لگا۔ پہلے پورے مہینے کی آدھی مزدوری ہم لیں گے اور آدھی صاحب!" جوان مزدور نے ٹھنڈک سے "سی سی" کرتے جواب دیا۔

"کون صاحب؟"

"وہی بڑا میٹ"

"پھر تم نے کہا نہیں کہ تم مہینہ بھر کھاؤ گے کیا؟"

"اس نے کہا ہم کیا جانیں، کمانے آنا تھا تو گرہ گانٹھ میں کچھ رکھ کے آنا تھا!"

"تم نے کہا نہیں کہ اگر تمھارے پاس کچھ ہوتا تو مزدوری ہی کرنے کیوں آتے؟"

"سب کچھ کہا۔ پر اس نے ایک بات بھی نہ مانی۔ بہت گڑگڑایا تو اس نے پر اتنا کہا "اگر پیسے مہینے کی پوری مزدوری نہیں دے سکتے تو تین مہینے تک آدھے آدھے مہینے کی مزدوری دینا پڑے گی۔"

"کتنا ملتا ہے روزانہ؟"

"یہی چھ آنے"

بھکارن دل ہی دل میں کچھ حساب جوڑنے لگی۔ پھر بولی: "تو تم مزدوروں سے تو ہم بھکاری ہی اچھے جو دس بارہ آنے روز کما لیتے ہیں!"

"ہاں ہاں!" مزدور نے بھکارن کی آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے گردن جھکا کر کہا

بھکارن نے دو روپے کرایہ پر کوٹھڑی لے رکھی تھی پکی دیواریں۔ کچا فرش شکستہ چھت۔ آٹھ فٹ چوڑی۔ بارہ فٹ لمبی۔ اسی میں اس کا وہ بوریا تھا جو پلنگ کا کام دیتا اور وہ گودڑ جسے وہ لحاف کی طرح اوڑھتی۔ اسی میں ایک طرف چار رگے رکھ کر اس نے ایک چولھا بھی بنا رکھا تھا جس کے قریب ایک توا تھا۔ ایک مٹی کا گھڑا اور ایک تاملیٹ۔

بھکارن کا سن کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔ یہی چالیس پینتالیس برس کی ہوگی مگر اس کے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کیچڑ بھری تھی۔ اور اس کی ناک بیچ سے دھنسی ہوئی تھی۔ اس کے بال اور اس کے کپڑوں پر جوئیں رینگتی اور کاٹتی پھرتی تھیں۔ وہ ہر وقت میل سے بھرے اور جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے ناخنوں سے یا تو سر کھجاتی یا تن بدن کو نوچتی رہتی تھی۔

مزدور ایک دیہاتی نوجوان تھا۔ سترہ اٹھارہ برس کا سن۔ گندمی رنگ مضبوط ہاتھ پاؤں۔ کان پور گنگا اشنان کے سلسلے میں آیا تھا۔ یہاں کسی نے اس کی جیب کاٹ لی اور وہ پورے دو دن سیوا سمتی کے دفتر اور کوتوالی کا چکر لگاتا رہا۔ پھر جب اپنے پیسوں کے ملنے کی طرف سے مایوسی ہوئی اور بھوک نے بہت ستایا۔ تو کام ڈھونڈھنے لگا۔ سمجھتا تھا بڑا شہر ہے بیسیوں ملیں اور کارخانے ہیں کہیں نہ کہیں پاؤں ٹکانے کی جگہ مل ہی جائے گی۔ مگر ہر جگہ ٹھیکیداروں اور جمعداروں کا دور دورہ تھا۔ کام سے پہلے ان کے حق کی گفتگو چھڑ جاتی اور ہر جگہ سے وہ ٹکا سا جواب پاکر مایوس پھرتا۔ تین دن اسی طرح کام کی تلاش میں گزر چکے تھے۔ اتنے زمانے میں صرف دو مرتبہ ایک آنے کی مزدوری پریڈ کے بازار کے سلسلے میں بوجھ ڈھونے کی مل گئی تھی۔ اس رقم نے دو دن کے چنوں کا ٹھکانا کر دیا تھا لیکن کل دن بھر اس نے بالکل فاقہ ہی کیا اور شام کو وہ بھوک اور تھکن سے مجبور ہو کر اس بھکارن کی کوٹھڑی کے سامنے والے چبوترے پر گر پڑا تھا ——— گو سردی تھی، دسمبر کا زمانہ تھا۔ مگر جوانی کی حرارت نے اسے فالج سے بچا لیا تھا۔ بلکہ وہ شب میں اسی طرح اپنے پھٹے کرتے میں پتھر کے فرش پر تھوڑا بہت سو بھی لیا تھا۔ صبح ہوتے ہی بھکارن اسے جگا کر اپنی کوٹھڑی میں لے گئی تھی۔ اس نے جلد جلد آگ سلگائی تھی۔ اور مزدور نے اس پر ہاتھ پاؤں سینکے تھے۔ پھر بھکارن نے اسے تھوڑے سے چنے دیئے تھے اور وہ انھیں کھا کر بھکارن کی ہدایت کے مطابق اس فیکٹری کے پھاٹک پر سارا دن کھڑا رہا تھا۔ جہاں کے لئے مشہور تھا کہ وہاں مزدوروں کی بڑی مانگ ہے۔

اس وقت وہ وہیں سے ناکامیاب پلٹا تھا۔

"پھر اب کیا کرو گے؟" بھکارن نے پوچھا۔

"کل اسی شرط پر کام کرنا شروع کر دوں گا۔ تین مہینے تک تین ہی آنے روز سہی:

"پر رہو گے کہاں؟"

مزدور نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ آج دفعتاً دوپہر ہی سے ابر گھر آیا تھا۔ بار بار بجلی چمکتی تھی۔ بار بار رعد گرجتا تھا۔ اس وقت ایسی ایک کڑک ہوئی کہ کوٹھڑی کی بوسیدہ چھت سے تھوڑی سی مٹی نیچے آ ہی گئی۔ پھر ساتھ ہی بوندیں ٹپ ٹپ گرنا شروع ہوئیں۔ پھر بجلی چمکی۔ بہت زور کی کڑک ہوئی اور اولے پڑنے لگے۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دس پانچ اولے اس کال کوٹھڑی میں بھی آ پڑے۔

بھکارن نے انھیں جھک کر اٹھا لیا۔ اور "شوشو" کر کے انھیں کھاتے اور کراہتے ہوئے کہا۔

"اب کہاں جاؤ گے یہیں رہو!"

مزدور نے گھبرا کر کہا "یہاں کیسے رہوں گا ماں!" اور اس نے متعجب آنکھوں سے دیکھا۔

بھکارن کے چہرے کی جھریاں قریب قریب مٹ گئیں۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ بالکل اس طرح کی چمک جیسی کسی فاقہ کش کی آنکھوں میں لذیذ غذائیں دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہنس کر بولی:-

"ماں کے بچنے! میں کچھ ایسی بوڑھی بھی نہیں ہوں!"

علی عباس حسینی

پردیسی

جب اودی بدلی برکھا کی دنیا پر آ کر چھا جائے
جب تاریکی کے پردوں سے بجلی رہ رہ کر لہرائے
جب رات کے گہرے سناٹے میں رم جھم رم جھم مینہ برسے
من تنہائی میں گھبرائے جی تم سے ملنے کو ترسے
برسات کی بھیگی راتوں میں پردیسی تم یاد آتے ہو

جب پورب سمت سے نکلا سورج پچھم کا رُخ کرتا ہے
جب شب کے پیمانے میں دن خاموشی کی مے بھرتا ہے
جب ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا ہوا کا دل کو چھو کر چلتا ہے
اک درد سا تن میں ہوتا ہے من دھیرے دھیرے جلتا ہے
تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں پردیسی تم یاد آتے ہو

شبنم جب فطرت کی مقدّس کلیوں کو نہلاتی ہے
جب تاروں کی خوابیدہ محفل برہم ہوتی جاتی ہے
جب ذرّے ذرّے سورج کی کرنوں میں سجنے لگتے ہیں
جب دل کے سارے تار وفورِ غم سے بجنے لگتے ہیں
کوئل کی لمبی تانوں میں پردیسی تم یاد آتے ہو

علی احمد بی اے

دوآتشہ اور ایک رباعی

اُس کے رُخ پہ بھی آخر رنگِ پیچ وتاب آیا
اے دلِ شکستہ کی آہ کا جواب آیا
اِک اُمنگ سی دل میں اُٹھ رہی ہے رہ رہ کر،
کیا کہیں بہار آئی؟ کیا کہیں شباب آیا!
ان دنوں نظرِ ان کی کچھ ستم پہ مائل ہے
مژدہ باد اے حرماںؔ! دَور کامیاب آیا

(۲)

جہاں میں اب کوئی جینے کی راہ بھی نہ رہی
کہ وہ تری نظرِ گاہ گاہ بھی نہ رہی
خیالِ توبہ واُمیدِ عفو کیا کیجے
کہ اب تو طاقتِ ترکِ گناہ بھی نہ رہی
اب اُس کے لطف وکرم کا تو خیر ذکر کجا
ستم یہ ہے کہ ستم کی نگاہ بھی نہ رہی

رباعی

جب آنکھیں وہ رہیں نہ وہ سب رنگیں
اب جلوۂ فطرت سے نہ فردوسِ بریں
[illegible] دن میں اپنا ایک حال تھا
اُٹھتی ہے کہیں نگاہ جاتی ہے کہیں

حرماںؔ خیرآبادی

ہڈیاں اور پھول

آٹھ، نو مہینے کے متواتر استعمال سے میرے بوٹوں کے تلے گھس گئے تھے اور ان میں دو ایک چھوٹے چھوٹے سوراخ پیدا ہو گئے، جن میں سے کیچڑ داخل ہو کر انہیں گیلا کرنے کے علاوہ میری طبیعت کی عیاشی کے ثبوت یعنی ریشمی جرابوں کو خراب کر دیا کرتا۔ ایک قسم کی لجلجاہٹ کی کیفیت میں میرے حواس خمسہ اپنے پاؤں اور ان میں لتھڑے ہوئے کیچڑ میں سمٹ آتے۔ میرے دماغ میں کوئی نازک خیال جگہ ہی نہ پا سکتا۔ گویا میرا دماغ ایک ناقابل گزر دلدل بن گیا ہو۔

اس وقت میں ڈرتا ڈرتا ملم کے پاس گیا۔ ملم، جیسا کہ میں اسے بطور ایک پڑوسی کے جانتا تھا۔ ایک تنہائی پسند غصیلا موچی تھا۔ وہ کئی بار اپنی بیوی کو پیٹا کرتا شاید اسی لئے وہ بیزار ہو کر بچوں سمیت میکے بھاگ گئی تھی۔ اور وہاں سے اس نے آج تک رسید کا خط بھی نہ بھیجا تھا...... ملم کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی جس میں دو تین کاریگر ایک مٹی کے تیل کے پرانے لیمپ کے نیچے پتنگوں اور پروانوں کی بارش کے باوجود بہت رات گئے تک بیٹھے کام کیا کرتے تھے۔ اور مجھے اپنے چوبارے پر سے فیکٹری کے ٹوٹے ہوئے روشن دانوں میں سے نظر آیا کرتے۔

ملم کے علاوہ اس وسیع کالی باڑی میں کوئی اور موچی تھا بھی نہیں اور ملم بھی عام موچیوں کی طرح کالی باڑی میں سے گزرنے والے ہر راہرو کے پاؤں کی طرف دیکھا کرتا اور بوٹ کی پالش کے حساب سے بوٹ والے کی مالی حیثیت کا اندازہ لگاتا۔ حالانکہ وہ عام موچیوں کی طرح نا سمجھ آدمی نہیں تھا۔ اور جہاں تک مجھے علم تھا وہ کچھ لکھ پڑھ بھی لیتا تھا۔ اس کے باوجود اسے بھی بوٹ ہاتھ میں لیتے ہی بیس کے قریب مرمت طلب جگہوں کی طرف اشارہ کرنے کی عادت تھی ——— یہاں سلائی ہو گی۔ یہاں بھی سلائی ہو گی۔ اس جگہ اسٹار لگیں گے۔ اور یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد ایڑیوں میں تپا لگے گا۔ اور اس تپا کے لفظ سے مجھے بہت چڑ تھی۔

کالی باڑی کے بازار میں ڈونگر محلہ کے سب کتے اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کی دُم سونگھ رہے تھے اور ملم اپنی آر کو ایک کھردرے، خام چمڑے میں دیئے نہایت دلچسپی سے ان آوارہ کتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے ایک رازدارانہ لہجے میں صرف اس لئے کلام کیا کہ شاید وہ اس طرح مزدوری کم طلب کرے گا۔ اور کیا معلوم جو وہ تپے کا ذکر ہی نہ کرے۔

"ان کتوں کا آپس میں تعارف ہونے کا ڈھنگ بھی عجیب ہے۔" میں نے ضرورت سے زیادہ ہنستے ہوئے کہا۔

ملم نے بھی اپنے دانت دکھا دیئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ گویا وہ کاروباری طور پر مجھ سے افضل ہے اور میری اس رمز کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ صندوقچی میں سے کیل، تسلی اور موم تلاش کرنے لگا۔ اس وقت دوپہر کا وقت تھا۔ اور کاریگر روٹی کھانے کے لئے کہیں گئے ہوئے تھے۔ پرانے اور خام چمڑے کے سیکڑوں ٹکڑے ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ ملم نے آر اٹھائی اسے پتھر پر رگڑا اور میرے بوٹوں کی سلائی شروع کر دی۔

ملم کی خاموشی کی وجہ سے میں سلسلۂ گفتگو روا نہ کر سکا۔ کچھ دیر بعد اپنی روئی دار بنڈی کے سوتی بٹن بند کرتے ہوئے وہ خود ہی بولا۔

"ان کتوں کو دیکھ کر مجھے اپنے گھر کی بات یاد آ گئی۔ بابو جی"

میں تجسس کی وجہ سے خود ہی ملم کی بھاگی ہوئی بیوی کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن جب ملم نے ہی وہ سلسلہ چھیڑا تو میں نے رسمی طور پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کتوں سے؟ ——— گھر کی بات؟"

ملم کچھ جھینپ سا گیا۔ اور دوسرے بوٹ کے لئے تلا تلاش کرنے کو صندوقچی پر ضرورت سے زیادہ جھک گیا۔ میں نے یہ ظاہر کیا۔ جیسے میں اس کی بات بہت دلچسپی سے نہیں سن رہا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس صورت میں وہ غصیلا موچی اپنے من کی بات کہہ دے گا۔ چنانچہ اس نے تسلی پر موم رگڑنے سے پہلے احتیاطاً ایک بار میری طرف دیکھا۔ اور مجھے اپنی دیاسلائی اور سگرٹ میں نیم متوجہ پا کر بولا:-

انہیں کتوں کو دیکھ کر گھر والی نے ابھی بات کی جو ان دنوں مجھے بہت ستاتی ہے

میں اس سے نمونہ جلا کٹا ہی رہتا تھا۔ اُسے ذرا ذرا سی بات پر پیٹا کرتا۔ اور کہتا، ہڈیاں توڑ دوں گا تیری۔ حالانکہ وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچ ہی تو رہ گئی تھی۔ اور اس کے منہ پر سرسوں کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس دن بھی دو گھر محلہ کے سب کتے کالی باڑی کے اس بازار میں چلے آئے تھے اور ایک بڑا سا کتا ایک مریل ماری کتیا کے سامنے اپنی دُم ہلا رہا تھا جیسے بڑا پیار جتا رہا ہو۔ اور گوری تو جانے کا کیا سمجھتی تھی۔ وہ وہاں سی جگہ، اسی دہلیز اسی دروازے کا سہارا لئے کھڑی مسکراتی رہی۔ پھر سامنے کتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"دیکھو تو وہ کیسے دم ہلا رہا ہے"

اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک تنومند کتا بھی کُتیا کے بدصورت ہو جانے پر اس کی محبت کا دم بھرے جاتا ہے۔ تو کیا تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے؟ تم جو ایک شرابی اور بدصورت آدمی ہو۔ رنگ تو جی کے ساتھ لگا ہی ہوا ہے۔ اور پہلے میں کتنی تندرست ہوا کرتی تھی۔

اس کے بعد وہ کُتا غرانے لگا اور اپنے اگلے پنجوں سے مٹی کرید کر پیچھے کی جانب پھینکنے لگا۔ شاید وہ اپنے رقیبوں کو مقابلے کے لئے اکسا رہا تھا لیکن میں نے گوری سے کہا "دیکھو تو وہ کتنی نفرت کا اظہار کر رہا ہے ——— اسے بھی یہ مریل ماری مریل مادہ پسند نہیں"

اس کے بعد وہ چُپ ہو گئی۔ پھر جیسے کہ اس کی عادت تھی سامنے چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس چارپائی پر جس کے نیچے شراب کے خالی پوتے اور ادھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے کترے ہوئے یا ادھ ٹوٹے کاگ پڑے ہیں۔ وہ ایک گیت گنگنانے لگی جس میں ایک آدمی اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تُو تو میرے لئے بلائے جان ہو گئی ہے۔ ایک دفعہ تو مر جا۔ مجھے رنڈوا ہونے کا بڑا شوق ہے۔ بابو جی اس گیت کا مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے۔ میں اس وقت گا کر نہیں سنا سکتا۔ اور مجھے ابھی دوسرا تلا بھی لگانا ہے ——— اور ہاں شاید آپ کو بھی ڈاکخانے جانا ہوگا۔

میں نے بوٹ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ خاموش طبیعت موچی آج کتنا باتونی ہو گیا ہے۔ اور باتونی مزدور کام اچھا نہیں کرتے پھر بھی میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "نہیں تو ظلم ——— مجھے آج چھٹی ہے"

ظلم نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ آدمی کہتا ہے۔ تو اپنے میکے جا کر مرنا۔ پھر میں وہاں تیرے پھول چننے اور تیری موت پر افسوس کرنے کے لئے آؤں گا۔ وہ جواب دیتی ہے تم ہرگز ہرگز وہاں نہ آنا۔ میں مر گئی ——— ماں باپ کی چندن کی شہتیری بہ گئی۔ تمہارا کیا گیا۔ اور اس کے بعد قضا کار وہ مر جاتی ہے۔ تو وہ اس کی سمادھ پر جا کر کہتا ہے۔

گوری، ایک دفعہ تو بول۔ دیکھ میں کتنی دھوپ میں کتنی دور سے پا پیادہ تیری سمادھ پر آیا ہوں۔ جنڈ کی چتکبری چھاؤں موت کی آواز بن کر کہتی ہے۔ گوری، ایک دفعہ تو جی لے۔ میں نے رنڈوے ہو کر بہت دکھ پایا ہے۔

اس کے بعد ظلم نے میرے جوتوں کی سلائی چھوڑ دی۔ اپنی پگڑی سے پلّو اُتارا۔ اور اس سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔ جذبات کی رَو میں میری آنکھیں بھی نمناک ہو گئی تھیں اس وقت میں گیت کی افسانوی قیمت پر غور کر رہا تھا کہ ظلم نے ایک ایسی بات بتائی جو انسانی فطرت پر ایک طنز ہے۔ وہ یہ کہ جب اس کی بیوی دلہن بن کر آئی تو ظلم اُس کی جوانی اور خوبصورتی کی بے طرح پاسبانی کرنے لگا۔ وہ اسے دروازے میں بھی کھڑی دیکھتا تو پیٹنے لگتا۔ یہ شک و شبہ کی عادت اب تک باقی تھی۔ اس وقت جبکہ گوری کا جسم توانا اور بھرا ہوا تھا۔ وہ اسے کہتا رہا۔ مجھے ایک پتلی۔ نازک عورت پسند ہے اور جب وہ دبلی ہو گئی تو کہنے لگا۔ مجھے تم سی مریل عورتوں سے سخت نفرت ہے۔ یہ ان ہی دنوں کی بات تھی جب وہ کتوں والا واقعہ پیش آیا تھا۔

موچی کی ان سب باتوں سے میں نے یہی اخذ کیا کہ گوری آخر میکے جا کر مر گئی ہوگی۔ آخر ظلم کے اتنا جذباتی ہو جانے کا کیا سبب؟ اس وقت مجھے وہ کہانی نامکمل سی دکھائی دی اور میں نے چونکتے ہوئے کہا "پھر اس کے بعد کیا ہوا ——— تم نے بات تو ختم ہی نہیں کی"

ظلم بولا۔ اس تین چار ماہ کے عرصے میں اُدھر سے کوئی خط نہیں آیا۔ وہ پہلے ہی بہت بیمار تھی۔ مر گئی ہوگی۔ سنتان پور یہاں سے تین چار سو کوس دُور پورب دیس میں ہے۔ اپنا تھوک ڈاک خانہ لگتا ہے۔ میں وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں میرے پاس کرایہ تک نہیں ہے۔ میرے غصیلے پن سے سبھی نالاں ہیں۔ کوئی مجھے مانگے کی ایک کوڑی بھی تو نہیں دیتے ہے یہاں شراب کی کچھ بوتلیں پڑی ہیں اور بس۔ بابو جی میری خواہش ہے۔ میں ایک دفعہ وہاں افسوس کرنے کے لئے تو چلا جاؤں!

لیکن ظلم کا وہ خیال خام تھا۔ اس چمڑے کی طرح خام جو اس نے باتوں باتوں میں میرے بوٹ کے پیچھے لگا دیا تھا اور جو ایک ہی مہینے میں گھس گیا۔ اس ایک مہینے کے اندر ظلم ایک دن میرے پاس بھاگتا ہوا آیا۔ میں اس وقت چوبارے کے چھجے پر بیٹھا کاٹھ کے جنگلے پر ٹانگیں لٹکائے پڑھنے کی بجائے کتاب کے ورق اُلٹ رہا تھا۔ ظلم نے ایک ہاتھ اونچا کیا۔

"خط ہے ——— بابو جی ایک خط ہے" وہ کہہ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے چوبارے پر سے اتر کر خط پڑھا۔ سنتان پور سے آیا تھا

تم کر ایک ڈرامے کی مورت بنی تھی۔ اس فضا میں گوری کے متعلق کئی قصے مشہور تھے۔ چھاچھ کے استعمال سے خوبصورت ہو گئی تھی۔ اور چہرے کی جھریاں بعد واپس آ رہی تھیں۔ چہرے کا چاند ہو گیا ہے کوئی ایرانی شہزادی معلوم ہوتی ہے۔ خود کرشن مہاراج جنہوں نے کسی جھاڑی کے کنارے بنے ہوئے گڑھے میں بھرے ہوئے پانی کے اندر چاند کا عکس دیکھ لیا تھا، تم سے زیادہ نہیں بچے۔ ایسی چیز تی کو گوارا کرنا ضروری تھا۔

خدا بے کار آدمی کو کام دے! میں ان دنوں اپنے چوبارے میں بیٹھا تم کی فیکٹری کے ٹوٹے ہوئے روشن دانوں میں سے تم کی سب حرکات دیکھتا رہتا۔ جب اس کے ساتھ کام کرنے والے کاری گر چلے جاتے تو تم ایک کھونٹی پر لٹکے ہوئے چھنے کو اتار لیتا۔ اور بڑے آجڈ، وحشیانہ انداز سے اسے پیار کرنے لگتا۔ جیسے کوئی ننھی منی سی لڑکی گڑیا سے کھیل رہی ہو۔ اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر اس بے جان گڑیا سے ہزاروں بے معنی باتیں کر لیتی ہو۔ چھنے کے علاوہ گوری کوئی میلا کچیلا دوپٹہ اُنگنی پر بھول گئی تھی۔ تم اسے اتار کر اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچنے لگتا۔ بیوی، اور اس کے بعد اس کا چھنا اور پھر دوپٹہ، اور چند بوتے تم کی محدود کائنات تھی غصیلا اور لڑاکا ہونے کی وجہ سے کوئی اس کے پاس تک نہیں پھٹکتا تھا۔ گوری نے میکے جا کر اسے خوب ہی سزا دی۔ اور اپنی بیماری کا کیا سہل علاج دریافت کر لیا تھا چھاچھ!

میں سوچنے لگا۔ اب تم نے گوری کی قدر پہچانی ہو گی۔ اور جب وہ چترتی کے بعد واپس آ جائے گی، تو وہ اس کی پوجا کیا کرے گا۔ اس وقت دھوپ کی معتدل حرارت میں مجھے کچھ نیند سی آنے لگی۔ اور میں گوری کے گیت کے متعلق سوچتا ہوا اونگھنے لگا۔ اس وقت ایک خیال میرے دماغ میں آیا —— جیتے جی انسان کے ہڈیاں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد پھول ہو جاتے ہیں۔

چترتی کے تیسرے روز تم کی بیوی کو آنا تھا۔ اس دن تم نے فیکٹری کے تمام مزدوروں کو چھٹی دے کر اپنے احمقانہ پن اور جلد بازی کا ثبوت دیا۔ وہ خود تمام دن گاڑی کے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ اس دن تم نے روز کے نشے میں سے آدھ سیر جلیبیوں کی گنجائش نکالی اور ایک آب خورے میں آدھ سیر دودھ ملا کر چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ اور بلی کے ڈر سے موری کے منہ پر چھوٹی چھوٹی اینٹیں لگا دیں۔

گذشتہ دنوں میں ڈونگر محلے کے چھوکروں اور کالی باڑی کے چیتھڑے پہنے ہوئے اور باسودوں کے لڑکوں نے جو گلیاں اور گیند اُڑاتے ہوئے روشن دان سے تم کی فیکٹری میں جا پڑے تھے نہیں چھو کر دل سے ڈر سے مانگنے کی جرأت ہی نہ کی تھی۔ اکیلا تم ہی اپنی گوری کے آنے کا منتظر نہیں تھا۔ وہ بچے بھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اور آج تم کے گھر کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ کب وہ آئے گی اور گلی دے گی۔ پڑوس کے نابینا استاد کی لڑکی ثریا کئی دفعہ پوچھ چکی تھی "خالہ کب آئے گی؟" گوری محلے پڑوس کی سب عورتوں سے میل جول رکھتی تھی۔ وہ ثریا کا سر دیکھ دیا کرتی تھی جس میں پانچ سالی لیکھیں پڑ گئی تھیں۔ فیکٹری کی پشت کی جانب جوالا پرشاد کا گھر تھا۔ وہ ابھی ایک دن کے نوٹس پر تبدیل ہوا تھا تو تم کی بیوی نے ایک دن میں اس کے تین درجن کے قریب کپڑے دھو ڈالے تھے۔ یہ سب کے سب چترتی سے تیسرے روز کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ بار بار گوری کے متعلق پوچھتے تو تم کو اپنی نامقبولیت کے مقابلے گوری کی مقبولیت کا احساس ہوتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا۔ شاید یہ سب کچھ گوری کی خوبصورتی کی وجہ سے ہو گا۔ عورتیں بھی تو عورتوں پہ عاشق ہو جاتی ہیں۔ اس کی سہیلیاں بن جاتی ہیں۔ اور اس کے ارد گرد منڈلاتی ہیں۔ پھر اُس میں حسد و رقابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ اور جب کبھی کوئی نوجوان پڑوسی اس کے گھر کے متعلق بات کرتا تو تم نہایت شک و شبہ کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا۔ اسی لئے میں نے گوری کے متعلق کسی قسم کی گفتگو کو یادداشت سے احتیاطاً خارج کر دیا تھا۔ حالانکہ مجھے بھی خواہش تھی کہ میرے چوبارے کے سامنے تھوڑی سی رونق ہو جائے اور اس سونی فیکٹری کے اندر سے ایک پتلی سی خوبصورت آواز آیا کرے۔ ایک دم سے پھول سا چہرہ دکھائی دے اور چھپ جائے۔ گوری کے چلے جانے کے بعد مدت تک میں اس خلا کو محسوس کرتا رہا تھا۔ اس حالت میں یہ کمی تم کو کیسے اکھرتی ہو گی۔ تم کو جس کی گوری اپنی ملکیت تھی۔ اور جسے اس پر بجا غرور تھا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر آج شاید پہلی دفعہ تم میں چڑچڑاپن چھوڑ دینے اور ہر کسی سے میل ملاپ رکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بچوں کی گلیاں اور گیند اٹھائے اور میدان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دے دیئے۔ پھر اس نے ثریا کو بلایا۔ اس کے ساتھ دو تین اور چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی تھیں۔ تم نے جیب میں سے اکنی نکالی اور اسے ثریا کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بزرگانہ شفقت سے بولا:۔

"—— یہ خرچ کر لو، لیکن دیکھو بیٹا! —— تیل کی چیز مت کھانا"

اس "تیل کی چیز مت کھانا" میں زندگی، اچھی زندگی۔ اور اس کی متعلقہ رجائیت سے ایک غیر مشروط صلح کا جذبہ ظاہر تھا۔ اس دن تم اسٹیشن پر بیوی کو لینے گیا۔ اور جب شام کو واپس آیا تو اس کے ساتھ کوئی عورت نہ تھی۔ وہ یوں ہی مغموم اداس واپس چلا آ رہا تھا۔ سلطان پور سے آنے والی گاڑی میں اس کی بیوی نہیں آئی تھی۔

اس دن تم نے بچے ہوئے پیسوں سے شراب منگوائی اور خوب پی۔ اور گلی ڈنڈی کھیلتے ہوئے بچوں کو لپیٹ لپیٹ کر گندی گندی گالیاں دیتا رہا۔ شام کے قریب

اس نے وہ پتے کو اتارا۔ اور اسے آنکھوں سے لگا کر رونے لگا۔ پھر خود بخود اس کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ اس کے باوجود کہ رونے میں مشغول وہ دیوانے کتے کی طرح منہ میں کف پیدا کئے، اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومنے لگا۔ کبھی کبھی چھلے کو اتار کر چوم بھی لیتا۔ مجھے ان روشن دانوں میں سے سب کچھ نظر آ رہا تھا میں نے اپنے کمرے کے ساتھ رہنے والے لسیین کو بھی تلم کی حرکات دکھائیں۔

رات کے نو، ساڑھے نو بجے کا وقت تھا۔ میں اور لسیین چھجے پر کھڑے تلم کو دیکھ رہے تھے۔ بتی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں تلم نے ہمارے دیکھتے دیکھتے سب کپڑے اتار دیئے اور ننگا کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہیں سے اپنی بیوی کی سرخ صدری برآمد کی۔ اور اس جا۔ پائی پر جس کے نیچے شراب کی خالی بوتلیں اور ڈھکنے پڑے رہتے تھے۔ وہ اکیلی صدری پہن کر سو گیا۔

اس کے بعد ایک خط آیا جس میں تلم کی بیوی نے اپنے نہ پہنچنے کی وجہ بتائی تھی کہیں چترتی کے روز بھولے سے اس دہی عورت کی نظر چاند پر پڑ گئی تھی۔ اور اب وہ اُپاسے کر رہی تھی۔

خط میں اور باتوں کے علاوہ ہندوستان پورٹ واپسی کی مقررہ تاریخ بھی لکھی تھی۔ اس دن بھی حسب دستور ڈاکیہ اور دوسرے بچے پوچھنے کے لئے آئے اور ہم نے قصداً اس بات کا تذکرہ نہ کیا۔ اس دن غل پور کے سٹیشن پر کسی لیڈر کو گزرنا تھا۔ اس لئے میں اور لسیین بھی سٹیشن جانے کا ارادہ کر بیٹھے۔

تلم نے اس دن بھی حسب معمول فیکٹری کے کاریگروں کو چھٹی دے دی۔ اور آبخورے میں دودھ منگوا رکھا۔ کاریگر بھی تلم کے اس اضطراب اور اس کی بیوی کے آنے پر نہ آنے کا تذکرہ کرتے ہوئے ہنستے تھے اور ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے تھے۔

شام کے جھٹ پٹے میں تلم سٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ سٹیشن قصبے سے پون میل کے قریب تھا۔ اور ابھی اتنی روشنی تھی کہ راستے میں شاہ جی کے باغ کے سنگترے اور ان کا نارنجی رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ تین چار آوارہ بانو۔ باڑھ کو توڑ کر باغ کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اور ہمارے سامنے کوئی سو گز کے فاصلے پر تلم سر راہ سنگریزوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا اپنی دھن میں جا رہا تھا۔ اس نے سر پہ ایک سرخ بنارسی صافہ باندھ رکھا تھا۔ کبھی تلم گرد و غبار میں ہماری نظروں سے غائب ہو جاتا۔ اور کبھی پھر اس کا بنارسی صافہ دھندلکے کو چیرتا ہوا، ہماری نظروں میں کھبنے لگتا۔

اس دن سٹیشن پہ بھیڑ تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد گاڑی آئی اس کے وسط میں ایک زنانہ ڈبہ تھا۔ اور عورتوں کے ہجوم میں دو تجسس بھری بھوری آنکھیں فکر مندی کے احساس سے پلیٹ فارم پر گھومنے والے خوب صورت سے خوبصورت متمول سے متمول آدمیوں کے گروہ میں ایک بدصورت قلاش اور چپٹے چپٹے آدمی کی جویاں تھیں۔

تلم آہستہ آہستہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اس نے دیکھا گوری کی صحت پہلے کی بہ نسبت بہت اچھی ہو گئی تھی اور اس کا چہرہ شگفتہ پھول کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ لمبے سفر کی وجہ سے تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ آنکھیں چار ہونے پر وہ بے صبری کی کیفیت نہ رہی۔ شاید وہ اپنی کمزوری کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

تلم نے دو ایک میلے کچیلے کپڑوں کی گٹھڑیاں گنوں کی ایک پولی اور چند اور چیزیں اتاریں اور اس کے بعد گوری بھی نیچے اتر آئی۔

چلتے چلتے بھیڑ میں گوری کسی کے ساتھ ٹکرا گئی۔ تلم نے اس واقعے کو دیکھا۔ اس کے علاوہ پل کی سیڑھیوں پر چند ایک بےکار نوجوان کھڑے گوری کو بھی دیکھ رہے تھے۔ جو ایک خاص قسم کی کیفیت میں آندی سی چلی جا رہی تھی۔ تلم نے غصے سے پیچھے دیکھا اور بولا۔

"گوری ——————"

گوری نے کانپ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اور گھونگٹ سر پر ڈال لیا۔

اب آسے راستہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ تلم کے دھوکے میں اس نے اپنا ہاتھ کسی اور شخص کے ہاتھ میں دے دیا۔ یا شاید یہ چترتی کے چاند دیکھ لینے کی وجہ سے تھا کہ تلم نے غصے سے ہکلاتے ہوئے کہا:-

"یہ نئے ڈھنگ سیکھ آئی ہو —————— پھوٹ گئیں میری جان کو دکھ دینے"

...... اُس وقت پل کے پاس ایک مریل سا کتا ایک خوبصورت کتیا کے سامنے اظہار محبت میں دم ہلا رہا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی

جسمِ جاناں

(متفرق اشعار)

لہرا لہرا سا اُٹھتا ہے رہ رہ کر وہ پیکرِ ناز
دُنیا دُنیا ہے یہ ادا عالم عالم ہے وہ بدن

جذبِ حُسن سے کھنچ کے ہوئی ساری دنیا جزوِ بدن
جان اور ایماں کا گاہک جسم کا یہ شرمیلا پن

زفرق تا بہ قدم جسم دل ہی دل ہے تمام
جہاں سے دیکھ اُسے آیا ہوا سا پیار ہے وہ

نکھار اس کے بدن کا فراق کیا کہیئے
زفرق تا بہ قدم خندہ ہائے زیرِ لبی

تمام شبنم و گل ہے وہ جسم سر تا سر
رُکے رُکے سے کچھ آنسوؤں کی رُکی سی ہنسی

زبانِ حال سے اپنا بنانے کا ہے پیام
زفرق تا بہ قدم وہ سپردگی ہے تمام

رگ رگ میں وہ خمار کا عالم کہ تو کہے
سوئی ہوئی ہیں جسم میں انگڑائیاں تمام

اک تھمی لہر ہے کہ جسم اُس کا
لوچ ایسی تو روح میں بھی نہیں

اگر روحانیت میں مادے کی کچھ تجھے شک ہو
لطافت دیکھ لے سر سے قدم تک جسم کی اُس کے

وہ جسم زسرتا پا خود عکس خود آئینہ
کچھ اشک کے قطروں میں موجیں ہیں تبسم کی

نہ وہ دریا نہ وہ گرداب مگر ہائے رے جسم
بھینچ لے جس کو وہ اک بار، ڈبو کر چھوڑے

بدن کی سج کوئی دیکھے تو آنکھ کھل جائے
نگاہیں اُس سے جو مل جائیں روح جاگ اُٹھے

جہاں پڑتی ہیں آنکھیں اُس بدن پر
تبسم ہائے پنہاں دیکھتا ہوں

جسم اُس کا فراق کیا کہیئے
کس قدر نرم جاذبیت ہے

راگ دیپک کا ہے کہ جسم اُس کا
وہ جو آتا چراغ جل جاتے

جسم تیرا ہے بانسری کی تان
تو سراپا ہے شعلۂ آواز

وہ رنگِ رُخ تھا اُٹھائی ہے جب نگاہ اُس نے
شراب جیسے چھلکتے چھلکتے رہ جائے

جگہ جگہ سے وہ گویا ہے بول اُٹھنے کو
بدن ہے سر سے قدم تک تمام جلوۂ رُخ

وہ محویت سے ہے کہ ایسا گمان ہوتا ہے
زفرق تا بہ قدم سوچتا ہے کچھ وہ جسم

فراق گورکھپوری

پانچ نظمیں

منظر

تارِ سازِ حیات گونج اُٹھے دل میں اک حشر ہوگیا برپا
لب پہ ہلکی سی مُسکراہٹ تھی کس نے چلمن سے جھانک کر دیکھا

رشک

آج سے چند ماہ قبل تجھے میں نے دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے
شرم آلودہ ایک بند کلی مثلِ گُل اب تو کھِل گئی کیسے
تُو وہی ہے کہ جس کے سینے پر ایک مصروف خواب تھا محشر
اور اب حشر جاگ اُٹھا ہے یوں جی میں آتا ہے برملا پوچھوں
کس نے بیدار کردیا اس کو!

دل میں چور

مجھ کو پڑھ کر سنا رہے تھے وہ ایک افسانۂ محبت کل
پڑھتے پڑھتے یہ آگئے الفاظ "آہ! تم سے مجھے محبت ہے"
پہلے پڑھنے سے رُک گئیں آنکھیں
اور پھر دیکھ کر مری جانب جانے کیوں اُن کی جھک گئیں آنکھیں

شاید؟

بے قراری کو دیکھ کر میری اے مری جان! بے قرار نہ ہو
اشکباری کو دیکھ کر میری اے مری جان! اشکبار نہ ہو
میں تو ہوں بے قرار تیرے لئے میں تو ہوں اشکبار تیرے لئے
کیا ہے تُو بے قرار میرے لئے! کیا ہے تُو اشکبار میرے لئے!
کیوں نگاہیں جھکا کے اب چپ ہے!

اَن ہونی

دیکھ کے شب کو میں نے تارے کیا کچھ اپنے دل میں سوچا!
کاش یہ تارے جگنو ہوتے! اور میں ناداں بچہ ہوتا
تارے سارے جگنو ہوتے
اور میں، اور میں بچہ ہوتا!
تارے کیونکر جگنو ہوتے؟ اور میں کیسے بچہ ہوتا؟

مسعود شاہد

بنگال کا پہلا شاعر
چنڈی داس

لس نے لیا شیام نام ؟
مجکو یہ بتا سکھی !
کان سے سُنا اسے   دل میں جا بسا مرے
روح پریشان ہوئی

میں یہ نہیں جانتی
کتنی مٹھاس اس میں ہے   کیسے زباں سے ہٹے؟
بول بول ہر گھڑی
میں ہوئی ہوں باؤلی
مجکو یہ بتا سکھی !
کس نے لیا شیام نام؟

یہ بنگال کے پہلے شاعر چنڈی داس کے ایک گیت کا اقتباس ہے۔
سنسکرت شاعر جے دیو۔ میتھالی شاعر ودیا پتی۔ اور دوسرے بے شمار ہندوستانی شعرا کی طرح چنڈی داس بھی رادھے کرشن کا نغمہ خواں تھا لیکن اُس کے اِس گیت کو پڑھ کر اچانک ایک سوال جاگ اٹھتا ہے کہ اس پھیلے ہوئے ہندوستان کے ماضی کی اتھاہ گہرائی میں سب سے پہلے "کس نے لیا شیام نام ؟"

ہاں سب سے پہلے یہ نام کس نے لیا کہ ہندوستان کی آیندہ نسلوں کو رادھا کی مانند ایک بے قرار روح بنا دیا جو آج زمانے کی اتنی تہوں کے باوجود یہ نام دہراتے تھکتی ہی نہیں (اور میں بھی یہ مضمون اس نام کی تحریک دینے والی خصوصیت کے باعث ہی لکھ رہا ہوں!)

درحقیقت تصورات کی پوجا انسان کے خون میں کچھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ اس کی جبلت ہی معلوم ہوتی ہے تصورات تخیل کی پیداوار ہیں۔ خیال کی لہریں، اور اگرچہ خیال اور عمل میں بظاہر ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اور آج کل کے مُنتشک زمانے میں عمل ہی کو اکثر لوگ برتر سمجھتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ عمل بھی تاریخ کے دائرے میں داخل ہوتے ہی محض خیال بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اس لحاظ سے تخیل ہی اس زندگی میں ایک بنیادی چیز ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمل کی ہمیں ضرورت ہی نہیں، خیال انسان کی ذہنی زندگی ہے۔ اور عمل اپنی پائدار صورت کے لحاظ سے بنیادی، اور دونوں کے ملاپ ہی سے مکمل زندگی کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ گویا زندگی کی تکمیل اس چکر سے ہے خیال عمل خیال

لیکن یہ باتیں ہمیں کہیں موضوع سے دور نہ لے جائیں۔ اس لئے جلد ہی گریز کرنا ہوگا ہمیں غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آج تک انسانی زندگی تخیل ہی کے ماتحت ارتقائی منازل طے کرتی آ رہی ہے۔ اور ہر ملک کے تخیل کا سب سے پہلا گہرا اور وسیع نقش اس ملک کی دیومالا ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی دیومالا کے بندھنوں سے کم و بیش رہائی پاتے گئے۔ اور تہذیب کی ترقی انھیں تصورات کی پوجا سے ہٹا کر مادیت کی طرف لاتی گئی لیکن ہندوستان اپنی روایتی سست رفتاری اور حکایت پرستی کے ساتھ اس سلسلے میں بھی اب تک اپنے ابتدائی تخیل ہی کا قیدی ہے۔ مابعد الطبیعات سے اس کا شغف آج بھی ظاہر ہے۔ آج بھی اس کے خاکی اُس قدیم جنت کے تصور ہی کے بل پر زندگی گزار رہے ہیں۔ جسے ان کے ذہنوں نے صدیوں پہلے اختراع کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض باتیں جو ہمیں بظاہر مغرب سے آئی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی آج سے بہت عرصہ پہلے ایک اور رنگ میں پیدا ہو چکی تھیں۔

آج ہمیں والٹ وٹمن کی مفرد جمہوریت" اقبال کا فلسفہ خودی، نٹشے کا مافوق الانسان اور مغرب کے جدید خیالات کے لحاظ سے انفرادیت کی ترقی ایک نئی چیز

معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسی ہندوستان میں آج سے پانسو سال پیچھے بنگال کا پہلا شاعر چنڈی داس ایسے ہی خیالوں کے گیت گاتا رہا ہے۔ چنڈی داس کے اُن گیتوں میں جن کا تعلق سہجیا مسلک سے ہے ایک گیت ایسا بھی ہے جس میں اُن خصوصیات کا ذکر ہے۔ جن کا ہونا ایک انسانِ کامل میں ضروری ہے۔ گویا وہ غالب کی طرح ہی یہ کہہ رہا ہے کہ "آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا ——— ہم سب انسان انسان پکارتے ہیں لیکن بہت کم ہیں جو انسان کی حقیقی خصوصیات سے آگاہ ہیں۔ انسان عالمِ تخلیق کی روح زندہ ہے۔ جوہرِ تخلیق ہے۔ اور ہمارے تخیّل کو ابھارنے والے بہترین اجزا کا مرکب۔ ہم میں سے اکثر اس کے ظاہر کو دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ انسان کی نگاہیں اس بھید تک نہیں پہنچ سکتیں جو انسانیت کی اصلی بنیاد ہے حقیقتاً محبّت ہی انسان کو انسان بناتی ہے۔"

اب خواہ ہم اس محبّت کو "سارے جہاں کا درد" سمجھ کر اخوّت اور جمہوریت کہہ لیں۔ خواہ درد کی دوا اور "درد لادوا" سمجھ کر صرف عشق کہہ لیں جس سے ہم نے "زیست کا مزا پایا"۔

گیارھویں صدی سے پہلے ہندوستانی ادب قدیم کلاسیکی زبانوں ہی میں تھا مثلاً سنسکرت وغیرہ۔ لیکن گیارھویں صدی میں عوام کی زبانوں نے اظہارِ احساس و جذبات کے لئے ایک زبردست تگ و دَو کی۔ عوام کی زبان کو سب سے پہلے شاعرانہ احساس کے اظہار کے لئے پرتھوی راج کے درباری شاعر چند بردائی نے استعمال کیا جس نے ساٹھ بند کی ایک بے حد طویل تاریخی نظم لکھی۔ اور یہ نظم بھی مکمل نہ ہو سکی کیونکہ وہ اسے ادھورا چھوڑ کر مر گیا۔ آگرے کے اندھے شاعر سور داس نے کرشن مہاراج کے سوانح پر ساٹھ ہزار اشعار لکھے۔ اور پھر پندرھویں صدی میں چنڈی داس نے رامی دھوبن کے عشق میں سرشار ہو کر رادھے شیام کے گیت سنائے۔ اور بنگالی زبان کو ایک بولی سے ترقی دے کر ادبی درجے کو پہنچایا۔ بنگالی شاعری کا وشنو دور چودھویں سے سترھویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے جب بدھ مت کو زوال ہوا تو پہلے وشنو کے پیروؤں کے اعتقادات از سرِ نو لوگوں کے ذہنوں پر حاوی ہوئے اور پھر وشنو کے پجاریوں نے اپنے خیالات سے غلبہ پا لیا۔ بنگال کے باشندوں کی زندگی اور ادب پر وشنو مت کا ایک گہرا اور پائدار اثر ہوا۔ وشنو مت براہمنوں کی قدیم خشک ذہانت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی روحِ انسانی کی اُن آرزوؤں سے بھی اسے ہم آہنگی حاصل تھی۔ جو ہمارے دل میں روحِ ازلی سے ملنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ وشنو مت ہی کو بھگتی مذہب کا نام بھی دیا جاتا ہے اس مذہب کا سب سے بڑا دیوتا وشنو ہے۔ وشنو کے اور بھی کئی نام ہیں مثلاً بھاگوت پرشوتم، نارائن، ہری وغیرہم۔ وشنو مت بھارت کے اس مذہبی اور فلسفیانہ طریق یا مسلک کا نام ہے جس کے اصول و قوانین نے وشنو دیوتا کی شخصیت کے گرداگرد نشو و نما پائی ہے۔ پہلے پہل ہندوستانی ذہانت صرف بڑے دیوتاؤں کا تصور ہی باندھ سکی تھی لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے بڑے دیوتاؤں کو بے نیاز قرار دیا۔ اور اس لئے انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی ایسا ڈھب بھی سوچ لیں جس سے دیوتا اور انسان علیحدہ علیحدہ نہ رہیں۔ چنانچہ اوتاروں کا وجود عمل میں آیا۔ یہ سب باتیں وقت کے ایک غیر معیّن اور وسیع دَور میں ہوئیں۔ اوتار کا تصور آتے ہی ہر دیوتا کے کئی اوتار بن گئے جو دنیا کی بری حالت کو سدھارنے کے لئے انسانی روپ میں اس دھرتی پر آیا کرتے تھے۔ وشنو کے ان اوتاروں میں سے رام اور کرشن سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ رام کتھا ایک سیدھا سادا قصہ ہے۔ اور شاید اسی لئے اس میں کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوئی لیکن کرشن کا قصہ رفتہ رفتہ ایک ایسی پیچیدہ صورت اختیار کر گیا کہ آج نہ صرف مذہبی بلکہ تاریخی اور ادبی لحاظ سے بھی تحقیق و دلچسپی کا موجب ہے۔ کرشن کا تصور ابتدا میں بہت سلجھا ہوا تھا یعنی وہ دانائے روزگار جس نے مہابھارت میں گیتا کے چالیس اپدیشوں کی تخلیق کی۔

اب ہم سب سے پہلے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ کرشن اوتار کا تعلق وشنو دیوتا سے کیونکر پیدا ہوا۔ پران ہمیں بتاتے ہیں کہ کرشن کی ماں کا نام دیوکی۔ اور باپ کا نام واسدیو تھا۔ اور یہ واسدیو یادو یا ورشنی نسل کا ایک کنور تھا جس کا قیام متھرا کے قرب و جوار میں تھا۔ اس کے علاوہ پرانوں ہی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کرشن کا ایک بھائی بلدیو بھی تھا۔ پہلی صدی قبل مسیح تک واسدیو اور بلدیو کی پوجا دیوتا کے طور پر ہوتی رہی۔ اور ان کے پجاریوں کو بھاگوت یا بھگت کہا جاتا رہا۔ اُن پجاریوں کے اصولِ مذہبی کو ایکانتک دھرم کہا جاتا تھا۔ اور اس دھرم کی بنیاد اس بھاگود گیتا پر تھی جس کے متعلق آج تک مشہور ہے کہ اس کی تعلیم کرشن واسدیو نے اپدیشوں کی صورت میں دی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ ایکانتک دھرم وشنو اور نارائن کے مروّجہ مذاہب میں گھل مل گیا۔ اور یوں وشنو۔ نارائن اور کرشن کے ناموں میں ایک بنیادی تعلق پیدا ہو گیا ہندوستان میں مذاہب اور ان کے تصورات کی نشو و نما افسانہ در افسانہ ہے "خیز" کی مصداق رہی ہے۔ کئی صدیاں گزر گئیں۔ اور اس مندرجہ بالا ملے جلے مذہب میں ایک اور پہلو پیدا ہو گیا۔ اور یہ پہلو ہمارے ادبی نقطۂ نظر سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پہلو کرشن کے بچپن کا بیان ہے جس میں اس کے بعض حیرتناک کارنامے نمایاں اور گوپیوں سے اس کے تعلقات کا ذکر ہے۔ پران۔ مہابھارت۔ چاندیوگ اپنشد ——— ان تمام ماخذوں میں کرشن کے بچپن اور گوپیوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پہلی صدی عیسوی تک گوکل میں کرشن کے لڑکپن کا تصور ابھی قائم نہ ہوا تھا۔ اور بھاگوت پران میں بھی اس لڑکپن کا صرف ذکر

ہی ہے لیکن باقی وہ لوازم موجود نہیں جو بعد میں شامل ہوئے۔ مثلاً رادھا کا وہاں نام تک نہیں ہے۔ وشنو پران میں بھی رادھا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ وشنو پران وشنومت کی ایک مستند کتاب ہے۔ ابتدائی وشنو ادب میں وشنو دیوتا کی نسائی قوت (پراکرتی) کا نام شری لکشمی اور کملا تو ہے لیکن رادھا نہیں ہے جنوبی ہندوستان میں رامانج نے وشنومت کا احیا کیا لیکن وہ بھی رادھا کا ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ نارائن کی "رفیقہ" کے طور پر لکشمی، بھو اور لیلا ہی کے نام لیتا ہے۔ رادھا کے تصور کی تخلیق بارھویں صدی عیسوی میں ہوتی ہے۔ اس زمانے میں نمبارک نے کرشن اور رادھا کے تصور کو نمایاں اہمیت دی۔ اس کے بعد ولبھ شاعر نے جنوبی ہندوستان میں اس کی پیروی کی۔ اور پھر سولھویں صدی میں بنگال کے صوفی چیتن دیو نے کرشن کے لڑکپن اور اس کی محبوب رادھا کے تصورات کو فروغ دیا۔ اور یوں بعد کے وشنومت میں رادھے شیام کی پوجا سب سے زیادہ امتیاز اور اہمیت حاصل کر گئی۔ اور ادب میں ان تصورات نے جے دیو۔ ودیاپتی۔ چنڈی داس اور دوسرے بے شمار شعراء کے جوہر خداداد کو چمکایا۔

لیکن چنڈی داس نہ صرف رادھے شیام کا نغمہ خوان تھا۔ بلکہ وہ اس فرقے کا بھی سب سے بڑا ترجمان تھا جس کی تخلیق رادھے شیام کی پوجا ہی سے ہوئی۔ اس فرقے کا نام سہجیہ مسلک تھا۔ اب ہم اس مسلک کے اصول و قوانین پر نظر ڈالنے کے لئے ڈاکٹر ڈی۔ سی سین کے بیان کو دیکھتے ہیں۔

جب ہندوستان میں بدھ مت کو زوال ہوا تو یہاں کی ذہنی اور مذہبی زندگی میں ایک التوائی دور نے گھر کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ابھی بدھ مت کے زوال کے بعد ہندو مذہب از سرِ نو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نہ چمکا تھا۔ بدھ مت نے ایک بلند روحانی زندگی کا جو تصور پیش کیا تھا۔ وہ اپنی دوسری حد کو پہنچ کر نفس پرستی کی تخریب آلود صورت اختیار کر چکا تھا۔ خدا کی ہستی پر اعتقاد اور اس کی عبادت کے جو بلند نظریئے ہندو مذہب نے پیش کئے تھے۔ لوگ انھیں بھول چکے تھے۔ اس دھندلکے میں ہندوستان کے ہر فرقے میں ——— خواہ وہ بدھ مت سے متعلق تھا یا ہندو مت سے ——— تانترک لوگوں کے خیالات غلبہ پا چکے تھے۔ وام آچاری تانترک مذہب کے نام پر ہولناک اور گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ یہ تانترک لوگ اپنا ایک وسیع اور واضح ادب ہمیں وراثت میں دے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دھندلے زمانے میں اخلاقیات کا شیرازہ کس بری طرح منتشر ہو چکا تھا۔

سہجیہ مسلک کا ماخذ بھی بدھ مت کے اسی وام آچاری فرقے ہی سے ہوتا ہے۔ بدھ مت کی پاکیزگی، اور بلند روحانیت کا رد عمل تانترک خیالات میں ظاہر ہوا تھا۔ ان لوگوں نے عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا پہلا زینہ قرار دیا لیکن عشقِ مجازی ہی میں اس قدر کھو گئے کہ سماجی اور اخلاقی لحاظ سے لوگوں کے لئے زندگی ایک تلخ حقیقت بن کر رہ گئی۔

بدھ مت کے وام آچاری مکتی کے حصول کے لئے رسموں کے ایک خاص مجموعے پر عمل درآمد کرتے تھے۔ ان رسموں میں نوجوان اور خوب صورت عورتوں کی پرستش اور ان سے "محبت" کی جاتی تھی سہجیہ مسلک والوں نے اپنے اصولوں کی بنیاد ابتداءً اسی خیال پر رکھی تھی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ عورت مرد کی جنسی محبت میں جسمانی پہلو کے علاوہ ایک ایسا روحانی پہلو بھی ہے جو دل دردمند کو عشقِ حقیقی کی طرف مائل کر سکتا ہے لیکن وام آچاری اور چنڈی داس سے پہلے کے سہجیہ طریق کے پیروکار محض مادیت میں ہی الجھ کر رہ گئے تھے۔ اور انھوں نے ان مذہبی اصولوں کو بھی اپنی نفس پرستی کا آلہ بنا رکھا تھا۔

دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں بدھ مت کا ایک مشہور عالم کانھو بھٹ گزرا ہے۔ یہی عالم بنگالی زبان میں سہجیہ مسلک کے عشقیہ گیتوں کا سب سے پہلا نمائندہ تھا جس عشق کا ذکر اس کے گیتوں میں کیا گیا ہے اسے سماج کی رضامندی حاصل نہ تھی۔ اپنی بیوی کی محبت کانھو بھٹ اور سہجیہ والوں کے خیال میں انسان کو تکمیل کے اونچے درجے تک نہیں پہنچا سکتی۔ کانھو بھٹ کے گیتوں میں ایسے مقام بھی آتے ہیں جو عریانی سے بڑھ کر فحاشی کے درجے تک پہنچے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں تصوف کی ایک ایسی روحانی اہمیت موجود ہے جن کی شرح و وضاحت ایک بلند روحانیت کی حامل بھی ہو سکتی ہے۔

بنگال میں بدھ مت کے اثرات کے زائل ہونے کے ساتھ وام آچاری فرقے کے خیالات کا اثر زائل نہ ہو سکا۔ وشنومت کے سہجیہ فرقے والوں نے وام آچاریوں ہی کے پرانے اصولوں کو اختیار کر لیا۔ اور ان کے خیالات وشنومت کے ذریعے سے عوام پر بھی چھا گئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چنڈی داس نے اپنے عشقیہ گیتوں میں کانھو بھٹ ہی کی ترجمانی کچھ اس انداز سے کی کہ اس مسلک پر ایک بلند روحانی رنگ چڑھا دیا چنڈی داس کے بہت سے گیت ایسے ہیں جن سے ہمیں سہجیہ مسلک کے اصول و قوانین کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً

"ہر شخص سہجیہ کی باتیں تو کرتا ہے لیکن افسوس! کوئی بھی اس کے اصلی معنی سے واقف نہیں ہے سہجیہ کا نور صرف اسی شخص تک پہنچ سکتا ہے جس نے تاریکی کے خطے کو پار کر لیا ہو" (یعنی جذبات پر قابو پا لیا ہو)

سہجیہ مسلک کے اصولوں کی اشاعت کے سلسلے میں چنڈی داس نے جو گیت لکھے ہیں ان میں بعض جگہ ابہام یا استعاروں کا عام الجھاؤ اس قدر بڑھ گیا

ہے کہ بعض باتیں پہیلیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ اور یہ خصوصیت سہجیہ کے دوسرے ادب میں بھی نمایاں ہے لیکن چنڈی داس کے ایسے گیت ابہام کے باوجود اس کے اپنے اعتقادات کی پوری شرح کر رہے ہیں۔ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"عورت کو ہر لحہ پاک دل رہنا چاہئے۔ اور کبھی بھی اپنے رجحانات کو پستی کی طرف نہ جانے دینا چاہئے۔ یوں تو محبت پر اپنی ہر بات کو قربان کر دے لیکن بہ باطن اسے اپنی محبت کے دو کرنے سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے چھپی ہوئی محبت کو چھپ چھپ کر ہی تکمیل تک پہنچانا چاہئے۔ اس طرح اس کا دل و دماغ، گویا دھل کر پاک و صاف ہو جائے گا لیکن اسے چاہئے کہ وہ کسی بھی حالت میں خواہشات کے سامنے ہار نہ مانے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو تخریب (غلط کاری) کے سمندر میں، نڈھا دھنڈ ڈال دے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے چاہئے کہ وہ بے حد احتیاط کے ساتھ ممنوع ندی کو چھونے سے محترز رہے۔ نیز اسے دکھ سکھ کا کوئی احساس ہی نہ رہنا چاہئے۔ اسے چاہئے کہ دوسرے اس سے برائی کریں تو کریں۔ وہ اپنے آپ سے سچی رہے۔"

اس طرح جذبات کے رس میں ڈوب جانا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے آپ کو پستی سے بچائے رکھنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اسی پہلو پر غور کرتے ہوئے چنڈی داس کہتا ہے:۔

———— "سچا عاشق بننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی سانپ کے منہ میں مینڈک کی طرح ناچنا" گویا ایک عاشق خواہ جذبات کے پرخطر کھیل میں کتنا ہی کیوں نہ کھو جائے اسے ضبط نفس کی اہلیت سے دستبردار نہ ہونا چاہئے تشبیہات کی قلابازیاں اس مشکل کو جس قدر بڑھاتی جا رہی ہیں۔ وہ بھی ملاحظہ ہو ———— "ایسی محبت کو وہی حاصل کر سکتا ہے جو سمیرو پربت کی چوٹی کو ایک دھاگے سے باندھ کر لٹکا لے یا کسی ہاتھی کو مکڑی کے جالے سے باندھ کر رکھ دے" یہ تو ہوا ضبطِ نفس کی مشکلات کا حال جس سے ہم بآسانی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کسی عام انسان کے بس کا نہیں ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے غیر معمولی طاقتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ شاعر ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس تگ و دو اور کشمکش کا نتیجہ کیا ہوگا۔

"احساسات اور خواہشات پر قابو پانے اور اس ضبطِ نفس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کرنے ہی سے انسان مکتی حاصل کر سکتا ہے۔"

چنڈی داس کے قول کے مطابق سہجیہ مسلک کے لحاظ سے جو لوگ تربیتِ نفس کرنا چاہیں انھیں اپنے مرکزِ محبت کے انتخاب میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہئے طرفین کے اخلاق راسخ۔ دل صاف۔ اور طبعی رجحان روحانیت کی طرف مائل ہونے چاہئیں۔

"اگر کوئی دوشیزہ جس کا طبعی رجحان روحانیت کی طرف مائل ہو کسی ایسے مرد کو محبت کرنے لگے جو اپنے خصائص میں کم درجے کا مالک ہو تو اس کی حالت بالکل اس پھول کی سی ہوتی ہے جسے کانٹے چھلنی کر دیں اور وہ شکستہ دل مرجاتی ہے اگر کوئی نوجوان کسی کم درجے کی دوشیزہ کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ تو اس کی حالت بعینہ اس شخص کی سی ہوتی ہے جس پر ارواحِ بد نے غلبہ پا لیا ہو۔ ایسا عاشق ہر وقت بے چین رہتا ہے۔ یہاں تک کہ یاس کی تاریکی اس پر حاوی ہو جاتی ہے۔ چنڈی داس کہتا ہے کہ کسی نیک طبع اور اس کے متضاد فطرت شخص کا ایسا ملاپ زبان اور دانتوں کے ملاپ کی مانند ہے کہ اگرچہ یہ دونوں یکجا رہتے ہیں لیکن جب کبھی موقع ملے دانت زبان کو کاٹنے سے نہیں رکتی

محبوب کے اس انتخاب کے بارے میں ہی سہجیہ ادب کی ایک کتاب "گپت سادھن تنتر" میں لکھا ہے:۔

"ناچنے والی عورت، کپالی ذات کی عورت۔ رنڈی۔ دھوبن۔ نائی کی بیٹی برہمن عورت۔ شودر عورت۔ گوالن۔ مالاکر ذات کی عورت ———— یہ نو قسمیں تا مترک لحاظ سے محبوب بنائی جا سکتی ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ ہوشیار ہوں وہ تربیتِ نفس اور روحانی نشوونما کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہو سکتی ہیں، وہ دوشیزائیں جو حسین ہوں۔ خوش قسمت ہوں، جوان اور خوش طبع ہوں ان کی پرستش بہت احتیاط سے کی جانی چاہئے۔ اور اسی ذریعے سے مکتی حاصل کی جا سکتی ہے۔"

چنڈی داس اس عقیدے کا زبردست پیرو تھا کہ جنسی محبت ہی سے خدا کی طرف دھیان لگایا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے:۔

"دوستو! آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ ایک عورت کی محبت سے کیونکر مکتی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اپنے جسم کو خشک لکڑی کی طرح بنا لو۔ تاکہ جذبات اسے تحریک نہ دے سکیں۔ وہ ہستی جو تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ اور کسی کو بھی دکھائی نہیں دیتی۔ اس تک صرف اسی شخص کی رسائی ہو سکتی ہے جو پاک محبت کے بھید کو جان لے۔"

عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کے بارے میں یہ چنڈی داس کے خیالات تھے لیکن ان خیالات کی نشوونما دو وجہوں سے ہوئی۔ ایک تو سہجیہ مسلک کے اصول اور دوسرے شاعر کی محبوبہ رانی دھوبن کے لئے اس کی محبت لیکن ایک بات کا ہمیں خیال رکھنا چاہئے کہ چنڈی داس ایسی غیر معمولی ہستی نے ممکن ہے کہ سہجیا اصولوں کے ماتحت رامی دھوبن کی پرستش کے ذریعے مایا جال سے مکتی حاصل کر لی ہو۔ ہر کسی کے لئے یہ کام ناممکن تھا۔ عام نوجوانوں نے تو ان اصولوں کی پیروی سے اپنے آپ کو اخلاقی لحاظ سے ایک خرابہ ہی بنایا ہوگا۔ ہندو سماج میں آوارہ عورتوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اور بیواؤں کے لئے یا تو ستی کا بھیانک منظر تھا۔ یا اس سے بھی بھیانک پابندیوں کی زندگی۔ بدھ کے پیرؤں نے آوارہ عورتوں اور بیواؤں کے لئے اپنے بھکشوؤں کے دوش بدوش خانقاہیں مقرر

کردی تھیں لیکن یہ قرب جلتی پہ تیل کا قرب تھا۔ انہی لوگوں نے اوّل اوّل اپنی جنسی تسکین کے لئے سہجیہ کے اصول تراشے بلکہ ان کی اندھادھند عشرت پرستی کی وجہ سے لوگوں میں ان کا نام سرمنڈی[1] جوڑی پڑ گیا تھا اور ان کے بعد بھی بدمعاش مرد عورتوں کو اسی نام سے پکارا جاتا رہا۔

وشنو مت والوں نے جہاں بدھ مت والوں سے سہجیہ کے اصول مستعار لئے۔ وہاں انھیں یہ نام مستزاد کے طور پر ملا۔ اس مسلک کا پیرو ہو کر رسوائی سے بچے رہنا بہت مشکل تھا۔ اور ممکن ہے کہ چنڈی داس اس آزمائش میں پورا اترا ہو کیونکہ اس کا تجربہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کے بعد تو یہ مسلک محض عیاشی کا ایک بہانہ بن کر رہ گیا کیونکہ وہ محبت جسے سماج اور مذہب نامنظور کریں۔ ترغیبات کی ایک ایسی آماجگاہ ہے جس میں پنپنا عوام کے لئے ناممکن ہے۔ اور اس لیئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ رادھے شیام کے تعلق کی محض مادی تشریح پر زور دیتے ہوئے وشنو سماج کے نچلے طبقے نے سہجیہ کے اصولوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا چیتن دیو اور وشنو مت کے دوسرے رہنماؤں کو ان خطرات کا کامل احساس تھا۔ اسی لئے جہاں انھوں نے اپنے پیروؤں کو عورتوں سے علحدگی کی تعلیم دی وہاں وہ سہجیہ کے اصولوں کی بھی مذمت ہی کرتے رہے۔ اور رادھے شیام کے استعارے کی صرف روحانی شرح کے ہی قائل رہے۔

یہاں پہنچ کر اگر ہمارے دل میں اس بات کی جستجو پیدا ہو جائے کہ ہم چنڈی داس کی زندگی کے حالات معلوم کریں تو بے جا نہ ہوگی۔ ہندوستان میں ہمیں بڑے لوگوں کے سوانح حیات اور خصوصاً شعراء کی زندگی کے افسانے بہت ہی اجمالی صورت میں ملتے ہیں لیکن ڈاکٹر ڈی، سی سین کی تحقیقات نے چنڈی داس کے متعلق کافی مواد بہم پہنچایا ہے ان کے قول کے مطابق بنگال کا یہ پہلا شاعر بیر بھوم کے ضلعے میں چھٹنا گاؤں میں پیدا ہوا اور ابتدائی زندگی ہی میں قریب کے گاؤں نانور میں اس نے اقامت اختیار کرلی۔ یہ گاؤں ایسٹ انڈیا ریلوے کے سٹیشن بول پور سے دس میل جنوب مشرق کی سمت واقع ہے۔ وہ جگہ جہاں چنڈی داس کا مکان تھا۔ اب صرف ایک شکستہ ٹیلے کی صورت میں موجود ہے۔ اسی گاؤں میں واسولی دیوی کا وہ مندر بھی تھا۔ جہاں چنڈی داس پروہت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یہ مندر امتداد زمانہ سے ڈھے پڑا تھا لیکن بعد ازاں اسی مقام پر ایک نئی عمارت تعمیر کردی گئی تھی۔ جہاں اب بھی واسولی دیوی کی پوجا ہوتی ہے چنڈی داس کی زندگی کے افسانے کا خاکہ تو سیدھا سادہ ہے۔ وہ مندر کا پروہت تھا۔ رامی دھوبن لڑکی سے اسے محبت ہوئی۔ اس جرم کی بنا پر (کیونکہ وہ خود براہمن تھا) اسے ذات سے خارج کردیا گیا اور کفارہ ادا کرنے پر مجبور کیا گیا لیکن رامی کی محبت نے کفارے کی رسموں کو تکمیل تک نہ پہنچنے دیا اور چنڈی داس رامی کو ساتھ لے کر ترکِ وطن کر گیا۔ ترکِ مذہب اور ترکِ وطن اس کی زندگی کے نمایاں واقعے ہیں۔ ترکِ وطن کے بعد وہ رادھے شیام کے گیت لکھتا رہا اور پھر اسی جلاوطنی میں مر گیا ———— یہ خاکہ ہے لیکن اس میں روایات و حکایات کی رنگ آمیزی بھی ہے۔ مثلاً رامی سے اس کے عشق کا آغاز کیونکر ہوا۔

کہتے ہیں کہ ایک روز وہ منڈی میں مچھلی خریدنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ مچھلی بیچنے والی سے اس کا سودا نہیں بن رہا تھا۔ اتنے میں اس نے کیا دیکھا کہ مچھلی بیچنے والی نے اس کی نسبت زیادہ مقدار کی مچھلی اس سے کم قیمت پر ایک اور گاہک کو دے دی ہے۔ وجہ پوچھی تو مچھلی والی کہنے لگی کہ یہ تو معاملہ ہی اور ہے ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے۔ اس لئے میں نے اسے کم قیمت پر مچھلی دی ہے۔ اس واقعے نے چنڈی داس کو محبت کے موضوع میں الجھا دیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ ایک جذبہ انسان کے چلن کو کیوں کر تبدیل کرسکتا ہے۔ اسی دن رامی دھوبن سے اس کا سامنا ہوا۔ رامی ایک جوان اور حسین دوشیزہ تھی۔ اور چنڈی داس محبت کے متعلق سوچ رہا تھا محبت کے مختلف خیالات اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ رامی اس کی سلمیٰ بن گئی۔ وہ رامی کو مخاطب کرکے عشقیہ گیت لکھنے لگا اور مندر کے فرائض کی تکمیل میں کوتاہی برتنے لگا۔ اگرچہ چنڈی داس اپنے گیتوں میں لکھتا ہے کہ رامی کے لئے اس کی محبت محض ایک ذہنی اور روحانی احساس تھی۔ اور اس میں جسمانی باتوں کو کوئی دخل نہ تھا لیکن دنیا ان باتوں کو کب سنتی ہے ؟ دنیا تو صرف اسی بات کی اجازت دیتی تھی کہ رامی چنڈی داس برہمن کے پاؤں کی دھول کو چھو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں یہی وجہ تھی کہ اگرچہ شاعر نے اپنے ایک گیت میں اپنی محبوبہ کو "ماں" کے لفظ سے بھی مخاطب کیا ہے اور اس بات کا تحریری ثبوت دے دیا ہے کہ اس کے جذبۂ دل میں کوئی ایسا جزو شامل نہ تھا۔ جسے لوگ پست سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی اسے برادری سے خارج کردیا گیا اور واسولی دیوی کے مندر سے معزول کرکے بہ بانگِ دہل اس بات کا اعلان کردیا کہ چنڈی داس، اب برہمن نہیں رہا۔ کیونکہ اس نے اپنی ذات سے کہیں نیچ ایک دھوبن عورت سے محبت کی ہے۔

چنڈی داس کا ایک بھائی نکل بھی تھا جسے برہمنوں میں بہت قبولیت حاصل تھی۔ اس کی ان تھک کوششوں سے برہمن اس بات پر راضی ہوئے کہ اگر چنڈی داس کفارے (پرائشچت) کے طور پر انھیں ایک دعوت دے اور آئندہ اپنے طرزِ عمل میں محتاط رہنے کا حتمی وعدہ کرے تو اسے دوبارہ ذات میں لے لیا جائے گا۔ نکل نے دعوت کا انتظام کیا اور تمام برہمن وہاں جمع ہو گئے۔ تاکہ چنڈی داس کے پرائشچت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اطمینان کرلیں لیکن اس دوران میں اس رسمِ کفارہ کی اطلاع رامی کو بھی مل چکی تھی۔ جب اس نے یہ خبر سنی تو بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آئی تو رونے لگی اور روتی ہی چلی گئی۔ دکھ درد کی اس انتہائی کیفیت میں وہ اس مقام پر گئی جہاں

[1] بدھ راہبوں اور راہباؤں کے سر منڈے ہوتے تھے۔

سے وہ اکثر چنڈی داس کو دیکھا کرتی تھی۔ لیکن؛ ہاں پہنچ کر بھی اسے اپنے آپ پر ضبط حاصل نہ ہو سکا۔ دل تھمنے ہی میں نہ آتا تھا۔ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی آخر وہ اس مقام پر جا پہنچی جہاں تمام برہمن جمع تھے اور جہاں چنڈی داس رامی کو بھول کر (؟) پراشچت پر تیار کھڑا تھا۔ رامی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہ رہی تھی۔ اور وہ چپ چاپ اپنے شاعر کی طرف تک رہی تھی۔ چنڈی داس اس منظر کو دیکھ کر رہ گیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ کس حماقت کا مرتکب ہوا چاہتا ہے۔ برہمنوں کی موجودگی، آج یہ یارے بھائی کی امیدیں اور کیا۔ سب کے خیال کو یک قلم فراموش کر کے وہ ایک پجاری کی مانند بڑھا۔ اور رامی کے قدموں پر جھک کر اس سے معافی کا خواستگار ہوا روایت ہے کہ اس موقعے پر چند منتخب برہمنوں نے دیکھا کہ رامی کے پیچھے پیچھے اس کا سایہ کئے کائنات کی دیوی کھڑی ہے۔ لیکن باقی برہمن اس جلوے کو نہ دیکھ سکے اور چنڈی داس کے اس اقدام پر پہلے سے زیادہ ناراض ہو گئے۔ چنڈی داس پہلے کی طرح اب بھی ایک ذات سے خارج شدہ انسان تھا۔ اس نے کہتے ہیں۔ رامی کو جو محض ایک معمولی دھوبن تھی، گیاتری کہہ کر پکارا۔ گیاتری برہمنوں کی نظروں میں ناقابلِ بیان تھی۔ گیاتری جسے ویدوں کی ماں کہا جاتا ہے۔ اسے ایک معمولی نیچ عورت سے کیا نسبت۔ لیکن چنڈی داس کے دل کی گہرائیوں میں جو باتیں تھیں انہیں کون سمجھ سکتا تھا۔ اس کے جذبۂ عشق میں سرشار دل کے لئے سب ہی یکساں تھے۔ ذات پات کوئی چیز نہ تھی۔ ایک برہمن اور ایک دھوبن ایک ہی مذہب کے مالک تھے۔ بلکہ وہ تو ہمہ اوست کا قائل تھا!

چنڈی داس اپنا گاؤں چھوڑنے کے بعد قریب کے ایک گاؤں کرناہر میں جا رہا۔ اور یہیں جب وہ ایک روز لوگوں کو اپنے گیت سنا رہا تھا تو مکان کی چھت کے گرنے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

یہ تو شاعر کے انجام کے بارے میں ڈاکٹر سین کا بیان ہے۔ لیکن رومیش چندر دت بنگالی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اسی روایت کو ذرا تبدیلی کے ساتھ لکھتا ہے بلکہ وہ اس کی زندگی کے چند اور واقعات میں بھی تغیر دیکھتا ہے۔ کالی، چنڈی، درگا اور شکتی ——— یہ سب ایک ہی دیوی کے نام ہیں۔ اور اس لئے آر سی دت کی نظر میں چنڈی داس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ شکتی کا پجاری تھا۔ چنانچہ نوجوانی کے زمانے میں وہ شکتی کی اس صورت کی پرستش کرتا تھا۔ جسے بشالکشمی کہا جاتا تھا۔ اور اسی نام سے شاعر نے اکثر اپنے کلام میں دیوی کو مخاطب کیا ہے۔ چنڈی داس کے شاکت[۱] سے وشنو ہو جانے پر کئی حکایتیں رائج ہو گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز وہ دریا پر اشنان کو گیا تو سطحِ آب پر اس نے ایک بہت ہی خوب صورت پھول تیرتا دیکھا۔ وہ یہی پھول لے کر بشالکشمی کی پوجا کو جا پہنچا۔ تاکہ ایک اچھی چیز دیوی کی مورت تک پہنچ جائے۔ پجا سے دیوی بنفسِ نفیس اس کے سامنے آئی اور اس نے شاعر سے وہ پھول مانگا۔ تاکہ وہ اسے اپنے سر پر رکھ سکے۔ پجاری متحیر ہو کر رہ گیا۔ اور اس نے دریافت کیا کہ اس پھول میں وہ کون سی غیر معمولی خصوصیت ہے جس نے دیوی کو یوں بنفسِ نفیس ظاہر ہونے پر مجبور کیا۔ اور اب وہ بجائے اس کے کہ پجاری اسے اس کے قدموں کی بھینٹ کر دے چاہتی ہے کہ اپنے سر کی زینت بنائے؟

دیوی نے جواب دیا۔ نادان موکھ بالک! اس پھول سے تو میرے مالک میرے ناتھ کی پوجا ہو چکی ہے۔ میرے پاؤں اس کے لائق نہیں۔ مجھے اسے اپنے سر پر رکھنے دو۔ شاعر نے پھر دریافت کیا۔ اور دیوی! تیرا ناتھ، تیرا مالک کون ہے؟ ——— اور دیوی نے اس کے جواب میں صرف ایک لفظ کہا "کرشن!" ——— اس روز سے چنڈی داس نے دیوی کی پوجا چھوڑ کر کرشن کو اپنا معبود بنا لیا۔

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس بات کا بہت امکان ہے کہ چنڈی داس کے تبدیلی مذہب ہی سے تحریک لے کر بعد کے مصنفوں نے شکتی کے پیروؤں پر وشنومت کی فضیلت ثابت کرنے کے لئے یہ روایت گھڑ لی ہو۔

اسی طرح رامی سے اس کے پہلے آمنے سامنے کے بارے میں بھی آر سی دت ایک اور روایت لکھتا ہے جس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ چنڈی داس نے رامی کی محبت سے پہلے نہ صرف وشنومت اختیار کر لیا تھا۔ بلکہ وہ سہجیہ کے اصول کی پیروی بھی کر رہا تھا۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ وہ سہجیہ مسلک میں اس وقت تک سادھن کی رسم پوری نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ ایک خوب صورت عورت اس کی محبوبہ نہ ہو بشرطیکہ عورت اس کی بیاہتا بیوی ہو۔ نہ روپے پیسے کے لالچ سے محبت کرے۔ بلکہ یہ ایک ایسی عورت ہو جس کی طرف اس کا دل پہلی نگاہ میں ہی بے ساختہ راغب ہو جائے۔ اب شاعر کو ایسی ہی عورت کی تلاش تھی اور جلد ہی یہ کام پورا ہوا۔

ایک روز دریا کے کنارے پر چنڈی داس کی نظر ایک دھوبن پر پڑی جو کپڑے دھو رہی تھی۔ چنڈی داس کو اس کی طرف پہلی نگاہ میں ہی بے ساختہ رغبت ہوئی۔ اور وہ ہر روز اس مقام پر مچھلی پکڑنے کے بہانے سے جانے لگا۔ اور یوں وہاں بیٹھ کر اپنی محبوبہ کو دیکھتے رہنا اس کا معمول بن گیا۔ رفتہ رفتہ بات چیت بھی ہونے لگی اور دونوں طرف برابر کی آگ بھڑک اٹھی اور پھر شاعر نے اپنے ماں باپ اور گھر بار کو چھوڑ دیا اور رامی ہی کے ساتھ رہنے لگا۔

موت کے متعلق بھی دت کی روایت میں اختلاف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

چنڈی داس ایک مشہور راگی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز وہ ساتھ ہی کے ایک گاؤں ماتی پور میں رامی کے ساتھ گانے کے لئے گیا۔ اور جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر لوٹ رہے تھے تو راہ میں ایک مکان میں ٹھہر گئے۔ اتفاق سے اس مکان

[۱] یعنی شکتی کا پجاری

کی چھت گر پڑی اور دونوں عاشق ایک دوسرے کی آغوش میں مر گئے۔ دتّ یہ بھی لکھتا ہے کہ شاید اس روایت کی بنیاد حقیقت پر نہیں ہے۔

رامی کا لکھا ہوا جو نوحہ ہمیں ملتا ہے۔ اس میں چنڈی داس کی موت کا ایک اور ہی بیان ہے لیکن اس کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔ ان واقعات کے علاوہ جو اوپر بیان ہو چکے۔ چنڈی داس کی زندگی میں ایک اور بھی قابلِ ذکر واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ودیاپتی سے اس کی ملاقات ہے۔ دتّ کے بیان کے مطابق اس ملاقات کا حال ہمیں روایات کے علاوہ بہت سی نظموں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ بنگال کی وشنو شاعری کی یادگار اور سب سے مشہور مجموعے "پدوکال پتر د" میں ایک نظم ہے۔ جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ نظم اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور رہی ہے۔

"چنڈی داس نے ودیاپتی کی قابلیت کا حال سنا۔ اور اس کے دل میں اس سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ودیاپتی نے چنڈی داس کی قابلیت کا حال سنا اور اس کے دل میں بھی اس سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ دونوں کے دلوں میں تجسس جاگ اٹھا ودیاپتی روپ نارائن کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ چنڈی داس بھی رُک نہ سکا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں دونوں شاعر ایک دوسرے کی تعریف کے گیت گاتے چلے اور ان کے دل ایک دوسرے کے لئے بے تاب ہوتے گئے۔ اچانک ان کا آمنا سامنا ہوا لیکن وہ ایک دوسرے کو پہچانتے تو تھے ہی نہیں جب انھوں نے ایک دوسرے کے نام سنے تو ایک دوسرے کو جانا۔"

بعض روایات کے مطابق یہ ملاقات گنگا کے کنارے ہوئی۔ اور بعض کے مطابق بھاگیرتی کے کنارے پر۔

ہندوستان کے پرانے شعراء کے سوانح حیات کے علم کی کمی کے باعث ان کے کردار کی خصوصیات کا اندازہ بھی زیادہ تر ان کے کلام ہی سے ہو سکتا ہے چنڈی داس کے افسانہ حیات کی اگرچہ تفصیلات معلوم نہیں لیکن بنیادی طور پر اس سے ایک مکمل کہانی ضرور حاصل ہو جاتی ہے۔ اور روایات کو بھی چھان بین کے بعد ہم اس جائزے میں شامل کر سکتے ہیں۔ اس کہانی اور ان روایات ہی سے ہم کسی حد تک اندازہ کر سکتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی زندگی میں ایک معین صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ایک معین روش اختیار کی۔ وہ کردار کے لحاظ سے کن خصوصیات کا مالک ہو گا مثلاً برہمنوں کے مقابلے میں اس کی ثابت قدمی اور قوتِ ارادی اس کی نمایاں خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ اور اگرچہ ایک بار وہ کفارے پر رضامند ہو کر اس استقلال میں لغزش کھا جاتا ہے لیکن اس کی تاویل ہم اس کے بھائی نکل کی محبت کو قرار دے سکتے ہیں۔

اس کے کلام کی سادگی اور خلوص سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ طبعاً بھی ایک سیدھا سادہ انسان تھا جو ہوا کے رُخ کو اپنے مخالف دیکھ کر ہوا کا رُخ بدلنے کی بجائے اپنا رُخ بدل لینا بہتر سمجھتا تھا۔ گویا اس کے خیالات اور جذبات میں احساسِ محبت کے علاوہ اور کوئی بات تندی و تیزی کی حامل نہ تھی۔ اور اس فطری مناسبت ہی کی وجہ سے وشنو مت اس کے طبعی رجحان کے عین مطابق تھا۔ اور اسی لئے اس نے مخالف عناصر سے محض اپنے کلام اور اپنے آدرش ہی کے ذریعے سے جنگ کرنے کو ترجیح دی۔

آج کل کے ماہرینِ قیافہ نیلے رنگ کی پسند کو فن کارانہ رجحان سے نسبت دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ چنڈی داس کا محبوب ترین رنگ نیلا ہی تھا۔ اس کا اظہار اُس کے اُن گیتوں سے بخوبی ہو رہا ہے جو اس نے رادھے شیام کے متعلق لکھے ہیں۔ ان گیتوں میں رادھا کی ساری کا رنگ وہ عموماً نیلا ہی بتاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ "نیلگوں زیبنگی" ساولے سلونے شیام کے رنگ کا ہی ایک عکس ہو۔ لیکن ہمیں تو کچھ اور شک ہوتا ہے کہ رامی کے ملبوس کا جادو اس رغبت میں کارفرما ہے ممکن ہے کہ پہلے روز جب چنڈی داس نے اسے دیکھا وہ اسی رنگ کی ساری باندھے ہو۔ یا ممکن ہے عموماً وہ اسی رنگ کی ساری استعمال کرتی ہو۔ یا ممکن ہے جب وہ نیلی ساری زیب تن کرتی ہو تو وہ چنڈی داس کو غیر معمولی طور پر حسین دکھائی دیتی ہو۔ اس کے علاوہ جب ہم رادھا کے اُس بناؤ سنگار اور بالوں کے گوندھنے کے انداز پر غور کرتے ہیں جس کی تفصیل شاعر ایک قسم کے ذاتی مشاہدے کے طور پر نظم کر رہا ہے تو ہمیں شک سا ہوتا ہے کہ کہیں یہ رادھا کے پردے میں بھی رامی دھوبن ہی کے گُن تو نہیں گا رہا اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے کیونکہ چنڈی داس کے کلام میں اس کے اپنے جذبات کا درد اور خلوص موجود ہے۔ موازنے کے طور پر بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ودیاپتی ایک ایسا فن کار تھا جو سنسکرت کی ادبی روایات کے ماتحت اپنے فن کے ذریعے سے رادھا کرشن کے استعارے کو ایک زندہ چیز بناتا ہے تو ہمیں آسانی سے سمجھائی دے جاتا ہے کہ چنڈی داس اپنے ذاتی تجربے کو ہی رادھا کرشن کے استعارے میں ایک ہمہ گیر صورت دے رہا ہے کیونکہ وہ انسان پہلے ہے اور فن کار بعد میں۔

اس کی غیر معمولی جبلّت کے اظہار کے لئے صرف اسی قدر کہنا کافی ہو گا کہ اس کی عصبیت اور خلافِ معمول رویے ہی کی وجہ سے اُس کے زمانے میں لوگ اسے "بگلا چنڈی" کہتے تھے۔ اور اس کے بعد اب تک مشرقی بنگال میں لوگ عصبی مزاج کے افراد کو "بگلا چنڈی" کہہ کر پکارتے ہیں۔

رامی کے لئے چنڈی داس کے دل میں جو محبت تھی۔ اس کو جانچنے کے لئے بھی گیت ہی ہماری رہنمائی کرتے ہیں لیکن یہ رادھے شیام والے گیت نہیں ہیں۔ یہ وہ گیت ہیں جو صرف رامی ہی کو مخاطب کر کے کہے گئے ہیں۔ ان ہی گیتوں سے پتہ چلتا ہے

کہ جب چنڈی داس کہتا ہے کہ وہ رامی کی پوجا کرتا ہے تو اس کے ذہن میں پرستش کا کوئی مفہوم موجود ہوتا ہے مثلاً ایک گیت میں وہ لکھتا ہے :-

"اے میری محبوب میں نے تیرے قدموں میں آکر پناہ لی ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے جلتے ہوئے دل کو ٹھنڈک پہنچائیں گے۔ میں تیرے اس حسن کا پجاری ہوا جس سے تقدس و پاکیزگی اُبل رہی ہے اور جو کسی قسم کی نفسانی خواہش کو برانگیختہ نہیں کرتا۔

جب میں تجھے نہیں دیکھتا تو میرا دل بے چین رہتا ہے۔ اور جب میں تجھے دیکھ لیتا ہوں تو میرے دل کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اے دھوبن۔ اے میری محبوبہ! تو تو میرے لئے ایسے ہے جیسے بے بس بچوں کے لئے اُن کے ماں باپ۔

ہر برہمن دن میں تین بار پوجا کرتا ہے۔ اسی طرح میں تجھے پوجتا ہوں۔
تو میرے لئے اس گائتری کی مانند مقدس ہے جس سے ویدوں کی تخلیق ہوئی
میں تو تجھے سرسوتی دیوی سمجھتا ہوں جو گیتوں کو تحریک دیتی ہے۔
تو تو میرے لئے پاربتی دیوی ہے ——— تو میرے گلے کا ہار ہے ———

تو میرے لئے آکاش بھی ہے اور دھرتی بھی، تو ہی میری پاتال ہے اور تو ہی میرا پربت ——— نہیں نہیں، تو تو میری تمام کائنات ہے۔ تو میری آنکھوں کی پتلی ہے تیرے بغیر میرے لئے ہر چیز تاریکی کی مانند ہے میری آنکھیں تجھے دیکھنے ہی سے تسکین پاتی ہیں جس روز تیرا چاند سا چہرہ نہیں دیکھتا میں ایک بے جان انسان کی مانند ہوتا ہوں میں تو ایک پل کے لئے بھی تیرے حسن و رعنائی کو بھول نہیں سکتا مجھے بتا دے کہ میں کس طرح تیری نظرِ کرم کا مستحق بنوں۔ تو ہی میرا منتر ہے اور تو ہی میری پرارتھناؤں کا نچوڑ۔ تیرے دلنشیں حسن کے لئے میرے دل میں جو چاہت ہے اس میں جسمانی خواہش کا کوئی بھی عنصر نہیں ہے۔ چنڈی داس کہتا ہے کہ دھوبن کی محبت پارس پتھر سے پرکھا ہوا سچا سونا ہے۔"

یہ ترجمہ رومیش چندر دت کا تھا لیکن ایک اور ترجمے میں جسے کالی پاد امکرجی نے کیا ہے یہی گیت قدرے مختلف صورت میں ہے۔ موازنے کی دلچسپی کے لئے یہ ترجمہ بھی پیش نظر ہے۔

"اے رامی! کان دھرو اور میری ایک کبھی پرارتھنا کو سنو جسے میں رہ رہ کر دہراتا ہوں۔ میں نے تیرے پیروں کو دیکھا اور انھیں ستیل پایا۔ اور اسی لئے وہیں پناہ لی۔ اے دھوبن! تیرا روپ کسی کنواری کے جوبن کا سا ہے۔ اور اس میں جذبات کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں ہے میری روح اسی کی آرزو میں گھل رہی ہے بلکہ اسے اپنی سُدھ بدھ بھی نہیں رہتی۔ اور جب اس روپ کی ایک جھلک بھی دیکھ لیتی ہے تو برکت اور تسکین پاتی ہے۔ تو دیکھنے ہی میں عورت ہے لیکن میری پیاری! تو مجھے ماں اور باپ کے سمان ہے۔ میری تمام پرارتھنائیں تیری ہی سمت اُٹھتی ہیں۔ کیونکہ تو گائتری ہے، ویدوں کی ماں تو سرسوتی ہے۔ بلکہ تو پاربتی ہے۔ تو ہر لمحہ میرے گلے کا ہار ہے۔ تو ہی آکاش ہے اور تو ہی دھرتی۔ تو ہی گہرائی ہے اور تو ہی پربت کی بلندی تیرے چہرے کے نور کے بغیر میری دنیا اندھیری ہے۔ اور میری آنکھیں اپنے زندہ حسن کے لئے بے کل ہیں میری یادوں میں ہر وقت تیری ہی رعنائی چھائی ہوئی ہے لیکن مجھے یہی نہیں معلوم کہ کس طرح اسے اپنا لوں۔ تو ہی پوجا کی ریت ہے اور تو ہی مناجات۔ بلکہ پوجا سے جو آنند ملتا ہے وہ بھی تو ہی ہے۔ میری پیاری ذرا ایک پل کو سوچ تو سہی کہ ان تین دنیاؤں (ترلوک) میں تیرے سوا اور کون ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں؟ چنڈی داس کہتا ہے کہ باسولی دیوی کی تحریک سے ہی اس نے ایک دھوبن کے قدموں کو اپنا سب سے بڑا ملجا و منتہا بنا لیا ہے۔"

یہ تو چنڈی داس کے جذبۂ دل کا اظہار تھا۔ اب رانی کی محبت کو بھی دیکھئے جس کا نغمہ ذیل کے گیت میں موجود ہے (یہ گیت بھی کالی پادامکرجی ہی کے ذریعے سے مجھے حاصل ہوا ہے)

"تم سارا دن جنگل میں گھومتے رہتے ہو۔ اور کھیل تماشوں اور محبت کی خوشیوں میں ڈوبے رہتے ہو لیکن میرے دل میں رہ رہ کر بے حد دکھ محسوس ہوتا ہے کیونکہ میں اس تمام عرصے میں تمہاری پیاری صورت کو نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے تو ایک ایک پل ایک ایک عمر دکھائی دیتا ہے میرا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ اور میں تمہاری جدائی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہاری جدائی ہی مجھے اس درد میں مبتلا کرتی ہے تمہاری موجودگی ہی مسرت کی تکمیل ہے۔ تمہارا چہرہ کتنا پیارا اور پاک ہے۔ اور اس کے گرد تمہارے گھونگھریالے بال لپٹے ہوئے ہیں۔ کاش میری آنکھیں کبھی جھپکتیں لیکن میری آنکھیں ہی تو سب سے بڑی دشمن بن گئی ہیں جو تمہارے حسن سے اپنی پیاس بجھاتی ہیں۔ اسی لئے تو میں ان کے بنانے والے پر بھی الزام دھرتی ہوں۔ تم میرے ہو اور میں تمہاری ہوں۔ ہمارا اس دنیا میں اور کوئی بھی دوست نہیں ہے۔ رامی اپنے دکھ میں کہتی ہے کہ چنڈی داس کے بغیر مجھے تمام دنیا اندھیر دکھائی دیتی ہے"

اس گیت کے علاوہ اس نوحے سے بھی رامی کی محبت کا اظہار ہو رہا ہے جو اس نے چنڈی داس کی موت پر لکھا۔

یہاں ایک بات یاد رکھنی چاہئے۔ زیادہ تر مصنف شاعر کی موت کا سبب کسی مکان کی چھت کے گر جانے کو قرار دیتے ہیں لیکن اس نوحے سے ایک اور ہی کہانی ملتی ہے۔ اس لئے ہمارے سامنے دو صورتیں ہیں۔ یا تو ہم اس نوحے کو رامی کا لکھا ہوا نوحہ نہ سمجھیں یا شاعر کے انجام کو اس نوحے کے مطابق قرار دیں۔ ڈاکٹر سین ایسے محقق نے بھی اس نوحے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ نیز چنڈی داس کی موت کا سبب مکان کی چھت

لہ نظارے سے کو تو جنبشِ مژگاں بھی بار ہے۔ اقبال

کے گرمنے کو قرار دیا ہے۔ بہر حال میں اس نوحے کی ستر ادر دلچسپی کے لئے اس کا ترجمہ آپ کے پیش نظر کئے دیتا ہوں۔ اس نوحے کی ابتدا میں جے این سی گنگولی نے جو نوٹ لکھا ہے اس کا ایک اقتباس یہ ہے۔

"ذات سے خارج ہونے کے بعد چنڈی داس رامی کو ساتھ لے کر بنگال کے قدیم دارالخلافہ گور میں جا پہنچا۔ گور اس زمانے میں مسلمانوں کے ماتحت تھا۔ یہیں چنڈی داس کی موت ہوئی جس کا ذکر نوحے میں ہے۔ اس نوحے سے وہی حصے لئے گئے ہیں جن سے پوری کہانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ نوحہ ایک قسم کی مثنوی ہے۔ اور اس کی زبان ابتدائی اکثر بنگالی ہے"

چنڈی داس کا نوحہ

"ہم نفس چنڈی داس! تو کہاں چلا گیا؟
"میری پیاسی آنکھیں ایک پل بھی چین سے نہیں رہتیں۔
"میری آنکھیں بھاگ کے پنچھی ہیں جو سوکھے بادل دیکھ کر بیاکل ہیں،
"گور کے مالک بادشاہ نے کیا کیا؟
"اس کی محبت کے نور سے مبرا زندگی بے کار ہے!
"اس نے میرے دل کے پیارے کو مار ڈالا۔

"تو دربار میں گانے کے لئے کیوں گیا؟
"آسمان، زمین، دوزخ، حیوان اور انسان کے سامنے
"وہ جو محبت کے لئے افتخار کا باعث تھا۔ خاک میں مل گیا۔

"بادشاہ کی بیگم نے گیت کو سنا۔
"وہ اپنے دردِ پنہاں کو نہ چھپا سکی۔
"اور اس نے اپنے سوامی کو اپنے دل کی بات بتادی۔

"۔۔۔ میری روح اندر ہی اندر بھڑک اٹھی ہے۔
"۔۔۔ وہ چنڈی داس کے عشق فروزاں سے بھڑک اٹھی ہے
"۔۔۔ محبت کے لئے اس نے اپنی ہر بات کی بھینٹ چڑھادی۔

"بادشاہ نے اپنے وزیر کو بلایا،
"۔۔۔ جلدی کرو تنومند سے تنومند ہاتھی کو لاؤ۔
"۔۔۔ اور اس بھاٹ کو قرار واقعی سزا دو۔۔۔

"۔۔۔ اس عظیم الجثہ حیوان کی بے پناہ پشت پر
"۔۔۔ ہمارے ملعون دشمن کو مضبوط رسیوں سے باندھ دو
"۔۔۔ اور اس سے اپنا پیچھا چھڑا لو ۔۔۔

"۔۔۔ بیگم پکار اٹھی ۔۔۔ سنئے، میرے مالک!
"۔۔۔ وہ نورِ روحِ عشق و محبت ہے۔
"۔۔۔ پھر آپ اس کے فانی جسم کو کیوں برباد کرتے ہیں؟

"۔۔۔ یہ شخص جس کا میٹھا گیت تیر کی طرح میرے دل کے پار نکل گیا ہے
"۔۔۔ کوئی معمولی مٹی کا انسان نہیں ہے،
"۔۔۔ اس کے دل میں تو ابدی محبت کی حکومت ہے۔

"ہاتھی تندی سے دھاڑا اور بول کر لپکا۔
"اور میرے پیارے! جب میں نے تجھے باقی نہ دیکھا
"تو میرے سر پر گویا آسمان سے بجلی گر پڑی۔

"ہاتھی کی سونڈ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے
"میں زور سے چلا اٹھی ۔۔۔ پران ناتھ!
"۔۔۔ میں اناتھ اور اکیلی ہی رہ گئی۔

"بیگم نے زور سے پکارا ۔۔۔ مجھے چھوڑ نہ جانا!
"اور اسی لمحہ اس کی روح اس سے الگ ہو گئی۔
"اور وہ دو جیون موت میں ایک ہو گئے۔

"چنڈی داس کا دھیان جمائے ہوئے
"بیگم زندگی سے نہ چمٹی رہی۔
"اور موت اس کے دکھ کا دارو بن گئی۔

"اس منظر کے اثر سے رامی دوڑی۔
"اور شاہی خاتون کے قدموں میں
"وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

اس نوحے کی سادگی دل پر اثر کرتی ہے لیکن عین ممکن ہے کہ اگر چنڈی داس کی موت کا یہ بیان صحیح بھی ہو تو یہ مثنوی رامی کی تصنیف نہ ہو۔ بلکہ اس المناک واقعے سے متاثر ہو کر کسی مقامی شاعر نے اسے لکھا ہو۔ جیسے کہ بہت سے واقعات کے متعلق ہیں ہمارے ملک میں منظوم بیان ملتے ہیں۔ خصوصاً اس قسم کی چھوٹی چھوٹی نظمیں اور مثنویاں۔

چنڈی داس کے حالاتِ زندگی اور بعض دوسری باتوں کا بیان ختم ہوا۔ اب ذرا اس کے کلام کے متعلق۔

بنگال کا ابتدائی ادب اور ممالک کی طرح دہنی تھا جب بنگال میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے اپنے معمول کے مطابق یہاں کی زبان و ادب کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی۔ اور اس توجہ سے بنگالی زبان و ادب کو تحریک ملی۔ اور فائدہ پہنچا لیکن ان کی توجہات سے قطع نظر بھی بنگال اور بہار کی زبان میں بعض ایسی بنیادی خصوصیات تھیں جن کی بناء پر یہاں کے ادب کی نشوونما اور ترقی لازمی تھی۔ کیونکہ جس زبان کے ابتدائی شاعر ودیاپتی اور چنڈی داس ایسے جوہر خداداد رکھتے ہوں۔ وہ عرصے تک ادبی لحاظ سے پست نہیں رہ سکتی۔ خواہ برہمن اور ان کی سنسکرت پرستی کی دیوار راہ میں حائل ہو۔ چنانچہ ہوا بھی یوں ہی۔ بنگالی زبان کے اس ابتدائی وحشت کدے سے یکا یک چنڈی داس کا جوہر ذہانت نمودار ہوا۔

زندگی کی اور باتوں کی طرح ہندوستان میں عورت مرد کے تعلقات بھی بیمنوں کے ساختہ اصولوں کے ماتحت ہی چلتے رہے یعنی اور عورت کے نکاحِ ثانی کے خلاف اصولوں نے عورت کی ہستی کو ہندوستانی مرد کی نظروں میں اگر بھیڑ بکری نہیں بنایا ہو تو کم سے کم ایک نہایت ادنیٰ اور معمولی چیز ضرور بنا رکھا ہوگا۔ گویا دوسری ضروریاتِ زندگی کی طرح عورت بھی ایک ایسی شے تھی جسے حاجت ہونے پر چند روپوں کی پابندی کے سودے سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ادب میں عورت کا تذکرہ قدیم سنسکرت روایات کے ماتحت چلتا آ رہا تھا۔ جب کسی شاعر کو شعر و سخن کے لئے عشقیہ احساسات کی ضرورت پڑتی تو وہ چند مقررہ اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے نفسیاتِ انسانی کو مدِ نظر رکھ کر مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کر لیتا۔ چنانچہ سنسکرت ادب میں جہاں جنسی پہلو نمایاں ہے۔ وہاں اس کی ممتاز خصوصیت ایک لذت ہے۔ اس میں عموماً عشق کے گہرے ذاتی تجربے یا آدرش کی کمی ہے ——— مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی یہاں عورت مرد کی مساوات کے خیالات آئے۔ وہاں عورت مرد کے آزادانہ میل ملاپ میں نئی پابندیاں بھی آئیں۔ قدیم زمانے میں یہاں کے عشاق کے جذبۂ دل میں رومیو یا مجنوں کے جذبات کی سی شدت اور گہرائی موجود نہ تھی لیکن جہاں مسلمانوں نے یہاں رہ کر ہندوؤں کی بہت سی باتوں کو اپنایا وہاں ہندوؤں نے بھی نئے آنے والوں کی بعض خصوصیات کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ عورت مرد کے آزادانہ میل ملاپ میں نئی پابندیوں ہی نے جذبۂ عشق میں ایک شدت اور گہرائی پیدا کی اور چنڈی داس ایسے شاعر نے اپنے ذاتی تجربے سے ایک آدرش قائم کیا۔

ایسی پابند سماج میں لازمی ہے کہ محبت اور محبت میں بھی فراق کی تند و تیز شاعری بارور ہو۔ اور چاہنے والوں کی روحوں میں ایک ایسا گداز پیدا ہو جائے جو اس نرم و نازک اور نفاست سے لبریز کیفیت کا ہم آہنگ ہو جو کسی دیوی دیوتا کے پجاری کے دل میں ہنگامِ دعا نمایاں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس طرح کی محبت جو آدرش کی قائل ہو اور جس میں کبھی بھی جسمانی حظ اٹھانے کا موقع نہ ملے صرف تخیل ہی اس سلسلے میں مددگار ثابت ہو۔ اور وہ بھی صرف قوتِ باصرہ ہی کی تسکین کے تصورات لائے) اپنی خیالی دنیا میں ایک روحانیت سی پیدا کر دیتی ہے۔ ایسی محبت میں ایک اور بات بھی ممتاز ہے۔ عاشق کو کوئی عورت اپنی دکھائی نہیں دیتی۔ سماج کے ذریعہ اور رضامندی سے حاصل شدہ عورت ایک سودا سا ہوتا ہے۔ اس سے کیا محبت کی جائے۔ اس لئے نامحرم عورت ہی اس کی عشقی توجہات کا مرکز بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے ملنا ناممکن سا نظر آتا ہے ——— ان حالات کے ماتحت ہی شعر و ادب میں وہ پہلو پیدا ہوتا ہے جسے پراکیہ رس کہتے ہیں (پراکیہ کے معنی نامحرم کے ہیں) اور ایسی محبت کی متعلقہ روحانیت ہی نے وشنیو شعراء کو ایک ایسا مماثل افسانہ مہیا کر دیا جو بظاہر انسانی جذبات کی تمام گہرائیاں رکھتے ہوئے اس لائق تھا کہ اس کی شرح ایک اور رنگ میں بھی کی جا سکے اور اسے خدا کے لئے انسانی آرزوؤں کا ایک استعارہ قرار دے دیا جائے۔ بنگالی وشنیوؤں کے لحاظ سے رادھا راجہ درکش بھانو کی بیٹی اور آین گھوش کی بیوی ہے۔ اور ایک نٹ کھٹ کھلنڈرے گوپال کرشن کی چاہت میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن رادھا فقط ایک عورت ہی نہیں۔ وشنیوؤں کی نظر میں وہ انسانی روح ہے، اور کرشن گوپال وہ روحِ ابدی جس کی آرزو میں انسان ازل سے اب تک محوِ جستجو ہے۔

اسی استعارے کی بنا پر چنڈی داس نے اپنے ان گیتوں کی تقسیم کی ہے جو رادھے شیام سے متعلق ہیں۔ مثلاً پوروراگ (پہلا راگ یعنی صبحِ محبت۔ آغازِ عشق) ——— دوتیہ (یعنی پیامِ محبت ——— دوت بمعنی پیامی) ابھی سار (یعنی خفیہ ملاقاتیں) اور سمبھوگ ملن (یعنی چاہنے والوں کی ملاقاتیں، وصل) ——— لیکن یہ وصل مستقل نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر جدائی ہے۔ اور یہ جدائی کرشن کے متھرا چلے جانے سے ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد دوبارہ روحوں کا وصال ہوتا ہے۔

وشنیوؤں کے تصور میں کرشن مشیتِ ایزدی کا اوتار ہے۔ اس کا رنگ سیاہی مائل نیلگوں ہے۔ یہ رنگ نظامِ کائنات کا سب سے ممتاز رنگ ہے۔ جہاں تک نیلی فام کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔ اسی بات کو لیجئے کہ زمین ایک چھوٹی سی چیز ہے اور آسمان وسیع تر

اور آسمان کا رنگ نیلا ہے، سمندر بھی جو ہمارے اس کرۂ ارضی سے تگنی وسعت رکھتا ہے نیلگوں ہی ہے۔ دھرتی پہ کھڑے ہوئے دور تک پربت بھی ایک دھندلی نیلگوں دیوار کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ دور کے سبزہ زار اور پیڑوں کے جھرمٹ بھی سبز کی بجائے نیلے ہی سے نظر آتے ہیں ——— تو کرشن کا رنگ بھی نیلا ہی[1] ہے کیونکہ وہ نہ صرف اس سنسار کا پالنہار ہے بلکہ اس دھرتی کے رہنے والوں کا پجاری اور دیوتا بھی ہے۔ اس کے سر پر مور پنکھ کا ایک تاج ہے جس میں مور کے پنکھ لگے ہوئے ہیں اور یہ مور پنکھ ہمیں دھنک کے مختلف رنگوں کی یاد دلاتا ہے۔ گویا نظامِ کائنات کی نیلاہٹ میں جو اور رنگ نمایاں نظر آتے ہیں وہ اس مور مکٹ میں ظاہر ہیں

کرشن کے ہاتھ میں ایک بنسی ہے۔ اس بنسی کی مدھر سریں انسانی روح کو روحِ ابدی کی طرف دعوت کا ایک آوازہ ہیں اور اس بلاوے سے باز رہنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے جس نے اس میٹھی تان کو سن لیا۔ اس کی نظروں میں تمام دنیا ہیچ ہو گئی۔ اس پر بنسی کا جادو چھا گیا۔ اور رادھا انسانی روح ہے جو بنسی کی تان سنتے ہی سب کچھ بھول جاتی ہے۔

ایک وشنو کے لئے اپنے گھر سے بڑھ کر اور کوئی جنت نہیں ہے۔ وہ گھر جو سماج کے تمام تعلقات کا مرکز ہے۔ اسی گھر میں ہمیں طفلگی میں ماتا کی برکت حاصل ہوتی ہے جو ہمیں اس دنیا کی بے مزہ باتوں اور ناگوار عناصر سے محفوظ رکھتی ہے اور ہماری طبیعت کو اکھڑ ہونے سے بچاتی ہے۔ یہ ماتا بھی ایک طرح سے خدائے مہر و کرم ہی کا ایک پرتو ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر جب ایک مرد باپ بنتا ہے تو دنیا کی آلائشوں نے اس کے دل میں جو کرختگی پیدا کر دی ہوتی ہے۔ وہ اولاد کی محبت ہی سے دور ہوتی ہے یا کم ہو جاتی ہے۔ ادھیڑ عمر کو پہنچ کر میل ملاپ کے لوگوں کے لئے بھی انسان ایک ہمدردی سی محسوس کرتا ہے۔ اور آخری عمر میں بڑھاپا تو گویا رحم و کرم کا ایک مجسمہ ہی بن جاتا ہے ——— ایک وشنو کی نظر میں رحم و ہمدردی کی یہ تمام کیفیتیں انسانی بس کی بات نہیں بلکہ ان کی تحریک روحِ ابدی کی طرف سے ہوتی ہے لیکن ان کیفیتوں سے بھی بڑھ کر عشقِ حقیقی کا اشارہ عشقِ مجازی میں ہوتا ہے اور اسی لئے ایک وشنو کے لئے ایک مرد اور عورت کی باہمی محبت اُن تمام خصائص بلند و بالا کی حامل ہوتی ہے۔ جو فرش سے نہیں بلکہ عرش سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور رادھے شیام کے جتنے بھی وشنو شاعر گزرے ہیں۔ وہ ان ہی خصائص کے ترجمان ہیں۔

چنڈی داس کی نسیج محبت میں رادھا کے تصور میں کرشن ایک عالی نظارۂ تخیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور

تنہا سب سے دور اکیلی
دکھیا دل لے کر ہے بیٹھی
رادھا ———
بات نہیں سنتی وہ کسی کی
اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی
رادھا ———
سُورَیہ کے گھونگٹ بادل کالے
ہردم بس اُن کو ہی دیکھے
رادھا ———
"میں ہوں پجارن جوگیا پہنے
بھوک نہیں ہے" بس یہ بولے
رادھا ———

تو وہ اس نے جوڑا کھولا ... کاندھوں پہ گیسو لٹکائے
جب کالے بالوں کو دیکھا ... دل میں دھیان کسی کا لائے
اب دیکھے آکاش کو رادھا ... اور اس نے بازو پھیلائے
کالی گھٹاؤں سے کچھ بولی ... لیکن کس کی سمجھ میں آئے؟
کس نے سنی ہے بات ادھوری ... ایک پہیلی کون بجھائے؟
مور کی گردن نیلی کالی ... دیر تلک وہ دیکھتی جائے:
آؤ، اس کا بھید بتائیں
آؤ پہیلی ہم ہی بجھائیں
ہم نے ان باتوں سے جانا ... دھیان لئے ہے شیام سندر کا
رادھا ———

اس گیت میں کرشن کے نیلگوں رنگ کی شاعرانہ وضاحت پر غور کیجئے۔ یہ رنگ ایک آئینہ ہے جس میں مناظرِ قدرت کا عکس دیکھ کر پجاری کا دل ان کے بنانے والے سے ہم آہنگ ہو جانا چاہتا ہے۔ حواسِ خمسہ جن موجوداتِ مرئی کا احساس دلاتے ہیں ان کے پردے میں پجاری غیر مرئی ہستیِ موجود کا پرتو دیکھتا ہے۔

ہندوستانی ذہن کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ یہ روزمرہ کی چیزوں سے بھی آورشی تصورات قائم کرتا ہے۔ اور پھر ان تصورات کو مجسموں کی صورت میں ڈھال کر پوجتا ہے اور اسی جگہ میں اس کی ذہنی زندگی اور اس کے جذبۂ عبودیت کی تسکین ہوتی ہے۔ جمنا اور برندابن ہندوستان کے ہر نقشے میں مادّی صورت لئے ہوئے موجود ہیں لیکن اسی مادی صورت سے ہندوستانی ذہانت ایک تخئیلی کیفیت اخذ کرتی ہے۔ اور برندابن کو محض ایک جنگل کی بجائے ذہنِ انسانی کا استعارہ بنا دیتی ہے جس میں کرشن لیلا کا دلچسپ اور دلکش کھیل دل کو لبھاتا ہے۔ رادھا ایک پیاسا

[1] اصل زندگی میں بھی ہمیں نیلی فام انسان ملتے ہیں چنانچہ تسمانیہ کی قدیم وحشی اقوام کی رنگت نیلگوں کہی جاتی ہے۔ م۔

عورت تھی لیکن اس کی روح کرشن کی ملکیت ہے۔ اسی طرح ہماری روح بھی اگرچہ اس دنیا سے بندھی ہوئی ہے پھر بھی جب اس میں خدائی محبت پیدا ہوتی ہے تو یہ دنیوی بندھنوں کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی۔ اسی کیفیت کو گیت میں دیکھئے :۔

کبھی ہے گھر میں کبھی ہے باہر ہزار بار آئی اور لوٹی
ذرا نہیں چین اس کے دل میں ہے بیتاب پیاری رادھا!
ہے دل کی دھڑکن میں ایک تیزی کہ آگ جلتی ہے آرزو کی
کدم کے جنگل پہ ہیں نگاہیں جہاں پہ دھو کو ہے بیٹھے دیکھا
حسین دوشیزہ کیوں ہے سر بہ زانو ؟ کیا سبب ہے اس کا ؟
بڑوں کی ناراضگی کی دل کو نہیں ہے اس کے ذرا بھی پروا
ہے اس پہ سایہ کسی نے جادو کیا ہے، ساری ہی ہے پریشاں
خلش ہے کس طرح سے دل کی نہیں ہوئے پورے دل کے ارماں
ابھی تو پہنے تھے اس نے زیور، ابھی انہیں پھر اتار ڈالا
نہ جانے کیا دھیان آیا اس کو، اتارا ان کو پھر سے پہنا
وہ کس لئے اپنی آرزوؤں کو بس میں کرتی نہیں ہے اپنے؟
ہے کیا تمنا؟ ہے آرزو کیا؟ امید کیسی ہے دل میں اس کے؟
ہیں اس کی باتیں سمجھ سے باہر حقیقت یہ ہے ہم پہ ظاہر
کہ دل ہے نادان رادھا کا اسے تو ہے چاند کی تمنا
مگر یہ کہتا ہے تم سے شاعر کبھی نہ رادھا کو تم جھڑکنا
کہ اس کے دل پر کیا ہے جادو کرشن نے اپنی بنسری کا

یہی کیفیت ایک اور گیت میں ذرا مختلف رنگ میں دکھائی دیتی ہے :۔

گیت

پریم کے دکھ کو پریم ہی جانے
دل کی دھڑکن بھی پہچانے

جگ کی ساری پیاری باتیں اب ہیں جیسے بیتی راتیں
میں ہوں اور پیتم کی ہتھیلی جان تھی میری، وہ بھی لے لی
کام کاج گھر کے نہیں بھائیں دل سے آہیں پھوٹ ہی آئیں
کیسے رکیں، کیسے رک جائیں! گھر کرتا ہے سائیں سائیں
کون منائے، کون اب مانے؟
پریم کے دکھ کو پریم ہی جانے

سب دن ہر کوئی بات بنائے جو بھی ہے دوش مجھی کو لگائے
موت سے بڑھ کر تیکھی باتیں دکھ کے دن ہیں، دکھ کی راتیں
پیتم بھی کب روگ مٹائے آپ بھی اور دل کو اکسائے
کوئی نہیں جو کہے اب میری بیرن ہے دنیا سب میری
کیسے دل کے دکھ کو مٹاؤں؟ کس کو کہوں اور کس کو سناؤں؟
چنڈی داس کہے اب ہم سے پریم کا بھید کہو پیتم سے
پیتم سے تو چھوڑ دو بہانے!
پریم کے دکھ کو پیتم جانے

دشنو شاعری کی مثالوں میں ہمیں ایک ایسی آزادی نظر آتی ہے جو سنسکرت اور اس کے زیر اثر پیدا شدہ ادبی تخلیقات میں موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ آزادی دیہاتی ادب کی آزادی ایسی نہیں ہے۔ اس میں فن کارانہ رجحانات نمایاں ہیں یہ آزادی ایک بلند تر شاعرانہ ذہانت کی پیداوار ہے جسے اپنے فن کا مکمل احساس و شعور ہے اور اسی لئے دشنو شعراء نے قدیم پابندیوں سے جان بوجھ کر رہائی حاصل کی ہے۔ وزن کا قدرتی بہاؤ اور انداز اظہار و بیان کی خوبی اس میں موجود ہے۔ ودیاپتی یا چنڈی داس ایسے شعراء جب عوام کی زبان میں بھی کوئی چیز لکھتے ہیں تو نہ تو عوام کی سی کمزور باتیں اپنے شعروں میں رہنے دیتے ہیں، نہ قدیم خواص کے سے تکلفات کو روا رکھتے ہیں اور چنڈی داس اس لحاظ سے ودیاپتی کی بہ نسبت پیش پیش ہے۔ چنڈی داس کی ملاقات کے بعد ودیاپتی نے بعض چیزیں ایسی لکھی ہیں۔ جن میں سادگی کو دخل ہے لیکن چنڈی داس نے کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جس میں سادگی۔ اخلاص اور بے ساختگی کی خصوصیات نہ ہوں۔ ودیاپتی کے رادھا کرشن والے گیت اور ان سے متعلق قصے ہی اس اثر کو ظاہر کرتا ہے جو سنسکرت روایات نے اس کے فن پر کیا۔ کیونکہ اس میں جن چھوٹے چھوٹے واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ تمام تر قدیم روایات کے ماتحت تخلیق کئے گئے ہیں۔ اس کے برعکس چنڈی داس کی شیام کتھا کے واقعات ہی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ روایات سے کم فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور ذاتی تجربے کو ادبی تخلیق میں زیادہ درجہ دیتا ہے۔ مثلاً کرشن رادھا کے پاس ایک ایسی عورت کے بھیس میں پہنچتا ہے جو علاج معالجے کی ماہر ہے۔ اور رادھا کی نبض دیکھتا ہے۔ پھر ایک بار وہ مداری یا جادوگر کے بہروپ میں آتا ہے۔ اور گاؤں کی تمام عورتیں اس کے کرتب دیکھتی ہیں لیکن یہ تماشا پردے کے اس پار ہوتا ہے اور کرشن کی محنت کی داد رادھا کے چہرے کی صرف ایک دزدیدہ جھلک ہوتی ہے پھر ایک بار نائن کے بھیس میں رادھا سے ایک لمحے کو مل جاتا ہے کبھی کسی راہبہ کا بہروپ بنا کر اسے دعا دینے کے بہانے سے دو باتیں کر جاتا ہے اور اسی طرح

رادھا بھی کرشن سے ملنے کو چھپ چھپ کے جاتی ہے۔ کبھی گوالے کے بھیس میں اور کبھی کوئی اور موقع دیکھ کر اس کے مطابق بہروپ میں۔

اس قسم کے بیان سے ملتے جلتے واقعات۔ اگرچہ ہمیں سنسکرت ادب میں کہیں نہ کہیں مل سکتے ہیں پھر بھی چنڈی داس کی پیش کش کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ ایک روایتی بات کی بجائے۔ اس کا اپنا تجربہ معلوم ہوتے ہیں جو اسے رامی کی محبت میں ہوا ہو۔

اگرچہ چنڈی داس اپنی زندگی ہی میں اپنی داستانِ عشق کی وجہ سے مشہور اور اپنے گیتوں کی وجہ سے کافی مقبول ہو چکا تھا اور اس کی شہرت اور مقبولیت بنگال سے باہر بھی پہنچ چکی تھی لیکن اپنے زمانے کے بعد سے تو وہ وشنو شاعری کا ایک ستون مان لیا گیا ہے۔ بعد کے شعراء نے اپنے کلام میں اکثر اسے خراجِ تحسین پیش کیا ہے مثلاً ایک شاعر لکھتا ہے۔

"مرحبا تجے دیو کو جو شاعری کے شہزادوں کا سب سے چمک دار ہیرا ہے مرحبا ودیاپتی کو جو نفیس جذبات کا مخزن ہے۔ اور مرحبا چنڈی داس کو جو نازک احساسات کی انتہائی بلندی کو حاصل کئے ہوئے ہے جو اس دنیا میں اپنی مثال آپ ہے"

اس سے زیادہ تعریف اور کیا ہوسکتی ہے ---- ہاں اگرچہ ودیاپتی اور چنڈی داس دونوں کا موضوع ایک ہی تھا لیکن ودیاپتی کا زیادہ رجحان ملاقات اور اس کی مسرتوں کی طرف ہے۔ اس کے کلام میں خوش گوار تشبیہات اور ایک ایسا زور ہے جو ہمہ گیر ہے۔ اور اس کے تصورات ایک تازگی سے لبریز ہیں۔ چنڈی داس کا خاص میدان فراق اور اس کی شدید تکالیف ہیں اور اس کے گیتوں میں سادہ اور دل کش تصورات ہیں۔ جن میں پُر تکلف تزئین و آرائش کلام کو دخل نہیں ہے۔ ودیاپتی کے کلام میں محبت کی تازگی اور گرم جوشی ہے۔ اور چنڈی داس کے کلام میں محبت کی گہرائی اور شدت۔ البتہ روحانی پہلو سے دونوں کا کلام یکساں ہے اور نغمگی کے لحاظ سے بھی ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے گیت گانے کی بہترین تخلیقات ہیں۔ ودیاپتی ایک عالم تھا اور چنڈی داس ایک عاشق۔ اور اسی لحاظ سے ان کے کلام میں بھی ان کی طبعی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس کی ایک عام مثال دونوں کے کلام سے رادھا کے تصور کی دی جاسکتی ہے۔ ودیاپتی کی رادھا ایک حسن کا رکا سنہرا خواب ہے جو انسانی جسم میں دکھائی دے رہا ہے۔ اور چنڈی داس کی رادھا —— اس کی اپنی محبوب عورت رامی ہی کا عکس ہے۔

دونوں شاعروں کے عیوب بھی نمایاں اور انفرادی قسم کے ہیں۔ ودیاپتی اکثر اپنے تکلف کی وجہ سے ساختہ تصورات پیش کر دیتا ہے۔ اور چنڈی داس ہجر کے واویلا سے یکساں اور بیزار کن ہونے لگتا ہے۔

اور اب چند گیت :-

آہ محبت، آہ محبت، میٹھی ہے سب کہتے ہیں !
لیکن پھر کیوں میری چاہ میں بس کے سوتے بہتے ہیں ؟
میں نہ ملوں گی، میں نہ ملوں گی، باتیں کرنے والوں سے
گھر پہ پیار کروں گی اپنی سندرتا کے جاووں سے !
یوں سُکھ لے کر کیا میں جیت نہ لوں گی ساری باتوں کو!
اور یوں چین سے بھر دوں گی میں اپنی روح کی راتوں کو!
چنڈی داس جنم جس کے دو ہیں وہ ایسے کہتا ہے !
یوں نہیں تیرا روپ آسے جیتے گا۔ مجکو بھروسا ہے!"

(۲)

سُنو سجنی ! مرے جیون کو اس کی چاہ لے ڈوبی
بڑا دن تھا۔ کہ جب پہلے پہل کاہن کو دیکھا تھا
کہ اُس دن سے مرے جی میں نہیں کچھ بھی رہا باقی۔
محبت آگ ہے۔ میں گر رہی ہوں آگ کا پیچھا
ٹھہرتی ہوں ٹھہرتے ہی میں جل رہتی ہوں دوبارہ۔
وہ کوئی اور ہوگی آگ جو پانی سے بجھ جائے
مگر یہ آگ آنسوؤں سے سُلگی ہے نہیں بجھتی۔
بجھاؤ، ہاں۔ بجھا دیکھو۔ تمھارے بس میں ہو جتنا
مگر یہ آگ دگنے زور سے پھر جل ہی اُٹھے گی،
دکھائی دے رہے ہیں دور بن کی آگ کے شعلے۔
مگر ایسے نہیں ہیں میرے من کی آگ کے شعلے،
ذرا دیکھو چھوؤ۔ اس جسم کو تم اپنے ہاتھوں سے
سمجھ میں آ ہی جائے گا یہ بیرن آگ ہے کیسی !
مرے دل میں میری سجنی! برہ کی آگ جلتی ہے
یہ اگنی ہے جدائی کی، جدائی شیام سندر سے،
مرے دل کو مری سجنی ! اسی اگنی نے گھیرا ہے،
میں ہر دم شیام سے دوری پہ آنسو ہی بہاتی ہوں
مرے دل میں ابھی تک شیام کی آشا کا ڈیرا ہے،
مجھے ہر سانس گویا تیر ہے۔ ہاں تیر سا زہری !
مگر سندر! یہ سُن لے بات ۔ چنڈی داس کہتا ہے :

خوشی کے ساتھ گر تو جھیلتی جائے گی دُکھ سارا
گھٹائیں دُور ہو جائیں گی، چھا جائے گا اندھیارا"

---

(۳)

رادھا بولی

یہ ہے اس کے پریم کی بنسی کا سرماتا، موہن جادو؛
کنول نین کے کرشن کنھیا
موہن، برندا بن کے بستیا
ہم کو بلائیں
ہم کیسے پتھر بن جائیں؟
دل کانپیں، لرزیں، تھرائیں،
تن پنجرا گھر کے آنگن میں،
من کا پنچھی برندا بن میں!
برندا بن میں کرشن کنھیا ڈول رہی ہرنے کی نیّا!

چاند چکور کے دل کو بھائے آشا کے جھولے میں جھلائے
دھرتی سے اُڑ کر جب جائے دُکھ کو بھولے سکھ کو پائے
اتنا بتا دُ یہ تو سمجھاؤ
کب پہنچیں گے؟ کب دیکھیں گے
نٹ کھٹ ناگر، دکھ بہ سکھ کر کے پھیلے، لہراتے بازو؟

---

(۴)

اس کی آنکھوں میں ہے بس شیام کی موہن مورت
اس کی آنکھوں میں نہیں اور کوئی بھی صورت
کان میں نام اگر ہے تو وہ اک شام کا ہے
دل میں بھی دھیان اگر ہے تو اسی نام کا ہے
اس نے پہنا ہے لباس اپنے بدن پر کالا
نیلے پھولوں سے بنائی ہے اک اچھی مالا
اس کے سینے کی سجاوٹ کے لئے ہے نیلم!
اور وہ کہتی ہے "مری سانولی سجنی! پریتم!
"آ! بس آ جا، مرے آغوش میں آ جا سجنی!
انگ سے اپنے مرا انگ لگا جا سجنی!"

وہ تو اک اونچے گھرانے کی ہے سندر بیٹی
ہر گھڑی دل ہے اور اس دل میں ہے اک بے چینی!
اس کا دل موہ لیا تم نے، تم ہی نے مادھو!
یاد کرتی ہے وہ ہر وقت، ہمیشہ تم کو!
دور ہوتا ہی نہیں دھیان تمھارا موہن
دل میں ہے دھیان ہر اک آن تمھارا موہن!
دیکھو دیکھو، وہ جو صورت تھی کنول کی صورت
اب وہ سنولا گئی، مرجھا گئی موہن مورت
اس کی آنکھوں سے بہی آتی ہے آنسوں دھارا
اور ان آنسوؤں سے بہ گیا کاجل سارا
اس کے بس ہی میں نہیں کیسے بھلائے تم کو؟
رحم کی بات ہے، رحم آئے تو آئے تم کو!
نیند سے خالی ہیں اب، خالی ہیں اس کی راتیں
دکھ سے بھرپور ہیں، دکھ والی ہیں اس کی باتیں
شیام سندر! ارے ہاں شیام! ذرا سچ کہنا
بس میں ہے، بس میں تمھارے ہی تو دارو اس کا
اور اب سن لو کہ یوں کہتا ہے چنڈی داسا
"اس طرح چین نہ پائے گا جو دل ہے پیاسا
چند ہی دن میں بس اب ہو گا تمھارا بندھن!
پاس آ جائیں گے، اور تم سے ملیں گے موہن!"

---

(۵)

رات اندھیری، بادل گہرا
ایسی رات میں کیسے آیا؟
ہم سے ملنے پریتم پیارا؟

چھم چھم برسے مینہ کی دھارا
پھلواری میں براجے پیارا
دیکھ کے دل بے چین ہمارا

دیکھ سکھی! پریتم آئے ہیں — میرے گن ہی انہیں لائے ہیں
کیسے چھوڑوں گھر کا آنگن؟ — گھر والے اور نندی بیرن

کیوں بھیجا تھا میں نے بلاوا؛ پیتم کو بھی دُکھ میں ڈالا
دیکھ کے اس کے دل کی لگن کو
دھیان آتا ہے میرے من کو
آگ لگاؤں اس آنگن کو
توڑوں لاج کے بربندھن کو
چنڈی داس کہے یہ کہانی کر دے گی جگ کو نورانی"

(۶)

کس نے لیا شیام نام؟
مجکو یہ بتا سکھی ——— کان سے سنا اسے ——— دل میں جا بسا مرے
روح پریشاں ہوئی
میں یہ نہیں جانتی
کتنی مٹھاس اس میں ہے کیسے زبان سے ہٹے؟
بول بول ہر گھڑی
ہوگئی ہوں باؤلی

مجکو یہ بتا سکھی!
کس نے لیا شیام نام؟ ——— اے سکھی بتا مجھے
کیسے ملوں گی اسے!
نام ہی سے یہ ہُوا موہنی سی کر گیا
جسم اُس نے جب چھُوا کہہ سکھی کہ ہوگا کیا؟
جس جگہ ہے اس کا گھر اس جگہ کنو ٔریاں
اُس کا روپ دیکھ کر ضبط کر سکیں کہاں؟
سوچ ہے یہی مجھے
بھول جاؤں میں اُسے!
بھول کیسے جاؤں میں کس طرح بھلاؤں میں؟
کہہ سکھی میں کیا کروں؟
اس کی کیا دوا کروں؟
گھر سے بات توڑ کر لاج شرم چھوڑ کر
جس کو دیکھو اُس کو ہی دُھن ہے اُسکی چاہ کی
بول بول میں تھکی
مجکو یہ بتا سکھی!

کس نے لیا شیام نام؟

(۷)

سکھ کو بنائی تھی اک کٹیا
آگ لگی تو کچھ بھی نہ دیکھا
امرت کے ساگر کو بلویا بس ہی میرے ہاتھوں میں آیا
پہلا دھن بھی آپ سے کھویا کچھ بھی نہ پایا، کچھ بھی نہ پایا
چندرمان کی سیتل چھایا
بن گئی سوریہ کی اگنی مایا
اس نے بھی دل کو جھلسایا
پربت پر جانے کی ٹھانی اب میں ہوں اور گہرا پانی
دھن کے کھوج میں نکلی گھر سے ہیرے بھی ہیں اب پتھر سے
ساگر میں اک بند بنایا
بند بنا کر شہر بسایا
شہر مٹا اور ساگر سوکھا
کچھ بھی نہ پایا، کچھ بھی نہ پایا
دل بولا ڈھونڈو بادل کو پیاس مٹے اپنی تو سکھ ہو
بادل بھی تھا میرا بیری برکھا کیسی! بجلی تڑپی،
جس پہ گری اس کو ہی مٹایا
کچھ بھی نہ پایا، کچھ بھی نہ پایا
چنڈی داس کہیں اب "لوگو! ہونی کو بھوگو! ہونی کو بھوگو
دل میں تمھارے نام شیام کا ہردے لگا ہے تیر کام[1] کا
"شیام نام دو جگ کی مایا
"شیام نام ہے سیتل چھایا"

رادھے شیام کے امر پریم نے جو لیلا برندابن میں رچائی، اُسے چنڈیداس نے آنے والی نسلوں کے لئے اپنے لافانی گیتوں میں سمویا، اور میں بھی بنگالی کرشن بھگت کے گائے ہوئے گیت اپنی زبان میں دہرا کر اس آنند ساگر کے مزے لیتا ہوں۔

میراجی

[1] کام دیو۔

خوشی کے ساتھ گر تو جھیلتی جائے گی دکھ سارا
گھٹائیں دور ہو جائیں گی، چھا جائے گا اندھیارا"

---

(۳)

رادھا بولی

یہ ہے اس کے پریم کی بنسی کا مدماتا موہن جادو:
کنول نین کے کرشن کنھیا
موہن، برندابن کے بستیا
ہم کو بلائیں
ہم کیسے پتھر بن جائیں؟
دل کانپیں، لرزیں، تھرائیں،
تن چھڑا گھر کے آنگن میں،
من کا پنچھی برندابن میں!
برندابن میں کرشن کنھیا ڈولے ری [illegible] بنسی کی نیا!

چاند چکور کے دل کو بھائے — آشا کے جھولے میں جھلاتے
دھرتی سے اٹھ کر نبھ جائے — دکھ کو بھولے سکھ کو پائے
اتنا ہی تو — یہ تو سمجھاؤ
کب تک ہیں گے — کب دیکھیں گے
نٹ کھٹ ناگر، دکھ ہر سکھ کر کے پھیلے، لہراتے بازو؟

(۴)

اس کی آنکھوں میں ہے بس شیام کی موہن مورت
اس کی آنکھوں میں نہیں اور کوئی بھی صورت
کان میں نام اگر ہے تو وہ اک شام کا ہے
دل میں بھی دھیان اگر ہے تو اسی نام کا ہے
اس نے پہنا ہے لباس اپنے بدن پر کالا
نیلے پھولوں سے بنائی ہے اک اچھی مالا
اس کے سینے کی سجاوٹ کے لئے ہے نیلم!
اور وہ کہتی ہے "مری سانولی سجنی! پریتم!
"آ! بس آجا، مرے آغوش میں آجا سجنی!
انگ سے اپنے مرا انگ لگا جا سجنی!"

وہ تو اک اونچے گھرانے کی ہے سندر بیٹی
ہر گھڑی دل ہے اور اس دل میں ہے اک بے چینی!
اس کا دل موہ لیا تم نے، تم ہی نے مادھو!
یاد کرتی ہے وہ ہر وقت، ہمیشہ تم کو!
دور ہوتا ہی نہیں دھیان تمھارا موہن
دل میں ہے دھیان ہر اک آن تمھارا موہن!
دیکھو دیکھو، وہ جو صورت تھی کنول کی صورت
اب وہ سنولا گئی، مرجھا گئی موہن مورت
اس کی آنکھوں سے بہی آتی ہے افسوں دھارا
اور آن آنسوؤں سے بہ گیا کاجل سارا
اس کے بس ہی میں نہیں کیسے بھلائے تم کو؟
رحم کی بات ہے، رحم آئے تو آئے تم کو!
نیند سے خالی ہیں اب خالی ہیں اس کی راتیں
دکھ سے بھرپور ہیں، دکھ والی ہیں اس کی راتیں
شیام سندر! ارے ہاں شیام! ذرا سچ کہنا
بس میں ہے، بس میں تمھارے ہی تو دارو اس کا
اور اب سن لو کہ یوں کہتا ہے چنڈی داسا
اس طرح چین نہ پائے گا جو دل ہے پیاسا
چند ہی دن میں بس اب ہوگا تمھارا بندھن!
پاس آجائیں گے، اور تم سے ملیں گے موہن!"

---

(۵)

رات اندھیری، بادل گہرا
ایسی رات میں کیسے آیا؟
ہم سے ملنے پریتم پیارا؟

چھم چھم برسے مینہ کی دھارا
پھلواری میں براجے پیارا
دیکھ کے دل بے چین ہمارا
دیکھ سکھی! پریتم آئے ہیں — میرے گن ہی انہیں لائے ہیں
کیسے چھوڑ دوں گھر کا آنگن؟ — گھر والے اور نندی بیرن

کیوں بھیجا تھا میں نے بلاوا؛ پریتم کو بھی دکھ میں ڈالا
دیکھ کے اس کے دل کی لگن کو
دھیان آتا ہے میرے من کو
آگ لگاؤں اس آنگن کو
توڑوں لاج کے ہر بندھن کو
چنڈی داس کہے یہ کہانی کر دے گی جگ کو نورانی"

(۶)

کس نے لیا شیام نام؟
مجکو یہ بتا سکھی —— کان سے سنا اسے —— دل میں جا بسا مرے
روح پریشاں ہوئی
میں یہ نہیں جانتی
کتنی مٹھاس اس میں ہے کیسے زبان سے ہٹے؟
بول بول ہر گھڑی
ہو گئی ہوں باؤلی
مجکو یہ بتا سکھی!
کس نے لیا شیام نام؟ —— اے سکھی بتا مجھے
کیسے ملوں گی اسے!
نام ہی سے یہ ہوا موہنی سی کر گیا
جسم اس سے جب چھوا کہہ سکھی کہ ہو گا کیا؟
جس جگہ ہے اس کا گھر اس جگہ کنواریاں
اس کا روپ دیکھ کر ضبط کر سکیں کہاں؟
سوچ ہے یہی مجھے
بھول جاؤں میں اسے!
بھول کیسے جاؤں میں کس طرح بھلاؤں میں؟
کہہ سکھی میں کیا کروں؟
اس کی کیا دوا کروں؟
گھر سے بات توڑ کر لاج شرم چھوڑ کر
جس کو دیکھو اس کو ہی دھن ہے اس کی چاہ کی
بول بول میں تھکی
مجکو یہ بتا سکھی!
کس نے لیا شیام نام؟

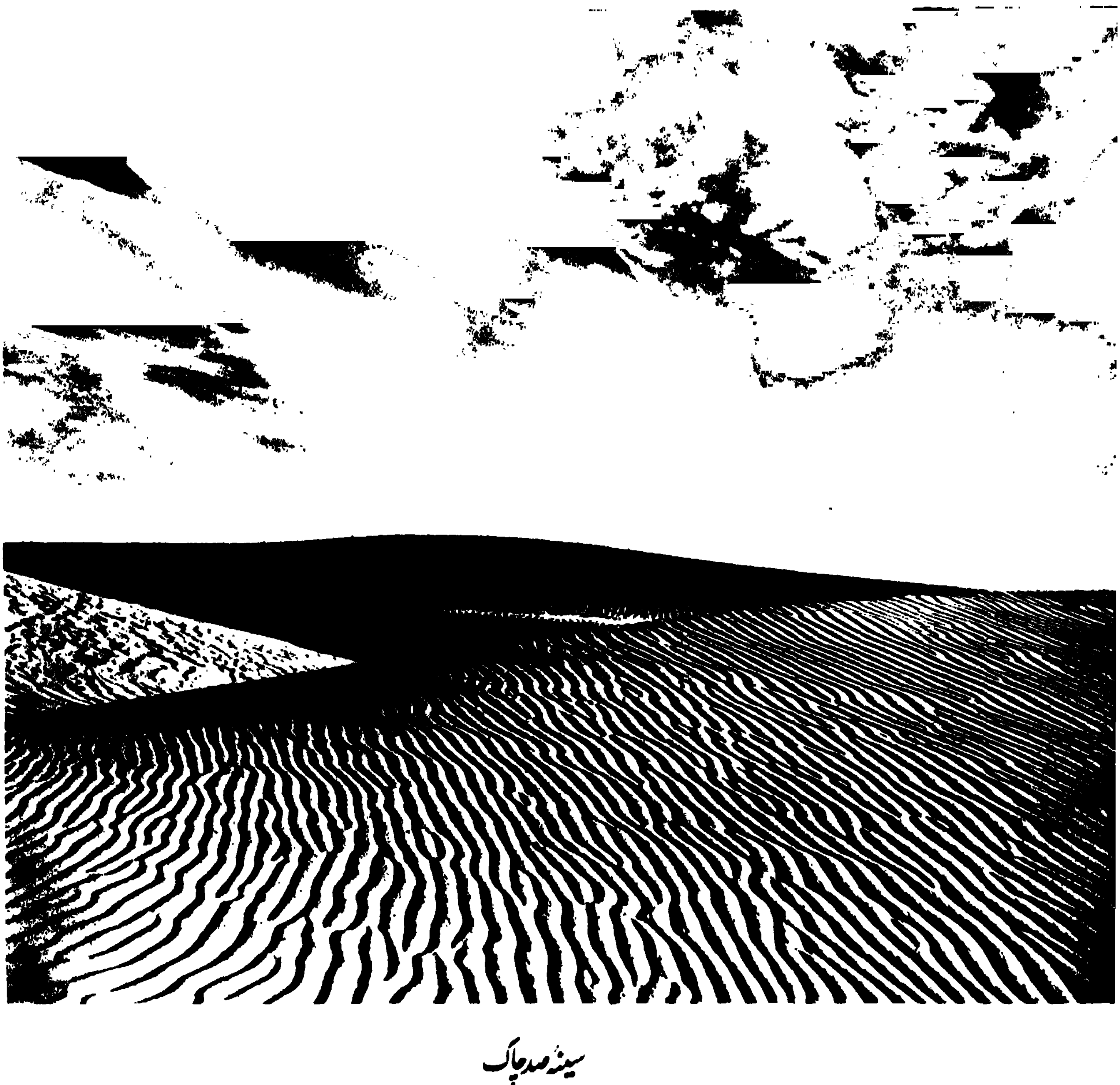
(۷)

سکھ کو بنائی تھی اک کٹیا
آگ لگی تو کچھ بھی نہ دیکھا
امرت کے ساگر کو بلویا بس ہی میرے ہاتھوں میں آیا
پہلا دھن بھی آپ سے کھویا کچھ بھی نہ پایا، کچھ بھی نہ پایا
چندرمان کی سیتل چھایا
بن گئی سوریہ کی اگنی مایا
اس نے بھی دل کو جھلسایا
پربت پر جانے کی ٹھانی اب میں ہوں اور گہرا پانی
دھن کے کھوج میں نکلی گھر سے ہیرے بھی ہیں اب پتھر سے
ساگر میں اک بند بنایا
بند بنا کر شہر بسایا
شہر مٹا اور ساگر سوکھا
کچھ بھی نہ پایا، کچھ بھی نہ پایا
دل بولا ڈھونڈو بادل کو پیاس مٹے اپنی تو سکھ ہو
بادل بھی تھا بیرا بیری برکھا کیسی؟ بجلی تڑپی،
جس پہ گری اس کو ہی مٹایا
کچھ بھی نہ پایا، کچھ بھی نہ پایا
چنڈی داس کہیں اب "لوگو! ہونی کو بھوگو! ہونی کو بھوگو
دل میں تمہارے نام شیام کا ہردے لگا ہے تیر کام[1] کا
"شیام نام دو جگ کی مایا
"شیام نام ہے سیتل چھایا"

رادھے شیام کے امر پریم نے جو لیلا برندابن میں رچائی، اُسے چنڈی داس نے آنے والی نسلوں کے لئے اپنے لافانی گیتوں میں سمویا، اور میں بھی بنگالی کرشن بھگت کے گائے ہوئے گیت اپنی زبان میں دہرا کر اس آنند ساگر کے مزے لیتا ہوں۔

میراجی

۱؎ کام دیو۔



سینۂ صد چاک



وہ مارا!

محبوبہ کا سایہ

آکاش کے نیلے ساگر کا متوالا چاند ہے دل میرا،
لیکن اب نور نہیں باقی، مرجھایا ہے، ماند ہے دل میرا،
وہ نور کہ جس کی کرنوں کے سایوں سے دھندلکے بنتے تھے،
بوجھل احساس مرے دل کے چھن چھن کر ہلکے بنتے تھے،
اب نور کے رنگ مٹے سارے، اب ایک اندھیرا چھایا ہے،
اب تاریکی کے بندھن نے دکھ درد کا روپ دکھایا ہے!

کیسا تھا سماں جب سارا جہاں میری آنکھوں میں سمایا تھا،
وہ سایہ تھی، میں سایہ تھا، دونوں پر جادو چھایا تھا،
جیسے جنگل میں غزالوں کا اک جھرمٹ ڈر کر بھاگ اُٹھے،
اور پیچھے پیچھے شکاری کا ہر تیر بھی نیند سے جاگ اُٹھے،
سوکھے پتوں میں جا کے گرے، تھرا اُٹھے، جھنجلا اُٹھے،
جنگل کی فضا کے گنبد میں ٹوٹے تاروں کی صدا اُٹھے،
یہ سارا منظر بھی اب تو میری آنکھوں میں سمایا ہے،
اور یاد کے ساحل پر پانی کی جھاگ نے راج جمایا ہے!

اس شہر کا ہر سونا رستہ مجھ کو دھارا ہے ندی کی،
ہر راہ سے یاد تڑپ کے اُبلتی ہے پہلی سُکھ بیتی کی،
شوبھا ہے اونچے محلوں کی ہر راہ کے دونوں کناروں پر،
اک منظر نغمہ بنتا ہے میرے سازِ دل کے تاروں پر،
منظر ہے محل کا، رستے کا، رستے پر پریمی جاتا ہے،
چھت پر پیراہن لٹکا ہے، لہراتا ہے بل کھاتا ہے!
اور سورج اپنے نور سے پیراہن کو سایہ بناتا ہے،

دِل گُپت بھون کے ساگر کی سندرتا میں کھو جاتا ہے،
وہ گُپت بھون بھی سایہ ہے اک میرے دل کے مندر کا،
اُس میں رانی کی مورت ہے اور گیت اشنان کے منظر کا!
متوالا چاند چمکتا ہے، دل میرا — انگ کسی کا ہے،
رِستا ہے لہو میرے دل کا اور اُس میں رنگ کسی کا ہے؛
چھت پر پیراہن لٹکا ہے، رانی اشنان میں کھوئی تھی،
کیا بیتی رات وہ سکھ کی سیج پہ ساتھ کسی کے سوئی تھی!
یہ سُوجھ جگاتی ہے دل میں اک درد کے مہلک جادو کو،
اَور گُپت بھون کا منظر خون بنا دیتا ہے آنسو کو۔
منظر ہے محل کا، رستے کا، رستے پر پریمی جاتا ہے،
چھت پر پیراہن لٹکا ہے، لہراتا ہے، بل کھاتا ہے،
اور درد کا پنچھی تنگ آکر اک ڈالی پر رُک جاتا ہے،
دل گیانی ہے سو رنگوں کا، یہ بات نئی سمجھاتا ہے،
"یہ پیراہن آنے والی، میٹھی، متوالی راتوں میں۔
"تیرے گالوں کو سہلائے گا — سیج کی اُن برساتوں میں
"کچھ دھیان نہ اِس کا آئے گا: پھلواری میں سو بھنورے تھے۔
"انمول بدن تھا پریتم کا، سولہ سنگار سے سنورے تھے
سب انگ اچھوتے، ان دیکھے، اور سُکھ کی سیج سہانی تھی،
اَوروں کے لئے تو اُجالا تھا، پریمی کو دُکھ کی کہانی تھی"

یہ دل کی بات لگی پیاری، میں دھیان کی دُھن میں ڈوب گیا،
دُکھ درد مٹا، میدان میں ہارا، دور ہُوا — محجوب گیا!
لیکن یہ رنگ خیالوں کے اب میری نظر میں سمایا ہیں،
سب بیتی رات کا جادو ہیں، سب پہلے جنم کی مایا ہیں۔

میراجی

آوازیں

گھوم کر آتی ہیں آوازیں قریب و دُور سے
راہ میں مُنہ زور سنّاٹوں سے ٹکراتی ہوئی
خامشی کی پُرسکوں لہروں میں پڑتے ہیں بھنور
گُھورنے لگتی ہے سنّاتی ہوئی ٹھنڈی ہوا
کانپ سا جاتا ہے پھیکی تیرگی کا سرد دِل
تیرنے لگتی ہیں ذرّوں کی حسیں پرچھائیاں
اور ———— اور
اس طرح آتی ہے آوازوں کے کھو جانے کی گونج
جس طرح دل ڈوب جاتا ہے کسی حسّاس کا

(۲)

اور پھر — اکثر صدائیں دُور کی آتی ہیں پاس
جھلملاتے نور کے سایوں سے کتراتی ہوئی
سنسناتی، نرم آوازیں، مہین و شرمگیں
کھیلتی، رُکتی، تھرکتی، ناچتی، گاتی ہوئی
حیطۂ احساس میں رکھتی ہیں جب اپنے قدم
چونک اُٹھتے ہیں کئی بے رنگ خوابوں کے خیال
اور ———— اور
رفتہ رفتہ اس طرح ہوتی ہیں خاموشی میں گم
جیسے کھو جائیں کسی اندھے پجاری کے حواس۔

یُوسف ظفر

اُردو میں ڈرامانگاری کے متعلق بعض آرا

ساقی (دہلی) "جناب سید بادشاہ حسین صاحب نے "اردو میں ڈرامانگاری" کے نام سے ۴۰۰ صفحات کی ایک عمدہ کتاب شائع کی ہے! اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں اور مضامین سے مدد لی گئی ہے ان کی تعداد ۲۴۳ ہے۔ اس سے مصنف کی کاوش اور تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب کا ہر باب اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ غور سے کیا جائے۔ اس کتاب میں نہ صرف اردو ڈراموں کی تاریخ خوش اسلوبی سے بیان کی گئی ہے بلکہ فنی معلومات کا ایک ذخیرہ بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر درسگاہ اور ہر لائبریری میں اسے شامل کیا جائے"

کامران (دہلی) "... جہاں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ایک جوان دماغ ہوگا وہاں ہر نتیجۂ فکر اور ہر رشحۂ قلم اپنی نظیر آپ ہو گا"

زمانہ (کانپور) "... یہ دلچسپ اور محققانہ تصنیف پندرہ مختلف ابواب پر مشتمل ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب مفید اور پُراز معلومات ہے جن حضرات کی طبائع کو تحقیقات سے لگاؤ ہے ان کے لئے اس کا مطالعہ بہت دلچسپ ہو گا"

جامعہ (دہلی) "... فاضل مصنف نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ تمثیل کی مختلف اصناف پر روشنی ڈالی ہے اداکاروں کی حرکات و سکنات سے بھی اس کتاب میں مفصل بحث کی گئی ہے کہ انہیں بنا کر دار ادا کرتے وقت کن کن خاص باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے"

نگار (لکھنؤ) "... کتاب مفید ہے اور کافی معلومات اس میں فراہم کر دی گئی ہیں اس کتاب کے مصنف حیدرآباد کے ایک خوش فکر نوجوان ہیں اور اس سے قبل بھی دو ایک کتابیں آپ کی شائع ہو چکی ہیں"

ادبی دنیا (لاہور) "اردو ڈراما پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں سید صاحب موصوف نے اپنی کتاب کو جس محنت و کاوش سے ترتیب دیا ہے اور جس کثرت سے معلومات فراہم کی ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کی آرا اردو ڈراموں اور ڈرامانگاروں کے متعلق پہلے نقادوں کی نسبت زیادہ صائب اور زیادہ تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں قیمت مجلد ...

اوٹین کریم اور سنو

فلم اور سٹیج کے درخشاں ستاروں کے رنگ و روپ کو پائدار بنانے کے لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے اعصاب اور پٹھوں کی صفائی پرورش کے لئے خوراک اور زندگی بخش طریقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اوٹین کریم اس بلند معیار کی تمام حاجتوں کو پورا کرتی ہے۔ یہ مسام سے فالتو مواد کو خارج کرتی ہے ان کے بند ہو جانے کو روکتی ہے اور اس طرح جلد کو ہوا سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقع دیتی ہے اس سے جلد کی دونوں طرف کے سوراخوں کی پرورش ہوتی ہے جلد کے نیچے خون کے جو ننھے ننھے ذرے موجود ہوتے ہیں اس سے وہ تازہ ہو جاتے ہیں اور خون کی گردش صحت کے صحیح اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور رنگ و روپ میں جوانی کی تازگی لوٹ آتی ہے۔



سادھنا بوس کے فن

رقص کی تکمیل اس کی بے عیب جلد اور نکھرا ہوا رنگ ہی کرتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ اس کی یہ صفات اوٹین کریم کے باقاعدہ استعمال کی مرہون ہیں ہر شب اوٹین کریم کا استعمال جلد کو از سرِ نو زندہ کر دیتا ہے۔

OATINE CREAM is indispensable for my toilet. I have been using it for a long time, and find it delightful, and extremely necessary to preserve a perfect skin.

Sadhona Bose



Oatine CREAM *for nightly massage* SNOW *for daily protection*

ہر روز سوتے وقت اوٹین کریم کی مالش سے چہرے اور گردن کے اعصاب زور حاصل کرتے ہیں، یہ کریم جلد کو ڈھیلا ہونے یا اس پر جھریاں پڑنے سے بچاتی ہے اور بہت آسانی سے قدرتی طور پر نیند کے دوران میں آپ کے حسن میں ایک نئی زندگی لاتی ہے۔
دن کے وقت اوٹین سنو کے استعمال سے ایک ٹھنڈک پہنچتی ہے اور حسن کو دن بھر دھوپ ہوا، گرد اور پسینے سے محفوظ رکھتی ہے

خوبصورتی کو بڑھانے اور قایم رکھنے کے لئے صرف انہی کی ہی ضرورت ہے





...rma & Zahur Shah in "HIMAT"

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۱ء

جلد ۱۹ — تصویر: آئندہ نسلیں — نمبر ۲

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس میں باہتمام صلاح الدین پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا اوپر مال لاہور سے شائع ہوا

دنیائے کاروبار

حصّہ فلم

راج نرتکی

وادیا مووی ٹون کا تازہ ترین کارنامہ راج نرتکی فلمی باتوں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے کئی پہلوؤں سے لائق توجہ ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ غالبًا ہندوستانی صنعت فلم سازی میں پہلا موقعہ ہے کہ ایک ہی کہانی کو بیک وقت تین زبانوں (ہندوستانی بنگالی اور انگریزی) میں پیش کیا جا رہا ہے، اس کے علاوہ اگر ایک طرف مادھو بوس جیسا تجربہ کار فن کار ڈائرکشن کے لحاظ سے فلم کی خوبیوں کا ذمہ دار ہے تو دوسری طرف اُس کے اداکاروں کا اجتماع بھی بہت پر زور ہے، اداکاروں میں سب سے پہلا نام بین الاقوامی شہرت کی رقاصہ سادھنا بوس کا ہے جس نے پردۂ سیمیں پر اس سے پیشتر کُم کُم رقاصہ نامی کھیل میں اپنے رقص کے کمالات دکھا کر فلم کے متوالوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایک رقاصہ کے علاوہ ایک لائق اداکار بھی ثابت کیا ہے۔ دوسرا نام پرتھوی راج کا ہے جس کی اداکارانہ صلاحیتوں کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے۔ کیونکہ خاموش فلموں کے زمانے سے کہ اب تک اُس نے بے شمار فلمی افسانوں میں اپنی بے نظیر اداکاری سے اپنے فن کی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ اس کے علاوہ بنگال کے مشہور کیریکٹر ایکٹر ارمین چودھری بھی ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان تین درخشاں ستاروں کے علاوہ ذیلی کردار بھی کچھ کم نہیں نیام پلی فلم کا پرانا آدمی ہے، اور ریوتما داس گپتا اور بنیتا دو دلکش صورتیں فلم کی خوبیوں میں چار چاند لگا رہی ہیں۔ اس کے مکالموں کی خوبیوں کے لئے جناب وحید الدین احمد کا نام کافی ضمانت ہے جنہوں نے کُم کُم رقاصہ میں اپنی صاف اور رواں زبان سے لوگوں کو اپنے حسنِ تحریر کا قائل کر لیا تھا۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ یہ قابلِ ذکر فلم عنقریب لاہور کے رٹز سینما میں شائقین کے لئے دلچسپی کا باعث بنے گی،

سوہنی مراد

پنجاب کی رومان نواز سرزمین شاید عشق و محبت کے افسانوں کے لحاظ سے خصوصًا زرخیز معلوم ہوتی ہے۔ فلم بین طبقہ اس سے پیشتر ہیر رانجھے اور

جیساکہ ہر پنجابی جانتا ہے۔ پنجابی کے سب سے بڑے شاعر وارث شاہ کی لافانی نظم ہیر ہی کے دو کردار ہیں لیکن وارث شاہ کی "ہیر" میں سوہنی اور مراد کا قصہ ذیلی حیثیت رکھتا ہے۔ اب شائقین کو موقعہ ملا ہے کہ وہ اس ذیلی قصے کو ایک اہم افسانے کی صورت میں دیکھ سکیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ پنجابی میں یہ فلم ایک خاص درجہ حاصل کر کے رہے گا۔

خزانچی

یہ فلم پنچولی پکچرز کا تازہ ترین کارنامہ ہے اور اس کی زبان اردو ہے۔ پنچولی پکچرز نے پنجاب کی صنعت فلم سازی کو جو بے حد غیر نمایاں تھی اپنے پہلے دو پنجابی فلموں سے ایک دو سالوں ہی میں تمام ہندوستان کی نظروں میں ممتاز بنا دیا ہے۔ اب تک یہ کمپنی صرف پنجابی کھیل ہی تیار کرتی رہی لیکن اردو کا یہ تازہ کارنامہ اُن کی بڑھتی ہوئی ہمت اور بلند ارادوں کا بیّن ثبوت ہے۔ کہانی کے لحاظ سے جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے یہ فلم ایک مؤثر تصویر ثابت ہوگی اور انسانی جذبات کی نیرنگیوں کو ظاہر کرے گی۔ اداکاروں کے لحاظ سے صرف دو نام ہی اس کی خوبیوں کی کافی سے زیادہ ضمانت ہیں۔ ایم اسمٰعیل جو پنجاب کا سب سے بڑا فلمی کیریکٹر ایکٹر ہے۔ اس کھیل کے ایک اہم کردار کی نمائندگی کر رہا ہے۔ رمولا وہ چنچل صورت جس نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی شوخ اور دلکش اداکاری کا کمال دکھا کر لوگوں کے دلوں کو لبھا لیا ہے۔ اس فلم کی ایکٹرس ہے۔

پوجا

"عزیزِ جہاں ہونا کسبِ کمال" کا ثبوت ہے۔ اور اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نیشنل سٹوڈیوز بمبئی کا تازہ ترین کارنامہ پوجا بمبئی میں ڈھائی ماہ سے خراجِ تحسین حاصل کر رہا ہے اور یہ قبولیت عام ہر روز بڑھتی ہی جاتی ہے تو ہمیں یقین کرنا پڑتا ہے کہ ضرور اس کھیل میں فن کی خوبیاں اور دوسری دلچسپیاں موجود ہوں گی۔ اس کھیل کی کہانی کا موضوع دو بہنوں کا باہمی افسانۂ کشمکش ہے چھوٹی بہن کی بیٹی کو بڑی بہن متبنّٰی بنا لیتی ہے اور یوں دونوں اس لڑکی سے ایک گہری وابستگی محسوس کرنے لگتی ہیں۔ اُن کا یہ جذبۂ محبت ہی باہمی نزاع و کشمکش کا باعث بنتا ہے ایک طرف بیٹی ایک طرف بہن ۔۔۔ اس اُلجھن کے مختلف

تو سمجھتے ہیں کہ ان دونوں کا یہ پارٹ اُن کے زمانۂ فلم کا کامیاب ترین کا پارٹ ہے۔ بیٹی کا پارٹ جیوتی نے ادا کیا ہے جو ایک ہونہار ایکٹرس ہے ڈائرکٹر کا سردار ایک کہنہ مشق ڈائرکٹر ہے اور جب سے وہ اپنے ابتدائی ہنگاموں سے رہائی حاصل کر چکا ہے ہر تازہ کھیل میں اس کا قدم ترقی ہی کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ کھیل اس نظریے کی تازہ ترین مثال ہے۔ اس کی کہانی اور مکالمے ایم صادق نے لکھے ہیں جو اس سے پہلے ہولی اور ٹھوکر کے ذریعے سے روشناس ہو چکا ہے اور گیت شرط غزنوی کی تخلیق ہیں۔

امید ہے کہ بمبئی ہی کی طرح ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی نوجوان کو قبولیت حاصل ہوگی۔

شکی شوہر

بلی موریا، ہادی، جال مرچنٹ آسمان فلم کے قدیم ستاروں میں سے ہیں اور رسی بھگت اور مدر انڈیا کے مصنف کے تازہ افسانہ شکی شوہر میں یکجا ہو رہے ہیں اس کا افسانہ نفسیاتی ہے اور ایک جج کی زندگی سے متعلق جو عدالت میں اگرچہ اپنے فرض یعنی انصاف کو بھول جاتا ہے لیکن قدرت اس سے اس کوتاہی کا انتقام اس صورت میں لیتی ہے کہ اُسے اپنی بیوی پر اعتماد نہیں رہتا۔ للتا پوار کلیانی اور شمیم نسائی کرداروں کے حسن و خوبی کے ذمہ دار ہیں۔

پنر ملن

بمبئی ٹاکیز کا تازہ ترین فلم ہے جو کشور ساہو اور سنیہ پربھا پردھان کی دلکش جوڑی کو لئے ہوئے رقص و نغمے کے ذریعے سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہا ہے۔ کہانی سیدھی سادی سماجی سی چیز ہے لیکن گیتوں کی دلکشی اور خصوصاً لیکی موہنی اور مہربات کو نظروں سے اوجھل سا کر دیتی ہے۔ سنیہ پربھا اپنی درخشانی سے ظاہر کر رہی ہے کہ آئندہ چل کر بہت جلد وہ اپنے آپ کو ایک ستارہ بنا لے گی کشور ساہو اپنی آواز اور سادگی سے لبریز شخصیت کے باعث ایک خاص اپیل رکھتا ہے۔

"ہرجائی"

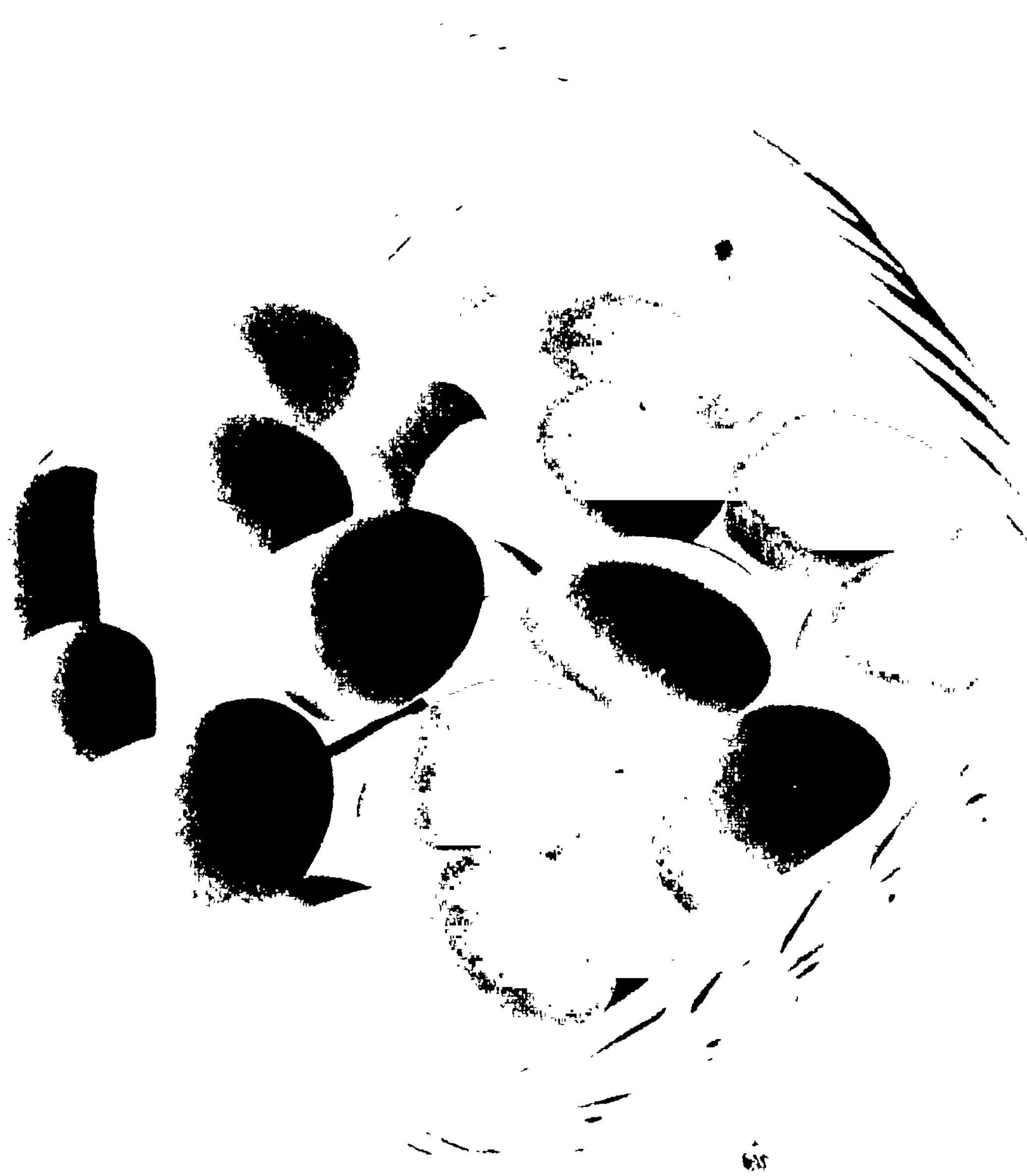
سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ

کا سالانہ منافع

مذکورہ بالا بنک کے چیف ایجنٹ لاہور کو بمبئی کے مرکزی دفتر سے مندرجہ ذیل تار موصول ہوا ہے۔

ہمارا سال رواں کا خالص منافع جس میں گذشتہ سال کا بقایا بھی شامل ہے ۳۸۵۵۵۰۷ روپے ہے۔ حصہ داروں میں ۴۳۹۸۰۵ روپے پہلے تقسیم ہو چکے ہیں اور اب ۶۷۲۵۲۸ روپے قطعی منافع کے طور پر دئے گئے ہیں جو سرمایہ پر سات فی صدی سالانہ کے حساب پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۸ آنے فی حصہ بطور بونس علیحدہ کیا گیا ہے۔ تین لاکھ روپے سنکنگ فنڈ میں اور ۷ لاکھ روپے سرمایہ محفوظ میں منتقل کئے گئے۔ دو لاکھ بیس ہزار روپے سٹاف کو انعام میں دئے گئے۔ اور ۳۱۸ ۸۱۲ روپے اگلے سال کے حساب میں ڈال دئے گئے۔

ہم بنک کو اس شاندار کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔



آئندہ نسلیں

بزمِ ادب

سالنامہ اس دفعہ جنوری کا پرچہ تھا اور اسے جنوری کے آغاز ہی میں شائع ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ادبی دنیا کے مخصوص سائز اور وزن کا کاغذ بازار میں نایاب ہو گیا ہے۔ اس تکلیف کے باعث چھپائی بیس بائیس دن تک ملتوی رہی اور پرچہ جنوری کے آخر میں تیار ہوا۔ جن خریداروں او ر احباب نے ہماری درخواست پر متوجہ ہو کر رجسٹری کے ٹکٹ ارسال کر دئیے تھے انہیں پرچہ بھیج دیا گیا ہے۔ اور باقی حضرات کی خدمت میں ارسال ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ موجودہ نمبر کے پہنچنے سے پہلے سالنامہ ہر جگہ پہنچ گیا ہو گا۔ جن اصحاب کو نہ ملا ہو وہ رجسٹری کے ٹکٹ بہت جلد بھیج دیں۔ دفترِ محصول ڈاک ادا کرنے کا ہر حال میں ذمّہ دار ہے لیکن ہزاروں رجسٹریوں کا بار اس پر ڈالنا زیادتی سی ہے اور رجسٹری کے بغیر سالنامہ بھیجنا اسے صریحاً موت کے منہ میں ڈالنا ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سالنامہ اپنے مضامین نظم و نثر اور تصاویر کے لحاظ سے کامیاب رہا یا ناکام۔ ابھی نہ معاصرین نے اس پر رائے کا اظہار کیا ہے اور نہ احباب نے۔ شاید اگلے ماہ تک ہمیں اُن کی آرا موصول ہو جائیں۔ بہر حال ہمیں اتنا اطمینان ہے کہ ہماری بہترین مساعی رائگاں نہیں جا سکتیں۔ ہم اس سالانہ مجلس میں اردو کے بہترین جواں فکر ادیبوں اور شاعروں کو یکجا کرنے کی پُرخلوص کوشش کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کون ہیں بلکہ اس پر نگاہ رکھتے ہیں کہ وہ کیا لے کر آئے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے ہاں سالِ رواں کی ادبی ترقیوں اور رجحانات کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

ہمارے فاضل دوست ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے اس سال بھی سالنامے کے بہترین علمی مضمون پر منصور گولڈ میڈل مرحمت فرما رہے ہیں۔ یہ اُن کی طرف سے چوتھا طلائی تمغہ ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس بار بہترین مضمون کا انتخاب پڑھنے والوں کی رائے کے مطابق کیا جائے۔ اس لئے تمام ناظرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ اس بارے میں ہمیں اپنی قیمتی رائے سے بہت جلد مطلع فرمائیں تاکہ اپریل کے پرچے میں اُن کے فیصلے کا اعلان کیا جا سکے۔

اشاعتِ زیرِ نظر کے مضامین کو سالنامے کا تتمہ سمجھنا چاہیئے جیسا کہ ہم اعلان کر چکے ہیں مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی کا قیمتی مضمون اردو کی شاہی سرپرستی، شاہد احمد صاحب ایڈیٹر ساقی کا افسانہ کھڑکی اور جناب کرشن چندر کا طویل مختصر افسانہ گرجن کی ایک شام درحقیقت سالنامے کی چیزیں ہیں جو ہماری مجبوریوں اور کوتاہیوں کے باعث کسی طرح شاملِ اشاعت نہ ہو سکیں۔ البتہ محترمہ عصمت چغتائی کا مطالعہ بیمار اور علی احمد صاحب کا قابلِ قدر مضمون یوگرانول کے گیت فروری ہی کے لئے مخصوص تھے۔ بعض کیا اکثر پڑھنے والوں کا خیال ہوتا ہے کہ سالنامے کے مضامین اپنے معیار کے اعتبار سے عام پرچوں کے مضامین سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہماری ناقص رائے میں یہ خیال خالی از مبالغہ نہیں، لیکن موجودہ اشاعت کے متعلق تو ہم نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک مختصر سالنامہ ہے جو بڑے سالنامے کے عین بعد آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

گرجن کی ایک شام افلاطونی محبت کا ایک گہرا نفسیاتی تجزیہ ہے اور کرشن چندر نے اس کی جمال افروزیوں میں وہ تمام کوہستانی رعنائیاں صرف کر دی ہیں جو اُن کے دل آویز تخیل اور رومانی مشاہدات کی تخلیق ہیں۔ انجام حسبِ معمول المناک ہے اور فنکار کی روحانی ترقیوں سے ہم آہنگ۔ اس افسانے میں ہم کرشن چندر کو فن کے ایک ایسے موڑ پر پاتے ہیں جہاں سے اُن کی آئندہ روش کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے وہ مبہم رومانیت کے دھندلکوں میں کھو جائیں، ممکن ہے وہ حقیقت نواز ترقی پسندی کی دھوپ میں واپس آ جائیں۔ فی الحال ہم انہیں خدا حافظ ہی کہہ سکتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے بیمار میں اپنے بے رحم نفسیاتی تجزیے کو جاری رکھا ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ وہ اس سرحدی مقام پر آ پہنچی ہیں، جہاں سے فی الحال انہیں ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھانا چاہیئے۔ اور اپنی رفتار کو ذرا سنبھالنا چاہیئے۔ شاید اس طرح وہ لوگوں کی ذہنی سرحد کو کچھ اور آگے بڑھا سکیں۔

صلاح الدین احمد

---

(۲)

زندگی کے ہنگاموں میں ایک اور دلچسپ ہنگامے کا اضافہ ہوا۔ سالنامہ تکمیل کو پہنچا اور یہ نئے سال کا دوسرا شمارہ اب پیشِ نظر ہے۔ گذشتہ سال میں محبوبِ شعر نے جو ادائیں دکھائیں اُن کا منتہا سالنامے میں ظاہر ہو چکا اور سالِ رواں میں جو جلوے دکھائی دیں گے اُن کی امید افزا جھلک اس شمارے میں موجود ہے۔

آج سے پہلے کی اردو شاعری میں کردارنگاری مثنوی، مرثیے اور ہجو تک محدود تھی، غزل کے کردار مثلاً عاشقِ زار، محبوبِ جفاکار، رقیبِ ناہنجار، واعظِ ریاکار، یا زاہدِ شب زندہ دار اپنے آپ میں زندگی کا چلتا پھرتا عکس نہیں رکھتے تھے، یہ سب کردار محض چند مخصوص رجحانات کے مجموعے تھے جن سے ایک معین موقعے پر معین چلن ہی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ گویا یہ مشینیں تھیں یا ریل کے انجن تھے جو شاعرانہ تخیلے کی ساختہ پٹڑیوں پر ہی چل سکتے تھے۔ اپنے آپ میں آ کر کسی نئی ڈگر پر چلنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن نئی شاعری میں جب شاعر در بکر غزل کی یک رنگ ہیئت سے چھٹکارا نصیب ہوا اور وہ اس تنگنائے سے ہٹ کر بہنے لگے تو جہاں اُن کی اپنی انفرادیت نے نت نئے رنگ نمایاں کرنے شروع کئے وہاں شعر میں شخصیت اور کردار کے نئے امکانات بھی پیدا ہو گئے۔ آج اردو کے نوجوان شعرا کے کلام میں جہاں اُن کی اپنی انفرادیت کے مختلف رنگ موجود ہیں وہاں اُن کے اپنے کئے ہوئے مطالعے بھی کردار کے تنوع میں اضافہ کر رہے ہیں۔ راشد کی نظم "خودکشی" کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھئے۔ میں کسی اور مقام پر لکھ چکا ہوں کہ راشد کی نظموں میں یہ بات اکثر موجود ہے کہ وہ ایک جھجکتے ہوئے تھکے ماندے انسان کا تصور پیش کرتا ہے جس کے ذہن پر تہذیب و تمدن کی الجھنوں کا اثر ذرا حد سے زیادہ ہوا ہو جو کسی بات سے جی بھر کر پورے طور پر لطف اندوز نہ ہو سکتا ہو، ایک نقطے سے ہٹ کر دوسرے نقطے تک جاتا ہو اور پھر دوسرے سے تیسرے تک۔ راشد کی اس نظم کا انسان بھی کچھ اسی قسم کا انسان ہے۔ راشد نے اپنے نظم سے منسلک خط میں بھی میرے اس نظریے کی تائید کی ہے ——— "اس میں ایک ایسے آدمی کے خیالات کا عکس آپ کو ملے گا جو زندگی کے یکساں بہاؤ (اور ریزہ کن کیفیت) میں شب و روز گرفتار ہے۔ ہر روز اپنے زعم میں یہ سمجھ کر دفتر یا دکان سے اُٹھتا ہے یا اپنے ہل کو خیرباد کہتا ہے کہ شاید کل اس زندگی کی یک آہنگی میں کوئی کمی واقع ہو جائے لیکن دوسرے دن وہی دفتر کی فائلیں، وہی سودے اور گاہک اور ماپ تول، وہی ہل اور وہی کھیتی۔ آخر وہ زندگی کی عشوہ کار محبوبہ کے قدموں میں لہو تازہ اور چمکتا ہوا لہو دیکھ پاتا ہے، مسرتوں میں غم کی آمیزش کا دفعتاً احساس کر لیتا ہے۔ چنانچہ عزم کرتا ہے، "آخری عزم" کہ مسرتوں اور امیدوں کی انتہائی بلندیوں سے کود جائے تاکہ زندگی کے حجابِ اکبر سے ہمیشہ کے لئے نجات پالے"۔

سمندر پار کے ایک ملک میں صدیاں گذریں ایک ایسا جوہر پیدا ہوا جس کی قربانی شہادت بن کر لہو کا ایک ایسا چمکتا ہوا نشان بنی کہ آج بھی ہر سال کرۂ ارضی کے لاکھوں انسانوں کے لئے رنج اور جوش کا باعث ہوتی ہے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے لئے نغمۂ شادی ہو یا نوحۂ غم ——— گھر کی رونق ہی ہوتا ہے۔ یہ نغمہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن احمد ندیم قاسمی... احمد پوری کا نوحۂ غم اُس صحیح عقیدت اور خلوص کا حامل ہے جو اپنی لذت و کیفیت سے نامحرم کو بھی محرم بنا لیتی ہے۔ سانس کی ہیا کل ایری پھیری رٹنے "حسین حسین" کے لفظوں میں سازِ دل کا ایک ایسا تار گونج رہا ہے جس کی صدا سننے والے کو بے اختیار سر دھننے پر مجبور کر دیتی ہے۔

عبدالحمید عدم ایک سچا فن کار ہے اور جب وہ اپنے گرد و پیش ادب میں ریاکاری کی "اچھوت خصوصیت" کا غلبہ دیکھتا ہے تو اُس کا ضمیر جھلا اُٹھتا ہے۔ اور اُس کی ذہانت گمراہوں کو تنبیہہ کرنے پر بیدار ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ محض ہجو پر نہیں اتر آتا کیونکہ اس کا جوہرِ شعری ایک نفاست سے پُرطنز پر حاوی ہے اور یوں احتیاط سے اُس کا نظریہ زیادہ مدلل دکھائی دیتا ہے۔ ادب اور آرٹ کے تماشے میں یہ مسخرا پن اُسے اچھا نہیں لگتا اور اُس کے بیان میں جو زور ہے وہ ہمیں بھی اُس کا ہمنوا بنا دیتا ہے۔

قیوم نظر بھی ایک تماشائی کا ذکر کر رہا ہے، لیکن اس ڈرامے کی اسٹیج تماشاگاہِ ہستی ہے۔ شام سے رات اور رات سے صبح تک بہت سی بدلتی ہوئی کیفیات نمودار ہوتی ہیں۔ اور شاعر کے دل پر اثر کرتی ہیں لیکن شاعر دیکھتا ہے کہ منظر کی اس "بن" کے مقابل میں جھینیں بھی ہیں، یہ جھینیں ستارے ہیں، جن پر رات کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ مسلسل ایک ہی رنگ میں جھلملاتے رہتے ہیں۔ شاید غیر شعوری طور پر شاعر اپنی بدلتی ہوئی اثر انگیزی سے تنگ آیا ہوا ہے اور ان ستاروں کی بے حسی پر اسے رشک آتا ہے۔

روش دین تنویر اب تک اکثر آپ کی نظروں میں ایک نظم نگار ہی کی صورت میں آتا رہا ہے لیکن اس دفعہ اُس کی دو غزلیں ظاہر کر رہی ہیں کہ وہ جتنا اچھا نظم نگار ہے غزل گوئی میں بھی اس سے کچھ کم نہیں۔ اگرچہ پہلی غزل بھی خوب ہے لیکن دوسری غزل کے تو ہر شعر میں ایک کیفیت ہے، ایک نفاست ہے، بات کا ایک سلیقہ ہے۔

"ناگ سبھا کا ناچ" ——— ایک نوجوان عورت کا نفسی مطالعہ ہے جب جسم کے بعض غدودوں کی تبدیلی نئی کیفیت، نئے میلان اور نئی آرزوؤں کا باعث بنتی ہے۔ ناگ، سنکھ اور بعض دوسری چیزیں استعارے ہیں۔

میراجی

آئینۂ عالم

بحری جنگیں

مرد میدان اور تلوار کا دھنی ایسے محاورے اب گئے گذرے زمانے کی بات ہیں۔ ایک وقت تھا کہ باوجود سپہ سالار کے حکم پر اندھا دھند عمل کرنے کے ہر سپاہی اپنی ذاتی عقل و دانش سے بھی میدانِ جنگ میں کام لے سکتا تھا لیکن آج کل میدان سے ہٹ کر جنگی کارناموں کا ماحول سطح سمندر اور فضائے بے پایاں سے متعلق ہو گیا ہے اور اس ماحول میں جنگ کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر سائنٹیفک آلات کی برتری پر ہے۔ یہ مانا کہ سپاہیوں کی ہمت اور چابکدستی کو بھی اس میں کافی دخل ہوتا ہے لیکن اُن کی کارگذاری سائنس ہی کی محتاج رہتی ہے۔

موجودہ بحری جنگوں میں میدانِ جنگ کا قدیم تصور تو قائم ہی نہیں رہ سکتا کیونکہ عرصۂ کارزار یا تسات میل کا معاملہ نہیں ہوتا۔ عموماً بڑے بڑے جہاز اس قدر فاصلے سے سرگرم جنگ ہوتے ہیں کہ اُن کے کارکنوں کو ایک دوسرے کے جہاز کا صرف بلند ترین حصہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن ماہرین نے ایسی توپیں بھی تیار کر لی ہیں جن کے ذریعے سے بارہ سے لے کر بیس میل تک نہایت صحیح اور تباہ کن نشانہ کیا جا سکتا ہے ان توپوں کے لحاظ سے میدانِ جنگ کا رقبہ تقریباً ساٹھ ہزار مربع فٹ ہو جاتا ہے۔

ایک بڑا جنگی جہاز عموماً طول میں چھ سو فٹ اور عرض میں نوّے فٹ ہوتا ہے۔ لیکن اتنے بڑے جہاز کو بھی جسے ایک طرح سے ایک آہنیں جزیرہ کہا جا سکتا ہے۔ اُس کے پہلو بہ پہلو ایک اور جہاز لا کر پسپا کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ جنگ میں ہی ایسی ایک دو مثالیں قائم ہو چکی ہیں کہ جرمن جہاز برطانوی جہاز سے زیادہ بڑی توپیں رکھنے کے باوجود فرار پر مجبور ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بحری جنگ میں سائنس کی برتری کے باوجود توپوں کے استعمال کی قابلیت اور چابکدستی کو اب بھی کافی دخل ہے۔

جس وقت دو جہاز باہم جنگ کے لئے تیار ہوتے ہیں تو آنکھ جھپکتے ہیں وہ ایک دوسرے سے نہیں جُٹ جاتے بلکہ سب سے پہلے انہیں نشانے کے لئے خاص جگہ کا تعین ضروری ہوتا ہے اور اس تعین ہی میں گھنٹوں مصروفیت رہتی ہے۔ اس عرصے میں بہت دیر تک کوئی گولہ نہیں پھینکا جاتا۔ اور اگر ایک دو بار توپ چلائی بھی جائے تو درمیانی وقفہ کافی دیا جاتا ہے۔ لیکن جگہ کے تعین کے بعد جب جہاز ایک مقررہ مقام پر جم جاتے ہیں اور جنگ باقاعدہ شروع ہو جاتی ہے تو ہنگامۂ کارزار اُسی وقت ٹھنڈا پڑتا ہے جب طرفین میں سے ایک فاتح اور دوسرا مفتوح ثابت ہو جائے۔

برطانوی جہازوں کا طریق کار یہ ہے کہ دشمن کے جہاز کو دیکھتے ہی لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے سے تمام متعلقہ جہازوں کو عمل کے لئے تیاری کا حکم دے دیا جاتا ہے اور ہر جہاز پر ایک ہزار انسان پل کے پل میں سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے مہیب گولے جن میں تین سو ہنڈرڈ ویٹ بارود ہوتا ہے۔ بارود خانے سے توپوں تک لے جاتے ہیں۔ آگ بجھانے والے اور جہاز کے بڑھئی لکڑی کے شہتیروں کے انبار لگائے تیار رہتے ہیں تاکہ جہاں کہیں سے جہاز کے تختے ٹوٹ جائیں اُن کی مرمت کی جا سکے۔ لوہا اُن گولوں کی حفاظت کے لئے جو ضروری مقامات پر رکھے ہوئے ہوں لوہے کی چادریں لگانے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ ہسپتال کا حصہ صاف کر دیا جاتا ہے اور ڈاکٹر اپنے کام کے انتظار میں رہتے ہیں۔ اس دوران میں سب سے اوپر کے کارکن دشمن کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اکثر ہوائی جہازوں کی مدد بھی لی جاتی ہے۔ لیکن ہم اس وقت یہی فرض کرتے ہیں۔ کہ دشمن کے جہازوں کے مستول دکھائی دے رہے ہیں۔ نشانچی اپنی سیدھ باندھنے میں مصروف ہیں اور جہاں اُن کے نشست بیٹھ گئی، انہوں نے نشانہ تاک لیا۔

کمرۂ مہمات میں ایک اطلاع برقی دی جاتی ہے جس میں ہوائی رفتار۔ برطانوی اور دشمن کے جہازوں کی رفتار اور اُن کا رُخ، ٹمپریچر، ہوا کا دباؤ، دھوپ کی

مقدار وغیرہ کا اعلان ہوتا ہے۔ یہ تمام معلومات بہت ضروری ہوتی ہیں۔

خاص شمار یہ مشینیں توپوں کے مصارف کے اعداد کا شمار کرتی ہیں اور ہر ایک توپ کے لئے صحیح اعداد کا شمارہ اس میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

توپیں ایک ہی طرح کی نہیں ہوتیں۔ ہر ایک کی جداگانہ تخصیص ہوتی ہے وہ ہوائیں جو بلند فضا میں ہوتی ہیں اور جن میں بموں کو گزرنا ہوتا ہے۔ اکثر پہلے چند گولوں کو ان کے نشانے پر ٹھیک نہیں پڑنے دیتیں۔ کئی ایک ادھر ادھر فائر کرنے کے بعد نشانچی "بزن" کا سگنل دیتا ہے اور پھر دشمن پر بے بھاؤ کی پڑتی ہیں۔ یہ ادھر اُدھر کی بم باری بہت موثر ثابت ہوتی ہے تین یا چھ بم جہاز کے اوپر پھٹ کر اتنا کام نہیں کر سکتے جتنا اتنے ہی بم کچھ فاصلے پر گر کر جہاز کے لئے مصیبت ڈالتے ہیں۔

جب نشانہ لگایا جا رہا ہوتا ہے تو توپوں کو شروع کرو کا حکم دے دیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ توپوں کے دہانوں کے پاس بم رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور بجلی کے مصالحہ گیر ایک ٹن کے بموں کو ان کی جگہوں پر پہنچا دیتے ہیں اور توپخانہ "تیار" کا سگنل دے دیتا ہے۔ پھر کرہ ہدایات سے سگنل دیا جاتا ہے۔ توپوں کا رُخ سیدھا کیا جاتا ہے۔ آخر کار ایک اور حکم منتظم خانہ سے ملتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ توپوں کے پاس تیار رہو۔

اس وقت شخص منتظر رہتا ہے۔ دشمن کی حرکات کا جائزہ لیا جا رہا ہوتا ہے۔ نشانہ اور سمندر کے بہاؤ کا بار بار جائزہ لیا جاتا ہے کہ کہیں ایک غلط وقت پر لہر کا ابھار توپوں کے نشانے کو خطا نہ کر دے۔ رفتہ رفتہ دشمن کے جہاز کا سامنا حصہ منتظم خانہ والوں کو دکھائی دیتا ہے۔ انگریزی جہاز لہروں کے ساتھ جھکولے کھاتا ہے اور بروقت کمرۂ اختیار میں چابی دبائی جاتی ہے اور ———— "اڑ اڑا دھم" تمام جہاز توپوں کی حرکت سے لرزنے لگتا ہے۔

دس یا اس سے کچھ زیادہ سیکنڈ گزرتے ہیں جب بم فضا میں چیختے سنائی دیتے ہیں۔ کئی اور لمحات اسی طرح بے قراری میں صرف ہوتے ہیں جبکہ نشانچی دشمن کو اپنی دوربینوں سے تاکتے رہتے ہیں۔ بالآخر پانی کے تودے [illegible] گرے ہوئے بموں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان سے نشانے کو جانچا جاتا ہے۔ اور ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ پھر توپیں گونجتی ہیں۔ ممکن ہے کہ پہلی بار کا نشانہ خطا ہو گیا ہو۔ دوسری بار خطا ہونے کے بھی امکان ہیں لیکن اگر نشانچی اور خبر گیروں نے صحیح تخمینہ لگایا ہو تو تیسری بار کا نشانہ ضرور کاری ثابت ہوگا۔

چند منٹوں کے لئے توپیں بڑی تیزی سے گرجتی رہتی ہیں۔ پھر جہازوں کا تناسب انداز بدل جاتا ہے۔ نئے تخمینے لگانے پڑتے ہیں۔ دشمن کا ایک بم یا جہاز دھوئیں کا ایک پردہ پھیلا دیتا ہے۔ ہوائی جہاز حملہ کرتے ہیں اور جہاز کو اپنا رستہ چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ جنگ کا طریقہ کار پھر بدلنا پڑتا ہے۔ دوبارہ پیمائش، نشانہ بندی اور مرکز طلبی کے لئے بم برسائے جاتے ہیں۔ اور پھر وہی تمام کارروائی دہرائی جاتی ہے۔

بڑے جنگی جہازوں کی بم باری بغیر التوا کے جاری نہیں رہتی، خاموشی کے کئی طویل وقفے جہازوں کو اپنی جگہ قائم کرنے کے لئے درمیان میں آ جاتے ہیں۔ اکثر یہ خاموشی چوبیس یا اس سے بھی زیادہ منٹ کے عرصے تک جاری رہتی ہے حتیٰ کہ جہاز اپنے دوسرے جہازوں کے سلسلے سے علیحدہ ہو جاتا ہے جس کا باعث یا تو دھند ہوتی ہے یا طوفان باراں۔

اختیار گاہ کے کارکن دشمن کی نشان دہی میں لگاتار مصروف رہتے ہیں۔ ہوائی جہاز بھی اس تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ نشانہ فاصلہ اور رُخ کی اطلاع دے سکیں اور جو مدد ان سے بن پڑے کر سکیں۔ بڑی توپیں اس دوران میں بھری پڑی رہتی ہیں۔

آہستہ آہستہ وہ اپنا رُخ جہاز کے رُخ کے ساتھ ساتھ رُخ بدلتی رہتی ہیں اور اسی رفتار سے وہ ان احکام کی تعمیل کرتے رہتے ہیں جو افسروں سے انہیں ملتے رہتے ہیں۔ افسر جہاز کی سب سے نچلی منزل میں ہوتے ہیں۔ اور یوں اوپر کے حکم بجا لانے والے کارکن ہر وقت نشانے کی زد میں ہوتے ہیں۔

اس دوران میں اوپر کی منزل والے کارکنوں کو ایک دھندلی قسم کی نقلی سی توپ دکھائی دیتی رہتی ہے جو انہیں اپنی اصلی توپوں سے گولہ پھینکنے کے لئے نشانے بتاتی ہے۔ جب حکم کی تعمیل کا لمحہ آتا ہے تو اس اشارتی توپ کو چلانے کے انداز میں قائم کر دیا جاتا ہے۔ جہاز حرکت میں نہیں ہوتا۔ دشمن کا مقام معین ہوتا ہے توپوں کے گولوں کو اس تک پہنچنے کے لئے صرف دس سیکنڈ درکار ہوتے ہیں اور اس مختصر عرصے میں گولے بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے بہت آسانی سے وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ بٹن کے دبتے ہی ہندآور جہاز کی توپیں دشمن کی تباہی کا سامان مہیا کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

ایم اے جاوید بی ایس سی

خودکشی

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری؛
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند،
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
مُنہ بسورے، رہگذاروں سے لپٹتے، سوگوار،
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتایا ہوا۔

میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی!
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدّت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اُس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو!
بوئے مے میں بوئے خوں اُلجھی ہوئی
وہ ابھی تک خوابگہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری،
جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اُس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے بام کو!
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی!

ن۔ م۔ راشد

حُسین حُسین!

انگ میں آگ سلگتی دُکھ کی رُوم رُوم بے چین
گھُل گیو جیون، نیر بھیو مَن، ڈوب گئے دو نَین
سانس کی بیاکُل ایری پھیری رَٹے حُسین حُسین!

آپ کا دُکھ من کیسے سموئے جس کا اُور نہ چھُور
تج نہیں دیتا تن کی مایا، جیون بڑا کٹھور
سانس کی بیاکُل ایری پھیری رٹے حسین حسین!

تَن پنجرا اور جیون پنچھی، پَڑی آتما دور
اِس اندھکار بھری مایا نے پھانس لیا بھرپور
سانس کی بیاکُل ایری پھیری رٹے حسین حسین!

آپ کا چاکر احمد پوری دُکھی رہے دن رین
اپنے بھکاری کو اب دیجے آتما کا سُکھ چین
سانس کی بیاکُل ایری پھیری رٹے حسین حسین!

سیّد مقبول حسین احمد پوری

یوکرائنا کے گیت

یوکرائنوں کے گیت .... لیکن آپ جانتے ہیں یوکرائنا کیا ہے؟

جہاں ...... بہار کے موسم میں گرم خوشگوار ہوا سانس لیتی ہے اور اپنے ساتھ سب کے بے شمار جنگلی مرغ اور دوسرے پرندوں کو اڑا لاتی ہے۔ جہاں کے جنگلوں کی زمینیں نیلے بنفشوں اور سُرخ گلابوں سے پٹی رہتی ہیں جہاں موسم بہار کی ندی "دسنیالگا" دوسری معاون ندیوں کے ساتھ مل کر سبز گھنے جنگلوں سے گنگناتی ہوئی گزرتی ہے اور جس کے پیہم ترنم سے دور دور تک فضائیں گونج اُٹھتی ہیں۔ جہاں سورج اپنی پوری تمازت کے ساتھ ضیا پاشی کرتا ہے۔ جہاں بید کے زرد جھنڈ اور طویل قامت شاہ بلوط ہمیشہ فضا میں سنہری بکھیرتے ہیں۔ جہاں کے باغ شاہ دانوں کی فراوانی سے سفید ہیں۔ جہاں لاکھوں کی تعداد میں بلبلیں ساری رات گاتی رہتی ہیں اور جہاں پیٹر دس نٹالکا سے سچی محبت کرتا ہے۔

وہاں ہے یوکرائن ...... جہاں موسم گرما میں ڈنا پیر اپنے دامن کو زرد پانی کی موجوں سے خالی کرنے کے لئے بحرِ اسود کی نیلی موجوں کی طرف بھاگتی نظر آتی ہے اور جس کے وسیع ...... وسیع ساحل پر اونچے فلک بوس پہاڑ "اہرام مصری" کی طرح خاموش اور سنجیدہ کھڑے پکے ہوئے گندم کے سنہرے میدانوں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ جہاں دیہاتیوں کی سفید چھوٹی جھونپڑیاں گلناری سیبوں، پیلی ناشپاتیوں، ارغوانی آلو بخاروں اور بھوزوں کی ان تھک تانوں میں خود کو چھپا لیتی ہیں۔ جہاں بید کے تلے چوڑی سڑک کے کنارے بوڑھا فقیر بیٹھا کھوئی ہوئی آزادی کے گیت گاتا ہے۔ جہاں ماضی کے آزاد دَور کے پوتے اب دھوپ میں چمکتی ہوئی درانتیوں سے گھاس کاٹتے ہیں ...... اُسی کھیت میں جہاں اُن کے آباء اجداد کی تلواریں چمکا کرتی تھیں۔

وہاں ہے یوکرائن ...... جہاں خزاں کے موسم میں دریائے دونائی کے فرحت پاش کناروں پر "تلخ ہوپ" کی سنہری اور پتلی بیل بید مجنوں کے عریاں درختوں کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ جہاں کروندے کی جھاڑیوں پر سُرخ خوشے خزاں کے سورج کی تپتی ہوئی دھوپ میں یاقوت کے مالے کی طرح چمکتے ہیں، جہاں مرد سینا گوندنی کے جنگل میں بیر چنتی ہوئی اپنے محبوب کی جدائی کے گیت گاتی ہے۔ جہاں چوپایوں کے گلے گہرے بادامی رنگ کے کھیتوں میں صبح سے شام تک چرتے ہیں۔ جہاں چنار اپنے سنہرے پتوں کے ساتھ کسی تنہا قبر پر کھڑا اس طرح سرسراتا ہے جیسے کوئی بدقسمت دوشیزہ اپنے بھولنے والے کے لئے رو رہی ہو۔ جہاں جب پتے گرتے ہیں اُس وقت رات کا آسمان بہت نیلا اور ستارے بہت روشن ہوتے ہیں۔

یہ ہے یوکرائنا ...... جہاں سردی کے موسم میں بطوں کی طرح سفید برف کھیتوں کو ڈھانک کر انہیں ایک بیکراں سفید سمندر بنا دیتی ہے جہاں گرتی ہوئی گھنی برف کا جادو کہر کو اولوں اور ژالوں میں بدل دیتا ہے اور سارا جنگل سمندر کی تہہ کے روپہلے مونگوں کے جنگلوں کی طرح نظر آنے لگتا ہے۔ جہاں لوگ یہ جانتے ہیں کہ موسم سرما کو بے فکر دیہاتیوں کی صحبت میں کس خوشی سے بسر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں کرسمس کے دنوں میں "بت پرستوں" کی دیوی "لاڈا" کے بھجن دن رات سنائی دیتے ہیں۔

جہاں سُرخ لومڑیاں دلدلی گھاس کے سایوں میں پناہ ڈھونڈتی پھرتی ہیں اور خاموش پہاڑیوں کے دامن میں پڑے ہوئے خرگوش گھوڑوں کی ٹاپ، شکاری کتوں کی بھونک اور بگلوں کی اچانک صدا پر چونک پڑتے ہیں۔

وہاں ہے یوکرائنا ...... جہاں کارپیتھین کی چوٹیوں پر بوڑھے شاہ بلوط اور صنوبر کے درخت گنگناتے ہیں اور جہاں کے ملکی باشندے سفید نقش دار قمیصوں اور سرخ پاجاموں میں پہاڑی وادیوں کے اندر

اپنے گلّوں کے ساتھ "ترمبیتا" کھیلتے ہیں۔ جہاں رات کی تاریکی میں بادل گرجتا ہے اور بجلی چمکنے چھال اور چمکدار پتوں والے "بیچ" درختوں کے سفید سینے پر کھیلتی ہے۔ جہاں دو باقن اپنے آبرشکی قزاقوں کے ساتھ چٹانی غار میں چور ناہورا کے نیچے سوتا ہے —— اس انتظار میں کہ اشارہ پاتے ہی یوکرائن کے دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔

وہاں سے یوکرائن کا کوہستانی سطح مرتفع جہاں گھاس کے جنوبی بڑے میدان جسے اسود کی لہروں سے جا ملتے ہیں اور خوبصورت رنگ کے ابابیل بھیڑوں کے سبے شمار گلّوں کو دیکھتے کے لئے آسمان پر چلتے بنا لیتے ہیں۔ جہاں ڈنا پر کے آبشار خوبصورت سے جزیرے سے ٹکرا کر ہوا کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں: ہمارے اسلاف کے پرچم اور ان کی بندوقیں کیا ہوئیں؟ تو وہاں —— جہاں بادل کا ایک سیاہ ٹکڑا اٹھتا ہے کہ پہاڑ اس پر اس طرح چھا جاتا ہے جیسے پریوں کی کہانیوں کا کوئی بڑا اژدہا۔

وہاں ہیں ریبو ردنین کے روسی میدان!

اور یوکرائن پر سے صدیاں گزر گئیں —— پہلے پہلے تو سیاہ بالوں والے سیتھی آرستان سے اپنے گلّوں کے ساتھ یوکرائن آئے۔ بعد میں نیلی آنکھوں اور سفید بالوں والے فنس نے ان کی جگہ لے لی تب دونوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور یہ طویل قامت سیاہ بھوری آنکھ اور حسین چہرے والے یوکرائنیوں نے اس سرزمین کو بسایا جبکہ "یور" اور "لاڈا" جیسے مہربان خدا ان کی سرپرستی کر رہے تھے۔

منگولی ایشیا سے آئے اور چنگیز خاں نے انسانوں کی کھوپڑیوں سے اپنا مخروطی مینار بنوایا اور راسٹپس کے میدانوں میں بہادر راد پیچی نے پولووٹس کو کالکا ندی پر روک کر اپنی مادر وطن کو بچا لیا۔ اسی یوکرانی چٹانوں پر سے بہتی ہوئی منگولی لہریں یورپ کو غارت کرنے کے ناقابل تھیں۔ خان واپس ہو گئے۔ تہذیب محفوظ رہ گئی لیکن یوکرائن لاشوں سے پٹ گیا —— انہیں کی ہڈیوں پر روس کی بہادر قوم کوسیک (COSSACK) نے جنم لیا اور زیادتیوں کا مقابلہ کیا۔ یوکرائن میں آزادی کے علمبردار یہی زبورونی کوسیک تھے جو نیلی قمیص اور سرخ پائجامے پہنے بھورے گھوڑوں پر سواری کرتے تھے۔

تب —— پول، ترک اور ماسکو دینوں نے اس کو اپنی ہوس کی آماجگاہ بنایا تاکہ ایسے ملک کو جہاں دودھ اور شہد کے دریا بہتے تھے اپنی سیادت میں لے لیں۔ کوسیکوں کی تلواریں صدیوں تک دنیا کے ہر حصے کے حملہ آوروں کا سر تسلیم کرتی رہیں آخرکار اس جنت نظیر خطے کا شیرازہ بکھر گیا۔

یوکرائنا کی اب کوئی چیز باقی نہیں، لیکن ان گیتوں میں وہ اب تک جیتی ہیں جو لوگوں کے دلوں پر نقش ہیں۔ یہ گیت یوکرائنا کی مردہ صدیوں کی یادگار ہیں۔ یوکرائن کے لوگ اب بھی جب "کولادی"، "وسینانکی" اور "کوپالنی" گیت گاتے ہیں تو ان کے سورج اور بادلوں کے دیوتا پھر زندہ ہو جاتے ہیں جو عیسائیت کے دشمن تھے۔

دلہنیں شادی کے گیت گاتی ہیں اور بیتے ہوئے دن واپس آ جاتے ہیں جبکہ ایک منچلا نوجوان اپنے قبیلے کے لوگوں کو جمع کر کے اپنی محبوب دوشیزہ کو اٹھا لینے کے لئے ہمسایہ گاؤں پر شب خون مارتا ہے۔ لڑکی کے تمام رشتہ دار اس کو ڈھونڈنے کے لئے اٹھتے ہیں اور بسا اوقات کسی خونی لڑائی کے بعد دولہا اپنی دلہن کو بغیر کسی ضرر کے اڑائے جاتا ہے —— ایک ہزار سال گزر گئے لیکن گیت یہ ظاہر کرنے کے لئے باقی رہ گئے کہ کبھی ایسی ناشائستگی کے بھی دن تھے۔ یوکرائن کی خانہ جنگی کے دنوں میں ایسا ہوا کرتا تھا جس وقت کہ کوسیک یوکرائنا کی زمین کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا کرتے اور "آزادی" کے گیت گایا کرتے تھے۔ وہ گیت اب بھی بدن میں خون کی روانی کو تیز کر دیتے ہیں۔

ماسکو، تاتاری، لیتھونیا، پولینڈ، ترکی اور ہٹس مین —— جنگیں بغاوتیں —— اور آخرکار یوکرائنوں کی آزادی کے آخری مقام قلعہ سیچ کے زوال کے بعد کوبزاروں کے گیت میں یوکرائنوں کی تاریخ منتقل ہو گئی۔ اور اب جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یوکرائن کی کوئی تاریخ اس کے گزشتہ دورِ عظمت کو دہرانے کے لئے موجود نہیں تو ان تاریخی گیتوں کی عظمت بہت بڑھ جاتی ہے۔

غلامی اور جاگیرداری طریقے کا آغاز ۱۷۸۲ء سے ہوا۔ کوسیک اس وقت تک غائب ہو چکے تھے اور ان کی جگہ یوکرائنی زبان بد ہا، ہیدومو کی اور آبرشکبون نے لے لی۔ ان کے کارنامے بھی یوکرائنی گیتوں کا جزو بن گئے نظام جاگیرداری کے غلاموں کی شکستہ حالی اور بے بسی یوکرائنی عورتوں کے گیتوں میں آہ بھرتی ہے۔ آزاد کوسیک اب ان کے شوہروں کے غلام تھے۔ بیکس عورتوں کے گیت بالخصوص درد اور غم سے لبریز ہیں۔ کوسیک کی نسل سے چونکہ اور خانہ بدوش ہوئے انہوں نے اپنے گیت اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں پر لکھے —— "پریم کے گیت" سدا بہار ہوتے۔ یہ گیت بلبلوں کے نغمے اور شاہ دانوں کے پھولوں کی طرح ہمیشہ تازہ، جوان، دلکش اور غیر فانی ہیں۔

"اطالوی گیت" بھی اچھے ہیں لیکن یوکرائنوں کے گیت کے گانے کی انوکھی طرزوں نے ان کا درجہ سب سے الگ اور سب سے بلند کر دیا ہے۔ یہ یوکرائن

کے حُسن سے پیدا ہوئے اور اس لئے حسین ہیں۔ یہ اسٹیپس کے روسی میدانوں میں اُگے اس لئے انہیں کی طرح وسیع ہیں۔ انہوں نے جنگلوں کی آزاد فضا میں جنم لیا اس لئے آزاد ہیں۔ یہ مغموم اور بیکس دوشیزاؤں کے آنسوؤں سے پیدا ہوئے اس لئے پُر درد ہیں۔

یہ ہیں یوکرائنوں کے گیت

لیکن افسوس کہ اصل زبان سے ان کے ترجمے ان کو اپنی اصلیت سے بہت دور کر دیتے ہیں اور یوکرائنوں کے یہ حقیقی وطنی نغمے ہمارے کانوں تک پہنچتے پہنچتے مدھم اور کہیں کہیں بے سُرے بھی ہو جاتے ہیں۔

پولینڈ اور روس کی سرحدوں کے درمیان رہنے والے یہ لوگ انیسویں صدی میں اپنے فنی کمالوں کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ آگے چل کر یہ یورپ کے سب سے اچھے گانے والے سمجھے جانے لگے۔ روس کے بہترین موسیقی یوکرائنی موسیقی ہے۔ روس کا مشہور ادیب گوگول در اصل یوکرائنی ہی ہے جس نے رومان نگاروں کے لئے ایک نئی راہ کھولی۔ روسی مصنّفوں میکسی موف، ڈریگومانوف، سےسنوسکی اور زرتلیف وغیرہ کے یوکرائنی گیتوں کے مجموعے ۱۸۳۰ء سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک شائع ہوتے رہے۔ رومانی شاعروں نے بہت جلد اس اثر کو قبول کیا۔ ۱۸۴۰ء کے قریب شیو چنکو جیسے بڑے شاعر نے اس قسم کی شاعری کو کمال کے آسمان تک پہنچا دیا۔ اس شاعرِ اعظم کا نام تمام یوکرائنوں کے نزدیک اب بھی مقدس سمجھا جاتا ہے۔

فلورنس رینڈل لیور سے لکھتا ہے :- مجھے یاد ہے میں جس زمانے میں "ونی پیگ" میں تھا روسالکا نامی ایک گانے والی نے مجھ سے ایک مقامی شاعر کے ایک گیت کی رُوداد بتائی تھی ——— ایک بے وفا دلہن اپنے ایک چاہنے والے سپاہی کے ہاتھوں قتل کر دی گئی تھی ——— انا ستاسیا تین سال اُس کا انتظار نہ کر سکی لیکن سپاہی اُس کی شادی ہوتے وقت آیا۔ گیت یہ ہے :-

"نیپا کے دوسری جانب سے طوفانی ہوا چل رہی ہے۔
کاش مجھے معلوم ہو سکتا کہ میری محبوبہ کیا کر رہی ہے۔
"تیری جان! کیا اب تو یہ چاہتی ہے کہ تو میری ہو جائے!
"آ ——— تاکہ ہم کسی دن شادی کے بندھنوں میں خود کو باندھ لیں۔
لیکن سب سے پہلے مجھے آئندہ ہفتے تریزیلی کے زہریلے پھول لانے ہوں گے
تیسے کر پاس میرے کے اصطبل میں ایک ذین دار گھوڑا ہے ——— میں اُس پر سوار ہو کر ضرور پھول لانے جاؤں گا۔

"اُن کا پانا بہت دشوار ہے ——— وہ دور، بہت دور جنگل کے راستے میں اُگتے ہیں لیکن میں گھوڑے کو تیز دوڑاتے ہوئے جاؤں گا اور اپنی پیاری کے لئے لاؤں گا۔

"میں جنگل پہنچا اور دو چیکلی درختوں کے درمیان زہلی کو پایا۔ میں گھوڑے سے اُتر گیا اور اُسے اکھاڑنے لگا۔ ٹھیک اس وقت "زوزولا" قریب اُڑتے ہوئے گایا۔

"نوجوان سپاہی اتنی تکلیف نہ اٹھا۔ پودے کو نہ اکھیڑ۔ تیری محبوبہ تجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔

وہ کل دوسرے سے شادی کرے گی،

"تب میں جلدی سے پلٹا اور اُس کے گھر پہنچا ——— اس کے دوست مجھ سے ملنے آئے میرے گھوڑے کو اصطبل میں باندھ دیا۔ مجھے دعوت اور شادی کے ناچ میں شریک ہونے کو کہا۔

"میں نے ناچ کی محفل اور شراب نوشی میں شرکت نہیں کی۔ میں اپنی بے وفا سے صرف دو باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے دلہن کا ہاتھ پکڑا اور بائیں ہاتھ سے اس کے سینے میں گولی مار دی۔"

اس طرح اُس کی محبوبہ اپنی دو سہیلیوں کے درمیان گر پڑی جیسے کوئی "تارا دو سورج سے روشن بادلوں کے درمیان بیلا پڑ جاتا ہے"۔ یوکرائنوں کے اکثر گیت ہمیں پوٹ لور روسٹن، "پوئیٹری" (شکاگو)۔ دی کرٹیکس ہن (نیو یارک) "بوری ہین" (اڈنبرا) کنیڈا (لندن اونیٹیریو)۔ "یونیورسٹی میگزین" (مونٹریل) سے حاصل ہوئے۔ بالخصوص "فلورنس رینڈل لیور سے" اور "پال کراتھ" کا انگریزی ادب پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنی زبان میں انہیں منتقل کر کے ایک بڑی کمی کو پورا کیا۔

ا۔ بت پرستوں کے گیت

کوپالو

بت پرستوں کے یہ قدیم گیت اب مشکل سے اپنی اصلی حالت میں ملتے ہیں۔ پرانی کتاب "کولاڈکا" میں اُن کے متعلق صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے کہ جنگل میں شاہ بلوط کے تلے بیج بوئے جاتے ہیں۔ ان بیجوں پر نوجوان

مرد اور دوشیزائیں بیٹھتی ہیں اور سب مل کر کولادی گیت گاتے ہیں۔ ڈھوروں کے نیچے آگ جلتی ہے اور ایک بوڑھا شخص ایک بکری کو ذبح کرنے کے لئے چاقو تیز کرتا ہے۔"

"کوتگ لئے کے معنی دیتا ہے یعنی نوجوان مرد اپنی محبوب دیوی لادی کے لئے بھجن گاتے ہیں۔ بوڑھا شخص پجاری ہوتا ہے جو بھینٹ چڑھانے کی رسم ادا کرتا ہے۔

"کوپالو یا موروز" یا "ضعیف" تینوں سے مراد کہر کا اژدہا" ہے۔ وہ مرگیا اور برف کے پانی کی طرح نہروں میں بہہ گیا۔ یوکرائن کے کوپالو دے" منانے کے دن اس بت کا عکس پانی میں ڈالتے ہیں۔ دوشیزائیں ندیوں میں ہار بہا دیتی ہیں اور ان ہاروں کے تیرنے کی رفتار سے اپنی قسمت کا اندازہ لگاتی ہیں۔

(۱)

کوپالو دے منانے کے دن
ایک حسین دوشیزہ نے اپنی قسمت آزمائی۔
وہ اپنا ہار بنانے کے لئے پھول توڑ لائی: ——
مالوا کے پھول اور لیولسٹوف کی کلیاں ——
اور انہیں دریا کے سینے پر بکھیر دیا۔
"بہے جا میرے ہار موجوں کی دھیمی رفتار کے ساتھ بہے جا۔ سیدھا میرے محبوب کے دریچے کی طرف۔
اُس کے دل تک جس سے میں محبت کرتی ہوں
اور —— اپنے ساتھ میری خوش قسمتی لے کر آ۔"
پھولوں کا ہار بہہ رہا ہے۔
اور اپنے ساتھ
دوشیزہ کا دل بھی لئے جا رہا ہے
ندی کے موڑ پر
ایک موج نے اس کو پلٹ دیا۔
کوپالو —— کوپالو نے
اس کی نذر ٹھکرا دی
اس رات وہ دوشیزہ
"تریزیع" کا زہریلا پودا لائی
آدھی رات کی تاریکی میں
اس نے انہیں اکھیڑا تھا

پھر جب رات بھیگ چکی
اُن کا عرق نچوڑا
اور زہریلا شربت پی گئی۔

(۲) وسنیانکا —— بہار کی دیوی

اے بہار کی دیوی وسنیانکا!
تو نے سرما کی رُت کہاں گزاری؟
"جنگل میں شاہ بلوط کے اوپر
میں ایک قمیص کے لئے تاگا کات رہی تھی۔"
اے بہار کی دیوی حسین وسنیانکا!
سورج کی کرنوں کو لے کر جلد ہمارے پاس آ جا۔

(۳) ہائی وکا —— جنگلوں کا گیت

بہار کی دیوی ہمارے لئے کیا لائی:
خوبصورت زلفیں، دوشیزہ کا حسن ——
دوشیزہ کا حسن گرما کے موسم کی شبنم ہے
بہار جسے دھو کر بھٹی میں خشک کرتی ہے
پھر کاغذ میں لپیٹ کر میز پر جما دیتی ہے۔
بہار کی دیوی اب ہمارے لئے کیا لائی ہے۔
ہمارے لئے قوت، لڑکوں کے لئے حُسن
لڑکوں کا حسن گرما کے موسم کی شبنم ہے۔
بہار کی دیوی جسے بارش کے چشموں میں دھوتی ہے، باڑھ پر خشک کرتی ہے۔
اور پھر چیتھڑوں میں لپیٹ کر میز پر جما دیتی ہے

۲۔ شادی کے گیت

یوکرائن کے رواج کے مطابق منسوب شوہر تین دن تک "ڈیوک" کہلاتا ہے اور لڑکی "ڈچس" —— خواہ وہ کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوں۔ ہمارے یہاں "پریم گیتوں" میں گلاب کا پھول جو رومانیت رکھتا ہے یوکرائن میں کلینا کا پھول اس کا قائم مقام ہے۔ حسین دوشیزاؤں کو اسی سے تشبیہ دی جاتی ہے مثلاً "کاش میں کلینا کی طرح لال ہوتی تب میں کبھی افسردہ اور غمگین نہ ہوتی۔ میرے ہونٹھ اور میرے گال گلناری ہوتے لیکن افسوس وہ زرد ہیں۔"

اس پھول کے درخت سے متعلق یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ

ایک نوجوان لڑکی کے قتل کر دیئے جانے پر اس کے رشتہ دار اس کی قبر پر کلینا پھول کا درخت اگاتے ہیں جس کی ایک شاخ سے اس کے بھائی نے ایک بانسری بنائی فوراً اس کی قبر سے ایک آواز آئی۔

"بھائی! بانسری اتنی تیز نہ بجا ۔۔۔ میرا دل دکھتا ہے۔"

شادی کے رسوم سے متعلق دوسرا پھول جس کا ذکر عام طور سے یوکرائن کے دیہاتی گیتوں میں آتا ہے "بارومینو" ہے۔ یہ سدا بہار پھول ہے بعض اس کو بھی قبر پر چڑھاتے ہیں۔ یہ ایک چڑھنے والی بیل کا پھول ہے جو موسم سرما کی برفباری میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ پودا قریب قریب پولینڈ کے "بیرٹ" یا خوشبو دار ولائتی مہندی کے مماثل ہوتا ہے۔

"بارومینو" پھول کا ذکر کہیں کہیں انگریزی شاعری میں بھی آیا ہے مثلاً:۔

"چھوٹے بارومینو"
تم دنیا کی چھاتی کے قریب ہی قریب پھیلتے ہو۔
کاش کبھی میرا حسین دوست بھی مجھ سے اتنا ہی قریب ہوتا!"

جون کی چوبیسویں کو جب گھر کے دیوتا کرپالو کی برسی منائی جاتی ہے جنوبی روس کی جوان کنواری لڑکیاں "بارومینو" پھول کے گجرے بناتی ہیں اور انہیں نہروں میں بہا دیتی ہیں۔ اگر ہار ڈوب گیا تو اس سے موت کا شگون بد لیتی ہیں اور جس دوشیزہ کا ہار تیرتا رہا وہ یہ سمجھتی ہے کہ اسی سال اس کی شادی ہو جائے گی۔

(۱) مروسنکا کی شادی

(مروسنکا کا نام یوکرائنی ادب میں وہی اہمیت رکھتا ہے جو "سلمیٰ" اور "لیلیٰ" کے نام اردو ادب میں رکھتے ہیں)

مروسنکا اپنے باپ سے کہتی ہے:۔
"پیارے باپ! دروازے بند کر دیجئے۔
دروازے بند کر دیجئے۔
"ڈیوک" کو قریب نہ آنے دیجئے
قریب نہ آنے دیجئے!"
"پیاری بچی نہیں، وہ مجھ سے التجا کرتا ہے
کہ میں اس کو اندر آ جانے دوں ۔۔۔ اندر آ جانے دوں
خمل اور ہوپ کی بیلوں کی طرح
دیکھو وہ پیچ و تاب کھا رہا ہے۔"
"بارومینو" کے گلدستے کی طرح میز پر کس نے بیٹھنے کی اجازت دی
مغرور ۔۔۔ شکرے کی طرح مغرور"
سورج بیٹے کی طرح آسمان پر چڑھ رہا ہے۔
مروسنکا جنت میں داخل کر لی گئی
"اے دوشیزہ! یہ فردوس کا باغ کس نے تجھے رہنے کے لئے دیا"
"خدا اور میرے باپ نے" وہ جواب دیتی ہے

(۲) ہار بنانے کی رسم

کلینا کا درخت چھوٹی وادی میں اگتا ہے
اور اس میں ایک سفید پھول کھلا ہوا ہے۔
دولہن کی سہیلیاں ایک شاخ پر سے اسے توڑنے گئیں۔
لیکن اب وہ خالی ہاتھ آ رہی ہیں۔
وہ اسے توڑ نہیں سکتی تھیں۔
لیکن وہاں مروسنکا گئی
وہ چھوٹی دلہن خود وہاں گئی
"کلینا" کے پھول کی شاخ اس کے سامنے جھک گئی
مروسنکا اپنے گھر آئی جہاں شادیانے بج رہے تھے۔
جہاں اس کی خوبصورت سہیلیاں جمع تھیں
اس نے ان پھولوں کو اپنے چہرے کے آگے رکھ لیا
اور مشتاق نگاہوں سے انہیں دیکھا
تب مروسنکا نے اپنے باپ سے پوچھا:۔
کیا میں ان کلینا کے پھولوں کی طرح خوبصورت ہوں؟
جب تک تو میرے گھر کے باغ میں ہے
لڑکی! تو انہیں پھولوں کی طرح حسین ہے۔
لیکن جب تو اپنے سفر پر روانہ ہو جائے گی
تیرا یہ حسن تجھ سے چھن جائے گا
اے دوشیزہ! تیری گہری سنہری گوٹوں سے
ان کا رنگ رفتہ رفتہ اڑ جائے گا"

(۳) دولہا کے دوستوں کا گیت

"دروازہ کھولو ۔۔۔ چھوٹا دروازہ"
"کون آواز دیتا ہے؟ یہ کون ہمارا انتظار کرتا ہے؟"
"ہم دولھا کے دوست ہیں"
"اچھا تو تم ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو؟"

"ہم اپنی سنہری شہد کی مکھیاں پیش کریں گے"
کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا یہ حقیقی تحفہ ہمیں خوش کر سکے گا
کیا تمہارے پاس ہماری نذر کے لئے اور کوئی چیز نہیں؟
لو یہ بڑا تحفہ ہم لائے ہیں۔
نوجوان لڑکی اپنی پیشانی پہ
کنوارپن کی مالا پہنے ہمارے ساتھ آ رہی ہے"

(۴) رخصتی

ماں کہتی ہے:۔
جب صبح ہوئی تو میں جاگی
میں نے دھندلکے میں سے آنگن کو دیکھا
وہاں برف پر چلنے والی خوبصورت گاڑی تھی
اور اس کے خوش رفتار گھوڑے ہنہنا رہے تھے
وہ میری مروسنکا کو مجھ سے بچھڑا لے جائیں گے"
"کیا اب میں تمہاری بیٹی نہیں رہی؟" لڑکی بولی
"کہ اپنے گھر سے تم اس طرح مجھے بھیجے دیتی ہو،
رات ہونے سے پہلے ہی!
اس کٹھن سفر میں مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے
میرا گانے والا بلبل میرے ساتھ جائے گا۔
کیونکہ میں اس کے رسیلے نغمے سنوں گی
جب وہ اندھیرے منہ مجھے بیدار کرے گا ——
وہ —— میری نئی ماں مجھے نہ جگائے گی
بلکہ وہ مجھ پر عیب لگائے گی —— میرے لئے سخت الفاظ استعمال کرے گی اور کہے گی:۔
یہ دلہن تو ناکارہ پیڑ کی طرح پھوہڑ ہے"۔

(۵) رخصتی کا گیت

میری پیاری ماں! نہ رو
میں اپنے ساتھ سب کچھ نہ لے جاؤں گی
دیکھو گائے، بیل
میں نے اصطبل میں بند رہنے چھوڑ دیئے ہیں
میں صرف اپنے ساتھ اپنی گھنی پلکیں
اور نیلی آنکھیں لے جا رہی ہوں
اور تمہاری میز پہ
تمہارے لئے میں نے اپنے آنسو چھوڑ دیئے ہیں۔
اور وہ باغ —— وہ پگ ڈنڈی
جہاں میرے قدم پڑتے تھے
جب میں تمہارے لئے پانی لانے کو
ہر روز جاتی تھی"
"بیٹی اچھا جا! مجھ کو اکیلا چھوڑ دے
ان پھل کے درختوں کو چھوڑ جا تو جن کی نگہبانی کیا کرتی تھی، اب ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟
انہیں کون پانی دے گا جب ان میں کلیاں نکل آئیں گی؟
باغ کی روشوں کے درمیان پڑے ہوئے پتوں کو جھاڑ کر اب کون راستہ صاف کرے گا؟
آہ تیرا محبوب آئے گا تو میں اس سے کیا کہوں گی؟"

(۶) موباف کا کھولنا

یوکرائن کی بن بیاہی لڑکیاں اپنے سیاہ کھلے ہوئے بالوں کو ایک موباف میں باندھے رکھتی ہیں اور انہیں ریشمی فیتوں سے سنوارتی ہیں۔ بعض اوقات پھولوں سے بھی ڈھک لیتی ہیں۔ یہ موباف "کوسا" کہلاتا ہے اور کنواریوں کا خاص سنگار ہے۔ وہ اسے مقدس اور اپنی عصمت کا نگہبان جانتی ہیں۔ اس موباف کا کھول دینا گویا اس بات کی علامت ہے کہ اب لڑکی کنواری نہیں رہی۔ بیاہی عورتیں چوٹی کے دو حصے کر کے ان کو الگ الگ دو موبافوں میں باندھ لیتی ہیں۔ پھر جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر سر کے گرد ایک رسی سے باندھ لیتی ہیں۔

"اس کے کالے بالوں سے موباف کھول دو۔
اور اس کی جگہ پھولوں کا ایک ہار باندھ دو
دیکھو مروسنکا ہورروڈنکا کے شہر کو
اپنے چھوٹے قدموں کے ساتھ جا رہی ہے
وہ خانہ باغ سے "بارونیو" کا پھول توڑتی ہے
اپنے کالے بالوں میں لگانے کے لئے
اس کی ماں اس کو ڈھونڈتی ہوئی آتی ہے
"میری لڑکی! تو کیا کر رہی ہے؟"
"میری ماں! کیا ایسا ہو سکتا ہے۔
کیا تجھے اب میری ضرورت نہیں ہے؟

تو مجھے گھر میں ٹھہرنے نہیں دیتی۔
بلکہ زبردستی نکال دینا چاہتی ہے
اپنی لڑکی کو اس کے حوالے کر دینے کے لئے
جو مجھے لے جانا چاہتا ہے
میں ابھی بہت چھوٹی ہوں
زیادہ چالاک بھی نہیں ہوں ــــ پھر کیوں.....؟"
"کیا میں تجھے زبردستی نکالے دیتی ہوں
کیا میں اپنے مکان میں تجھے رکھنا نہیں چاہتی۔
تیرے لئے
میری یہ کبھی آرزو نہیں رہی
اجنبی آ کر تجھے مجھ سے مانگتے ہیں
اور مجھے اُن کی بات ماننا پڑتی ہے"۔

(۷) شادی سے ایک روز پہلے

دولہن اپنے عاشق سے کہتی ہے:۔
"اونچے درخت پر پتے بہت گھنے تھے۔
تم کل رات کیوں نہ آئے
مجھے حیرت ہے! میں سمجھی
شاید تمہارے پاس گھوڑا نہ تھا
یا شاید تم راہ بھول گئے تھے
یا تمہاری ماں نے ٹھہرا لیا تھا"
عاشق جواب دیتا ہے
"میرے پاس گھوڑا تھا اور میں راستہ بھی جانتا تھا
اور میری ماں نے بھی مجھے روکا نہ تھا۔
لیکن ــــ میری چھوٹی بہن تمہیں نہیں پسند کرتی۔
اس نے میری زین چھپا دی۔ میں نے بہتیرا ڈھونڈا نہ پایا
میری بڑی بہن نے اسے ڈھونڈ نکالا
اور جلدی سے میرے گھوڑے کی پیٹھ پر کس دیا
اور بولی، لو یہ گھوڑا ــــ جلد جاؤ
چاند کی روشنی تمہیں راہ دکھانے کے لئے کافی ہے
بہادر بھائی! ہمیشہ اپنی گردن اونچی رکھنا
وہ ہنستی ہوئی بولی۔
"اپنی محبوبہ کے گاؤں سے تمہیں بہت سی باتیں سیکھنی ہیں
اور اس کی راہ بہت پیچیدہ ہے
اپنا گھوڑا کھو نہ دینا ــــ گمراہ نہ ہو جانا
جاؤ! لیکن تمہاری شادی کا دن طلوع ہونے سے پہلے واپس آجانا"

۳۔ تاریخی گیت

(۱) پین کالنووسکی

"پین" کے معنی معزز شخص کے ہیں اور "پین کالنووسکی" یوکرائن کے طریقہ جاگیرداری کے دور میں سرکشوں کا ایک طبقہ تھا۔ یہ "پین" یا نواب اپنا حرم ترکوں کی طرح بہت وسیع رکھتے تھے۔

ایک "پین کالنووسکی" قصبہ "بوہوسلف" کا مالک تھا اور خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس سے متعلق بہت سے دلچسپ واقعات ہیں کہتے ہیں کہ ایک بار وہ ایک بوڑھی عورت سے ملا جو اُس کے علاقے میں سوکھی لکڑیاں چن رہی تھی۔ اُس نے اس کو حکم دیا کہ وہ درخت پر چڑھ کر کوئل کی طرح پکارے اور جب اُس نے اس کی تعمیل کی تو کالنووسکی نے گولی کا نشانہ بنا کر اُسے نیچے گرا دیا۔

اس کی دوسری عادت یہ تھی کہ وہ اپنے کوٹ کی جیب میں ایک سوئی اور تھوڑا تاگا رکھتا تھا اور اُس سے جو دیہاتی ملتا وہ پوچھتا۔ "کیا تمہارے پاس سوئی اور تاگا ہے"۔ اگر وہ نہیں کہتا تو بے اختیار اُسے مارنے لگتا اس جرم میں کہ وہ کفایت شعار نہیں۔ یہ گیت اُسی لارڈ سے متعلق ہے۔

"بوہوسلف" کا مالک "پین کالنووسکی" وہاں ناچ رہا تھا۔
"یونڈریونا" پاوا (مورنی) کی طرح حسین تھی
اور جب اس کی نظریں اس جنگلی کبوتری پر پڑیں۔ اس مجسم حُسن پر
اور اُس نے اس کی بغلگیری اپنے گالوں پر محسوس کی۔
"پین کالنووسکی! تم میرا جوتا تک اتار سکتے ہو
میرے پاؤں سے ــــ لیکن میں اُسی کا بوسہ لوں گی جس کو میں پسند کرتی ہوں تب اُس قصبے کے سمجھدار دیہاتیوں نے اُس حسین عورت کے کان میں کہا،
"اگر تو جلد فرار نہ ہو گئی تو تجھ پر آفت آجائے گی"
"یونڈریونا" پُل پر سے ہوا کی طرح گزر گئی۔
اور قصبے کے مکانوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔
دو کریہہ المنظر سپاہیوں نے کھینچی ہوئی تلواروں کے ساتھ اس کا تعاقب کیا
اور جب منڈی کے مقام سے گزر رہی تھی

بے چاری کبوتری آخر پکڑی گئی۔
پین کالوزوسکی کی چاندی کی بندوق سیدھی اس کی طرف اٹھی۔
عورت کے دل کی طرف ــــ اور اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیا
"خوبصورت لانبے قد والی بوندریونا میرے ساتھ رہ
ورنہ تو گوبر کی طرح ابھی زمین پر پڑی نظر آئے گی"
"میں قسم کھاتی ہوں ــــ میں مر جانا بہتر سمجھتی ہوں کالوزوسکی!
قبل اس کے کہ میں تجھ جیسے کی آغوش میں ہمیشہ پڑ رہنے کے لئے جاؤں"
جیسے ہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ بندوق چلی ــــ اور وہ گر گئی
اور اس کا باپ جو دیکھ رہا تھا بے اختیار چلا اٹھا
"خوبصورت لڑکی! میں بھی تیرے ساتھ مر جاؤں گا"
اور اس نے اپنا سفید سر دیوار سے ٹکرا دیا
گھنٹے بجنے لگے ــــ اور غم آلود آوازیں فضا میں گونج اٹھیں
"بوندریونا! آج ساری زمین تیرا کفن ہے"

(۲) مروسیا

بحیرۂ اسود پر ــــ ایک سفید چٹان پر
پتھر کا قید خانہ کھڑا ہے
سات سو کوسیک (Cossack) ــــ قسمت کے مارے ہوئے
ان کالی کوٹھڑیوں میں تیس سال سے بند ہیں
انہوں نے خدا کی دنیا نہیں دیکھی
اور نہ مقدس سورج کی روشنی ان کی آنکھوں پر پڑی
(بزرگ خدا! ہم بدقسمتوں کو رہائی دلا
اس سخت قید اور مسلمانوں کے عقیدے سے
ہم کو خاموش سمندروں پر تاروں کی دنیا میں بھیج دے۔
خوش آئند وطن میں، عیسائیت کی زمین پر
اے خدا ہم کو ہماری دعاؤں میں سن)
تب ایک دن غلام لونڈی "مروسیا" پادری کی بیٹی ان کے پاس
آئی اور ان سے کہا:۔
"اے کوسیک لوگو!
بدقسمت قیدیو!
کہو ــــ آج یوکرائنا میں کیا ہو رہا ہے
اے غلام لونڈی مروسیا!
ہم کیسے بتا سکتے ہیں کہ آج یوکرائن میں کیا ہو رہا ہے!
کیا ہم تیس سال سے قید میں نہیں
خدا کی دنیا سے الگ، سورج کی روشنی سے دور،
اس لئے ہم نہیں بتا سکتے کہ آج یوکرائن میں کیا ہو رہا ہے"!
تب غلام لونڈی "مروسیا" پادری کی بیٹی بولی
"اے کوسیکو! بدقسمت قیدیو!
آج ہمارے ملک میں "ایسٹر" منایا جا رہا ہے
اور کل "ایسٹر فیسٹ" کی مقدس دعوت کا دن ہے"
ان کے سفید چہرے زمین کی طرف جھک گئے
اور انہوں نے غلام لونڈی "مروسیا" کو بددعا دی
"خدا کرے! اے پادری کی بیٹی!
تجھ کو کبھی خوش قسمتی اور خوشی نصیب نہ ہو۔
کیونکہ تو نے یہ خبر سنا کر ہمارے بھولے ہوئے رنج کو تازہ کر دیا"!
"اے کوسیکو! بدقسمت قیدیو۔
قسمیں نہ کھاؤ۔ مجھے بددعا نہ دو
جمعہ کے دن جب ہمارا ترکی پاشا مسجد جائے گا۔
میں یہاں آؤں گی اور قید خانے کے دروازے کھول کر تم سارے
بدقسمتوں کو رہا کر دوں گی"۔
"ایسٹر کے پہلے دن ــــ جب ترکی پاشا مسجد گیا
اس نے اپنی کنجیاں غلام لونڈی کو دے دیں
"مروسیا" پادری کی بیٹی کو
وہ آئی اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔
اور بولی:۔
میں تم سے کہتی ہوں ــــ جو حق ہے وہی کرو۔
سیدھا یوکرائن کے شہر کو چلے جاؤ
لیکن میں التجا کرتی ہوں
"یوسلف" کے گاؤں سے نہ گزرنا۔
میرے باپ اور میری ماں سے ملنا
تو میرے باپ سے یہ کہنا کہ اپنے گھے فروخت نہ کرے
اور اپنا مال نہ لٹائے
مجھے غلامی سے چھڑانے کے لئے روپیہ نہ جمع کرے۔

کیونکہ میں ترک بن گئی ہوں —— مسلمان -
ترکی آرام، اچھی زندگی اور غم آمیز خوشی کے لئے"

(۳) تاتاری حملے کے وقت

یوکرائنوں کی تاریخ میں تاتاریوں کو وہی اہمیت حاصل ہے جو امریکہ کی تاریخ میں "رَیڈ انڈینس" کو۔ انہوں نے کریمیا میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً یوکرائن پر حملہ کرتے اور لوٹ مچاتے وہاں جو باشندے ہاتھ آتے انہیں لے جاکر ترکی غلاموں کے بازار میں فروخت کرتے۔ بعد میں انہوں نے آپس میں کثیر تعداد میں شادیاں بھی کیں

یوکرائنا بہت فکر مند ہے اس کے رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔
"اوردا" نے اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے بچوں کو کچل دیا ہے
ہورڈوں کا سیلاب بوڑھوں کو اپنے ساتھ بہا لے گیا
جو باقی بچ گئے تھے قیدی بن کر چلے گئے
اب یوکرائن کی کون حفاظت کرے گا۔
اس مصیبت کے وقت میں؟
اس کی زمین دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے
اس کے لڑکے چار حصوں میں منتشر ہو گئے ہیں۔
اس کا چہرہ تاریک ہو گیا ہے۔
وہ مریض ہے۔
تاتاریوں کے مظالم کی وجہ سے!

(۴) بیدا کا گیت

یوکرائن کے شہزادہ کوسیک بیدا کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں اس کا اصلی نام منرڈ تھا۔ یہ وہی فاتح ہے جس نے کوسیکوں کا مشہور قلعہ "سیچ" بنوایا تھا۔ ترکوں پر اس کے بہادرانہ حملے بہت مشہور ہیں۔ اس گیت کے بند اس کے ایک قابل ذکر واقعے سے متعلق ہیں۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ ترکی کے سلطان کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جب یہ قید ہو گیا تو سلطان نے بیدا کو قسطنطنیہ کی دیواروں سے جن میں لوہے کے بڑے بڑے کڑے آویزاں تھے رسیوں سے باندھ کر لٹکا دیا لیکن کسی طرح سے بیدا کے ایک ملازم نے اسے تیر اور کمان دے دی جسے اس نے چھپا لیا اور جب سلطان کی سواری اسے دیکھنے آئی تو اس نے تین مسلسل تیروں سے سلطان، اس کی بیوی اور پھر اس کی بیٹی کو مار ڈالا۔

"بیدا، بیدا شہد کی شراب پی رہا تھا۔
نہ ایک دن، نہ دو دن اور نہ ایک رات سے
ترکی کا سلطان آیا
"نوجوان تم کیا کر رہے ہو؟"
"میں شراب پی رہا ہوں" بیدا نے کہا "ایک دن سے نہیں
دو دن سے نہیں —— میری کوئی رات خالی نہیں"
"اگر تم شراب پینا چھوڑ دو تو میں قسم کھاتا ہوں
اپنی لڑکی کی منگنی تمہارے ساتھ کر دوں گا"
"وہ میری نظر میں زیادہ خوبصورت نہیں
اور اس کا مذہب میں نہیں پسند کرتا"
"کہاں ہیں میرے سپاہی۔ اس بد زبان کو لے جاؤ
اس کی پسلیوں سے رسی باندھ کر قسطنطنیہ کی دیواروں سے لٹکا دو
نہ ایک دن، نہ دو دن
اور نہ صرف ایک رات بیدا لٹکتا رہا۔
ایک ہفتہ کے بعد سلطان آیا:۔
"ہاہا! بیدا کیا تو بالکل گونگا ہو گیا ہے؟"
"نہیں" اس شوہر نے کہا "میں دو درخت دیکھتا ہوں
دو کبوتر اُن پر آرام سے بیٹھے ہیں"
"اپنی کمان میرے حوالے کر دو" سلطان بولا
"تم کو اس جرأت کی کافی سزا ملے گی"
بیدا کا سیدھا ہاتھ کمان سے قریب ہوا
اور سلطان کی کنپٹی میں تیر پیوست ہو گیا،
اُف سلطان کی بیوی کو بھی اس نے مار دیا،
آہ اُس کی بیٹی کو بھی نہ چھوڑا،
"یہ کچھ دیر پہلے بادشاہ تھا" بیدا چلایا
"لیکن دیکھو اب کیسا بے بس ہو کر پڑا ہے
اچھا اب میں سمجھتا ہوں
مجھے شراب کا دوسرا گھونٹ پینا چاہئے"
بیدا، بیدا شہد کی شراب پیتا ہے
نہ ایک دن، نہ دو دن اور نہ ایک رات!"

۴۔ کوسیکوں کے گیت

(۱) روانگی کا گیت (سولھویں صدی)

کوسیکوں نے بگل بجایا۔ اور وہ جا رہے تھے
دور بہت دور — آدھی رات کو
مروسنکا کی بھوری آنکھیں
روتے روتے بہت جلد اندھی ہو جائیں گی
نہ رو، نہ رو مروسنکا، غمگین نہ ہو — غم نہ کر
خدا سے اپنے پیارے کے لئے دعا کر"
چاند بے ہوا کی خاموشی میں طلوع ہوا
کوسیک سے اُس کی ماں نے کہا
اُس کی "الوداع" آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی۔
"جا اب جا میرے چھوٹے لڑکے!
جا! لیکن بہت دنوں تک غائب نہ رہنا
چار ہفتے ختم ہونے سے پہلے آ جانا"
"میں بہت جلد آ جاؤں گا میری ماں
ایک مہینہ ختم ہونے سے پہلے
لیکن میرے سیاہ خوبصورت گھوڑے نے
دروازے سے نکلتے ہی ٹھوکر کھائی"
خدا جانے کیا ہو گا — سب کچھ خدا ہی کی مرضی سے ہو گا
میں اچھی طرح گھر واپس آ جاؤں
یا خونی میدان میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں
پیاری ماں — اپنی چہیتی لڑکی کی طرح
میری مروسنکا کو اپنے پاس رکھنا
میرے نیچے میرا گھوڑا زور سے ہنہنا رہا ہے
تم لوگوں کی امیدوں سے پہلے ہی میں آ جاؤں گا"

(۲) قیدی

کوئل — کوئل گا رہی ہے۔ صبح اندھیرے منہ
نوجوان کوسیک اپنی اپنی محبوبہ سے دور قید خانے میں پڑے ہیں
کمرے کی تاریکی میں اُن کی امیدیں مر چکی ہیں
لیکن کوئل گا رہی ہے۔ صبح سویرے اندھیرے منہ
"ہوا چل رہی ہے — کاش سمندر کی طرف سے چلتی
اور ہم کو ہمارے علم کے بغیر بہا لے جاتی
ہماری بھاری زنجیریں پیچھے چھوڑ کر
کاش سمندر کی طرف سے ہوا آتی
او سورج! او سورج تو جس رائن پہ چمک رہا ہے
ہم کو وہیں لے چل جہاں ہماری محبوبہ ہمارے لئے بے قرار ہے
کوسیکوں نے اپنا ناچ شروع کر دیا ہو گا۔
دھوپ میں دھوپ میں مسرت کا رقص
نیلے سمندر! وہ ہواؤں کے ساتھ سمندر پر رقص کرتے ہوئے
ہمارے بھائی ہماری طرف آ رہے ہیں — ہم کو آزاد کرنے کے لئے
آہستہ آہستہ سمندر پر — اس کی موجوں پر"
کوئل — کوئل گا رہی ہے
صبح — اندھیرے منہ سلطان سو رہا ہے
رونے والوں کی آواز سن کر وہ جاگ اُٹھا
اُن کے ہاتھوں اور پاؤں کو مضبوط زنجیروں سے جکڑ دو
تاکہ وہ فرار نہ ہو سکیں، صبح سویرے اندھیرے منہ

(۳) ترکوں کی قید میں

دریائے ڈنائپر کے دہانے پر ایک جزیرہ تھا جس کو "پورتستا" کہتے تھے۔ کونٹ منزو وشنوسکی (بیدا) نے یہاں ایک قلعہ بنوا کر دو ہزار کوسیکوں کو متعین کیا تھا تاکہ وہ یوکرائن کو تاتاری حملوں سے محفوظ رکھیں۔ بعد میں یہ قلعہ "سیچ" کہلانے لگا اور تاتاریوں اور پولینڈ کے باغیوں کی آماجگاہ بن گیا — پھر ایک نیم سیاسی حکم کے تحت "نائٹس" کی ایک جماعت لامذہبوں سے لڑنے کے لئے یہاں مقرر کی گئی — وقت گزرتا گیا اور زمانے کے امتداد کے ساتھ ساتھ "سیچ" مشرقی یورپ کا ملٹری ہائی اسکول بن گیا۔ کوسیک تاتاریوں کو کریمیا سے آگے نہ بڑھنے دینے کیلئے لڑتے رہے اور قسطنطنیہ حاصل کرنے کے لئے ترکی پر متعدد حملے کئے جب کوسیکوں کے قصبے نے پولینڈلوں کے خلاف بغاوت کی تو زیپوروگیں کوسیک بھی اُن میں شامل ہو گئے اور ان کا قلعہ یوکرائنی جمہوریت کا مرکز بن گیا۔ ۱۷۷۵ء میں "سیچ" کیتھرائن ثانی کے ہاتھوں تباہ کر دیا گیا۔

نیلے سمندر پر لہریں گرج رہی ہیں
اور پہاڑوں کی بلندی تک اوپر اُٹھتی ہیں
بدبخت! ڈرپوک کوسیک

اپنے ترکی قید خانوں میں چلا رہے ہیں۔
"کیوں اے میرے مہربان خدا ہم پر یہ آفت کیوں!
دو سال سے ہم یہاں پڑے ہوئے ہیں۔
زنجیروں سے ہمارے ہاتھ بھاری ہیں
کیا ہم اسی طرح یہاں مر جائیں گے؟
یوکرائنی عقابوں کے بچو، اٹھے
ترکی غلام کاٹ کر پھینک رہے ہیں
زندہ شکاریوں کی قبریں
ہمشے! نوجوان زیپوروگین کیا تم ابھی بیدار نہیں ہوئے؟
آزادی کے بیٹو
ہم کو ترکوں کی قید سے رہائی دلاؤ"

۵- دیہاتی گیت

(۱) گیت

میں ندی کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا
میرا گھوڑا میرے پہلو میں چل رہا تھا۔
"کوسیک مجھ سے شادی کرو گے؟" ایک میٹھی آواز آئی
"مجھ سے شادی کرو یا نہ کرو
لیکن صرف اتنا تو کہہ دو
کہ شاید کسی اچھے دن تم مجھے شادی کا پیغام دوگے"
"او! اگر تم مجھ سے زیادہ دولت مند ہوتیں خوبصورت لڑکی
میں تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ضرور لیتا
اور میرے سخت گیر باپ کے سامنے ہم تم کھڑے ہوتے"
"اوہ! اگر میں دولت مند ہوتی مغرور کوسیک!
تو تم جانتے ہو میں کیا کرتی!
میں تمہارے باپ کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالتی"
میں ندی کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا
"سرد آہیں نہ بھر خوبصورت لڑکی!
تیرے باغ میں "بارومینو" کبھی نہ مرجھائے گا
اگر تو مجھے اپنا نہ بنا سکی تو تجھے فکر کیا
تیرے لئے دوسرا بہت جلد آجائے گا
ابھی تیرے گال سرخ ہیں تو جوان ہے"!

(۲) دوشیزہ لڑکی کا گیت

میری کالی پلکیں کس کام کی ہیں!
میری نیلی آنکھوں کا کیا مصرف؟
میری جوانی کچھ نہیں —— میری خوشی اُڑی جا رہی ہے،
اس لئے کہ میری جوانی ہر روز ڈھلتی جا رہی ہے
آنکھیں روتے روتے بے نور ہو گئی ہیں
پلکوں کا جسم مرجھا سا گیا۔
اے کنواری لڑکیو! اب میں جوانی سے بیزار ہو گئی ہوں۔
اس پرند کی طرح جو ہوا کی کمی کے سبب مر جاتا ہے
تو میں کیوں اپنے حسن کی قدر کروں؟ —— آخر کیوں؟

(۳) پریمی

تیز ہوا ہمیشہ چلتی ہے
پیڑ کی اونچی شاخیں زور زور سے ہلتی ہیں
اُس کا خط کبھی نہیں آتا
اُف میرا دل ٹوٹ رہا ہے
اے بے رحم تکلیف دہ ہواؤ
اُس سے میں بہت جلد نفرت کرنے لگوں گی
وہ مجھے مسلسل خط لکھتا رہتا ہے
میں کب تک انتظار کرتی رہوں؟

(۴) چاندنی

یوکرائنا میں اکثر یہ ہوتا کہ پندرہ سولہ سال کی لڑکیوں کی شادی ان کی رائے اور اُن کی پسند کے بغیر صرف ماں کے انتخاب پر کر دی جاتی۔ چنانچہ بہت سی جوان لڑکیاں ڈوب مریں —— جب وہ یہ دیکھتیں کہ ان کا سنہرا مستقبل تاریک ہو رہا ہے۔

چاند کی روشنی چمکتی جا، چمکتی جا
پن چکی کے پہیئے کے گرد
"باہر آ پیاری اور اس کی بہار دیکھ
سُن رات کتنی خاموش ہے!
آ! دو گھڑی بیٹھ کر باتیں کریں"
"آہ میں تو خود آنا چاہتی ہوں پیارے

دیکھو میں کتنی بے چین ہوں
لیکن ان کھڑکیوں میں روشنی اب تک جل رہی ہے
ہماری ذرا سی سرگوشی نہیں ادھر توجہ کر دے گی .....
افسوس وہ ہمیں نہیں ملنے دیں گے
ماں! کیا یہ تم ہو؟ ..... مجھے نہ ملنے
مجھے ہمیشہ کے لئے لنگڑا نہ کر دے
ٹھہر —— تو آج رات میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر
مجھے دریا میں دھکیل سکتی ہے
لیکن مجھے ایک لمحہ کی نظر دے
تاکہ میں ایک اجنبی پہ نظر ڈال سکوں
—— خوبصورت دنیا الوداع
زمین ساری خوبصورت چیزوں سے بھری ہوئی ہے
میری بدبختی کو کون دیکھے گا!
کون میرے ساتھ دریا تک جائے گا؟
دنیا تو خدا کی ساری چیزوں کی طرح حسین تھی
لیکن میرے دن بڑی تکلیف میں کٹے ——
اس سے زیادہ تکلیف مجھے جانے میں ہے
آہ! موت کتنی بھیانک ہے!
میرے پاس خوشی کبھی آتی ہی نہیں"

(۵) اکیلی محبت

میں نے اسے کھو دیا —— اپنی پیاری کو
اس طرح میں نے اپنی محبوبہ سے محبت کی
جس طرح ماں اپنے بچے سے
اس طرح کاش میں نے اپنی پیاری کو
اپنا دل دیا ہوتا
میں کھڑکی میں بیٹھا ہوں
اور سوچتا ہوں کیا وہ مجھ سے شادی کرے گی"؟
کاش وہ میرے دل کی حالت جانتی
جس طرح ماں اپنے بچے کی۔
میں اس کے آنے کا انتظار کرتا ہوں
اگرچہ وہ کبھی نہیں آتی۔ افسوس اب میں نے جانا
وہ میری پروا نہیں کرتی۔ محبت کی توہین کرتی ہے

(۶) ناچ کا گیت

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے، موسلا دھار
وہ تیزی سے نیچے آ رہی ہے
تن تنہا —— اتنی خوبصورت
نالوں میں "شش شش" آواز ہو رہی ہے
"آج مجھے کون گھر لے جائے گا"!
کوسیک جو دیر سے شراب پی رہا تھا
ناچ والوں کی پارٹی میں ایک عورت کو ہنستے ہوئے دیکھ کر بولا۔
اے حسینہ، کچھ دیر ٹھہر
میں آج تجھے تیرے گھر پہنچاؤں گا"
میں منت کرتی ہوں۔ مجھے میرے گھر نہ لے جا
کیونکہ —— میرا شوہر ریچھ ہے
میں وہاں پہنچوں گی تو وہ مجھے مارے گا
"تم اپنے ساتھ مجھے لے جاؤ گے"!
سازوں کی آواز بارش کی طرح تیز ہو جاتی ہے
بجانے والے جھومنے لگتے ہیں
وہ کوسیک ٹھہرا ہوا ہے —— وہ بھی نہیں گئی
سب جانتے ہیں کہ وہ آج اسے گھر لے جائے گا۔

(۷) جدائی کا گیت

ہوا تیز چل رہی ہے —— درخت جھکے جا رہے ہیں
میں روتی ہوں کیونکہ میرا دل دکھتا ہے
ایسے درد سے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں
میرے سال روتے ہوئے بسر ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے
تنہا اکیلی میں روتی ہوں
ایسا نہ ہو لوگ کہیں دیکھ لیں
کیونکہ جب کوئی آنسو نہیں دیکھتا۔ اور کوئی نہیں جھڑکتا
تو ایک لمحے کے لئے میرا دل سکون محسوس کرتا ہے۔
ریت میں اگا ہوا پودا کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔
اگر سورج اور شبنم اسے غذا نہ پہنچائیں
پھر میں کس طرح زندہ رہوں جبکہ ایسے بوجھل دلوں میں

میرا جان سے زیادہ پیارا محبوب میرے پاس نہیں

(۸) انگوٹھی

ایک مہینہ گزر گیا جب میرا سپاہی مجھے الوداع کہہ کر رخصت ہوا تھا اور
جاتے ہوئے اس نے اپنے آنسوؤں کے ساتھ مجھے ایک انگوٹھی دی۔
"اگر میں جنگ سے واپس نہ آؤں
یہ انگوٹھی تمہارے سچے سپاہی کی یاد دلائے گی"۔
آج صبح سویرے انگوٹھی میری انگلی میں ٹوٹ گئی
یقیناً تباہی اس کے سر پر بیٹھی مسکرا رہی ہے
میں نجومی سے پوچھوں گی — میں ابھی جوان ہوں۔
"انگوٹھی کے ٹوٹ جانے کا کیا مطلب!
مجھے خوف ہے کوئی بری خبر آنے والی ہے"۔

. . . .

"یہ بہت برا ہوا۔ اس کا ٹوٹنا کسی کی موت ہے"
"ہاں میرا کلیجا جلتا ہے — آگ کی طرح جلتا ہے"۔
دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک ہو گئی اور وہ بیہوش ہو گئی — جیسے
جلتی ہوئی دھوپ سے پھول کمہلا کر پتوں میں ڈھلک جاتا ہے
گاؤں میں ایک پرانا قبرستان ہے وہاں شاہ بلوط کی ایک صلیب ایستادہ ہے
اس کے تلے ایک لڑکی سو رہی ہے — کئی سال سے
دور کسی زمین میں وہ ابدی نیند سو رہا ہے

(۹) رومال

سورج سمندر کے افقی کناروں پر ڈوب رہا تھا
سرخ، سرخ جیسے خون —
اور اس ارغوانی سیلاب میں ایک دوشیزہ نے
سنہرے اور روپہلے تاروں سے ایک دستی بنائی
جب وہ سی چکی تو اسے اپنے سینے سے لگایا
پھر خوب روئی — اور دریچے کے دونوں پٹ کھول دئے۔
اے ہوا کے تیز جھونکے، میرے عقاب! اسے اپنے بازوؤں پہ لے جا
اتنا تیز جس تیزی سے دونائی ندی آگے بڑھتی ہے۔
اے آزاد ہوا میری طرف سے اسے لے جا
جہاں وہ ہے — ہاں میرا دل خوب جانتا ہے
وہ اس وقت "آلکانوں" کی صفوں میں لڑ رہا ہے۔
جا میرے سنہرے عقاب — سورج اور چاند سے گزرتا ہوا
ہوا پر بہتا جا یہاں تک کہ اسے پالے
اور سنہرے عقاب جب تو کوئی آواز سنے
قمری کی طرح — ٹھہر جانا میرے پیارے کے لئے
اس مقام پر میرا پیارا تیرا انتظار کرتا ہوگا
اس کے پاس ایک نفیس گھوڑا ایک سونے کی سی تلوار ہے
تو آندھی کی طرح آزاد اور نڈر ہو کر
اس کے اوپر جا گرنا جیسے کوئی گلاب کی پنکھڑی
اگر وہ سو رہا ہے تو اسے جگانا نہیں اور
(اے میرے خدا) اگر وہ بے جان پڑا ہے
تو لوٹتے ہوئے
اسے سنہرے عقاب اس کے میٹھے چہرے پر ڈال دینا

(۱۰) انگوٹھی کا تحفہ

اس نے مجھے ایک انگوٹھی دی۔ میں ہنسی اور اس سے پوچھا۔
"اس کا کیا مطلب"؟ "تحفہ" اس نے جواب دیا
دوسرے دن میں دوسرے کے ساتھ گئی۔
اور شام کو جب پلٹی تو وہ بہت غصے میں تھا
"تم نے میری انگوٹھی پہن رکھی ہے" اس نے طعنہ دیتے ہوئے کہا
انگوٹھی کے معنی شادی کے ہیں — تم میری ہو گئی ہو"۔
میں نے انگوٹھی اتار کر اس بے وقوف مرد کی طرف پھینک دی اور کہا۔
"چلے جاؤ! میں نے ایسا بے وقوف شخص آج تک نہیں دیکھا۔
جو کہتا کچھ ہے اور معنی کچھ اور لیتا ہے"

(۱۱) یوکرائنوں کا قومی ترانہ

یوکرائن ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کی آزادی اس کی شان!
ہم کو یہ امید رکھنا چاہئے کہ ایک مرتبہ پھر قسمت
اس کی داستان کو روشن بنائے گی
سورج طلوع ہوتے وقت شبنم کی طرح
ہمارے دشمن غائب ہو رہے ہیں۔
ہم حکومت کریں گے اے نوجوان بھائیو!
ہمارے ملک کو کوئی ڈر نہیں
کورس:- روح اور جسم کی قربانیاں دے کر

ہم اپنی آزادی کی پرورش کر رہے ہیں۔
ہم بتا دیں گے کہ ہم بہادر بیٹے ہیں۔
ان بہادر کو سیکون کے جو برباد ہو گئے
ملی وکوادو ، زنالی ، زہ نوک اور ترا سیلو قربان ہو کر
ہم کو ہمارے مقدس فرض کے لئے آمادہ کر رہے ہیں
وہ اپنی قبروں سے ہمیں جگا رہے ہیں
ہم کو بھول نہ جانا چاہئے۔ ——
ہمارے بہادر کو سیکون کی موتوں کو
کیونکہ ہمارے نوجوان اور ان کا شباب
ہلکے داموں نہ قربان کیا جائے گا

کورس۔ روح اور جسم کی قربانیاں دے کر
ہم اپنی آزادی کی پرورش کر رہے ہیں۔
ہم بتا دیں گے کہ ہم بیٹے ہیں
ان بہادر کو سیکوں کے جو برباد ہو گئے۔

علی احمد

رباعی

عشرت میں کوئی چمن لٹاتا جائے
یا ہم سے گلہ نہ بس سر جھکاتا جائے
مطلب یہ ہے انسان کسی حال میں ہو
احساس کی لذتیں اٹھاتا جائے

حرماں خیرآبادی

غزل

اُس کے در کا سجدہ سجدہ غیرتِ صد سجدہ ہے
اس لئے ہر سجدے میں ہم کو عادتِ صد سجدہ ہے
حُسن کے ہر تازہ منظر کو نیا سجدہ ضرور
ذوقِ سجدہ کو غمِ محویّتِ صد سجدہ ہے
وسعتوں میں زندگی بھر سے ہے سایہ عتِ طویل
ایک سجدے کو میسّر عظمتِ صد سجدہ ہے
صدق کی پاکیزگی جشنِ عقیدت کا سرُور
رند کے ہر سجدے میں کیفیّتِ صد سجدہ ہے
پائے خُم پر سر ہو، دل آوازِ ساقی کی طرف
ایسے سجدے کا تصوّر غیرتِ صد سجدہ ہے
ذرّہ ذرّہ تھا مرا مسجود راہِ شوق میں
پھر بھی فطرت بندگی کو حسرتِ صد سجدہ ہے

عبدالعزیز فطرت

بے حس تماشائی

شفق نے پہن لی سرِ شام ہی ردائے سیہ پرسکوں رات کی
نہیں دن کا لیتا کوئی نام بھی خموشی نے کچھ اس طرح بات کی
ہوا نیم جاں اور فضا ناتواں
گرا چاہتا ہے ابھی آسماں
زمیں شب کے آغوش میں سو گئی اندھیرے کے طوفان میں کھو گئی
غضب ہے کہ ہر چیز چپ ہو گئی
گھروں میں دیئے جل سکے کچھ بھی پتنگے بھی جلے جل کے بجھ بھی گئے
گھنی جھاڑیاں غولِ رہ بن گئیں بھرے باغ پر وحشتیں تن گئیں
جہاں گم ہوا عالمِ خواب میں بھیانک سیاہی کے گرداب میں
غضب ہے کہ ہر چیز چپ ہو گئی
ستارے مگر جھلملاتے رہے

(۲)

طلسمِ شبِ تار مٹنے لگا افق سے ہوا ہے نمودار چاند
چلا اوجِ گردوں پہ بڑھتا ہوا سبک سیر اور نرم رفتار چاند
سنورتا ہوا جگمگاتا ہوا
جہاں کو منور بناتا ہوا
اُمڈتا ہوا آیا سیلابِ نور کیا کوہ و صحرا کو غرقابِ نور
ہوئے خاک کے ذرے سیرابِ نور
گلستاں میں نغمے چہکنے لگے شگوفوں کے چہرے دمکنے لگے
مچلنے لگے میگساروں کے دل دھڑکنے لگے ماہ پاروں کے دل
خوشی ہر طرف مسکرانے لگی محبت کی دنیا بسانے لگی
ہوئے خاک کے ذرے سیرابِ نور
ستارے مگر جھلملاتے رہے

(۳)

جہاں حسن و خوبی کا آباد تھا نشاط آفریں تھی شبِ ماہتاب
یکایک چمن کی طرف سے اُٹھا سیہ لکۂ ابر پا در رکاب
ہوا کیا چلی سر پہ ہی آ گیا
بڑھا بڑھ کے جھٹ چاند پر چھا گیا
نئی سر پہ نازل مصیبت ہوئی اندھیرے کی قائم حکومت ہوئی
مسلط پھر اک بار ظلمت ہوئی
ضیا پاشیوں کا جہاں مٹ گیا زمیں کے لئے آسماں مٹ گیا
مٹیں حُسن کی جلوہ آرائیاں مٹیں کیف و مستی کی رعنائیاں
محبت کے سیمیں فسانے مٹے حسینوں کے رنگیں بہانے مٹے
مسلط پھر اک بار ظلمت ہوئی
ستارے مگر جھلملاتے رہے

قیوم نظر

یہ شاعر

(خلوص آرٹ کا اخلاق ہے)

وجد زا کوئی تاثر بھی انہیں ملتا نہیں
قدرتی احساس سے جذبہ کوئی ہلتا نہیں

ہیں عمل پیرا یہ ہر نافہم کی تجویز پر
ناصیہ فرسا ہیں عقلِ عام کی دہلیز پر

اپنے دل کی بے کراں گہرائیوں سے دور ہیں
بک چکی ہے جن کی مختاری، یہ وہ مزدور ہیں

ہے دماغ ان کا زمانے کی نظر پر رقص کار
ہے ضمیر ان کا جہاں کی اک نگاہِ مستعار

مانگ کر اندھوں سے بینائی نظر پیما ہیں یہ
ناشناسائے تموّجِ ریگ کے دریا ہیں یہ

گفتگو ان کی پرائی سی، نظر نقال سی
ہے چکیدہ ان کے للچائے لبوں سے رال سی

جو جہاں کہتا ہے بچوں کی طرح کرتے ہیں یہ
دوسروں کے رنگ اپنے نقش میں بھرتے ہیں یہ

روح ان کی رنجِ ناپرسی سے یکسر سرد ہے
دل کی رعنائی پہ تاریکی، نظر میں گرد ہے

ایک بے وقعت سی شہرت کا پریشاں سا جنون
پے بہ پے ان کو بناتا پھر رہا ہے کارٹون

"آرٹ اور پیغام" کا اک ہوش افگن سا خیال
کر رہا ہے ان کی معقولیتوں کو غربال

بیٹھے بیٹھے جب بھی سوجھی ہے زمانے کو ہنسی
ڈال دی ہے کان میں ان کے بھنک اس بات کی

قوم کی مردہ رگوں میں جوش بھر سکتے ہیں یہ
چارۂ ناسازیِ حالات کر سکتے ہیں یہ

انقلاب آور ادب کو لا کے استعمال میں
عظمتِ ماضی کو لا سکتے ہیں دامِ حال میں

بس اسی وحشت خیالی سے پریشاں حال ہیں
اپنے حق میں آپ گویا شامتِ اعمال ہیں

ہیں یہ تحسینِ زمانہ کے نشے سے چور چور
عقل کے پیچھے لئے پھرتے ہیں لٹھ ننگِ شعور

اپنی شخصیت سے یوں خائف ہیں جیسے چور ہیں
ان کے دعوے کس قدر بے روح اور کمزور ہیں

پائیں گے کیا اپنی گہرائی کا یہ ظالم سراغ
طاقِ دل میں رکھ کے ترغیبِ زمانہ کا چراغ

ان کے امکانات محرومِ نمو رہ جائیں گے
ان کے غنچے ناشناسِ رنگ و بو رہ جائیں گے

ایک کھسیانی ہنسی کا روپ ہے ان کا کلام
دعوئے رندی تو ہے، لیکن نہ مے اپنی نہ جام!

اپنے من کی وسعتوں کا شائبہ بھی ہمنشیں
ان ریاکاروں کے پھوٹے بخت میں آیا نہیں

ڈال کر پردہ تجاہل کا یہ اپنی ذات پر
کر رہے ہیں تبصرہ آفاق کے حالات پر

پوچھ ان مردہ ضمیروں سے کسی دن اے ندیم!
کر چکے ہیں اپنے دل کی قوتوں کو جو تقسیم

کیا کبھی سرمایہ و محنت کی آویزش کوئی
دے گئی ہے زخم ان کے قلب و جاں کو واقعی!

کہہ کے مے پینے کی خواہش کو کسی شب خیرباد
کر سکے ہیں یہ کسی فاقہ زدہ کے دل کو شاد؟

کیا کوئی دن تھا کہ جب دام و درم کے یہ غلام
رک گئے ہوں کرتے کرتے کجکلاہوں کو سلام

قوم کو روتے ہوئے سو میل تک جاتے ہیں یہ
پیٹ کے دوزخ کا ایندھن جمع کر لاتے ہیں یہ

"انقلابی شاعری" کا کوئی دعویدار ہے
کوئی سرمایہ گری سے مائلِ پیکار ہے

شاعرِ ملت ہے کوئی شاعرِ مزدور ہے — آرٹ کا بیت المقدّس گرد سے معمور ہے
آرٹ خود آگاہی و "خود مرکزی" کا نام ہے — آرٹ دل کی گفتگو ہے، رُوح کا الہام ہے
آرٹ اک نازک کنایہ ہے کوئی ناول نہیں — پرتوِ اعجاز ہے، ہذیان کا بادل نہیں
آرٹ ہے نقاش کے احساس کا نازک خدنگ — دل کی سچائی کا شعلہ، رُوح کی گرمی کا رنگ
ظاہری اخلاق کے بے رنگ اور مہمل اصول — کھا چکا ہے جن کا حُسن و دلکشی مدتوں کی دھول
آرٹ کی دنیا میں ہیں کچھ وہم ہائے بے فروغ — سطح پر حُسنِ نمائش، تہ کے اندر اک دروغ
آرٹ کا اخلاق قائم ہے فقط اخلاص پر — آرٹ ہے نقاش کا احساس، آنکھیں اور جگر

مجھ کو مت اکسا ریاکاری پہ پیہم ہمنشیں! — خود فریبی فطرتِ اخلاص کا عنصر نہیں
میں نے اُس معنی کو دینا ہے لباس اشعار کا — جس میں اک پرتو ہو میری روح کے اظہار کا
میری موسیقی، مرے شام و سحر میرے خیال — میرے دلکش عیب میرے خوبصورت احتمال
حُسن میں آنکھوں کا رنگیں اور وارفتہ مزاج — گاہ دل کی شادکامی، گاہ دل کا اختلاج
چاندنی راتوں میں لہراتی ہوئی زلفوں کا رنگ — رقص کرتی سی مسرت سانس لیتی سی اُمنگ
مہ وشوں کی نرم باہوں کی صباحت کا گداز — آنکھ کی مستی، جبیں کا نور، مے کے برگ و ساز
معنی و احساس کے تازہ کنول کھلتے ہوئے — مے کی رَو بہتی ہوئی، مستی کے لب ہلتے ہوئے
روحِ شاعر روحِ فطرت، روحِ فطرت بے قرار — شعر ہے فطرت کے دل کا ایک نورانی شرار
زندگی کے دُکھ کی باتیں، زندگی کے سُکھ کا راگ — قلبِ شاعر ایک مستی، قلبِ شاعر ایک آگ
زندگی کا طرفہ گر ہوں، زندگی کا نغمہ خواں — کہہ رہی ہے زندگی میری زباں میں داستاں
زندگی کا دل دھڑکتا ہے مرے اشعار میں — گیت اور آہیں ہیں ہم آمیز اس پیکار میں
ہمنشیں مجبور ہوں میرے جواں افکار ہیں رق، — میرے شعروں کے تبسّم خانۂ پندار میں
میری اپنی ذات ہی ہوگی سراپا جلوہ گر — میرے دریا میں نظر آئیں گے میرے ہی بھنور
اپنے شعروں میں ہیں اپنے دل سے ہم آہنگ ہوں — [illegible] کی قوسِ قزح کا رنگ ہوں
ایک سچائی ہے میرا آرٹ اک دھوکا نہیں — ایک جلوہ ہے مری تصویر، اک پردا نہیں
ایک اونچے روپ میں گُم ہے مرا ذوقِ نظر — اے مرے ہمدم مجھے رہ رہ کے شرمندہ نہ کر

آرٹ کو میں وعظ سے آلودہ کر سکتا نہیں!
جھینگروں کی سطح پر شاعر اُتر سکتا نہیں۔

عدم

گرجن کی ایک شام

عرشی اور ارضی کی بحث بہت پرانی ہے۔ وہ ادیب جو ہر وقت آسمان پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی خدمت میں میں صرف یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ہماری زمین بھی ایک ستارہ ہے۔

(میکسم گورکی)

۔تول ست تمہیں خط نہیں لکھ سکا۔ شاید اوشا کی فریب کاریوں کو بھولنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر جگدیش کی دلدوز محبت کے آخری منظر دیکھنے میں مصروف تھا کچھ ٹھیک طرح سے تمہیں نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے کہ تم پوچھو۔ کیا جگدیش بھی محبت کر سکتا ہے۔ موٹا سا آدمی۔ گو کچھ اتنا موٹا بھی نہیں۔ لب پر ہر وقت مسکراہٹ تنکا کا شوقین۔ برج اور بیئر کا پجاری۔ کیا ایسا شخص بھی الفت کی ستمگاریوں کی تاب لا سکتا ہے۔ تو میری جان میرے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ ..... مگر نہیں، یہ بہتر ہوگا کہ پہلے میں تمہیں اس جگہ کے متعلق بتاؤں جہاں ہم گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے پڑے ہوئے ہیں کیونکہ ماحول نہ صرف حیاتِ معاشرہ کا بلکہ ہماری تمام زندگی کا جزوِ اعظم ہے اور خاص کر محبت اور ماحول میں جو گہرا تعلق ہے وہ مجنوں کی بادیہ پیمائی اور فرہاد کی کوہ کنی سے صاف عیاں ہے۔ دور کیوں جاؤ تمہارے وطن پنجاب ہی میں سوہنی مہینوال کا افسانہ محبت دریائے چناب کی پرشور روانیوں کا رہین منت ہے اور ہیر رانجھے کا دلفریب قصۂ الفت ذات پات اور قبائلی رکاوٹوں کی دیوار پر عشق پیچاں کی طرح آویزاں نظر آتا ہے اور سچ پوچھو تو غالباً ہم کسی فردِ واحد سے محبت نہیں کرتے بلکہ اگر محبت کرتے ہیں تو صرف اپنے آپ سے، دراصل انسانی محبت بذاتِ خود ایک حقیر سی شے ہے، محبت ہے کیا؟ یہی دو دھڑکتے ہوئے دلوں کا سنگم، لیکن جو چیز اسے عرفانی بلندیوں پر لے جاتی ہے یا اہرمنی پستیوں میں گرا دیتی ہے۔ وہ اس کا ماحول ہی ہے۔ ماحول کی اہمیت سے انکار کرنا زندگی کی عظمت سے انکار کرنا ہے۔ بیچارا جگدیش بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے پوچھو جن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں اور جن کی گہرائیوں کا الم کسی بے کس زخمی، سسکتے ہوئے آہو کے درد کا آئینہ دار ہے۔

سب سے پہلی بات جو میں تمہیں اس جگہ کی بابت بتانا چاہتا ہوں وہ اس کی بلندی ہے۔ یہ جگہ سطح سمندر سے سترہ ہزار فٹ بلند ہے۔ اس بلندی پر پہنچ کر انسانی محبت بھی بلند ہو جاتی ہے۔ خیالات و تاثرات میں غیر ارادی و غیر شعوری طور پر ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغ پر ایک عجیب نشہ دل میں ایک عجیب وسعت، روح پر ایک عجیب سا وجد طاری ہو جاتا ہے۔ تنفس کا دورہ تیز ہے اور کاندھوں پر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منوں بوجھ تھا جو اٹھ گیا۔ اوپر دیکھو تو آسمان کو چھونے کو جی چاہتا ہے اور نیچے دیکھو تو دامن میں کوہ کا سلسلہ، کہ کوہ گرتے ابھرتے اور پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چشم زدن ہی میں نظر ان پہاڑوں اور وادیوں سے پھسلتی ہوئی نچلے میدانوں پر پڑتی ہے اور نظر کا آخری نقطہ وہ ہے جہاں دریائے جہلم کا پانی چاندی کے پتلے تار کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بلندی پر پہنچ کر آدمی سب پستیوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پاک و صاف سمجھتا ہے جتنی کہ یہ سپید برف جس کی آب و تاب میں موت کی خاموشی اور قدرت کی پاکیزگی پنہاں ہے۔ یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ اوشا کی محبت کتنی حقیر تھی اور اس کا دائرہ کتنا محدود، یہ وہ محبت تھی جو صرف ڈرائنگ روم ہی میں کی جا سکتی ہے۔ اس استوائی پھول کی طرح جو شیشے کی دیواروں کے اندر ایک محبوس باغیچے ہی میں کھل سکتا ہے۔ اور مصنوعی روشنی، مصنوعی حرارت اور مصنوعی غذائیت کا محتاج ہے، ڈرائنگ روم۔ ریشمیں ساریاں، برقی قمقمے، مصنوعی چلتے ہوئے فقرے۔ میں حیران ہوں کیا واقعی مجھے اوشا سے محبت تھی یا شاید یہ اس غیر فطری ماحول کا اثر تھا، جو

باہر کی کھلی اور خوشگوار فضا میں پہنچ کر مٹ گیا۔

یہاں بجلیاں کوندتی ہیں، بادل گرجتے ہیں، رم جھم، رم جھم بارش ہوتی ہے اولے پڑتے ہیں۔ برف گرتی ہے۔ پھر ہوا کے چند تیز و تند جھونکے آتے ہیں اور مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ آسمان خوش نما نیلگوں، آفتاب سونے کے تھال کی طرح درخشاں، اور پر پھیلائے ہوئے ہوا میں تیرتی ہوئی چیل کسی پری کی طرح حسین نظر آتی ہے۔ ہم اپنے خیمے کا جالی دار پردہ کھولتے ہیں۔ گرم کافی کی پیالی ہاتھ میں۔ بندوق کاندھے پر لٹکائے باہر نظر دوڑاتے ہیں۔ چاروں طرف برف ہے، ہوا خاموش ہے۔ آسمان صاف ہے۔ ہم آہستہ آہستہ کافی پیتے اور چمڑے کے جوتوں کے اوپر دھان کے خوشوں سے بنے ہوئے جوتے پہن لیتے ہیں اور شکار کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ یہاں شکار بہت ملتا ہے، جنگلی بکریاں۔ رونسے۔ ریچھ اور بھیڑیے، آخر الذکر بھوکے ہوں تو شکاریوں کو ہی شکار کر لیتے ہیں۔ پھر رات کے وقت الاؤ کے قریب خیمے میں بچارا چوکیدار اور اس کا جانباز کتا آگ تاپتے ہوئے مایوسانہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ کالی رات میں ہوا سیٹیاں بجاتی ہے۔ بھیڑیے چلاتے ہیں پھر برف کے تودوں کے گرنے سے ایک مہیب اور خوفناک آواز پیدا ہوتی ہے جو دُور دُور تک پھیلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس کے بعد خاموشی، مکمل خاموشی، موت اور سکون، شکاری نہیں آیا۔ شکاری اب کبھی نہیں آئے گا شکار کرتے کرتے وہ خود شکار ہو گیا، اس کی ہڈیاں برف کے تودوں کے نیچے ہیں اور اُن پر بھیڑیے ناچ رہے ہیں۔

لیکن گھبراؤ نہیں دوست۔ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ صحیح و سلامت اور اب تک ایک درجن کے قریب ریچھوں، رونسوں، اور بھیڑیوں کو گولی کا نشانہ بنا چکے ہیں۔

جس جگہ ہمارا کیمپ ہے اس سے کوئی ڈیڑھ پونے دو میل نیچے مغرب کی طرف، گرجن کا دلکش مقام ہے، اس سے زیادہ دلکش جگہ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ یہاں سے پورے دو میل بھی نہ ہوگا، لیکن اُف! کتنا دشوار گذار راستہ ہے۔ بلکہ راستہ ہی نہیں۔ ہر ایک قدم برف کو کاٹ کاٹ کر بنانا پڑتا ہے اور پھر کئی جگہ اس قدر پھسلن ہے کہ ذرا پاؤں اِدھر اُدھر ہوا تو اِزن برقرار نہ رہا تو آدمی چشم زدن میں سینکڑوں فٹ نیچے برف سے اٹی ہوئی کسی کھڈ میں جا گرتا ہے۔ اب تو ہم اس راستے سے کسی قدر واقف ہو گئے ہیں لیکن پھر بھی متواتر برف و باراں سے ہر روز نیا راستہ تراشنا پڑتا ہے اور پھر بھی اگر دھیمے سے چلتے چلتے، دائیں یا بائیں نیچے نظر پڑ جائے تو ان بے پناہ گہرائیوں کو دیکھ کر بے اختیار سارے جسم میں اک جھرجھری سی آ جاتی ہے۔

گرجن کا مقام گرمیوں میں رہنے کے لئے بہترین جگہ ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ وہ ہزاروں سیاح جو ہر سال گلمرگ جاتے ہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ گرجن گلمرگ سے کس قدر نزدیک ہے۔ گرجن میں کہیں کہیں برف کے ٹیلے ہیں تو کہیں ایسے ہموار ٹیلے جن پر گرمیوں میں ریشم کی طرح نرم اور ملائم گھاس اُگتی ہے۔ کہیں کہیں پہاڑ کی شکنوں میں تنگ کے تناور درخت کھڑے ہیں جو برف و باراں میں محفوظ خیموں کا کام دیتے ہیں، یہاں پانچ جھیلیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی اور خوش نما سب سے بڑی جھیل کو نندن سر کہتے ہیں۔ یہ کوئی ڈھائی تین میل کے پھیر میں ہوگی۔ سال میں دس مہینے یخ بستہ رہتی ہے۔ لیکن جب ہم نے اُسے دیکھا، تو گہرے نیلے رنگ کا ایک تختۂ آب بن رہی تھی، اور چاروں طرف پیلے پیلے جنگلی پھولوں سے مرصع تھی۔ یہ غالباً دنیا کی سب سے اونچی جھیلوں میں سے ہوں گی اور اس زمانے کی یاد دلاتی ہیں جب تمام دنیا زیرِ سطحِ آب تھی۔ پھر جب آہستہ آہستہ ہمالیہ کے پہاڑ نمودار ہوئے تو یہ جھیلیں وہیں پانی کے گڑھوں کی مانند رہ گئیں۔

نندن سر پر غروب آفتاب کا جو نظارہ ہوتا ہے۔ وہ نہ جھیل ڈل پر میسر ہے نہ ولر پر، یہاں نہ ہوٹل ہیں۔ نہ شکارے۔ نہ سیاح۔ نہ موٹریں، نہایت دشوار گذار راستے ہیں جو سال میں صرف تین چار ماہ کھلے رہتے ہیں اور جن پر جفاکش اور خانہ بدوش گڈریے، اپنے ریوڑوں کو گرجن کے مرغزاروں میں چرانے کے لئے لاتے ہیں۔ اور اگست کے پہلے ہفتے ہی میں پھر نیچے کی آبادیوں میں چلے جاتے ہیں۔ کبھی شاذ ہی کوئی سیاح یہاں آ نکلتا ہے، شکار کا شوقین یا تنہائی کا دلدادہ، اور پھر اُسے شاذ ہی واپس جانا نصیب ہوتا ہے پھر یہیں کہیں برف کے تودوں میں یا بھیڑیوں کے پیٹ میں، یا ان تناور تنگوں کے قریب اُس کی قبر بنتی ہے۔ اس لحاظ سے گرجن بہت بدنام ہے اور گڈریے تو گرجن دیوتا کو پوجتے ہیں جو اس پہاڑ کی چوٹی پر رہتا ہے جہاں ہمارا کیمپ ہے۔ گرجن کے دیوتا کو آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ گرجن کے دیوتا کو پردیسیوں، مسافروں اور سیاحوں سے بہت نفرت ہے وہ نہیں چاہتا کہ ماسوا، اُن پہاڑی گڈریوں کے جو اُسے پوجتے ہیں اور کسی کا بھی اُس کے علاقے میں گزر ہو۔ گڈریے جانتے ہیں کہ گرجن دیوتا جس پر ناراض ہوتا ہے، اُسے موت کی سزا دے دیتا ہے، اور جس پر خوش ہوتا ہے۔ اُس کی بکریوں میں دودھ زیادہ کر دیتا ہے، اس کی بھیڑوں کو نہایت خوبصورت ملائم ریشم سے ڈھک دیتا ہے۔ برف میں، جھکڑ میں۔ طوفان میں، ہر حالت میں اُس کے

ریوڑ کی حفاظت کرتا ہے۔

گرجن کی ایک دلفریب شام کا ذکر ہے۔ میں جگدیش اور ریوا ایک پہاڑی شکاری جسے ہم ترائی کے علاقے سے اپنے ساتھ لائے تھے شکار کھیل کر واپس کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔ اور راستے میں سندن سر کے مقام پر بیٹھ کر سستانے لگے تھے۔ اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا۔ ہوا میں ایسی خنکی تھی کہ ہر سانس میں برف کے لطیف سے گالے مُنہ کے اندر جاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر اُجلے اُجلے بادل منڈلا رہے تھے۔ بادلوں اور ڈوبتے ہوئے سورج کے عکس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی عالیشان محل کے نیلگوں فرش پر ایک طلائی ستون کھڑا ہے اور ایک مرمریں محراب کو سہارا دے رہا ہے۔ معاً جگدیش نے پانی کی سطح پر ایک سنگریزہ پھینکا، ارتعاش پیدا ہوا۔ اور دوسرے لمحے میں وہ خوب صورت محل اور طلائی ستون تھرتھرا کر لاکھوں جواہر ریزوں میں بکھر گیا، اب پانی کی ہلتی ہوئی سطح پر لاکھوں سورج متلاطم تھے اور ہر موجِ آب ایک کرن بن گئی تھی۔

جگدیش نے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب کے پیلے پیلے پھولوں کو توڑ کر ایک گچھا بنایا اور انہیں اپنے کوٹ پر ٹانکتے ہوئے بولا۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں۔ اُن کی مہک، ان کا رنگ۔ یہ مست کر دینے والا، کیف آور تعطر۔ ریوا۔ ان خوبصورت پھولوں کا کیا نام ہے۔

ریوا کسمسایا، وہ روئیدگیوں کی قسمیں پہچانتا تھا۔ ریچھوں کو دو میل کی دوری سے سونگھ لیتا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں عقاب کی سی تیزی تھی جو سَن کی طرح سامنے سے اڑنے والے بھنورے پر شست لگانے میں بھی کبھی غلطی نہ کرتی تھیں۔ لیکن وہ ان پھولوں کے نام نہ جانتا تھا۔ اچھا شکاری کہیں اچھا شاعر نہیں ہوتا۔ اُس کے بھورے رخسار اور بھی بھورے ہو گئے۔ اور وہ رُک رُک کر بولا۔ "مجھے۔ پتہ۔ نہیں۔"

جگدیش کو ریوا کی بے چینی میں بہت لطف آیا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا "ٹھیک ہے۔ ان پھولوں کے نام سے کسی کو آگاہ نہ ہونا چاہئے۔ شاید ان پھولوں کا کوئی نام ہی نہیں اور یوں بھی تو خوبصورتی کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ حسن کی کوئی ذات نہیں۔"

میں نے مسکرا کر احتجاجاً کہا "جملہ حقوق محفوظ، تم میری باتیں دہرا رہے ہو۔"

ریوا بے چینی سے اپنی جگہ پر ہلا۔

جگدیش نے مزاحاً کہا "ہونہہ۔ جملہ حقوق محفوظ! شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ادوشٹ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہو۔ ارے بھلے مانس، یہ گرجن ہے گرجن۔"

جگدیش نے بمشکل یہ فقرہ زبان سے ادا کیا ہو گا کہ بادل زور سے گرجا یہاں موسم کتنا غیر معین ہے۔ پل میں دھوپ پل میں برف و باراں، ریوا نے ایک نظر بھر کر اُن بادلوں کی طرف دیکھا جو اب گرجن کی چوٹی کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ اُس نے نتھنے پھیلا کر شمالی ہوا کو سونگھا، اور پھر اپنے فرغل کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا۔ جلدی چلو۔ طوفان آ رہا ہے۔

ہم نے اپنی سمور کی ٹوپیاں پھولوں کے تختوں سے ڈھونڈھ نکالیں اور انہیں پہن کر چل کھڑے ہوئے۔ اگرچہ ابھی دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن کئی جگہوں پر پہاڑوں اور گھاٹیوں کے مختلف حصّوں پر سفید بادل اپنا سایہ ڈال رہے تھے۔ ہوا کی خنکی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی، اور ہمیں تو ابھی بہت اوپر اپنے کیمپ تک پہنچنا تھا۔ ہم جلد جلد لیکن نہایت خاموشی سے راستے پر چڑھتے جاتے تھے۔ گرجن کی چوٹی پر سے بادل نیچے کی طرف پھیل رہے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چلنے لگا تھا اور کہیں کہیں روئیں جیسی پتلی اور ہلکی دھند ہمارے راستے میں آ جاتی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی، لیکن کوئی پون گھنٹہ کے سفر کے بعد طوفان نے ہمیں آ ہی لیا۔ ہلکی ہلکی بارش، اور پھر کرپڑی اور اُس کے ساتھ فوراً ہی برف گرنی شروع ہوئی۔ ریوا سب سے آگے تھا۔ درمیان میں جگدیش، اور آخر میں میں، ہم تینوں کی کمر میں ایک ہی رسی بندھی ہوئی تھی۔ ریوا ہمارا رہنما تھا۔ پندرہ بیس منٹ اور چلے۔ یکایک میری کمر کو ایک سخت جھٹکا لگا۔ بہت سخت، اتنا کہ اگر میرے حواس بجا نہ ہوتے اور برچھا میرے پاس نہ ہوتا تو میں یقیناً اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتا، اب میں برچھے کے سہارے کھڑا زور لگا رہا تھا۔ کیونکہ رسّا بائیں طرف جھکا ہوا تھا۔

چاروں طرف دھند چھا گئی تھی۔

اوپر سے ریوا کی آواز آئی "سنبھل جاؤ، سنبھل جاؤ۔"

"کیا ہوا؟" میں نے چلّا کر پوچھا۔

جگدیش کی آواز آئی۔ میں برف پر گر گیا ہوں۔ اُف کتنا درد ہے۔ اٹھا نہیں جاتا۔ پاؤں میں ضرب آ گئی ہے۔

"اٹھو، اٹھو، کوشش کرو" میں نے رسّی پر زور لگاتے ہوئے کہا۔

طوفان نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ دھند سفید تھی، لیکن تاریکی سے بھی بدتر، میرے اور ریوا کے درمیان جگدیش کہیں بیچ میں برف پر گرا ہوا تھا اور

ہم اُسے اٹھا نہ سکتے تھے۔

ریوا کی آواز آئی۔ "توازن ٹھیک رکھو۔ رسّی کو دائیں طرف جھٹکا دو۔

ایک ..... دو ..... تین"

بڑا زور لگایا۔ لیکن جگدیش نہ اُٹھ سکا۔

آخر رسّی کو بل دیتے ہوئے اور ربر چھے سے کچی گرہیں باندھتے ہوئے میں ریوا اور جگدیش تینوں ایک مقام پر جمع ہو گئے۔ میں نیچے سے چل کر اوپر جگدیش کے پاس پہنچ گیا اور اسی طرح ریوا اوپر سے نیچے کو آتا ہوا جگدیش کے پاس آ گیا۔ جگدیش گھٹنوں کے بل پڑا ہوا کراہ رہا تھا۔

"کیا ہوا جگدیش" میں نے جُھک کر جگدیش کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

جگدیش سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا، مگر پھر فوراً برف پر بیٹھ گیا، "آہ مجھ سے تو اب چلا بھی نہ جائے گا۔ پاؤں میں ضرب آئی ہے۔"

چاروں طرف سفید دھند چھا گئی تھی۔ ہوا میں ایک وحشیانہ تیزی تھی۔ برف خاموشی سے گر رہی تھی۔

"ہو ..... ہوآ ..... آ آ آ ہو ..... ہوا ..... آ آ آ ..... ہو" ریوا نے دو بار سیٹی بجائی۔ سیٹی کی تیز آواز کسی نوکدار خنجر کی دھار کی طرح تلملاتی ہوئی، طوفان کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اور پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

"ہوآ ..... آ ..... آ ہو، ہوآ ..... آ ..... آ ..... آ ..... ہو"

ریوا نے چند لمحوں کے بعد پھر سیٹی بجائی۔ کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔

ریوا نے ایک متعین وقفے کے بعد پھر سیٹی بجائی، اور ہم تینوں دھڑکتے ہوئے دلوں سے اس کے جواب کے منتظر رہے۔ لیکن کانوں میں صرف بڑھتے ہوئے طوفان کے وحشیانہ قہقہے تھے۔ سردی دم بدم بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں نیند آ رہی تھی۔

"مت سوؤ۔ جگدیش مت سوؤ" ریوا نے سیٹیوں کے درمیانی وقفے میں کہا۔ میری آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار چھا رہا تھا۔ پپوٹے بند ہوئے جاتے تھے۔ جانتا تھا کہ مجھے سونا نہ چاہیئے۔ جانتا تھا کہ یہ خمار موت کا خمار ہے، یہ نیند اجل کی نیند ہے۔ آخری اور کبھی نہ ختم ہونے والی نیند۔ پھر بھی آنکھیں جھپک جھپک جاتی تھیں اور جگدیش بیچارا تو بالکل اونگھ رہا تھا۔

ریوا نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ میری بات سنو۔ میری بات سنو دیکھو۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو، اپنی مٹھیوں میں برف بھر لو۔ نہیں نہیں دستانے نہ اتارو۔ یونہی مٹھیوں میں برف بھینچ لو۔ زور سے۔ زور لگاؤ اور زور لگاؤ، اور .....

"ہوآ آ آ ..... ہو ..... ہو آ۔ آ۔ آ ..... ہو" دور سے نیچے سے کسی مدھم سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریوا نے جواب میں سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز، ایسا معلوم ہوا کہ دور دور پھیلتی جا رہی ہے اور خطرے کا سگنل دے رہی ہے امداد کے لئے پکار رہی ہے۔ اس سیٹی میں کتنا خوف تھا کتنی التجا۔ کتنا درد کتنی اُمید، ہمارے کان اُس کے جواب کی طرف لگ گئے۔ کیا سچ مچ سیٹی کا جواب آیا تھا۔ کیا یہ محض اک واہمہ تو نہ تھا۔

مگر نہیں دور نیچے۔ کہیں سے پھر سیٹی کی آواز سنائی دی۔ مدھم۔ میٹھی۔ امید دلانے والی، اس برفانی طوفان میں وہ سیٹی روشنی کے مینار کی طرح چمک اٹھی۔

قدرے توقف کے بعد ریوا نے پھر سیٹی بجائی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس کا جواب آیا۔ ایک سیٹی کہہ رہی تھی۔ "ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ طوفان میں گھرے ہوئے ہیں"۔ دوسری کہہ رہی تھی۔ "گھبراؤ نہیں۔ ہم آ رہے ہیں"۔ دوسری سیٹی نزدیک آتے آتے پھر دور ہو جاتی۔ شاید راستے سے پرے ہٹنا پڑا ہوگا۔ اس طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ آدھ گھنٹہ اور، اب آنے والا ہمارے نزدیک ہی کہیں تھا۔ چند منٹ اور اضطراب میں گزرے۔ اب ہمارے سامنے ایک جفاکش ادھیڑ عمر کا پہاڑی کھڑا تھا۔ اُس کی چھاتی پر ایک لالٹین بندھی تھی جس کی مدھم روشنی اس تاریک دھند کو چیر کر بمشکل ایک دو گز دور جاتی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی ایک چھریرے بدن کا جوان کھڑا تھا۔ لیکن دھند میں اُن کی صورتیں اچھی طرح پہچانی نہ جاتی تھیں۔ بس سائے سے معلوم ہوتے تھے۔

جفاکش پہاڑی نے پوچھا "کیا بات ہے، طوفان میں کیسے گھر گئے؟"

ریوا نے جواب دیا "ہمارے ساتھی کو چوٹ آ گئی اور —" اُس نے فقرہ ناتمام رہنے دیا۔

جفاکش پہاڑی چند منٹ تک چپ رہا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

چند منٹ آرام کے بعد پہاڑی نے چھریرے بدن کے جوان کو جگدیش کی طرف اشارہ کر کے کہا "اسے اٹھالو۔ میں بمشکل راستے کی رہنمائی کر سکوں گا"

چھریرے سائے نے چند لمحوں کے لئے توقف کیا، پھر وہ جھکا اور اپنے مضبوط ہاتھوں سے جگدیش کو اٹھا کر اپنی پشت کے گردن کے قریب

رکھ لیا، دوسرے پہاڑی نے ایک رسّی سے جگدیش کی ٹانگیں اُس کی کمر سے باندھ دیں۔ پھر ایک رسّا اپنی کمر سے باندھ کر اُس جوان کی کمر کے گرد لپیٹا۔ پھر وہ رسّا مجھ تک پہنچا۔ میں نے اُسے کمر میں باندھ کر ریوا کے حوالے کیا، آخر میں ریوا نے اُسے مضبوطی سے اپنی کمر میں باندھ لیا۔

"تیار رہو"۔ پہاڑی نے ہمیں چوکنّا کرتے ہوئے کہا۔ "برتھے مضبوطی سے تھامو۔ ایک . . دو . . تین"، اور اس طرح رات کی تاریکی میں، برف کے خطرناک سمندر میں یہ کارواں از سرِ نو گرجن کو چلا۔

پہاڑی کا گھر ایک تُنگ کے نیچے تھا، وہاں پہنچ کر اُس نے جلدی سے دو تین کھالیں نکال کر زمین پر بچھائیں اور دوسرے پہاڑی نے جگدیش کو وہاں لٹا دیا۔ جگدیش بے ہوش تھا یا شاید برف کی نیند سو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کا پہاڑی تنے کی کوکھ کے اندر گیا اور وہاں سے اپنی مٹھی میں ایک گول مُڑی ہوئی چمڑے کی تھیلی سی باہر لایا۔ الاؤ کی سُرخ روشنی میں میں نے دیکھا۔ یہ ایک نافہ تھا۔

"ذی شی لالٹین بجھا دو"۔ پہاڑی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ جواب ایک طرف اندھیرے میں بیٹھا ہوا سستا رہا تھا۔ اندھیرے میں ایک لمبے سانس کی آواز سنائی دی اور پہاڑی کا ساتھی الاؤ کی طرف بڑھا۔ اُسے تاریکی سے روشنی میں آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ اب اُس نے اپنی سمور کی ٹوپی اتار پھینکی تھی جس نے اُس کے لمبے بالوں کو چھپا رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں تکان سے نیم وا تھیں اور جبیں پسینے سے تر تھی۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اُس نے پہاڑی کی کمر سے لالٹین کو کھولا۔ اور ایک پھونک مار کر اُسے بجھا دیا۔ پھر لالٹین ہاتھ میں لے کر سر کو ایک طرف جھکائے ہوئے وہ واپس اندھیرے میں چلی گئی۔

پہاڑی گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اور جگدیش کے تنفّس پر غور کرنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس نے لکڑی کے بڑے چمچے میں تھوڑا سا گرم دودھ اور نافہ ڈال کر ہلایا اور اسے جگدیش کے منہ میں انڈیل دیا۔ ایک اور چمچے میں اُس نے کوئی اور چیز گرم کی جو غالباً کسی جانور کی چربی معلوم ہوتی تھی۔ اور بہت بدبودار تھی جب وہ چربی بھی گرم ہو کر سیال بن گئی تو اُس میں بھی اس نے تھوڑا سا نافہ ڈال دیا اور اُسے انگلی سے ہلاتے ہوئے اُس نے ذی شی کو پکارا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟" ذی شی نے وہیں اندھیرے میں بیٹھے ہوئے جواب دیا اس کی آواز شکستہ اور مضمحل تھی۔

"اِدھر آنا بیٹیا۔ ذرا ان کی کنپٹیوں کو سہلاؤ۔ یہ لو روغن۔"

ذی شی نے جگدیش کا کن ٹوپ اتار دیا۔ اور اُس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کی کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی، پہاڑی تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا الاؤ کے سرخ ہالے میں پہاڑی کا شکن آلود چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ ٹھوڑی کس قدر مضبوط تھی۔ اور گردن کی رگیں باہر کو تنی ہوئی تھیں جگدیش کا سانس کبھی دھیما ہو جاتا۔ کبھی تیز چلنے لگتا، کبھی اس میں گرر گرر کی سی آواز پیدا ہوتی جیسے کسی گھڑی کو چابی دیتے وقت سنائی دیتی ہے . . . . . لڑکی دھیرے دھیرے کنپٹیاں سہلا رہی تھی، اُس کے سہلانے سے چمڑ چمڑ چمڑ کی ایک عجیب خواب آور سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں ادھ مُندی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ جگدیش پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اُس کا آدھا چہرہ اندھیرے میں تھا اور آدھا الاؤ کے ہالے میں میں اس کا چہرہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ یہ آرین اور منگول خطوط کا ایک حسین مرقع تھا۔ زعفران اور گلاب کے رنگوں کا اک دلربا امتزاج۔ اُس کے غلافی پپوٹے اس طرح جھکے ہوئے تھے کہ آنکھیں بالکل بند معلوم ہوتی تھیں۔ ذی شی . . . . . .

معاً میرے دل میں خیال آیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ ایک خواب ہے۔ یہ جوان لڑکی، یہ پہاڑی بوڑھا، یہ تُنگ کا تنا، یہ سُرخ الاؤ، یہ سب کچھ ایک طویل خواب ہے۔ شاید میں اس کے بیٹھنے کے کمرے میں صوفے پہ لیٹا ہوا اس سپنے کو دیکھ رہا ہوں۔ اور وہ ابھی ابھی ایک نیلی ساڑھی پہن کر اندر آئے گی اور مجھے سوتا دیکھ کر اپنی تحقیر آمیز ہنسی سے مجھے جگا دے گی۔ "اُٹھو۔ بے فکرا تو، ساڑھے پانچ بج گئے۔ ایڈی کینٹر کا فلم . . . . میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ قدرے توقف کے بعد میں نے پھر آنکھیں کھولیں تو وہی منظر تھا وہی پہاڑی بوڑھا درخت سے پیٹھ لگائے بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ لڑکی جگدیش کا سر سہلا رہی تھی۔ جگدیش کا تنفس اب صاف چل رہا تھا۔ الاؤ کا ہالہ تنگ ہو گیا تھا۔ تنگ ہو رہا تھا۔ اونگھتے، جاگتے پلکیں جھپکتے جھپکتے، اس خوبصورت تصویر کو دیکھتے دیکھتے آہستہ آہستہ یہ سارا منظر ایک سکوں ریز دھندلکے میں غائب ہو گیا۔

جب دوسرے دن آنکھ کھلی، تو نہ جگدیش تھا۔ نہ وہ جوان لڑکی پہاڑی بوڑھا بھی غائب تھا۔ میں اکیلا تُنگ کے وسیع سائے میں لیٹا ہوا تھا۔ کچھ دیر دل میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ کل جو کچھ دیکھا تھا محض ایک افسانہ تھا، آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پہلے تنے کی کوکھ نظر آئی، پھر دور پرے دھوپ میں ایک ریوڑ چرتا ہوا نظر آیا۔ ڈھارس بندھی، زور سے آواز دی۔

"جگدیش۔ او۔ جگدیش۔"

ریوڑ میں سے دو ایک بکریوں نے مُنہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"جگدیش" میں پھر زور سے چلّایا۔ "او جگدیش نامعقول جگدیش۔"

یکایک تنے کی کوکھ سے پہاڑی مسکراتا ہوا نکلا۔ "گرجن دیوتا کی مہربانی سے کل آپ کی جان بچ گئی۔"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور پہاڑی کی طرف تکتے ہوئے کہنے لگا "شکریہ تمہارا اور تمہاری بہادر لڑکی کا ہزار بار شکریہ۔"

"کیا نام ہے اُس کا؟ ذی شی؟"

"ہاں، ذی شی، اُس کا نام ہے۔ میری ننھی ذی شی بہت اچھی لڑکی ہے۔ گرجن دیوتا اُس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ وہ سب برفیلے راستوں سے واقف ہے۔ اُسے گرجن دیوتا کبھی کوئی گزند نہیں پہنچنے دیتے۔ چھوٹی عمر ہی میں اُس کی ماں مرگئی تھی۔ گرجن دیوتا ہی نے پالا ہے۔ گرجن دیوتا ذی شی سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

ایک گرجن دیوتا پر ہی کیا موقوف ہے۔ میں نے دل میں سوچا اس سے تو ہر کسی کا دل محبت کرنے کو چاہتا ہے۔ میں نے پہاڑی بوڑھے سے پوچھا "جگدیش کہاں ہے؟"

پہاڑی نے جواب دیا۔ صبح جب اُن کی آنکھ کھلی تو پاؤں کی موچ بالکل نکل چکی تھی۔ اب وہ ذرا نندن سر تک سیر کرنے کو گئے ہیں۔ ذی شی کو میں نے اُن کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ وہ دونوں اب واپس آتے ہی ہوں گے۔ آپ تو خوب سوئے۔"

"ہاں میں تو خوب سویا" میں نے دل میں سوچا۔ کیونکہ رات بھر کسی نے میری کن پٹیوں پر مالش نہیں کی۔ "وہ دونوں!" یہ لفظ سن کر میرے دل میں ایک نامعلوم سی خلش پیدا ہوئی۔ ایک خفیف سا انتشار! کمبخت جگدیش ہر بار بازی لے جاتا ہے۔ میں نے پہاڑی سے آہستہ سے پوچھا۔ "نندن سر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"یہی کوئی کوس بھر۔ سیدھے اُس طرف، وہ!"

"اچھا میں بھی ہوا دھوا آؤں" بڈھے سے یہ کہہ کر میں چلتا بنا۔

میں چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جگدیش نہ تو لارڈ بائرن کی طرح لنگڑا ہے اور نہ ڈان جوان کی طرح حسین۔ پھر بھی یہ کمبخت عورتیں کیوں اس پر اتنی جلدی فدا ہو جاتی ہیں۔ کیا اس دنیا میں ہم ہی جہاں تہاں گاندھی رہ گئے ہیں۔ آخر ہمارے پہلو میں بھی ایک حساس دل ہے۔ سوز، تڑپ، شعریت سب کچھ ہے۔ مگر اس پر بھی سب ہمیں ایک گمن چکر سمجھتے ہیں۔ آخر یہ تفاوت کیوں؟ جگدیش میں ایسے کونسے لعل لگے ہیں۔ موٹی موٹی آنکھوں پر عینک جما کر مرغے کی طرح چھاتی نکال کر چلنے سے کونسے سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ وہ چڑیل اودشا بھی اسی پر مرتی تھی! کمبخت، یونہی سوچتے سوچتے، دل ہی دل میں کڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ یکایک سامنے سے ایک دلکش ہنسی اور پھر ایک بلند قہقہے کی آواز سنائی دی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو سامنے کے ٹیلے پر سے جگدیش اور ذی شی چلے آرہے تھے۔ دونوں نے لمبے سموری فرغل پہن رکھے تھے، دونوں کے سروں پر سموری ٹوپیاں تھیں جن پر ایک طرف کو پیلے پیلے پھولوں کے گچھے بندھے تھے۔ جگدیش کا بلند قہقہہ مجھے بہت ناگوار گزرا۔

"اتنی دیر سوئے رہے؟" جگدیش نے سوال کیا۔ سوال کیا تھا سراسر تضحیک تھی۔

"اتنی جلدی جاگ اُٹھے؟" میں نے جواب دیا۔ جواب کیا تھا۔ سراسر طنز تھی۔

"نہانے چلے ہو؟" جگدیش نے پوچھا۔

"پاؤں کی موچ نکل گئی ہے کیا؟" میں نے جواب دیا۔

ذی شی نے ایک دلکش قہقہہ لگایا، اور اپنا بایاں بازو میرے بازو میں ڈال کر کہنے لگی "آؤ ہم تینوں واپس نندن سر کو چلیں" جب ہم نندن سر کو چلے تو جگدیش اپنی عینک صاف کر رہا تھا اور میں دل میں کہہ رہا تھا کہ اے پُرفن حسینہ تونے اس وقت، تو ہم دونوں کو خوش کر دیا لیکن جلد یا بدیر تجھے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ تو ہم دونوں میں سے کس کو چاہتی ہے۔!

اور جلدی اس امر کا فیصلہ ہو گیا! میں نندن سر پہ نہاتا رہا۔ اور وہ دونوں پھولوں کے تختوں میں نیم پنہاں خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی ہنس پڑتے: پھر کان ہی کان میں ایک دوسرے کو کچھ کہتے، ایک دوسرے کی طرف پھول توڑ توڑ کر پھینکتے۔ جگدیش نے خدا جانے اُسے کیا کہا کہ ذی شی یکایک بھاگ اٹھی جنگل کی مست ہرنی کی طرح، جگدیش اس کے پیچھے اٹھ کر دوڑنے لگا ہاں واقعی پاؤں کی موچ نکل چکی تھی۔ پھولوں کے تختوں میں اس نے کئی چکر کھائے مگر ذی شی کہاں اُس کے قابو میں آتی تھی۔ اور اس کے لانبے لانبے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی پھولوں کے تختوں سے پرے ٹیلوں پر سے چھلانگیں لگاتی ہوئی دور نکل کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔ جگدیش بھی بھاگتا بھاگتا نظروں سے غائب ہو گیا۔ اب میرے سامنے صرف سموری دو ٹوپیاں پڑی تھیں اور پھولوں کے مسلے ہوئے تختے۔ — یخ کی طرح سرد پانی نے جسم اکڑا دیا تھا۔ اور ہونٹ نیلے کر دیئے تھے۔ میں نہا کر بہت دیر تک دھوپ تاپتا رہا۔ آج گرجن دیوتا کی چوٹی پر بادلوں کا نشان بھی نہ تھا۔ میں پہاڑ پر اس سلوٹ کو ڈھونڈنے لگا جس کے اندر خیمہ تھا۔ لیکن وہ سلوٹ یہاں سے نظر نہ آتی تھی۔ جگدیش اور ذی شی کہاں گئے۔ یہ سوچ کر میرا منہ لال ہو گیا۔ اب تو گرجن کو ہی اپنی قیام گاہ بنانا ہوگا آج ریوا کو کہنا ہوگا کہ مزدوروں کو ساتھ لے کر جائے اور خیمہ اور دیگر سامان اٹھوا کر یہاں لے آئے۔ اس برفانی سلوٹ سے یہ تنگ کی بستی زیادہ محفوظ جگہ ہے

اور اُرکل کی طرح ایک اور ویسی ہی برفانی اور طوفانی شام آگئی تو گرجن دیوتا کی بد دعا پوری ہو جائے گی

اب بدن ابھی حرارت سے گرم ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں غنودگی سی آنے لگی تھی۔ دماغ میں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر کپڑے پہنے اور چلنے لگا۔ راستے میں پھر مجھے جگدیش اور ذی شی مل گئے۔ ذی شی کے رخساروں کی لالی بڑھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں نیمی تھیں۔ جگدیش کی چھاتی ضرورت سے زیادہ باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک مسئلے بھری شدہ لفنٹ کی طرح۔ اس بار ذی شی نے چلتے چلتے میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا۔ بیٹا صبر کرو۔ رونے دھونے سے کیا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے کئی چہرے نظر کھا چکے ہو۔

گرجن میں زندگی ایک سپنے کی طرح گذرتی ہے۔ اس سپنے میں سبز ریشمیں گھاس کے بے شمار قطعے ہیں۔ ان قطعوں کے اندر کہیں کہیں تنگ کے درخت ہیں۔ ان تنگ کے درختوں کے نیچے گڈریے اور اُن کے ریوڑ رہتے ہیں۔ دن بھر ریوڑ سبزے کے قطعوں میں گھاس چرتے ہیں۔ کودتے ہیں، ناچتے ہیں، مَیں مَیں، بَا بَا کرتے ہیں، عشق کرتے ہیں۔ کبھی ناکام رہتے ہیں تو ایک دوسرے کو سینگ مار مار کر لہو لہان کر دیتے ہیں۔ گڈریے مینڈھوں کو لڑاتے ہیں۔ شرطیں بدتے ہیں، ہارتے ہیں، جیتتے ہیں۔ الغوزے بجاتے ہیں، نکے کھیلتے ہیں۔ پھر جب شام ہو جاتی ہے اور مغربی افق کی آخری لال دھاری تاریکی میں گم ہونے لگتی ہے تو ریوڑوں کو واپس تنگ کے درختوں تلے لے آتے ہیں۔ الاؤ کے ارد گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے میں دودھ شامل ہوتا ہے اور مکھن۔ اور مکئی کی روٹی کبھی نمک یا گڑ۔ یا نیچے کی بستیوں سے کبھی کبھی پیاز اور سُرخ مرچیں بھی آ جاتی ہیں۔ ورنہ اکثر دہی دودھ اور مکئی کی روٹی۔ دہی اور مکھن۔ پنیر۔ گرجن میں ہر چرواہے اور چرواہی کے جسم سے پنیر کی سوندھی سوندھی بُو آتی ہے۔ جو اکثر شہری طبیعتوں کو بہت بُری معلوم ہوتی ہوگی۔ پسند اپنی اپنی۔ غازہ اور پوڈر۔ اور لپ سٹک کی جگہ چرواہیاں یہی دودھ مکھن استعمال کرتی ہیں۔ تیل کی جگہ بھی مکھن۔ یہاں مٹی کے برتن بہت کم ہوتے ہیں۔ دودھ کھالوں میں دودھ کر رکھا جاتا ہے۔ دودھ دوہتے وقت چرواہیاں شرطیں بدتی ہیں۔ کس کی بکری زیادہ دودھ دیتی ہے؟ کون زیادہ دودھ کی دھاریں اپنے مُنہ میں ڈال سکتی ہے۔ نیم گرم دودھ کی تازہ دھاریں جب پیاسی زبان سے جا لگتی ہیں تو دل کو وہ فرحت نصیب ہوتی ہے کہ چائے اور کوکو سب بھول جاتے ہیں۔ میرے خیال میں زندگی کا بہترین مصرف یہ ہے کہ آدمی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک تنگ کے درخت کے تلے رہے۔ بکریاں چرائے۔ الغوزے بجائے اور تازے دودھ کی دھاروں سے مشام جان کو ہر دم تازہ رکھے۔ دودھ سے مکھن نکالنے کا طریقہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہاں نہ مٹی کی مٹکی ہے نہ بلونا۔ بس ایک کھال میں اس کے نصف حجم کے برابر دودھ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور ایک چرواہی اس کھال کو اچھی طرح سے بند کر کے ایک پھکنے کی طرح گھاس پر لٹا دیتی ہے۔ اور پھر جس طرح آٹا گوندھا جاتا ہے۔ اس طرح کھال کو اپنے ہاتھوں سے بار بار گوندھتی ہے۔ لٹیں بکھری ہوئی ہیں۔ چہرہ لال ہے۔ آنکھوں میں چمک ہے۔ زبان پر ایک پہاڑی گیت ہے اور کھال کو گوندھے جا رہی ہے۔ کوئی ایک آدھ گھنٹے کے بعد کھال کے اندر دودھ اور مکھن الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ دودھ الگ دوسری کھال میں ڈال لیا جاتا ہے اور مکھن مُنہ سے اتار لیا جاتا ہے۔ دودھ خالص بھی ہوتا ہے اور گاڑھا بھی۔ اس دودھ میں پانی کم اور مکھن زیادہ ہوتا ہے اور جب پیو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا شیریں مکھن کا سیال ہے کہ گلے میں اترتا جا رہا ہے۔ اس دودھ کو پی کر نیند بہت آتی ہے۔ ساری زندگی ایک سپنا معلوم ہوتی ہے۔ اور در اصل گرجن ہے بھی ایک سپنا ہی۔ ورنہ ایسے ایسے مقام تو اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو دنیا تلخ حقیقتوں سے بھری جا رہی ہے۔ نقلی دودھ اور نقلی محبت۔ اور نقلی انسانیت۔ اور پھر زندگی کارخانے سے گھر کے گندے صحن میں۔ اور گندے صحن سے کارخانے کے گندے ورکشاپ تک محدود رہتی ہے۔ اس زندگی میں بچے پیدا ہوتے ہی بوڑھوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن گرجن میں ابھی تک ہر بوڑھا اور نوجوان بچپن کی معصومیت کو لئے ہوئے ہے۔ الاؤ کے چٹختے ہوئے کوئلوں کی مدھم روشنی میں چرواہیاں اُون سے کچھ بُن رہی ہیں۔ تکلی گھوم رہی ہے۔ اُن کی باہیں اور چہرے۔ اور آنکھیں ایک خاص ترتیب سے حرکت کرتی ہیں، جیسے یہ مکھن کی پتلیاں ہیں۔ ایک چرواہا کہانی سنا رہا ہے۔ ریمی کی کہانی تم نے سنی ہے ریمی گرجن کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ وہ تنگوں کے سایوں میں پل کر جوان ہوئی۔ اور رنندن سر کی نیلی جھیل کا عکس اس کی دلکش آنکھوں میں چمکتا تھا۔ اس کی جبیں گرجن کی برف کی طرح سپید تھی۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج نے اُس کی گالوں کو چُوم کر انہیں ایک جادوانی چمک عطا کی تھی۔ ایسی لڑکی کسی دیوتا ہی سے بیاہنے کے لائق تھی۔ کسی چرواہے کو اُس سے محبت کرنے کی جرأت نہ ہونی چاہئے تھی۔ گرجن دیوتا کا سایہ اُس پر تھا۔ وہ اکثر دن بھر اکیلی گھومتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بے خوف و خطر گرجن کی سب سے اونچی چوٹی پر چلی جاتی۔ شاید اس نے دیوتا کے درشن کر لئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کو بہت پیاری تھی۔ لیکن افسوس وہ اُسے کسی سے بیاہ نہ سکتے تھے۔ داتو ایک معمولی چرواہا تھا لیکن اُس نے ریمی سے عشق کیا۔ وہ جان بوجھ کر موت کے مُنہ میں جا رہا تھا۔ اُسے کئی بار سمجھ دار بوڑھے چرواہوں نے سمجھایا لیکن وہ نہ مانا۔ گرجن

دیوتانے بھی اُسے کئی بار سمجھایا کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ ایک بار داٹو کو لنگ سر کی گھاٹی میں گرجن دیوتا ملے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اور گھاٹیاں اور چوٹیاں اور میدان ایک روپہلی خاموشی میں کھوئے ہوئے تھے۔ نہ ہوا تھی، نہ نغمہ، نہ بادل اور اس خاموش بےحس و حرکت کائنات میں صرف دو دل دھڑک رہے تھے۔ ریمی اور داٹو۔ داٹو اور ریمی اور داٹو نے جرأت کرکے ریمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ عین اُسی وقت داٹو کو سامنے ایک سپید برف کا گولا ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے گھبرا کر ریمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گولا ہوا میں اڑتا ہوا آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا۔ اور پھر اُس کے سامنے زمین سے آسمان تک برف کی ایک لکیر کھنچ گئی تھی، ریمی کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ سپید۔ اور داٹو اس لکیر کو دیکھ کر کانپنے لگا۔ لیکن وہ ریمی کی محبت سے دستبردار نہ ہوا۔ گرجن دیوتا نے اُسے ایک بار پھر سرزنش کی۔ کہانی سنانے والے چرواہے کو معلوم تھا کہ کس طرح داٹو کو گرجن دیوتا نے رات بھر طوفان میں گھیرے رکھا تھا۔ داٹو کو اُس بھیانک رات میں کبھی کبھی گرجن دیوتا کی خشمگیں آواز سنائی دیتی۔ ریمی کی محبت سے باز آ، ریمی تیری نہیں ہو سکتی۔ کبھی کبھی اُسے بھیڑ بکریوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کبھی کوئی جلتا ہوا الاؤ کسی ٹنگ کے نیچے نظر آ جاتا۔ لیکن یہ سب گرجن دیوتا کے کرشمے تھے، وہ رات بھر طوفان میں گھرا رہا، اور جب دوسرے دن وہ گھر پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ اُس کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے ہمیشہ کے لئے نیلے ہو گئے تھے لیکن پھر بھی وہ اُسی شدت سے ریمی سے محبت کرتا رہا۔

پھر کیا ہوا؟ ایک چرواہے نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

بس گرجن کی کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان میں محبت ہوتی ہے، بچپن کے ہوائی قلعے، معصوم توہمات اور قدرت کے ہیبت ناک مناظر۔ ان کہانیوں میں نہ فن کاری ہوتی ہے نہ عروج، نہ پلاٹ، گڈریے جو جی میں آئے کہتا چلا جا رہا ہے کہانی آپ ہی آپ بنتی چلی جا رہی ہے۔ جیسے ریشم کے کیڑے کے منہ سے ایک خوبصورت کویا تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہانی کہنے والے کی زبان کہتی چلی جا رہی ہے اور کہانی تیار ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کہانی اُس کہنے والے نے بھی پہلے کبھی نہیں سُنی اُسے خود معلوم نہیں پھر کیا ہوا؟ لیکن وہ کہانی کہتا چلا جا رہا ہے۔ اور رات کے سناٹے میں۔ الاؤ کی روشنی میں، اُن بیٹھی ہوئی چرواہوں کے جھرمٹ میں داٹو اور ریمی کے حسین پتلے تخیل کے شبستان میں اُجاگر ہو رہے ہیں۔

لیکن ریوا کو شاعری سے دلچسپی نہیں۔ وہ کہانیاں سننا نہیں چاہتا۔ اُسے اعتراض ہے کہ کیوں ہم نے پہاڑ کی بلندیوں کو چھوڑ کر یہ پستی اختیار کی ہے۔ اُس کی شاہین کی سی نگاہیں شکار کی تلاش میں زیادہ خوشی محسوس کرتی ہیں۔ اُسے یہاں کی مکھن کی ٹکیوں یا الغوزے بجاتے ہوئے گڈریوں۔ یا گرجن دیوتا کی بہیمانہ حرکتوں سے ذرا بھی دلچسپی نہیں، وہ قدرت سے، طوفان سے۔ موت سے ایک بہادر سپاہی کی طرح مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ اُسے معلوم نہیں کہ اوشا کی بے وفائی نے میرے دل میں کیا آگ لگا رکھی ہے اور اب گرجن کی برفانی وادیوں میں ایک نئے الاؤ کے شعلے لپکنے لگے ہیں۔ وہ صرف ایک خوشبو کی تعریف کرنا جانتا ہے جب وہ کبھی ہرنے کو زخمی کرکے فوراً اُس کے نافے پر زور سے ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ نافے کی تھیلی میں سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی ہیں۔ ہرن جانکنی کی حالت میں ہے۔ زندگی نافے میں سے خوشبو کی لپٹیں بن کر نکل رہی ہے۔ ریوا اپنے شکار پر جھکا ہوا ہے۔ نافے کو مضبوطی سے پکڑ کر اور اُسے چاقو سے چیر کر جسم سے الگ کر ڈالتا ہے۔ کہتے ہیں اگر نافہ ہرن کا شکار کرتے ہوئے فوراً ہی اس تھیلی کو نہ پکڑ لیا جائے تو سارا نافہ ہرن کے جسم میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور تھیلی میں ذرا سی بھی خوشبو نہیں رہتی۔ اور نافہ نافہ نہیں رہتا، بلکہ محض چربی کی ایک پوٹ۔ ریوا صرف نافے کی تعریف کر سکتا ہے۔ پنیر کی سوندھی خوشبو سے اُسے گھن آتی ہے۔ ذی شی کے بالوں۔ ذی شی کے کپڑوں اور ذی شی کے جسم میں بھی یہی پنیر کی سوندھی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ جگدیش ایک صاحب ہو کر بھی کیونکر ذی شی سے عشق کر سکتا ہے۔ خود جگدیش کو بھی اس نئے جذبے پر حیرانی سی تھی، اُس نے اکثر۔ بلکہ ہم دونوں نے اکثر پہاڑی عورتوں سے عشق کیا تھا۔ اور یہ عشق ہمیشہ چند روپوں۔ حفاظتی تدبیروں اور دو ایک ریشمی رومالوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ کبھی ہم اسے شعری جذبہ کہتے تھے کبھی وقتی شادی لیکن ہوتا یہی کچھ تھا یعنی ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا۔ لیکن یہ کسی بلاخیز طوفان کی آمد تھی کہ ذی شی کو دیکھتے ہی جگدیش اُس میں ایسا کھو جاتا تھا کہ ذی شی کے سوا اُسے دنیا کی کوئی اور چیز اچھی نہ لگتی تھی یہاں نہ جہیز کا سوال تھا۔ نہ تعلیم کا، نہ آداب کا اور ذی شی ان سب باتوں سے بیگانہ تھی۔ پھر بھی جگدیش اس بے وقوفی پر تلا ہوا تھا۔ وہ ذی شی سے شادی کرنا چاہتا تھا، شادی! سمجھتے ہو دوست؟ جگدیش اُس بے باک پہاڑی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جس نے صوفے کی شکل تک نہ دیکھی تھی، جس کے باپ کے پاس ایک گز زمین بھی نہ تھی جس کی انگلیوں میں ایک چاندی کی انگوٹھی بھی نہ تھی جس کے اطوار وحشی پرندے کی طرح تھے۔ گرجن دیوتا اس سے زیادہ بددعا اور کسی کو نہ دے سکتے تھے لیکن جگدیش بے بس تھا میں اُسے کئی بار سمجھاتا، پاگل ہوئے ہو؟ گرجن کی زندگی خانہ بدوش گڈریوں کی زندگی ہے لیکن انسان ایسی قبائلی زندگی سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہ ٹنگ کے درختوں تلے نہیں رہتا۔ بلکہ شہر بسا کر رہتا ہے۔ وہ صرف مکھن اور پنیر پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کی صدہا لذتیں اُسے میسر ہیں۔ ذی شی پہاڑی لڑکی ہے۔ مہدالوں

میں تمازتِ آفتاب سے فوراً جھلس جائے گی تم خود اس سے نفرت کرنے لگو گے۔ کیا سمجھتے ہو! جس نظام میں تم رہتے ہو۔ اُس میں اس قسم کی عورت ایک دن بھی بمشکل گزارا سکے گی۔ گھُٹ کر مر جائے گی۔ شہری زندگی کا آسمان بہت تنگ ہوتا ہے۔ اور زمین بھی نپی تلی ہوتی ہے۔ وہاں نہ برفانی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ نہ سرسبز مرغزار۔ ذی شی تو ایک عجائب گھر میں رکھے جانے کے لائق ہے نہ کہ تمہاری بیوی ہونے کے لائق۔ اور پھر آج کل شادی میں محبت کو کیا دخل۔ قبائلی زندگی میں محبت ہو سکتی تھی لیکن موجودہ زندگی میں اور اس کے زمینی نظام میں محبت کو کیا دخل۔ اس دنیا میں ایک اونٹ کو سوئی کے ناکے سے گزارا جا سکتا ہے لیکن محبت کے جذبے کو اس دنیا میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جب گرجن سے واپس جاؤ گے۔ اس وقت میری باتوں کی قدر معلوم ہوگی۔ اُس وقت تمہیں ادشا یاد آئے گی۔ ذی شی تو سینما بھی نہیں دیکھ سکتی کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو! جگ ہنسائی ہوگی۔ لوگ کہیں گے۔ جگدیش چڑیا گھر سے ایک جانور پکڑ لایا ہے۔

لیکن جگدیش بے بس تھا شاید عمر میں پہلی بار اُسے کسی سے محبت ہوئی تھی وہ محبت جو چند رد یوں۔ حفاظتی تدبیروں اور ریشمی رومالوں پر مشتمل نہ تھی۔ یہ کسی انوکھی آگ کا شعلہ تھا جو اس کی روح کے ہر کونے میں کوندتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ کسی کے بس کا روگ نہ تھا۔ اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکٹھے رہتے تھے پہلے پہل ذی شی ہم تینوں کے ساتھ شکار کے لئے جاتی تھی۔ اُس نے بندوق چلانا بہت جلد سیکھ لیا تھا۔ اور کچھ دنوں سے تو وہ ایک مشاق شکاری بن گئی تھی۔ جس کی نگاہیں ریوا کی عنابی آنکھوں سے تیزی میں کچھ ہی کم تھیں۔ لیکن اب جگدیش اور ذی شی اکثر اکیلے شکار کو جاتے تھے۔ اور ریوا اور میں اکثر مخالف سمت میں جایا کرتے۔ لیکن کبھی کبھی کسی گھاٹی کی تنگنائے میں ہمارا میل ہو جاتا۔ وہ باہوں میں باہیں ڈالے چلے آ رہے ہوتے۔ اُن کے کاندھوں پر بندوقیں ہوتیں۔ جھولوں میں دن بھر کا شکار، نگاہوں میں ایک دوسرے کے لئے بے اندازہ محبت کبھی کبھی میں انہیں دن ڈھلے کسی گھاٹی کی اونچی چٹان پر کھڑے دیکھ لیتا۔ ان کی پشت میری طرف ہوتی۔ جگدیش کا ہاتھ ذی شی کی کمر میں ہوتا۔ اور ذی شی کا سر جگدیش کے کندھے پر۔ بندوقوں کی سیاہ نالیں۔ درختوں کے تنوں کی طرح نظر آتیں۔ جس سے وہ سہارا لئے کھڑے ہوتے۔ وہ نیچے اُن وادیوں کی طرف تک رہے ہوتے جہاں شام کی دھند پھیلتی جا رہی تھی اور سورج کا پگھلا ہوا سونا دھند کی سفید لہروں پر تیرتا ہوا نظر آتا۔ ساری فضا میں خاموشی ہوتی اور اس رد پہلی خاموشی میں صرف دو دل دھڑک رہے ہوتے۔ میں ان دلوں کا گیت سن سکتا تھا۔ یکایک ریوا بندوق سیدھی کرتا اور "ٹھائیں" کی آواز کے ساتھ ایک ہنسولہ زمین پر آ گرتا۔ جگدیش اور ذی شی چونک جاتے۔ جیسے اُن کے سنہرے سپنے کے تار تھرا اٹھے ہوں۔ بندوق کی گرج گھاٹیوں میں بار بار گونجتی ہوئی پھیلتی جاتی۔ جیسے گرجن دیوتا گرج رہے ہوں۔

جگدیش بے بس تھا۔ لیکن یہ جانتا ضرور تھا کہ یہ محبت میدانوں میں پنپنے کی نہیں وہ اس سندر سپنے کو ابدی بنانا چاہتا تھا لیکن سپنے آخر سپنے ہوتے ہیں، ان کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ ان کی اپنی دنیا ہوتی ہے اور جب یہ ہماری دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح چٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور آواز بھی نہیں آتی۔ کئی لوگ اس دنیا میں سندر سپنوں کو ابدی بنانا چاہتے ہیں۔ سچی محبت، سچی انسانیت سچی اخوت، سچی مساوات ..... پانی کے بلبلے ...... وہ اس دنیا کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ یہ چیزیں اس دنیا کی فضا میں نہیں پھل پھول سکتیں۔ ان کے لئے ایک نئی فضا کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے ہمیں اس ساری دنیا کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا ہوگا۔ اور ایک نئی دنیا آباد کرنا ہوگی جگدیش جانتا تھا کہ یہ کہنا آسان ہے۔ لیکن کرنا بہت مشکل۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جگدیش نے واقعی اپنے سندر سپنے کو ابدی کر لیا۔ مجھے وہ طوفانی رات نہیں بھولتی۔ جب اُسی تنگ کے درخت کے نیچے میں، ریوا اور بوڑھا بونا رات بھر جگدیش اور ذی شی کا انتظار کرتے رہے تھے۔ برفانی ہواؤں کے فراٹوں نے ریوڑ کو اس طرح اکٹھا کر دیا تھا کہ وہ سب غریب جانور ایک دوسرے کی تھوتھنیوں میں منہ چھپائے پڑے تھے اور کراہ رہے تھے۔ تنگ کے باہر طوفان گرج رہا تھا اور بجلی کے پر پیچ حلقے زمین پر آگ کے بگولوں کی طرح چلتے نظر آتے۔ ایک جہنمی منظر تھا۔ جس میں بادل کی گرج۔ ہوا کی وحشیانہ چیخیں اور چوٹیوں پر سے گرتی ہوئی برف کے بھیانک قہقہے سنائی دیتے تھے۔ ریوا نے صبح سویرے ہی آنے والے طوفان کے متعلق ہم سب کو متنبہ کر دیا تھا لیکن جگدیش اور ذی شی نے ہنس کر بات ٹال دی تھی۔ ذی شی تو طوفانوں سے مطلق نہ ڈرتی تھی۔ اور اس کے علاوہ اُس دن وہ کسی ہرنسے کا شکار کرنا چاہتی تھی جو نسے گرجن پہاڑ کی چوٹیوں پر گھوم رہے تھے۔ جگدیش اور ذی شی دونوں رختِ سفر باندھ کر شکار کے لئے صبح ہی اُن خطرناک بلندیوں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ جہاں پہلے اُن کا کیمپ تھا اور میں نے اور ریوا نے انہیں رومال ہلا ہلا کر الوداع کہی تھی۔

یہ آخری الوداع تھی۔ اُس رات گرجن کے خوفناک دیوتا نے اپنے محبوب کو اپنی یخ بستہ چھاتی سے ہمیشہ کے لئے لپٹا لیا اور اپنے رقیب کے سینے میں وہی بجلی گھونپ دی جو رات بھر آگ کے پر پیچ حلقوں میں گردش کرتی رہی تھی

یہ گرجن دیوتا کا انتقام تھا! دوسرے دن جب ہم چند اور گڈریوں کو ساتھ لے کر انہیں ڈھونڈنے کے لئے نکلے تو ہم نے انہیں پہاڑ کی بلندیوں پر ایک سلوٹ کے نیچے مردہ اور یخ بستہ پایا۔ جگدیش کی آنکھیں کھلی تھیں اور ذی شی کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے دیکھتے مر گئے تھے۔

ذی شی برف پر لیٹی ہوئی تھی اور جگدیش اس کا سر اپنے زانو پر رکھے تھا اور سلوٹ کے کناروں سے رات بھر پانی رستا رہا تھا اور اُس نے اُن دونوں کے گرد ایک نیلم کی قبر بنا دی تھی۔ ذی شی کی آنکھیں گہری نیلی تھیں جیسے نندن سر کی جھیل اور جگدیش کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں اُن کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جگدیش کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا آہ ان گہرائیوں کا الم کسی بے کس، زخمی، سسکتے ہوئے آہو کی فریادوں کا آئینہ دار تھا، ہرن جانکنی میں تھا اور زندگی نافے میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی ...... جب سندر سپنے اس دنیا سے ٹکراتے ہیں تو پانی کے بلبلے کی طرح چٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں.....

تنگ کے دائرے سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ الاؤ کے تنگ ہالے میں ریوڑ سویا ہوا نظر آتا تھا۔ چرواہیاں تکلی پھراتی ہوئی اُون سے کچھ بن رہی تھیں چرواہے محویت کے عالم میں ہاتھوں میں ٹھوڑیاں لئے ایک کہانی سُن رہے تھے کہانی سنانے والا چرواہا کہہ رہا تھا۔ بہت دن گزرے اس تنگ کے درخت کے نیچے ایک پہاڑی بونار رہتا تھا۔ اُس کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اُس کا نام تھا۔ ذی شی۔ ذی شی گرجن دیوتا کی منظورِ نظر تھی۔ ایک دن کیا ہوا کہ اسی تنگ کے درخت کے سائے میں تین شکاری آکر بیٹھے.....

ایک چرواہی نے سانس روک کر پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

کرشن چندر

شعر

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا شرماتا جا

حفیظ جالندھری

گیت

پاؤں میں پڑے ہوں چھالے
کانٹوں سے چھلے ہوں تلوے
ہم پریم پنتھ کے راہی، ہنس ہنس کر کشٹ سہیں گے
ہم تم ایک ساتھ رہیں گے

چھایا ہو گھور اندھیرا
ڈوبی جاتی ہو نیّا
ہم متوالی لہروں پر، ساجن اک ساتھ بہیں گے
ہم تم اک ساتھ رہیں گے

بھونچال سے دھرتی کانپے
جگ پڑا رہے کھ ڈھانپے
ہم پریم مندر کے باسی، گائیں گے اور کہیں گے
ہم تم اک ساتھ رہیں گے

سپنے میں آیا کرنا!
یہ گیت سنایا کرنا
ہم تم اک ساتھ رہیں گے۔ ہم تم اک ساتھ رہیں گے
ہم تم ایک ساتھ رہیں گے

صابر ٹوہانوی

غزل

غلط کہ شوق ترا محرمِ نیاز نہیں
مگر یہ کیا کہ غمِ دو جہاں گداز نہیں

ہے تنگ ہمتِ رہرو کو عرصۂ منزل
میں کیا چلوں کہ رہِ زندگی دراز نہیں

بلا کی بزم ہے یارب ترا جہاں جس میں
کوئی نظر سے مجھے سامانِ احتراز نہیں

مِلا بھی اور نہ ملا مجھ کو کچھ پتہ اپنا
یہ ایک راز ہے لیکن یہ کوئی راز نہیں

فریبِ عقل میں آتا نہیں جنوں میرا
فریب ہے مگر ایسا زمانہ ساز نہیں

نہ جا خدا کے لئے دشتِ جستجو میں نہ جا
سوادِ غزنیِ اُمید میں ایاز نہیں

شکستِ حُسن کی روداد بھی تو ہے اس میں
تُو گر سُنے تو فسانہ مرا دراز نہیں

عبث ہے وحشتِ انساں کمالِ فطرت سے
کہ اس کی صنعتِ نازک حریفِ راز نہیں

کہاں ہے شیخ! یہ اصل و مجاز کیا شے ہے؟
حقیقتِ ازلی میں کوئی مجاز نہیں۔

ہے پاسِ وضعِ وفا کس کو اس زمانے میں
میں رہنِ شوق نہیں تُو اسیرِ ناز نہیں

مرے سخن کو ترازوئے نغمہ سے مت تول
سرودِ عشق بقدرِ نوائے ساز نہیں

گدائے میکدہ ہے اب بھی تائب اے ساقی!
تری نگاہ مگر میکدہ نواز نہیں

مراتب علی تائب


پیلس تھیٹر میں عنقریب آنے والا ہے
یملاجٹ کے خالق پنچولی آرٹ پکچرز کا پہلا آل انڈیا ہندی شاہکار
خزانچی
KHAZANCHI
حسین انسانی زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے
فلم پر افسانے سے زیادہ حقیقت کا رنگ غالب ہے
آپ دیکھیں گے تو محسوس کریں گے کہ آپ ہی کی زندگی کا نقشہ پردہ سیمیں پر لا دیا گیا ہے
کہانی اس کی روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے
اداکاران خصوصی
ایم اسمعیل
غلام حیدر
اجمل
درگا موٹا


ذہانت اور تجربے کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمۂ بجلی نے بھی سند عطا کی ہے کہ اس بیٹری پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ بیٹری کے ساتھ لکھی ہوئی گارنٹی دی جاتی ہے۔ مضبوط دو پلیٹیں اور ہلکی اندرونی رکھ ایکو بیٹری کی نمایاں خوبیاں ہیں۔
ایکو بیٹری
تقسیم کنندگان
سرن موٹرز دی مال لاہور


ڈونگرے کا بال امرت
دینا چاہیے
کیونکہ اس میں قیمتی اور ضروری دوائیں پڑی ہیں۔ اس کے استعمال سے بچوں کی کھانسی بخار رفع ہوتے رہیں

اُردو کی شاہی سرپرستی

عرصہ ہوا۔ ادبی دنیا میں اسی عنوان کے تحت ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں دکھایا گیا تھا کہ شاہان سلف نے اردو کی کیسی قدردانی کی لیکن تعجب ہے کہ اس میں اس سرپرستی کا قطعی ذکر نہیں تھا جو انگلستان کے شاہی خاندان نے کی۔

ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے جیسی محبت تھی اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہے اور ہندوستانی امور کے متعلق حکم احکام جاری کرنے اور اسی سے متعلق دیگر ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے حکم دیا کہ ایک سکرٹری ہندوستانی ہونا چاہئے چنانچہ حافظ منشی عبدالکریم صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔

حافظ صاحب آگرہ کے رہنے والے ایک معمولی گھرانے کے فرد تھے۔ فارسی۔ عربی۔ خوب جانتے تھے مگر انگریزی مطلق نہیں جانتے تھے۔ بلند قامت اور انتہا سے زیادہ شاندار اور وجیہہ آدمی تھے۔ ایک انگریز کے ساتھ بہت قلیل تنخواہ پر ولایت گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کو اس ملازمت کا موقع مل گیا۔

ملکہ معظمہ نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے ہندوستان کی زبان سیکھیں۔ اور منشی صاحب سے اُردو پڑھنا شروع کر دی۔ مجھے ٹھیک تاریخ یاد نہیں لیکن ۱۸۹۰ء سے قبل حافظ صاحب اس عہدے پر مامور ہو چکے تھے۔

بہت تھوڑے عرصے میں حافظ صاحب کا اس قدر رسوخ بڑھ گیا کہ علاوہ تنخواہ میں اضافہ ہونے کے ان کو شاہی محل میں رہنے کو جگہ ملی۔ اور بہت جلد انھوں نے ہر مجسٹی کے اشارے ہی سے اپنی بیوی اور بھتیجے عبدالرشید صاحب کو بھی بلا لیا۔ ملکہ معظمہ نے سلوک اور مہربانی میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ خود اُن کے گھر آتیں۔ اور مہربانی دن بدن اس درجے بڑھتی گئی کہ روز کا ان کا معمول ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز برابر حافظ صاحب[1] کے یہاں بھجواتیں۔ روزانہ بعد ناشتہ معمول کر لیا کہ حافظ صاحب کی بیوی سے ملنے آتیں اور دیر تک بیٹھی رہتیں۔ اس اعزاز کے ساتھ حافظ صاحب کا اعزاز بھی بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر موقع پر ان کو ساتھ رکھتیں۔ جہاں سوائے شاہی خاندان کے لوگوں کے کوئی نہ ہو وہاں حافظ صاحب کو دیکھ لیجئے۔ برابری کا سلوک کرنے لگیں اور حد یہ پہنچی کہ یورپ کے بادشاہوں میں سے کوئی آتا تو اس کے ساتھ تمام پروگرام میں برابر کے شریک رہتے۔ ملکہ معظمہ نے ان کو ایک معزز دوست کی طرح رکھا۔ اور اس کی تصدیق ملکہ معظمہ کی خود تحریر کرتی ہے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً حافظ صاحب کو کتابیں بھی بطور تحفہ دی ہیں۔ اور ان کتابوں میں خود اپنے قلم سے لکھتی ہیں

PRESENTEDTO HERMOST LOYAL & SINCERE

FRIEND HAFIZ MUNSHI ABDULKARIM

دوسری کتاب میں بجائے SINCERE کے

AFFECTIONATE‘INTIMATE لکھتی ہیں۔

کسی میں کچھ اور کسی میں کچھ اور انتہا یہ ہوتی ہے کہ ایک کتاب میں آپ کو LOVING FRIEND کا لقب عطا ہوتا ہے لیکن لفظ LOYAL سب میں ہے

کئی کتابوں میں اردو میں لکھا ہے :-

بخدمت حافظ منشی عبدالکریم ۔

اور نیچے دستخط فرماتی ہیں : وکٹوریہ قیصرۂ ہند۔ ہاتھ میں رعشہ تھا۔ لہذا قلم روک کر لکھتی تھیں سطر قدرے ٹیڑھی ہو جاتی تھی۔ وکٹوریہ کے "و" کو خوب گھماتی تھیں اور بہت کچھ تحریر اس طرح ہے۔

وکٹوریہ

اعزاز کا اندازہ چند واقعات سے کیجئے :-

زار روس آئے تو اُن کو بھی حافظ صاحب کے گھر آنا پڑا۔ زارینہ اُن کی

---

[1] جن برتنوں میں یہ تحفہ آتا وہ بھی تحفے کے ساتھ ہی رہ جاتے اور اب تک کریم لاج میں رکھے ہوئے ہیں۔ یہ برتن مختلف کھانوں کے ہیں جن پر وکٹوریہ کا شاہی کورٹ آف آرم بنا ہوا ہے۔ ان برتنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے کی ہر قسم کی چیزیں بھیجی تھیں۔ دراصل ان کی میز پر جو بھی پسندیدہ کھانا آتا۔ اس کا ایک حصہ اسی وقت انتہائی بے تکلفی کے ساتھ بھیج دیتی تھیں۔

بیوی سے ملیں اور تبادلہ تحائف ہوا۔ زار روس نے جو چائے کا مرصع سٹ دیا وہ اب بھی موجود ہے۔ حافظ صاحب کی بیوی نے زردوزی کے کپڑے وغیرہ زارینہ کو دیے۔ جن کی تصویریں موجود ہیں۔

شاہان یورپ کی دستی تصاویر موجود ہیں۔ جو انھوں نے بطور اظہار دوستی حافظ صاحب کو دیں اپنے زمانے کے ہر بادشاہ سے برابر ملے جیسا کہ تمام تصویروں اور اخبارات کے کٹنگ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔

ایک تصویر دیکھیے۔ حافظ صاحب ہندوستان جانے کے لیے چوکڑی پر سوار ہیں۔ ملکہ معظمہ نیچے کھڑی ان کو رخصت کر رہی ہیں اور مصافحہ کر رہی ہیں۔ امپیریل گارڈ سلامی دے رہا ہے۔

ایک اور شاہی خاندان کے ممبروں کی تصویر میں ملکہ معظمہ درجنوں لڑکوں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ بیچوں بیچ میں حافظ صاحب بیٹھے ہیں۔ داہنے ہاتھ پر ملکہ معظمہ ہیں شہنشاہ جارج پنجم پیچھے کھڑے ہیں۔ اس وقت یہ ولی عہد کیا بلکہ ولی عہد کے ولی عہد بھی نہ تھے یعنی شہزادہ وکٹر زندہ تھے۔

ایک اور تصویر دیکھیے کہ ملکہ معظمہ بیٹھی اردو پڑھ رہی ہیں اور حافظ صاحب انگلی سے کتاب پر کچھ بتا رہے ہیں۔ یہ تصویر چھپنا تھی کہ لندن میں برہمی پھیل گئی کہ ملکہ معظمہ نے PRIVATE CAPACITY میں حافظ صاحب کے ساتھ بیٹھ کر تصویر کیوں کھنچوائی۔ سارا لندن کو ٹیلوں پر لڑ گیا۔ اخباروں کے کٹنگ دیکھنے کے لائق ہیں

آپ ہندوستان تشریف لائے تو والدہ معظمہ کی بیماری کے سبب آئے تھے۔ برطانوی بیڑے کے جنگی جہاز پر تشریف لائے جو انتہائی تیز چلتا تھا۔ اور گھر پر جو پہنچے ہیں تو ملکہ معظمہ کے دو دو تین تار آتے تھے۔ جن میں بیمار پرسی اور خیر و عافیت طلبی ہوتی تھی۔

کمشنر صاحب آگرہ کے بارے میں ایک سخری طبیعت رکھنے والے صاحب کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور حافظ صاحب کے گھر کی دوڑ دھوپ سے جوتے ٹوٹ گئے تھے۔

آپ کو آگرہ ہی میں موضع "نینانا جاٹ" بطور جاگیر صرف خاص سے دیا جواب بھی ہے۔ آپ کے والد صاحب کو خان بہادری کا خطاب ملا۔ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم جب ہندوستان بحیثیت ولی عہد آئے تو حافظ صاحب کے والد گھر پر تھے۔ ان سے ملنے گھر پر گئے اور دعوت چائے قبول فرمائی۔

حافظ صاحب کو ہندوستانی خطاب کچھ نہ ملا لیکن وکٹورین آرڈر کا سب سے بڑا خطاب جو خود ملکہ کے ہاتھ میں تھا وہ انھوں نے عطا فرمایا یعنی "جی سی وی۔ او"

ملکہ معظمہ سیر و تفریح اور کسی کام کے لیے کسی جگہ بھی جاتیں اسپیشل ٹرین میں ملکہ کے ڈبے سے ملا ڈبہ ان کا ہوتا۔ ایسا ہی فرانس میں ہوا۔ بڑے بڑے عمائد کا ڈبہ علیحدہ اور حافظ صاحب کا ڈبہ ملا ہوا جس میں سے آنے جانے کا راستہ تھا۔ یہاں ملکہ معظمہ کبوتروں کے شکار کو گئیں۔ اور سب سے زیادہ حافظ صاحب نے شکار کیے۔

محل میں ڈرامے بہت ہوتے اور ہمارے حافظ صاحب بھی ڈرامے میں حصہ لیتے۔ باوجود ملکہ کے ساتھ دن رات رہنے کے آپ کا لباس ہمیشہ ہندوستانی رہا یعنی شیروانی اور صافہ۔ اور اسی دھج سے آپ ڈرامے میں بھی شریک ہوتے۔ غالبًا کوئی باوقار پارٹ ادا کرتے ہوں گے۔

ملکہ معظمہ کے اردلی جتنے تھے۔ سب کے سب ہندوستانی تھے۔ ان لوگوں کو حافظ صاحب آگرہ سے لے گئے۔ محل کا تمام انتظام و انصرام اور ملکہ کی ذات خاص کے متعلق جتنے اہم اور ضروری کام تھے۔ ان سب پر ہندوستانی قابض ہو گئے۔ محل میں نہ صرف اردو سمجھی اور بولی جانے لگی۔ بلکہ بغیر اس کے کام چلنا ناممکن ہو گیا۔ تمام شہزادے شہزادیاں جو اپنی دادی کے اردگرد دن بھر کھیلتے۔ سب اردو سیکھ گئے۔ شہزادی بیٹرس۔ ملکہ سویڈن جو ملکہ کی صاحبزادی تھیں۔ اور ان کی لڑکیاں تک اردو سیکھ گئیں۔ شہنشاہ ایڈورڈ۔ اور جارج پنجم اور ملکہ میری وغیرہ اور دن رات کے ساتھ رہنے والے عزیز۔ رشتہ دار اور ملازم اردو بولنا سیکھ گئے ان اردلیوں نے وہ زور باندھا کہ جی چاہتا تو ایک دفعہ وزیر اعظم کو بھی کہہ دیتے کہ "انتظار کیجیے"۔

اور آخری وقت میں ان اردلیوں کی دن رات کی خدمت کی حد اس درجے پہنچی کہ ملکہ معذور ہو چکی تھیں۔ ان کو اٹھاتے بٹھاتے یہی تھے طبیعت ناساز ہو تو نرس کو ملکہ نکال دیتیں۔ اردلی خدمت کرتا۔ اور میں اس اردلی سے ملا ہوں جس کا کہنا ہے کہ "ملکہ معظمہ نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑا"۔ جس وقت اس نے یہ بیان کیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

بالمورل کاسل (BALMORAL CASLE) میں ملکہ زیادہ رہتی تھیں۔ حافظ صاحب کے رہنے کے لئے کوارٹرز فاصلے پر تھے۔ لہٰذا خاص اپنے کمرے کے سامنے چھوٹا سا مکان بالمورل کاسل کے اندر بنوا دیا جس کا نام "کریم لاج" ہے۔ اور جو آج تک مع سامان اسی طرح موجود ہے۔ اس کی خبر اخباروں میں چھپی جس کے میں نے کٹنگ دیکھے ہیں۔ لوگوں کو سخت کوفت ہوئی۔

حافظ صاحب نے ملکہ معظمہ کو نہ صرف اردو پڑھائی بلکہ قرآن پاک بھی پڑھایا۔ جسے وہ احترام اور شوق سے پڑھتی تھیں۔ اس کو الہامی کتاب مانتی تھیں

لارڈ کرزن جیسے مغرور وائسرائے سے حافظ صاحب کی زبردست ٹکر ہوئی۔ وہ ہندوستان میں تھے۔ جب لارڈ کرزن نے دہلی کا مشہور دربار منعقد کیا۔ حافظ صاحب کی جگہ داہنی صف میں والیانِ ملک کا رتبہ رکھنے والوں کے بعد یا ان کے ساتھ رکھی گئی۔ حافظ صاحب جو دن رات شاہانِ وقت سے برابری سے ملتے تھے۔ کب گوارا کر سکتے تھے۔ آپ نے شرکت سے انکار کر دیا۔ دراصل آپ کو دربار میں خود بطور ملکہ معظمہ کے نمایندے کی حیثیت سے شریک ہونا تھا۔ لہذا آپ نے فرمایا کہ میں کرزن کے برابر بیٹھوں گا۔ وہ اگر شاہِ وقت کے سرکاری نمایندے کی حیثیت رکھتے ہیں تو میں ذاتی نمایندہ ہوں۔ بڑی کشمکش ہوئی۔ کرزن ہارے اور ان کو ڈائس پر جگہ دینی پڑی برابر نہیں تو اپنے بعد۔

مگر عبرت کا مقام ہے کہ وکٹوریہ کے مرنے کے بعد متعصب انگریزوں نے بدلا لیا۔ اور وہ عبرت ناک سین بھی لوگوں نے دیکھا کہ حافظ صاحب کمشنر کے بنگلے پر اس کے منتظر ہیں کہ کمشنر صاحب غسل کر کے نکلیں۔

شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم تخت پر بیٹھے تو اس تکلیف کو محسوس کر کے حافظ صاحب نے ایک خط شاہ موصوف کو لکھا کہ آپ یو۔پی کے گورنر کو ایک نجی خط لکھ دیں۔

شاہ موصوف نے خط کا جو جواب دیا۔ وہ میں نے دیکھا ہے۔ اس میں شاہ موصوف نے لکھا کہ "سلطنت اتنی بڑی ہے کہ میں ہر گورنر کو ذاتی طور پر نہیں جانتا لیکن آپ اس خط کو لے جا کر جو صاحب بھی گورنر ہوں ان کو دکھائیں۔ وہ صاحب خود جان لیں گے کہ خط کا لکھنے والا کون ہے (یعنی بادشاہ خود) امید ہے کہ وہ آپ کا خیال کریں گے۔ حافظ صاحب نے ایسا ہی کیا۔ نتیجہ الٹا نکلا

حافظ صاحب کی یہاں تو کوئی سنتا نہ تھا۔ اور وہ ذرا ذرا سی بات کیلئے شاہِ وقت کو نجی خط لکھتے تھے۔ ان کی زندگی میں تو کسی کی نہ چلی لیکن ان کے مرنے کے بعد ہی ان کے خاندان والوں کو حکم ہو گیا کہ کوئی نجی خط مت لکھو بلکہ جو خط بھی لکھو کلکٹر ضلع کے ذریعے سے لکھو۔ کوئی تحفہ بھیجو تب بھی ایسا ہی کرو۔ حافظ صاحب

لہ حافظ صاحب کے چھوٹے بھائی آگرہ کی تحصیل باہ میں تحصیلدار تھے اور وہاں سے کسی نوع تبادلہ نہیں چاہتے تھے۔ جب کبھی تبادلہ کا سوال اٹھتا سٹوری لندن کے شاہی محل سے کھنچتی اور تبادلہ رک جاتا۔ یہ بات یہاں والوں کو سخت ناگوار گزرتی۔ تحصیل باہ میں اب بھی ریل نہیں ہے۔ واللہ اعلم کہاں تک صحیح ہے کہ حافظ صاحب نے وہاں ریل نہ نکلنے دی۔ اس لئے کہ بھائی نہیں چاہتے تھے۔

دراصل لندن میں حافظ صاحب ایسی پوزیشن میں تھے کہ انڈیا آفس میں کسی سے بھی کچھ کہہ دیں تو ہو جاوے۔ یا کسی سے کہہ دیں تو ہو جاوے۔

کے بھتیجے عبدالرشید صاحب ولایت میں ساتھ ہی رہتے تھے۔ اور تمام شاہی خاندان کے لڑکوں کے ساتھ دن رات رہنا ہوتا تھا جن میں شہنشاہ جارج آنجہانی بھی تھے۔ ستم دیکھئے کہ ان کو بھی منع ہو گیا کہ نجی خط نہ لکھو۔

یہ بھی قانون بن گیا کہ شاہِ وقت کے ہندوستانی اردلی خود یہاں سے تین سال کے لئے بھیجے جائیں۔ چنانچہ اب فوجی آدمی جاتے ہیں۔ اور شاہِ وقت سے بہت دور رکھے جاتے ہیں۔

ملکہ معظمہ اردو کتابیں پڑھ لیتی تھیں۔ رعشہ کے سبب لکھتی کم تھیں۔ اور اردو بولتی تو خوب تھیں بلکہ میری بھی خوب اچھی طرح اردو بولتی تھیں۔ اور شاہ جارج آنجہانی بھی خوب اردو بولتے تھے اور سمجھتے تھے۔ ان کے بیٹے موجودہ ڈیوک آف ونڈسر ایک حرف اردو نہیں سمجھتے تھے یہی حال موجودہ شاہ کا ہو گا۔

ملکہ معظمہ نے جو تحائف حافظ صاحب کو دیئے۔ وہ تمام مع ان تمام چیزوں کے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ آگرے میں حافظ صاحب کی کوٹھی کریم لاج واقع DRUMMOND ROAD پر موجود ہیں۔ حافظ صاحب کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بڑے بھتیجے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اور اب شاید پنشن لے لی ہے۔

ان کے چھوٹے بھتیجے میرے ہم عمر اور دوست تھے۔ اور روزانہ کریم لاج میں ہم لوگ آتے جاتے تھے۔ اور یہ سب چیزیں دن رات دیکھتے تھے۔ ہزاروں تصویریں ہیں حافظ صاحب کی ڈائری بھی ہے۔ جو انگریزی ٹائپ کی ہوئی مصور ہے۔ دیکھنے کی چیز ہے۔ ملکہ معظمہ کے نجی خطوط بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو نے شاہی محل میں کیسی حکومت کی ہے محض اردو سیکھنے کے سبب ملکہ معظمہ سے حافظ صاحب کا رسوخ بڑھا۔ ورنہ بحیثیت انڈین سکرٹری صرف بوقت ضرورت کاغذات پیش کرنے سے زائد کچھ خدمت نہ تھی۔ اور آپ نے جو بھی عروج حاصل کیا وہ بحیثیت ملکہ کے URDU TEACHER کے کیا۔

حافظ صاحب کی بیگم صاحبہ کو شاہِ وقت کی جیب خاص سے اب بھی چار سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی ہے۔ یہ علاوہ جاگیر ہے۔

محض تحفہ تحائف ہی اتنی قیمت کے ہیں کہ حافظ صاحب مالامال ہو گئے۔ معمولی چیز سے لے کر اعلے سے اعلے چیز موجود ہے۔ اور حافظ صاحب ہر قسم کی چیزیں اپنے ساتھ لے آئے۔ جو اب یادگار کے طور پر بے حد دلچسپ ہیں۔ اردو کے رسوخ اور اردو کی ہر دلعزیزی پر ان سب چیزوں کے دیکھنے ہی سے روشنی پڑتی ہے۔ اور اردو کے محقق کے لئے وہاں ضرورت سے زیادہ مواد مل سکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ جس وقت یہ تمام چیزیں دیکھیں یہ امر پیش نظر نہ تھا کہ اس قسم کا مضمون لکھنے بیٹھوں گا۔

میری دانست میں یہ مضمون بغیر ایک لطیفے کے تذکرے کے نامکمل ہی رہ جائیگا

۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ میں آگرہ ہی میں تھا۔ اس وقت ملکہ معظمہ کے دو اردلی زندہ تھے۔ ایک دکان پر چپراسی کرتے تھے۔ دوسرے صرف اپنی چودہ روپے کی پنشن میں گزر کرتے تھے۔ ان سے میں ملا تھا بلکہ اکثر ملتا تھا۔ اور یہ قصر شاہی میں دس گیارہ برس رہے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کے خاص خادم تھے۔ اور آخری وقت کی خدمت بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ ان کے پاس ملکہ وکٹوریہ کے لاتعداد تحفے تھے۔ ڈراموں میں خوب شرکت کرتے تھے۔ ان ہی حضرت کا لطیفہ ہے۔ انھوں نے کوشش کی کہ لڑکا تحصیل میں چپراسی ہو جائے۔ اور ملکہ معظمہ کے خدمت گار کی حیثیت سے بہت کچھ حقوق جتائے مگر دال نہ گلی۔ یہ حیران ہی تھے کہ یہ معلوم ہوا کہ جارج پنجم دربار کرنے خود ہندوستان آئیں گے۔ اور آگرہ بھی آئیں گے۔ چنانچہ اب انھوں نے لڑکے کی ملازمت کا معاملہ التوا میں ڈالا جب بادشاہ کی آمد کی خبر آگرہ میں آئی تو انھوں نے قرض ادھار کرکے عمدہ اچکن بنوائی اور صافہ بنوایا۔ مگر ان کو ایک خیال اور بھی دامن گیر تھا۔ شاہی محل پر جارج پنجم کی بحیثیت شہزادے کے یہ شاید کچھ خدمت نہ کرتے تھے۔ دن رات کا رہنا ٹھہرا۔ اور جب وہ اپنی دادی سے ملنے آتے تو بھی کچھ توجہ نہ دیتے۔ اس وقت شہزادہ جارج دلی عہد کے دوسرے بیٹے تھے اور زیادہ نوٹس میں آنے والی شے نہ تھے۔ شاہ موصوف ڈاڑھی نئی عمر ہی سے رکھتے تھے۔

جب جارج پنجم آگرہ میں آئے تو یہ پہنچے۔ دور دور تک گوروں کا پہرہ تھا۔ بمشکل کیمپ سکرٹری تک رسائی ہوئی جس نے ان کو دھتکار کر نکال دیا۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو سنا کہ بادشاہ تاج محل دیکھنے جائیں گے۔ یہ رات گئے تاج محل کے دروازے پر پہنچے اور ایسے موقع پر پہنچے کہ بادشاہ گزریں تو سڑک کے کنارے سے سلام ہو جائے۔ ایسا بھی ہو گیا مگر بادشاہ کو پتہ نہ چلا۔ پھر یہ حضرت آگے بڑھ کر موقع پر پہنچے۔ جوں ہی بادشاہ گاڑی سے اترے اور وائسرائے اور گورنر وغیرہ استقبال کو بڑھے اور یہ جھٹ سے لپک کر باوجود گوروں کے روکنے کے بڑھ گئے۔ گوروں نے بڑھ کر پکڑا ہے کہ بادشاہ نے دیکھ لیا اور انھوں نے سلام کیا۔ بادشاہ نے پہچان لیا اور اشارہ کیا۔ سیدھے قدموں میں جا گرے اور کھڑے جو ہوئے تو بادشاہ بڑی محبت سے پیش آئے۔ بار بار خیریت پوچھتے کہ تم اچھی طرح ہو۔ ملکہ معظمہ بھی آ گئیں اور وائسرائے وغیرہ کو چھوڑ کر بادشاہ ان کے ساتھ چلے لیکن جلد ہی ملکہ معظمہ کے یہ ساتھ ہو گئے۔ ملکہ معظمہ نے سب حال پوچھا۔ ایک ایک اردلی کو پوچھا۔ وقت کم تھا۔ ہدایت کی کہ رات کو مع بچوں کے ہم سے ملو۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضور آپ کے نوکر گھسنے نہ دیں گے۔ چنانچہ اسی وقت کسی کو بلا کر ان کا سامنا کرا دیا۔ یہ رات کو مع دوسرے اردلی کے اور اپنے بچوں کے پہنچے۔ ملکہ معظمہ اور بادشاہ نے بڑی شاہانہ التفات کی۔ ہر اردلی کو پوچھا معلوم ہوا دوسرے سب مر گئے۔ تنگ دستی کی معروض پر تنخواہ کا اضافہ ہوا۔ انعام و اکرام دیا۔ تحفے تحائف دیئے۔ اور ہر طرح مہربانی کی۔

اب یہ سوچے کہ لڑکے کی ملازمت کا بھی طے ہو جائے۔ نہ ڈپٹی کلکٹری نہ تحصیل داری بلکہ صرف چپراسی۔ شاید بادشاہ کی سمجھ میں بھی نہ آیا ہو کہ تحصیل دار یا تحصیل کیا بلا ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ بس آپ تحصیل دار کو ایک خط لکھ دیں۔

بادشاہ سلامت نے یہ معروض قبول نہیں کی۔ مگر ان کو اطمینان دلایا اور کئی افسروں کو بلا کر ان کو سمجھایا۔ اب میں نہیں بتا سکتا کہ معاملہ کیا ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ سب افسروں نے لاپروائی کی۔ قصہ مختصر یہ کہ باوجود بادشاہ تک پہنچ کے ان کا لڑکا چپراسی نہ ہو سکا اور یہ بھی صبر کرکے بیٹھ رہے کہ بس اب کوشش کی حد ہو گئی۔ کہنے لگے کہ صاحب اب تو خدا رہ گیا ورنہ جہاں تک سفارش ہو سکتی تھی کرالی۔ ممکن ہے کسی افسر نے یہ بات تحریر میں لانا پسند نہ کی ہو کہ بادشاہ سلامت کی خواہش ہے کہ اس کا لڑکا جو ملازمت چاہتا ہے وہ مل جائے۔ معاملہ زبانی ہی زبانی رہا ہوگا۔ اور پھر انھوں نے خط کے ذریعے جو بادشاہ کو لکھنا چاہا تو وہ خط بھیجنے نہ دیا گیا۔ مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ خدا کرے یہ اب بھی زندہ ہوں یہ واقعات خود میں نے ان کی زبانی سنے ہیں۔

حافظ صاحب کے بڑے بھتیجے عبدالرشید صاحب سے کوئی ملے تو شاید اردو کی شاہی سرپرستی کے متعلق دلچسپ معلومات بہم پہنچیں۔ آپ کا اب بھی شاہی خاندان کے افراد سے تعلق ہے۔ شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تاج پوشی کے دربار میں آپ شاہی HOUSE HOLD کی طرف سے مدعو تھے۔ مگر اب فرق ہے پہلے محل میں رہتے اور ٹھہرتے تھے۔ اب ہوٹل میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔

ڈیوک آف کناٹ کا اسپیشل جاتا تھا۔ اور راہ میں کسی سے ملنے کا حکم نہ تھا۔ یہ شاید متھرا میں تھے۔ ان کو پتہ چلا تو انھوں نے اسپیشل روک لیا۔ حالانکہ رات کا وقت بے وقت تھا۔ مگر ڈیوک موصوف بہت اخلاق سے ملے۔

اب شاہی خاندان سے اور حافظ صاحب کے خاندان سے صرف یہ تعلق رہ گیا ہے کہ تحفے تحائف بڑے دن پر اور دوسرے موقعوں پر اب بھی جاتے ہیں اور خطوط بھی جا سکتے ہیں لیکن ان کا نجی اور ذاتی رنگ غائب۔

دراصل سول سروس کے انگریزوں کو منظور ہی نہیں کہ ہندوستانیوں کا رسوخ بڑھے اور غالباً موجودہ سیاسی فضا کی رفتار کی ذمہ داری بھی اسی ذہنیت کے سر قرار دی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر مجھے ایک اور واقعہ یاد آیا۔

ملکہ معظمہ نے عبدالرشید صاحب کو ایک رائفل اور ایک مچھلی پکڑنے کی بنسی بطور تحفہ دی۔ یہ اسے لے کر ہندوستان آئے تو سوال رائفل کے لائسنس کا اٹھایا گیا

انھوں نے کہا کہ یہ ملکہ کا تحفہ ہے۔ میں تو ہرگز لائسنس نہ لوں گا خواہ ضبط ہو معلوم نہیں کیا ہوا۔ بندوق ضبط تو کیا ہوتی۔ مگر انھوں نے لائسنس بھی نہیں لیا۔

افسوس ہے کہ اردو کی شاہی قدردانی قصۂ ماضی ہی ہو گئی میرا خیال ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آج سیاسیات پر بھی اردو کی سرپرستی اور قدردانی کے سبب کافی اثر پڑتا اور شاہ اور رعیت کے درمیان وسیع خلیج حائل نہ ہوتی اور آج برطانیہ کا ہندوستان میں اقتدار اور وقار ہی دوسرا ہوتا۔

حافظ صاحب کی روش وہی مولویانہ رہی۔ نہایت باوضع شرعی ڈاڑھی اور کوٹ اگر پہنا تو بند کالر کا۔ ایک تصویر میں یاد پڑتا ہے کھلے گلے کا کوٹ مع ٹائی ہے مگر صافہ ہمیشہ وہی اور نہایت ہی شاندار صافہ باندھتے تھے۔

آخر عمر حافظ صاحب کی اچھی طرح نہیں گزری۔ ہر قدم پر سول سروس کے افسر جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے تھے۔ ان کی پوزیشن بھی نازک تھی چھوٹے بھائی تحصیل دار تھے۔ بھتیجے تحصیل دار تھے۔ بھلا لارڈ اور وائسرائے بھی ان کے آگے کوئی چیز تھے محلہ پڑوس کے لوگ اور دوست احباب سے جب ملتے تو شکار کا ذکر ہو سفر کا ذکر ہو۔ کوئی ذکر بھی ہو۔ اگر کوئی تذکرہ چلے تو یہ بیچارے سوائے اس کے اور کیا کہیں کہ بھئی ایک دفعہ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ فلاں ڈیوک اور فلاں لارڈ ساتھ تھے اور فلاں بادشاہ ساتھ تھے وغیرہ وغیرہ

اس قسم کی باتیں سن کر دوست احباب خواہ مخواہ خفا ہوتے کہ ہر وقت شیخی مارتے ہیں۔ یہ نہ سوچتے کہ قریب بیس برس کے جو شخص ایسے ماحول میں رہا ہو کہ ساتھیوں میں سوائے ڈیوک اور پرنس کے دوسرا نہ ہو تو وہ اور کیا ذکر کرے۔

ان کو ملکہ کے مرنے کا سخت صدمہ تھا۔ کہتے تھے کہ جینے کو جی نہیں چاہتا لطف زندگی نہ رہا۔ وہاں رہتے رہتے عادات بھی بدل گئے تھے اور یہاں ان کو لوگوں کی صحبت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ملکہ کے مرنے کے بعد شاید چار پانچ سال ہی زندہ رہے۔

اپنے سرکاری عہدے سے وہ علحدہ ہو کر ملکہ معظمہ کے محل کے منتظم خاص کے عہدے پر مقرر ہو گئے تھے اور دہلی دربار میں ملکہ معظمہ کے ذاتی نمایندے کی حیثیت سے شریک ہو کر ان کو جو اعزاز حاصل ہوا تھا۔ وہ اردو کے لئے باعث فخر ہے۔

مجھے امید ہے کہ اردو سے محبت رکھنے والے اگر آگرہ آئیں گے تو ضرور کسی ذریعہ سے "کریم لاج" جا کر اردو کی شاہی سرپرستی کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے ۱۹۲۳ء تک تو "کریم لاج" میں ایک بہت وسیع کمرے میں تمام اشیا بطور میوزیم کے رکھی رہتی تھیں اور انگریز اور ہندوستانی سب جا کر دیکھ سکتے تھے اور ان کے بھتیجے نہایت اخلاق سے ملتے اور بڑی تکلیف گوارا کرتے تھے۔ ملکہ معظمہ کے ذاتی خطوط اصل دیکھنے کی چیز ہیں۔ اور ان خطوط ہی سے صحیح اندازہ لگتا ہے کہ حافظ صاحب ملکہ معظمہ کے کیسے دوست تھے۔ مثلاً زلزلہ کا جھٹکا ملکہ معظمہ نے محسوس کیا۔ حافظ صاحب کسی وجہ سے علحدہ کسی دوسری جگہ تھے تو ملکہ معظمہ نے تار دے کر صرف یہ دریافت کیا کہ "کیا تم نے بھی زلزلے کا جھٹکا محسوس کیا" بہت سے خطوط صرف خواص ہی کے دیکھنے کے لائق ہیں۔ جن کا ذکر بوجوہ مناسب نہیں۔

یہ اس شخص کے حالات ہیں جس نے ملکہ معظمہ کے اردو ٹیچر کی حیثیت سے ایسا عروج حاصل کیا جو دوسرے کو نصیب نہیں اور جس نے شاہی محل کی زبان بدل دی تھی۔ اور اردو کا ایسا جھنڈا گاڑا تھا جس کی یادگار اب تک ملکہ معظمہ کے قصر شاہی بالمورل کاسل میں موجود ہے۔

ملکہ معظمہ کے گرد وپیش سارے محل میں اردو کا رواج تھا اور سوائے اردو کے دوسری زبان نہیں بولی جاتی تھی۔ ذرا سوچئے کہ ملکہ کے گیارہ ذاتی خادم اردو داں تھے اور یہ وہ تھے جو ملکہ کا قرب حاصل رکھتے تھے۔ اور تمام اہم خدمات روزمرہ ان کے سپرد تھیں۔ ان اردو جاننے والے ملازموں سے سب کا کام اٹکتا تھا۔ یہ دن رات وہیں محل پر رہتے تھے اور یہ معزز ترین نوکر تھے۔ ان کے سبب دن رات کے رہنے والے سب کے سب اردو بولنے اور سمجھنے لگے تھے۔

جب شاہ وقت خود اردو پڑھے اور نوکر چاکر بھی سب اردو داں رکھ لے تو ظاہر ہے کہ اور لوگ بھی اس کی طرف توجہ کریں گے۔

میری دانست میں اردو کی سرپرستی کی ایسی کوئی نظیر نہیں مل سکتی ہے۔ اور شاید دنیا کی زبانوں میں صرف اردو ہی کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اتنے بڑے شہنشاہ کے محل تک اس طرح رسائی ہوئی۔ اور اردو کی تاریخ میں ملکہ وکٹوریہ کی شاہی سرپرستی ہمیشہ یادگار رہے گی ✦

عظیم بیگ چغتائی

شعر

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

سیماب اکبرآبادی

قطعات

غمدیدگی

میں جھیل چکا ہوں شدّتِ شوق　　میں صدمۂ یاس اٹھا چکا ہوں
باقی ہے کون سی اذیت　　اب جس کے لئے میں جی رہا ہوں؟

آسمانی نغمہ

چاندنی، کاہکشاں، مستیِ ہوئے نغمہ　　یہ سماں عکس ہے فردوس کے گلزاروں کا
لیکن اتنا تو بتا مطربۂ زہرہ خصال!　　یہ ترا نغمہ ہے یا گیت ہے سیاروں کا

حسرت

کون سی شے تمہاری نذر کروں　　آہ اے صبح و شامِ کوہ مری!
مجھ تہی دستِ زندگی کے پاس　　اِک جوانی ہے وہ بھی درد بھری

رازِ دروں

تکلیفِ یہ ہر فرقت کی کمی نہیں دشت　　یہ بارِ الم آہ اُٹھایا نہیں جاتا
وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے　　سینے میں بھی اللہ چھپایا نہیں جاتا

حسنِ آواز

کر رہی ہو تم کسی سے گفتگو؟　　پڑ رہی ہے یا گلستاں میں پھوار؟
یہ تمہارے ہنسنے کی آواز ہے　　بج رہا ہے یا کہیں کوئی ستار؟

میری تصویر

اس کے رنگوں میں مرے حال کی تفسیر نہیں　　پرتوِ روح نہیں، قلب کی تنویر نہیں
نہ مرا سوزِ غم اس میں نہ مرا جوشِ طرب　　میری تصویر نہیں یہ مری تصویر نہیں

جنّتِ ارضی

یہ سبزہ، یہ ترا نغمہ، یہ مہتاب　　یہ کلیوں کی چٹک یہ رونقِ گُل
اگر ایسے میں جنت بھی عطا ہو　　تو ٹھکرا دوں اُسے میں بے تامّل

اختر انصاری

دو غزلیں

یہ کون ہے جو حُسن کے پردے میں چھپا ہے؟
معلوم ہے جو کھیل کہ تو کھیل رہا ہے

تجھ سے تو کھنچا ہے فقط انگارۂ تصویر
تصویر کو رنگین مرے خوں نے کیا ہے

یہ تیرے چمکتے ہوئے بے تاب نظارے
اک شعبدہ بازی کے سوا اور یہ کیا ہے

تُو یہ تو بتا صانعِ فردوس و جہنم!
کچھ تجھ کو مرے دردِ تمنا کا پتا ہے!

منزل ہے عجب منزلِ مقصودِ محبت
مسجد کا ہے ماحول نہ مندر کی فضا ہے

کیا چارہ ہے کیا چارہ ہے اے شیخ و برہمن!
بُت کہتا ہے میں بُت ہوں مگر مجھ میں خدا ہے

کیا ڈھونڈتے ہو دودِ چراغِ دلِ تنویر
بے شک یہ بجھا سا ہے مگر جل کے بجھا ہے!

ہم صبح تک دعا کا اثر دیکھتے رہے
بجھتے ہوئے شرر پہ شرر دیکھتے رہے

دل سے صدا یہ طور پر آئی کلیم کو
جلوہ کدھر تھا آپ کدھر دیکھتے رہے

تاروں نے اپنی راہیں بدل لی ہیں اور ہم
اُن کے گلے میں لعل و گہر دیکھتے رہے

لاکھوں تڑپ تڑپ کے نظارے پلٹ گئے
کچھ بھی نہ دیکھتے تھے مگر دیکھتے رہے

آنسو ٹپک کے خاک میں گم ہو گیا کہیں
ہم لرزشِ شعاعِ قمر دیکھتے رہے

تھی ایک جست صاحبِ معراج کے لئے
جبریل اپنی جنبشِ پر دیکھتے رہے

تنویر اُن سے کیجے تغافل کا کیا گلہ
ہم ہی نہ تھے اُدھر وہ جدھر دیکھتے رہے

روشن دین تنویر

کھڑکی

ایک مزدور کے کمرے کا اندرونی حصہ۔ سامنے والی دیوار کے بیچ میں ایک کھڑکی ہے جس میں سے آسمان نظر آ رہا ہے۔ سیدھے ہاتھ کو ایک دروازہ۔

چولہے کے آگے مزدور کی بیوی بیٹھی ہے۔ دو بچے اجو اور جیوتی کھڑکی کے پاس کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔

اجو:۔ وہ بادل دیکھ رہی ہو، بہن جیوتی؟ (جیوتی خوشی سے تالیاں بجاتی ہے) بڑا سارا سفید گھوڑا ہے بالکل سچ مچ کا گھوڑا۔

جیوتی:۔ مگر لنگڑا ہے۔ تیز نہیں دوڑ سکتا۔

اجو:۔ لنگڑا نہیں۔ بڈھا ہے۔

جیوتی:۔ کیوں بھیا دیکھو تو بھیا! وہ بادل تو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسی دادا کی داڑھی دکھائی دیتی تھی ..... بالکل سفید!

اجو:۔ دیکھو دیکھو! وہ چل رہا ہے۔ نہ جانے کہاں جا رہا ہے؟

جیوتی:۔ دیکھو! اونٹ معلوم ہوتا ہے۔ وہ دیکھو کوہان۔ مجھے تو اس پر کوئی سوار بھی دکھائی دے رہا ہے۔ وہ کہیں بہت دور جا رہا ہے۔

اجو:۔ اونٹ کیسے ہو سکتا ہے؟ ننھی ننھی گھنٹیوں کی آواز تو آ ہی نہیں رہی۔ سنائی دے رہی ہے کہیں تمہیں؟ مجھے سنائی نہیں دیتی کیونکہ گھنٹیاں تو ہیں ہی نہیں۔ دیکھو، دیکھو! کتنا لال ہوتا جا رہا ہے! کس قدر لال ——— جیسے چاچا کی آنکھیں، جب رات گئے وہ گھر آتے ہیں مجھے تو لال بادل اچھے نہیں لگتے۔ تمہیں اچھے لگتے ہیں؟

جیوتی:۔ نہیں! بڑے برے ہوتے ہیں۔ جیسے کارخانوں کی دہکتی ہوئی بھٹیوں میں آگ۔ مجھے تو لال بادل سے نفرت ہے۔ یہ اس آگ کی طرح ہوتا ہے جس میں دادا کو جلایا تھا ——— جب رات کو انہیں آنکھیں بند کر کے نیند آ گئی تھی، اور سب کہہ رہے تھے کہ وہ مر گئے۔

اجو:۔ ہاں۔ لال بادل ایسا ہوتا ہے۔ جیسے ..... جیسے کیا بہن؟ تمہیں یاد ہے جیوتی؟ چاچا کا دوست ——— جس کا ہاتھ مشین میں آ کر کچلا گیا تھا؟ تمہیں یاد ہے اس کا لٹکتا ہوا گوشت ..... کیسا دکھائی دے رہا تھا؟ او ..... !

جیوتی:۔ (اس کے یاد آنے پر چیخ کر) او ..... ! مجھے لال بادلوں سے نفرت ہے۔

اجو:۔ مگر مجھے سرخ گلاب پسند ہیں۔ چاچا کے کارخانے کا مالک روز صبح کو ایک سرخ گلاب اپنے کوٹ میں لگاتا ہے۔

مزدور کی بیوی:۔ بس اب ختم کرو بچو۔ بتی تو جلا لے جا کر اجو۔

اجو:۔ مگر ابھی تو اندھیرا نہیں ہوا ماں ——— آسمان تو جاگ رہا ہے۔

جیوتی:۔ مجھے تو کھڑکی بڑی پیاری لگتی ہے۔ کیوں اجو، تمہیں بھی اچھی لگتی ہے؟

اجو مجھے تو آسمان بہت پیارا لگتا ہے، جب کھڑکی کھلی ہو۔

جیوتی:۔ جب کھڑکی بند ہوتی ہے تو مجھے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے رات کو جھانکنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ یہ رات کیا ہوتی ہے اجو؟

اجو:۔ لو! یہ تو سب بتا سکتے ہیں۔ تمہیں نہیں معلوم؟

جیوتی:۔ کیوں نہیں۔ مجھے تو معلوم ہے ..... مگر تمہیں بھی معلوم ہے؟

اجو:۔ کیوں نہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے۔ جب پرماتما سو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں رات ہو گئی جب وہ جاگتا ہے تو دن ہو جاتا ہے۔

جیوتی:۔ اجو! بادل دور چلا گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ بھی وہیں جا رہا ہے جہاں دادا چلے گئے! دادا بڑے اچھے تھے۔ کیسے اچھے اور پیارے تھے۔ ہمارے دادا! سدا رنجیدہ رہتے تھے۔

اجو:۔ جیوتی، تمہیں بھی کبھی رنج ہوتا ہے؟

جیوتی:۔ بس جب کبھی ماں کو روتا دیکھتی ہوں مگر جب کھڑکی میں سے

آسمان مسکراتا ہے تو میں خوش ہو جاتی ہوں۔

اجو:۔ ہاں، بتی میں جلاؤں گا۔ بکس کہاں ہے؟

مزدور کی بیوی:۔ لو یہ رہا۔ بس تیرہ دیا سلائیاں ہیں اس میں۔ بڑی ہوشیاری سے جلانا۔ جب بتی جلاؤ تو کھڑکی بند کر لینا۔ نہیں تو ہوا سے کئی دیا سلائیاں بجھ جائیں گی۔

اجو:۔ نہیں ماں۔ تم دیکھنا کیسی ہوشیاری سے میں بتی جلاتا ہوں پہلی ہی دیا سلائی میں جلاؤں گا۔ (دیا سلائی جلاتا ہے)

جیوتی:۔ ہو ہو! ..... کیسا اچھا معلوم ہو رہا ہے! شعلہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آنکھ۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔

اجو:۔ اچھا اچھا جیوتی۔ ذرا چپکی رہو۔ (شعلہ بجھ جاتا ہے)

مزدور کی بیوی:۔ دیکھا ایک دیا سلائی خراب کی۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا تم سے۔

اجو:۔ ہاں یہ غلطی میری نہیں ہے۔ جیوتی .....

جیوتی:۔ اجو! میں نے کچھ نہیں کیا۔ جھوٹ مت بولو۔

اجو:۔ ہاں، ہاں! پہلے تو کبھی دیا سلائیاں اتنی بُری نہیں ہوتی تھیں۔

مزدور کی بیوی:۔ دو سلائیاں جلا دیں۔ اب صرف گیارہ رہ گئیں۔ تیرہ تھیں پہلے۔

جیوتی:۔ ہاں! کارخانہ میں سب کہا کرتے ہیں کہ تیرہ منحوس ہوتا ہے۔

مزدور کی بیوی:۔ (لڑکے کے ہاتھ سے بکس لے کر) میں خود جلاؤں گی۔ بھاگو یہاں سے، فتنے کہیں کے۔ اگر چاچا ابھی گھر آجائیں اور دیکھیں کہ اندھیرا پڑا ہے۔ تو کوسنے اور گالیاں دینے لگیں۔ بیچارے چاچا ..... سارے دن انہوں نے اتنی سخت محنت کی ہوگی ..... سارے دن ..... جیسے مشین ..... جیسے مشین۔ (بچے کھڑکی کے پاس چلے جاتے ہیں) اتنے میں بتی جلاؤں تم کھڑکی بند کر دو۔ (بچے کھڑکی بند کر دیتے ہیں)

اجو:۔ جیوتی، تمہیں اندھیرے میں ڈر لگتا ہے؟

جیوتی:۔ نہیں تو۔ تمہیں لگتا ہے؟

اجو:۔ ارے نہیں۔ مجھے اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا۔

جیوتی:۔ ایک دفعہ میں نے سنا تھا چاچا کہہ رہے تھے ماں سے "مجھے تو دن کے اُجالے سے ڈر لگتا ہے"! اُجالے سے چاچا کیوں ڈرتے ہیں؟

اجو:۔ دیکھتی نہیں ہو؟ دن بھر اُنہیں کام کرنا پڑتا ہے۔ ارے دیکھو دیکھو! تمہیں وہ بڑی سی پیلی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ اُن پہاڑوں کے پیچھے؟ وہ؟ وہ؟

جیوتی:۔ ہاں، وہ چاند ہے ..... چاند ..... مجھے چاند اچھا لگتا ہے بھیّا! مجھے چاند چاہیئے۔

اجو:۔ تمہیں چاند نہیں مل سکتا۔

مزدور کی بیوی:۔ (طاق میں دیئے کو رکھ کر بڑبڑاتی ہے، جیسے بہتر کر لے کا گلا) ... جسے کوئی نہیں پوچھتا ... جس کی کسی کو پروا نہ ہو ..... ہم غریب مزدوروں کے کُنبے۔ جاہل، بے آرام، بھوکے، گندے، چیتھڑے لگے ہوئے، کچلے ہوئے ... اندھیرے بلوں میں بستے ہیں، سہمے ہوئے ... چلتے پھرتے مُردے ... پرچھائیاں ... اُن انسانوں کا ہم پر قبضہ ہے جن کے قبضے میں کچھ بھی نہیں — گندگی، ابتری، بیماری ... سُست اور سڑاندی موت! ... بس یہی بڑبڑایا کرتا ہے میرا غریب پتی سوتے میں (لپکلنے رینڈھنے پھر چولہے کے پاس چلی جاتی ہے۔)

اجو:۔ (لٹکتے ہوئے چاند کی طرف اشارہ کر کے) کتنا بڑا اور گول ہے! جیسے سونے کی بڑی سی تھالی۔

جیوتی:۔ مجھے تو سونے کا سکہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے پاس ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا! کتنی ساری چیزیں اس سے خرید لیتی!

اجو:۔ بھلا کیا کیا خرید و گی؟

جیوتی:۔ ارے بہت ساری مٹھایاں بازار سے خرید لوں۔

اجو:۔ اور میں ایک گیند خرید لوں اور واہ! کیا مزا آئے کہ کل دن بھر اس سے کھیلتے رہیں! کیوں بہن؟ میں جانوں چاند تو سچ مچ ایک گیند ہے۔ شاید پرماتما اس سے کھیلتا ہے۔

جیوتی:۔ مجھے یہ کھڑکی پیاری لگتی ہے۔ کیسی کیسی عجب چیزیں ہمیں اس میں سے دکھائی دیتی ہیں — اس کھڑکی میں سے۔ آؤ اجو! ہم گائیں۔

اجو:۔ اچھا کیا گائیں؟

جیوتی:۔ کھڑکی کا کوئی گیت۔

اجو:۔ ہاں گاؤ۔ پہلے تم شروع کرو۔

جیوتی:۔ نہیں، تم شروع کرو۔

اجو۔ چلو ہم دونوں مل کر شروع کریں۔

(جیوتی اور اجو اپنا گیت گاتے ہیں)

کھڑکی کھڑکی، پیاری کھڑکی!
چندا ماموں جھانک رہے ہیں
ہم دونوں کو تاک رہے ہیں
کھل جائے تو بادل دیکھیں!
بند ہو شیشوں میں سے دیکھیں
جھوم رہے ہیں، گھوم رہے ہیں
چندا ماموں چوم رہے ہیں!
تجھ سے گذر کر ہم تک آئیں
چندا ماموں ہم کو رجھائیں
کھڑکی کھڑکی، پیاری کھڑکی

(گیت ختم کر کے خوشی سے دونوں چیخیں مارتے ہیں اور ان چیخوں میں سارے محلے اور گلیوں کے بچوں کی چیخیں بھی شامل ہو جاتی ہیں)

مزدور کی بیوی:۔ چلو بچو۔ رات سر پر آ رہی ہے۔ دو دو روٹی کھا کر سو رہو۔

(ایک روٹی لے کر دونوں بچے کمرے کے ایک کونے میں جا دبکتے ہیں)

(ایک ہمسائی داخل ہوتی ہے)

ہمسائی:۔ کیوں بہن! ہمیں رات بھر کے لئے ایک ہانڈی دے سکتی ہو؟ ہماری ٹوٹ گئی۔

مزدور کی بیوی:۔ ضرور بہن۔ لو یہ لو۔ اور ہاں اسے واپس کرنے کا خیال نہ کرنا۔

ہمسائی:۔ تم بڑی اچھی ہو بہن۔ ننھے نے ہماری ہانڈی توڑ دی۔

مزدور کی بیوی:۔ آہ بہن۔ دیر سویر ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔

ہمسائی:۔ تمہارے پتی کیا آج رات کو دیر سے گھر آئیں گے؟

مزدور کی بیوی:۔ میں ابھی تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تمہارے پتی کام پر سے واپس آ گئے یا نہیں؟

ہمسائی:۔ نہیں۔ دیکھنا بہن وہ کہہ رہے تھے کہ آج سب اکٹھے ہوں گے۔ سب مزدور۔ میرا مطلب ہے، ہاں سارے مزدور —— کسی بات کا فیصلہ کرنے کے لئے۔ انہوں نے مجھے بتایا نہیں کس بات کا ہیں

گھر لوٹ آئی، روح کی طرح۔

مزدور کی بیوی:۔ ہاں۔ یہ سب کے سب تھک گئے ہیں —— میرا غریب پتی مجھے کیسا دکھ ہوتا ہے کہ اس کی مدد نہیں کر سکتی۔ کچھ کام میں بھی کرتی جس طرح تم اور اور پڑوسیوں کی بیویاں محنت مزدوری کرتی ہیں —— مگر کروں گی میں بھی —— بس ذرا جی ٹھیک ہو جائے۔ دیکھو تو بہن! میرے پھیپھڑوں میں درد ہوتا ہے اور منہ سے خون آ رہا ہے۔ مگر میں اب اس کی پروا نہیں کروں گی۔ شاید کام پر لگ جانے سے جی کچھ اچھا ہی ہو جائے۔

ہمسائی:۔ کام، کام، کام! سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کا انجام کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم دکھ جھیلنے کے لئے کیوں پیدا ہوئے تھے۔ ہم سرے سے پیدا ہی کیوں ہوئے! کچھ آرام کرنے کے لئے پیدا ہوئے اور باقی محنت کرنے اور رونے! ایسا کیوں؟

مزدور کی بیوی:۔ مالک ہم سے کہتے ہیں کہ یہ تمہارے کرم ہیں، ایک طرح سے نصیب کا لکھا سمجھو —— پرماتما کی مرضی۔ ہاں، یہی ہم سے سدا کہا جاتا ہے۔

ہمسائی:۔ اور ہم دن رات پرماتما کے گیت گاتے رہتے ہیں اور آس لگائے رہتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن وہ ہماری دعائیں سنے گا اور ہماری مدد کرے گا!

اجو:۔ (چپکے سے) جیوتی، کل ہم ایک لمبی سی رسی میں پتھر باندھ کر نیچے لٹکائیں گے۔

جیوتی:۔ ہاں، ہاں! (اٹھ کر چلے جاتے ہیں)

مزدور کی بیوی:۔ ہاں پرماتما کی تعریفیں گاتے ہیں۔ اس وقت بھی جبکہ کمر ٹوٹ رہی ہو اور ہونٹوں پر پپڑیاں بندھ رہی ہوں اور ہڈیاں تھک کر چور ہو رہی ہوں اور گوشت پیلا پڑ گیا ہو —— پرماتما کے گیت گاتے ہیں۔ جب آواز مر گئی ہو —— جب ہر چیز دم توڑ رہی ہو!

ہمسائی:۔ مگر پرماتما جیتا ہے!

مزدور کی بیوی:۔ سمجھ میں نہیں آتا! (اس کے بعد ہی پڑوس میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز فضا کو چیرتی ہوئی آتی ہے۔)

ہمسائی:۔ یہ میرے ننھے کے رونے کی آواز ہے۔ اس کے رونے سے کل رات تمہاری نیند تو بڑی بے چین ہوئی ہوگی؟

مزدور کی بیوی:۔ اچھا! یہ تمہارا بچہ کل رو رہا تھا۔ میں نے جانا کہ دوسری

پڑوسن کا بچہ ہے، وہ جسے کالی کھانسی ہو رہی ہے۔ تمہارے بچے کو کیا ہوا؟

ہمسائی:۔ کوئی نئی بات نہیں۔ اس کے سارے بدن پر پھوڑے ہو گئے ہیں اور اس کے سانس میں سے ایسی بُو آتی ہے جیسی کسی گندی نالی میں سے۔ لیکن اس سب کچھ کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے — یہ نصیب ہے . . . . اچھا بہن، اس ہانڈی کا شکریہ۔ (چلی جاتی ہے)

مزدور کی بیوی:۔ اے پرماتما! کیا تو سچ مچ وہاں گہرے اندھیرے آسمان پر ہے؟ کیا تو سُن سکتا ہے؟ اگر نہیں سُن سکتا تو کیا تُو بہرہ ہے؟ اور اگر سُن سکتا ہے تو کیا تو گونگا ہے؟ اے پرماتما! تو کون ہے اپرماتما، پرماتما، پرماتما! تُو کیا ہے؟ اگر واقعی موجود ہے تو کیا ہے؟

(مزدور داخل ہوتا ہے، نشہ میں ہے، تھک کر چُور ہو رہا ہے)

مزدور:۔ عورت! کیا اب بھی تو پرماتما کو پُکار رہی ہے؟ تھکی نہیں؟ کیا تو نہیں جانتی وہ سنگدل ہے، بے رحم اور بے پروا ہے؟ تجھے نہیں معلوم کہ سُننے کے لئے اُس کے پاس وقت نہیں ہے — ہماری سُننے کے لئے پسینے میں نہانے والے بدنصیبوں کی۔ نہیں جانتی کہ اُسے کارخانوں کے مالکوں نے خرید لیا ہے؟ مشین کے مالکوں نے؟ اپنا وقت کیوں ضائع کر رہی ہے؟ عورت! کیوں اپنے پھیپھڑوں کو ضائع کر رہی ہے؟ بھٹیوں کے دھوئیں، کارخانوں کی زہریلی ہوا اور اس کال کوٹھڑی نے جس میں ہم رہتے ہیں، کیا تیرے پھیپھڑوں کو کافی تکلیف نہیں پہونچائی ہے؟

بیوی:۔ آج تم بہت رات گئے آئے؟

مزدور:۔ بچے کہاں ہیں؟

بیوی:۔ ابھی ابھی سوئے ہیں۔ ٹِک ٹِک لگا رکھی تھی بادلوں، چاند اور آسمان کی۔ اور اپنے دادا کی سفید ڈاڑھی کی — کھڑکی کے پاس کھڑے باتیں مٹھار رہے تھے۔

مزدور:۔ کھڑکی سے بچے محبت کرتے ہیں، ہے نا؟ بدنصیب بچے! صرف یہی ایک خوشی انہیں میسر ہے۔ آسمان اور اس پہ بادل، چاند اور تارے — یہی ان کے کھلونے ہیں — ہاں! یہ نتیجہ ہے مزدور کے گھر پیدا ہونے کا۔ پرماتما غارت ہو جائے۔ میں کہتا ہوں غارت ہو جائے پرماتما!!! اور اگر میں کُفر بک رہا ہوں تو پرماتما مجھے معاف کرے۔

بیوی:۔ تھوڑی دیر ہوئی میری سہیلی پڑوسن ایک ہانڈی مانگنے آئی تھی۔ تم نے جو پچھلے ہفتے میلے میں سے دو ہانڈیاں لی تھیں ان میں سے ایک میں نے اُسے دے دی ہے۔

مزدور:۔ اچھا کیا۔ ان کی ہانڈی کیا ہوئی؟ ٹوٹ گئی شاید!

بیوی:۔ ہاں۔ اور میں نے اُس سے کہا تھا کہ دیر سویر ہر چیز ٹوٹ ہی جاتی ہے۔

مزدور:۔ واہ واہ! واہ واہ! ہاں، کیونکہ — ہر چیز دیر سویر ٹوٹ جاتی ہے — ہم سب ٹوٹ جاتے ہیں — زندگی کے ہر لمحے ہمیں توڑ دیا جاتا ہے — میں غارت ہو جاؤں — تم غارت ہو جاؤ اور — ہم سب غارت ہو جائیں — مٹی کی ہانڈیاں، سستی ہانڈیاں!

بیوی:۔ کیا تم سیدھے کارخانہ سے اب واپس آ رہے ہو؟

مزدور:۔ ہاں۔ راستے میں ایک جگہ رُک گیا تھا۔ تم تو جانتی ہو۔

بیوی:۔ مجھے تاڑی کی بُو آ رہی ہے۔

مزدور:۔ ہاں۔ تم نے شاید سمجھ لیا ہوگا۔

بیوی:۔ ہاں میں سمجھتی تو ہوں۔ مگر دیکھو تو، کوشش کی جا رہی ہے کہ مزدور تاڑی پینا چھوڑ دیں اور اس کی بجائے پرماتما کے گیت گائیں۔

مزدور:۔ غریب آدمی کے لئے تاڑی کو چھوڑنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کو چھوڑ دے۔ اور خدا کو چھوڑنا ایسا ہے جیسے تاڑی کو چھوڑ دے۔

بیوی:۔ آؤ بھوجن کر لو۔

مزدور:۔ مجھے آج بھوک نہیں لگ رہی — میں تھکا ہوا ہوں — اتنا تھکا ہوا کہ ایک نوالہ بھی نہیں کھا سکتا۔

بیوی:۔ تم کچھ پریشان نظر آتے ہو۔

مزدور:۔ ہاں ایک اُڑتی اُڑتی خبر ہے۔

بیوی:۔ کیسی خبر؟

مزدور:۔ کہا جا رہا ہے کہ اب ہر چیز پر ٹیکس لگنے والا ہے۔

بیوی:۔ قانون کون بناتا ہے؟

مزدور:۔ جو قانون بناتے ہیں وہ ہمیں کبھی نہیں دکھائی دیتے۔ وہ بڑے مقدس اور قیمتی ہوتے ہیں۔ وہ اُن دیوتاؤں کی طرح ہیں جنہیں ہمیں کبھی نہیں دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ہم اُنہیں ایک دفعہ بھی دیکھ لیں تو پھر وہ دیوتا نہیں رہتے۔ اور ساری قلعی کھل جاتی ہے۔

بیوی:۔ عجیب قانون ہیں! کیا سارے قانون انسان ہی بناتے ہیں؟

مزدور:۔ سب — ہاں — سب! مِل کے قانون، کارخانوں کے قانون،

—— زمین کے قانون۔

بیوی :۔ کرم کا قانون بھی؟

مزدور :۔ ہاں، عورت! کرم کا قانون بھی —— سارے قانونوں سے زیادہ چالاکی اور ہوشیاری کا قانون! یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہم اس لئے کچلے جاتے ہیں، توڑے جاتے ہیں اور بھوکے ہیں کہ ہم نے پہلے گناہ کئے ہیں۔ پرماتما انہیں غارت کرے! اور ہم ان کے آگے اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ اری عورت، تو کیا سوچ رہی ہے! اب ایک اور قانون بننے والا ہے۔ یہ خبر سنی ہے ہم نے آج شام کو۔ تیرے تو خیال میں بھی نہیں آسکتا۔

بیوی :۔ بتاؤ تو، بتاؤ تو۔

مزدور :۔ بھیانک، ذلیل اور سفاک —— میرے غریب بچے!

بیوی :۔ تمہارے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ ہمارے بچوں کو ہم سے چھین لے جائیں گے؟

مزدور :۔ عورت، اس کی تو ان میں ہمت بھی نہیں ہے، جب تک میں یہاں ہوں۔ جب تک خون کا ایک قطرہ بھی زندہ ہے اور ان زہر خوردہ رگوں میں دوڑ رہا ہے!

بیوی :۔ تو پھر اور کیا ہے؟

مزدور :۔ میں تمہیں ابھی نہیں بتا سکتا۔ نہیں، بتانا بھی نہیں چاہئے۔ نہیں، میں نہیں بتاؤں گا۔ اچھا، اچھا۔ انہیں کوشش کر لینے دو۔ وہ اپنی سی کر کے دیکھ لیں۔ دیر سویر ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔ (پاگلوں کی طرح ہنستا ہے) عورت! تو ٹھیک کہتی ہے!

پڑوسی :۔ (ایک مزدور پڑوسی یکایک داخل ہوتا ہے) پڑوسی! وہ سچ ہے —— افواہ سچی ہے۔ وہ آ پہونچا۔ (یکایک چلا جاتا ہے)

مزدور :۔ وہ ہمارے پیچھے پڑے ہیں کہ ہمیں کچل ڈالیں، زخمی کر دیں، ساری عمر کے لئے اپاہج کر دیں۔ کم تعداد، کم تعداد غاصب! جنہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں اپنی گاڑی کے پہیوں سے باندھ رکھے ہیں، گھوڑوں کی طرح ہمیں جوت رکھا ہے، جو ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح مار مار کر ہنکاتے ہیں، جنہوں نے ہمیں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا رکھی ہیں، جنہیں یہ دیکھنے کی اُمید ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ماں کے پیٹ ہی سے زنجیروں میں جکڑی پیدا ہوں گی۔ وہ ہمیں گونگے عوام کہتے ہیں۔ ہم اب بھی اُنہیں بتا دیں گے۔ گونگے عوام! ذرا اُنہیں ہماری تاریک بے نور کوٹھڑیوں اور تہ خانوں میں آنے تو دو۔ اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ عوام گونگے نہیں، اندھی حیوانی قوت نہیں ہے کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اسے استعمال کر لیں۔ اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ عوام میں مرد، عورت اور بچے شامل ہیں —— جن میں سے ہر ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، بے مثل اور شاندار! ہر ایک میں ایک دل دھڑک رہا ہے جو طبلِ جنگ کی طرح گونج رہا ہے اور تیار ہے کہ آخری فتح کا نقارہ بجا دے۔

بیوی :۔ میرے غریب، تھکے ہوئے ساتھی! میں سمجھ گئی، میں سمجھ گئی۔

مزدور :۔ مزدور خیال دوڑا سکتا ہے، ہنس سکتا ہے، خواب دیکھ سکتا ہے، تکلیفیں جھیل سکتا ہے، —— ہاں محبت تک کر سکتا ہے اُن سے بھی اچھی۔ عوام! ہاں —— دیر سویر یہ بھی ٹوٹ جائیں گے، عورت! جیسے پانی، سمندر کا دہاڑتا ہوا پانی۔ ہم اُنہیں اس کی سزا دیں گے —— کل اُنہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم خوب جاگ رہے ہیں، طویل موت سے یکایک جاگ اُٹھے ہیں اور ایسے جاگے ہیں کہ پھر نہیں سو سکتے۔ عورت! آخر کار ہمیں ظالم کے ظلم کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اس نے ہمیں ہماری نیند سے جگا دیا ہے۔ اب ہم وہ غلام نہیں رہیں گے جو پہیوں سے بندھے رہتے ہیں، جن کے جسم و روح اُن بھاری مشینوں سے کچل دیئے گئے ہیں جو مٹھی بھر آدمیوں کی ملکیت ہیں۔ ہم اُٹھیں گے اور ماریں گے اور مالک بن جائیں گے —— اور پھر! فرصت! آرام! —— مشینیں، کروڑوں کی فرمانبردار ہو جائیں گی۔ ٹھیک ہے —— ہم قبروں کی طرح پڑے نہیں رہیں گے۔ کیا! اُمید؟ آزادی؟ ہمارے لئے، ہم تک کے لئے؟ بے بس، کچلے ہوئے جانور! زرد، غلام، تھکے ماندے مزدور؟ بھوک! کیا تو دُھواں تھی کہ اتنے جلدی اُڑ گئی؟ اور تُو، اے مشقت! کیا تو ایک بھیانک خواب تھا جو ختم ہو گیا؟ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا؟ کیا کہہ رہا ہوں میں؟ عورت! کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ کیا ہمیں بھوک، غلامی اور بیماری سے چھٹکارا مل جائے گا؟

بیوی :۔ ہاں، میرے غریب تھکے ہوئے پتی۔ ہمارا لئے اچھا زمانہ جلدی آنے والا ہے۔

مزدور :۔ نہیں . . . . . ابھی بہت دُور ہے —— اور —— ہم تھک چکے ہیں۔ (ایک آدمی کولتار کی بالٹی ہاتھ میں لٹکائے داخل ہوتا ہے)

بالٹی والا:۔ افسوس ہے کہ اتنی رات گئے میں آیا ہوں۔ اور وہ کھڑکی کہاں ہے؟

بیوی:۔ اسے یہاں کیا چاہئے، اور یہ ہے کون!

مزدور:۔ وہ افواہ سچ ثابت ہوئی! وہ ہے سامنے دیکھو ـــ کیسی اچھی کھڑکی ہے۔ اس لئے بھی کہ جب تم اپنی زندگی سے عاجز آجاؤ تو اس میں سے باہر کود پڑو۔

بالٹی والا:۔ (کھڑکی کے سب شیشوں پر کولتار پھیرنا شروع کرتا ہے) گناہ کی طرح سیاہ۔ گناہ کی طرح سیاہ ـــ کولتار کا رنگ ہے ـــ اور میں تو صرف اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ بس۔

بیوی:۔ کیا یہ پاگل ہے! یہ کیا کر رہا ہے؟

مزدور:۔ کھڑکی پر کولتار پھیر رہا ہے اور اُن ٹوٹے ہوئے شیشوں پر بھی جو اس میں باقی رہ گئے ہیں۔ مٹھی بھر آدمیوں نے ایک نیا قانون بنایا ہے۔ اب وہ روشنی پر ٹیکس لگا رہے ہیں۔

بیوی:۔ روشنی پر ٹیکس لگا رہے ہیں! اور کیا اب روشنی ہمارے گھروں میں کبھی نہیں آئے گی؟

بالٹی والا:۔ بس ختم ہوئی ـــ جب تک تم اس کی قیمت ادا نہ کر دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک پیمانہ مقرر کر دیا گیا ہے جس کے مطابق تم اپنی دن بھر کی روشنی خرید سکتے ہو۔ اچھا، تمہارا شکریہ شب بخیر ـــ بلکہ صباح بالخیر۔

(اپنی بالٹی اور برش لئے باہر چلا جاتا ہے)

مزدور:۔ یہ آخری چھاپہ مارا ہے دن کی روشنی پر۔

بیوی:۔ اب اس کے بعد وہ ہر چیز پر ٹیکس لگائیں گے۔ ہماری آنکھوں پر، ہمارے بچوں کی آنکھوں پر۔ شاید ہمارے لبوں پر بھی مُہریں لگا دیں گے۔ بلکہ ہمارے خوابوں اور کانوں پر بھی ٹیکس لگا دیں گے۔ ہماری چیخوں اور ہمارے قہقہوں پر بھی۔ ہر چیز پر وہ ٹیکس لگا دیں گے!

مزدور:۔ لیکن ہمارے پرماتما کے گیتوں اور دُعاؤں پر ٹیکس نہیں لگائیں گے ـــ کیونکہ یہ تو ہمیں آزادی سے اُس پرماتما کی خدمت میں بھیجنی ہیں جو وہاں ہے۔ (آسمان کی طرف غصّے سے گھونسا تانتا ہے۔) جو ہر چیز کو دیکھتا ہے، سب کچھ اور پھر بھی ـــ ایک لفظ تک نہیں کہتا۔ یہ ہے ہمارا پرماتما جسے زمینوں اور مشینوں کے توندل مالکوں نے بالکل خرید لیا ہے۔ اے عورت! وہ تو شاید تیرے جسم پر بھی ٹیکس لگا دیں گے اور پھر ہر دفعہ جب میں تجھ سے محبت کروں گا۔ مجھے ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔

بیوی:۔ ارے ظالم، ظالم نصیب! کیا یہ سب سچ ہے؟

مزدور:۔ بالکل سچ ـــ اور پھر بھی سب کچھ ایک بہت بڑا جہنمی جھوٹ دکھائی دیتا ہے۔ وہ سب کے سب جھوٹے ہیں۔

(شہر میں سے سات بجنے کی آواز آتی ہے)

بیوی:۔ یہ کیا بج رہا ہے؟ ارے! سات بج گئے! اور بتّی بجھ گئی! اے پرماتما! کتنا اندھیرا، کتنا اندھیرا چھایا ہوا ہے ہر چیز پر!

مزدور:۔ اندھیرا جیسا تہ خانے میں ہوتا ہے۔ اندھیرا جیسے اندھے کی آنکھ، سیاہ جیسے جھلسی ہوئی لاش، کوئلے کی رنگت! پڑوس والو! پڑوس والو!! (پاگلوں کی طرح چیختا ہے۔)

اجو اور جیوتی:۔ (اندھیرے میں جاگ کر) ماں! چاچا! ہم کہاں ہیں؟

(سارے پڑوس کی کوٹھریوں میں سٹر پٹر کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں)

مزدور:۔ اور باہر صبح انتظار کر رہی ہوگی، راہ تک رہی ہوگی اور تعجب کر رہی ہوگی کہ ہم سب کو کیا ہو گیا! روشنی! روشنی! عورت، تُو ٹھیک کہہ رہی تھی! دیر سویر ہر چیز ٹوٹ جاتی ہے۔ روشنی! روشنی! روشنی! (کھڑکی کے شیشے کو توڑ ڈالتا ہے ..... چاروں طرف سے شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

یہ ہماری طرف سے اُن کو چیلنج ہے!

روشنی، روشنی، مزدور کے گھر میں ..... ہمیشہ کے لئے!

(خوشنما گلابی روشنی اندر آتی ہے اور اپنے ساتھ مزدوروں کے لئے ایک نئی اور شاندار زندگی لاتی ہے۔)

(ہرندرا ناتھ چٹوپادھیا)

شاہد احمد دہلوی

دو غزلیں

(۱)

حریمِ ناز تخیل کا آستانہ رہے
جو یوں رہے تو کہاں ہجر کا زمانہ رہے

یہ حال بزم کی شرکت سے کم نہیں پیارے!
زبانِ دل پہ ترے حسن کا فسانہ رہے

نگاہِ لطف ہے لپٹی ہوئی نقابوں میں
کہ میرے شوقِ جنوں زا کی انتہا نہ رہے

مٹا رہا ہوں محبت میں خود کو دانستہ
کہ عشق حسن یگانہ کا بھی یگانہ رہے

میں تیرے حسن کے قلزم میں ڈوب ڈوب گیا
کہ میرا گوہرِ یکتا نہ بے ٹھکانہ رہے

تری فضائے محبت کا شاہباز نہیں
مری نگاہ کا جاذب گر آشیانہ رہے

ترے جمال کی مضرابِ نور پاش کی خیر!
امین کے تارِ نفس کا یہی ترانہ رہے

(۲)

جبھی تو شغل ہے شربِ دوام اے ساقی!
کہ قطرہ قطرہ مے ہے پیام اے ساقی!

الٹ کے جام میں شیشے کو توڑ کر رکھ دے
کر اپنی تیغ کو یوں بے نیام اے ساقی!

تری نگاہ کی زریں کمندِ ناز کی خیر!
میں انتظار میں ہوں زیرِ بام اے ساقی!

مری خودی کے منافی ہے جام سے پینا
خموں کے دل میں ہے میرا مقام اے ساقی!

پیوں نہ جس کو ترے خم میں غوطہ زن ہو کر
وہی شراب ہے مجھ پر حرام اے ساقی!

زمینِ شور کا دانے سے ہے گلہ بے جا
تری شراب کہاں خود ہوں خام اے ساقی!

غزل سرا ہے تری بزم میں امینِ حزیں
وہ تیرے بادہ کشوں کا امام اے ساقی!

امینِ حزیں سیالکوٹی

فولادی

رستم کو رستم زماں بنانے والی اکسیر

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی بیاض کا نادر نسخہ

جسے

عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب رئیس اعظم نے جدید سائنٹفک طریقہ پر ترمیم کرکے سہل الاستعمال اور پر اثر بنادیا ہے۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اپنی سیاحت عالم کے دوران میں ایک عجیب و غریب نسخہ کا پتہ لگایا ہے۔

جو

رستم اور سہراب کی طاقت کا ضامن ہے

اور سلاطین اعظم کی لاثانی قوت کا موجب تھا۔ اجمل خاں اعظم نے اس نسخے کے نادر اجزا سے ایک معجون تیار کی

یہ

نواب صاحب رام پور اور مہاراجہ پٹیالہ کی پسندیدہ معجون تھی جو اکثر والیان ریاست کے استعمال میں رہی۔ مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب رئیس اعظم نے اس معجون کو جو صرف رؤسا کے لئے خاص طور پر تیار ہوتی تھی۔ جدید اصول پر ترتیب دے کر زیادہ پُراثر بنا کر قرصوں کی شکل میں تبدیل کر دیا اور رفاہ عام کے لئے ہندوستانی دواخانے کو مرحمت فرمادی

اب یہ

فولادی قوّت پیدا کرنے والی اکسیر

جو قوت کی لاثانی دوا ہے اعضائے رئیسہ میں حیرت انگیز قوت پیدا کرتی ہے

اعصاب کو طاقتور بناتی ہے، بدن میں قوت، دل میں جوش، جسم میں چستی اور چہرے پر رونق پیدا کرتی ہے

سال نو کا لاثانی تحفہ

فولادی ہے جو زندگی، طاقت، ولولہ اور جوش سب ہی کچھ پیدا کرتی ہے اس سے جوانی کی امنگیں از سر نو پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے چند روزہ استعمال سے

بوڑھے بھی جوان ہو جاتے ہیں!!

قیمت:۔ فی قرص دو آنے ۲؍ پندرہ یوم کی مکمل خوراک ۳۰ قرص کی سربند شیشی ؎ صبح دو قرص دودھ کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔

تار کا پتہ:۔ ہیڈی سنز دہلی　　ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶　　قائم شدہ سنہ ۱۹۰۳ء

مینیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

بیمار

اور پھر وندناکر بخار چڑھتا اور گھگھی بندھ جاتی معلوم ہوتا ہڈیاں چٹ چٹار ہی ہیں اور کھال جھلسنے لگی۔ گلے میں جیسے رٹھ چلنے لگتا۔ چون چرے شرارد کھڑاور پھر کھانسی کے پھندے پڑنے لگتے۔

زبان تو جوتے کا تلا ہوگئی تھی کھٹی کھٹی سڑاندی دوائیں کھاتے کھاتے اُس میں جو گلٹیاں ہوتی ہیں وہ بھی مردہ ہوگئی تھیں۔ اُسے یاد آتا تھا جبکہ وہ چھوٹا سا تھا تو کونین کتنی کڑوی، املیاں کتنی کھٹی، اور شکر کی گولیاں کتنی میٹھی ہوتی تھیں! اُس کی زبان کیسی جاندار اور حساس تھی! اور اب وہی زبان کس قدر ڈھیٹ ہوگئی تھی کہ کسی چیز کا اثر بھی نہ ہوتا تھا۔

بچے آنگن میں کلکاریاں مارتے اور ایسا معلوم ہوتا گویا اُس کے کلیجے پر گھن برس رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے دروازے دھڑ دھڑاتے نکل جاتے اور اُس کی زندہ لاش سر سے پیر تک لرز جاتی اور پھر دوسری آوازیں بھیانک بھونپو والی لاریاں گوگتی ہوئی موٹریں کھڑکھڑاتے تانگے اور منمناتی ہوئی سائکلیں سب گویا اُس کے سینے پر سے وندناتی گذرتیں۔

"رام رام ست ہے!" اُس کا کلیجہ مسل جاتا۔

لینا دوڑنا — چلیو! وہ اپنا مُنہ بھجولوں میں بسے ہوئے لحاف میں دبا لیتا۔ گویا لوگ اُسے ہی مارنے دوڑ رہے ہیں۔

اور گُتّے! گُتّے تو شیر تھے ان کا بس نہ تھا جو اُس کی گود میں لیٹ لیٹ کر بھونکتے اور بلیوں کو تو رات کے وقت کورٹ شپ کے لئے اسی کے کمرے میں آنا فرض تھا۔ اس کی "شی شی" اور "ہش" پر بلیاں مسکرا مسکرا کر اپنے عاشق بلوں کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھتیں اور اٹھلاتی ہوئی "ریاؤں" کر کے وہیں پر جاتیں۔ دو ایک دفعہ ڈرنے کے بعد اب وہ بھاگنا بے وقوفی سمجھتی تھیں۔

اور پھر ہوا! خاک پڑی ہر دراز اور جھید سے چنگھارتی ہوئی سیدھی اُسی کی طرف لپکتی اور اُس کے جسم میں ٹھنڈ کے انجکشن دینا شروع کر دیتی۔ سرسرکرتی دریا کی طرح اُس کے کانوں میں گرتی اور گردن میں سے پھسلتی ہوئی ٹھیک سینے پر جم جاتی۔ گرمیوں میں یہی ہوا ریت کے گرم گرم ذرے لا کر اُس کے جسم پر چنگاریوں کی طرح چپکاتی اور اُسے بھٹی میں سونے کا مزہ آجاتا۔ وائے موسم!

پر سب سے زیادہ دکھ دینے والی جو بات تھی وہ اُس کا موٹا پڑوسی تھا۔ سُرخ چقندر بڑی گھندار مونچھوں والا وہ آکر دھپ سے بیٹھ جاتا اور مونڈھا لبالب اُس کے جسم سے بھر جاتا۔

"کیسے ہو!" وہ بغیر پھولے ہوئے ہمیشہ ایک ہی لہجے میں کہتا!

اور پھر "بھابی ذرا پان تو دیجو ایک" وہ اُس کی بیوی سے فرمائش کرتا۔ مرجھائی ہوئی آدھی درجن بچوں کی ماں کا کھمبوں مالا گھتی رنگ کا چہرہ ذرا دیر کو مسکرا اُٹھتا۔

"کبھی دہی بڑے کھلاؤ نا۔" یا "بھابی آج تو مٹر پلاؤ کھا کر ہی جاؤں گا"

وہ دھنسی ہوئی تیمارداری کی عادی آنکھیں پھڑکنے لگتیں۔ ہونٹے جھک جاتے اور پھر وہ اُسے کچھ نہ کچھ چھینکے پر سے دینے یا کوئی اچار یا چٹنی چکھانے دوسرے برآمدے میں لے جاتی۔ وہاں سے اُس کی چپڑ چپڑ کھانے اور بیوی کے کھکھلانے کی آواز آنے لگتی۔

اس وقت فوراً اُسے یا تو رفع حاجت کی اشد ضرورت لاحق ہو جاتی یا پیاس اُٹھ کھڑی ہوتی یا اُس کے کسی نہ کسی حصۂ جسم کو دبنے یا مسلے جانے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی۔

اُس کے کئی بار پکارنے پر وہ جلی کٹی آتی۔ آنکھیں گھومی ہوئی اور چہرہ تنا ہوا گویا وہ قہقہے جو اُسے دیوانہ کئے دے رہے تھے کچھ دیر پہلے ان ہونٹوں سے نہیں گذرتے تھے بلکہ کہیں کسی اور ہی دنیا سے آئے تھے۔ وہ گھور گھور کر اُس کے منہ کو تکتا گویا وہاں کوئی چیز چپکی ہی تو رہ گئی ہوئی۔

پانی پیتے اور ہاتھ پیر مسلواتے مسلواتے وہ تھک جاتا مگر برآمدے میں بیٹھے ہوئے جبڑے ویسے ہی چکی کی طرح چلا کرتے۔ گویا انہوں نے اُس کی ہستی کو ہی چاب ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو!

وہ بیمار تھا تو کیا۔ دل تو مردہ نہ ہوا تھا۔

پر اس میں بیوی کا کیا قصور تھا۔ وہ تو جوان تھی اور رگوں میں خون دوڑ رہا

تھا اگر وہ کبھی جھوٹ موٹ کو ہی اُس سے کچھ کہتا تو وہ اینٹھ جاتی۔

"اُسے پسلو مجھے یہ چونچلے نہیں پسند!" اور اُس کا تنکے جیسا ہاتھ ہوا میں جھولتا رہ جاتا۔ کبھی انہیں چونچلوں کے مارے اس کا سینے میں گھڑی بھر دل نہ لگتا تھا۔ دن دن بھر وہ دونوں روٹھے رہتے اور [illegible] یہ ہاتھ کتنے شریر تھے! اور اس پڑوسن نے تو اُس کی جیسے ہی [illegible] دی تھی وہ خود [illegible] تو قمیص ہی [illegible] کھینچ دیتا اور بیوی جان جان کر [illegible] ہی پڑ جاتی۔ گو وہ چاہتی تو پرے سے الگ سے ہی [illegible] تو پڑوسی نہیں تو اس کا کرتا پاجامہ یا موزہ ہی اُس کی چھاتی پر موٹاپ [illegible] کو آن موجود ہوتا۔ اول تو تھا ہی کتنا خون جسم میں پر جو کچھ بچا [illegible] ہی سن سن کھولا کرتیں۔ اور اس کا جی چاہتا تھا اپنی سوکھی سوکھی انگلیوں سے موٹے پڑوسی کے جسم پر سے گوشت کی تہیں کی تہیں اکھیڑ ڈالے اور اوپر سے نمک مرچیں ملا کر اور اس وقت اس کی زبان کا مزہ [illegible] آ جاتا!

خاموش لیٹ کر وہ کسی کام میں مشغول بیوی کو دیکھتا! اُس کے تخیل میں اُسے صاف موٹے پڑوسی کی پرچھائیں نظر آتی۔ کاش وہ کسی ترکیب سے اس بدمعاش عورت کے خیالات کو قید کر سکتا! اُس کا بس چلتا تو اُسے سوچنے ہی نہ دیتا، پر وہ تو گویا خاموش طعنے سے دیتی تھی۔

تو بخار تو میرے خیالوں کی ڈور کو زیادہ بڑھا جاتا۔ بدگمانیاں بڑھتیں۔ اُسے اپنے سب بچے پڑوسی کی شکل کے معلوم ہونے لگتے۔ ویسی ہی ناچتی ہوئی آنکھیں، موٹے موٹے بدن، وہی گھومے ہوئے پاؤں اور سوجے ہوئے ٹخنے بالکل پڑوسی جیسے! اور وہ انہیں قریب بلا کر گھور گھور کر دیکھتا۔ [illegible] شک مٹتا کبھی اور جم جاتا اور وہ پاگل ہونے لگتا۔ اُس کا دماغ قلابازیاں کھانے لگتا۔ یہاں تک کہ اُسے بیوی کے پیٹ میں صاف صاف پڑوسی کی شکل کے بچے نظر آنے لگتے۔ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھتا اور اُسے قریب بلا کر گھورتا۔ او دھوبن بھی کتنی بے وقوف ہے۔ آخر ساڑھیوں میں اتنا کلف دینے کی کیا ضرورت ہے؟ انسان کا دھچا ہی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ انسان کتنا پھول جاتا ہے۔ خواہ مخواہ!

"دھوبن حرامزادی سے کہو اتنا کلف نہ [illegible] جھماتا۔

"کیوں؟ اب کلف اور ساڑھیوں میں بھی [illegible] خلل ہو گیا؟" وہ تنک کر جواب دیتی۔ ساڑھیوں میں تو اُس کا خلل ہے شک نہیں، پر آخر کیوں؟

اور بخار انگڑائیاں لیتا۔ اُس کی سوکھی ہنڈلیاں پھٹنے لگتیں۔ اور پھیپھڑے زخمی کبوتروں کی طرح پھڑپھڑاتے۔ کن پٹیاں پھڑکنے لگتیں۔ اُس کا جی چاہتا بیوی کی گردن پکڑ کر اتنی مروڑے کہ اُس کا زخرہ پھٹ جائے اور پھر اس کی ناک کاٹ ڈالے۔ ناک کاٹنا گو اب بالکل فیشن میں نہیں سمجھا جاتا پر اُسے تو ہر لمحہ تخیل کی دنیا میں بیوی کی ناک کاٹتے ہی گذرتا۔ وہ دیکھتا کہ اُس نے ناک کاٹ ڈالی ہے اور چاقو کی مہین نوک سے اُس کے چہرے پر باریک باریک چارخانہ کاڑھ رہا ہے۔ وہ چونک کر بیوی کے چہرے کو دیکھتا۔ بے شک اُس کے سارے منہ پر باریک باریک لکیریں نظر آتیں۔ لوگ کہتے تھے کہ پریشانی کی وجہ سے پڑ گئی ہیں، پر وہ خوب جانتا تھا اور دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ یہ وہی لکیریں تھیں جو وہ چاقو سے اپنے تخیل کی دنیا میں کاڑھا کرتا تھا۔

رات کو بخار نئی قلابازی لگاتا۔ کوئی ٹکڑا جسم کا یخ ہو جاتا اور کوئی انگارے کی طرح بھبکا کرتا۔ آنکھیں جلتیں تو ناک برف کی ڈلی ہو جاتی اور ہتھیلیاں سلگتیں تو پنجے گلنے لگتے۔ گلے میں جیسے کوئی دہی بلو رہا ہے۔ کنپٹی سُن ہو جاتی۔ ڈاکٹر ٹٹول ٹٹول کر اُس کے جسم پر گوشت کی بوٹیوں میں سوئیاں لگاتا تھا۔ کولھوں میں گٹھلیاں پھانسوں کی طرح چبھتیں۔

ذرا آنکھ لگی اور جیسے کسی نے ہزاروں روئی کے گٹھر کے گٹھر اُس پر کھول کر بکھیر دیئے اور وہ سسکیاں لے لے کر اُس میں ڈبکیاں لگاتا۔ ہاتھیوں کی وضع کے جانور اُس کے سینے پر کودتے اور پنڈلیوں میں جیسے کوئی دُرّے لگا رہا ہے۔ پلنگ کے نیچے سے سینکڑوں سوکھے بے گوشت ہاتھ اُس کی طرف بڑھتے۔ اس کی کن پٹیوں پر مہین مہین غیر انسانی انگلیاں رینگتیں۔ خواب میں اس کے کل مردہ عزیز ہاتھ پھیلا پھیلا کر اُسے بلاتے۔ بوڑھی دادی اپنا ڈگڈگاتا ہوا سر ہلا کر اُسے پھسلاتی مگر وہ بڑی خوش اسلوبی سے ان لوگوں کو ٹال کر صاف لوٹ آتا۔ کہتے ہیں کہ خواب میں اگر کوئی مردہ عزیز بلائے اور اس کے ساتھ چلے جاؤ تو فوراً مر جاتے ہیں! وہ ان روحانی چالوں کو خوب جانتا تھا اور کوئی اُلّو نہ تھا جو چکر میں آ جاتا۔ آخر کیوں مرتے وہ؟ وہ انتقاماً جی رہا تھا۔ لوگوں کو کیوں آخر اُس کی موت کی امیدیں لگی ہوئی تھیں؟ نہیں مرتا وہ! پھر؟ کسی کو کیا؟

وہ لوگوں کے سامنے اور اکڑ کر لیٹتا۔ کوئی ذرا سی بھی بات ہوتی تو بہادر اور چھبیلے مزاج والے جوانوں کی طرح کڑک کر بولتا۔ لوگوں کے ہمدردی سے افسردہ چہروں کو دیکھ کر وہ سُلگ اُٹھتا۔ جی چاہتا کہ اُن کی کھوپڑیوں کو کچل دے۔ جوں جوں وہ اپنے کو تندرست دکھاتا لوگ متفکر ہوتے جاتے۔

"سنبھالے رہئے!" وہ سر ہلا ہلا کر کہتے۔

لوگ اُسے جانے کیا سمجھتے تھے۔ کبھی وہ بھی دن تھے جب کنبے رشتہ کی ساری کنواریاں اُس سے بچائی جاتی تھیں، جیسے وہ انہیں کھا ہی تو جاتا۔ اور وہ لڑکیاں بھی تو اُسے دیکھتے ہی تلملا اٹھتیں۔ اُن کے چہرے تمتما

اُٹھتے اور جو کام کرتی ہوتیں وہ اُن کے ہاتھ سے چھوٹ پڑتا۔ بھاگتیں تو فوراً گر پڑتیں، مُنہ ڈھانکنا چاہتیں تو دوپٹہ ہی اُتر جاتا اور وہ بے بس اُس کے رحم و کرم پر رہ جاتیں اور وہ تھا بھی بڑا رحم دل!

اتنی ڈھیر سی لڑکیاں اُس سے شرماتی تھیں کہ وہ کچھ فیصلہ بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ کبھی منجھو پر وہ "مرجاتا"۔ کبھی جاتی اُس کے دل کا ٹکڑا بن جاتی اور کبھی اِن سب کو مع اِس پرہوس دنیا کے وہ چھوڑ کر منّی کا پجاری بن جاتا۔ اور پھر کبھی ایک دم سے گڑ بڑا کر وہ سب پر ایک دم ہی ٹوٹ پڑتا!

پر اب تو عرصہ سے اُس سے شرمانا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ مہترانی بی جوان بہو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے باتیں کر لیتی جیسے وہ کوئی بلّی یا چوہا ہے۔ اور منجھو جن سے قریب قریب آدھی منگنی ہو گئی تھی اور شادی سے پہلے اُس کے آنے کی خبر سُن کر اُن پر ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ مزے سے بیٹھی اپنے بچّے کو اُس کے سامنے ہی دودھ پلایا کرتی۔ اور جاتی اپنی پوشیدہ بیماریوں کا ذکر اُس کے ڈاکٹر سے اُسی کے سامنے گھنٹوں کرتی۔ لوگ اُسے خطرے کی حدوں سے باہر کر چکے تھے۔ اُس کی زندگی کے بہترین زمانے کو ناعاقبت اندیشی کا زمانہ کہہ کر معاف کر چکے تھے۔

ایک دفعہ اُس نے چاہا کہ ان لوگوں کے ذرا ہوش ٹھکانے کر دے اور وہ نوجوان ماما کو دیکھ کر کچھ بڑبڑایا۔ پھر وہ ہنسنے لگی۔

"اُے ہے بھیّا کا بخار بہت ہی چڑھ رہا ہے"۔ وہ اٹھلاتی ہوئی چل دی سب اُسے بھیّا کہنے لگے تھے۔ جب سے وہ بیمار پڑا تھا لوگ بن بن کر اُسے جلاتے تھے۔ یہاں تک کہ اُس کا بوڑھا چچا تک اُسے "بھیّا" کہہ کر پکارتا تھا۔ بڈھا اینٹھتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ وہ اُس کے اتنا بھی نہیں جینے کا اور بہت جلد دوسری دنیا کو کوچ کر جائے گا۔ ہونہہ! لوگ آس لگائے لگائے مر جائیں گے مگر وہ ضد میں نہیں مرے گا۔ وہ جئے گا! جئے جائے گا! خواہ کتنے ہی لرزے چڑھیں، پھیپھڑے دُکھیں پڑوسی آئیں اور بیوی مسکرا مسکرا کر اُن کے سڑاندے موزے سلتے پر وہ جئے گا۔ خواہ اُس کے سب بچّے پڑوسی کے ہم شکل ہو جائیں۔ سب پڑوسی سے ملنے لگیں اُس کے بھائی ماں باپ بہن سب پڑوسی کی طرح آنکھیں مٹکائیں اور پاؤں گھما لیں ٹخنے سو جائیں پر وہ جئے گا۔ انتقاماً جئے گا! یہ تو ہونے سے رہا کہ وہ لوگوں کے اطمینان کو مر جائے۔

وہ دیکھتے ہی انسان کو بھانپ جاتا۔ وہ اپنے عیادت کرنے والوں کے چہروں کو غور سے دیکھتا۔ اگر اُن پر افسردگی چھائی ہوتی تو وہ بگڑ جاتا۔ یہ سب منحوسوں کے چہرے ہوتے اور وہ انہیں جلے کٹے جواب دیتا۔ جو لوگ مریض کا دل خوش کرنے کو ذرا مسکرا کر آتے انہیں وہ مکّار سمجھتا۔ وہ اُسے اُلّو سمجھتے تھے کیا؟ وہ گھر سے ہی اُسے "بس اب اچھے ہو جاؤ گے" "اللہ نے چاہا جلد شفا ہو گی" جیسے جملے سنانے آتے تھے اور ایسے لوگوں کے نازک معاملات پر وہ گفت و شنید شروع کر دیتا۔ اُن کے چہروں سے مسکراہٹ اُڑ جاتی۔ اور وہ بدحواس ہو جاتے اور جو اگر کسی کے چہرے سے کچھ بھی نہ ظاہر ہوتا تو وہ اُسے پکا اُلّو سمجھ لیتا۔ وہ اُسے عجیب و غریب طریقوں سے نقصان اٹھانے، ذلیل ہونے، لٹھ بازی کرنے اور مقدمہ چلانے کے فوائد سمجھایا کرتا یہاں تک کہ عیادت کو آنے والے کے چہرے پر وحشت اور جنون کے تسلّی بخش آثار نظر آنے لگتے۔ تب وہ اطمینان سے ہنستا اور "آؤ گے؟ خواہ مخواہ!" وہ دل ہی دل میں اس سے پوچھتا۔

جتنے ڈاکٹر آتے بدمزہ سے بدمزہ دوا تجویز کرتے اُس کے سینے پر مالش کرانے یا انجکشن لگانے کے بہانے اُس کی بیوی کی فضول مدد کے خواستگار ہوتے۔ وہ بے بات بھی اُس کی انگلیاں ٹٹولتے اور خون کی کمی وغیرہ کے بہانے اُسے مرغن کھانے اور لذیذ دوائیں کھانے کو بتا جاتے۔ کوئی ہی ایسا ڈاکٹر ہو گا جس نے فوراً بیوی کے لئے نسخے پر نسخہ نہ لکھ دیا ہو!۔ وہ انہیں موٹی موٹی گالیاں دیتا اور کل بیوی کے نسخے پھاڑ ڈالتا۔ اُس کا بس نہیں تھا کہ مٹھی بھر اپنے جراثیم پھانک کر پلا دیتا۔

کبھی وہ بھی زمانہ تھا کہ یہی بیوی اُس کے جنم مرن کی ساتھی بنی تھی اور سنگ میں جان دینے کے وعدے کر چکی تھی پر اب جراثیم کے ڈر سے فینائل سے ہاتھ دھوتی اور سوڈوں سے غرارے کرتی تھی۔ کتنی گہری خلیج دونوں میں حائل ہو گئی تھی۔!

اور پھر بخار چڑھتا۔ پھیپھڑے پھولتے گلے میں گاڑی سی چلتی، ہڈیاں چٹختیں اور وہ جسمانی اور روحانی دکھوں میں ڈوب جاتا!

عِصمت چغتائی

شعر

بادل بادل بجلی بجلی
بادہ گساراں! بادہ گساراں!

فراق گورکھپوری

ناگ سبھا کا ناچ

ناگ راج سے، ناگ راج سے ملنے جاؤں آج،
ناگ راج ساگر میں بیٹھے سر پر پہنے تاج،
ناگ راج کی سبھا جمی ہے خوشبوئیں لہرائیں،
بہتی، رکتی، الجھتی جاتی، من کو مست بنائیں،
چندرماں کی کرنیں آئیں، بل کھائیں، — بل کھائیں،
ننھے ننھے، ہلکے ہلکے، میٹھے گیت سنائیں۔
گاتے گاتے تھکتی جائیں، سوئیں سکھ کی نیند۔
انگ انگ میں ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی نیند!
کچھ لمحے یوں بیتیں، اور پھر سنکھ بجائے ناگ۔
وحشی اور بے باک، انوکھے نشے لائے ناگ۔
سوئی کرنیں جاگ اٹھیں اور ناچیں سندر ناچ،
دیوداسی یاد آجائے، ہاں — اور مندر — ناچ!
ناگ سبھا کا ناچ انوکھا، سارا ساگر ناچ!
میرا من بھی بنتا جائے دیکھ دیکھ کر ناچ!

میراجی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

ادارہ اس شمارے میں جائزۂ نثر کی عدم اشاعت کے لئے معذرت چاہتا ہے اور اس کی وجہ صلاح الدین صاحب کی علالت ہے۔ امید ہے کہ آئندہ مہینے اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

میراجی

اجنبی عورت

ایشیا کے دُور افتادہ شبستانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں۔
کاش اک دیوارِ ظلم
میرے اُن کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ عماراتِ قدیم
یہ خیاباں، یہ چمن، یہ لالہ زار،
چاندنی میں نوحہ خواں،
اجنبی کے دستِ غارت گر سے ہیں!
زندگی کے ان نہاں خانوں میں بھی
میرے خوابوں کا کوئی روماں نہیں۔
کاش اک "دیوارِ رنگ"
میرے ان کے درمیاں حائل نہ ہو!
یہ سیہ پیکر، برہنہ راہرو
یہ گھروں میں خوبصورت عورتوں کا زہرِ خند
یہ گذرگاہوں پہ دیوآسا جواں
جن کی آنکھوں میں گرسنہ آرزوؤں کی لپک
مشتعل، بیباک مزدوروں کا سیلابِ عظیم!
ارضِ مشرق! ایک مبہم خوف سے لرزاں ہوں میں
آج ہم کو جن تمناؤں کی حرمت کے سبب
دشمنوں کا سامنا مغرب کے میدانوں میں ہے۔
اُن کا مشرق میں نشاں تک بھی نہیں!

سالنامہ ادب لطیف سالنامہ ۱۹۴۳ء ——— ن۔م۔ راشد

ن۔م۔ راشد کی اس نظم کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن اس کے الفاظ کو بھول جاتا ہے سب سے پہلے میں دل سے شاعر کے براہ راست مفہوم کو نکال دیتا ہوں۔ میرا تخیل یک دم مغرب کے موجودہ ہنگامہ زار میں جا پہنچتا ہے۔ جہاں انگلستان کے وہ باشندے موجود ہیں جو امن پسندی اور جمہوریت کے علمبردار بنتے تھے لیکن آج جن کی تہذیب و تمدن کے گہوارے تباہ کاری کے خرابے بن گئے ہیں اور جنہیں اپنے آدرش کی حفاظت کے لئے مغرب کے میدانوں میں دشمنوں کا سامنا ہے۔ یہاں تک سوچ لینے کے بعد میں پھر ایشیا میں آپہنچتا ہوں۔ اب میرا ذہن اس نظم کے شاعر کے ذہن سے ہم آہنگ ہے۔ مغرب کی سمت کا یہ ذہنی سفر میں نے اُس نفسیاتی پیچ کی بنا پر کیا ہے جو شاعر نے نظم کے آخر میں رکھا ہے۔ بین الاقوامی حالات کا یہ تاثر اجنبی عورت کے ذہن میں قائم کرنا ایک بعد کی چیز ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ سوچتے ہیں کہ شاعر کو اس نظم کی تحریک کیونکر ہوئی۔ آج یعنی موجودہ جنگ سے پہلے بھی ہم مغرب کی کئی عورتوں کو راستہ چلتے یا اور کئی مقامات پر اپنے ہی ملک میں دیکھتے تھے لیکن وہ ہمارے لئے صرف ایک حاکم قوم کے نسائی پہلو کا مظہر تھیں۔ یا اگر ہمارے جنسی جذبات انہیں دیکھ کر برانگیختہ ہو جائیں تو اُس صورت میں

وہ ایک ناممکن الحصول قسم کی عورت بن جاتی تھی۔ جسے دیکھ کر بجنوری جیسا شاعر اُسے "صنمِ فرنگ" پکار سکتا تھا لیکن اب ہم سیاسی طور پر ترقی پا چکے ہیں۔ ہمارا نفسی شعور بین الاقوامی حالات کے لحاظ سے ہمیں پہلے مسائل کو ایک نئی روشنی میں محسوس کرا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نظم کا شاعر جب ایک مغربی عورت کو دیکھتا ہے تو بجنوری کی طرح یہ نہیں کہتا ہے کہ تیرے عشق میں ہوں میں مبتلا بلکہ اس کا ذہن ایک اور ہی ڈگر پر چل کھڑا ہوتا ہے وہ اپنے احساسات میں ڈوب جانے کی بجائے اس عورت کے خیالات پر غور کرنے لگتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اس وقت اس عورت کا اندازِ نظر ہماری ذات ہمارے حالات اور ہمارے ملک کے متعلق کیا ہوگا۔ اور یوں وہ اپنی ہستی کو چھوڑ کر ذہنی طور پر اس اجنبی عورت کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ عورت ایک ایسی روح ہے، نسائی روح جو مغرب کے جنگی ہنگاموں سے تنگ آکر اگر مادی طور پر مشرق میں نہیں آن پہنچی تو کم از کم روحانی لحاظ سے ہماری سرزمین کی طرف ضرور مائل ہے۔ اُسے اپنے ملک میں تسکین حاصل نہیں وہ اپنے ماحول کے دوزخ سے نکل کر کسی ایسی خیالی جنت میں پہنچ جانا چاہتی ہے۔ جہاں امن و آسائش ہو، جہاں راحت اور مسرت ہو اور اسی جستجو میں وہ مشرق کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس کا نسائی ذہن سوچتا ہے کہ مشرق کی حرم سراؤں میں اس کا مطلوبہ آرام مل سکتا ہے۔ مغرب میں اُسے اپنی زندگی کشمکش سے پُر نظر آتی ہے، امن کی حالت میں بھی اور جنگ کی حالت میں بھی۔ ایشیا کے دور افتادہ شبستان اُسے لبھاتے ہیں۔ لیکن وہ سوچتی ہے کہ ان شبستانوں کی پابند اور غیر انفرادی زندگی میں اُسے تسکین حاصل نہیں ہو سکتی ان حرم سراؤں کی خواب گاہوں میں اُس کا آدرش نہیں مل سکتا۔ ان میں اُس کے خوابوں کا کوئی رومان نہیں۔ ان کے اور اُس کے درمیان ایک ظلم کی دیوار حائل ہے۔ یہ ظلم حرم سراؤں کی پابند زندگی ہے۔ حرم سراؤں سے نکل کر اس کا تصور مشرق کی اور دلکش چیزیں پیش کرتا ہے۔ قدیم عمارتیں، خیاباں، چمن، لالہ زار جہاں کے تہہ خانوں میں بیٹھ کر ایک زمانہ گزرا کہ ان کے بنانے والے زندگی کا لطف حاصل کرتے تھے۔ لیکن رات کی چاندنی میں ان اجڑے ہوئے مقامات اور کھنڈروں کا نقشہ اُسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نوحہ کر رہا ہے، اُس غارت گری کا نوحہ خواں ہے جو اجنبی حملہ آوروں نے ان آثارِ قدیمہ سے روا رکھی، اس لئے ان میں بھی اُسے اپنے خوابوں کا کوئی رومان نظر نہیں آتا۔ اُس کا آدرش یہاں بھی غیر موجود ہے۔ اب اُس کا تصور پھیلتا ہے اور وہ موجودہ مشرق پر غور کرتی ہے۔ یہاں کے سیاہ رنگ انسان، مفلس انسان، یہاں کی گھروں میں قیدی عورتیں، جو خوبصورت ہیں لیکن ہنستی ہیں تو ان کی ہنسی بھی دل کی نہیں ہوتی۔ یہاں کے رستوں پہ چلتے ہوئے قوی ہیکل جوان جن کی نگاہیں اُن کے دل کی حالت کو عریاں کئے دے رہی ہیں، یہاں کے مشتعل مزدوروں کا انبوہ ــــ اس تمام مختلف بکھری ہوئی انسانیت میں اُسے اُس تمنا کا عکس بھی نظر نہیں آتا جو اُس کے اپنے دل میں ہے۔ جو اُس کے ہموطن افراد کے دل میں ہے۔ یہ تمنا امن و راحت اور جمہوریت کو تباہی سے بچانے کی تمنا ہے۔ اس اجنبی عورت کے خوابوں کا رومان جو نظم کے شروع میں ایک انفرادی چیز تھا نظم کے آخر میں پہنچ کر اجتماعی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ آغاز میں شاید صرف اُس کی ذات ایک آرام کی جگہ تلاش کرنا چاہتی تھی لیکن انجام میں پہنچ کر اُس کے خوابوں کا رومان ایک نئی چیز بن جاتا ہے، ایک توقع جو مغرب کے رہنے والوں کو مشرق سے تھی اور اب بھی ہے لیکن اُس کے پورا ہونے میں اب مشرق کی طرف سے ایک جھجک دکھائی دے رہی ہے۔ اس جھجک کی وجوہات شروع سے لے کر آدھی نظم تک بیان کی گئی ہیں۔ جن تمناؤں کی حرمت کے سبب مغرب کے رہنے والے دشمنوں کا سامنا کئے بیٹھے ہیں اُن کا عکس مشرق میں کیونکر نظر آسکتا ہے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک دیوارِ ظلم حائل ہے۔ ایک دیوارِ رنگ حائل ہے۔ اور اس حقیقت کو جان کر یہ اجنبی عورت شاعر کو ایک مبہم خوف سے لرزتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مہمانداری

پھیل ہے فضاؤں میں خوشی میری نظر کی
ہنستی نظر آتی ہیں فضائیں میرے گھر کی
دل شاد مرے اہل و عیال آج بہت ہیں
مصروف ہیں وہ بھی، نہیں مصروف فقط میں
رکھی ہے سلیقے سے ہر اک کام کی چیز آج
مہمان مرے گھر میں ہیں کچھ میرے عزیز آج
شادی کا مکاں گھر مرا معلوم نہ ہو کیوں!
مجمع ہو جب اتنا تو بھلا دھوم نہ ہو کیوں؟
بھائی بھی ہیں بہنوئی بھی بھاوج بھی بہن بھی
بیٹھا ہے بھتیجا بھی، بھتیجے کی دلہن بھی
بچی اک ادھر بیٹھ کے تکتی ہے دلہن کو
کچھ طفل سناتے ہیں ادھر اپنی بہن کو
بچوں پہ جھلک خاص ہے تنویرِ سحر کی
اُٹھ بیٹھے ہیں سب سنتے ہی آوازِ گجر کی
دلکش یہ فضا صبح کی مایۂ نور کا تڑکا
بلبل کی طرح بول رہا ہے کوئی لڑکا

بزمِ ادب

موجودہ نمبر کے افسانوں میں ایک دلکش تنوع پایا جاتا ہے۔ جناب صدیقی کا ایک خط لطفِ زبان کے اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوع اگرچہ نیا نہیں لیکن اندازِ بیان اچھوتا ہے جب سے ہمارے ہاں افسانہ نگاری کے جدید اسلوب کا رواج ہوا ہے۔ اس نوع کی چیزیں بہت کم شائع ہوئی ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ ناظرین کو اس کے مطالعے سے کچھ بھولے ہوئے مزے یاد آجائیں گے۔

دیویندر ستیارتھی صاحب کا افسانہ برہمچاری ہماری معاشرت کے جنسی پہلو کا ایک لطیف اور بے باک مطالعہ ہے۔ اس کہانی کی خوبی یہ ہے کہ کرداروں کو کسی قسم کی حرکت دینے یا افسانے میں بحران پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مگر اس کے باوجود کہانی کی زندگی اور حرکت میں کوئی فرق نہیں آیا اور افسانہ نگار کا مرکزی تأثر پڑھنے والے پر اسی طرح چھا جاتا ہے، جیسے کسی جاندار ڈرامے کا انجام۔ ستیارتھی صاحب کے محبوب دیہاتی گیتوں نے ان کا پیچھا یہاں بھی نہیں چھوڑا بلکہ ہمیں تو شک گذرتا ہے کہ انہوں نے ان کشمیری گیتوں ہی کے تانے بانے پر اس دلکش افسانے کی زندگار شال تیار کی ہے۔ بہر حال دیکھنے کی چیز ہے۔

اُپندر ناتھ صاحب اشک کی کہانی بینگن کا پودا ان تجربات کے سلسلے کی ایک نئی کڑی ہے جو ہمارے بعض نوجوان افسانہ نگار علامیت (سمبلزم) کے میدان میں کر رہے ہیں۔ اشک صاحب جیسے مشاق افسانہ نگار کے لئے کسی نئی ٹکنیک کو اپنانا کچھ مشکل نہیں ہونا چاہئے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے اس تجربے میں کچھ ایسے ناکام نہیں رہے۔ لیکن ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں اس سے بہتر چیزیں لکھ سکتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔

میرا جی کا مضمون امریکہ کا تخیل پرست شاعر ان کی شعر و شاعری کی تنقید کے سلسلے کا ایک اہم اور وزن دار حلقہ ہے اور ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ ان کی وسعتِ مطالعہ اور شدتِ تفکر کا ایک شاندار نتیجہ ہے۔

ایڈگر ایلن پو کو انگریزی ذوق ایک ممتاز افسانہ نگار کا مختصر افسانہ نویسی کے موجد کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اس کی شاعری بھی کچھ کم دلچسپ نہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی غیر معمولی شخصیت اور اس کے تصورات اس کی افسانہ نگاری کو بھی نثر سے ہٹا کر شعر کے قریب لے جاتے ہیں۔ ادب پر اپنے اثرات کے لحاظ سے اس کا درجہ اور بھی بلند ہے کیونکہ اس کے فرانسیسی مداحوں کے ذریعے سے نہ صرف یورپ کے تمام ممالک پر اس کے نظریات کا اثر ہوا بلکہ اُسے ادب کی اُس تحریک کا بانی تسلیم کیا گیا جسے یورپ کے نقاد تحریکِ انحطاط کا نام دیتے ہیں۔ اس تحریک کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ فرانس کے مشہور شاعر چارلس بادلیئر اور سٹیفن میلارمے اس کے حامی اور پیرو تھے۔

میرا جی نے پو کی بعض نظموں کو جس انداز سے اردو کا جامہ پہنایا ہے وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔

صلاح الدین احمد

(۲)

اردو شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ذکر اس صفحے پر ایک سے زیادہ دفعہ آچکا ہے — ان بدلتے ہوئے رجحانات کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ پہلا دور ختم ہوا، اب ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ لیکن پہلے دور میں ہر بات محدود تھی، اصنافِ سخن مقرر تھیں، موضوعِ شعری کا ایک معین دائرہ تھا، اور اس کے ساتھ ہی ذہنی افق بھی ایک ہی رنگ کا حامل تھا — نئے دور میں جہاں موضوعاتِ شعری میں وسعت ہوئی اور اصنافِ سخن میں بھی نئے نئے بُت ڈھالے جانے لگے وہاں ذہنی افق بھی رنگارنگ جلووں سے نگاہوں کو لبھانے لگا — ضرورت اب اس بات کی ہے کہ موجودہ اردو شاعری کے مختلف رنگوں اور اُن اثرات پر نقاد اپنے قلم کو مائل کریں اور اس وضاحت سے تحسین و ستائش اور نقد و نظر کے باب کو صحیح بنیادوں پر کھڑا کریں۔

موجودہ شمارے میں مختار صدیقی کی "ایک تمثیل" میں بظاہر بیا اور موت کی اس حالت سے تحریک شعری ہوئی ہے کہ — پہلا دور ختم ہوا،

اور نئے دور کا آغاز ہے۔ لیکن اس خیال یا احساس کی ادائیگی میں ناگوار اور دلکش رنگوں کی جو آمیزش کی گئی ہے، اس کا نفسیاتی پہلو بھی غور کے لائق ہے بیاہ اور موت کے واقعے ایک ایسی چوکھٹ کے مانند سے ہیں کہ اس پر کھڑے ہو کر فن کار نے جو منظر پہلے خود دیکھا ہے اور پھر ہمیں دکھایا ہے۔ وہ ہیئت کی پابندی اور لغت کی قدامت کے باوجود ایک ایسے "تعجب" کا اظہار کر رہا ہے جو ہمیں ناپسندیدگی اور رغبت کی ایک ایسی الجھن میں جکڑ لیتا ہے جس کا زور اور جس کی قوت اذیت پرستی اور الم پسندی میں نہاں ہے۔ نظم کی تحریک کا باعث ایک شعر ہے۔ اور اُس شعر سے جس خیال کو انگیخت ہوئی ہے اگرچہ اس کا اظہار دوسرے حصے (چوتھی چلے) میں ہے لیکن اس کے آثار پہلے حصے میں ہی ظاہر ہوئے ہیں۔ "باغِ مصفّٰی"، "حجلۂ خلد نشاں" اور آخر میں "گلشن جنت" — اگرچہ سب کے سب خوشگوار تصوّرات کے حامل ہیں لیکن ان کا تعلق حیات بعد الممات ہی سے ہے۔

امریکہ کے تخیل پرست شاعر ایڈگر ایلن پو کی نظر میں دنیا کا سب سے زیادہ شعریت سے لبریز موضوع ایک حسین عورت کی موت ہے، اس نقطۂ نظر سے بھی اس نظم کو دیکھا جا سکتا ہے — ہاں، ایک بات کا خیال رہے ممکن ہے اس نظم کی تمثیل دہری ہو، اس لئے ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ موت کی تمثیل بیاہ ہے یا بیاہ کی تمثیل موت۔

"عشق گریزاں" میں قیوم نظر اپنی استعارہ پرستی کا اظہار کر رہا ہے۔ خواہ آپ پروانے کو پروانہ سمجھ لیں خواہ اس پردے میں اپنا عکس دیکھیں نظم دونوں طرح لطف دے جائے گی۔ لیکن یہ فن کار کا کمال ہے۔ آپ کا کمال یہ ہوگا کہ پروانے کو محض پروانہ نہ سمجھتے ہوئے مفہوم میں ایک گہرائی پیدا کر لیں۔

"سرد ہو چکی محفل" — ان تینوں لفظوں میں پروانے کا مکمل ماحول ہے — اور اس گرد و پیش کا تاثر فن کار کے لئے خیال انگیز بن جاتا ہے۔ شاید بے حرکت فضا سے اُس کو الجھن ہو رہی ہے۔ وہ اس الجھن کو مٹانا چاہتا ہے۔ الجھن کیسے مٹے؟ — بے حرکت فضا تو اُس کی اپنی "بے عملی" کا ایک عکس ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو کیا بُرا بھلا کہے؟ — وہ اپنی ہستی کے بے عمل پہلو کو پروانے کی صورت میں دیکھنے لگتا ہے۔

لیکن عزیز احمد "پیارے چاند" کو دیکھ رہا ہے تکتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی رات کا ماحول قیوم نظر کی رات کی طرح محفل تک محدود نہیں (اگرچہ وہ محفل ہی کا رنگ ہو ہستی کی وسعت کو ظاہر کرتی ہے) — عزیز احمد کی جاگتی ہوئی، سوتی ہوئی، کھوئی ہوئی رات ہے۔ بلند و پست پہ چاندنی کی برکھا ہو رہی ہے۔ لیکن جی اُداس ہے، دل چاہتا ہے کہ یہ برکھا براہِ راست اُس پر اثر کرے۔ اس اُداسی کو دور کر دے۔ تمام نظم میں چاندنی کی لطافت ہے، الفاظ اور بحر کا ترنّم ہے — لیکن ایک بات کا خیال رہے شاعر کی اداسی جنسی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کا الم مبہم ہے، تمام نظم میں کوئی سراغ ایسا نہیں جو ہمارے ذہن کو کسی عورت کی طرف لے جا سکے۔ اور اس لئے یہ نظم خالصتاً فطرت پرستی کے احساس کی نمائندگی کر رہی ہے۔

آسمان کی اس لطیف فضا سے علی احمد ہمیں زمین ہی کا ایک لطیف منظر دکھاتا ہے: "گرما کی دوپہر کا ایک رومان" — گرما اور پھر اس کی دوپہر — اس میں کیا لطافت ہوگی جس کے تصور ہی سے کثافت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ فن کار کا کمال ہے جو اس پسینہ لانے والی فضا میں بھی ایک حسینہ کے نرم و نازک بیان میں کچھ ایسا گم کرتا ہے کہ گرمی کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔

"گرما" سال کے ایک حصے کا نام ہے۔ وقت کا ایک معمولی سا ٹکڑا، لیکن یوسف ظفر "عکس" کے عنوان سے ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا ذکر کر رہا ہے۔ تصوّرات کی آمیزش اور ترتیب سے اُس نے احساس و خیال کو تحریک دی ہے۔ اور یہ تحریک کہاں تک کامیاب ہے اس کے متعلق اس وقت کچھ کہئے گا جب نظم کو پڑھنے کے بعد آپ کا ذہن بھی شاعر کے ذہن سے ہم آہنگ ہو کر تین زمانوں کے تانے بانے میں کھو کھو جائے۔

شاعری کی ریل گاڑی یوں مختلف منزلوں سے چلتی ہوئی شملے کی طرف جا نکلتی ہے جہاں ضمیر جعفری نے خوب خوب مزے لے کر خلوت کے مناظر کو جلوت کے مناظر بنایا ہے۔

میراجی

آئینہ عالم

مصر اور برطانیہ کے تعلقات

برطانوی وزیر اعظم لارڈ سالسبری عام طور پر کہا کرتے تھے کہ "خدا نے افریقہ کو یورپ کی وزارت ہائے خارجہ کی زندگیوں کو تلخ کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔" افریقہ سے ہمیشہ ان کی مراد مصر ہوا کرتی تھی اور مصر ہمیشہ یورپ کی دو بڑی طاقتوں فرانس اور برطانیہ کے مابین کش مکش کا موجب رہا ہے۔ آخر برطانیہ کو مصر میں زیادہ اقتدار حاصل ہو گیا لیکن اس اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے اسے ہمیشہ بے شمار پریشانیوں اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جس کی ہلکی سی جھلک صرف اسی بات سے ظاہر ہے کہ مصر پر برطانوی قبضے کے پہلے چالیس سال کے دوران میں ہی اسے چھیالیس اعلان کرنے پڑے جس میں اس نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا کہ حکومت برطانیہ اس وقت مصر کو اپنے تصرف سے آزاد کر دے گی جب یہاں خدیو کی پوزیشن مستقل ہو جائے گی اور سارا ملک منظم ہو جائے گا۔"

مصر مغربی طاقتوں کے لئے ہمیشہ جاذب نگاہ رہا ہے۔ اسے پرانے زمانے میں بھی مشرق کی کنجی تصور کیا جاتا تھا۔ مختلف حکومتوں نے مثلاً پہلے اٹلی اور پھر فرانس اور برطانیہ نے مشرق کے ساتھ اپنی تجارت کو مضبوط کرنے کے لئے بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کو ایک نہر کے ذریعے سے ملانے کے کئی منصوبے باندھے نپولین نے بھی اپنے زمانے میں یہی خواب دیکھا اور اس مجوزہ نہر کو بنانے کی کوشش کی۔ وہ اس غرض کے لئے مصر میں آیا بھی تھا۔ بعض اطلاعات کی بنا پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مصر کی رائے عامہ کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو لیکن اس امر سے انکار نا ممکن ہے کہ مغرب مصر کو مشرقی ممالک میں سب سے زیادہ اہم خیال کرتا تھا۔ یہ تو اس وقت کی بات ہے جب نہر سویز ابھی معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس نہر کے بننے کے بعد تو مغربی اقوام بالکل دیوانی سی ہو گئیں اور انھوں نے اس ملک کو اپنی "سرپرستی" میں لینے کے لئے جو جو کوششیں کیں وہ ارباب بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

برطانیہ کو مصر کے ساتھ پرانے وقتوں سے دلچسپی ہے اور اس گہری دلچسپی کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب اس نے سلطنت عثمانیہ کے امور میں جس کے ماتحت مصر ۱۵۱۷ء سے آ رہا تھا دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں کہ انیسویں صدی میں مصر کے گورنر محمد علی پاشا نے ترکی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ ترکی نے روس کی مدد سے اس فتنے کو دبانے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ آخر سات سال بعد برطانیہ نے دونوں میں صلح کرا دی محمد علی کو ترکی حکومت کے ماتحت کسی قدر آزادی سی حاصل ہو گئی اور مصر پر ترکی کا اقتدار برائے نام رہ گیا۔ یہ ۱۸۴۱ء کی بات ہے۔ اس وقت سے برطانوی اقتدار مصر پر برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ بالآخر ترکی کی بجائے برطانیہ اس کا "آقا" تصور کیا جانے لگا۔ برطانوی اقتدار کا اعلان اس وقت تک نہ کیا گیا جب تک ترکی نے گزشتہ جنگ میں برطانیہ کے خلاف اور جرمنی کی حمایت میں جنگ میں شرکت نہ کی اور معاہدہ لوزان کی رو سے جو ۲۳ جولائی ۱۹۲۳ء کو ہوا مصر پر ترکی کے آئینی حقوق کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اب ہم ایک بار پھر انیسویں صدی کے آخری ربع میں جاتے ہیں جب ۱۸۷۴ء میں گلیڈسٹن کے بعد ڈسرائیلی نے برطانیہ کی وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا۔ گلیڈسٹون اور ڈسرائیلی میں بہت فرق تھا۔ اور یہی فرق ڈسرائیلی کے وزیر اعظم بننے کا موجب ہوا گلیڈسٹن اس بات کا خواہش مند تھا کہ برطانیہ میں مزید اصلاحات نافذ کی جائیں اور امن کی حکمت عملی پر کاربند رہا جائے لیکن برطانوی سیاست داں یہ چاہتے تھے کہ برطانیہ کو اس چھوٹے سے جزیرے کے باہر بھی قدم رکھنا چاہئے اور وہ کسی ایسے آدمی کے جویاں تھے جو نو آبادیات حاصل کرنے کی پالیسی کا حمایتی ہو۔ ڈسرائیلی نے ان کی آرزوؤں کو پورا کیا۔

ان ہی دنوں ایک واقعہ پیش آیا۔ خدیو مصر سویز کے حصے جو اس نے خود خریدے تھے بیچنا چاہتا تھا۔ سویز اور مصر کو چونکہ مشرق کی کنجی سمجھا جاتا تھا اس لئے یورپ کی ہر بڑی قوم انھیں خریدنے کے لئے مضطرب تھی۔ فرانس سب سے زیادہ کوشش کر رہا تھا اور اسے اس میں کامیابی کی امید بھی ہو چلی تھی لیکن ڈسرائیلی نے فرانس کی امیدوں

پانی پھیر دیا اور ایک صبح فرانس نے نہایت حیرت و استعجاب سے یہ خبر سنی کہ خدیو نے سویز کے حصے برطانیہ کو بیچ دیئے۔ اگر واقعات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سویز کے حصوں کو خریدنے سے اس نے نہ صرف سویز کے انتظام میں ہی زیادہ اختیارات حاصل کر لئے بلکہ سارے افریقہ اور ہندوستان میں برطانیہ کا اقتدار مضبوط کر دیا۔

ممکن ہے خدیو یہ حصے فروخت نہ کرتا اگر مصر کا قرضہ بہت زیادہ نہ بڑھ جاتا جو ۱۸۶۳ء میں تینتیس لاکھ پونڈ تھا لیکن ۱۸۷۶ء میں ۹ کروڑ پونڈ ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ کہ مصر کی مالی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی اور اس حالت کی ذمہ داری ان غیر ملکی تاجروں پر عائد ہوتی ہے جو وہاں آباد ہو گئے تھے اور خراب اشیاء کو نہایت مہنگی قیمت پر بیچ رہے تھے جنہیں بعض وجوہ کی بنا پر حکومت خریدنے پر مجبور تھی۔ علاوہ ازیں یہ اجنبی حکومت کو ٹیکس بھی نہیں دیتے تھے۔ ان تمام باتوں نے مصر کی مالی حالت کو کمزور کر دیا اور وہ واقعہ پیش آیا جس نے مشرق کی قسمت کو بدل دیا۔ ڈسرائیلی نے خدیو کو مشہور یہودی خاندان راتھچائیلڈ سے ایک خطیر رقم بطور قرض بھی لے دی۔ جس سے اس نے مصر کی حالت کو سدھارنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مصر ابھی سلطان ترکی کے ماتحت سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۷۹ء میں سلطان نے خدیو کو حکومت سے ہٹا دیا اور اس کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا۔ یہ حکومت کے سخت ناقابل تھا۔ اس نے نظامِ حکومت میں غیر ملکی افسروں کو بہت بڑی تعداد میں اور زیادہ سے زیادہ تنخواہیں دے کر ملازم رکھ لیا۔ چونکہ مصری خزانے میں اتنی استطاعت نہ تھی کہ اتنے اخراجات کا کفیل ہو سکتا اس لئے اس نے اپنے ملکی افسروں کی تنخواہوں کو پہلے سے نصف کر دیا۔

ان واقعات کا ردِ عمل ضروری تھا۔ لہٰذا مشہور مصری جرنیل عربی پاشا کی سرکردگی میں مصری فوج نے اس نوجوان بادشاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عارضی طور پر مصر میں قوم پرست وزارت قائم ہو گئی۔ مگر بہت جلد بغاوت فرو ہو گئی۔ عربی پاشا کو گرفتار کر لیا گیا اور برطانیہ نے چونکہ اسی نے بغاوت فرو کی تھی فیصلہ کیا کہ جب تک مصر کے حالات درست نہیں ہوتے برطانوی فوج وہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد اگرچہ نوجوان بادشاہ بدستور حکمراں رہا لیکن محض برائے نام سا۔ کیونکہ دراصل لارڈ کرومر جو مصر میں برطانوی قونصل تھا مصر پر حکومت کرتا تھا۔

ان دنوں ادھر سوڈان میں حالات خراب ہو رہے تھے اور مہدی سوڈانی کی قیادت میں درویشوں نے علمِ آزادی بلند کر دیا تھا۔ برطانیہ نے جنرل گورڈن کی درخواست پر اسے سوڈان میں حالات پر قابو پانے کے لئے بھیجا لیکن وہ کامیاب نہ ہوا اور دشمن نے خرطوم میں اس کا محاصرہ کر لیا جو چھ ماہ تک جاری رہا اور جس کے نتیجے کے طور پر جنرل گورڈن اپنی گیارہ ہزار سپاہ کے ساتھ قتل ہو گیا۔ اس موقع پر شروع شروع میں نہ تو حکومت مصر ہی گورڈن کی مدد کر سکی نہ حکومت برطانیہ۔ آخر اس واقعہ کے دس سال بعد لارڈ کچنر کو سوڈان میں بھیجا گیا جس نے محض دو بریگیڈوں کی مدد سے جن میں صرف ۲۳ ہزار سپاہی تھے۔ چالیس ہزار درویشوں پر فتح پائی اور مہدی سوڈانی کی قبر سے اس کی ہڈیوں کو نکال کر جلایا اور اس طرح گورڈن کا انتقام لیا۔ سوڈان فتح ہونے کے بعد خرطوم پر مصری اور برطانوی جھنڈے پہلو بہ پہلو لہرائے گئے۔

جب لارڈ کچنر سوڈان میں آیا تھا۔ اس وقت ایک فرانسیسی فوج وسطی افریقہ کے جنگلوں سے ہوتی ہوئی نیل کے بالائی حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ درویشوں کی سرکوبی کے بعد کچنر نے اس فرانسیسی فوج کی طرف توجہ کی پہلے کچنر نے اس کے جرنیل سے درخواست کی کہ وہ واپس چلا جائے مگر اس نے اس درخواست کو ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ جب برطانیہ نے فرانس پر دباؤ ڈالا تو اسے واپس آنا پڑا۔ آخر ۱۸۹۹ء میں فرانس کے نئے وزیر اعظم ڈیلکیسی نے جو السا س اور لورین کے فرانسیسی صوبوں کی واپسی کے لئے جو جرمنی کے قبضے میں تھے برطانیہ اور فرانس کے اتحاد کو ضروری خیال کرتا تھا نیل کے بالائی حصے پر برطانوی تصرف تسلیم کر لیا۔ ۱۹۰۴ء میں برطانیہ اور فرانس نے جب اپنی نو آبادیوں کے مسائل کا فیصلہ کیا تو فرانس نے مصر پر برطانوی اقتدار قبول کر لیا اور برطانیہ نے مراکو پر فرانسیسی قبضہ کو مان لیا۔ اور یہ دونوں اقوام ایک دوسرے کی دوستی کے حلقہ میں زیادہ مضبوطی سے بندھ گئیں۔

پہلے بیان کیا گیا ہے کہ ان دنوں خدیو کے نوجوان بیٹے کے پردے میں لارڈ کرومر مصر پر حکمراں تھا اور اس کی حکومت بالکل خود مختارانہ تھی۔ اگرچہ اس نے اپنی حکومت کے دوران میں مصر کو بہت سے فائدے بھی پہنچائے مثلاً نظامِ حکومت کی کمزوریوں کو دور کیا۔ بیگار کو بند کر دیا۔ انصاف کو تقویت دی۔ مصریوں کو اعلیٰ عہدے دیئے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہت زیادہ خود مختار تھا۔ اس حد تک کہ بعض دفعہ وہ خدیو یا مصری حکام سے مشورہ نہیں کیا کرتا تھا اور ملکی نظام کو برقرار رکھنے میں تشدد کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ آخر اس کی سختی ہنگامی ملک میں ہر طرف بے اطمینانی ظاہر کی جانے لگی۔ آخر ۱۹۰۷ء میں اس نے استعفےٰ دے دیا۔

کرومر کے بعد مصریوں میں آزادی کے جذبات جنہیں کرومر نے سختی کے ساتھ دبا رکھا تھا بھڑک اٹھے اس لئے حکومت نے مصریوں کو مطمئن کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ مصری اسمبلی کے نمائندوں کو بعض امور پر سوالات کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اور لارڈ کچنر کے زمانے میں جہاں منتخب شدہ ممبروں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ وہاں ان کو بعض ایسے امور پر بھی جرح کرنے کی اجازت مل گئی جن پر ابھی تک نہیں اجازت نہ تھی۔ لارڈ کچنر نے زراعت پیشہ طبقہ کی زمینوں کو قرضہ میں

قرق ہونے سے بچانے کے لئے بھی ایک قانون پاس کرا دیا لیکن مصری ان اقدامات سے مطمئن نہ ہوئے۔ وہ مکمل آزادی سے کم کسی چیز پر بھی رضا مند ہونے کو تیار نہ تھے۔

کچھ عرصے کے بعد جنگ عظیم شروع ہو گئی جس کے دوران میں برطانیہ نے قاہرہ کو مشرق وسطیٰ میں اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ خدیو کو تخت شاہی سے محروم کر کے اسے مکمل برطانوی قبضے میں لے لیا گیا نیز برطانوی فوجیں زیادہ تعداد میں یہاں رکھی گئیں۔

جنگ کے بعد صدر جمہوریہ امریکہ ولسن نے مصر کے قائد اعظم زاغلول پاشا کو بھی امن کی کانفرنس میں وفد لانے کی دعوت دی۔ ولسن کا اس سے یہ مطلب تھا کہ برطانیہ کو مصریوں کے مطالبات معلوم ہو جائیں گے۔ چنانچہ زاغلول وفد لے کر گئے لیکن کسی نے ان کے مطالبات پر کان نہ دھرا اور وہ بے نیل و مرام واپس آ گئے۔ ان کی ناکامی سے مصریوں کی آزادی کی تحریک زیادہ تیز ہو گئی۔ جس کی وجہ سے حکومت نے زاغلول پاشا کو مالٹا میں بھیج دیا لیکن اس واقعہ سے برطانیہ کی مخالفت زیادہ بڑھ گئی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے مصر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ سی لگ گئی ہے اور زاغلول پاشا کی گرفتاری کے دو دن بعد ملک میں بغاوت ہو گئی۔ جسے دبا دیا گیا۔ مصر کے ہائی کمشنر ایلن بی نے زاغلول کو رہا کرا دیا اور مصالحت کی کوششیں کیں جو کامیاب نہ ہو سکیں اور فسادات پھر رونما ہونے لگے۔ اب حکومت نے زاغلول اور ان کے پانچ ساتھیوں کو مصر سے باہر کسی مقام پر نظر بند کر دیا۔

فروری ۱۹۲۲ء میں حکومت برطانیہ نے مصر کو آزادی دینے کا اعلان کر دیا لیکن یہ آزادی مکمل آزادی کی حیثیت نہیں رکھتی تھی کیونکہ حکومت نے بعض نہایت اہم محکمے اپنے قبضے میں رکھے۔ اس آزادی کو اگرچہ مصر کی حکومت نے بھی تسلیم نہ کیا لیکن خدیو نے اپنے آپ کو مصر کا بادشاہ کہنا شروع کر دیا۔ جب عام انتخابات ہوئے تو اس میں وفد پارٹی نے ایک سو اٹھاسی نشستوں پر قبضہ کر کے زاغلول کی قیادت میں جو اب آزاد ہو چکے تھے وزارت قائم کر لی۔

وفد پارٹی کی وزارت قائم ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مصریوں نے مکمل آزادی کی جدوجہد چھوڑ دی۔ زاغلول نہایت سختی سے اپنی قوم کے متفقہ مطالبے پر ڈٹا رہا اگرچہ ریمزے میکڈانلڈ نے دو بار ان سے ملاقات کرنے کا شوق بھی ظاہر کیا لیکن آپ نہ ملے۔ آخر جب تیسری بار مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے پھر دعوت دی تو آپ لندن میں ان سے ملے۔ ابھی تک آزادی کی تحریک جاری تھی اور کہیں کہیں مصری تشدد بھی برت رہے تھے۔ اسی دوران میں کسی شخص نے سوڈان کے گورنر جنرل سر لی سٹیک کو قتل کر دیا۔ چونکہ یہ فعل ذاتی حیثیت میں کیا گیا تھا لہذا خدیو اور وزیر اعظم نے قاتل کے اس فعل کی مذمت کی اور کہا کہ مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے گی لیکن برطانوی حکام نے مصری حکومت کے اقدام کا انتظار کئے بغیر مصری حکومت کو چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا اور مطالبہ کیا کہ حکومت مصر

۱۔ جرمانہ ادا کرے۔

۲۔ سوڈان سے مصری حکام کو واپس بلا لے۔

۳۔ اجنبیوں کی ملازمت کے قوانین پر نظر ثانی کرے۔

۴۔ ان کی حفاظت کے سلسلے میں قدم اٹھائے۔

چونکہ الٹی میٹم کی میعاد بہت کم تھی اس لئے کچھ نہ ہو سکا۔ لہذا انگریزوں نے اسکندریہ کے چونگی خانہ پر قبضہ کر لیا۔

زاغلول پاشا نے اس واقعے سے متأثر ہو کر وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور لیگ آف نیشنز سے اپیل کی لیکن لیگ نے اس معاملے کو بین الاقوامی حیثیت نہ دیتے ہوئے رد کر دیا۔ زاغلول کے بعد لبرلوں نے وزارت قائم کی اور وعدہ کیا کہ مصر کی حکومت برطانوی ماہرین مالیات و انصاف کے مشوروں پر عمل کرے گی چنانچہ اسکندریہ کے چونگی خانے سے برطانوی حکام نے فوجیں واپس بلا لیں لیکن سوڈان کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔

۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان کئی بار مصر اور برطانیہ کے جھگڑے کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ان ہی دنوں زاغلول پاشا وفات پا گئے۔ اس کے بعد ۱۸ر جون ۱۹۲۹ء اور ۸ر مئی ۱۹۳۰ء کے درمیان بھی ایک بار پھر کوشش کی گئی جس میں مصری رضا مند ہو گئے کہ برطانوی فوجیں نہر سویز کے خطے میں رہیں لیکن ہنڈرسن نے مصری مہاجرین کو زیادہ تعداد میں سوڈان جانے کی اجازت نہ دی اور مصری پھر بگڑ گئے۔ اس دوران میں حکومت برطانیہ مصر کے بین الاقوامی معاملات میں برابر مداخلت کرتی رہی اور کبھی کبھی طاقت کا استعمال بھی کرتی رہی لیکن مصر نے آزادی کی جدوجہد جاری رکھی اور یہ جدوجہد ۱۹۳۵ء میں بہت زیادہ بڑھ گئی۔ آخر ۱۹۳۶ء میں حکومت برطانیہ نے مصر کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے مصر نیم آزاد ہو گیا اور اس معاہدے کی رو سے یہ بھی طے پایا کہ برطانیہ مصر میں اپنی افواج کی ایک تعداد رکھ سکے گا۔ جسے جنگ کے دوران میں بڑھانے کی اجازت ہو گی۔ اور برطانیہ مصر کی ریلوں اس کے ہوائی اور بحری اڈوں کو بھی استعمال کر سکے گا۔

اس لحاظ سے آج کل مصر نہ تو بالکل آزاد ہی ہے نہ پورا غلام بلکہ وہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ اور مصر اور برطانیہ کو ۱۹۳۶ء کے معاہدے نے دوستی کے رشتے میں منسلک کر رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ مصر برطانیہ کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھتا ہے اور درامے درمے برطانیہ کی مدد کر رہا ہے اور اس کے حق میں پروپیگنڈا بھی کرتا ہے۔ اور مصر کے مدبرین بارہا موجودہ جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ اپنی ہمدردیوں کا اظہار کر چکے ہیں۔

تابش صدیقی

ایک تمثیل

حجلۂ گور میں سامانِ عروسی ہوگا
لاش آرام سے سوتی ہے سہاگن بنکر"

رخصتی

رخصتی ہوتی ہے، جاتی ہے دلہن کی ڈولی!

باری باری یہ اعزہ ابھی کاندھا دیں گے
دھن پرایا تھا مگر آج پرایا ہوگا
فرطِ رقت سے ہوئی جاتی ہیں پُرنم آنکھیں
کون ایسا ہے جو اس وقت نہ رویا ہوگا
گل بداماں ہے کہ اک خرمنِ گل ہے ڈولی
دوش پر پھول نہیں باغِ مصلّے ہوگا
کوئی دم ہے کہ اسی خرمنِ گل کے صدقے
حجلۂ خُلد نشاں اور مہکتا ہوگا
روتی آنکھوں میں جھلکتے ہیں لہو کے قطرے
پھول ہنستے ہیں مگر خون ٹپکتا ہوگا
ہے جو خلوت میں یہ وارفتہ لپٹ بیلے کی
دل میں نوشہ کے مگر حشرِ تمنا ہوگا

سمٹی سمٹائی، لجاتی ہوئی آئی دلہن
داخلِ گلشنِ "جنت" ہوئی جانِ گلشن!

چوتھی چالے

لئے آتے ہیں سبھی داغِ جگر کے مالے
زیبِ تن ہوگا نیا آج عروسی جوڑا
پھر نئے سر سے اعزہ کی ضیافت ہوگی
ڈھیریوں پھول مہکتے ہیں پڑے خلوت میں
منہ چھپائے ہوئے گھونگھٹ میں ہے راجدھارانی

خیر سے چاندسی دلہن کے ہیں چوتھی چالے
رگرد مہتاب پڑیں گے نئے سیمیں ہالے
پھر سے رقت میں لہو روئیں گے رونے والے
اور خوشبو سے ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
گرچہ خلوت میں نہیں سانوری صورت والے

لاش آرام سے سوتی ہے سہاگن بن کر
گوہرِ اشک سے آنکھوں کی بھری ہے جھولی!
رخصتی ہوتی ہے، جاتی ہے دلہن کی ڈولی!

مختار صدیقی

امریکہ کا تخیل پرست شاعر

ایڈگر ایلن پو

اُردو ادب کی تاریخ میں میر تقی کی شخصیت اور اُن کا افسانۂ حیات جس کی پنہاں گہرائیاں کم ہی لوگوں کو معلوم ہیں، اپنی المناک دلکشی کو لئے ہوئے آج بھی ہمارے دلوں کو موہ رہا ہے اور اگر ہم اُن کی حیاتِ عشق کے کم روشن پہلو پر غور کریں تو اُن کی بد دماغی کے وجوہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ امریکی ادب میں بھی ایک شاعر اور ادیب کی زندگی اس افسانے سے مماثلت رکھتی ہے، لیکن یہ مشابہت محض بنیادی ہے، تفصیل کے لحاظ سے امریکی ادیب میر تقی سے کہیں مختلف ہے اور اس کی وجہ شاید کسی حد تک ملکی اختلاف ہے اور کسی حد تک اردو اور انگریزی ادب کا فرق۔

پو کی زندگی میں سب سے تلخ حقیقت جو ہمیں دکھائی دیتی ہے وہ اس کی بدنصیبی ہے، ایسے بدنصیب انسان جن کی ذہانت میں عظمت کا جوہر موجود ہو خاص طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اُن کی شخصیت ایک حکایت بن جاتی ہے اُن کی زندگی کے ارد گرد روایات کا جال تن جاتا ہے اور اس حکایت اور اُن روایت کی ہر کوئی من مانی شرح کرنے پر اتر آتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ذہانت میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی بلکہ وہ خوش قسمت ذہین لوگوں ہی کی مانند ہوتے ہیں لیکن بظاہر اُن کی ذات میں دنیا کو کئی اُلجھنیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُن کی ذہانت اور زندگی کی متضاد کیفیتیں بیرونی دنیا میں بھی متضاد عکس ڈالتی ہیں۔ میر تقی کا فسانہ کسی کے لئے صرف ایک بددماغ ذہانت کا فسانہ ہے، کسی کے لئے اُس ناکام عاشق کی کہانی ہے جسے اپنی کسی رشتہ دار لڑکی سے محبت تھی، اور کوئی آج اُس کے کلام سے اس کے میلان ہم جنسی کے دلائل مہیا کرتا ہے۔ اردو کے ایک اور شاعر [illegible] کی شخصیت ابھی لوگوں کی نظروں میں زیادہ مانوس نہیں ہوئی [illegible] سے بھی بڑھ کر مختلف قیاسات کا امکان ہے۔ اور آج بھی ایک دو شاعر اردو ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں جن کے متعلق اُن کی موت کے بعد اسی قسم کے مختلف قیاسات قائم کئے جائیں گے۔

پو کا بھی انگریزی ادب میں یہی حال ہے، جو بھی کتاب اُس کے متعلق لکھی گئی ہے ایک نئے نقطۂ نظر سے۔ کوئی اُسے شرابی کہتا ہے۔ کوئی اعصابی مریض، کوئی اذیت پرست، اور کوئی جنسی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے۔ اور ان رنگا رنگ خیال آرائیوں کی وجہ سے اصلیت پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ اٹھائے نہیں بنتا ہے۔

حقیقتاً پو اور اُس کی زندگی کے متعلق صرف ایک ہی بات اُلجھی ہوئی ہے، صرف ایک پیچیدگی ہے۔ اُس کی ذات میں صرف یہی بات پُراسرار اور اس لئے قابلِ غور ہے کہ وہ ایک اعصابی مریض تھا اور اُس کی تخلیقاتِ ادبی میں صرف ایک اُلجھن ہے، ادب اور آرٹ کی ازلی (اور ابدی) اُلجھن۔ اُس کی شخصیت میں متضاد، غیر معمولی اور تخریب آلود باتیں ہیں، لیکن وہ سب واضح ہیں، اُن میں کوئی بھید کی بات نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں کہ کوئی مصنف ایسا نہیں گذرا جس نے اپنے ذہن کی کارفرمائیوں کے روشن نقوش اپنی تحریروں میں پو کی ایسی وضاحت کے ساتھ چھوڑے ہوں نیز کوئی مصنف ایسا نہیں گذرا جس کی ذہانت اور زندگی کے حالات کا تجزیہ پو کی مانند کمال محنت اور فراست سے کیا گیا ہو۔

پہلی نظر میں پو کو نہ تو شرابی کے لحاظ سے دیکھنا چاہئے نہ اعصابی مریض کے لحاظ سے، اور نہ اُس کی آوارہ مزاجی کا ذکر کرنا چاہئے، حقیقت تک زینہ بہ زینہ پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اُسے پہلی نظر میں ایک صحافت نگار، ایک اخبار نویس سمجھیں، انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کا ایک محنتی اخبار نویس، ذہنی لحاظ سے امریکی سماج میں اس وقت ایک عجب دُہری قسم کی

کیفیت تھی۔ روحانی اور اخلاقی لحاظ سے ایک بے چینی تھی، کھلی زمینیں رہنے سہنے کے لئے موجود تھیں، انسان کی حرکات و سکنات پر کوئی پابندی نہ تھی اور تمام سماج ایک تیزی کے ساتھ متحدہ جمہوریت کی طرف رواں تھی۔ پہلے ابتدائی اثرات دور ہو رہے تھے اور قوی اعصاب کا ساز ہر نئی مضراب سے گونج اٹھتا تھا۔ ذہانت میں ایک تیزی اور بیداری تھی لیکن دماغوں میں تربیت کی کمی تھی۔ اور عام طور پر ملک میں کوئی پختہ نظام کارفرما نہ تھا۔ ایسی صورتِ حال ادب اور آرٹ میں بھی ایک دورنگی کا باعث ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ڈی۔ ایچ لارنس کے خیال میں امریکی ادب اور آرٹ کی حرکت کا بہاؤ دہرا ہے، اس بہاؤ کا ایک پہلو پرانے شعور کو مانجھنا اور اُس کا تجزیہ کرنا ہے اور دوسرا پہلو اس کے ساتھ ہی نیا شعور قائم کرنا۔

لارنس کے خیال میں پو کی تخلیقات میں پہلے پہلو کا اظہار ہے۔ کیونکہ یہ اُس کی قسمت میں لکھا ہوا تھا کہ وہ اپنی روح کو ایک تجزیے کے ایک مسلسل بکھیڑے میں اُلجھا دے اور اس عمل کو واضح صورت بھی دیتا چلا جائے اور یہ بھی اس کی تقدیر میں تھا کہ اس کام کے لئے لوگ اُسے بُرا بھلا بھی کہیں۔ حالانکہ اُس نے تلخ ترین انسانی تجربات میں سے بعض کی کامیاب ترجمانی کی تھی اور یہ ترجمانی ضروری بھی تھی۔ کیونکہ اگر روحِ انسانی اپنا قیام چاہتی ہے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی مردِ مجاہد اپنی قربانی سے اُس کے لئے تلخ ترین تجربات کی تکمیل کرے۔

پو کے متعلق آج تک جو کچھ لکھا گیا اُس میں سے زیادہ تر مواد جانبداری سے آلودہ ہے۔ پو کو یا تو ایسے سوانح نگار اور نقاد ملے جن کے لئے اس کی ذات اور اُس کے حالات میں بہت زیادہ اپیل تھی اور انہوں نے اُسے اندھا دھند سراہا یا دوسری طرف ایسے لوگ تھے جو تنگ نظری اور محدود ذہنیت کے باعث اُسے پسند کرنے ہی کے قابل نہ تھے۔ نیویارک کے ایک اخبار میں اُس کی موت پر جو مضمون اُس کے متعلق شائع ہوا وہ اس قسم کے رسمی مضامین سے کہیں مختلف ہے جو مشاہیر کی موت کے عین بعد شائع ہوا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اُس مضمون کے چند اقتباسات دیکھئے جو اب اپنی اس غیر معمولی خصوصیت کی بنا پر امریکی ادب میں تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

"ایڈگر ایلن پو مر چکا ہے۔ پرسوں بالٹی مور میں اُس کی موت ہوئی۔ یہ اطلاع بہت سے لوگوں کے لئے حیران کن ہو گا لیکن ان میں سے بہت ہی کم ایسے نکلیں گے جنہیں اس خبر سے رنج ہو۔ شاعرِ مذکور اپنی ذات اور شہرت کے لحاظ سے تمام ملک میں جانا پہچانا تھا اُس کی تحریروں کا مطالعہ کرنے والے انگلستان چھوڑ یورپ کے باقی علاقوں میں بھی موجود تھے۔ لیکن کہیں بھی اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔

"باتیں کرتے ہوئے اُس کی گفتگو بسا اوقات فصاحت کے لحاظ سے انسانی مرتبے سے کہیں بلند ہو جاتی تھی۔ اُس کی آواز کا زیر و بم حیرت ناک مشاقی سے ظاہر ہوا کرتا تھا۔ اور اُس کی بڑی بڑی بلیغ آنکھیں کبھی تو آسودہ دکھائی دیتی تھیں اور کبھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان آنکھوں سے اس کے مخاطبوں کی آنکھوں میں آتشیں لہریں چھوٹ رہی ہیں۔ اس دوران میں اُس کا اپنا چہرہ یا تو بے حد چمک رہا ہوتا یا اس میں ایک اَن مٹ قسم کا پھیکا پن نمودار ہو جاتا۔ اور چہرے کی یہ بدلتی ہوئی کیفیتیں اُس کے تخیل کی رفتار کے ساتھ ساتھ دورانِ خون کی کمی بیشی کے مطابق ہوتیں۔ اُس کے تصورات اُن دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے جن تک اسی شخص کی نظریں پہنچ سکتی ہیں جسے عمیق نظری کا جوہر خداداد عطا ہوا ہو کبھی کبھی وہ خواب دیکھنے لگتا اور اس وقت وہ کسی خیالی دنیا کا باشندہ معلوم ہوتا، ایک ایسی سرزمین کا رہنے والا جو کبھی جنت میں ہے کبھی دوزخ میں اور جس میں اس کے اپنے ذہن کے پیدا کردہ کردار رہتے بستے ہیں، اور جہاں اُس کے من مانے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں ..... رستہ چلتے ہوئے بازاروں میں کبھی تو وہ دیوانہ معلوم ہوتا اور کبھی رنج و الم سے چور کبھی وہ زیرِ لب گالیاں دیتا ہوا نظر آتا اور کبھی اس کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوتیں۔ گویا وہ کسی ایسی دعا میں مشغول ہے جو اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہے۔ لیکن یہ دعا اُس کی اپنی ذات کے لئے نہ ہوتی تھی کیونکہ اُسے محسوس ہوتا تھا یا کم سے کم وہ اس کا بہانہ کرتا تھا کہ اُسے موت سے پہلے ہی مردود اور ملعون قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ دعا اُس ہستی کی مسرت و راحت کے لئے ہوا کرتی تھی جو اُس خاص لمحے میں اُس کی پرستش کا مرکز ہو۔ کبھی یوں رستہ چلتے وہ بے دھیانی سے سامنے دیکھتا جاتا لیکن ایسے موقعے پر اُس کی نظریں اپنے دل ہی کی حالت کو ہی دیکھ رہی ہوتیں، وہ دل جسے درد و کرب اور اندیشوں نے تڑپنے پر مجبور کر رکھا ہو۔ اُس کے چہرے پر ملال کا ایک کفن سا لپٹا ہوا ہوتا اور ایسی حالت میں اُسے موسم کی تندی اور تیزی کی بھی کچھ پروا نہ رہتی۔ تمام رات بھیگے ہوئے کپڑوں میں بازوؤں کو باد و باراں کے تھپیڑوں اور بوچھاڑوں کے مقابل وحشیانہ طور پر ہلاتے ہوئے یوں محوِ گفتار ہوتا گویا وہ روحوں سے باتیں کر رہا ہے، اُن روحوں سے جنہیں ایسے سمے میں صرف اُسی کی ذات پیدا کر سکتی ہے۔ یہ روحیں اُس کی نظروں میں اُس عدن کی رہنے والی تھیں جس کی خاک تک پہنچ کر

اُس کی اپنی روح اُن تمام مصائب کو بھول جائے گی جو اُسے اس مادی زندگی میں لاحق تھے۔ اسی عدن میں وہ سب لوگ بھی رہتے تھے جو اُس کے پیارے تھے۔ اس سرزمین تک وہ خود کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا، ہاں کبھی کبھی چند بیتاب لمحوں میں اُسے اُس کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔"

یہ مضمون رُفس گریس وُلڈ نے لکھا تھا، وہ پو کی زندگی میں نہ صرف اُس کا دوست تھا بلکہ مرنے سے پہلے پو نے اپنی تصنیفات کے انتظام کے لئے بھی اُسی کا نام مقرر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مضمون کے مطالعے کے بعد پو کو ایک دیوانے کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا لیکن وہ عمر بھر دیوانہ تو نہ تھا۔ اعصابی مزاج البتہ تھا۔ اور اسی عصبیت اور حالاتِ زندگی کی بنا پر اپنی عمر کے آخری دور میں اس پر جنون کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس مضمون میں گریس وُلڈ نے پو سے یقیناً ناانصافی کی تھی۔ لیکن اس کا انتقام پو کے مداحوں نے اس عمدگی سے لیا کہ آئندہ نسلوں کے لئے اس کی حیثیت ایک دغاباز دوست اور کینہ توز نقاد کی بن کر رہ گئی۔

یہ تو تھا پو کے متعلق لوگوں کی رائے کا ایک رُخ جس کی ترجمانی مندرجہ بالا اقتباسات کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اس مضمون کے شائع ہوتے ہی پو کی جانب داری میں اُس کے دوست این پی ولس اور جی، آر گراہم نے مضامین لکھے۔ ان میں تصویر کی دوسری انتہا کا اظہار تھا اور گریس وُلڈ جسے خبطی اور جنونی کہہ رہا تھا اُسے "ایک خاموش، صابر، محنتی اور شریف انسان" کہا گیا۔ جس کے متعلق لوگوں کے دلوں میں اُس کے عادات و اطوار اور قابلیت کی بنا پر احترام کے جذبات تھے۔

اُس کے اپنے زمانے کے لوگوں کی انتہائی رائوں کی وجہ تو یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ وہ لوگ اُسے قرب کے باعث غیر جانبداری سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن اصل بات پھر بھی وہیں کی وہیں رہتی ہے۔ پو دراصل ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی انسانی اور فن کارانہ ۔۔۔ دونوں حیثیتوں سے لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی لئے جو اُن کی مخالفت کرتے ہیں وہ انتہائی مخالفت کرتے ہیں اور جو اُن کے حق میں بولتے ہیں وہ بھی حد سے بڑھ کر حق میں بولتے ہیں۔

پو کی شخصیت میں سب سے نمایاں بات اُس کا دہرا پن ہے اور یہ خصوصیت نہ صرف اس کی طبیعت اور ذہانت ہی میں نمایاں ہے بلکہ اُس کی تخلیقات میں بھی موجود ہے۔ اس کے ہمعصر اس کے متعلق دو یکسر مختلف رائیں رکھتے ہیں اسی سے ظاہر ہے کہ وہ ایک شخص نہ تھا بلکہ اُس کی شخصیت کے دو پہلو تھے۔ جن لوگوں سے اُسے قلبی تعلق تھا اور جنہوں نے اُسے سکون اور ہوشمندی کی حالت میں دیکھا تھا، اُن کی نظر میں اُس کی ہستی محبت بھری، ملنسار اور وفاشعار تھی اور وہ لوگ جن پر اُس کی تنقید کے بے پناہ نشتر چلتے رہے یا جنہیں اُس سے اس حالت میں ملنے کا اتفاق ہوا جب وہ نشے کی حالت میں ہوتا تھا، اُسے تنک مزاج، اکھڑ، بدمزاج، خود کام، وحشی بلکہ ضمیر تک سے عاری تصور کرتے رہے۔ لیکن ہمیں سوچنا ہے کہ کیا اس نشے کی حالت میں پو کی اپنی شخصیت غائب ہو جاتی تھی اور اُس کی عمیق ذہانت سے کوئی اور ہستی نمودار ہوتی تھی، وہ ہستی جو اُس کے ذہن کے اُن وحشیانہ تصورات کی ترجمان تھی جن میں قبرستانوں کی ہیبت اور نحوست تھی؟

اگر ہم پو کے ذہن کی طرف غور کریں تو وہاں بھی وہی دہرا پن دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ آدرش کا پجاری تھا۔ تصورات کو پوجنے والا۔ آدرش کے لئے اس کے دل میں جو آرزو تھی اُس کی بنیاد صرف تخیل پر نہ تھی بلکہ دل ہی کی کوئی اندرونی طاقت اس آرزو کی تخلیق کئے ہوئے تھی۔ عورت کے حُسن، دلکشی اور پاکیزگی کے سلسلے میں اس کا دل حساس تھا اور اس حُسن کا اُجالا بعض اوقات اُس کی نظموں میں نہایت نفاست کے ساتھ نمودار ہوا ہے۔ اُس کے تصورات اُس کے شعور کو اس خاکی کُرے کی سطح پر نہیں رہنے دیتے تھے۔ اس مادی دنیا سے دور فرشتوں کی فضائیں، پریوں کی بستی میں، خوابوں کی سرزمین میں جہاں روحیں لافانی ہو کر پھرتی رہتی ہیں اُس کا تخیل اُسے بھی لے جاتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے دل میں بعض خواہشات ایسی بھی تھیں جن کا تعلق اس پست دنیا ہی سے ہوتا ہے۔ شہرت کی ہوس کے بارے میں وہ کہتا ہے "مجھے شہرت سے محبت ہے۔ میں اُسے پوجتا ہوں۔ شہرت کے ساغر کو میں تلچھٹ تک پینے کو تیار ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس زمین کے ہر شہر اور قصبے سے، ہر میدان اور گھاٹی سے میرے اعزاز میں خوشبو کے دھوئیں کی لپٹیں بلند ہوں۔ شہرت، ناموری! ۔۔۔ ان کا سانس زندگی بخش ہے۔ یہ جیتا جاگتا تابندہ درخشاں لہو ہیں۔ جب تک انسان شہرت کو حاصل نہیں کر لیتا وہ گویا زندہ ہی نہیں ہوتا۔"

اور شہرت کی یہ ہوس، امتیاز کی خواہش بچپن ہی سے اس کی زندگی میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ ایک شخص جو سکول میں اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ بیان کرتا ہے کہ سکول کے زمانے میں پو اکثر اپنے ہم سبقوں میں سب سے طاقت ور لڑکے کو کہا کرتا کہ لو جتنے زور سے جی چاہے میرے سینے پر مکا مارو۔ اور اُس نے مکا کھانے کا یہ ڈھب مجھے بھی سکھایا تھا اور میں بھی اپنے بل بوتے کے مطابق اُس کی پیروی کیا کرتا تھا یوں مکا کھانے کے لئے پھیپھڑوں کو پہلے

آخری حد تک ہوا سے بھر لیتا ہوتا تھا اور مُکا کھانے کے لمحے میں ہوا کو خارج کرنا ہوتا تھا" بچپن کے اس واقعے سے جہاں پو کی ہوشیاری اور چالاکی کا پتہ چلتا ہے وہاں اُس کی طبیعت کے ایک اور پہلو پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔ معلوم نہیں اُس نے پھیپھڑوں میں یہ ہوا بھرنے کا طریقہ کہاں سے سیکھا تھا لیکن آئندہ عمر میں یہ اس کی خاص عادت تھی کہ ذرا سی کوئی بات معلوم کر کے اُس کی بنا پر بڑے نتائج کا اظہار کیا کرتا اور یوں لوگوں کو تعجب میں ڈال کر اُن کی حیرانی اور اپنی برتری اور فوقیت کا لطف اٹھاتا۔ حقیقی علم سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ذہنی زندگی میں جس طرح حقیقت کو چھوڑ کر تخیل پرستی اُس کا شعار بن گئی تھی۔ اسی طرح علم کے سلسلے میں بھی اُسے محض دکھاوے کی باتوں ہی سے دلچسپی تھی۔ علم کی طرف وہ محض اس لئے رجوع ہوتا کہ اس سے حاصل شدہ طاقت اور امتیاز اُس کی ذہنی زندگی گزارنے کے لئے ضروری تھا۔

جس طرح علم کی حقیقت اور سچائی کی خواہش کسی عالم یا سائنس دان کے دل میں ہوتی ہے پو کے دل میں نہ تھی۔ اور اسی لئے اُس نے کبھی کسی علم کو باقاعدگی کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ اتنا ہی جان کر چھوڑ دیا جتنا اُسے اپنی نمائش کے لئے ضروری معلوم ہوا۔

آج کل تہذیب و تمدن کی تیز رفتاری نے وقت کا احساس لوگوں کے دلوں میں گہرا کر دیا ہے اور اس تیز روی میں اکثر یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہر بات کے لئے وقت بہت تھوڑا ہے اسی احساس کے زیر اثر علم کے متعلق لوگوں کے انداز نظر میں بھی تبدیلی آ گئی ہے۔ اور وہ کم جان کر زیادہ جتا سکنے کو ہی علم سمجھنے لگے ہیں پو کے زمانے کے امریکہ میں بھی رفتار تیز ہی قسم کی تھی۔ اور اگرچہ اور کسی لحاظ سے پو امریکی روایات کا حامل نہ تھا لیکن اس پہلو سے وہ اپنے ماحول کا پروردہ کہا جا سکتا ہے کہ علم کو زیادہ ظاہر کرنا بچپن ہی سے اُس کی خصوصیت تھی اور بڑی عمر میں جب اپنی تصنیفات کی بنا پر سماج میں اس نے کامیابی اور قبولیت حاصل کر لی تب بھی یہی رنگ اُس کی شخصیت میں جھلکتا ہے ۱۸۴۲ء میں جبکہ وہ سماجی لحاظ سے انتہائی بلندی پر تھا۔ اس کے متعلق ایک شخص اپنے کسی خط میں لکھتا ہے "معلوم ہوتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اُس میں کوئی مافوق الفطرت خصوصیت ہے اور اس سلسلے میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں۔ عجیب باتوں کی شہرت تو خیر کوئی بات نہ تھی لطف یہ ہے کہ اُن باتوں کو لوگ سچ سمجھتے ہیں۔ مسمریزم کے لحاظ سے اُس کے تجربات کے متعلق عجیب کہانیاں مشہور ہیں اور اُن کے متعلق جب کبھی کہا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ مسکرا دیتا ہے۔ اُس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب دلکشی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اُس سے تعارف پیدا کرے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اُس سے اچھی طرح میل جول قائم رکھ سکتے ہیں"۔ جس ماحول سے یہ تاثر پیدا ہوا وہی ماحول پو کی منشا کے عین مطابق تھا۔ شہرت کی جس بھیدوں سے بھرپور خوشبو کا وہ متوالا تھا۔ اس ماحول میں وہی ہوس کے نتھنوں کو تسکین دیتی ہے۔ لیکن ایسی فضا اُس کے لئے سازگار اور صحت مند نہ تھی۔ کیونکہ اس میں جہاں اُس کی ہوس تسکین پاتی تھی وہاں وہ اور بھی بھڑک اٹھتی تھی اور اس سے بڑھ کر بھی ایک اور خرابی یہ تھی کہ اس ماحول نے اس کے آسودہ نفس میں بعض مہلک رجحانات کو بیدار کر دیا یعنی آسودہ عشقی رجحان کو جگا کر اُسے اُن راستوں پر چلایا جن پر اب تک وہ بوجوہ جانے سے باز رہا تھا۔ اس سماجی ماحول میں اُس نے جن عورتوں سے دل لگایا اُن کا ذکر آگے آئے گا۔ پہلے ہمیں پو کی زندگی کے ڈرامے کے خاص خاص کرداروں کا جائزہ لے لینا چاہئے۔

ظاہر ہے کہ پو کی زندگی میں سب سے پہلے خاص کردار اُس کے ماں اور باپ تھے۔ پو ۱۹ جنوری ۱۸۰۹ء کو بوسٹن میں پیدا ہوا۔ اُس کے ماں اور باپ دونوں کسی سفری تھیٹریکل کمپنی میں ایکٹر تھے لیکن اُن کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ پو ابھی تین ہی سال کا تھا کہ اُس کی ماں مر گئی اور باپ کا حال اب تک سوانح نگاروں کو معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ پو کو رچمنڈ کی ایک امیر اور بے اولاد عورت مسز ایلن نے لے کر پال لیا۔ اور بہت چاہ سے پرورش کیا لیکن مسٹر ایلن جو اپنی عیش پسند طبیعت کی وجہ سے گھریلو فضا کو کچھ خاص پسند نہ کرتا تھا ہمیشہ پو کا مخالف رہا۔ اُس کی یہ مخالفت ہی پو کی زندگی میں سب سے پہلا ایک ایسا واقعہ ہے جس نے آئندہ چل کر اُسے تمام دنیا کا مخالف بنا دیا۔ نیز اپنی بیوی سے پو کا بیدردی سے جو بے وفائی کیا کرتا تھا لامحالہ اُس کا اثر بھی عہد بلوغ میں پو کی زندگی پر یقیناً ہوا ہوگا۔ پو کی ابتدائی تعلیم انگلستان اور امریکہ دونوں جگہوں پر ہوئی اور بعد میں ورجینیا کی یونیورسٹی میں بھی وہ ۱۸۲۶ء میں داخل ہوا لیکن مسٹر ایلن سے اختلافات کی بنا پر پہلے ہی سال کے بعد نوجوان پو بوسٹن بھاگ گیا اور وہاں جا کر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ تین سال تک فوج میں رہا۔ طبعی رجحانات نے اُسے تلوار کی بجائے قلم کی طرف رجوع کیا اور نوجوانی کے معمول کے مطابق سب سے پہلے اُس نے شعر گوئی شروع کی اس زمانے کا کچھ کلام بوسٹن اور نیویارک کے رسائل میں شائع بھی ہوا لیکن باقاعدگی کے ساتھ ۱۸۳۲ء سے بالٹی مور کے مقام پر پو نے لکھنے لکھانے کو اپنا پیشہ بنا لیا

اور پھر غربت سے اس کی کبھی نہ مٹنے والی جنگ شروع ہوئی۔

ابھی تک جن کرداروں کا بیان ہوا وہ پو کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ اُن کی حیثیت محض پس منظر کی ہے۔ نمایاں کرداروں میں سب سے پہلا درجہ پو کی ساس مسز کلیم کا ہے۔ اسی عورت کی وجہ سے پو جسمانی طور پر زندہ رہا۔ مسز کلیم گویا پیدا ہی اسی لئے ہوئی تھی کہ بغیر سوچے سمجھے اپنے متعلقین کی خدمت گزاری کرتی رہے۔ اپنی سیدھی سادھی بیٹی اور پریشان دماغ پو سے اُسے ویسی ہی دل بستگی اور محبت تھی جیسی ایک ماں کو اپنے کسی آوارہ بچے سے ہوتی ہے جہاں کہیں بھی وہ ان کے ساتھ گئی اور جیسی بھی حالت میں ہی زندگی کی کشمکش میں ہمیشہ اُن دونوں کی اپنے مقدور سے بڑھ کر حفاظت کرتی رہی۔ مکان کے کچھ حصے میں اگر کچھ اور لوگ رہنے کو آجاتے تو انہیں کے سہارے سے وہ مدد حاصل کرتی۔ پو کے وہ مسودے جن کے مواد کے متعلق اُسے کچھ بھی علم نہ تھا بغل میں دبا کر وہ ایڈیٹروں کے دروازے کھٹکھٹاتی پھرتی بلکہ آخری عمر میں تو بعض لوگوں نے اُسے شہر سے باہر کھیتوں میں بھی دیکھا کہ کوئی نہ کوئی خود رو سبزی جمع کرتی پھر رہی ہے تاکہ غریبانہ دسترخوان پر ایک آدھ چیز کھانے کے لئے زیادہ ہوجائے۔

گھر کی فضا میں جب کبھی شراب کے نشے میں پو کی تندی و تیزی یا اُس کے پُراسرار غم کی المناک گھٹا کے اثرات سے اگر اس کا دل کبھی ڈرا یا گھبرایا بھی ہوگا تو اس نے کبھی کسی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیونکہ پو سے اُس کی دلبستگی ایک انسان کے لحاظ سے تھی اور اس لئے اُسے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ اُس کے غیر معمولی افعال پر نکتہ چینی کرے۔ اپنوں کے عیب بھی اپنے ہی نظر آتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اپنے عیبوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے، ان پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔

پو کو بھی مسز کلیم سے بھی ویسی ہی دل بستگی تھی جس بے غرضانہ انداز میں یہ ماں کی ایسی محبت کا تحفہ اُسے پیش کیا گیا۔ اُسی انداز میں اُس نے اُسے قبول کیا۔ جب کبھی پو گھر سے دور ہوتا تو خطوں میں وہ اپنی زندگی کی معمولی سے معمولی تفصیلات کا بھی ذکر کرتا۔ مثلاً "آج میں نے ایک چھاتا خریدا ہے کیونکہ بارش کا موسم آن پہنچا ہے" ——— اور اسی قسم کی اور باتیں۔

اوپر کی باتوں سے ظاہر ہے کہ مسز کلیم ایک سیدھی سادھی عورت تھی۔ اُس کی طبیعت میں کوئی کج روی نہ تھی۔ اس لئے پو کے متعلق اُس کے دوسرے ہم عصروں کی بجائے اُس کی ساس کی ماننے پر ہمیں اعتبار کرنا چاہیئے کہ اُس نے جو کچھ دیکھا ہوگا وہی بیان کیا ہوگا۔ اُس کے الفاظ میں "پو عادات و اطوار کے لحاظ سے گھریلو انسان تھا۔ گھر سے اگر ایک آدھ گھنٹہ بھی باہر رہتا تو اکیلا نہ ہوتا۔ یا اپنی بیوی ورجینیا کو ساتھ رکھتا، یا اس کے ساتھ نکلتا۔ وہ ایک مہربان اور محبت کرنے والا خاوند تھا، اور ایک فرمانبردار بیٹا طبیعت کی تیزی کے ساتھ ساتھ اس میں فراخ دلی بھی تھی، فیاضی بھی اور شرافت بھی اُس کے ذوقی رجحانات میں ایک سادگی تھی اور ہر خوبصورت اور اچھی چیز کے لئے اُس کے دل میں تعریف کا جذبہ تھا ہم تینوں گویا ایک دوسرے ہی کے لئے زندہ تھے" مسز کلیم کے ان الفاظ سے خیال ہوتا ہے کہ پو کے گھر کی فضا بہت پرسکون قسم کی ہوگی۔ لیکن اس پرسکون فضا میں بھی اُس کے دل پر ہر وقت ایک گھٹا سی چھائی رہتی تھی اور وہ ایک ایسی دنیا میں زندگی گزار رہا تھا۔ جہاں ناگفتنی ہیبت اور ملال آمیز شوکت طاری تھی۔

پو کے جیون ناٹک میں عورتوں کے لحاظ سے سب سے اہم کردار اُس کی ساس تھی جس کی بنیادی خصوصیتوں کو آپ کسی حد تک جان چکے ہیں لیکن ایک بات کا لحاظ رہے۔ اس کی اہمیت بھی بنیادی لحاظ سے ہی تھی بظاہر وہ پس منظر کا ایک کردار معلوم ہوتی ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ کہ ہم ایسے باہر سے دیکھنے والوں کو ایک بڑھیا میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ دوسرا کردار اسی بڑھیا کی بیٹی ورجینیا ہے۔ پو جیسے جوہر خداداد کے مالک اور لاپرواہ سے آدمی کو دو وجوہ کی بنا پر عورت کی ضرورت تھی ایک اپنی تخلیقی تحریک کے طور پر اور دوسرے اپنی دیکھ بھال کے لئے۔ ورجینیا سے شادی کرکے گویا اُس نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ اور یوں ورجینیا تحریکِ تخلیقی کے لئے اور اس کی ماں مسز کلیم دیکھ بھال اور حفاظت کے لئے ملی۔ ورجینیا ذہنی اور جسمانی لحاظ سے بچہ سا تھی۔ ابھی اُس کی عمر بارہ ہی سال کی تھی کہ پو نے اُسے اپنی بیوی بنانے کی کوشش کی لیکن اُس کی کم عمری کے باعث دور نزدیک کے کسی رشتہ دار کی مداخلت نے ایک دو سال تک یہ کام نہ ہونے دیا۔ ورجینیا کی ماں جس طرح اور باتوں میں پو کے دوسرے احکام اور خواہشات کے تابع تھی۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اُس کی رضامندی پو کو حاصل تھی۔ یہ دونوں ماں بیٹیاں پو کی ذہنی اور نفسی ضروریات کو کما حقہٗ پورا کرتی تھیں ساس میں اُسے شاید بچپن کی چھوٹی ہوئی ماں کا عکس نظر آتا تھا اور اس بالی بیوی میں اُسے اُن نحیف و نزار شکلوں کا سایہ دکھائی دیتا تھا جو ہر وقت اُس کے تصوّرات میں گردش کرتی رہتیں اور پھر اس کی تحریروں میں

بقائے دوام پاتیں۔ اس لحاظ سے ورجینیا پو کے تخریب آلود تخیل کو مکمل تسکین پہنچا سکتی تھی۔ طفلانہ ذہنیت، پیلا، مریضانہ چہرہ اونچا اُبھرا ہوا ماتھا، یہ تمام باتیں مل کر اس کی نظروں میں ایک غیر زمینی پاکیزگی کا تصور پیش کرتی تھیں اور یوں اُس کی بیوی ایک ایسا سایہ سا بن جاتی تھی۔ جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو جس کی جسمانی ضرورت کے سلسلے میں کوئی سوال ہی نہ اُٹھتا ہو۔ اور جیسے کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے اگر ایسا کوئی سوال پیدا بھی ہوتا تو پو اس کے پورا کرنے سے قاصر تھا۔ اور یہ انوکھا پن کچھ بیوی ہی کے معاملے میں نمایاں نہیں دکھائی دیتا۔ کیونکہ اس شادی سے پہلے اور بعد کے زمانے میں جتنے بھی معاشقے اس نے کئے ان سب میں یہی اچھوتا پن کارفرما تھا۔ جس طرح بچپن میں اپنے ایک دوست کی بیوی سے جو عمر میں اس سے کہیں بڑی تھی اُسے وارفتگی پیدا ہو گئی تھی اور اُس کے احساسات میں کوئی جسمانی پہلو نمایاں نہ تھا۔ اسی طرح بعد کی عمر میں بھی اُس کے اکثر معاشقے روحانی ہی قسم کے ہوا کرتے تھے۔ ہاں ایک بات تھی اگر کبھی ذہنی طور پر اس کے جسمانی احساسات بیدار ہوتے تو پھر اُن کی شدت اور تندی و تیزی بھی یکسر طور پر غیر معمولی ہی ہوا کرتی تھی۔ عمر کے آخری سالوں میں جب کبھی اس کے دل میں جنسی جذبات جاگ اٹھتے تو وہ گویا دیوانہ سا ہو جاتا۔ اُسے اپنے احساس و شعور پر قابو نہ رہتا۔ شادی سے پہلے بھی ایک بار ایسا واقعہ درپیش ہوا تھا۔ بالٹی مور میں اس کے ابتدائی قیام پر ایک دھندلکا سا چھایا ہوا ہے لیکن اس زمانے میں اس کے ایک معاشقے کا پتہ چلتا ہے۔ اس عورت کو وہ نظموں میں "میری" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔ (جس کا اصل نام مس ڈیورو تھا) اس معاشقے کے دوران میں ایک روز شام کو اُس نے اچانک یہ تجویز پیش کر دی کہ چلو ہم اسی وقت شادی کر لیں۔ اس غیر معمولی رویے اور اصرار سے وہ گھبرا گئی اور اس نے انکار کر دیا تو وہاں سے چلا آیا۔ اور گھنٹے آدھ گھنٹے کے بعد پھر اُس کے گھر پر جا پہنچا لیکن اب وہ نشے کی حالت میں تھا۔ اور اس حالت میں اُس نے اس قسم کا وحشیانہ رویہ اختیار کیا اور مجنونانہ حرکات کیں کہ اُسے کہہ دیا گیا کہ یہاں سے چلے جایئے۔ اور مہربانی سے پھر کبھی نہ آیئے۔ ابتدائی زندگی کا یہ واقعہ اُس کے آخری زمانے پر روشنی ڈالتا ہے لیکن یہ واقع اور بعد کے تمام واقعات ویسے عجیب نہ تھے جیسا کہ ورجینیا سے اُس کی شادی کا معاملہ۔ کیونکہ اصلاً یہ شادی کوئی شادی ہی نہ تھی۔

پو کے ذہن کا جنسی پہلو اوپر کی باتوں کے مدنظر ایک انوکھی نشوونما کا حامل تھا۔ معلوم نہیں کہ اس نشوونما میں کن اثرات کو دخل ہے۔ لیکن ایک سراغ ہمیں ملتا ہے اور وہ یہ کہ بلوغ کے زمانے میں اُس کے زبردستی کے باپ مسٹر ایلن کی اپنی بیوی سے بے وفائیوں نے اُس کے ذہن پر یقیناً ایک خاص قسم کا اثر پیدا کیا ہو گا۔

محبت اور عورت کے متعلق پو کے خیالات بہت سیدھے سادھے اور شریفانہ قسم کے تھے۔ مثلاً نوجوانی کی محبت کے متعلق وہ لکھتا ہے۔ "نوجوانی کی شاعرانہ محبت بغیر کسی حیل و حجت کے ایک ایسا انسانی جذبہ ہے جو زیادہ سے زیادہ ہمارے اُن تصورات سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے جو محبت کی پاکیزہ لذت کے متعلق ہمارے ذہنوں میں قائم ہیں۔" ایک نقاد نے لکھا ہے کہ پو کی تخلیق کے نسائی پیکر یا تو سنگین مجسّمے ہیں یا فرشتے اور ایک اور مصنف کہتا ہے کہ پو عورت کی بجائے عورت کے تصور کی پوجا کرتا تھا۔ اور یہ رائیں پو کی خیالی اور حقیقی زندگی کے متعلق ایک سنجیدہ گہرائی کی حامل ہیں اگر ہم اُس کی زندگی کے اہم واقع یعنی ورجینیا سے اس کی شادی پر غور کریں اور اس کے ساتھ ہی اُس کی لکھی ہوئی کہانیوں پر نظر دوڑائیں تو دونوں میں ہمیں ایک یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ دونوں کا منبع و ماخذ ایک ہی نظر آتا ہے۔ شادی کا واقعہ اُس کوشش کو ظاہر کرتا ہے۔ جو اُس نے اپنے آپ کو حقیقت سے ہم آہنگ بنانے میں کی۔ اور افسانوی کردار اُس کی اس کوشش کو ظاہر کرتے ہیں جنہیں اُس نے اعصابی مریضوں کے اسلوب پر ایک خیالی دنیا میں اپنی ذہنی ضروریات کی تکمیل کے لئے بسایا تھا۔

لیکن اپنے عشقی واقعات کی کثرت کے باوجود پو عام معنوں میں عاشق نہ تھا۔ اپنے ایک مقالے "اصولِ شعری" میں عورت کے متعلق وہ لکھتا ہے "اس سے (عورت سے) بڑھ کر کوئی اور بلند اور پاکیزہ موضوع کسی شاعر کے زیرِ قلم نہیں آیا۔ یہ ایک خیال ہے جو روح کو پھیلاتا ہے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے مصائب کے باوجود اُس صورت میں تقدیر کا شکوہ کرے جبکہ اُسے کسی عورت کی غیر متزلزل محبت حاصل ہو، ...... عورت کے حُسن میں، اُس کی چال کی رعنائی میں، اُس کی آنکھوں کی چمک میں، اُس کی آواز کے ترنم میں، اُس کے نرم و نازک قہقہوں میں، اُس کی آہوں میں، اُس کے ملبوس کی سرسراہٹ کی ہم آہنگی میں انسان کو سچی شعریت کا احساس ہوتا ہے اُس کی دل کو جیت لینے والی محبت میں، اُس کی گرم جوشی میں، اس کی لطیف کشادہ دلی میں، اُس کے نحیف اور عقیدتمندانہ صبر و قناعت میں بھی ایک گہرا احساس شعریت ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر، ہاں، اس سے کہیں بڑھ کر انسان شعریت کو عورت کے اعتماد و اعتقاد میں، اُس کی پاکیزگی میں،

اُس کی قوت میں اور اُس کی محبت کی یکساں رفعت شان میں ہو جاتا ہے۔

لیکن محبت اور عورت کے متعلق اس اندازِ نظر کے باوجود بعض لوگ جو پو سے ذاتی طور پر واقف تھے یہ کہتے ہیں کہ وہ جذبات سے یکسر عاری تھا۔ اور بیوی کے معاملے میں اس کا رویہ اس خیال کی تائید ہی کرتا ہے۔ ورجینیا اور اُس کے تعلقات عمر بھر نامکمل ہی رہے، روحانی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ اور اس سلسلے میں ایک عجیب حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ پیار سے اکثر اپنی بیوی کو "سِس" کہا کرتا تھا جو "سسٹر" (یعنی بہن) کا مخفف ہے۔

اس کے علاوہ ابھی اُس کے بیاہ کو کوئی خاص عرصہ نہیں ہُوا تھا کہ وہ جب کبھی سماجی تعلقات میں کسی سے ملنے ملانے جاتا تو اوّل تو تنہا ہوتا۔ اور اگر ورجینیا اس کے ساتھ ہوتی بھی تو سارا وقت خاموش رہتی۔ کسی کے گھر پر یا کسی ادبی حلقے میں جو کچھ بات چیت ہوتی اُس میں صرف وہی حصہ لیتا۔ اس کی بیوی کا وہاں ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ اور اس کے باوجود وہ جب کبھی بیوی کی بات کرتا تو یہی کہتا کہ اُس کی زندگی کا صرف وہی ایک سہارا ہے۔ اور یہ بات حقائق سے صحیح ثابت ہوتی ہے۔ بیوی کی موت کے بعد اس کے اعصاب گویا بالکل جواب دے گئے لیکن اس صدمے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُسے اپنی بیوی سے ویسی ہی محبت اور دلبستگی تھی جیسی کسی خاوند کو ہوتی ہے بلکہ وہ ایک ذریعہ تھی جس سے وہ اپنی ذہنی کشمکش کو ایک ہنگامی تسکین دے سکتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب وہ نہ رہی تو اُس کی ذہنی کشمکش بڑھتے بڑھتے جنون کے درجے تک جا پہنچی۔ جس طرح اُسے اپنی عظمت میں ایک افسانوی اعتقاد تھا اسی طرح بیوی کی ہستی بھی اس کی نفسی زندگی کی اُلجھنوں کے افسانے کے لئے ضروری تھی۔

جذباتی سوانح نگار اور نقاد اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پو کو اپنی بیوی سے ایک برادرانہ دلبستگی تھی اور ایک طفلانہ عورت کے ساتھ یہ غیر معمولی سنجوگ پو کے کردار کی امتیازی پاکیزگی کا ثبوت ہے۔ لیکن حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر پو نے ورجینیا سے اس لئے شادی کی تھی کہ اُسے ارادتاً مکمل طور پر اپنی بیوی بنائے تو اس سے صرف دو نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ یا تو اُس کے نفس میں ایک ظلم اور سفاکی تھی یا وہ اعصابی لحاظ سے صحت مند نہ تھا اور اگر صرف یہ بات تھی کہ وہ ایک نام کی بیوی حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس سے ایک اور ہی نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ معمول کی زندگی کو یوں ارادی طور پر تیاگ دینا ظاہر کرتا ہے کہ اُس میں کسی قسم کی نہایت اہم اور گہری احساساتی بدنظمی تھی اور اسی لئے اُس کا

تخیل عجیب تخلیقات و تصورات میں کھو یا رہتا تھا اور یہ نتیجہ ہمیں قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک شخص نے جو پو کو زندگی میں جانتا تھا کہا ہے: "وہ ہر وقت کسی نہ کسی کی محبت میں مبتلا رہتا تھا" ــــ اور نوجوانی سے موت تک اس کی زندگی ہمیں بھی عشقبازی کا ایک تانتا دکھائی دیتی ہے اگرچہ ان عشقی معاملات سے کبھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا لیکن عشق کے لحاظ سے اس کی اہلیتِ نفسی سے ہمیں انکار نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ پو اس قسم کا مستقل عاشق ہے اور دوسری طرف ہمیں نظر آتا ہے کہ نوجوانی کے عین بعد ہی اپنی ابتدائی دنیوی زندگی میں ہی وہ جلتے بلتے ہوئے اپنے دامن کو ایک ایسی عورت سے باندھ دیتا ہے۔ جو ابھی نہ صرف ذہنی لحاظ سے بچہ تھی بلکہ جسمانی لحاظ سے بھی۔ اور جس کے متعلق پو کو بخوبی علم تھا کہ شادی کے بعد کافی عرصے تک زناشوئی کے تعلقات قائم کرنا ناممکن ہو گا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ بلوغ کے بعد بھی بیوی کی مسلسل بیماری کے باعث پو کو اُس سے خلوت میں الگ ہی رہنا پڑا۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس غیر متوقع صورتِ حال سے جو ضبطِ نفس پو کو کرنا پڑا اس نے بھی اُس کی نفسی اُلجھنوں میں معتدبہ اضافہ کیا ہو گا۔ لیکن پو کی اُفتادِ طبع اور اُس کے دوسرے افعال کے مدِنظر یہ خیال کچھ زیادہ صحیح نہ ہو گا۔

یہ بات ہمیں بہت اُلجھاتی ہے کہ آخر ورجینیا میں وہ کون سی بات تھی جس کی بے پناہ اپیل کے آگے اُسے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اُس کی کہانیوں اور نظموں میں بھی، جن فرشتوں اور سنگین مجسموں کی ایسی عورتوں کا ذکر ہے، اُن کے ہوتے ہوئے یہ اشارہ ہمیں ملتا ہے کہ پو کی خارجی زندگی چونکہ جنسی افعال سے مبرّا تھی اس لئے اس کے تصوّرات بھی ایسی ہی عورتوں کے خیالوں سے لبریز تھے اور یہیں سے یہ نظریہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ورجینیا کے حسن میں جو ایک غیر جنسی قسم کا رنگ تھا وہی پو کی پسندیدگی کا باعث بنا۔ اور یوں ضبطِ نفس کا سامنا اُسے مجبوراً نہیں ہوا بلکہ اُس نے ارادی طور پر اس اندازِ حیات کو منتخب کیا۔ اس کے دل کو صرف اس دلکشی کا احساس تھا جو نسائی حُسن میں اُس وقت باقی رہ جاتی ہے جب اُس میں سے ہر قسم کے جنسی اجزا الگ ہو جائیں۔ اس طرح پو کہہ سکتا تھا کہ ورجینیا کے لئے اُس کی دلبستگی اور رغبت پاکیزگی کی پُوجا کا حکم رکھتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی تحریروں میں وہ جنسی جذبے کے تصوّر ہی سے منحرف ہے نیز عملی زندگی میں

بھی جب کبھی کسی عورت سے عشقی تعلق قائم کرتا ہے تو یہی جنسی پہلو سے علیحدہ رہنے والی بات ہی اُس کے تعلق کو درہم و برہم کر دیتی ہے۔ تو ہمیں شک گذرتا ہے کہ کہیں پاکیزگی میں یہ غیر معمولی دلچسپی کسی گہری نفسی ممانعت اور اُلجھن کا ظاہری نشان تو نہیں ہے۔ اور پو، اگرچہ ورجینیا کی دلکشی کے بھید کو وہ خود نہ جان سکا لیکن ہم کسی حد تک پہچان لیتے ہیں کہ نفسی ممانعت اور اُلجھن ہی اس رغبت کا باعث تھی۔ گویا ورجینیا سے شادی کر کے بیوی کی نوعمری نہ صرف زن و شوئی کے تعلقات میں مانع رہی بلکہ دوسری عورتوں سے بھی جب کبھی پو کے تعلقات قائم ہوئے تو وہ پورے طور پر روحانی نہ سہی، لیکن پورے طور پر جسمانی بھی نہ ہو سکے کیونکہ وہ ایک شادی شدہ انسان تھا۔ حقیقی زندگی میں تو بیوی کی کم عمری اور مرض پو کے مکمل تعلق میں حائل ہوئے لیکن ذہنی زندگی میں نہ مرض کا خیال تھا نہ پاکیزگی کا، صرف پو کی اپنی ذات حارج تھی۔

ہاں، ورجینیا کی شکل و شباہت کے متعلق۔ اس سلسلے میں بھی مختلف بیان ہیں۔ بعض اُسے دلکش اور حسین بتاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے بیان سے جنہوں نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کا ذکر تحریر میں کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسین تو اتنی نہ تھی جتنی اچھوتی تھی۔ اُس کے حُسن یا دلکشی میں ایک انوکھا پن تھا۔ ایک اجنبیت سی تھی۔ بال سیاہ تھے اور شربتی آنکھوں میں اس کی طبعی نرمی اور دل سوزی جھلک رہی تھی۔ لیکن اس کا اونچا ماتھا۔ چہرے کے خدوخال کے تناسب کو نامناسب بنائے ہوئے تھا۔ اس کے علاوہ اُس کا رنگ اتنا پیلا تھا کہ بیک نظر دیکھنے میں تو پھیکا سفید محسوس ہوتا تھا گویا اُس میں لہو کی ایک بھی بوند موجود نہیں ہے اور اُس کے طفلانہ ذہن کے ساتھ کالے بال، چمکدار آنکھیں اور پیلی رنگت ۔۔۔۔ یہ سب مل جل کر ایک غیر انسانی قسم کا تاثر پیدا کرتی تھیں۔

اپنی کہانیوں میں، تنقیدی مقالوں میں، متفرق ٹکڑوں میں، ۔۔۔۔ ہر جگہ پو لارڈ ویرولم کا ایک فقرہ درج کرتا ہے "دنیا میں کوئی ایسا اعلیٰ حُسن نہیں ہے جس میں تناسب کا ایک انوکھا پن موجود نہ ہو"۔ اور اس فقرے پر اُس نے نہ صرف اپنے جمالیاتی نظریے کی بنیاد رکھی بلکہ اُس کے تخیل کی کارفرمائی کا بھی یہ قانون بن گیا۔ یہاں ایک خیال رہے کہ انوکھے پن سے پو کی مراد اچھوتا پن نہ تھی بلکہ اس اجنبیت کو وہ "غیر معمولی" سے بڑھ کر مافوق الفطرت کے معنی دیتا تھا۔ اور اسی لئے اُس کی ذہنی دنیا ایک ایسی سرزمین ہے جہاں معمول کے مطابق باتیں غیر معمولی سمجھی جاتی ہیں اور غیر معمولی بلکہ مافوق الفطرت باتوں کو روزمرّہ کی چیزیں تصوّر کیا جاتا ہے۔ وہاں گویا ہماری دنیا کے تمام اصول و قوانین باطل ہو جاتے ہیں۔ وہاں کے رہنے والے بھی کسی دھندلے خطے کے رہنے والے ہیں، اور ایک ایسی سرزمین میں چلتے پھرتے ہیں جو ہمارے احساسات سے دور کسی ان دیکھے، انجانے مقام پر واقع ہے۔ وہاں کا ماحول تخیل کی غیر معمولی قلابازیوں کا رہونِ ترتیب ہے اور اسی لئے چونکہ ان کی آنکھیں کوئی عام منظر نہیں دیکھتیں، ان کے دل بھی عام جذبات کو پرورش نہیں کرتے۔

لیکن ہم ورجینیا سے ہٹتے ہوئے پو کی خیالی دنیا میں کھوئے جاتے ہیں۔ ابھی ورجینیا کے آخری دور کا بیان باقی ہے۔ ایک شخص جسے اُس زمانے میں پو کے گھر جانے کا اتفاق ہوا لکھتا ہے "میں نے دیکھا کہ ورجینیا بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ لیکن یہ بستر تنکوں کا بنا ہوا تھا۔ نہ اس پر کوئی گدیلا تھا۔ نہ اس قسم کی کوئی اور چیز۔ چارپائی پر تنکے بچھا کر ان پر ایک دو برف کی ایسی سفید چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ موسم سردی کا تھا اور بیمار عورت رہ رہ کر سردی سے سکڑی جاتی تھی اور اُسے تشنج کا دورہ پڑتا تھا جو دق کے مریض کو اکثر شدید حرارت میں محسوس ہوا کرتا ہے۔ رزائی یا لحاف کے طور پر خاوند کا بڑا اکوٹ اس کے اوپر رکھا تھا۔ اور اس کے سینے پر ایک بڑی سی چتکبری بلی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بلی کو اپنے مفید ہونے کا احساس تھا یعنی وہ جانتی تھی کہ اس سردی میں اپنی مالکن کو وہ اپنے جسم کی گرمی سے کتنا آرام پہنچا رہی ہے۔ بڑا اکوٹ اور بلی۔ یہی دو چیزیں سردی سے بچاؤ کا ذریعہ تھیں اور پو بیوی کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا اور اُس کی ساس اُس کے پاؤں اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے تھی تاکہ اس طرح بھی کچھ نہ کچھ گرمی اُسے پہنچائی جا سکے"۔۔۔۔

پو کے لئے یہ انتہائی عزبت اور پریشان حالی کا زمانہ تھا۔ غربت کو دور کرنا اُس کے بس کی بات نہ تھی اور اُسے اس کا بھی یقین تھا کہ اُس کی مدقوق بیوی آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گی۔ ممکن ہے کہ اُس کے بسترِ مرگ پر بیٹھے ہوئے پو نے اپنی امکانی کوشش کی ہو کہ وہ اپنی نفسی اُلجھنوں کو آئندہ کے لئے کسی حد تک تو صاف کرے۔ لیکن جیسا کہ آئندہ کے واقعات سے ظاہر ہو گا۔ یہ مادہ ہیولیٰ جو اُس کے ذہن کے ہر کونے پر مستولی تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ بے ترتیب ہوتا گیا۔

۳۰ جون ۱۸۴۷ء کے روز ورجینیا کا آخری دن تھا۔ پو کے دل

میں اس کے لئے خواہ کسی قسم کا جذبہ کیوں نہ ہو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس جذبے میں محبت کی نرمی ضرور موجود تھی۔ اور اگرچہ اُس نے کافی عرصے سے اس حادثے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رکھا ہوگا۔ پھر بھی جب بیوی کی موت سے سامنا ہوا تو اُس کے دل و دماغ گویا غم کے ایک اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے اور اس غمناک کیفیت میں رفتہ رفتہ اور بھی پیچیدگی پیدا ہوتی گئی جب کہ اُس کا آسودہ جنون اپنے ہنگامی دوروں کو لے کر آن پہنچا۔ جنون سے اب تک دُھد ہنے کی وجہ اُس کی بیوی ہی تھی۔ بیوی کی ہستی اُس کی کش کش سے پُر زندگی اور ذہانت کے لئے ایک سہارا تھی لیکن جب وہ نہ رہی تو اُس کے تصورات آہستہ آہستہ پہلے سے زیادہ وحشت ناک ہوتے گئے اور اُس کا تخیل اس کے سامنے متواتر جنون و جرائم کی تصویریں لانے لگا۔

اور اب ہم تیسرے اہم کردار کی طرف آتے ہیں۔ بیوی کی موت نے خطرناک طور پر پو کو آزاد کر دیا۔ اور اُس کی زندگی میں اُن کسی حد تک مضحکہ خیز معاشقوں کا دور شروع ہو گیا جن کی انگیخت سے آخری سین کی تیاری ہونے لگی۔ بیوی کی موجودگی نے پو کے احساسات پر جو پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ اب اُٹھ چکا تھا اس لئے اُسے اپنے اُن ذہنی رجحانات سے جو اب تک آسودہ رہے تھے گہری شناسائی ہو گئی، اور جب جنس کا سویا ہوا شیر جاگ اُٹھا تو پو کی زندگی عورتوں کے رحم و کرم پر بسر ہونے لگی۔ آج تک کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ اس زمانے میں اُسے کتنی عورتوں کی طرف رغبت ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ کم سے کم چار عورتیں ایسی تھیں جن سے اچھے خاصے جذباتی تعلقات قائم ہوئے۔ اور اُن میں سے دو کے ساتھ تو نسبت بھی ٹھہر گئی۔ ایک طرف تو اُس کی ذہنی کارفرمائیوں کا یہ حال تھا اور دوسری طرف اس کے اندیشہ ناک دل و دماغ کی یہ حالت تھی کہ رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو جب تک اُس کی ساس سرہانے بیٹھ کر اُس کی پیشانی کو نہ سہلاتی اسے نیند ہی نہ آتی۔ اور اس سہلانے کے دوران میں ظاہر ہے کہ وہ اپنے وحشیانہ تصورات کی اتھاہ گہرائیوں میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہوگا۔

عشق بازی کے یہ قصے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ورجینیا کی موت سے کچھ عرصہ پہلے ہی شروع ہو گئے تھے۔ شاید اُسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اب اُس کی بیوی کے دن تھوڑے ہیں اور کوئی دن آتا ہے کہ یہ سہارا باقی نہ رہے گا، پابندی اُٹھ جائے گی۔ اور اس لئے وہ پیشقدمی کے طور پر عشق کی طرف راغب تھا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔

مسز اوس گُڈ ایک جذباتی شاعرہ تھی۔ پو نے اُس سے سلسلہ جنبانی کرتے ہوئے میل جول شروع کر دیا لیکن جلد ہی یہ تعلقات رسوائی کی صورت اختیار کرنے لگے اور رسوائی سے ڈر کر شاعرہ الگ تھلگ ہو بیٹھی۔ اس کے بعد مسز شیو کی باری آئی۔ اس عورت نے پو کو بے ہوشی کے دوروں میں نرس کیا تھا، یہ خاتون بھی مندرجہ بالا شاعرہ کی طرح پو کے دیوانہ جوش سے خوفزدہ ہو کر علیحدہ ہو گئی۔ اور پھر مس رَوئسٹر کی باری آئی، یہ پو کے بچپن کی محبوبہ بھی تھی، لیکن یہ معاملہ بھی پہلوں ہی کی طرح ٹائیں ٹائیں فش ثابت ہوا۔ جس طرح ہر معاملے میں پو کو کوئی عجیب طاقت آگے بڑھنے پر مجبور کرتی تھی اُسی طرح اُس کا ردِ عمل ہوتا تھا۔ اور کسی بھی معاشقے سے کوئی مناسب نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب عورتوں میں سے پو کی نظر میں کوئی بھی حقیقی نہ تھی۔ ہاں۔ وہ اُس کے اُلجھنوں سے بھرپور دل و دماغ میں عشقی تحریکات کو برانگیختہ کرتی تھیں، لیکن جو تخیل کی دیوی ہر لمحے اُس کے تصورات پر چھائی رہتی تھی۔ اُس کا ہنگامی نمائندہ بھی وہ انہیں نہ بنا سکتا تھا۔

اس دور کے معاشقوں میں سے سب سے زیادہ تفصیلات ہمیں مسز سارا وٹمن کے قصے کی معلوم ہیں اور چونکہ بیوی کی موت نے جس کشمکش اور ہنگامے میں پو کی زندگی کو دھکیل دیا تھا۔ اُس پر یہ معاملہ سب سے بڑھ کر روشنی ڈالتا ہے۔ اس لئے مسز وٹمن کو ہی ہم پو کے تماشائے حیات کا تیسرا اہم کردار قرار دیں گے۔ مسز وٹمن بھی شاعرہ تھی اور زمانے کے رجحانات کے مطابق ادبی ذوق رکھتی تھی۔ طبعاً ایک جذباتی عورت تھی اور اس کے ساتھ ہی بیوہ۔ ذہنی رجحانات کے لحاظ سے اس میں عصبیت بھی پائی جاتی تھی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہر وقت کسی اہلِ بصیرت کا روائتی سفید لباس اس کے زیبِ تن ہوتا اور ایتھر کا عطر ہمراہ لئے رہتی اپنے اس طبعی الوکھے پن کے باعث وہ پو کا مرکزِ ذہنی بننے کے لئے بہت مناسب عورت تھی۔ اور پو خاطر خواہ طور پر اُس کی ہستی کے ارد گرد اپنے الوکھے اور مجنونانہ تصورات کا تانا بانا بن سکتا تھا۔

پو کی پُرجوش توجہ اور اندھا دھند اظہارِ اشتیاق سے اُس کا ذہن بالکل اپنے قابو میں نہ رہا اور بعض دوستوں کے روکنے کے باوجود وہ پو سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ اور اس بات کا اُسے خیال نہ آیا کہ پو کی ذات اب ایک کھنڈر کی مانند ہے۔

۱۸۴۵ء کے موسم گرما میں پو شہر پروویڈنس سے گذر رہا تھا

یہیں مسز وٹمن رہتی تھی۔ چاندنی رات تھی اور اپنے مکان کے باغ میں مسز وٹمن معمول کے مطابق سیر کر رہی تھی۔ پو کا گذر کہیں قریب سے ہوا اور سب سے پہلی بار اس نے سارا وٹمن کو دیکھا۔ اور اگرچہ پو نے بعد میں جا کر یہ لکھا ہے کہ اُسی لمحے میں اُسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ عورت بھی اس کی اپنی ہستی کی طرح ایک "ہم قسمت روح" ہے لیکن ان دونوں کی ملاقات ورجینیا کی موت کے بعد ہوئی۔ ملاقات کا قصہ یوں ہے کہ کسی محفل میں پو نے سارا وٹمن کے متعلق کچھ توصیفی کلمات کہے۔ ان سے متأثر ہو کر مسز وٹمن نے پو کے اعزاز میں ایک نظم لکھ کر شائع کی۔ اور جب پو کی نظر سے وہ نظم گذری تو اس نے سارا کے نام ایک خط لکھا جس کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ ان اقتباسات سے پو کی وہ ہذیان آلود ذہنی کیفیت صاف ظاہر ہے جو موت تک برابر قائم رہی۔

"میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ سب سے پہلے میں نے تمہارا نام ——— سے سُنا۔ وہ گفتگو میں اپنے قول کے مطابق تمہاری "انفرادی افتادِ طبع" کے متعلق اشارہ کر رہی تھی۔ نیز اُس نے کنایۃً کچھ تمہارے "غم" کے بارے میں بھی کہا۔ پہلی بات نے میری توجہ پر ایک عجیب گرفت کی اور دوسرے کنائے نے میری اُس توجہ کو پابند اور مرکوز کر دیا۔ اُس نے تمہارے ایسے خیالات، جذبات، رجحانات اور کیفیات کا ذکر بھی کیا جنہیں میں جانتا تھا کہ یہ میرے دل کی باتیں ہیں، نوعِ انسانی میں سے اور کوئی ان میں حصہ دار نہیں ہے۔ چنانچہ یہ سب باتیں سُن کر میری روح پر ایک گہری ہمدردی کا احساس چھا گیا۔ جو کچھ مجھے محسوس ہوا۔ اُسے میں بہترین طریق پر یوں ظاہر کر سکتا ہوں کہ "تمہارا انجان دل مجھے اپنے سینے میں محسوس ہونے لگا، اور یہ معلوم ہوا کہ اب یہ دل یہیں رہے گا، اور اس کے ساتھ ہی میرا دل تمہارے سینے میں محسوس ہوا۔

"اسی لمحے سے میں تمہیں چاہتا ہوں، اس لمحے کے بعد جب کبھی میں نے تمہارا نام سُنا یا کہیں پڑھا میرے دل پر ایک لرزش سی طاری ہو گئی اور اس لرزش میں اندیشہ و مسرت۔ دونوں کی آمیزش تھی۔ مجھے یہی خیال رہا کہ تم ایک بیاہتا عورت ہو اور گذشتہ چند مہینوں ہی میں مجھ پر حقیقتِ حال کھلی ہے۔ تمہیں دیکھنا تو درکنار میں تم سے بات کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکتا تھا کئی سال تک میں اپنے لبوں پر تمہارا نام تک نہ لایا، اور اس دوران میں جب کبھی کوئی تمہارا ذکر کرتا تو اُسے میری روح ایک ساغرِ مے سمجھ کر نوش کرتی۔

تمہارے متعلق اگر میں کوئی سرگوشی بھی سُن پاتا تو اُس سے مجھ میں ایک چھپی حِس بیدار ہو جاتی اور یہ احساس خوف، بہجت آمیز شادمانی، اور ایک ناقابلِ وضاحت وحشی جذبے سے مل جل کر بنا تھا اور اس کی مشابہت احساسِ جرم سے تھی؛ ..... محض یہ خیال کہ جو الفاظ میں لکھ رہا ہوں۔ ان پر تمہاری پیاری انگلیوں کا زور پڑے گا اور تمہاری رسیلی آنکھیں انہیں دیکھیں گی ——— ان الفاظ کو جو ایک شدید محبت کی گہرائی سے بیساختہ طور پر اُمڈ آئے ہیں ——— محض یہ خیال میری روح کو ایک ایسی انتہائی مسرت سے لبریز کئے دیتا ہے جو میری انسانی فطرت کے لئے بہت کافی ہے ..... لیکن ایک اور خیال بھی تھا جس نے مجھے یہ سطریں لکھنے پر مجبور کیا۔ ——— میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ احساس ——— یہ مقدس جذبہ جو میرے سینے میں اُس کے لئے چمک رہا ہے۔ آسمان سے تعلق رکھتا ہے: آسمانی ہے، اور یوں اس کے پاکیزہ سینے کی گہرائیوں میں بھی جوابی محبت کا کم سے کم ایک ذرّہ تو لازمی طور پر ہو گا ——— اور میرے اللہ! کتنے عرصے تک ——— آہ کتنے عرصے تک میں یونہی بے مصرف انتظار کرتا رہا ہوں، نا اُمیدی میں اُمید کی جھلک دیکھتا رہا ہوں یہاں تک کہ آخرِ کار مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جو نا اُمیدی کی کیفیت سے کہیں بڑھ کر سخت اور بے باک ہے۔"

لیکن یہ عورت بھی جسے پو ایسے جوشیلے الفاظ میں مخاطب کرتا ہے اس قابل نہ تھی کہ اس کے تصورات کی آدرشی عورت کا نمائندہ بن سکتی۔ ہاں، دوسری عورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ نسبتاً اس درجے کے لئے موزوں تھی لیکن حقیقتاً نا مکمل۔ مگر حقیقت پر پو کی گرفت اس قدر ڈھیلی پڑ چکی تھی کہ اُس کی معمولی انفرادیت ہی اس کو ایک غیر زمینی دلکشی کی صورت میں لبھانے لگی بلکہ کچھ عرصے کے لئے تو اُس کے ذہن سے ورجینیا کا تصور بھی جاتا رہا۔ ہاں اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے کسی کونے میں یہ احساس موجود تھا کہ اُسے مسز وٹمن کے تعلقات کے سلسلے میں کس مشکل کا سامنا ہے۔ وہ اتنا اندازہ تو آسانی سے لگا سکتا تھا کہ مسز وٹمن جسمانی طور پر ایک صحت مند عورت ہے اور اگر اُسے بیوی بنا لیا گیا تو اس صورت میں زناشوئی کے بعض ایسے حقوق بھی اس کو پورے کرنا ہوں گے جن کی تکمیل سے پو جوہ قاصر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ایک چھپی حِس بیدار ہو جاتی اور یہ

احساس خوف، ہیبت آمیز شادمانی اور ایک ناقابلِ وضاحت وحشی جذبے سے مل جل کر بنا تھا اور اس کی مشابہت احساسِ جرم سے تھی“ — گویا اس کے نفس تحت الشعور نے اُسے متنبہ کر دیا تھا لیکن وہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور تھا۔ اس معاشقے کے دوران میں پو کی حرکات و افعال کسی ایسے شخص سے ملتے تھے جسے اس بات کا شدید احساس ہو کہ وہ کسی عجیب پیچیدہ مصیبت کے جال میں گرفتار ہے۔ اور اسی لئے وہ ادبر کے خطوں کی طرح کئی اور خطوں میں اپنی وکالت کرتا رہا، لیکن جونہی اُسے مسز وٹمن کی رضامندی حاصل ہو گئی اس کی یاس پرستی نے اسے مے خواری کی طرف دھکیل دیا اور اسی سے نوبتی نے ان تمام تیاریوں پر پانی پھیر دیا جو شادی کے لئے کی جا رہی تھیں بلکہ الزاماً یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شادی سے ایک آدھ روز پہلے پو نشے میں دُھت مسز وٹمن کے سامنے جا پہنچا۔ تاکہ اس کا دل پلٹ جائے اور وہ اُسے اُس پابندی سے رہائی دے دے جس کی ذمہ داریوں کو وہ خاطر خواہ طور پر پورا نہ کر سکتا تھا۔

لیکن جہاں تک پو کے سوانح نگاروں نے اندازہ لگایا ہے۔ مسز وٹمن کا معاشقہ کوئی آخری معاملہ نہ تھا۔ بیوی کی موت کے بعد سے اپنی موت تک پو کا یہی شعار رہا کہ جو بھی عورت اُس کے راستے میں آئی اور اُس کے اعصابی ذہن کو ذرا بھی اپیل کی اس کا جنسی تعاقب شروع ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں تمام صنفِ لطیف اُس کے ذہن میں ایک ہستی کی صورت میں مرکوز ہو گئی تھی۔ اور اُسے اس صنف کے مختلف افراد میں کوئی تمیز نہ رہی تھی۔ اور اس لئے ہر کسی کو وہ واسطے دیتا پھرتا تھا کہ وہ اُسے خدا جانے کون سی مصیبت سے ”بچالے“ اصل بات یہ تھی کہ ورجینیا اس کی زندگی میں ایک پشتے کی حیثیت رکھتی تھی۔ جس نے اس کی ذہنی زندگی کے اس ریت کے محل کو برقرار رکھا ہوا تھا اور جب وہ سہارا نہ رہا تو اُس کے تخیل کا وہ گھروندا آنکھ جھپکتے میں ڈھ گیا۔ اور اُسے اچانک اس ضرورت کا سامنا ہوا کہ وہ اب کوئی نیا ڈھکوسلا تیار کر لے جس کے بل پر زندگی گذاری جا سکے۔ جس طرح ابتدائی ایام میں وہ اپنی حقیقی قابلیت کے ساتھ اپنی مفروضہ الجینوں کے افسانے کو ملا کر اپنے اعصابی مزاج کی تسکین کا سامان مہیا کر لیا کرتا تھا۔ اسی طرح اب اُسے پہلے سے بھی بڑھ کر کسی خود فریبی کی ضرورت تھی۔ اُس کی اُلجھی ہوئی طبیعت کے سامنے اب دنیا کا بڑے سے بڑا کام کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ زندگی کی ناکامیوں نے اُس کے ذہن پر اس قدر گہرا اثر کیا تھا کہ اب، جب تک وہ کائنات کے

معمے کو حل نہ کر لے اسے تسکین ہی نہ ہو سکتی [illegible] عظمت کے الگ بھگ ہی کوئی مرتبہ چین سے سکتا [illegible] اس کو ایسے سراب دکھائی دیتے رہے تھے لیکن پہلے وہ [illegible] کسی حد تک قابو میں رہے تھے۔ انہوں نے اُسے نقصان [illegible] حصولِ کمال کی طرف متوجہ رکھا تھا بلکہ اُس کے جوہرِ خداداد نے اُس [illegible] کو ادب کی لازوال صورت دے دی تھی لیکن حقیقت اور تخیل میں جو حد قائم ہے وہ بہت نازک ہے۔ اور وہ حد مٹ چکی تھی۔ دونوں میں اب کوئی فرق نہ رہا تھا۔ پہلے جو باتیں دھندلی حقیقت معلوم ہوتی تھیں وہ اب ایسے حقائق کی صورت میں جلوہ گر ہونے لگی تھیں جن پر اُسے اعتقادِ کامل تھا لیکن اس خطرناک حالت کو دور نہ کیا جا سکتا تھا۔ پانی سر سے گذر چکا تھا۔ وہ انجام لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہا تھا۔ کیونکہ اب وہ روک بھی باقی نہ رہی تھی۔ جس نے اُس کی عشقیہ زندگی کو کافی سے زیادہ حد تک اپنے بس میں کر رکھا تھا۔ اب وہ گویا تین دنیاؤں میں بیک وقت زندگی بسر کر رہا تھا۔ پہلے صرف دو پہلو تھے ایک خیالی پہلو اور دوسرا گھر کا حقیقی پہلو لیکن اب حیاتِ عشقی کا تیسرا پہلو بھی نظر کے سامنے تھا۔

اوپر پو کے جن ڈگمگاتے ہوئے خصائصِ طبعی کا ذکر کیا گیا ہے اس میں دوسری باتوں کے علاوہ اُس کی شراب خوری کو بھی کافی سے زیادہ دخل تھا اس لئے ضروری ہے کہ ہم اُس کی اس علت کا بھی کم سے کم مختصر جائزہ لے لیں۔

بچپن میں پو رچمنڈ کے جس سماجی حلقے میں پل کر بڑا ہوا تھا اُس میں شراب کا استعمال عادت کی بجائے تہذیب و شائستگی کا زیادہ مرہون تھا گھر آئے مہمان کی خاطر تواضع میں اس آتشِ سیال کی پیشکش طرفین کے لئے اعزاز کا باعث تصور کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایسی سوسائٹی میں ظاہر ہے کہ پو بلوغ سے پیشتر ہی شراب کے استعمال سے کافی سے زیادہ شناسا ہو چکا تھا۔ اور اُسے اُس ہنگامی تسکین کا بھی احساس و شعور ہو چکا تھا جو اس چیز کے استعمال سے محسوس ہوتی ہے لیکن پو کی شراب خوری کی صرف یہی توضیح کافی نہیں ہے۔ کیونکہ اُس سوسائٹی میں اور بھی تو کئی نوجوان ہوں گے جو باوجود شناسائی کے شراب کے عادی نہ بن سکے ہوں گے۔ اس کے علاوہ پو کا اندازِ استعمال تہذیب و شائستگی سے بظاہر کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ مختلف بیانات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اکثر کافی لمبے عرصے تک پو شراب کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا۔ نیز وہ متواتر اور

مسلسل پینے کا عادی نہ تھا۔ بلکہ اُس پر اپنی ذہنی کشمکش اور اُلجھنوں کے ساتھ ہی ساتھ شراب خوری کے بھی گویا دورے پڑا کرتے تھے اور اس وقت اُس کی کیفیت کسی دیوانے کی سی ہو جایا کرتی تھی جس کا چلن ایک ایسی غیر معمولی صورت اختیار کر لیتا جس کا سمجھنا اس کے روز کے ملنے والوں کی سمجھ سے بھی بالا ہو جاتا۔ غالباً وہ غالبؔ کے اس شعر کا پیرو تھا کہ

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

البتہ ایک فرق تھا کہ اس "گونہ بے خودی" کی جستجو اُسے "دن رات" نہ تھی، ہاں جب کبھی اس کی ذہنی اُلجھنیں اُس کے اختیار سے باہر دکھائی دیتیں تو وہ تسکین کے لئے اس ہنگامی علاج کی طرف رجوع ہو جاتا۔ طباّع ذہانتوں میں عموماً اور شعراء میں خصوصاً یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی کسی انفرادی افتادِ حیات یا افتادِ طبع کی بنا پر اس شعدۂ جوالہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ پوؔ نے صاف الفاظ میں اپنی مے خواری کی وضاحت کی ہے۔ ایک بار اس نے اپنی محبوبہ مسز ذمن سے کہا تھا کہ میں نے مے خواری سے حصول عشرت کے لئے اپنی شہرت زندگی اور دل و دماغ کو خطرے میں نہیں ڈالا۔ یہ کام میں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اذیت رساں یادوں سے چھٹکارا پانے کے لئے کیا ہے بعض دفعہ مجھے ایک ناقابلِ علاج تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے، اور کسی عجیب آنے والی مصیبت کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اپنے کئی ایک خطوں میں بھی اُس نے اس بیان کا اعادہ کیا ہے اور اُس کے حالاتِ ذہنی کو دیکھتے ہوئے ہمیں اُس کے بیان کو صحیح سمجھنا پڑتا ہے۔

جب کبھی اُس پر یاس اور اندیشوں کا یہ دورہ پڑتا اور اسے بھلانے کے لئے وہ شراب کا سہارا لیتا تو اُس نشے کی حالت میں اس سے عجیب حرکات سرزد ہوتیں اور ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنی اُن حرکات کے متعلق کوئی وضاحت پیش نہ کر سکتا۔ ہاں، ایک صحیح اعصابی مریض اور شرابی کی طرح رہ رہ کر یہ بات کہتا کہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا، اب وہ کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہ لگائے گا، اب اُس نے اپنی کمزوری پر قابو پا لیا ہے لیکن جلد یا بدیر پھر وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ یاس اور اندیشے اور پھر وہی ہنگامی اور غیر مکمل علاج، مے خواری۔ اور ان دوروں کے بعد اُسے اپنے دوستوں سے ایک شکایت رہتی کہ وہ اُس کے شراب کو جنون کا باعث سمجھنے کی بجائے جنون کو شراب کا باعث کیوں نہیں سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر جان ڈبلیو روبنسن نے پوؔ کی شراب خواری کے متعلق ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس میں تمام حالات اور بیانات سے ثابت کیا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک ایسا مے خوار تھا جس کی عادت بظاہر ناقابلِ وضاحت دکھائی دیتی ہے لیکن جس کی کمزوری کی حقیقی وجہ اُس کی روح کی مریضانہ کیفیت ہے۔ لیکن یہاں ایک دلچسپ اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پوؔ صحیح معنوں میں ایک شرابی تھا تو کیوں ہر عادی مے خوار اُس کی طرح تخلیقِ ادب کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اگر اُس کے اندیشوں سے لبریز دماغ کو "سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا تھا"۔ تو یہ اُس کی مے خواری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے جوہرِ طبع کی وجہ سے تھا۔ گویا وہ طباّع پہلے تھا اور شرابی بعد میں۔

پوؔ کا جیون ناٹک دیکھتے ہوئے ہم اس کہانی کے اہم کرداروں سے واقف ہو چکے۔ اور چونکہ ہر شخص اپنے ملنے والوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے اس قصے کے ہیرو کو بھی کچھ ہم نے براہِ راست پہچانا اور کچھ بالواسطہ اُن اہم کرداروں کے ذریعے سے۔ اس لئے اب ہمیں اُس کی ذہنی دنیا کی طرح رجوع ہونا چاہیئے لیکن پہلے ایک نکتے کو سامنے رکھ لیں۔ بیوی کی زندگی تک اگرچہ اُس نے اپنے گردوپیش کے لوگوں سے میل جول ترک نہیں کیا تھا بلکہ اپنے معاشقوں کے سلسلے میں مختلف صورتوں میں زندگی کا سہارا تلاش کرتا رہا لیکن اُس زمانے میں بھی بنیادی طور پر وہ تنہا ہی تھا اور یہ تنہائی ازلی اور ابدی تھی اور اس لئے لاعلاج۔ اپنی ایک نظم میں وہ بہت خوبی سے اس کا اظہار کرتا ہے۔

اکیلا

دائیں بائیں جو لوگ تھے اُن سا نہ تھا بچپن کے زمانے سے
مری آنکھ نہ اوروں کی آنکھ سی تھی مرے جذبوں کا رنگ نرالا تھا
مرے دُکھ کو کوئی نسبت ہی نہ تھی لوگوں کے رونے رُلانے سے
مرے عیش و مسرّت کی لہروں کا سب سے ڈھنگ نرالا تھا۔
جو کچھ بھی مجھے مرغوب ہُوا، وہ صرف مجھے مرغوب ہُوا،
جو شخص مجھے محبوب ہُوا وہ صرف مجھے محبوب ہُوا۔
وہ دورِ طفولیّت جس کہ اندھا طوفان بن جاتا تھا،
وہ دور جو زیست کے دن سے پہلے آنے والا سویرا تھا،
اُس دور میں ہی اس بھید کے بندھن نے مرے دل کو گھیرا تھا
یہ بھید کہ جس کو نیکی بدی کی گہرائی سے آنا تھا۔
آتا تھا اندھے دھارے سے، آتا تھا مچلتے چشمے سے
آتا تھا چٹان کے دوارے سے، اُونچے پربت کے پردے سے

سرگرداں سورج سے آتا تھا میری زیست پہ چھا تا تھا،
وہ سورج جس کو خزاں میں افق پہ سونے کا رنگ چڑھاتا تھا،
اُس برق سے آتا تھا اس کو جو چمک اُٹھتی ہے گھٹاؤں سے
اور شور سے رعد کے آتا تھا، آتا تھا اُڑتی ہواؤں سے۔
آتا تھا اُن طوفانوں سے جو سب کا دل دہلاتے ہیں،
اور اک آواز مجسم بن کر دنیا پر چھا جاتے ہیں،
ان بادلوں سے آتا تھا جو آکاش پہ ڈیرا جماتے تھے
اور میری نگاہوں میں کالے بھوتوں کے جھنڈ بناتے تھے۔

اس نظم سے جہاں پو کے احساسِ تنہائی کی شدّت اور گہرائی معلوم ہوتی ہے وہیں یہ سراغ بھی ملتا ہے کہ بچپن ہی سے اُس کا ذہن سیدھی سادی باتوں سے غیر معمولی تاثر لیتا تھا۔ ایک عام بچے کو مظاہرِ فطرت سے تسکین اور شگفتگی کا احساس ہو سکتا ہے لیکن وہ ایک عام بچہ نہ تھا۔ اس کو بچپن ہی سے بادلوں میں بھوت دکھائی دیتے تھے اور آئندہ چل کر یہی بھوت اُس کے دل و دماغ پر چھا گئے۔ یہاں تک کہ ان غیر معمولی تصوّرات نے حالاتِ زندگی کے ساتھ مل کر ایک نئی دنیا کی تخلیق کی۔ یہی نئی دنیا پو کے تخیّل کی دنیا تھی۔ اور اس دنیا کا مطالعہ پو کی ذہانت کو سمجھنے میں کافی حد تک ہمارا معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

پو ایک جگہ لکھتا ہے "وہ لوگ جو دن کو خواب دیکھتے ہیں انھیں بہت سی ایسی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو ان لوگوں کو دکھائی نہیں دے سکتیں جو صرف رات کو خواب دیکھتے ہیں" — اُس کی یہی بات ایک ایسا سراغ ہے جس سے ہم اُس کی خیالی دنیا کی نوعیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یوں تو اس دنیا میں (جسے دارالمحن کہتے ہیں) ہر کسی نے اپنے کسی ذہنی گوشے میں ایک ایسی جگہ کا تصوّر کسی نہ کسی صورت میں قائم کر رکھا ہوتا ہے جہاں وہ زندگی کے مصائب سے گھبرا کر ایک دو لمحوں کو پناہ لے سکے۔ لیکن ایک عام شخص کی خیالی دنیا اور ایک طبّاع کی تخلیقی سرزمین میں فرق ہے۔ مگر ایک بات یکساں ہے، خواہ کوئی عام انسان ہو، خواہ شرابی یا کسی نشے کا عادی، خواہ اعصابی مریض اور خواہ جوہرِ خداداد کا مالک — سب کی خیالی دنیا اذیّت دہ الجھنوں کو تمام تر نہ مٹا سکتی ہے نہ دھندلا سکتی ہے۔ ہاں ہنگامی طور پر احساس و شعور کو کند کر دیتی ہے۔ عام انسان اس کند کیفیت کو حاصل کرنے کے لئے اپنے معمولی تصوّرات سے کام لیتا ہے، شرابی یا نشے باز اپنی علّت سے، اعصابی مریض کو اندرونی طور پر ہی اس دنیا کی تخلیق میں مدد مل جاتی ہے۔ اور ایک طبّاع انسان کی تخلیقی ذہانت ان سب سے بڑھ کر تخیّل پرستی کے کرشمے دکھاتی ہے۔ عام انسان جانتا ہے کہ اس کی یہ دنیا محض ایک دل بہلاوا ہے، شرابی اور اعصابی مریض بھی اس بات کا احساس کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ محض ایک طفل تسلّی ہے اور طبّاع کو تو اس کا بھی شعور ہوتا ہے کہ یہ سارا محل اُس کا اپنا کھڑا کیا ہوا ہے لیکن سب کے سب اپنے تصوّرات اور خوابوں کو حقیقت پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ خواب اُس کے لئے زندگی سے گریز کا ذریعہ ہیں۔ خواہ اس خیالی دنیا میں ہیبت ناک باتیں ہی کیوں نہ ہوں، اس میں ایک ایسی تسکین تو ہوتی ہے جسے شعور تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ پو کی خیالی دنیا کا یہی حال تھا۔ اگرچہ اس کے اندیشوں اور گہرے ملال کی صحیح نوعیت عام طور پر متنازعہ فیہ ہے لیکن اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا باعث دبی ہوئی جنسی آرزوئیں تھیں جو اس کے ذہن کی گہرائیوں میں جا کر آسودہ ہو چکی تھیں، اور اس کے تصوّرات میں علامتی صورت اختیار کر کے اُبھرتی تھیں۔ اس ملال، اور اس اندیشے نے اُس کی زندگی کو مصائب کا ایک ان مٹ سلسلہ بنا رکھا تھا۔ اور اسی لئے اس کی تخلیقاتِ ادبی، اُس کی کہانیاں بھی ایک ایسے ہی سلسلے کے اثر میں نشو و نما پاتی تھیں۔

جب وہ تصوّر میں اپنی کسی کہانی کے ہیرو کی زندگی بسر کرتا تھا اور اس تخیّلی بھیس میں کسی ان دیکھی، انوکھی دنیا میں جا پہنچتا تھا اور ایسی اچھوتی دوشیزاؤں کے خیالات میں ڈوب جاتا تھا جو اُس سے جدا ہو چکی ہوں، تو یہ کیفیت اُس کے لئے اس حقیقی زندگی کی بہ نسبت کہیں زیادہ تسکین دہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اُس کی یہ حیثیت اُس کے اعصابی آدرش سے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ اس دنیا میں تو وہ صرف ایک ایڈیٹر تھا، اور ایڈیٹر بھی ایسا جسے اپنے حق سے کہیں کم معاوضہ ملتا ہو، جس کے ساتھ ناانصافی پر ناانصافی ہو رہی ہو۔

نفسیات کے ماہر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ اعصابی مریض کی بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ ایک افسانے کے بل پر زندگی گذارتا ہے، اور اُس کا عمل اس افسانے کو حقیقت بنانے کے لئے ایک براہِ راست یا بالواسطہ کوشش ہوتی ہے، اُس کی تمام حرکات اور افعال کا یہی ایک

مقصد ہوتا ہے۔ ابتدا میں احساسِ کمتری کے باعث اپنے آپ پر اعتماد پیدا کرنے کے لئے یا اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے وہ افسانہ طرازی کرتا ہے، اور پھر اُس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس افسانے کو حقیقت کی صورت دے دے۔ ظاہر ہے کہ پو کا منتہائے نظر بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔

پو اگرچہ زندگی میں اپنے پیشے کے سلسلے میں شہر بہ شہر پھرتا رہا بلکہ اُس کی یہ آوارگی اور پریشان حالی میر کے اس شعر سے مطابقت رکھتی ہے کہ

نہ دیکھا میرِ آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا

پھر بھی اُس کے اس مستقل انتقالِ ماحول کا اثر اُس کی تخلیقات پر نہ ہوا۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا اپنی دنیا، اپنی کائنات کو ساتھ لے کر گیا۔ کیونکہ اس کے لئے اسی دنیا کی زندگی حقیقی زندگی تھی۔ اس دنیا کی چار دیواری میں اس کا ذہن اس قدر مرکوز تھا گویا اُسے اپنی مستقل حرکت کا احساس تک نہیں ہے۔ اور اسی لئے اُس پر مختلف مقامات اور مختلف شخصیتوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس کا ثبوت اس کے اپنے الفاظ سے بھی ملتا ہے۔

"اس دنیا کے حقائق مجھے سراب معلوم ہوتے ہیں، محض سراب! — اور اس کی بجائے خوابوں کی بستی کے وحشیانہ تصورات اس روزمرہ زندگی کا مواد ہی نہیں بلکہ کلیتاً اپنی ہستی نظر آتے ہیں۔"

تخیل اور تصورات کے اس قدر مرکوز ہو جانے کی ایک اور وجہ بھی دکھائی دیتی ہے۔ اپنی گھریلو کائنات میں اُس کی اپنی ذات ہی ایک ایسا مرکز تھی جس کے گرد گھر کی فضا گھوم رہی تھی۔ اس گھر میں اس کا کہا ایک حکم تھا، ایک قانون۔ کسی کو اُس کی بلندی اور برتری پر اعتراض نہ تھا، نہ اُس کے جوہر کی فوقیت میں کسی کو شک تھا۔ اور اس لئے اس محدود مقام پر اُسے نہ صرف اُس پاس کی دنیا بلکہ باہر کی کائنات کا مرکز بھی اس کی اپنی ذات معلوم ہوتی تھی۔ گویا اُس کا گھر — گھر کی فضا اُس کے لئے گریز کا ایک ایسا ہی محفوظ مقام تھی جیسا کہ اُس کی تخیل کی دنیا۔ اُسے اپنی تسکین کے لئے جس چیز کی ضرورت تھی یعنی ایک غیر مادی، غیر جنسی حسن کا مجسمہ، وہ گھر میں اُس کی بیوی کے بھیس میں اسی طرح موجود تھا جیسے اُس کے تصورات کی دنیا میں۔ نیز گھر میں بھی وہی سلطانِ کائنات تھا اور تخیل میں بھی۔

باہر کی دنیا میں جہاں خود کام ناشر اور ایڈیٹر اس کو دھکے دیتے تھے، اچانک اُسے محسوس ہوتا کہ یہاں نہ تو اس کی بیوی ایسی چپ چاپ صورت ہے، نہ اُس کی ساس ایسی خدمت گذار عورت۔ اپنے آپ کو وہ جو کچھ سمجھتا ہے باہر کی دنیا اس نقطۂ نظر سے اس کی قدر نہیں کرتی۔ باہر کی دنیا اس دھندلے محل کی ملال آمیز شان سے بے خبر ہے جسے اُس نے بنایا ہے، اور اُس علم و کمال سے بھی بے خبر ہے جس نے اُس کی ذات کو فانی انسان کے درجے سے کہیں بلند کر دیا ہے۔ — اور یہ احساس اُس کے لئے درد و کرب کا باعث ہوتا، اُس کی ذہنی کشمکش شدید تر ہو جاتی اور اس کشمکش سے جو اس کے لئے دو یکساں نمایاں حقیقتوں کی صورت میں موجود تھی۔ ایک دہشت، ایک جنون بیدار ہو جاتا۔ اور اسی جنونی کیفیت کے باعث وہ غیر معقول غصہ اُس پر طاری ہو جاتا جو اُسے نامناسب افعال پر مجبور کر دیتا، لوگوں کو برا بھلا کہنے پر اکساتا، ہمعصر لکھنے لکھانے والوں کی مخالفت پر بھڑکاتا، اور جو لوگ اُس کی شخصیت کے صرف بہتر اور شعوری پہلو سے واقف ہوتے وہ اس غیر متوقع رویے سے متحیر رہ جاتے۔

پو کے ذہن نے جو الگ تھلگ دنیا بنا رکھی تھی اگر ہم اُس کی نوعیت اور علتِ تخلیق کو سمجھ لیں تو ہم اُس کی زندگی، اُس کی شخصیت اور اس کی تخلیقاتِ ادبی کو صاف اور واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اور ہمدردانہ زاویۂ نگاہ سے غور کر سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہمارا راستہ دشوار منزلوں سے ہٹ جاتا ہے، بلکہ ہم صحیح معنوں میں کسی راستے پر گامزن ہی نہیں ہو سکتے۔

اور اب ہم پو کے تماشائے حیات کے آخری سین کی طرف آتے ہیں۔ اس بات کا بیان تو پہلے کیا جا چکا ہے کہ ورجینیا کی موت کے بعد پو کا ذہن اُس کے قابو میں نہ رہا تھا اور اُس کے ان گنت معاشقوں نے اس کیفیت میں اضافہ ہی کیا تھا۔ جولائی ۱۸۴۹ء تک وہ یکسر اس قابل نہ رہا کہ اپنی دیکھ بھال کر سکے۔ اس زمانے میں اُس کے جنونی دماغ میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ دوسروں کی ملازمت کی بجائے اپنا ایک ماہنامہ جاری کر دے اور اس تجویز کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے روپے کی فراہمی کے سلسلے میں وہ رچمنڈ پہنچا۔ لیکن یہاں پہنچ کر چند روز تک وہ شہر کے ذلیل ترین میخانوں میں ڈولتا پھرا۔ اور اس آوارگی اور پریشان حالی سے جان آر تھامسن نے اُسے رہائی دلائی جو اُس زمانے میں ماہنامہ پیامبر

"دی میسینجر" کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس بات کے باوجود کہ اُس نے اس کی فوری ضروریات کو پورا کیا تو آپ اس قابل نہ تھا کہ کسی طرح کا بھی اثر اس کی بہتری کے لئے اس پر ڈالا جاسکتا۔ چنانچہ اس پھیرے میں جتنا عرصہ وہ رچمنڈ میں رہا، اس کی آوارگی بدستور جاری رہی۔

یہ اُس کی خارجی زندگی تھی اور داخلی طور پر اس کا غیر مدلل اور ناقابلِ فہم ملال اُس پر پہلے سے زیادہ گہرائی کے ساتھ تسلط پا رہا تھا۔ اپنی ایک محبوبہ "اینی" کو لکھتا ہے "میرا غم و ملال ناقابلِ فہم ہے، اور یہ بات مجھے اور بھی غمگین بنا دیتی ہے۔ میرے ذہن میں تاریک پیشگوئیاں چھا رہی ہیں۔ کسی بھی بات سے میرا غم دور نہیں ہوتا، مجھے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا میری زندگی ضائع گئی ہے، ماضی کی زندگی اور مستقبل ایک بے رونق خلا کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس کشمکش اور ان اندیشوں سے نپٹ سکوں، اور یاس کی اس تاریکی میں بھی امید کی جستجو کو جاری رکھوں۔"

اس سے تقریباً ایک سال بعد ۳۰ جون ۱۸۴۹ء کے روز اُس نے ایک بار پھر، اور اب کی دفعہ آخری بار، رچمنڈ جانے کی تیاریاں کر لیں تو اس وقت بھی اس کا ذہن اسی طرح اندیشوں سے پُر تھا۔ چنانچہ اس سفر سے پہلے وہ اپنی ایک دوست مسز لیوس سے ملنے کے لئے گیا اور دورانِ گفتگو میں کہنے لگا "مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کو اب کبھی دوبارہ نہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے آج رچمنڈ جانا ازحد ضروری ہے، اگر میں نہ لوٹوں تو میرے سوانح حیات ضرور لکھئے گا کیونکہ مجھے امید ہے کہ آپ میری ذات سے انصاف کریں گی۔"

چنانچہ یہ آخری مہلک سفر ان خیالات کے ساتھ شروع ہوا۔ جب وہ فلاڈلفیا پہنچا جو اُس کے سفر کی پہلی منزل تھی تو اس پر جنون کا ایک واضح دورہ پڑا۔ اس دورے میں اُسے یوں محسوس ہونے لگا گویا بعض نا جان اشخاص اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور اُس کی جان کے درپے ہیں۔ اس شہر میں جان سارٹین نامی ایک شخص رہتا تھا جس سے پو کی شناسائی قیامِ فلاڈلفیا میں ہوئی تھی۔ اس کے ہاں پہنچ کر پو نے اس سے درخواست کی کہ وہ اُسے ان لوگوں کے چنگل سے رہائی دلائے اور اپنی حفاظت میں رکھے۔ جان سارٹین لکھتا ہے کہ پو نے مجھ سے کہا کہ جو کچھ میں آپ کو بتاؤں گا اسے آپ مشکل ہی سے سچ سمجھیں گے لیکن اس انیسویں صدی میں بھی ایسی باتیں ممکن الوقوع ہیں ـــــ اس کے بعد اُس نے ذیل کا قصہ سنا دیا "میں نیویارک کو جا رہا تھا کہ گاڑی میں اپنی سیٹ سے پیچھے کچھ دور میں نے چند لوگوں کو سازش کرتے سُنا کہ کس طرح وہ مجھے مار کر گاڑی کے پائیدان سے نیچے دے پھینکیں گے۔ وہ اس قدر آہستہ آواز میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ اگر میری قوتِ سامعہ غیر معمولی طور پر تیز نہ ہوتی تو میرے پلے کچھ بھی نہ پڑتا۔" اور اس قتل کے افسانے کے بعد اس نے خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک خاموش رہا اور پھر اچانک بول اُٹھا "اگر میں یہ اپنی مونچھیں صاف کر ڈالوں تو پھر مجھے پہچاننا ذرا مشکل ہو جائے گا۔ کیا آپ مجھے ایک اُسترا لا دے سکتے ہیں تاکہ میں انہیں مونڈ لوں؟" ــــ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا کہ "ایک جعلی چیک بنانے کے جرم میں مجھے موبامینسنگ کے جیل خانے میں ڈال دیا گیا تھا اور اس قید کے دوران میں میں نے دیکھا کہ ایک سفید لباس میں ایک عورت کی شکل نمودار ہوئی۔ اور مجھ سے کچھ باتیں کرنے لگی، اگرچہ کچھ اس نے مجھے کہا اُسے میں نہ سُن سکتا تو بس یوں سمجھو کہ اب تک خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ وہیں ایک ملازم نے مجھ سے کہا کہ اگر میں چاہوں تو اس کے ساتھ قلعے کی چار دیواری میں چل پھر کر سیر کر سکتا ہوں میں رضامند ہو گیا۔ یونہی قلعے کے مختلف مقامات کی سیر کے دوران میں ہمیں فصیل کے قریب ایک خم ملا۔ میرے ساتھی نے پوچھا کہ شوق فرمائیے گا؟ میں نے انکار کر دیا۔ اگر میں ہامی بھر لیتا تو وہ مجھے اُسی خم کی آتشِ سیال میں ڈبو دیتا ــــ یوں ہی آخر کار وہ لوگ مجھے اذیت دینے کے لئے اور میرے دل کے ٹکڑے کرنے کے لئے میری ساس مسز کلیم کو وہاں لے آئے اور پھر میں نے یہ بصارت سوز منظر دیکھا کہ انہوں نے پہلے ٹخنوں تک اُس کے پاؤں آرے سے الگ کر دیئے، پھر گھٹنوں تک ٹانگیں کاٹ دیں اور پھر کولھوں تک تمام کی تمام ٹانگیں اُڑا دیں ـــــ"

جنون کے اس دورے میں پو کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ اوپر کے دہشت ناک بیان سے کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے روز اُس کی ذہنی حالت کافی حد تک درست ہو گئی، اور اس بات کا بھی احساس ہونے لگا کہ ایک روز پیشتر اُس نے جو داستان سنائی تھی وہ اس کے تخریب آلود ذہن کا ایک کرشمہ تھا۔

۳ر اکتوبر ۱۸۴۹ء کے روز بالٹی مور کے ایک ڈاکٹر کے نام اسی شہر کے ایک ناشر نے ذیل کا رقعہ لکھا۔

محترم

مائن کے چوتھے وارڈ پول پر ایک صاحب موجود ہیں جن کا لباس

کچھ ضرورت سے زیادہ خستہ و خراب ہے اور جس کا نام ایڈگرایلن پو بتایا جاتا ہے۔ یہ صاحب اس وقت ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کی ان سے شناسائی ہے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہیں اپنی موجودہ حالت میں مدد کی ضرورت ہے۔ جلدی میں یہ رقعہ لکھ رہا ہوں۔

آپ کا

جوس ڈبلیو واکر

اس رقعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پو کو مذکورہ مقام سے ایک ہسپتال میں پہنچایا گیا۔ جہاں ڈاکٹر جے موزین اس کا علاج کرنے لگا جو وہاں کا معالج تھا۔ ہسپتال پہنچنے کے چار روز بعد مریض ہذیان کی کیفیت میں راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

لیکن پو مرنے سے پہلے اس حالت کو کیونکر پہنچا؟ بہت عرصے تک لوگوں کو اس کی موت کے متعلق صحیح واقعات کا علم نہ ہو سکا۔

رچمنڈ سے پو چند روز پہلے روانہ ہوا تھا۔ یہاں اس نے اگرچہ پبلک طور پر آئندہ شراب کو ہاتھ نہ لگانے کا عہد کیا تھا لیکن ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ روانگی کے وقت وہ کافی سے زیادہ نشے کی حالت میں تھا نیز بالٹی مور میں بھی جب وہ مذکورہ بالا تاثر کے سامنے پہنچا ہے تو اس وقت بھی نہ اُسے یہ معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آیا، کہاں ہے، کون اس کو ہسپتال پہنچا رہا ہے وغیرہ، بلکہ درمیانی وقفوں میں جب کچھ ہوش بھی آیا تو وہ یہ یاد نہ کر سکا کہ اس سانحے سے پیشتر وہ کن لوگوں کے ساتھ تھا۔

ہسپتال میں اُسے صبح پانچ بجے پہنچایا گیا۔ اس وقت سے لے کر دوسرے روز صبح تین بجے تک وہ اسی بے ہوشی کی حالت میں رہا۔ اس کے بعد اس کے اعضا میں تشنج شروع ہوا۔ اور ساتھ ہی ہذیان کی ہلکی سی لیکن متواتر کیفیت بھی جاری رہی۔ ہذیان کی اس حالت میں بے تحاشا لگاتار باتیں کرتا رہا گویا وہاں کوئی ایسے لوگ موجود ہیں جن سے وہ مخاطب ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ یکسر زرد تھا اور اس کا تمام جسم پسینے میں شرابور۔ ہسپتال میں داخلے سے دوسرے روز ڈاکٹر اس کی اس کیفیت کو بدل سکے ہوش آتے کے ساتھ ہی ڈاکٹر اس کے سرہانے پہنچا اور اس سے اُس کے رہنے کی جگہ اور رشتہ داروں کا پتہ پوچھنے لگا۔ لیکن اُس کا ہر جواب گڈمڈ اور ناقابلِ فہم تھا۔ البتہ یہ اس نے بتایا کہ رچمنڈ میں اُس کی ایک بیوی ہے۔ (حالانکہ ورجینیا کبھی کی مر چکی تھی) نیز یہ بھی کہا کہ اُسے یہ معلوم نہیں کہ وہ رچمنڈ سے کب روانہ ہوا اور اُس کے کپڑوں کا ٹرنک کہاں گیا۔ چونکہ پو نے اس گفتگو کے دوران میں زندگی سے ناامیدی کا اظہار کیا اس لئے ڈاکٹر نے اُسے تسلی دلائی کہ کوئی فکر کی بات نہیں چند روز میں ہی اُسے افاقہ ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے مل سکے گا اس وقت تک ڈاکٹر اس کی ہر طرح سے خبرگیری کرے گا۔ اس پر پو گویا پھوٹ پڑا اور ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ کہنے لگا کہ اس وقت اس کا بہترین دوست بھی اس کی یہی سب سے بڑی خدمت کر سکتا ہے کہ اس کے سر میں پستول رکھ کر چلا دے۔ کیونکہ جب وہ اپنی موجودہ ذلت کو دیکھتا ہے تو چاہتا ہے کہ زمین پھٹ پڑے اور وہ اس میں سما جائے۔ یہ کہنے کے کچھ لمحوں کے بعد وہ اونگھ گیا جب ڈاکٹر دوبارہ اس کے پاس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس پر شدید ہذیانی کیفیت طاری ہے۔ اور دو نرسیں اُسے قابو میں لانے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں۔ ہفتے کی شام تک یہی کیفیت طاری رہی اور وہ اُس وقت سے لے کر دوسرے روز صبح تک "رینالڈز" نامی کسی شخص کو زور زور سے متواتر پکارتا رہا۔ اور اس کے بعد اُس کی حالت میں ایک نمایاں تبدیلی شروع ہوئی ہذیان میں ہاتھ پاؤں مارنے سے وہ بہت تھک چکا تھا اس لئے اب خاموش ہو گیا۔ اور کچھ دیر تک یوں معلوم ہوا گویا آرام کر رہا ہے پھر اُس نے آہستہ سے اپنے سر کو جنبش دی اور بولا "اے خدایا! مجھ بے چارے کی مدد کر!"— اور اس کے ساتھ ہی اس کا دم نکل گیا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر کا بیان ہے کہ موت کے بعد شہر کے بہت سے نمایاں اصحاب ہسپتال میں اسے دیکھنے کو آئے۔ اور ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو چاہتے تھے کہ انہیں اُس کے بالوں کی ایک لٹ مل جائے۔

بالٹی مور میں پہنچنے سے پہلے کے حالات پر اگرچہ ایک دھند لکا چھایا ہوا ہے لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ رچمنڈ سے روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنے دوست ڈاکٹر جان کارٹر کے ساتھ کچھ وقت گذار کر اس کی چھڑی عاریتاً لئے ہوئے اس نیت سے علیحدہ ہوا کہ کسی ہوٹل میں کھانا کھا آئے۔ اس ہوٹل میں اس کے کچھ اور دوست مل گئے جن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ بالکل ہوش میں تھا اور بھلا چنگا باتیں کر رہا تھا۔ لیکن یہاں سے نکل کر وہ ڈاکٹر کارٹر کو اس کی چھڑی لوٹانے کے لئے گیا نیز اس کے کپڑوں کا ٹرنک بھی رچمنڈ کی ایک سرائے میں جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا پڑا رہا۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ رچمنڈ سے چلا تو اُس کو اپنے بھلے بُرے کا مطلق ہوش نہ تھا اس کی جیب میں کافی رقم موجود تھی۔ دیدہ تم اسے ایک لکچر کے معاوضے میں ملی تھی جو اس نے رچمنڈ کے

بلی پہلو نہ جانے کب اور کیونکر بالٹی مور پہنچا۔ یہاں اگر غالباً اس نے پھر شراب نوشی شروع کی جس کی وجہ سے اس کے پھیپھڑوں کا پرانا مرض عود کر آیا اور یوں وہ اُن توقعات کے عین مطابق اپنے انجام کو پہنچا جو اس کی پہلی زندگی کو دیکھ کر قائم کی جا سکتی ہیں۔

اگرچہ اب ہمیں اُس کے انجام کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذہن کو جن اُلجھنوں نے اپنا گھر بنا رکھا تھا ان سے موت ہی رُہائی دے سکتی تھی۔ بیوی کی موت کے بعد ڈھائی سال تک اُس نے جو کچھ کیا اور کہا اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اب اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے کوئی اور افسانوی محل تیار کرنے کے ناقابل ہے، یہ اُس کے بس کی بات ہی نہیں رہی، چنانچہ ان حالات کی بنا پر اُس کی زندگی اُس کے متعلقین اور اس کی اپنی ذات کے لئے بھی ایک بارِ گراں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی ذہنی تخریب اب اس گہرائی کو پہنچ چکی تھی کہ وہ پہلے کی طرح اپنی اُلجھنوں اور اندیشوں کو اد ب کی صورت بھی نہ دے سکتا تھا۔ اور اس لئے اگرچہ موت اس قدر رُسوا یا اور نامناسب طریق پر اُس تک پہنچی لیکن پھر بھی وہ اس کے دکھ کا مداوا تھی۔

امریکہ میں اگرچہ پو اپنی زندگی میں مقبول تھا لیکن اس کی تحریرات محبوب نہیں تھیں اور اس کم پسندی کی مختلف وجوہات تھیں ایک تو اس کی ذاتی حرکات مثلاً معاصرین پر اس کی زہر آلود تنقید دوسرے نشے کی عادت میں مختلف لوگوں سے اس کا نامناسب رویہ تیسرے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بعض دفعہ دوستوں کے علاوہ اور لوگوں سے اُس کا صرف قرض لینا بلکہ بعد میں اپنی پریشان حالی اور پریشان خیالی سے واپس نہ کرنا۔ اس صورتِ حال میں وہ ایک محبوب مصنف کبھی نہ بن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ایک تو غربت نے اس کو گھر کی مرغی بنا رکھا تھا۔ نیز امریکہ کے ادبی ماحول میں وہ فضا اور وہ شخصیتیں ہی نہ تھیں جو پو کے ایسے غیر معمولی جوہر کی ترا واقعی قدر کر سکتیں۔ اس کے جوہر کو ظاہر ہونے کے لئے سب سے مناسب ملک فرانس تھا جہاں کے ادب اور زندگی میں ہر طرح کی اُپج اور غیر روایتی چلن پنپ سکتا ہے اور فرانس تک اُس کا کلام پہنچا۔ اس کی زندگی میں ہی بعض کہانیوں کا ترجمہ فرانس کے رسالوں میں شائع ہوا۔ اس بات کا اس کو خود بھی علم تھا لیکن باقاعدہ طور پر فرانس نے اُسے اپنے مشہور شاعر چارلس باڈلیئر کے ذریعے سے حاصل کیا۔ فرانسیسی رسائل میں شائع شدہ پو کی بعض چیزیں باڈلیئر کی نظر پڑیں۔ اور وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا اور اُس نے پو کی اصل کتابیں مہیا کیں۔ انہیں دیکھ کر اس پر جو اثر ہوا وہ اس کے اس فقرے سے ظاہر ہے —— "جب پہلے پہل میں نے اس کی کتاب کھولی اور اس کا مطالعہ کیا تو میں نے ایک خوف اور ایک مسرت کے ساتھ دیکھا کہ پو نے بیس برس پہلے نہ صرف اُن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کے خواب میں دیکھتا تھا۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسے فقرے کے فقرے میری نظر پڑے جو میں اپنے ذہن میں ڈھالا کرتا تھا۔"

اس وقت ابھی چارلس باڈلیئر نے بذاتِ خود فرانسیسی ادب میں کوئی درجہ حاصل نہ کیا تھا۔ وہ ابھی آپ ذریعۂ اظہار کی جستجو میں سرگرداں تھا۔ اس دریافت کے عین بعد ہی باڈلیئر نے پو کے کلیات کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں شروع کر دیا اور پندرہ سال کی لگاتار محنت کے بعد یہ کام ختم کیا۔ ان ترجموں اور ان کے بعد باڈلیئر کی اپنی شاعری کے ذریعے سے پو کا اثر فرانس کے دیگر شعرا اور مصنفین پر بھی ہوا۔ جن میں سے فرانس کا مشہور تخیل پرست شاعر سٹیفانے میلارمے خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔

فرانس میں نقادوں شاعروں اور ادیبوں نے جس گرمجوشی سے پو کا استقبال کیا اس کا اندازہ ذیل کی آرا سے ہو سکتا ہے۔

ایک نقاد لکھتا ہے "اُس کا کلام ایک ایسے پھول کی طرح ہے جس کا رنگ اور جس کے نقش و نگار اس لئے اچھوتے اور انوکھے ہوں کہ اس پھول کا پودا زہر میں سینچا گیا ہے۔"

ایک اور لکھتا ہے "وہ خوف، جنون اور موت میں محبت کا شاعر ہے —— وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنے کلام سے ضمیرِ شعری کو بیدار کیا ہے، لیکن اُس کی اٹ پٹی رینت کو ہماری آنکھیں نہیں دیکھتیں بلکہ ہماری روحیں محسوس کرتی ہیں۔"

باڈلیئر جو شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھا نقاد بھی تھا۔ اس کے متعلق لکھتا ہے "جس اشتیاق کے ساتھ وہ اپنے آپ کو انوکھے پن کی گہرائیوں میں محض انوکھے پن کے لئے کھو دیتا ہے اور ہیبت ناک کی اُلجھنوں میں محض ہیبت ناک کے لئے سمو دیتا ہے۔ اس سے اس کی تخلیقات کا اخلاص ظاہر ہے، نیز وہ ہم آہنگی بھی نمایاں ہے جو اُس کی ذات میں شاعر اور انسان کے درمیان قائم ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بہت سے افراد کے سلسلے میں یہ اشتیاق نتیجہ ہوتا ہے ایک ایسی وسیع اور پُر زور شکتی کا جو بیکار پڑی ہوتی ہے۔ یہ شکتی بعض دفعہ تو ایک تندی پاکیزگی سے پیدا ہوتی ہے اور بعض دفعہ

گہرے احساسات کے دباؤ سے۔ وہ غیر فطری مسرت جو کسی انسان کو اپنا بہتا خون دیکھ کر محسوس ہوتی ہے، وہ حرکات جن کی شدت اور جن کا اصراف اُن کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ جنبش جو روح کے حکم کے بغیر گلے سے بلند ہوتی ہیں — سب ایک ہی ذیل میں آتی ہیں (اسی دبی ہوئی شکستگی اور حد سے بڑھی ہوئی پاکیزگی کی ذیل میں) —

گویا دوسرے لفظوں میں اگر انسان اعصابی مریض ہو اور اُس کی جنسی آرزوئیں معمول کے مطابق پوری نہ ہوسکیں تو اُس کے نفیس احساسات دب کر اس قسم کے غیر معمولی راستے اختیار کرتے ہیں۔ اس مسئلے کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے ہمیں جدید نفسیات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ امریکہ کے ایک مصنف نے پو کی ذہانت کا نفسی تجزیہ اپنی ایک کتاب میں کیا ہے لیکن اس کی طرف نگاہ کرنے سے پہلے کسی حد تک فنی طور پر اذیت پرستی کو سمجھ لیں۔

اذیت پرستی ایک نفسی تجریب کا نام ہے جس میں کسی شخص کو کسی حیوان ناطق یا مطلق کے درد، مصیبت یا خفت میں جنسی حظ حاصل ہو۔ اگر اس درد و مصیبت کا مرکز اپنی ذات ہو تو اُسے داخلی اذیت پرستی کہا جائے گا۔ اور کسی دوسرے کی صورت میں خارجی اذیت پرستی بعض صورتوں میں اس درد و مصیبت کے تصور ہی سے ایسے اعصابی مریض کو تسکین ہوسکتی ہے اور عملی طور پر کسی اذیت کے منظر کی ضرورت نہیں رہتی۔ پو کا نفسی مرض بھی یہی خیالی اذیت پرستی ہی تھا جو بنیادی طور پر خارجی تھا لیکن چونکہ ماہرین نفسیات کے نزدیک داخلی اور خارجی اذیت پرستی میں گویا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے ہم پو کی زندگی اور تخلیقات میں بھی اس مرض کی دونوں کیفیتیں دیکھتے ہیں۔

امریکن مصنف البرٹ مورڈیل نے اپنی ایک کتاب میں بہت سے انگریزی مصنفین اور شعراء کا نفسی تجزیہ کیا ہے۔ اور ایک باب اس کتاب میں پو سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ذیل میں ہم البرٹ مورڈیل کے خیالات کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

تجزیۂ نفسی کے نقطۂ نظر سے ایڈگر ایلن پو کا مطالعہ ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ اگرچہ اس لحاظ سے بہت سے ماہرین نے اس پہلے ونے کی ہے مگر اب بھی اُس کا یہ پہلو کافی حد تک تشنۂ تکمیل ہے۔

پو کے کلیات اور سوانح حیات کو دیکھنے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنی کہانیوں اور نظموں میں بھی وہ متواتر جن دوشیزہ عورتوں کا ذکر کرتا ہے ان کی تہ میں کون عورت چھپی ہوئی ہے، وہ اکثر ان نازنینوں کو مردہ تصور کرتا ہے۔ اور اس لئے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں وہ اپنی بیوی ورجینیا کا عکس دیکھتا ہے لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ورجینیا ابھی زندہ تھی تب ہی سے اُس کے تخیل نے ان عورتوں کی تخلیق شروع کر رکھی تھی۔ ابھی وہ چودہ پندرہ سال کا تھا کہ اُسے اپنے ایک دوست کی ماں مسز سٹینارڈ سے محبت ہوگئی اور جب یہ عورت مرگئی تو اُس کا غم کسی کروٹ چین ہی نہ لیتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور عورت سے اُسے رغبت ہوئی جس کا نام میری ڈیلویڈ تھا۔ اس عورت نے پو سے دفا کی۔ ہمارے خیال میں یہی عورت تھی جس کی جدائی کو پو موت کی جدائی تصور کرتا ہے۔ بچپن کی پہلی محبت کا خاتمہ موت نے کیا اور دوسرا تعلق بے دفائی سے ٹوٹا۔ ان دونوں حقائق نے مل کر اس کے دماغ میں مری ہوئی دوشیزاؤں کا تصور پیدا کردیا۔ اور یوں اُس کی نظموں اور کہانیوں میں اُس کے ان تشنہ افسانہ ہائے محبت کا غیر شعوری اثر ظاہر ہوا۔ یہ نفسی نشو ونما طفلی ہی سے شروع تھا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اُس کی ماں کا انتقال ہوا اور اس کے بعد جس بھی عورت سے اس کا تعلق پیدا ہوا۔ خواہ وہ تعلق ماں کا تھا یا محبوبہ کا، اس میں اُسے مکمل تسکین حاصل نہ ہو سکی۔

اس سلسلے میں دوسرا سوال موت کے موضوع میں پو کی غیر معمولی دلچسپی کا ہے۔ خصوصاً جب وہ موت اور نازنین عورتوں کو یکجا تصور کرتا ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی بیوی کی موت یا کم سے کم اس کی مہلک بیماری کے باعث یہ تصور اس کے ذہن میں جاگزین ہو گیا۔ لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنا چاہیئے کہ ابھی پو نے ورجینیا سے شادی بھی نہ کی تھی کہ موت کے موضوع سے اس رغبت کا اظہار ہو چکا تھا۔ اس کی ابتدائی کہانیوں میں دوشیزہ عورتوں کی موت کا نہایت واضح بیان ہے۔ پو نے اپنے اس نظریے کا اظہار بھی کیا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ شعریت سے لبریز موضوع ایک حسین دوشیزہ کی موت ہے۔ اور ہمارے خیال میں اس نظریے کی تحریک اُس کو اُن عورتوں سے ہوئی تھی جو اُسے مل نہ سکیں یا الگ ہوگئیں یا اُس کے جذبۂ محبت کو تشنہ چھوڑ کر مرگئیں۔ تئیس سال کی عمر سے پہلے چھ ایسی عورتوں کا حال ہمیں معلوم ہوتا ہے جن کا سلسلہ طفلی میں اُس کی اپنی والدہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُس کے ذہن میں حسن اور موت ہم آہنگ ہو کر رہ گئے تھے۔

اسی مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پوکو نہ صرف موت یا دوشیزہ عورتوں کی موت سے دلچسپی تھی بلکہ وہ اکثر مختلف کرداروں کے زندہ دفن ہونے کا بیان بھی کرتا ہے یا ایسے لوگوں کا حال لکھتا ہے جو اس جرم کے مرتکب ہوئے ہوں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں جدید نفسیات کے پیغمبر مرحوم ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ کے ایک اقتباس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ لکھتے ہیں "تھوڑا عرصہ ہوا کہ مجھ پر ان تصورات اور خیالات کی اہمیت واضح ہوئی جو انسان کے ذہن میں زمانۂ حمل میں آ سکتے ہیں۔ انہیں خیالات اور تصورات میں اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ بہت سے افراد کو بعض دفعہ زندہ دفن ہونے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ نیز حیات بعد الممات کے اعتقاد کی گہری غیر شعوری دلیل بھی انہی میں ہے۔ کیونکہ حیات بعد الممات رحم کی زندگی سے اس دنیا کی پر اسرار زندگی میں آنے کا ایک عکس ہے۔ اس کے علاوہ پیدائش کا عمل انسان کے لئے خوف کا پہلا تجربہ ہے۔ اور اس لئے یہی عمل خوف کے احساس کا نمونہ اور ماخذ ہے"۔

ڈاکٹر فرائیڈ کے مندرجہ بالا نظریئے ہی میں ہمیں پو کے اندیشوں اور خوف سے بھرپور افسانوں اور اس کی اپنی ذہنی الجھنوں کے حل کا سراغ ملتا ہے — ایک فرد کی جنسی آرزوئیں جب پیاسی رہتی ہیں تو ان میں ایک ناگوار جھلک ایک خوف کی صورت اختیار کر لیتی ہے اس لحاظ سے پو کی زندگی پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس خوف میں اگر پیدائش سے پہلے کا خوف بھی شامل ہو جائے تو تمام بات صاف ہو جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ پو کس لئے دوشیزاؤں کے مرنے اور مر کر پھر جی اٹھنے میں دلچسپی لیتا تھا۔

یہ تمام باتیں ایک طرح سے پو کی نفسی نشو و نما کا پس منظر ہیں۔ ان سب سے مل کر اور اس کے ساتھ احساسِ کمتری کا اضافہ ہو کر اُس کے اذیت پرستانہ رجحانات ظاہر ہوتے ہیں۔ نہ صرف اس کی کہانیاں اور نظمیں اس اذیت پرستی کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ وہ زہریلے مضامین بھی اس کے شاہد ہیں جو اُس نے اپنے ہمعصر مصنفین اور شعراء کے خلاف لکھے۔ گویا وہ درد اور تکلیف کو محض درد اور تکلیف کے لئے پسند کرتا تھا، چاہتا تھا اور چونکہ وہ حقیقی زندگی میں یہ کام نہ کر سکتا تھا اس لئے اُس نے اپنی ادبی زندگی میں اس گہرے جذبے کے لئے نکاس کی صورت پیدا کر لی تھی۔

پو کی نمایاں خصوصیت تخیل پرستی ہے۔ وہ خوابوں کا رسیا تھا، سپنوں کا گھیلانی ہے اور اس کی ادبی تخلیقات بھی خوابوں ہی کے تانے بانے ہیں سے وہ خود ایک جگہ ایک کہانی کے کردار کی زبانی جو حسبِ معمول اُس کی اپنی شخصیت کا عکس ہے، کہتا ہے "خواب دیکھنا ہی میری زندگی کا حاصل رہا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے لئے سپنوں کی ایک کٹیا بنا لی ہے"۔ اسی طرح ایک اور جگہ لکھتا ہے "جو لوگ خواب دیکھتے ہیں انہیں ابدیت کی جھلک نظر آتی ہے"۔ اس کے علاوہ اس کی نفسیات بھی ایک سچے خوابوں کے رسیا کی نفسیات سے مشابہت رکھتی ہے۔ وہ جو اپنی زندگی میں حاصل نہ کر سکتا تھا ان کے تصورات قائم کر لیتا تھا۔ زندگی میں وہ غریب تھا اس لئے کہانیوں میں وہ امیرانہ محلوں کا بیان کرتا ہے، زندگی میں اُس کو اپنی محبوب عورتیں حاصل نہ ہو سکیں اس لئے کہانیوں میں وہ موت پر حیات بعد الممات کے نظریئے سے فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کا یہ انہماک اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اُسے حقیقت میں کوئی دلچسپی ہی نہ رہی تھی۔ اس کی کسی تحریر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اُس کے زمانے میں امریکہ میں غلامی کے انسداد کا مسئلہ بھی تھا یا میکسیکو کی جنگ بھی ہوئی تھی۔

اور اب ہم اس تحریکِ ادبی کا ذکر کرتے ہیں جس کا بانی مبانی پو تھا لیکن جس کا اثر نہ صرف فرانس بلکہ یورپ کے تمام ممالک پر ہوا لیکن اس سے پہلے حُسن اور شاعری کے متعلق پو کے نظریات سے ذرا سی واقفیت حاصل کر لی جائے۔ شعر کے متعلق اگرچہ اس نے ایک سیر حاصل مقالہ "اصولِ شعری" کے عنوان سے لکھا ہے لیکن ذیل کا اقتباس اس کے اندازِ نظر پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

بہت عرصے سے میرا یہ خیال ہے کہ "غیر معین" سچے شعر کا نمایاں جزو ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ "غیر معین" سچی موسیقی کا بھی جزو ہے۔ میرا مطلب راگ کے سچے اظہار سے ہے۔ اگر موسیقی میں ہم کسی قسم کا تعین پیدا کر دیں، اس میں کسی قسم کے ارادی سُر ملا دیں تو یک قلم اُس کی مصفا، آدرشی، بنیادی اور لازمی خصوصیت اور کیفیت جاتی رہے گی۔ اس میں جو خواب کی سی ایک لذت ہو گی وہ باقی نہ رہے گی جس روحانی فضا میں موسیقی تیر رہی ہوتی ہے وہ مٹ جائے گی۔ اس کی تابِ پرواز کاہیدہ ہو جائے گی۔ اس کی بجائے وہ آسانی سے سمجھ میں آنے والی اور سرا سر جاننے والی چیز بن جائے گی — اس زمین کی ایک چیز"۔

گویا پو شعر میں کنایتی فضا اور دھندلکے کا حامی تھا۔ شعر کو وہ دو اور دو چار قسم کی کوئی چیز نہ سمجھتا تھا۔ ریاضی اور سائنس کے مسائل سے الگ انداز کا ایک مسئلہ جانتا تھا۔ اور حُسن کے متعلق اسی مقالے سے

مندرجہ ذیل اقتباس اُس کے نقطۂ نظر کو ظاہر کرتے ہیں۔

"ہمارے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ حسن کے بلند ترین مظاہرات میں ملال کا ایک لہجہ موجود ہوتا ہے۔ نشو و نما کے انتہائی درجے پر پہنچ کر حسن خواہ کسی قسم کا ہو ایک حساس روح کو آنسو بہانے پر مجبور کرتا ہے، اور یوں ملال شاعرانہ لہجوں میں سب سے زیادہ مرتبہ رکھتا ہے۔

حسن کی ہر بلندی میں ملال کا یہ شائبہ ضرور نمایاں ہوتا ہے، اور جب راگ کے اثر سے ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں تو اس کا باعث شدتِ مسرت نہیں ہوتی، بلکہ ایک بے قابو کر دینے والا غم اس کی علتِ غائی ہے۔ جسے ہم فانی انسان عام طور پر اُس اچھوتی بہجت سے ہم آہنگ نہیں بنا سکتے جس کی ایک کنایتی اور غیر معیّن جھلک ہم کو راگ کی بدولت دکھائی دیتی ہے۔"

اگر ہم حسن کے لازمی خصائص کے تجزیے کا نتیجہ اوپر کے اقتباسات کی صورت میں معین کر لیں تو یہ کام نہایت آسان ہو جاتا ہے کہ کسی ایسے ایک موضوع کا تقرر کر لیا جائے جو بنیادی طور پر تمام ضروریات کی تسکین کر سکے۔

—— "بلندی، رفعت یا تکمیل کو ایک پل بھی نظر سے اوجھل نہ رکھ کر میں نے اپنے آپ سے سوال کیا "انسانیت کی ہمہ گیر مفاہمت کے لحاظ سے ملال انگیز موضوعات میں سب سے زیادہ ملال انگیز موضوع کون سا ہے؟" —— ظاہر ہے کہ اس کا جواب —— موت تھا۔ اور پھر میں نے سوال کیا کہ کس صورت میں یہ سب سے زیادہ ملال انگیز موضوع شعریت کا حامل ہوگا! —— جو کچھ میں اوپر وضاحت سے بیان کر چکا ہوں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا جواب بھی ظاہر ہے۔ "جب یہ موضوع حسن سے قریب ترین ہم آہنگی حاصل کر لے۔ چنانچہ دنیا میں ایک حسین عورت کی موت بغیر ردّ و قدح کے ایک ایسا موضوع ہے جس میں سب سے زیادہ شعریت ہے!"

ظاہر ہے کہ حسن اور شعر کے متعلق پو کے مندرجہ بالا اندازِ نظر کی تخلیق اُس کے ذاتی حالات سے ہوئی لیکن یہ کوئی اعتراض نہیں۔ ہر شخص عالمگیر نظریوں تک بھی ذاتی تجربات اور تفکر ہی کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ ان نظریات کو ہم کمزور نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان کے اندرونی زور ہی نے یورپ کی ذہنی اور روحانی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ جب سے پو کے کلیات کو چارلس باڈلیئر نے فرانسیسی زبان میں پیش کرنا شروع کیا تبھی سے فرانس اور پھر رفتہ رفتہ یورپ کے مختلف ممالک میں اُس تحریک کی ابتدا ہوئی جسے "اشاریت" کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن جس کا زیادہ مشہور نام "تحریکِ انحطاط" ہے۔ اگرچہ اس تحریک کے آثار اس سے پہلی ذہنی تحریک رومانی ہی میں موجود تھے جس کا بانی مبانی مشہور مفکر روسو تھا، لیکن باڈلیئر کی پیش کش کے زمانے ہی سے اس کی واضح صورت لوگوں کے سامنے آئی۔ کیونکہ اب اس تحریک کو ایک گرو مل گیا تھا۔ (ایڈگر ایلن پو) اور اُس گرو یا پیغمبر کو ایک ایسا چیلا حاصل ہو گیا جو اُس کے نظریات کی نہ صرف خاطر خواہ تبلیغ کر سکتا تھا بلکہ خود بھی ایک پیامبر ہی کی حیثیت رکھتا تھا۔ انگریزی مصنف ایڈورڈ شانکس کے خیال میں مندرجہ بالا دونوں نام اس تحریک کے لئے موزوں نہیں ہیں لیکن وہ "تحریکِ انحطاط" کے نام کو زیادہ موزوں سمجھتا ہے، کیونکہ اس میں یاس کی ایک ایسی خاموش مدافعت کی جھلک ہے جو اس تحریک کی نمایاں خصوصیت تھی، اور دوسرے نام سے تو صرف ادبی طور پر ایک مسلک کی حمایت کا اظہار ہوتا ہے اور بس۔ یہ نام روحانی طور پر کلیتہً حاوی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ پو کے اس نظریے کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو اُس نے شعر کی "غیر معین" خصوصیت کے متعلق پیش کیا تھا۔ خیر نام خواہ کچھ ہو ہمیں کام سے زیادہ تعلق ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نظریات جو تحریکِ انحطاط کے اجزا ہیں کسی فرد سے ہٹ کر اجتماعی حیثیت اختیار کر چکے تھے اور یہ زمانہ انیسویں صدی کے دوسرے پچاس سالوں کا ہے اور جب باڈلیئر نے پو کے کلیات کی پیشکش کے بعد اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا تو یہ تحریک فرانس سے نکل کر یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پھیلی۔

اس تحریک کی نمایاں خصوصیت وہ ردِ عمل تھا جو انیسویں صدی کے ماحول سے بعض افراد کے ذہنوں میں پیدا ہوا لیکن صنعتی لحاظ سے جو بغاوت اُس وقت پیدا ہو رہی تھی اُس کی مخالف ہونے کے لحاظ سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ تحریک بھی بغاوت کا ایک ایسا پتھر تھا جو پہلی بغاوت کے پتھر کا جواب دینے کے لئے اٹھایا گیا۔ یہ محض ایک اندازِ نظر تھا۔ اس کے حامی اُس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس کی آنکھوں کو ایک ایسی نئی دنیا اپنے گرد و پیش دکھائی دے رہی تھی جو اُن کے آبا و اجداد کی دنیا سے یکسر مختلف تھی۔ انقلابِ فرانس اور اس کے ساتھ ہی صنعتی انقلاب وہ ایسے ردِ عمل تھے جن کے نتائج اب نمایاں دکھائی دینے لگ رہے تھے۔

بادشاہوں کا نفاذ سلطنت ہوا تھا۔ اور جمہوریت کی سطح تحریک انحطاط والوں کو جمہوریت کا ایک ایسا طوفان معلوم ہوتی تھی جو ہر قائم بات کو تہس نہس کر دے گا۔ اس لئے انہیں نئے حالات سے کوئی رغبت نہ تھی۔ نیا نظام اُس پہلے حُسن کو مٹا رہا تھا۔ کیونکہ جمہوریت اور حُسن میں بُعد ہے۔ ظاہر ہے اور انحطاطی شعراء کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ جمہور محض مادّی زندگی بنا پر ایک ایسی چیز کا خاتمہ کر دیں جس کی پرورش صدیوں میں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سائنس سے بھی نفرت تھی۔ کیونکہ یہی ایک ایسا علم تھا جو اُن کے مخالفوں کا سب سے زیادہ معاون تھا۔ پَو نے خود سائنس کے متعلق ایک جگہ کہا ہے کہ گیت کی لازمی خصوصیات سے سائنس کو مطلق ہمدردی نہیں۔ اور گیت "حُسن" ہے۔ چنانچہ پَو کا انداز نظر "تحریک انحطاط" کے حامیوں کا مسلک بن گیا اور اس کے ساتھ اس کے سوانح حیات نے اس کی حیثیت ایک ایسے شہید کی ایسی بنا دی جس نے گویا ماحول سے ہم آہنگی نہ پیدا کی اور اپنے نظریات کے لئے رفتہ رفتہ گھُل کر جان دیدی۔ اُس نے ریل گاڑی کی دنیا کو ناپسند کیا اور ریل گاڑی کی دنیا نے اس ناپسندیدگی کا انتقام اُس کی ذات سے لیا۔ اور یوں وہ ایک شہید پیغمبر بن گیا۔ اور اس کے بعد بھی جن شعراء نے تحریک انحطاط کی حمایت کی عموماً ان کی زندگی ایک المناک افسانہ ہی بنتی رہی۔ اور وہ گویا اپنی تکلیف اور اپنے خون سے اس پودے کو سینچتے رہے اور صنعتی انقلاب سے شاعری کو جس صدمے کا اندیشہ تھا وہ کسی حد تک دور ہو گیا کیونکہ تحریک انحطاط والے نہ صرف قدیم حسن کے قیام میں کامیاب ہوئے بلکہ اپنی قربانیوں سے ایک نئے حسن کی تخلیق کا ذریعہ بھی بنے۔

اور اب ایک دو نظمیں۔

مرے ہوؤں کی روحیں

تاریک خیالوں کا جمگھٹ بے رنگ لحد کے گھیرے میں
تیری ہستی کو لپٹائے گا تنہائی کے بکھیڑے میں
ان لمحوں میں اس دنیا کا گستاخ، ہجوم بے پایاں
جانے گا نہ کوئی بات تری تو ہو گا ہر اک نظر سے نہاں

۲

وہ گھُپ ہو رات ہو گا لیکن اس میں نہ ہو گی تنہائی
چپ چاپ ہی تھکے رہنا ان ہونٹوں پہ ہو مہر خاموشی!
اُن لوگوں کی روحیں جاگیں گی اِس دنیا میں سامنا تھا جن سے
کچھ سائے نظر آئیں گے تجھے ملتے جلتے سا در سا کن سے
پھر دیکھے گا تو ان کی رضا تیری ہستی پر چھائے گی
آواز رہے سینے میں نہاں، ہونٹوں پہ ہو مہر خاموشی!

۳

آکاش کا مشعل رات کو صاف تو ہو گا مگر غم آئے گا
اور انجم رخشاں میں بھی یہاں کا اُجالا نظر نہیں آئے گا
یہ اجالا جس میں آس دلکش صورت بن کے جھلکتی ہے
یہ اجالا جس کی ہر اک کرن اونچے مشعل میں چمکتی ہے
وہ انجم رخشاں لہو کے دھبوں ایسا رنگ دکھائیں گے
وہ تھکن جو تجھ پر چھائی ہوئی اُس کو اور بڑھائیں گے
اور تیرے لہو کی گردش میں اک ایسی گرمی لائیں گے
جس کی سوزش سے خون کے ذرّے انگارے بن جائیں گے

۴

سب اک پل میں مٹ جائیں گی یہ باتیں جو تیرے دل میں ہیں
وہ گھڑیاں پھر نہ دکھائیں گی نظارے جو اس محفل میں ہیں،
جیسے شبنم کے اڑنے پر شبنم کا نام گیاہ میں ہے
ان باتوں کا ہے حال یہی، ان کا حاصل اک آہ میں ہے۔

۵

وہ سامنے دور پہاڑی ہے اور اُس پر کہرا چھایا ہے
اور بہتی ہواؤں نے اپنے ہونٹوں پر قفل لگایا ہے
یہ کہرا دھندلا دھندلا ہے ذرّے ذرّے میں سمایا ہے
اَن مٹ ہے، لافانی، جیسے لوہے سے کسی نے بنایا ہے
یہ کہرا ایک اشارہ ہے پیڑوں کے سروں سے چھلکا ہے
بھیدوں کے بھید نہاں اس میں، یہ تو بھیدوں کا دھندلکا ہے

موت اور حیات بعد الممات کے موضوع جس طرح پَو کی کہانیوں میں نمایاں نظر آتے ہیں اسی طرح اوپر کی نظم سے بھی اس کی دلچسپی ظاہر ہے۔ اور ذیل کی نظم عشقیہ ہے، لیکن اس عشق میں بھی اُس کے تصورات کا مدہم رنگ موجود ہے۔ یہ نظم اس کی کسی محبوبہ کے نام ہے بیوی کے نام نہیں

بعض نقادوں کے خیال میں اس کی مخاطب پوؔ کے بچپن کے دوست کی والدہ مسز سٹینارڈ ہے لیکن ایک نقاد اس نظم کو "ہیلن" کے نام سمجھتا ہے کیونکہ بے وفائی کے بعد اس کا درجہ بھی پوؔ کی نظروں میں ایک مری ہوئی عورت کا ہو چکا تھا۔

سورگ باشی سے

یہ تو ہی تھی جس کی خواہش کا جذبہ مرے دل کے اندر تھا
سرسبز جزیرہ سمندر میں اک چشمہ تھا، اک مندر تھا
پھل پھول تھے پریوں کی بستی کے
پھل پھول تھے سب میرے بھئے!
سندر سپنا تھا ہٹ بھی چکا امید کا شعلہ راکھ بنا
"بڑھتا جا، آگے نکلتا جا، آگے ہی آگے چلتا جا"
آتی ہے یہی آواز مجھے
اب آنے والے زمانے سے
لیکن ماضی اب آنکھوں میں اک دھندلی خلیج کی صورت ہے
رہتی ہے وہیں پر روح مری حیران ہے، چپ کی مورت ہے
آرام کی سے کا پیپا نہ
ماضی ہی بنا ہے کاشانہ
لیکن افسوس کہ مجھ میں نہیں اب زیست کے ولولے جیسں،
وہ شمع بجھی، وہ نور مٹا اب کچھ بھی نہیں اب کچھ بھی نہیں
دساحل کی ریت پہ آتی ہیں
لہریں یہ بات سجھاتی ہیں)
کیا سوکھا پیڑ ہرا ہوگا؟ گھائل پنچھی پر تولے گا؟
ناممکن۔ میں تو سمجھتا ہوں آئندہ درد بھی بولے گا:
آے دیکھا دل "ماضی کے مکیں!
اب کچھ بھی نہیں اب کچھ بھی نہیں"

پوؔ حقیقت پر خواب کو ترجیح دیتا تھا، ذیل کی نظم سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے:-

ایک خواب

شب کے تاریک تصوّر میں مجھے لاکھوں بار
خواب آئے ہیں مسرّت کے جو اب دور ہوئی
خواب بیداری کے جب لائے مگر فردہ حیات
دل مرا ٹوٹ گیا — روح مری چُور ہوئی

اُس کو ہر چیز نظر آتی ہے دن میں اک خواب
جس کی آنکھیں ہوں لگی بیتے زمانے کی طرف
اُس کی آنکھوں سے نگاہوں کی کرن مائل ہے
حال کی باتوں کو ماضی میں چھپانے کی طرف

آہ! وہ خواب، وہ اک خواب مقدس میرا،
میں اُسے دیکھتا تھا، لوگ ہنسا کرتے تھے،
ہاں اُسی خواب نے اب تک مجھے خوش رکھا ہے۔
اُس کے ہی نور سے رستے بھی سُجھا کرتے تھے۔

اس کی کیا فکر مجھے اب ہے جو طوفانی رات
اور وہ نور بہت دور سے آتا ہے نظر
پوچھتا ہوں میں کہ سچائی کے تاروں میں کبھی
ایسی تابانی کا دیکھا ہے کسی نے منظر؟

ذیل کی چھوٹی سی نظم کو بیداری کا ایک خواب سمجھنا چاہیئے کیونکہ یہ محض ایک جھوٹی تسلّی کا حکم رکھتی ہے ورنہ پوؔ سے سچّی ہمدردی سوائے اُس کی ساس کے اور کس کو تھی؟

کسی کے نام

غرض نہیں مجھے اس سے کہ خاک میں میری
نہیں ہے خاک کا ذرّہ بھی اب کوئی موجود
نہ اس کی فکر ہے: نفرت کے ایک لمحے سے
ہزاروں سال محبت کے ہو گئے نابود

میں اس کا غم نہیں کھاتا کہ دہر میں جو لوگ
اکیلے رہتے ہیں مجھ سے زیادہ ہیں مسرور

مجھے یہ سوچ ہے میں تو فقط مسافر ہوں
مرے نصیب کی برگشتگی پہ تو رنجور؟

ذیل کی نظم کی تحریک پو کو غالباً اپنی بیوی ورجینیا کے مستقل اور مہلک مرض سے ہوئی ہے جب اُس کے بسترِ مرگ پہ بیٹھے بیٹھے موت اور مصائب کے متعلق اس کے ذہن میں خیالات اور تصوّرات کا ایک طوفان جاگ اُٹھتا تھا۔

جیون کی ندی

دھیرے دھیرے۔ دھیرے دھیرے جیون ندی بہتی جا
اے عنابی لہو کی بوندو! رُک جاؤ، اب رک بھی جاؤ۔
دیکھنے دو تم، دیکھنے دو تم مجھ کو یہ سندر سپنا
اُن لمحوں تک جن میں رُکے گا اِس بہتی دنیا کا بہاؤ۔

دیکھو دیکھو۔ میری ہمکھیا اُس کا درد اذیت، گھاؤ،
دیکھو کیسے ہر اک آنکھ کی پُتلی تیز چمکتی جائے۔
سُن لو، سُن لو ان چیخوں کو، یہ آواز کا پیارا گھلاؤ،
جن میں اُس کی نا اُمیدی دھندلی دھندلی دمکتی جائے۔

اُٹھو۔ اُٹھو۔ اے پاتال کی روحو! اُٹھو! اُٹھ بھی جاؤ،
تیر کے ایسے آنکھ جھپکتے اُس کے دل میں ڈیرا جماؤ۔
ہیبت! دہشت! اپنی خون جماتی چیخوں کو لے آئے
جلدی آئے آکر اپنا نحوست والا جال بچھائے

ہاں! اے میرے دل کی لہرو! خوش ہو جاؤ، خوش ہو جاؤ،
اب بدلے کی مٹھاس کو چکھو، اس کے نشّے میں کھو جاؤ
اور ہاں، تم بھی میرے دل کی نفرت کو دیکھو چُپ چاپ
کیا ملعون تھا وہ لمحہ بھی جبکہ ہوا تھا اپنا ملاپ

پو کی اذیت پرستی کو یہ نظم کافی سے زیادہ حد تک ظاہر کر رہی ہے اور ذیل کی نظم سے بھی پو کے خصائص یعنی ظاہر ہیں۔ موت، نغمے میں نوحہ، قبر کا گوشہ، جھیل تعویت کرینی خیالات کی یہ جا ہے اور اسی سے ایک اور بات یاد آئی۔ شعر میں فنی لحاظ

ان سب باتوں کے لحاظ سے اس کا درجہ بلند تھا۔ اس مضمون کے ساتھ آپ جو ترجمے دیکھیں گے اُن میں سے اکثر میں ہندی کی وہ بحر استعمال کی گئی ہے جو فارسی میں نہ تھی لیکن اردو والوں نے ہندی سے لے کر اپنالی۔ یہ ڈھیلی ڈھالی بحر (جس میں ضرورت کے وقت ایک تیزی بھی پیدا کی جا سکتی ہے) نہ صرف موسیقی کے لحاظ سے گیتوں کے لئے بہت موزوں ہے بلکہ خواب دیکھنے والی طبائع سے ایک فطری مناسبت رکھتی ہے۔ چنانچہ میر تقی کی اکثر غزلوں میں اور اچھی غزلوں میں خصوصاً، آپ اسی بحر کو پائیں گے۔ پو کے ترجموں میں بھی اس بحر کا زیادہ استعمال ہونا اُس کی خواب آلود ذہانت کی نسبت سے ہے۔

جھیل

جب آئی بہار جوانی کی، اُس من موہن میٹھی کہانی کی
اِس پھیلی پھیلی دنیا کا اک کونہ میں نے ڈھونڈ لیا،
اس کونے سے جو رغبت تھی ویسی نہ کسی سے چاہت تھی،
ہر ذرّہ دل کو لبھاتا تھا اور آنکھوں کو گرماتا تھا،
اک جھیل تھی بن میں کھوئی ہوئی اور گہری نیند میں سوئی ہوئی
اُس جھیل کے سونے کناروں کو کچھ کالی چٹانوں نے گھیرا تھا
اور ساتھ صنوبر کے لمبے اونچے پیڑوں کا ڈیرا تھا
لیکن جب رات آ جاتی تھی، اور دنیا پر چھا جاتی تھی،
بے چین ہوائیں چلتی تھیں اور اُن سے چیخیں نکلتی تھیں،
وہ گریہ تھا، وہ نغمہ تھا، وہ نغمہ بھی اک نوحہ تھا،
میں اس نوحے کو سنتا تھا، اور پہروں ہی سر دُھنتا تھا
اُن روتے روتے نغموں میں اُن چیخوں والے لمحوں میں
پل بھر جادو مٹ جاتا تھا اور دھیان مجھے یہ آتا تھا:
یہ کیسی وحشت چھائی ہے، تنہائی ہے، تنہائی ہے!
احساس مگر ناگفتہ تھا، ظاہر تھا پھر بھی نہفتہ تھا،
ہیروں کی کان ملے مجھ کو یا سارا جہان ملے مجھ کو
میں جھیل کہانی کیسے کہوں؟ بہتر ہے یہی خاموش رہوں،
وہ سب لہریں تھیں زہر بھری، ان لہروں میں تھی موت چھپی،
جو گہرائی میں بچھونا تھا۔ اک ایسی قبر کا کونہ تھا،
جس میں اس شخص کو راحت ہو (اور ذہن رسا کو مسرت ہو)
جو بڑھ کے اس گہرائی کو، اپنے دل کی تنہائی کو
اس کے ذرّوں میں سمو ڈالے پہلے منظر کو دھو ڈالے
وہ دھندلی جھیل سنور جائے اور باغ عدن کا نکھر آئے

میراجی

کالکا کی ایک صبح

چٹکیاں لیتی ہے دل میں کالکا کی اک سحر
جا رہی تھی ریل زناتی سی، لہراتی ہوئی
کُہر آلودہ دھندلکوں کی ردا کو چیرتی
یخ ہوا کے تیز رَو جھونکوں سے ٹکراتی ہوئی

ہے تصور جس کا اب تک جنتِ قلب و نظر
ایک زخمی سانپ کی مانند بل کھاتی ہوئی
کوہساروں کے جگر، قلبِ فضا کو چیرتی
پٹریوں پر اک خنک سی راگنی گاتی ہوئی

دھندلے دھندلے آسماں پر سرخیاں سی چھا گئیں
چونک اُٹھے ذرات، ویرانے نے لیں انگڑائیاں
کوہساروں کے کنارے نور میں دھوئے گئے
چوٹیاں روشن، شجر جاگے، سویرا ہو گیا
تھرتھراتی روشنی میں جھلملائیں وادیاں
میری نظریں چومتی تھیں ان مناظر کو ابھی

رات کی پریوں کے چہرے فق ہوئے شرما گئیں
ضَوفشاں تھیں صبحِ زر افروز کی رعنائیاں
شبستاں کے نظارے نور میں دھوئے گئے
صبح کے زانو پہ سر رکھ کر اندھیرا سو گیا
جاگ اٹھیں خواب میں لپٹی ہوئی آبادیاں
ناگہاں ہو نکے ہوئے انجن کی منزل آ گئی

جلوۂ رخشاں سے حیراں رہ گئی میری نظر
یک بیک سب شبنم آلودہ دریچے کھل گئے
پھوٹ نکلا ریل کے کمروں سے اک سیلابِ حُسن
رات کے کپڑوں میں وہ سوئے ہوئے چہروں کے رنگ
چاند سے چہروں پہ آوارہ لٹیں بکھری ہوئی
خواب آلودہ نگاہیں، خواب برساتی ہوئی
بعض احساسِ جوانی کے نشے سے چُور چُور
گفتگو میں شہد، لوچ اعضا میں، آنکھوں میں خمار

کالکا کے "ریل اسٹیشن" کا منظر دیکھ کر
بام و در سارے ضیائے مہ وشاں سے دھل گئے
ہر حسیں جس میں تھا گویا گوہرِ نایابِ حُسن
کچھ کے بُشروں پر سمٹ آئی ہوئی دل کی اُمنگ
خاک پر گویا خراماں جنتیں بکھری ہوئی
جسم میں انگڑائیاں سی پیچ و خم کھاتی ہوئی
لب پہ متوالی ہنسی، آنکھوں میں ہلکا سا سرور
چال میں رس، سانس میں گرمی، نگاہوں میں بہار

آنچلوں میں جگمگاتی یاسمیں باہوں کا نور — احمریں آنکھوں کی مستی، مرمریں باہوں کا نور
سادگی میں بھی نمایاں اک نشیلا بانکپن — کھوئی کھوئی سی ادائیں، سوئے سوئے سے بدن
سیمتن پریاں نکل آئیں تھیں فرشِ خاک سے — یا جواں حوریں اُتر آئیں دلِ افلاک سے
بعض ابھی ناآشنائے کیفِ صہبائے شباب — تھی رگ و پے میں رواں لیکن تمنائے شباب
خندہ زن پیشانیوں پر صبح کے تاروں کا نور — اک ردائے بے نیازی، اک غرورِ بے شعور
پھول سے چہرے، تھکن سے چور سنولائے ہوئے — گردنوں میں سر سے دوپٹے ڈھلک آئے ہوئے
ہر نظر جھکتے ہوئے منظر کو بہکاتی ہوئی — ہر ادا رگ رگ میں انگارے سے دوڑاتی ہوئی
ہر طرف اٹھلا رہا تھا کاروانِ حسن و رنگ — لوٹ آیا تھا زمیں پر آسمانِ حسن و رنگ

اک خلش سی دل کی بستی میں ابھی آباد ہے
کالکا کی وہ سنہری صبح اب تک یاد ہے

سید ضمیر جعفری بی اے

دو رباعیاں

(۱)

طوفانِ بلا کا ساتھ دے دیتے ہیں
کشتی کو کنارے سے [illegible] لیتے ہیں
[illegible] ہیں
[illegible] کھینچ [illegible]

(۲)

[illegible] پہ نقشہ کچھ بنانا ہی پڑا
[illegible] درد کو دبانا ہی پڑا
[illegible] دوست
سمجھا تھا کہ [illegible]
لیکن وہ ملے تو مسکرانا ہی پڑا

پرویز شاہدی

پیارے چاند

دل پہ مرے بھی نور کی ہلکی ہلکی بارش کر دے چاند
ظلمت کے اس کاشانے میں ایک اجالا بھر دے چاند
نور کا تو اک منبع ہے اور میرا کلبہ تیرہ و تار
یاس کے بادل جس کے اندر ہیم چھائے رہتے ہیں
ظلمت کے اس کاشانے میں ایک اُجالا بھر دے چاند
دل پر مرے بھی نور کی ہلکی ہلکی بارش کر دے چاند!
مایوسی کا جادو سارا، تاریکی کا سارا پردہ
پھاڑ دے اس کو توڑ دے اس کو میرے پیارے پیارے چاند

پھوٹ پھوٹ کر تیری کرنیں بے چیکے سے آجاتی ہیں،
ساری زمیں پر سارے جہاں پر نرمی سے چھا جاتی ہیں،
نور کا پردہ ہے آویزاں، ساری فضا میں سیمیں تُھپیاں
خواب کی دیوی چاندنی بن کر گویا فلک سے اُتری ہے
جس کی لپیٹ میں ہر اک شے کو حاصل ہے اک کیف و سرور
سب دنیا ہے نور کا مخزن، میرا کلبہ تیرہ و تار
ظلمت کے اس کاشانے میں ایک اُجالا بھر دے چاند!

ہر اک شے کو حاصل ہے اک کیفِ سکونِ روح و قلب
ہر اک شے ہے راحت میں آرام نصیب اور محوِ خواب
اس پھیلے سیمابِ رواں میں خارِ بیاباں، باغ کے پھول،
حل ہو جانے کے شوق میں جیسے جگ کو بھول کے سوئے ہیں
ایسا سماں ہے پھر بھی میرا دل بے چین ہے اور بیتاب
دل پہ مرے بھی نور کی ہلکی ہلکی بارش کر دے چاند
ایسے سمے میں سوئے سوئے چاندنی میں گم ہو جاؤں میں
دھرتی چھوڑ آکاش پہ پہنچوں جگ والوں سے کھو جاؤں میں
ایسے سمے میں مر جانا بھی ایک نیا جینا ہے چاند
درد کی دھول کو دھو کر نور کے امرت کو پینا ہے چاند

دھیان رہے یوں اڑتی اڑتی روح کوئی جب تجھ سے ملے
روح مری ہوگی، تو بھی بازو پھیلا کر مجھ سے ملے
تیرے ان کالے داغوں میں اور سہی اک کالا داغ!

عزیز احمد

اچھی کتابیں زندگی کو اچھا بناتی ہیں

لیکن ہر شخص کو اچھی اور بری کتابوں میں تمیز کا موقعہ حاصل نہیں خصوصاً آج کل کے تیز رفتار زمانے میں جب کہ ہر بری چیز اپنا ظاہری دلکش لباس پہن کر ہمیں دھوکا دینے کے لئے ہر طرف موجود رہتی ہے۔ اس دھوکے سے بچنے کے لئے سکون اور وقت کی ضرورت ہے ان وجوہات کے مدنظر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ ادبی دنیا کے پڑھنے والوں اور عام پبلک کے لئے وقتاً فوقتاً چنی ہوئی کتابوں کی مختلف فہرستیں شائع کی جائیں اس انتخاب اور معیار کی ضمانت صلاح الدین احمد اور میراجی مدیران ادبی دنیا کا نام ہے انہوں نے نہایت محنت اور وقت صرف کرنے کے بعد یہ انتخاب کیا ہے اور جو بلند نظری اور معیار کی خوبی ادبی دنیا کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے۔ اسی کا لحاظ ان فہرستوں پر بھی رکھا ہے ناظرین کی آسانی کے لئے یہ تمام کتابیں کتب خانہ ادبی دنیا میں فراہم کر لی گئی ہیں تاکہ ایک ہی جگہ سے بغیر کسی دقت کے آپ کو یہ چنی ہوئی کتابیں مل سکیں ہمیں امید ہے کہ ہر ماہ ناظرین ان فہرستوں کا مطالعہ کر کے ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت
افسانے		پس پردہ — چندر بھوشن سنگھ		منتوش ۸ر مینار — حکیم احمد شجاع	۱۲ر
فردوس خیال — منشی پریم چند	عہ	سایۂ فطرت — حسن عزیز جاوید	۸ر	ہملٹ — مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	[illegible]
پریم تیسی حصہ اول و دوم — ”	۳ہ	محبت اور نفرت — اختر حسین رائے پوری	۳ہ	فاؤسٹ — گوئٹے	[illegible]
نظارے — کرشن چندر	عہ	ہیبت ناک افسانے — امتیاز علی تاج	۸ر	چند تو پیاں — نور الٰہی محمد عمر	[illegible]
منٹو کے افسانے — سعادت حسن منٹو	۸ر	**مضامین**		چند ڈرامے — ”	[illegible]
سحر فرانس — طاہر قریشی	عہ	پطرس کے مضامین — احمد شاہ بخاری	۸ر	**منظومات**	
دانہ و دام — راجندر سنگھ بیدی	عہ	حاجی لق لق کے افسانے — حاجی لق لق	۱۱ر	بانگ درا — اقبال	[illegible]
باسی پھول — سید علی عباس حسینی	۳ہ	مطائبات — سندباد جہازی	عہ	نقش و نگار — جوش ملیح آبادی	[illegible]
شعلے — پروفیسر احمد علی ایم اے	عہ	جدید جغرافیہ پنجاب — ”	عہ	فکر و نشاط — ”	[illegible]
سوز ناتمام — عاشق حسین بٹالوی	۳ہ	دنیائے تبسم — شوکت تھانوی	۳ہ	بہارستان — مولانا ظفر علی خاں	[illegible]
چغتائی کے افسانے — مرزا عظیم بیگ چغتائی	سے	مضامین فلک پیما — فلک پیما	۶	سوز و ساز — حفیظ جالندھری	[illegible]
صنوبر کے سائے — حجاب امتیاز علی	عہ	روح لطافت — مرزا عظیم بیگ چغتائی	۳ہ	نغمہ زار — ”	[illegible]
میری ناتمام محبت — ”	۸ر	روح ظرافت — ”	۸ر	چراغاں — احسان دانش	[illegible]
طلسم خیال — کرشن چند	۳ہ	کولتار — ”	۸ر	آتش خاموش — ”	[illegible]
اندھی دنیا — اختر انصاری	عہ	**ڈرامے**		نغمۂ حرم — اختر شیرانی	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	عہ	نقش دوام — عبدالحمید عدم	[illegible]

برہمچاری

پریم ترنی کی وہ رات مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ نہ پہلے کسی پڑاؤ پر سورج کماری نے اتنا سنگار کیا تھا۔ نہ پہلے وہ گیس کا لیمپ جلایا گیا تھا۔ اس روشنی میں سورج کماری کا عروسی لباس کتنا چمک اٹھا تھا۔

دونوں گھوڑے والوں کو خاص طور پر بلایا گیا تھا ایک کا نام تھا عزیزا اور دوسرے کا رفیق۔ جے چند کا کشمیری کلرک جیالال بہت مسرور نظر آتا تھا۔ خود جے چند بھی دولھا بنا بیٹھا تھا۔ رسو ئیے کو نہ جانے اس محفل میں کچھ کشش کیوں نہ محسوس ہوئی۔ کام سے فارغ ہوا تو وہ یاترا کا بازار دیکھنے چلا گیا۔

پریم ناتھ سے بغیر کچھ کہے سنے ہی جب میں سری نگر سے پیدل پہلگام کی طرف چل پڑا تھا تب کسے خبر تھی کہ اتنے اچھے خیمے میں جگہ مل جائے گی سورج کماری نے بات پہچان لی تھی۔ اس نے جے چند کو بتا دیا کہ میں گھر والوں کی رضامندی کے بغیر ہی ادھر چلا آیا ہوں۔ اس طرح اس نے میرے لئے اپنے خاوند کے دل میں ہمدردی کے جذبے کو اور بھی ابھار دیا۔

جیالال نے عزیزا سے وہ گیت گانے کا مطالبہ کیا، جس میں ایک کنواری کہتی ہے۔ "بید مشک کی خوشبو میرے من میں بس گئی ہے۔ بادرے بھونرے! تو کہاں جا سویا ہے؟" اسے یہ گیت یاد نہ تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ وہ لڑکی جس کے من میں بید مشک کی خوشبو بس گئی تھی، سورج کماری سے کہیں بڑھ کر حسین ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ کشمیر کی بیٹی کو اکثر خوبصورت لباس نصیب نہیں ہوتا۔

خود سورج کماری نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ مجھے اس کا وہ روپ یاد آرہا تھا، جب وہ سہرا دیکھا ڈھے گھوڑے پر سوار تھی اور چندن واڑی پار کر کے برف کے اس پل پر اتر پڑی تھی جس کے نیچے سے شیش ناگ بہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ جنگل کی اپسرا معلوم ہوتی تھی۔ راستے میں جنگلی پھول چن کر چلتے چلتے جیالال نے ایک گجرا تیار کر لیا تھا۔ اور وہ مسکراہٹ مجھے کبھی نہ بھولے گی جو جیالال سے یہ گجرا لیتے ہوئے سورج کماری کی آنکھوں میں رقص کرنے لگی تھی۔

میں نے کہا "گیت تیار کرنا کچھ مشکل تھوڑا ہی ہے۔ بول بنسری میں سے گذار دیں، گیت بن جائے گا۔"

سورج کماری بولی "میرے پاس تو ایسے بول بھی نہیں رہ گئے۔ ہاں بنسری میں نے سنبھال کر رکھ چھوڑی ہے ..... میرے بھی دل میں کبھی گیتوں کی دھن سمائی تھی۔"

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن اپنے ذہن میں اس سے مخاطب ہوا —— گھبراؤ نہیں، متوالی دلہن! تمہارے بول تو بہت سریلے ہیں ..... وہ ضرور کسی روز پھر بنسری میں سے گزریں گے ..... اور اپنے گیتوں کے رس میں ڈوب کر تو مجھے بھول جائے گی .....

عزیزا نے لوچدار آواز میں گانا شروع کیا۔

"لج پھولے اندونن
بچ کنن گوسے نامے اون!
لج پھولے کول سرن
ودتھونبرن کھس رو۔
پھولی پوسمن اندون
بچ کنن گوسے نامے اون؟"

'دور جنگلوں میں پھول کھل گئے۔ کیا میری بات تیرے کانوں تک نہیں پہنچی؟ کول سرینا جھیلوں میں پھول کھل گئے۔ اٹھو ہم چراگاہوں کی طرف چڑھیں گے۔ دور جنگلوں میں چنبیلی کے پھول کھل گئے۔ کیا میری بات تیرے کانوں تک نہیں پہنچی؟'

جے چند کشمیری خوب سمجھتا تھا کشمیر میں ٹھیکیداری کرتے اسے کئی سال ہو گئے تھے۔ سورج کماری نے کیوں اس زبان میں دلچسپی نہ لی تھی،

اس بات پر سب سے زیادہ حیرت مجھے اسی بات ہوئی۔ جے چند بولا "یہ کسی کنواری کا گیت ہے۔ اس نے دیکھا کہ بہار آ گئی جنبیلی کے پھول بھی کھل گئے۔ اور پھر شاید غیر شعوری طور پر اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ خود بھی جنبیلی کا ایک پھول ہے۔"

گیت کا ایک ہی ریلا عزیزا کو بہت قریب کھینچ لایا۔ سارے راستے میں میں نے کبھی اسے اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ آدمی کتنا چھپا رہتا ہے۔ اسے جاننے کی میں نے اب تک کوشش بھی تو نہ کی تھی۔

روز روز کے لمبے سفر سے ہم بہت تھک گئے تھے۔ اب اس شغل میں سب تکان بھول گئی۔ سورج کماری کا سندر چہرہ سامنے نہ ہوتا تو عزیزا کو بہار کا گیت کیسے یاد آتا۔

سورج کماری کہہ رہی تھی: "بابوجی! میں نے سنا ہے کہ اس وادی میں بہنے والی پانچوں ندیوں کا پانی، جہاں اتنا قریب قریب بہتا ہے، ایک دوسری سے کم و بیش ٹھنڈا ہے۔"

جے چند بولا۔ "شاید یہ ٹھیک ہو۔"

میں سوچنے لگا کہ سب مرد بھی تو ایک سی طبیعت کے مالک نہیں ہوتے...... عورتیں بھی طبیعت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتیں.....

واہ ری قدرت، پنج ترنی کی پانچوں ندیوں کا پانی بھی یکساں ٹھنڈا نہیں!

"پاربتی ان ندیوں میں باری باری سے نہایا کرتی تھی، بابوجی!"

"تم سے کس نے کہا؟"

"جیالال نے۔"

جیالال چونک پڑا۔ سورج کماری نے عشرت انگیز ہنسی ہنس کر جے چند کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ بھی خود ایک پاربتی ہو اور اپنے شِو کو رجھانے کا جتن کر رہی ہو۔

میں نے عزیزا سے کوئی دوسرا گیت گانے کا مطالبہ کیا۔ وہ گا رہا تھا۔

"دنی وسئی آمدلن یار کنی مے لکھنا!
چھوہ لوگم سِن ولن یار کنی مے لکھنا!
وسئی سئیندز شیلن یار کنی مے لکھنا!"

"آرول کے پھولوں میں تمہیں تلاش کروں گی۔ کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب! میرے بال کو خود سے نفرت ہو گئی ہے۔ کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب! سندھ نالے کے پانی میں تمہیں تلاش کروں گی۔ کہیں تم ملو گے نہیں (میرے) محبوب!"

رفیع اس درخت کی طرح تھا، جسے جھنجوڑنے سے اونچی ٹہنی پر لگا ہوا پھل نیچے نہیں گرتا۔ اس نے ایک بھی گیت نہ سنایا لیکن جیالال تو بس اچھل ہی پڑا اور بغیر رسمی تقاضے کے اس نے گانا شروع کیا۔

"چوری یار چولم تائے، تہی ماڈے لٹھ وون؟
.. تہی ماڈے اُو ٹھ وون!
وورن مارن گرائے لولو گرائے لولو
ووتھی وی دگ نیا ورو وہائے کر دنے!
سنگرمالن چھلائے لولو، چھلائے لولو!"

"میرا محبوب چوری چوری بھاگ گیا۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے کہیں، دیکھا ہے کہیں؟ — کان کے سہرے ہلاتے ہوئے، ہلاتے ہوئے! اٹھو، پریو! ہم "رود" ناچ ناچیں گے، پہاڑیوں کی چھاؤں میں، چھاؤں میں!"

جیالال مسکرا رہا تھا۔ سورج کماری کی طرف للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنا بے کار رہا۔ وہ اس کی زبان نہ سمجھتی تھی، داد نہ دے سکتی تھی لیکن اُسے مسکراتا دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگی۔

سورج کماری کی مسکراہٹ میں کتنی موہنی تھی۔ وہ کالی داس کی کسی حسن و عشق کی نظم کی طرح تھی جس میں لفظوں کے ایک سے زیادہ معنی نکل آتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یوں محسوس ہوا گویا اس کی مسکراہٹ جے چند اور جیالال کے نہیں بلکہ میرے لئے ہے۔

مگر میں اس مایا جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اپنشد کی پرانی کہانی "کچھ دیویانی" میری آنکھوں کے آگے پھر گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک کچھ ہوں اور اسی اثر کے ماتحت سورج کماری دیویانی کے روپ میں دکھائی دینے لگی۔

کچھ سورگ کا رہنے والا تھا اور وہ دھرتی پر ایک رشی کے آشرم میں زندہ جاوید رہنے کی ودیا سیکھنے آیا تھا اور میں نے یاترا کے دن کاٹنے کے لئے جے چند کے خیمے میں پناہ لی تھی۔

سورگ سے چلتے وقت کچھ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ یہ ودیا سیکھ کر سورگ ہی کو لوٹ آئے گا۔ اور وہاں کے باسیوں کو اس کا فیض پہنچائے گا۔ اس کے لئے سب سے ضروری یہی تھا کہ وہ برہمچاری کے دھرم پر پکا رہے رشی آسانی سے وہ ودیا کسی کو سکھاتا نہ تھا۔ کتنے ہی نوجوان کچھ سے پہلے

آ چکے تھے۔ ہر کوئی رشی کے غصے کی تاب نہ لاکر وہیں ختم ہو گیا۔ مگر جب کچ آیا تو رشی کی لڑکی دیویانی اُس پر فریفتہ ہو گئی۔ اپنے باپ سے فرمائش کر کے اُس نے اسے یہ وِدّیا سکھانے پر رضامند کر لیا۔

جب کچ یہ وِدّیا سیکھ چکا تو واپس جانے کے لئے تیار ہوا۔ دیویانی کہنے لگی: "دیکھو، اس دیو متی ندی کو نہ بھولنا۔ اس کا بہاؤ پریم کے بہاؤ ایسا ہے۔"

کچ نے جواب دیا: "اسے میں کبھی نہ بھولوں گا..... اِسی کے قریب اُس دن، جب میں یہاں پہنچا تھا، میں نے تجھے پھول چُنتے دیکھا تھا..... اور میں نے کہا تھا۔ میرے لائق کوئی سیوا ہو تو کہو۔"

دیویانی بولی: "ہاں اسی طرح ہمارا پیار شروع ہوا تھا..... اب تم میرے ہو..... عورت کے دل کی قیمت پہچانو..... پیار؟ کسی دیوتا سے سستا نہیں..... اور اب تمام دیوتا اور اُن کا بھگوان اپنی ساری طاقت سے بھی تمہیں واپس نہیں لے سکیں گے..... مجھے پھول پیش کرنے کے خیال سے بیسیوں بار تم نے کتاب پرے پھینک دی تھی..... ان گنت بار تم نے مجھے وہ گیت سنائے تھے جو سورگ میں گائے جاتے ہیں..... تم نے یہ چال صرف اسی لئے تو نہیں چلی تھی کہ یوں مجھے خوش رکھ سکو اور آسانی سے وہ وِدّیا سیکھ لو جسے میرے پتا جی نے پہلے کسی کو سکھانا منظور نہیں کیا تھا.....؟"

کچ بولا: "مجھے معاف کر دے، دیویانی!..... سورگ میں تو مجھے جانا ہی ہو گا..... اس کے علاوہ میں تو برہمچاری ہوں!"

"برہمچاری!..... ایک راہی کی طرح تو یہاں آ نکلا تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ چھاؤں دیکھ کر آن بیٹھا اور پھول چُن چُن کر تو نے میرے لئے ہار بنایا..... اب اپنے ہاتھوں سے تو ہار کا تاگا توڑ رہا ہے..... دیکھ، پھول گرے جا رہے ہیں.....!"

"پھول گرے جا رہے ہیں، لیکن میں بے بس ہوں۔ سورگ میں سب میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ مجھے وہاں جانا ہی پڑے گا — اور یہ بات تو تم سے چھپی نہیں کہ مجھے اب سورگ میں سکھ چین نصیب نہ ہو گا۔"

میں نے سوچا کہ ایک لحاظ سے میں کچ سے کہیں زیادہ دلیل پیش کر سکتا ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں۔ "سورج کماری! تیری مسکراہٹ تیرے خاوند کے لئے ہونی چاہئے۔ دیویانی کی طرح تو کسی رشی کی کنواری لڑکی تھوڑی ہی ہے!"

سورج کماری انگڑائی لے رہی تھی۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ بائیں گال پر سرک آئی تھی۔ میری طرف مخاطب ہو کر بولی: "بس یا ابھی اور؟"

میں نے اُس کا پورا مطلب سمجھے بغیر ہی کہہ دیا: "بس۔ اور نہیں۔"

"اور نہیں..... خوب رہی۔ میں تو اِدھر کی زبان سمجھتی نہیں۔ تمہاری خاطر باؤجی نے عزیزا کو یہاں بلایا۔ اب ایک دو گیت سُن کر ہی تمہاری بھوک مٹ گئی؟ اور وہ جو گیت گیت کی رٹ لگا رکھی تھی پہلگام میں؟....."

میں نے کہا: "نہیں بی بی جی! میں نے سوچا آپ کو نیند آ رہی ہے، اور شاید عزیزا بھی سونا چاہتا ہے۔"

عزیزا کچھ نہ بولا۔ جے چند نے محفل برخاست کر دی۔ عزیزا اور رفیق چلے گئے اور سو گئے۔ جے چند اور سورج کماری کے بستر لگا کر ہمارے پاس آ بیٹھا۔

سورج کماری پوچھ رہی تھی۔ "باؤجی! سنا ہے گپھا میں کبوتروں کا جوڑا بھی درشن دیتا ہے۔"

"صبح کو تم خود دیکھ لو گی۔"

"کبوتر کہاں سے آتے ہیں؟"

"اب یہ میں کیا جانوں؟"

"ایک سنیاسی نے بتایا تھا کہ یہ کبوتر شیو اور پاربتی کے روپ ہیں۔"

"شاید عورتوں کا دیکھنا ہو۔"

رسوئیا سو چکا تھا۔ جے چند اور سورج کماری بھی سو گئے۔ جیا لال بولا: "اُف! کتنی سردی ہے!"

"کتنی سردی ہے! برہمچاری ہو کر بھی یہ سردی نہیں سہہ سکتے۔ شرم کا مقام ہے۔"

"برہمچاری تو میں ٹھہرا۔ مگر اس آب و ہوا کا عادی نہیں ہوں۔"

"برہمچاری کو تو کسی موسم سے بھی نہیں ڈرنا چاہئے۔"

"تم بھی تو برہمچاری ہو؟" اُس نے طعن سے کہا۔

"تو میں کب ڈرتا ہوں؟"

"تو کیا تم خیمے کے باہر کھلے آسمان کے نیچے سو سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔"

یہ بات میں نے جوش میں آ کر کہہ دی تھی۔ میں نے اپنی موٹی کشمیری لوئی اٹھائی اور خیمے کے باہر نکل گیا۔ جیا لال میرے پیچھے بھاگا۔ میں رک کر کھڑا ہو گیا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔

وہ بولا: "میں نے تو ہنسی میں کہہ دیا تھا اور تم سچ مان گئے۔"

"سچ ہو یا جھوٹ۔ میں دکھا دوں گا کہ برہمچاری ڈرتا نہیں۔"

"اچھا تو خیمے کے قریب ہی لیٹ جاؤ۔"

میں خیمے کے قریب ہی لوئی میں لپٹ کر لیٹ گیا۔ وہ اندر سے چٹائی نکال لایا اور بولا اسے نیچے ڈال لو۔ ایسی تو کوئی شرط نہ تھی کہ ننگی دھرتی پر سو کر دکھاؤ گے۔

چٹائی ڈال کر وہ میرے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ بولا ارے یار! مفت میں کیوں جان گنواتے ہو؟

"اونہہ" میں نے شانے پھڑکاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی بات کا خطرہ نہیں۔"

"اچھا تو میں ٹھیکیدار صاحب کو جگاتا ہوں۔" جیالال بولا۔

پھر جیالال اُس مسلمان چرواہے کی کہانی مجھے سنانے لگا جس نے ایک بڑا کام کیا تھا۔ یاتری امرناتھ کا راستہ بھول گئے تھے۔ اس نے ڈھونڈھ نکالا تھا۔ اور اُس کے عوض میں اب تک اُس کی اولاد کو چڑھاوے کا ایک معقول حصہ ملتا آ رہا ہے۔

میں نے شرارتاً کہا "تو وہ امرو راُس وقت بیچارہ ہوگا۔"

وہ ہنس پڑا اور اندر جا کر لیٹ رہا۔ میں چاند اور تاروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پرانے زمانے میں بڑے بڑے رشی اِدھر آتے تھے تو خیموں میں تھوڑا ہی رہتے تھے۔ یوں کھلے آسمان تلے پڑے رہتے ہوں گے۔ اِس کرلاکے کی سردی سے وہ ڈرتے نہ تھے۔

کچھ دیر کے بعد تارے میری نگاہ میں کانپنے لگے۔ چاند دھند میں لپٹ گیا۔ خواب آلود پلکوں نے آنکھوں کو سی دیا۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔

میں نے دیکھا کہ جیالال گھوڑے پر سوار سورج کماری کو گجراپیش کر رہا ہے۔ اور وہ پشاور کی ہرے دوپٹے والی جوان عورت عجب انداز سے مسکرا رہی ہے۔ میں نے جیالال کو متنبہ کرتے ہوئے کہا: "جیالال تمہارا منصب العین عورت سے کہیں بلند ہے ۔ ۔ ۔ ۔ عورت ایک سراب ہے ۔ مایا!"

جیالال ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگا اور بولا "لیکن یہ مایا کس قدر حسین ہے۔ مجھے تو اس سراب کے پیچھے ہی سرگرداں رہنے دو۔"

عزیزا بید مشک کی ٹہنی لئے آ رہا تھا۔ میں نے معاً اُس سے سوال کیا: "یہ کس کے لئے لائے ہو، عزیزا؟"

"اُس بہار کی دلہن کے لئے جو خیمے میں اس وقت مستِ خواب ہے۔" عزیزا نے نیم بیہوش آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس وقت مجھے کسی سورج کماری کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ گا رہی ہو ۔۔۔ "بید مشک کی خوشبو بھیگے بن میں بس گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دور جنگلوں میں جنبیل کے پھول کھل گئے۔ کیا میری آواز تمہارے کانوں تک نہیں پہنچی میرے محبوب؟"

اور جیسے کوئی بے چند کہہ رہا ہو "تمہاری آواز میں نے سُن لی۔ اُٹھو! ہم چراگاہوں کی طرف چڑھیں گے۔"

پھر وہ سورج کماری تتلیوں کے پیچھے بھاگی۔ بے چند بھی اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ سورج کماری کو دیکھ کر مجھے اُس چینی کنواری کا خیال آیا۔ جسے تتلیوں نے پھول سمجھ لیا تھا اور ٹولیاں بنا کر اس کے گرد جمع ہو گئی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ تتلیاں تو سورج کماری سے بھاگ رہی تھیں اور ان کا پیچھا کرتے ہوئے اُس کا سانس چڑھ رہا تھا۔ بے چند کو دیکھ کر مجھے چینی تاریخ کے اس بادشاہ کی یاد آئی جس نے پنجروں میں سینکڑوں تتلیاں پال رکھی تھیں۔ جب اُس کے باغ میں خوبصورت لڑکیاں جمع ہوتیں تو وہ حکم دیتا کہ پنجروں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ تتلیاں سب سے حسین لڑکی کے گرد گھومنے لگتیں اور اس طرح یہ لڑکی بادشاہ کی نگاہوں میں بھی جچ جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا اس بے چند نے بھی تتلیوں کی مدد سے اس سورج کماری کو چنا تھا؟ مگر یہ تتلیاں تو نہ سورج کماری کی پروا کرتی ہیں نہ بے چند کی ۔ ۔ ۔ ۔

دوڑتی دوڑتی وہ سورج کماری ایک چرواہے کے پاس جا پہنچی۔ بولی "بنسری پھر بجا لینا۔ پہلے میرے لئے تتلی پکڑ دو ۔۔۔ وہ سندر تتلی جو ابھی ابھی سامنے پھول پر جا بیٹھی ہے۔" شاید تتلی کی بجائے وہ اُس نوجوان چرواہے ہی کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔ اور پھر جب اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آتے ہوئے بے چند نظر آیا۔ وہ بدستور گا رہی تھی ۔۔ "کہیں تم مل گئے نہیں، میرے محبوب؟ آؤ دل کے پھولوں میں تمہاری تلاش کروں گی۔"

کہیں سے کوئی جیالال آ نکلا۔ بولا "تو نرگس ہے ۔ خار سے بھر پور شرم سے تو گردن جھکائے ہوئے ہے۔" اور وہ سورج کماری بولی: "بادل سے پھوٹ کر میں تیرے انتظار میں تھی۔"

بے چند کو آتا دیکھ کر جیالال بھاگ گیا اور وہ بُری طرح پٹتا۔ بے چند بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ سورج کماری سر جھکائے کھڑی تھی پاؤں کے انگوٹھے سے وہ زمین کریدتی رہی۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اور یہ کھیل نہیں دیکھوں گا۔ اپنی لوئی میں سمٹ کر لیٹ گیا۔ سورج کماری کا خیال تک میرے دل میں نہ آئے، یہی میری کوشش تھی۔

مگر سورج کماری تھی کہ سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ میرے پاس آ بیٹھی اور رسیلی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اسے اپنے بالکل قریب پاکر میں بہت گھبرایا۔ اور میں نے چلاتے ہوئے کہا "عورت ــــ عورت مایا ہے۔ اور میں ایک برہمچاری ہوں۔"

اُس نے میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "نا بابا! مجھے پاپ لگے گا۔"

"تو مجھے بھی؟"

"ہاں۔"

"مجھے تو پاپ نہیں۔"

میں چپ رہا۔ وہ بولی "اب یاد آیا۔ جیالال سے مجھے کہا تھا کہ میں نے اُسے تھوڑی سی مسکراہٹ دے دی تھی۔ اُس دن سے تم کچھ تنے تنے سے رہتے ہو...... تمہارے ہاتھ کیسے شل ہو رہے ہیں۔ جانتے ہو؟"

"ہو جانے دو۔"

"پاؤں نیلے ہو رہے ہیں۔"

"ہونے دو۔ تم جاؤ۔"

وہ مجھے سہلاتی رہی۔ اُس کے بازو کتنے گداز تھے۔ ان میں کتنی گرمجوشی تھی! وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے بھینچنے لگی۔ میں سنبھل نہ سکا۔ جسم ہارتا جاتا تھا۔

کیا سچ مچ میں وہ دیا ہوں جس کا تیل کبھی ختم نہیں ہوتا، جس کی بتی کبھی بجھتی نہیں! کیا عورت مایا ہے...... سورج کماری بھی مایا ہے! اُس کے بازوؤں کی گرمی اس کی لانبی لانبی پلکیں اور اُس کے بھرے ہوئے گال، کیا یہ سب مایا ہے! اس پیار سے خدا ناراض ہوتا ہے تو ہو جائے۔ یہ بات تھی تو یہ صورتیں نہ بنائی ہوتیں، یہ جذبات نہ دیئے ہوتے۔

اوپر تارے جھلملا رہے تھے۔ میرے ذہن میں محبت کے جذبات جاگ رہے تھے۔ میں نے کہا "بکھرے ہوئے بال درست کر لو۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ میں اُٹھ بیٹھا "سورج کماری! تم نے بڑی تکلیف کی" میں نے کہا "اِس سردی میں تم یہاں بیٹھی ہو۔ خیمے میں چلی جاؤ۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ غصہ ہی میں سُر جاگ اُٹھیں گے...... ضروری نہیں کہ بسری ہنہ لگانے ہی سے بجے...... ہوا بھی تو سُر جگا دیا کرتی ہے...... اور اُس کا گیت مجھے ہمیشہ کے لئے جیت لے گا۔

پھر مجھے اُس رشی کی یاد آ گئی جس کی کہانی میں نے کسی پرانی کتاب میں پڑھی تھی۔ اُس کے آشرم میں عورت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک دن مہمان نوازی کے جذبے کے ماتحت اُس نے ایک بھولی بھٹکی سندر کنواری کو اپنے ہاں ٹھہرا لیا تھا۔ لڑکی کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اندر سے کنڈی لگا لے۔ مگر آدھی رات کے بعد رشی کی ہوس جاگ اُٹھی۔ وہ لڑکی کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ پھر چھت پھاڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اندر کود پڑتا لڑکی دروازہ کھول کر بھاگ گئی...... پھر جیسے کسی نے تصویر اُلٹی لٹکا دی۔ میں نے دیکھا کہ رشی ہون کنڈ کے قریب سو رہا ہے اور وہ لڑکی اُس کے قریب آ بیٹھی ہے۔ رشی کا سر اُس نے اپنے زانو پر رکھ لیا ہے۔ رشی گھبراتا ہے، جھنجلاتا ہے۔ مگر پھیلے اور سمٹتے بازوؤں کی گرفت اُسے بھاگنے سے روکے رکھتی ہے۔

میرا جسم سردی سے اکڑ رہا تھا۔ اپنی مندر پر جھنجلانے کے لئے جس گرمی کی ضرورت پڑتی ہے، وہ سب ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ دل سے باتیں کرتے کرتے میں پھر ضمیر کے دھارے میں بہہ گیا۔

میرا سینہ گرم ہو گیا تھا۔ گردن بھی۔ پیٹ بھی گرم ہو رہا تھا۔ پیٹ کی نچلی آنتیں ٹھنڈے پانی سے نکل کر آگ کی طرف لپکنے والے بچوں کی طرح جدوجہد کر رہی تھیں۔ گردن کے پاس تو گرم اور خوشگوار سانس لپٹ رہی تھی۔ زانو ابھی بے حس تھے اور پاؤں میں کسی نے سیسہ بھر دیا تھا ــــ ٹھنڈا اور بھاری۔

میں نے بولنا بند کر دیا تھا۔ کون جانے یہ کیا چیز تھی۔ جو میرے اندر بھرپور کے خیال کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس خیال کی آواز جسم کی ایک ایک گہرائی سے سُنی ان سُنی سی اُٹھ رہی تھی۔ یہ کچھ ایسی حالت تھی جو سوتے سوتے چھاتی پر ہاتھ آ پڑنے سے ہو جاتی ہے...... کوئی میرے دل کو پکار رہا تھا۔ میں نے ایک انگڑائی لی۔ ہاتھ کی ٹھنڈی انگلیاں پیٹ پر آ لگیں۔ اب یہ گرم تھا۔ زانوؤں میں بھی جنبش محسوس ہوئی اور یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ پاؤں بھی میرے جسم سے الگ نہیں۔

سورج کماری بھی چپ تھی۔ مگر جب اُس کے بازو مجھے بھینچنے کے لئے پھیلتے اور سمٹتے تھے۔ وہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھ کر کچھ کہنا چاہتی۔ مگر اُس کے ہونٹ جو دیر تک اُڑتے رہنے والے پرندوں کی طرح پر سمیٹ کر آرام کر رہے تھے، ہل کر رہ جاتے۔ نیم خفتہ سی اس کی آنکھیں۔ جیسے گھنے جنگل کے سایوں میں کرنیں جھلملا رہی ہوں، پھر اُن میں ایک خاموش مسکراہٹ تھرتھرانے لگتی۔ اپنی آنکھیں میں نے اُس کی گردن کی طرف موڑیں۔ دیکھا کہ اُس کی رگیں مدہوش سی لیٹی ہوئی ہیں۔

دور سے شغلانے ہاکر میں اُس کی آنکھوں کے اندر جھانکنے لگا۔ کیا

بون دیکھنا گناہ ہے؟ کیا برہمچریہ ہی سب سے بلند معیار زندگی ہے؟ کیا اس کے لئے سب لطف تیاگ دینا چاہئے۔ یہ سب لطف جو خوبصورتی اگرمجوشی اور ازخود رفتگی سے مل کر بنا ہے۔

سورج کماری، جو پہلے کون جانے کس غنودگی میں اونگھ لونگھ جاتی تھی اب شاید کسی سپنے کی راحت بخش چھاؤں کی بجائے خود زندگی میں تھرکنے والے پیار کا آنند لینا چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ پلکوں کی سیاہی دھیرے دھیرے دور ہوتی گئی۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ کچھ دیر نیلے آسمان کے گرد کرنوں کا نظارہ رہا ۔۔۔ ایک مست پھیلا ہوا نظارہ۔ پھر یہ نظارہ سمٹ کر سورج کماری کی آنکھوں میں بدل گیا۔

میرا سر اُس کی گود میں تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ڈر گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ سورج کماری نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر پھیرا۔ دوبارہ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ خیمے کے اندر ہوں، پاؤں کے پاس انگیٹھی سلگ رہی ہے، اور کئی لوگ اس چہرے پر سے گرد جمع ہیں۔

دیکھنے کی قوت کے ساتھ ساتھ سننے کی قوت بھی لوٹ آئی۔ سنسکرت کے کچھ بول میرے کانوں میں پڑے۔ کوئی پنڈت جی میرے لئے پرارتھنا کر رہے تھے اپنے آپ یا اِن لوگوں کے کہنے سے۔

میں خاموش تھا۔ احسان مندی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اپنی ہٹ دھرمی پر پشیمان بھی تھا۔ یہ دونوں خیال کافی دیر تک رہے۔ پھر کچھ شیطانی جذبے، جن سے ہماری زندگی قائم ہے، دھیرے دھیرے جاگنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ ہٹ دھرمی نہ ہوتی تو سورج کماری کی گود کا لطف اور سکون کیسے نصیب ہوتا سورج کماری کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ میں ڈرا۔ کیا اُس نے میرے جذبات کا بھید پا لیا ہے؟ شرم، بے بسی، خودفریبی اور نہ جانے کن کن چیزوں سے پیدا ہونے والی ایک مسکراہٹ میری مونچھوں میں ہی کہیں گم ہوگئی۔

سورج کماری نے لوگوں سے کہا۔ اب یہ ٹھیک ہیں ...... ٹھیک ہو جائیں گے آپ لوگ بستر وغیرہ سنبھال لیں۔ امرناتھ جانے کا وقت ہوگیا ہے۔"

لوگ اطمینان سے سفر کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔ مگر پنڈت جی بدستور منتر پڑھے جا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ سورج کماری نے ایک بار پنڈت جی کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف منہ موڑ کر ایک للچائی سی ادا سے مسکرا کر کہا، "اٹھو، برہمچاری جی! ..."

دیوندر ستیارتھی

گرما کی دوپہر کا ایک رومان

کھڑکی جو کھلی سامنے بیٹھی نظر آئی — پنکھا لئے اک ہاتھ میں جھلتی نظر آئی
گرمی سے پریشاں سی نظر آئی جوانی — افسردہ و حیراں سی نظر آئی جوانی
ننگا تھا سر اور بال سلیقے سے جمے تھے — چوٹی میں دو اک پھول قرینے سے لگے تھے
تھا سمٹا ہوا دوش پہ چُنت کا دوپٹہ — گہرا نہ بہت، ہلکی سی رنگت کا دوپٹہ
وا تکمہ گریبان کا تھا، سینہ کھلا تھا — کچھ تھوڑا بہت حُسن کا گنجینہ کھلا تھا

کچھ نیچی نگاہیں وہ کئے دیکھ رہی تھی
شاید کوئی تحریر سی لئے دیکھ رہی تھی

گردن کو اک انداز سے نیہوڑائے ہوئے تھی — نظریں نہ اٹھانے کی قسم کھائے ہوئے تھی
ہونٹوں پہ تبسم کی گھٹا جھوم رہی تھی — پھولوں کے نشیمن میں صبا جھوم رہی تھی
کچھ دیر جو گذری اسی خاموش فضا میں — اک شعر پڑھا میں نے ترنم کی ادا میں

"گُل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
او خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی"

وہ برق کی تیزی سے چمکتی ہوئی پلٹی — جلدی سے خط اک سمت کو رکھتی ہوئی پلٹی
پلٹی تو مجھے کھڑکی میں گاتے ہوئے دیکھا — دیکھا تو مگر آنکھ چراتے ہوئے دیکھا
بالوں کو دوپٹے سے چھپاتی نظر آئی — مشتاق نظر کو بہت اچھی نظر آئی
چاندی سی جبیں، لعل سے لب، آنکھ شرابی — گنجان بھویں، لانبا سا قد، چہرہ کتابی
جرأت نے ذرا کام لیا میری نگہ نے — پیغام مرا دے ہی دیا میری نگہ نے
بے ساختہ ہونٹوں پہ اُدھر آئی ہنسی سی — برساتی ہوئی پھول نظر آئی ہنسی سی
ہنستی ہوئی دو چار قدم ہٹ گئی پیچھے — لے کر نگہ لطف و کرم ہٹ گئی پیچھے

پھر مڑ کے بڑے ناز سے پٹ بھیڑ گئی وہ
اُمید کے بربط کو مرے چھیڑ گئی وہ

علی احمد بی اے

عشقِ گریزاں

(۱)

سرد ہو چکی محفل

اور تو نے پروانے، خواہشوں سے بیگانے!

جان سے گذرنے کا کھیل ہی نہیں کھیلا

بجھ گیا ترا بھی دل!

سرد ہو چکی محفل۔

(۲)

آدمی کو جینا ہے

ہم کنارِ غم ہو کر لطفِ زندگی کھو کر

آج اور کل برسوں بے بسی کے بل برسوں

زہرِ زیست پینا ہے

آدمی کو جینا ہے

(۳)

عمر پر نہ جا اُس کی

یہ طویل مجبوری اپنی اصل سے دوری

وجہِ دردِ ہستی ہے ننگ و نامِ ہستی ہے

عمر ہے سزا اُس کی

عمر پر نہ جا اُس کی

(۴)

دیکھ رات جاتی ہے!

اُٹھ ابھی لپک کر آ بن سنور چمک کر آ

صبح ہونے سے پہلے موت ہی سے دل بہلے

شمع جھلملاتی ہے

دیکھ رات جاتی ہے

قیوم نظر

ایک خط

الہ آباد

۴ر اگست سنہ ۴۲ء

.....خوش رہو۔

تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی پہلی فرصت میں مجھے خط لکھو گی۔ لیکن میں اب تک چشم براہ ہوں۔ کیا بھول گئیں؟

اب کی بار آگرے کا قیام میرے لئے ایک نیا باب ہے جس کی ابتدا تم نے کی ہے..... یہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میری فطرت کے وہ نازک اور کمزور پہلو تم لوگوں کے سامنے نہ آنے پائیں جن کی معمولی سی خراش بھی میرے دماغی سکون کو برباد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میں نے حُسن کی مسلسل تنقیص کی اور حسین لوگوں کی صحبت کو اپنے لئے ہمیشہ زہر ہلاہل سمجھا ـــــ یہ سب میں اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ خدانخواستہ تم سے مجھے کوئی شکایت ہے ـــــ میں کیا اور میری شکایت کیا! ـــــ یہ تو میں صرف تم کو بتا رہا ہوں کہ واقعات کی ہلکی ہلکی لرزشیں کس طرح مجھے بہا لے جاتی ہیں۔

یا وش بخیر! تم سے قبل ایک اور ناوک فگن بھی مجھے اپنا شکار بنانا چاہتا تھا۔ میں نے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کی اور راستے میں اپنی فطرت کے اتنے گھناؤنے پہلو دکھائے کہ اگر معمولی دل و دماغ کا آدمی ہوتا تو نفرت کئے بغیر نہ رہتا ـــــ مگر زمانے کی ستم ظریفی کو دیکھو کہ میری ہر تدبیر اُلٹی پڑی۔ طبیعت کی پراگندگی کو ناتجربہ کاری کا جامہ پہنایا گیا۔ پھر اس حُسن عقیدت کے باوجود جب اصرار اجتناب حد سے آگے بڑھا تو یہ کہہ کر کہ "اونہہ! آپ کو کیا؟ آپ بُرے ہیں تو غیروں کے لئے! میں اپنے لئے تو آپ کو اچھا بنا لوں گی"۔

مجھے ایک ایسی دماغی "اُلجھن" میں مبتلا کر دیا گیا جس سے چھٹکارا آج چھ برس کے بعد بھی نصیب نہیں۔

..... تمہیں بتاؤ کیا یہ فطرت کا انتقام نہیں تھا؟ کیا میری سپر سے تلوار کا کام نہیں لیا گیا؟

اے روشنی طبع .....

میں نے علی گڑھ کا قیام ترک کیا اور الٰہ آباد بھاگ آیا کہ شاید جگہ کی تبدیلی زندگی کو پھر پرانے ڈھرے پر لگا دے اور میں پھر اسی اطمینان سے زندگی کی لہروں پر تیرنے لگوں جس پر کبھی اپنے دوستوں کے سامنے فخر کیا کرتا تھا مگر توبہ کیجئے۔ بھلا کھوئی ہوئی چیز ـــــ اور کھوئی ہوئی بھی نہیں چھینی ہوئی چیز کہیں واپس ملا کرتی ہے! کتابیں اُلٹیں، مضمون لکھے۔ آگرہ دہلی کلکتہ اور مدراس کے سفر کئے۔ دوستوں سے مباحثوں میں وقت کاٹا۔ سیاسیات میں حصہ لیا جلسوں میں تقریریں کیں اور نہ معلوم کیا کیا کر ڈالا مگر پھر! پھر یہ کہ آج بھی وہی کھٹک کہ

جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں!

چونکہ عمر کا بیشتر حصہ بورڈنگ میں گذرا ہے۔ مختلف قسم کے احباب سے صحبت رہی ہے اور طبیعت کے فطری رجحان کی بدولت بڑا وقت اپنے اور دوسروں کے نفسیاتی مطالعہ میں گذرا ہے۔ اس لئے اس کیفیت کو سمجھنے میں زیادہ کاوش نہیں کرنا پڑی اور ہمیشہ یہ محسوس ہوتا رہا کہ میں اپنے آپ کو ایک سخت دھوکا دے رہا ہوں۔ ایک گہرا فریب۔ لیکن ہر مرتبہ یہ فریب کھل گیا اور میں اپنی بے مائیگی پر افسوس کرتا ہوا پکڑا گیا۔

میں بیٹھا پڑھ رہا ہوں۔ کتاب بہت عمدہ ہے۔ مضامین کی سنجیدگی اور انداز بیان کی لطافت توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ بارہ پندرہ صفحے ختم کر چکا ہوں کہ ایک دم سے یہ محسوس ہوا جیسے بڑی دیر سے کسی نے دماغ کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ جو کچھ میں پڑھ رہا تھا وہ نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ نہ ہاتھ میں کتاب یاد رہی اور نہ کتاب پر سطریں دکھائی دیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے ہلکا ہلکا کہر بڑی دیر سے چھا رہا تھا لیکن ہم محسوس نہیں کر رہے تھے جھنجھلا کر چند صفحے اُلٹے اور پھر سے پڑھنا شروع کیا ـــــ ایک سطر ـــــ دو سطر ـــــ تین ـــــ چار ـــــ آج مولانا کا اخبار نہیں آیا ـــــ ٹائیکہ نے دکھائی دیا تھا ـــــ کوئی خط بھی نہیں آیا ـــــ معلوم نہیں ابا جان کیسے ہیں ـــــ ان کا

خط تو کئی روز سے نہیں آیا —— یہ لوگ خط کیوں نہیں لکھتے —— چار ہفتے ہوئے ایک خط آیا تھا —— لفافہ تھا —— اس میں الائچی کے دانے —— دو میں نے کھائے۔ باقی اسی لفافے میں رکھے ہیں —— لفافہ بکس کے اندرونی خانے میں ہے —— پڑھوں؟ کتاب رہ جائے گی۔ —— اونہہ! —— پہلے کمرے کا دروازہ بند کر لوں —— اوہو اس میں اتنے خط جمع ہو گئے —— خانہ بھر گیا —— ائیں —— ابا جان کے خطوط بھی اسی میں ہیں! چلو اچھا ہے جائے بننے گی ردی کم ہو گئی ہے۔ چوڑی —— الائچی کے چار دانے لفافے میں —— دو پچکے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے جن پر کچھ لکھا ہوا —— چھ برس کی پرانی تحریر۔ —— ایک خط بے القاب کا ——

"مجھے معلوم ہوا کہ آپ کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ اپنی مرضی سے ایسا کر رہے ہیں۔ اس میں آپ کی اور میری دونوں کی بڑی بدنامی ہے۔ اگر چچی جان یا دادی اماں کوشش کریں تو کوئی بات نہ تھی —— اب آپ خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالئے ہیں تو دیکھئے آپ سے زیادہ مجبور رہوں۔ لیکن پھر بھی اپنے دل کو کیسا تھامے ہوئے ہوں میں جانتی ہوں کہ اس خط سے آپ کو بڑی تکلیف ہوگی۔ لیکن آپ کی محبت سے امید ہے کہ آپ میرا کہنا ٹالیں گے۔ آپ کو دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے ہیں —— اس سے ہزار درجے بہتر موقع آپ کو ملتے رہیں گے —— میں تو خیر جیسے تیسے گذار لوں گی۔ آپ اپنی حالت درست کیجئے اور پڑھنے میں دل لگائیے۔ دوا خدا کے لئے پیتے رہئے گا۔ آپ گھر خط لکھ دیجئے جیسے آپ ٹال رہے ہیں۔ میں بدنصیب نہ معلوم کتنی کوشش اور ہمت کے بعد آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں کیا کروں زمانے کے ہاتھوں سے مجبور رہوں۔ میری تو اس بھی اس دنیا میں نہیں رہیں جو انہیں سے کچھ کہتی سنتی۔"

چار دفعہ یہ خط پڑھنے کے بعد ایک شعر پڑھا۔

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی۔ اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

لاحول ولاقوۃ۔ میں تو بھول چکا تھا پھر یہ ہنگامہ کیوں؟ ارے! تو میں رو رہا ہوں۔ یہ کیا مذاق ہے۔ اُونہہ یہ خطوط جلا کیوں نہ ڈالوں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری —— مگر جلانے سے فائدہ؟ کبھی یادگار ہی کے طور پر کام دیں گے —— کام دیں گے؟ —— اچھی کہی ہاؤ بکس ہی میں بند کئے دیتا ہوں —— اب نہیں کھولوں گا۔ اور نہ دماغ میں خیال آنے دوں گا —— چلو گھومنا چاہئے —— ضیا صاحب —— ضیا صاحب —— آپ کو دنیا میں سوائے اونگھنے اور پڑھنے کے اور بھی کوئی کام آتا ہے؟" —— دروازے جو زور سے کھولے تو شاید نہیں ناگوار ہوا —— بہت خفا فرمانے لگے "جناب آپ کو تو امتحان دینا ہے نہیں —— دوسروں کو کیوں پریشان کرتے ہیں! جی ہاں —— آپ امتحان دیں گے! مجھے بھی امتحان دینا ہے —— ضیا صاحب واقعی دیکھئے چاندنی کیسی چھٹکی ہوئی ہے —— آئیے گھوم آئیں —— چائے نہیں پیجئے گا —— چلئے بھائی عابد علی کے ہاں آپ کو چائے پلا لائیں —— دروازہ میں تالا ڈال دیجئے گا۔

شام کو رنگیں سماں اور تیرے ہاتھوں میں کتاب
ہو نہیں سکتا تری اس بدمذاقی کا جواب

ضیا صاحب شعر تو بس ایک ہے۔

چاندنی رات میں جب پھول کھلا کرتے ہیں
اور بڑھ جاتا ہے سودا ترے سودائی کا

آج جناب ایک غزل دکھائی دی۔ جگر کی ہے —— بمبئی مطلع کا دوسرا مصرعہ قیامت کا ہے۔

آہ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

(زور زور سے)

جیسے ہر شے میں کسی شے کی نہ نا۔ نا۔ نا۔ نہ۔ نا

نا۔ نہ۔ نا۔ نا۔ نا۔ نہ . . . .

جیسے ہر شے میں —— ضیا صاحب کورس ختم کر لیا آپ نے!

کیوں؟ آپ تو نہ معلوم کب سے کتابوں کو دبائے بیٹھے ہیں اور اب بھی کورس ختم نہیں ہوا —— میں نے تو آج طے کر لیا ہے کہ اب امتحان کی تیاری شروع کر دینا چاہئے —— نہیں مذاق نہیں —— بھئی میں امتحان کے معاملہ میں ذرا فراخ دل واقع ہوا ہوں۔ جو کچھ دماغ میں سماتا ہے وہ یاد کر لیتا ہوں۔ اور جو رہ جاتا ہے اسے کاغذ کے ٹکڑوں اور دوات کے لیبل پر لکھ لیتا ہوں۔ یہ سب امتحان میں کام دیتا ہے۔ اور صاحب میرے نزدیک تو یہ سب جائز ہے۔ میرے ایک استاد کا قول ہے کہ "چوری ضرور کرو لیکن پکڑے نہ جاؤ"۔ اور ہے بھی یہی امتحان نام ہے ممتحن کو بے وقوف بنانے کا —— جو جتنا زیادہ سلیقے سے بے وقوف بنائے گا وہ زیادہ نمبر پائے گا —— میں ہمیشہ اول آتا

ہوں۔ کیونکہ مجھے امتحان دینے کا راز معلوم ہے ــــ مگر ضیا صاحب اس سال میں پاس نہ ہوں تو کیا رہے! ــــ نہیں۔ واقعی ــــ مذاق نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ پاس تو ہمیشہ ہی ہوتے رہے ــــ اب کی مرتبہ فیل ہو کر کیوں نہ دیکھیں؟ ــــ اجی نہیں ــ مگر یہ کسی کو فکر بھی نہیں کہ میں پاس ہوتا ہوں یا فیل ــ میری کامیابی ہی پر کس کو خوشی ہوتی ہے جو ناکامیابی پر کوئی رنج کرے گا ــــ دنیا تو ناکامیابیوں کا نام ہی ہے ــــ اور پھر میں تو صد درجہ کا بدقسمت ہوں ــــ واللہ اگر سونے میں ہاتھ لگا دوں تو مٹی ہو جائے ــــ جی ہاں تعلیم میں یقیناً کامیاب رہا ــــ مگر کیا کامیاب رہا ــــ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا ــــ میرے لئے تو پاس ہونا بھی اجیرن ہو گیا ہے ــــ گھر پر ہر شخص کہتا ہے "پاس تو ہو ہی جاؤ گے" اور جب واقعی پاس ہو جاؤ تو پھر یہ کہ "ہم تو جانتے ہی تھے" جانتے ہی تھے! گویا ہماری محنت اور ہماری ترکیبیں کوئی چیز ہی نہیں! ذلیل ہیں یہ لوگ۔ مولوی صاحب میں تو اپنی بدقسمتی سے عاجز آ گیا ہوں ــــ اسی لئے ضیا صاحب۔ آج تک میں نے کسی سے محبت نہیں کی ــــ نہ معلوم کیا اُفتاد اُس غریب پر آن پڑے ــــ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا ــــ ہا ہا ــــ ہا ہا ــــ ارے یہ ہنسی کی بات تو نہیں ہے ــــ کبھی نرینش سے بھی ملے ہیں آپ؟ ــــ اری بہت دلچسپ ہے ــــ آج مجھ سے کچھ نفسی تحلیل پر گفتگو کر رہے تھے ــــ کچھ محبت کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ بہت مقدس انداز میں بولے "عورت یا تو کسی سے محبت نہیں کرتی اور اگر کرتی ہے تو صرف عمر میں ایک مرتبہ"! اور پھر مزید ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے ــــ کہنے لگے کہ مرد ہمیشہ اس کی محبت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے ــــ پہلے تو اُسے محبت پر مجبور کر دیتا ہے اور پھر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتا ہے ــــ میں نے کہا "میاں کیا حماقت کی باتیں کر رہے ہو! عورت ہمیشہ مرد کو انگلیوں پر نچاتی ہے ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ مرد اپنی طرف سے پہلے محبت کا اظہار کرے ــــ یہ تو عورت ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ قتل بھی کرتی ہے اور مسکراتی بھی جاتی ہے ــــ ہمیشہ محبت کا اظہار خود کرے گی۔ کبھی زبان سے اور اکثر آنکھوں سے ــــ تم سفر کے لئے گھر سے چلے ــــ وہ ہاتھ پکڑ کر رو دے گی ــــ تم پوچھو "کیوں روتی ہو؟" کہہ دے گی "کچھ نہیں"! بہت اصرار کرو تو نہایت سادگی اور معصومیت سے نظریں جھکا کر کہے گی "میں کیا بتاؤں۔ آپ میری جگہ ہوتے تو سمجھتے" ــــ بہر حال اچھا ہے نہ سمجھے" بتاب اگر آپ سمجھتے ہیں تو فی النار و سادہ نہیں سمجھتے تو فی السقر اور ضیا صاحب ــــ یہ واقعہ ہے کہ عورت کی فطرت کا سمجھنا بہت نازک علم ہے ــــ اور اتنا ہی خطرناک بھی ــــ لیکن اگر خدانخواستہ سمجھ میں آ جائے تو پھر خود سمجھ کا خدا حافظ!

دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن!

اونہہ ــــ ہو گا۔ آج کون تاریخ ہے؟ ــــ چاند ڈوب رہا ہے ــــ ستارے بھی کچھ دھندلے سے ہو رہے ہیں ــــ جیسے کسی دوشیزہ کی قبر پر باسی پھول ــــ کیوں صاحب! کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ روشنی کتنی ہی مدھم کیوں نہ ہو کسی نہ کسی مخرج کی مرہون منت ہوتی ہے ــــ مگر تاریکی؟ ــــ تاریکی خود پیدا ہوتی ہے اور خود تمام عالم پر چھا جاتی ہے ــــ یہ تاریکی کا بھی کوئی مخرج کیوں نہیں ہوتا؟ ــــ دل پر تاریکی کے اثرات کتنے ہولناک ہوتے ہیں ــــ میں اپنی زندگی کی تاریکیوں سے گھبرا گیا ہوں ــــ میرا بچپن کتنا امید افزا تھا ــــ جیسے انگور کی بڑھتی ہوئی بیل ــــ میرے دماغ میں ترقی کی کتنی قوتیں موجود تھیں ــــ میری ذہانت ــــ میرا حافظہ ــــ میری خوش مذاقی ــــ لیکن اب؟ ــــ اب کیا! کچھ بھی نہیں ــــ کلیاں سب ایک طرح کی ہوتی ہیں ــــ خوش رنگ ــــ خوبصورت بھینی بھینی خوشبو کی مالک ــــ مگر پھول بننے کے بعد ــــ اور بعد کیوں؟ اکثر پہلے بھی ــــ کچھ ہاروں میں گندھ کر سہروں میں چڑھ جاتی ہیں اور کچھ دنیا کو دھوکا دینے کے لئے مرنے والے کی قبر پر ڈال دی جاتی ہیں۔

جس طرح چاہے چھیڑ دے ہم کو
تیرے ہاتھوں میں ساز ہیں ہم لوگ

آج دو روز کے بعد جو یہ خط اٹھا کر دیکھا تو نہ معلوم کہاں سے کہاں بہک چکا تھا۔ اب اس کشمکش میں ہوں کہ یہ خط پھاڑ ڈالوں یا تمہیں بھیج دوں اگر بھیجتا ہوں تو ڈر ہے کہ کہیں تم بھی خفا نہ ہو جاؤ ــــ مجھے دوستوں کی خفگی سے اتنا ہی ڈر لگتا ہے جتنا غیروں کی ناراضگی میں لطف آتا ہے ــــ اور پھاڑنے کو جی اس لئے نہیں چاہتا کہ

ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا!

خیر "بیاں اپنا" تو نہ معلوم کتنا لکھ لکھ کر ضائع کر چکا ہوں مگر "ذکر پری وش" کا یہ پہلا ہی موقع ہے ــــ ایک بات البتہ سمجھ میں آتی ہے۔ کیوں نہ یہ خط تمہیں بھیج دوں اور خود روپوش ہو جاؤں ــــ بہر حال کل تک طے کر لوں گا کہ تمہیں یہ داستان سنانا چاہیئے یا نہیں ــــ خدا کرے تم بخیریت ہو

تمہارا ......

غالباً یہ داستان کبھی نہ سنائی جا سکی۔ جن صاحب نے یہ خط لکھا تھا وہ میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ ان کی زندگی کے متعلق غالباً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ باوجود گھر کی خوش حالی کے اپنی تعلیم کی نصف سے زیادہ ذمہ داری انہیں ہمیشہ اپنے ہی کاندھوں پر اٹھانا پڑی ——— ٹیوشن کرتے تھے اور درجہ میں اول آکر وظیفہ لیتے تھے۔

یہی ان کا ذریعہ آمدنی تھا جس پر چھٹے درجے سے لے کر ایم اے تک کی زندگی گذری۔ بی اے کے آخری سال میں وہ میرے "ہمکرہ" ہو گئے ——— ابتدا میں تو ہمارے تعلقات بہت رسمی سے تھے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے بھاگنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور قدرتاً مجھے بھی ان سے دور ہی رہنا چاہئے تھا۔ لیکن ان کی ایک حرکت مجھے بہت عجیب سی معلوم ہوتی تھی چنانچہ ان سے میں نے اس کے متعلق جب ایک مرتبہ سوال کر دیا تو ان کی گھبراہٹ اور پریشانی دیکھنے کے قابل تھی ——— اور غالباً ان کا جواب یا میرا سوال ہماری دوستی کا پہلا زینہ تھا ——— وہ حرکت یہ تھی کہ جہاں دوپہر کو ہم لوگ کالج سے آئے تو ہوسٹل کے نوکر سے ان کا پہلا سوال یہ ہوتا کہ "ڈاکیہ تو نہیں آیا؟" "میرا کوئی خط تو نہیں ہے؟" ان تین برسوں میں شاید کوئی دن ایسا نہیں گذرا کہ انہوں نے یہ سوال نوکر سے نہ کیا ہو اور انہیں جواب نفی میں نہ ملا ہو۔ پھر لطف یہ ——— اور یہ میں نے دس ہی پندرہ روز کے بعد سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہ سوال کرتے وقت ان کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پوچھتے ہوئے ڈر رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ انہیں جواب کا علم پہلے ہی سے ہوتا تھا ——— وہ خود خط کبھی نہیں لکھتے تھے۔ البتہ رات کو اکثر دیکھا گیا کہ کچھ لکھ رہے ہیں اور صبح کو معلوم ہوا کہ جو کچھ لکھا تھا اسے یا تو پھاڑ دیا یا جلا دیا ——— تین برس کی دوستی میں صرف ایک زمانہ مجھے یاد ہے کہ جب ان کے پاس تقریباً دو ہفتے تک روزانہ ایک لفافہ آیا کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ان کی زندگی کے سب سے زیادہ پُر مسرت دن تھے۔

بہرحال یہ افسانہ طویل ہے۔ اگر کبھی فرصت ہوئی تو ان کی زندگی کے چند دلچسپ ٹکڑے لکھوں گا۔

ان کا یہ خط اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا ہے جو ان کی ایک شیروانی کی جیب میں سے مجھے ملا۔ دو مہینے قبل بغیر اطلاع کے ایک دن وہ غائب ہو گئے ان کا سامان ابھی تک میرے ہی پاس ہے۔ ابھی حال میں ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ کی کسی ٹریڈ یونین میں کام کر رہے ہیں۔ دن بھر مزدوروں میں تقریریں کرتے ہیں اور رات کو کسی کامریڈ کے ہاں (جو انہیں پکڑ لے جائے) جا کر سو رہتے ہیں ——— ہماری دوستی کے آخری زمانے میں ایک شعر وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے اور جس پر ان کے اکثر احباب نے فقرے بھی چست کئے لیکن خود انہیں اس کا کبھی احساس نہ ہوا۔ شعر یہ تھا کہ

ہر چند بگولہ مضطر ہے، اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے، اک رقص تو ہے، بے چین سہی برباد سہی

ان کے اصل خط میں جہاں نقطے لگے ہیں وہاں مکتوب الیہا کا نام تھا جسے احتراماً میں نے پوشیدہ رکھا ہے۔

صدفی



عکس

ریشمیں ہے مرے امروز کا لمبا دامن
دوش کی وادیٔ پرخار پہ جو پھیلا ہے
آگے جب بڑھتا ہوں اُمید کے گلشن کی طرف
دوش کی وادیٔ پُرخار کی اک جھاڑی سے
ریشمیں دامنِ امروز اُلجھ جاتا ہے
لَوٹ کر دیکھتا ہوں دامنِ امروز کو میں
اور رُک جاتا ہوں۔ رُک جاتا ہوں اک آہ کے ساتھ
میرے ماضی کے بیابان کی غمگیں وسعت
یوں سمٹ کر مری آنکھوں میں چلی آتی ہے
جیسے اک تیر نظر میں کسی خونخوار کا جوش
اور ماضی کے بیابان کے رنگیں کانٹے
جن کی آنکھوں میں لہو ہے مرے ارمانوں کا
میرے دامانِ تصور سے لپٹ جاتے ہیں،

گونجنے لگتے ہیں کانوں میں پرانے قصے
سامنے آنکھوں کے آجاتی ہیں سُونی راتیں
سلسلہ چھڑتا چلا جاتا ہے مایوسی کا
دوشِ مرحوم کے دامن پہ لہو کے چھینٹے
دُور سے روشن و تابندہ نظر آتے ہیں
بند کر لیتا ہوں آنکھیں غمِ محرومی سے

اور پھر دیکھتا ہوں گلشنِ فردا کی طرف
پھول جھڑ جاتے ہیں اُمید کی ہر ڈالی سے
سُونا سُونا سا نظر آتا ہے سارا گلشن
یاس کے تار لرزتے ہیں نگاہوں میں مری
ٹوٹنے لگتے ہیں آنکھوں کے فلک پر تارے
سر جھکا لیتا ہوں ناکام تمنا ہو کر

یوسف ظفر

بینگن کا پودا

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا، سوکھا پچکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے۔

. . . .

سردیوں کے مختصر سے دن کو گزرے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا چکر لگا کر نیچے کھادی کی موٹی بنیان، اس پر چھوٹا گرم اندرویئر اس پر موٹے کھدر کی قمیص۔ اس پر اچکن اور گلوبند۔ اور ان سب کے اوپر اوورکوٹ پہنے ہاتھوں میں بیٹری لئے اپنے لوہے کی ایڑی والے فلیکس کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ میں مست، دسمبر کی تیکھی، ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے کانوں کو اوورکوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں ایک میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں بوڑھے کو خستہ اور بوسیدہ، اندھیری کالی رات کی طرح کالا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹھک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے" میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر کہا۔

"کچھ نہیں بابوجی، میں ماہی رام کا آدمی ہوں"

"ماہی رام کے ہی سہی، لیکن اتنی سخت سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو"

"تیرے پاس کپڑا ہے بابوجی"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ڈرٹ مار کر بٹا ہوا لائن کا ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ گیا تھا۔ اور اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے۔ پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا میرے داخل ہوتے ہی گرم، لیکن مٹی کے تیل کی تیز لپٹ آئی۔ بارہا میرے دوستوں نے مجھے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے" شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے"

وہ کہا کرتے ہیں اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلائے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے۔ میں بارہا یوں محسوس بھی کرتا ہوں لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب کبھی بھی دروازہ کھولی کر بیٹھتا ہوں اور تیز ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے۔ اور میرے ہاتھ یخ ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے تو میں اٹھ کر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں ـــــ جیسے سگرٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی، سر چکرا دینے والی بو اچھی لگتی ہے، کچھ اسی طرح یہ سب کچھ بھی مجھے اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے ارد گرد لپیٹ کر میں کام پر آبیٹھا۔

بیٹھ تو گیا لیکن میرا دھیان برآمدے کی طرف ہی لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا، وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا۔ اور "مشترکہ کمیونٹی کچن" سے گھر کو آتے ہوئے، میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ اس نے بتایا تھا کہ بینگن کا پودا دو بار پھل دیتا ہے، ایک بار چھانٹ دیا جائے تو دوبارہ پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا، سوکھا، سکڑا، پچکا زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا لگی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی۔ لیکن وہ بے حد معمر دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی سے پتلے ہاتھ، بانس سی ٹانگیں، سوکھا پچکا چہرہ، اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا ـــــ بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے، تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے۔ سہانجنا بھی چھانٹنے پر بڑھتا ہے۔ نباتات میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹنے پر پہلے سے بھی زیادہ پھلتے پھولتے ہیں۔ شہتوت، شالا، اور مدب وغیرہ وغیرہ۔ تو انسان کو اس خدائے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا! لیکن دہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا کہ انسان کی بیل بھی تو امر ہے۔ موت

اس کی تنچی ہے ہرد موجود ہیں، نیچے بوڑھے۔ اس کے پھل پھول، پتے اور شاخیں ہیں جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں۔ قینچی انہیں کاٹ دیتی ہے اور ان کی جگہ نت نئے، ہرے بھرے، زندگی کی حرکت سے خوش، اچھلتے کودتے ہنستے ناچتے گاتے، پھول اور پتے لگتے ہیں۔ اور زندگی کی امر بیل بڑھتی پھولتی، جھومتی ہی چلی جاتی ہے .....

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں کیوں آپڑا ہے؟ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا۔ کیوں جی، تم ہو کون؟

"میں جی، ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ہاں ماہی رام کے آدمی تو ہو، لیکن ماہی رام کے کیا ہوتے ہو؟"

بوڑھا کچھ جواب دینے لگا تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کئی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد، اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ رشتے میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کا ہم وطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی ہے، دو لڑکیاں ہیں — بیاہنے کے قابل اور وہ روزگار کے لئے ماہی رام کے ساتھ آگیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لئے ناممکن ہوگیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود، پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں۔ اور وہ غریب باہر سردی میں پڑا ہے۔ نام نہاد بستر کے طور پر شاید ایک میلی پھٹی ڈلائی اس کے پاس ہے۔ اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے — قریب قریب پگھل کر میں نے کہا۔ "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ۔ باہر تو بڑی سردی ہے، برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟"

لیکن اسی وقت سیمنٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحہ ماہی رام — وہ ٹھیکیدار گوپال داس کا چھ فٹ تین انچ لمبا آدمی دروازے پر آ کھڑا ہوا — بڑی سی پگڑی، اس کے نیچے کالا موٹا کمبل، گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتا — ایک دن چھ مولیوں کے لئے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا اور وہاں پکڑ کر اس نے اسے وہ وہ گالیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا۔

"تم نے اسے خود یہاں سلایا ہے بابو جی۔ نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو تین دن دیکھتے دیکھتے ہو گئے ہیں۔ کل رات گوبھی کے دس پھول غائب ہوگئے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ پھول کوئی تمام پکے بہت ٹماٹر اتار کرے گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کچن کو ترکاری بھی سپلائی کرنی ہوتی ہے اور پھر دو سو روپے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ بھی تو اسی بن سے پورا کرنا ہے اور پھر مزدور دن کی مزدوری .....

لیکن ترکاری پر کون ڈاکہ ڈال جاتا ہے۔ یہاں تو کبھی چوری ہوتے سنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔ پاس کوئی کوٹھی نہیں۔ لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں۔

"نہیں بابو جی، باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آ سکتا۔"

"لیکن اس دن مولیاں ....."

"وہ اور بات تھی بابو جی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا جاتے جاتے اکھاڑ کر لے گیا۔ یہ کوئی یہیں کا ہی ہے — میں سالے کو پکڑ کر ایسا سبق دوں گا، کہ عمر بھر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔" اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ بھینچ گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر چاہو تو اسے اندر سلا دو۔"

"نہیں بابو جی، سردی تو آپ امیروں کو لگتی ہے، اسے تو یونہی محض دکھاوے کے لئے یہاں سلا دیا ہے، ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا — ان مونگروں کے پیچھے بیٹھ کر۔ جونہی یہ سمجھ کر کہ بوڑھا سو گیا ہے، کوئی آیا کہ میں نے دبوچا۔"

اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے ....."

"کافی کپڑے ہیں، اس کے پاس بابو جی"

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

....

میں پھر کام میں منہمک ہوگیا لیکن مجھ سے کام ہو نہیں سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپال داس — دھن دولت اولاد اور بے فکری سے اس کے گال اس پچاس سال کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سرخ تھے — اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں، جب یہ بوڑھا باہر پڑا ہے، وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا دہکتی ہوئی انگیٹھی سے گرم اپنے کمرے میں، مزے سے گپیں ہانک رہا یا تاش یا شطرنج کھیل رہا ہوگا .....

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ بھی تنے لاد رکھا تھا اور کمرہ خوب گرم تھا — میں اٹھا کچھ ضروری کاغذ قلم دوات لے کر

سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کل ذرا سویرے اُٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے کو تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار بوڑھے سے پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں۔ لیکن "نہیں نہیں بابو جی۔ میرے پاس کافی کپڑے ہیں"۔ اس کا یہ جواب سُن کر قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے، گرم سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا۔ صرف لحاف پر ننگی کمبل اندر ڈال لیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لئے۔ اور پھر اُنہیں آہستہ آہستہ بچھایا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے — بے ربط، بے ترتیب لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ اور پھر بند۔ . . . .

سوتے سوتے، کبھی ماہی رام، کبھی اس بوڑھے، اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے۔ اور وہ اسے مارتا مارتا ساتھ کے گاؤں ویرو کے تک لے گیا ہے۔ اور سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ چور نہایت پر درد نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے، اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں — وہی گُھٹا ہوا سر، وہی پھولے ہوئے گال اور وہی چوکور ناک!

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اتر گئی ہے۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے چھاتی کچھ بھاری تھی؛ اور گلا سوکھا جا رہا تھا۔

سرہانے رکھے ہوئے لوٹے سے پانی پی کر اچھی طرح سے لحاف لے کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے پھر لیٹ گیا۔ باہر ہوا مکانوں کو ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے — شاں — شاں — شاں — اور دُور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک بھی سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑنے لگا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے۔ پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑتے ہیں۔ ساری کی ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ کیاروں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ صرف اس مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے۔ پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے، اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی سی بن گئی ہے۔ گھٹنوں کو بانہوں میں لے کر چھاتی سے لگائے، وہ سکڑا سمٹا، ننگا، اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے — اولے اُس کے سر پر گرتے ہیں اور وہ اسی بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا، نہ جانے جامن کا، نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ نیچے کھڑی شور مچا رہی ہے — بوڑھا مر گیا، بوڑھا پھانسی لے کر مر گیا۔

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا" "مر گیا" کی آواز آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے — کڑ کڑ . . . . کڑ کڑ . . . . .

میری آنکھ کھل گئی دیکھا کہ کوئی زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

سرہانے رکھی ہوئی گرم جرابیں پہن کر سر پر ٹوپی رکھ اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں اُٹھا۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سیکرٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے" میں نے پوچھا۔

"رات آپ کے برآمدے میں بوڑھا مر گیا"

میں نے دیکھا — اسی میلی سی کالی چارپائی پر اپنے اردگرد وہی میلا لحاف لپیٹے، بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں پھٹی پڑتی ہیں۔ اس کا لحاف بھیگ گیا ہے دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا . . . ." میں نے کہنا شروع کیا۔

"میں چائے کے لئے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی، لیکن یہ بلا تک نہیں۔ آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سردی میں اکڑ گیا ہے۔" اور ٹھیکیدار کے آدمی سے انہوں نے کہا کہ اسے اُٹھوانے کا انتظام کیا جائے۔

. . . .

اس کے دو دن بعد، کچن کو جاتے ہوئے اچانک رک کر میں نے ماہی رام سے کہا
"خدا کے لئے اس پیلے سے بینگن کے پودے کو اکھاڑ دو"۔
میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران سا میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے کہا۔
"بہت اچھا سرکار"

اُپندر ناتھ اشک

ایک منظر

پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی
سامنے جیوتی جاگ رہی ہے، پیچھے گھور اندھیرا،
دیکھ کے دو دنیاؤں کا جلوہ ڈول اٹھا من میرا!

آج اشنان کیا گوری نے، "آج بھلا کیوں نہائی؟"
دونوں اڑائیں دھیان کے پنچھی کی، جوگی والا پھیرا!
یہ سنگار جال مایا کا، اس نے کس سے نبھائی؟
مورکھ چھوڑ نادانی کی باتیں، کیسی دھن یہ سمائی؟
دونوں لوک دیکھ کے دھیان اک اور ہی جگ کا آیا،
دور سے دیکھو تو اندھیارا، پاس اجیالے کی مایا،
پھیل رہی ہے سیاہی، رستہ بھول نہ جائے راہی۔
مایا کا جب بندھن ٹوٹے، چھائے تھکن کا سایا،

جھومی گیسو کی چھایا تو دھیان انوکھا آیا،
پھیلے پھر سے سیاہی، رستہ بھول ہی جائے راہی
نٹ کھٹ برندابن سے ساتھ میں رادھا کو بھی لایا،
رادھے مکھ کی اجلی مورت شام گیسو کا سایا۔

میراجی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

کا تذکرہ اور جائزہ

اس دفعہ "نقد و نظر" کا حصہ غیر معمولی وسعت اختیار کر گیا ہے اس لئے حصہ نثر کا جائزہ شامل نہیں ہوسکا۔ ناظرین یہاں جو کمی پائیں گے اس کا بدل انہیں نقد و نظر کے صفحات میں مل جائے گا۔

(ادارہ)

موہن بابو

ملے تھے جب تم موہن بابو مجھ پاپی سے پہلے پہلے
یہ آنکھیں تھیں سرمہ دانی بال تھے بھنورا جیسے کالے
تھی پیشانی چاند سی پیاری چاندی جیسے دانت روپہلے
گال تمہارے پھول گلابی، ہاتھ تمہارے روئی کے گالے
بڑے مزے کے دن تھے وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

اب دیکھو تو آنکھیں ڈوبی، سر ہے چکنا جیسے کدو
پیٹھ جھکی، گردن میں رعشہ کانپ رہی ہیں دونوں ٹانگیں
جھکے ہوئے ہو تم جیسے جھک جائے کوئی خچر لدو
پٹا دو اللہ ہم دونوں کا اب وہ جیون کس سے مانگیں
بڑے مزے کے دن تھے وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

کھیلے تاش حسینوں کے جھرمٹ میں نچا نچا کر آنکھیں
چومے گال رنگیلے سندر اب وہ لٹکے جیسے تھیلا
اب وہ آنکھیں بجھی بجھی سی پلک اوٹ سے آنسو جھانکیں
بنے ہوئے تھے موہن بابو کسی زمانے میں تم چھیلا
بڑے مزے کے دن تھے وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

موہن بابو تھے زندہ دل من تھا ان کا پریم میں پورا
لگے وہ ہنسنے جیسے اونٹ جماہی لیتا منہ کو پھیلا
ہوئے تھے بوڑھے لیکن اُن کا دل نہ ہوا تھا ابھی ادھورا
آئی یاد جوانی اُن کو جیسے سپنا میلا میلا
بڑے مزے کے دن تھے وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

کر کے جگالی بولے تجھ کو احمد پوری یہ کیا سوجھی؟
سن یہ جیون روپ بدل کر کرتا جگ میں اَدْ ٹَک ناٹک
یہ دنیا ہے ایک پہیلی چلا یہاں سے جس نے بوجھی
ختم ہوا اب کھیل ہمارا کھلا ہوا ہے سامنے پھاٹک
بڑے مزے کے دن تھے جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

کھیل ہمارا ختم ہوا اب کہہ دو یہ پھاٹک والے سے
بجا کے گھنٹی چھوڑ دے جلدی اُس پھاٹک کے اوپر پردے
آؤ چلیں اب دیر ہوئی کل ملنا ہے ناٹک والے سے
کہیں یہ اس سے کھیل ہمارا جانچ کے ہم کو رخصت کر دے
بڑے مزے کا کھیل تھا وہ جب ہم تم کھیلے جیون ناٹک

(یہ نظم ایک انگریزی نظم کو دیکھ کر لکھی گئی۔)

ہفت روزہ مصور افسانہ نمبر ۵ اپریل ۱۹۴۱ء

سید مقبول حسین احمد پوری

احمد پوری کی مندرجہ بالا نظم میں جو خصوصیت مجھے سب سے نمایاں دکھائی دی ہے وہ ہے گفتگو کے ذریعے سے کردار نگاری۔ نظم ایک ذرا سا واقعہ ہے لیکن اس واقعے کو فن کار نے زندگی بلکہ ہر زندگی پر محیط کر دیا ہے اور وہ بھی صرف آخری بند کی فکر انگیزی سے۔ نظم کا لطف اس صورت میں پوری طرح آسکتا ہے اگر ہم اسے ایک ایسی تصویر سمجھ لیں جس میں دو بوڑھے آدمی ایک دوسرے کے سامنے موجود ہیں، ایک شاعر (احمد پوری) جو مسلمان ہے اور دوسرے موہن بابو جو ظاہر ہے کہ ہندو ہیں، ایک زمانہ گذرا کہ یہ دونوں ایک گاؤں میں رہتے تھے (گاؤں کی دلیل بعض تشبیہات ہیں — آنکھیں سرمہ دانی، ہاتھ روئی کے گالے، چکنا سر کدو، خمیدگی لدو خچر کی ایسی) نیز شاعر

کا کردار جس سادگی اور زندہ دلی کا حامل ہے وہ اکثر دیہات میں دکھائی دیتی ہے) ہاں تو بچپن سے یہ دونوں دوست ایک گاؤں میں رہتے تھے مسلمانوں میں تعلیم کا خیال کم ہے شاید شاعر وہیں کھیتوں ہی میں الجھا رہا اور موہن بابو پڑھنے لکھنے کے بعد کسی شہر میں چلے گئے۔ یوں وقت گزرتا گیا اور دونوں کی عمریں بیتتی رہیں۔ آخر بڑھاپے سے کچھ عرصہ پہلے بلکہ بڑھاپا آجانے پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ دلوں میں وہ پرانی بچپن کی چاہ جاگ اٹھی اور احمد پوری اپنے دوست کی قلب ماہیت پر غور کرنے لگے۔ موہن بابو چونکہ شہر کی ہوا اچھی طرح کھا چکے تھے۔ اس لئے ان میں سے جذباتیت کافی حد تک رخصت ہو چکی تھی۔ احمد پوری کے سادہ خیالات اور اخلاص بھری دلبستگی سے وہ متاثر ہوئے ہوں گے لیکن انہوں نے "حال" کے آگے سر تسلیم خم کرنا سیکھ لیا تھا۔ چنانچہ اسی زاویۂ نظر سے انہوں نے احمد پوری کی باتوں کو جانچا۔

نظم میں جگہ جگہ کئی دلچسپ کنائے ہیں۔ مثلاً (موہن بابو) کرکے جگالی بولے۔ اس ٹکڑے سے جہاں آپس کی بے تکلفی ظاہر ہوتی ہے۔ وہاں موہن بابو کے شہر میں جا کر پان چبانے کی عادت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ نظم کے پہلے مصرعے میں دو باتیں ذرا الجھانے والی معلوم ہوتی ہیں۔ مصرعہ ہے "ملے تھے جب تم موہن بابو مجھ پاپی سے پہلے پہلے" ــــ پہلے پہلے گویا بچپن کے بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی ــــ دوسرا لفظ "پاپی" ہے "مجھ پاپی سے" ــــ پاپی کیوں! ــــ ــــ اسی بند کے اگلے تین مصرعوں میں جس انداز سے موہن بابو کی دلکشی کا بیان ہے کیا اس سے کوئی اشارہ ملتا ہے؟ ــــ اگر کوئی اشارہ نہ بھی ملتا ہو تو بھی اس نظم میں "زیر لب" "میلان ہم جنسی" کے کنائے موجود ہیں۔

یہ نظم احمد پوری نے کسی انگریزی نظم کو دیکھ کر لکھی ہے۔ جس کامیابی سے شاعر نے ایک اجنبی زبان کے خیال کو اپنایا ہے وہ توصیف کے لائق ہے۔

موضوع سخن

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ وہ غازہ کا ہلکا سا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنی ہے یہی

آج تک سرخ و سیاہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ

یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہئے کوئی ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

نیا ادب مارچ اپریل ۱۹۴۱ء ———— فیض احمد فیض

فیض کی یہ نظم اپنی بہت سی خوبیوں کے ساتھ ساتھ متنازعہ فیہ بھی ہے۔ انفرادی لحاظ سے اگر ہر مصرعے یا شعر کو دیکھا جائے تو اس کے تاثر کی کامیابی یقینی دکھائی دیتی ہے لیکن مکمل تاثر کے لحاظ سے صرف اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے، جس شدت سے ہر مصرعہ الگ الگ ذہن پر اثر کرتا ہے وہ کیفیت مکمل صورت میں نہیں دکھائی دیتی شاید یہ اس لئے ہے کہ اس نظم کی حیثیت کچھ اس کلمے کی سی ہے کہ "مرنے میری جان! انقلاب زندہ باد میری جان" ــــ اور یوں یہ نظم "انقلاب زندہ باد" رہتی ہے نہ

میری جان بنتی ہے۔ جدید شعراء میں فیضؔ اشتراکی تغزل کا کامیاب شاعر ہے لیکن اُس کی دوسری نظموں میں توجہ کے ابھاؤ کی جو کیفیت عموماً پائی گئی ہے وہ مجھے اس نظم میں مفقود نظر آتی ہے۔ انفرادی لحاظ سے ہر مصرعہ فن کار کی شاعرانہ خوبیوں کو ظاہر کر رہا ہے۔ الفاظ کا لطیف اور نازک استعمال ــــ "افسردہ، سلگتی ہوئی شام ــــ نہ سے ہوئے ہاتھ، زلف کی موہوم گھنی چھاؤں، سرخ و سیہ صدیاں، دمکتے ہوئے شہر، پُراسرار کڑی دیواریں، جسم کے کمبخت دلآویز خطوط" ــــ "دھندلی سی حنا کی تحریر" اور "آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ" تصور کا گہرا احساس دلاتے ہیں۔

غالباً مکمل طور پر ناآخر میں اس لئے انتشار پیدا ہوا ہے کہ اس نظم میں فن کار اپنی عام روش سے کسی حد تک ہٹ کر رہا ہے یعنی داخلی ہوتے ہوئے بھی ایک طرح سے خارجی ہے۔

ہاں، ایک بات بہت کھٹکنے والی ہے "برک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں" ــــ مقتل گاہیں درست نہیں بلکہ غلط ہے کیونکہ ظرفِ مکان کے آخر میں ظرفِ مکان کا لاحقہ لگانا گویا ایسا ہی ہے جیسے "لارنس گارڈن کا باغ" یا "شبِ قدر کی رات"

ٹوٹا ہوا ریکٹ

پانی کا اک بلبلہ جیسے
حد سے زیادہ پھول گیا ہو
میلا سا اک تمغہ جیسے
کوئی فضا میں بھول گیا ہو
جیسے اک ننھا غبارہ اڑ اڑ کر نغمے گاتا ہے
دن میں ایک بڑا سیارہ دو جانب آتا جاتا ہے
صاف زمیں پر جال ہے اس پر دل کی اک دنیا اُٹھتی ہے
یہ تارا کی گیند نہیں ہے، یہ میری آشا اڑتی ہے
امرت رکھنے والی ناگن
جالی اور گل کاری کا پھن۔
حرکت کی آتی ہے آہٹ
وہ اٹھا اک نازک ریکٹ
گاہے اچھا ہاتھ لگا کر
اپنے اوپر اتراتی ہیں
گاہے "ضربیں" خالی پا کر
غصے میں شرما جاتی ہیں
دوسری جانب کھیلنے والے پہلے خود موقعہ دیتے ہیں
کچھ لمحے کے بعد ہرا کر غصے کی لذت لیتے ہیں
کالج کے رومانی لڑکے پاس ہی سے آتے جاتے ہیں۔
دیکھ کے "ٹینس لان" کی جانب ہیگل کے گانے گاتے ہیں
پوچھ رہی ہیں ساتھی سے وہ بولو کیسا کھیل رہی ہوں؟
سوچ رہی ہیں اپنے جی میں سب سے اچھا کھیل رہی ہوں
ہاں یہ کیسی گیند کی تیزی
کیا اب کھیل ترقی پر ہے!
یہ متواتر ضربیں کیسی
کیا مقصود اپنا جوہر ہے؟
لیکن یہ کیا کھیلنے والے کیسے اچانک رُک سے گئے ہیں؟
کچھ ہنس کر کچھ پوچھ رہے ہیں، کچھ تارا کو دیکھ رہے ہیں۔
چپ ہیں وہ ماتھے پہ پسینہ اُن کے جیسے چھوٹ گیا ہے
کھیلتے کھیلتے جانے کیسے اُن کا ریکٹ ٹوٹ گیا ہے۔

سلام مچھلی شہری اس نظم میں اس کے نتیجے کی پوسیدگی کے باوجود ایک اچھوتا موضوع پیش کر رہا ہے۔ اکثر انسانوں کی نگاہ ثابت ریکٹ کی طرف ہی نہیں جاتی، ٹوٹے ہوئے ریکٹ کی تو بات ہی جدا ہے ــــ گویا موضوع واقعی اچھوتا ہے۔ سلامؔ کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی سادگی ہے اور اس کے علاوہ اُس کے فنی خصائص بھی اس نظم میں موجود ہیں۔ ریکٹ کا پھیلا ہوا بیضوی حصہ جالی اور گلکاری کا پھن ہے، محاکاتی لحاظ سے ــــ جب اچھا ہاتھ لگتا ہے تو کھیلنے والی اتراتی ہے اور جب ضرب خالی جائے تو غصے میں شرما جاتی ہے۔ نفسیاتی مطالعہ بھی ہے ــــ "دوسری جانب کھیلنے والے پہلے خود موقعہ دیتے ہیں، اور کچھ لمحے کے بعد ہرا کے غصے کی لذت لیتے ہیں (البتہ لطف اٹھانے کی بجائے لذت لینا کچھ ٹھیک نہیں۔ نیز کچھ لمحوں چاہئے تھا) ــــ حقیقت پرستی بھی ہے ــــ کالج کے رومانی لڑکے جب ٹینس لان کے پاس سے گذرتے ہیں تو ہیگل کے گانے گاتے ہیں۔

آخر میں "میں کب اس سوسائٹی کا ہوں" اور "بس ان کا ٹوٹا ہوا ریکٹ دور یہاں سے دیکھ رہا ہوں" ــــ ان ٹکڑوں سے فن کار نے جو پلٹا کھایا ہے اس سے نظم کا موضوع ریکٹ نہیں رہا بلکہ وہ مضمحل اور ناکام نوجوان نمایاں ہو گیا ہے جس کے ہم قسمت انسانوں کی اس دنیا میں کمی نہیں ہے ایک جگہ غبارے کو تشدید سے باندھا گیا ہے۔ یہ غلطی ہے۔

پسپائی

کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں اُمیدوں کو؟
رہنے دو نا آشنائے احساں کر دو۔

میں تو پردیسی ہوں اور آئی ہوں دو دن کے لئے
کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی
اور پھر آنے کا امکان نہیں۔
روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں
کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں اُمیدوں کو؟

کیوں جلاتے ہو مرے دل کے چراغ
میں نے یہ سارے دیئے خود ہی بجھا ڈالے ہیں۔
آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے۔
جس طرح جنگ کی راتوں کو بڑے شہروں میں
بتیاں خود ہی بجھا دیتے ہیں
زندگی کے سبھی آثار مٹا دیتے ہیں۔
اس طرح
میں نے یہ سارے دیئے خود ہی بجھا ڈالے ہیں
آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے۔

اس پہ ہر رات نئے حملے ہوا کرتے تھے۔
آسمانوں سے کئی دشمنِ جاں طیارے
انہیں شمعوں کا نشانہ رکھ کر
بم گرا جاتے تھے اور آگ لگا جاتے تھے۔
اس کو تاریک ہی تم رہنے دو
دل کی دنیا میں اجالا نہ کرو۔
میری امیدوں کو مدہوش پڑا رہنے دو

تم نہیں مانو گے؟
تم یہ کہتے ہی جاؤ گے؟
اچھا دیکھو!
لو جلاؤ مرے سینے کے چراغ
دل کی بستی میں چراغاں کر دو۔
پھر مرے جینے کا — یا مرنے کا — ساماں کر دو۔

پریت لڑی مئی سنہ ء ۔۔۔ شریف کنجاہی

آس اُجالا ہے، یاس تاریکی۔ شروع سے یہ تصور انسانی زندگی میں چلا آیا ہے اور شاعری میں بھی، چاہت سے بھرپور دلوں کے لئے ان دو لفظوں کی کیفیتوں کی باہمی کشمکش توجہ کا مرکز رہی ہے۔ گھر کو دل کا استعارہ کہا جاتا رہا ہے، اور یوں یاس سے پُر سینے کو کلبۂ تاریک، اندھیری کٹیا، خانۂ ویراں اور بہت کچھ اور ایسا کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن اب تک اس تاریکی، دل کی تاریکی کی تشبیہ میں کوئی حقیقت پرستانہ مماثلت پیدا نہ ہوئی تھی۔ آج نئی زندگی کی نئی باتیں اچھوتی صورتوں میں ہماری شاعری پر بھی اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اس کی ایک مثال اوپر کی نظم ہے اگر یوں کہا جائے کہ اُمید کا اُجالا مفقود ہونے کی وجہ سے میرے دل میں بلیک آوٹ ہو گیا ہے، تو بات ہنسی پیدا کر دے گی۔ لیکن شریف کنجاہی نے اسی تصور کو مندرجہ بالا نظم میں ایک فنکارانہ نفاست کے ساتھ پیش کیا ہے۔

آئیے اب قصہ قائم کریں۔ شاعر کسی گاؤں کا رہنے والا ہے "جس طرح جنگ کی راتوں کو بڑے شہروں میں" — یہاں شہر کی وسعت کی تخصیص، صرف لفظ "بڑے" اس کا اظہار کر رہا ہے کہ پیش نظر واقعے میں ہیرو اور ہیروئن کسی بڑے شہر میں نہیں ہیں، گاؤں میں ہو سکتے ہیں لیکن گاؤں میں بھی نہیں ہیں، — شروع میں ایک مصرعہ ہے "روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں" — گاؤں میں گھر سے نکلنا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا (اگرچہ آج کل شہروں کی حالت بھی دگرگوں ہے) — تو گویا ہیرو اور ہیروئن نہ کسی بڑے شہر میں ہیں، نہ کسی گاؤں میں کسی قصبے میں ہوں گے۔ اور وہاں ہیروئن چند دن کے لئے آئی ہے (کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی) نہ جانے کن بہانوں سے یہ ملاقات میسر آئی ہے (روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں) — چوری چھپے کی اس ملاقات میں عاشق محبوبہ کی صورت کو تکتا چلا جا رہا ہے۔ شاید بہت عرصے کے بعد ملے ہیں اور اس لئے "اور عشرت کی تمنا کیا کریں، سامنے تو ہو، تجھے دیکھا کریں!" شاید گزشتہ جدائی نے ہیروئن کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا تھا کہ اب تو اتنا زمانہ بیت چکا۔ اب اُس کے دل میں میری وہ پہلی سی چاہ کہاں رہی ہوگی۔ اور اسی لئے جب عاشق اُسے ایک بے خودی سے دیکھے جاتا ہے تو اس کے دل میں مردہ تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں، مٹی ہوئی امید پھر سے انگڑائیاں لینے لگتی ہے لیکن اُس کا نفسِ غیر شعوری اُسے کہتا ہے کہ وہ یاس کا اندھیرا، وہ سکونِ یاس کچھ بُرا تو نہ تھا، بُرا نہ تھا۔ پہلی اُمید و بیم والی اضطرابی کیفیت کے درد و کرب سے تو نجات

مل تھی رما تھا کہ وہ درد و کرب بھی ایک لذت لئے ہوئے تھا۔ اُمید کی حالت میں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے" سینکڑوں بھلے بُرے خیالات دل میں آتے تھے۔ امید کہتی تھی ہم ملیں گے، یاس کا اندھیرا آتا اور سمجھاتا اگر وہ بے وفا نکلا! اُمید کہتی تھی ملنے کے بعد کس آرام سے رہیں گے، یاس کا اندھیرا آتا اور سمجھاتا: نہ معلوم وہ اب کس چال میں ہے، دشمنوں کو کہیں کچھ ..... دشمن، ہاں دشمن بھی تو آج کل جب شہروں میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ تو حملہ آور ہوتا ہے اس کے طیارے یاس کے خیالات کی طرح امید کی شمعوں کا نشانہ رکھ کر دل کی بستی میں آگ لگا جاتے ہیں۔ اب میں ہوں ہمسرا جا ہنے والا ہے، یہ مجھے تک رہا ہے" تکتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس کے یوں دیکھنے سے کون یاس کا اندھیرا مٹ گیا، میرا وہم تھا، یہ بے وفا نہیں ہے، ہم ملیں گے، ملنے کے بعد کس آرام سے رہیں گے، — لیکن کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے"..... — پھر وہی پہلی کیفیت قائم ہو گئی، اور صرف اس لئے کہ عاشق محبوب کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے ہے۔ محبوبہ نہیں چاہتی کہ وہ یوں دیکھے، امیدوں کو جگائے، لیکن وہ نہیں مانتا — محبوبہ ہار مان لیتی ہے" اچھا دیکھو! — لو بجھاؤ میرے سینے کے چراغ" — اور یہاں "دل" کے چراغ "سینے" کے چراغ بن کر ایک کنائتی رنگ لے آتے ہیں اور اگر یہ کنایہ صحیح مانا جائے تو آخری مصرعے میں پھر مرے جینے کا — یا مرنے کا — سامان کر دو) — "جینے یا مرنے کا سامان" سماجی پابندیوں کے ان گنت پہلوؤں کا عکس بن جاتا ہے۔

میراجی

شعر

میر صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

میر تقی

نقد و نظر

"کونپل" اور "ہوائی قلعے"

پہلی کتاب مکتبۂ اردو لاہور اور دوسری اردو بک سٹال لاہور سے شائع ہوئی ہے قیمت علی الترتیب عہ اور عہ ہے۔ جو مضامین کے لحاظ سے مناسب بلکہ کم اور ضخامت کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ دونوں کتابوں میں اغلاط کی افراط ہے۔ لکھائی چھپائی دونوں کی بہت خوب اور گرد پوش خوبصورت اور دیدہ زیب ہیں۔

کرشن چندر اور اپندرناتھ اشک ہمارے جدید افسانوی ادب میں جو اہمیت رکھتے ہیں وہ ناظرینِ "ادبی دنیا" سے مخفی نہیں۔ دونوں فن کاروں کی بیش قیمت ادبی خدمات ہمارے لئے باعثِ فخر و مباہات ہیں اور مستقبل کا مورخ ادب جب بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کی فنی ترقیوں کا حال بیان کرے گا تو کرشن چندر اور اپندرناتھ اشک کا نام شاید ایک ہی سانس میں لے گا۔ جس سانس میں وہ اردو کی دنیا کی ناچیز خدمات کا ذکر کر رہا ہوگا۔

یہ دونوں فن کار جہاں اپنی خدمات کے اعتبار سے ہم پایہ ہیں۔ وہاں اپنی تخلیقات کی نوعیت اور زبان و بیان کے لحاظ سے باہم دگر بالکل مختلف ہیں اس ضمن میں مثالاً ایک لطیفہ پیشِ خدمت ہے:۔

اس ماہ کے نقد و نظر کے سلسلے میں جب رفیق گرامی میراجی نے مجھے یاد دلایا کہ باب کے یہ صفحات مجھے لکھنے ہیں اور میرے ذمے کی کتابوں میں کونپل اور ہوائی قلعے بھی شامل ہیں تو میں کہ اپنی تفصیل نگاری کے ہاتھوں عاجز ہوں اس شش و پنج میں پڑ گیا کہ دونوں میں سے کون سی کتاب کا انتخاب کروں۔ ہمارے ہاں نقد و نظر کا باب وسیع ہونے کے باوجود عموماً تنگ ہی ثابت ہوتا ہے اور ایک دفعہ میں ایک سے زیادہ کتابوں پر ریویو کرنا کم از کم میرے بس کی تو بات نہیں۔

از بس کہ ہم پیالہ اشک اور کرشن دونوں کے حقوق ایک ہی جیسے ہیں اس لئے جب مجھے اس مشکل کا یہ حل دفعتہً سوجھا کہ دونوں کتابوں کی وصولی کی تاریخ دیکھی جائے اور جو کتاب پہلے چھپی ہو اسی کو پہلے لے لیا جائے۔ تو یقین جانیے میں فرطِ مسرت سے اچھل پڑا لیکن تفصیل نگاری ابھی منہ ہی میں تھی کہ کونپل کا سرورق الٹا تو سامنے یہ تحریر

مولانا صلاح الدین صاحب کو

سادر

اوپندرناتھ اشک

۴ر دسمبر ۱۹۴۲ء

اسے سامنے رکھ کر ہوائی قلعے کا پہلا ورق الٹا تو لکھا تھا۔

محبی صلاح الدین احمد کی نذر

بہ خلوصِ تمام

کرشن چندر

۴ر دسمبر ۱۹۴۲ء

یہ تو ہوا اس لطیفے کا کلائمیکس "لیکن" اخلاقی نتیجہ" ابھی باقی ہے اور وہ ہے ان دونوں فن کاروں کے اندازِ بیان کا باہمی اختلاف۔ بات یہیں سے چلی تھی۔ بظاہر دو دو الفاظ کی یہ دو سطریں بے حقیقت سی نظر آتی ہیں لیکن مجھ سے پوچھئے تو میں ان ننھی منی سطروں کو نہ صرف ان فن کاروں کے اسلوب نگارش کا آئینہ دار سمجھتا ہوں بلکہ ان کی ذہنی کیفیتوں کا عکس بھی تصور کرتا ہوں۔ اشک نے افسانہ نگاری اردو میں شروع کی لیکن ہندی والوں نے اپنے وسیع تر دائرے کے باعث اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اب نہ صرف اس کی زبان غیر شعوری طور پر ہندی آمیز ہوتی جا رہی ہے بلکہ اس کے اسلوب بیان میں بھی ہندی والوں کا سا رنگ آ رہا ہے لیکن شکر ہے کہ موجودہ تصنیف جس کے بیشتر افسانے اردو کے بلند پایہ رسائل میں چھپ چکے ہیں ایک بڑی حد تک اس رجحان سے مبرا ہے۔ دراصل یہ مجموعہ اشک کا پہلا مستقل مجموعہ ہے۔ اور اس کی تدوین میں جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے اشک نے خاص کاوش

سے کام لیا ہے۔

کرشن چندر نے پہلے پہل جب لکھنے کو قلم اٹھایا تو وہ ہماری زبان کی لطافتوں اور اس کی ممکنات سے ایک بڑی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ اسی لئے اس کی تحریر کی سب سے نمایاں خوبی چست بندشوں اور خوب صورت الفاظ کا انتخاب ہے۔ موجودہ مجموعے میں یہ خوبی اگرچہ اپنی پوری شان سے قائم ہے لیکن بعض بعض مقامات پر زبان و محاورہ کی لغزشیں بُری طرح کھٹکتی ہیں۔

ہوائی قلعے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو بیشتر ہفتہ وار اخبارات میں چھپے اور ہفتہ وار صحافت کی عجلتیں مصنف یا مدیر کو پیش نظر واز کی نوک پلک سنوارنے کا موقع نہیں دیتیں۔ بظاہر ہوائی قلعے کے پبلشر نے ان اخبارات کے کٹنگ لے کر ان کی اسی طرح کتابت کرا دی اور شاید اپنی منصبی مصروفیات کے باعث جناب مصنف اس پر نظر ثانی نہیں کر سکے۔

"لپیٹے" یعنی انشائے لطیف کی بنیاد جن عناصر پر رکھی جاتی ہے۔ اُن میں زبان سب سے اہم ہے۔ اس لئے ایک کامیاب مصنف کو اس بارے میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہئیے۔ زبان کی ذرا سی لغزش اس سارے تاثر کو منہدم کر دیتی ہے جو فن کار ایک معمولی سے خیال کی بنیاد پر بڑی محنت سے تعمیر کرتا ہے۔

"ہوائی قلعے" اردو کی ان معدودے چند کتابوں میں سے ہے جن کا موضوع زندگی، اور ذریعۂ اظہار انشائے لطیف ہے۔ اس صنفِ ادب میں کرشن چندر نے اپنے لئے ایک مخصوص پیرایۂ بیان چن لیا ہے۔ وہ اپنی تحریر کو اگرچہ افسانے کے قالب میں ڈھالتا ہے لیکن اسے افسانے کے اصطلاحی لوازم سے بچائے رکھتا ہے۔ طنز کی ایک لطیف سی لہر اس کے رگ و پے میں جاری رہتی ہے۔ اور اس طرح پڑھنے والا بہت سی تلخ حقیقتیں منہ بنائے بغیر نگل جاتا ہے۔ ہماری رائے میں کرشن چندر کی انشائے لطیف اور اس کے افسانوں میں محض ایک ہلکا سا اصطلاحی فرق ہے۔ اور موجودہ مجموعے کے بیشتر مضامین ایسے ہیں جن سے ملتے جلتے مضامین افسانوں کی شکل میں مصنف کے پہلے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً بے رنگ و بو دو فرلانگ لمبی سڑک وغیرہ۔ اور سچ پوچھئے تو دو فرلانگ لمبی سڑک کے پائے کا کوئی مضمون موجودہ مجموعے میں نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ "الف لیلہ کی گیارھویں رات"، "سوا راج سے پچاس سال بعد"، "عشق اور ایک کار" اور "ہوائی قلعے"، زندگی کے بعض مناظر کو ایسے لطیف پیرائے میں پیش کرتے ہیں کہ مصنف کی فنی مہارت آپ سے داد چھین چھین لیتی ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس مجموعے کے بیشتر مضامین زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، ہماری اور آپ کی زندگی سے عوام کے مسائل حیات سے۔ اور مقام شکر ہے کہ ان کا مصنف ان کی تحریر کے وقت زندگی کے ایسے دور سے گزر رہا تھا جس پر ابھی آسائش کا رنگ نہیں چڑھا تھا۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ ایسی بے رحم حقیقت نگاری سے کام نہ لیتا جو پیش نظر صفحات سے جھلک رہی ہے اور جس نے ان مضامین کے لئے ہمارے طنزیہ ادب میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ کرشن چندر کی طنز نگاری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جھٹکے نہیں دیتا بلکہ چٹکیاں لے لے کر مار ڈالتا ہے۔ پڑھنے والے پر چھا جانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا اور نہ اس کا مزاج بگاڑتا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ مضمون کا عنوان دیکھ کر آپ اس کی مخالفت پر تُل جاتے ہیں لیکن جب اسے ختم کرتے ہیں تو خود کو اس کے ہم رکاب پاتے ہیں۔ اس کا بے پناہ طنز اپنے نادرہ کار حسن سے آپ کو اسیر کر لیتی ہے۔ اور ایک شیریں باز ساحرہ کی طرح آپ کو اپنی ہم نوائی پر مجبور کر دیتی ہے۔

عشق اور ایک کار میں نادار سکھو جو بے کار تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے، ایک بورژوا لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ واقعہ اور کردار کا یہ ٹائپ کس قدر عام ہے لیکن ہمارے طنز نگار نے اسے کیسی خوبی سے ایک اچھا پن عطا کیا ہے۔ دیکھئے :-

> "اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پلاز اتھیئٹر کے تیسرے درجے میں بیٹھا تھا۔ اور وہ فرسٹ کلاس میں تھی لیکن پھر بھی میری محبت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی سنیما کے دروازوں میں روشنی بڑھ جاتی۔ تو میں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے سے باز نہ رہ سکتا تھا اور کھیل کے ختم ہونے تک تو مجھے یقین ہو گیا کہ ربِ عظیم نے مجھے ایک جاودانی جذبے سے نوازا ہے۔ چنانچہ اسی جذبۂ سرمدی سے سرشار ہو کر میں نے کھیل ختم ہونے کے بعد لڑکی کی کار کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا اور پھر احتیاط سے اس کا نمبر اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا ......
>
> میں یہ بیان نہیں کرنا چاہتا کہ اس کے بعد ہم کہاں ملے اور کیسے ...... وہ مجھے یقیناً پسند کرتی تھی اور پھر ایک دن میں نے لال باغ میں اسے چند غنڈوں کی چھیڑ چھاڑ سے بچا لیا! اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ غنڈے میں نے ہی کرائے پر مہیا کئے تھے۔ اور میں ہی انہیں لال باغ لے گیا تھا۔ غرضیکہ میں نے فضل بک ڈپو کے ناولوں کا ہیرو بننے کی پوری پوری سعی کی۔ وہ اس دن سے مجھے اور بھی پسندیدہ (؟) نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور میں تو اس کے قدموں کی مٹی کو پوجتا تھا ...... میں یقیناً خوش تھا اور یقیناً ایک لمبے عرصے کے لئے خوش رہتا۔ اگر پنڈت نے اپنے

محبت کے عشقی اطلاعیے سے میری عقل کو مسلوب نہ کر دیا ہوتا۔ پچھلا آپنیڈ سے نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی محبوبہ سے شادی کی درخواست کرو، کم بخت یہیں سامنے تو بیٹھا ہے ......

"ہیلو — لو" اس نے پھر حیرانی سے کہا "یہ کیا؟ تم آج ایک نئی ٹائی لگائے ہوئے ہو، خیر تو ہے؟"

میں نے اپنے چہرے پر ایک محزونیہ مسکراہٹ پیدا کرلی اور پھر کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور آہستہ سے کہنے لگا پڑھے جاؤ کرتی —— کی - پڑھے جاؤ۔ میں تمہاری شیریں آواز سننا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ یہ نغمہ کیٹس کی بلبل کے نغمے کی طرح مجھے اپنے آپ میں تحلیل کر لے۔ آہ۔ تمہاری آواز کس قدر شیریں ہے"

اس نے بلند آواز میں پڑھنا شروع کردیا لیکن اب وہ چیخ رہی تھی اور تلخ لہجے میں میری نقلیں اتار رہی تھی۔

"کل میں نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں پنگ پانگ چمپین شپ جیت لیا"

میں نے اپنے سر کے گرد ایک روحانی ہالہ بناتے ہوئے کہا بہت خوب" کرتی نے جواب دیا "کیا تم ایک دیوار کے مقابلے میں کھیل رہے تھے، بدھو اڈو انی۔ مذاق کی حد ہو چکی"

میں تم سے پیار کرتا ہوں، مذاق کی حد ہو چکی۔ کرتی میری بات سنو مجھے تم سے محبت ہے۔ بے اندازہ محبت۔ کرتی۔ کیا تم مجھ سے شادی کروگی؟"

وہ چند ثانیے خاموش رہی پھر اس نے سنجیدہ ہو کر پوچھا "تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"سچی محبت" میں نے جواب دیا "مذہب نسل اور باپ کی تمیز سے بالاتر ہے۔ یہ ایک روحانی، سرمدی ....."

کرتی نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا "تم ایک مہینہ میں کتنا کما لیتے ہو؟"

میں نے احتجاجاً کہا "میں —— اشتراکی ہوں"

"کیا تمہارے پاس ایک کار ہے؟"

"کار تو نہیں لیکن ایک بائیسکل ضرور ہے جو مجھے بحیث سنیما کی دیوار کے ساتھ لگا ہوا مل گیا تھا" میں نے فخریہ کہہ دیا کہ کرتی نے جھٹ گھنٹی بجائی اور اس کا ملازم داؤد کمرہ کے دروازے میں نمودار ہوا۔

"داؤد!" کرتی نے بلند آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں غصے کے ساتھ عصمت و عفت کے نسائی جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے "داؤد —— اس بدمعاش کو کمرے سے باہر نکال دو!"

سکھو نے داستان ختم کردی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں گم ہوگیا۔ کلب میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ج۔ بس اور آنند اپنی کرسیوں پر اس طرح سہمے ہوئے بیٹھے تھے جیسے کسی استاد کی گھرکی سے بچے دبک کے بیٹھ جائیں۔ آتش دان میں جلتی ہوئی لکڑیوں پر تیز تیز شعلے چمک جاتے تھے۔ یکایک کلب کے سب سے پرانے ممبر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور سکھو کے حزیں چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ بیٹا سکھو، غم کھانے سے کیا ہوتا ہے انقلاب کے لئے کام کرو اور خدا کا شکر کرو کہ اپنی روحانی محبت کے باوجود تم زندہ ہو۔ ورنہ اگر تم کسی بورژوا ناول کے ہیرو ہوتے تو اس واقعے کے بعد یقیناً خودکشی کر لیتے!"

اقتباس قدرے طویل ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ کرشن چندر کی انشاؤلیسی کے تمام عناصر کی نمایندگی کرتا ہے۔ ہمارے نوجوان طبقے کی جنسی فاقہ زدگی۔ رومانی خود فراموشی اور زندگی سے فرار کی کوشش کو اس سے زیادہ مؤثر پیرایۂ بیان شاید کبھی نصیب نہیں ہوا۔ اور سماج اور عورت اور عشق اور روٹی کی ایسی ظالمانہ تحلیل بہت کم فن کاروں کے حصے میں آئی ہے۔ مضمون کا آخری حصہ اپنے اندر ایک ڈرامائی تاثر لئے ہوئے ہے اور اپنے ادبی کیف سے اس تاثر کو شدید تر کئے دیتا ہے۔ یہ ادبی کیف اردو کے بہت کم طنز نگاروں کو میسر ہے۔ اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ اپنی افتادِ طبع اور رجحان ادبی کے لحاظ سے محض طنز نگار ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں لیکن کرشن چندر کی ادبی تربیت ایک رومانی ماحول میں ہوئی اور اس نے زندگی پر ہنسنے سے پہلے زندگی کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کوشش کا کیا حشر ہوا لیکن بظاہر اس نے تیز و نازک تاثرات اور حسین و جمیل نگارشات کا ایک لطیف ورثہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ جو اس فن کار کی ہر اچھی تخلیق پر چھایا جاتا ہے مجموعے کے آخری مضمون "ہوائی قلعے" کا آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"وہ اطرف انیلی لڑکی جس سے بڑے چاؤ سے چھوٹی عمر میں جھوٹ موٹ بیاہ رچایا تھا کیوں عین شباب کی سرمستیوں میں ایک بالکل انجان، ناواقف آدمی کی بیاہتا بن کر چلی گئی اور تمہارے کلیجے میں

ناسور پیدا کر گئی ... لیکن جہاں تم نے جوانی میں کئی پرانے قلعوں کو باہم جمع پر تم تعمیر بادکبی (؟) وہاں تم نے بہت سے نئے قلعوں کی تخلیق بھی کی۔ تم نے اپنی سادہ لی محبوبہ کی رنگت کو چنبیلی کے پھولوں کی طرح حسین بنا دیا۔ اپنے غریب ملک کے جھنڈے کو اتنا بلند کیا کہ کائنات کی کل وسعتیں اس کے سایے تلے آگئیں۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے کی جگہ ایک جگمگاتا ہوا زمرد و لعل و جواہر کا محل تیار کیا ..... تم دنیا کے سب سے بڑے شاعر ادیب، افسانہ نویس، سیاست دان، سپاہی حکیم اور مصلح کہلائے اور شہرتِ دوام کا تاج تمہارے سر پر رکھا گیا!

لیکن ان باتوں کے باوجود تمہاری آنکھ اس وقت کھلی جب تم ایک حقیر سے دفتر میں ایک حقیر سی نوکری حاصل کر کے ایک حقیر سے مشاہرے پر ملازم ہوئے۔ تمہارے ماں باپ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور تمہارے پلّے ایک چڑچڑی اور بھدی وفادار بیوی باندھ گئے محبت کے سوتے خشک ہو گئے۔ پھونس کے جھونپڑے جل گئے اور تمہارے ملک و قوم غریب تر ہوتے گئے

× × × × × × × × ×

مگر اتنا کچھ ہونے پر بھی ہوائی قلعوں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے جوانی کے بعد پیری آئی اب پچھلے سب قلعے معدوم ہو چکے۔ اپنے لئے کچھ باقی نہیں، اب توجہ دوسروں کی طرف ہے، بوڑھے باپ نے قلعے بنائے اپنے جوان بیٹے کے لئے۔ بوڑھی ماں نے لرزتے ہوئے تخیل میں اپنی جوان بیٹی کے خاوند کو دیکھا کہ اس کے گھوڑے کی رکابیں موتیوں سے گندھی ہوئی ہیں۔ اور اس کے خوبصورت دولہانے اپنا سر ساس کے پیروں میں رکھ دیا ہے۔

نوجوان پوتے نے دادا کے نام پر ایک بہت بڑا ہسپتال تعمیر کیا ہے جس میں دنیا بھر کے گنٹھیا کے مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ کیونکہ دادا کو خود گنٹھیا کا مرض ہے اور وہ ڈاکٹروں کو فیس دیتے دیتے تنگ آگئے ہیں۔

خدائے برتر نے ستر سال سے زیادہ عمر کے بوڑھوں کے سب گناہ بخش دیئے ہیں۔ ان میں بوڑھے دادا بھی شامل ہیں وہ خوشی سے ناچنا چاہتے ہیں مگر گنٹھیا کی وجہ سے نہیں ناچ سکتے وہ گانا چاہتے ہیں۔ مگر زبان پر لکنت طاری ہو جاتی ہے۔ سننا چاہتے ہیں مگر ساری کائنات پر یکایک ایک بسیط خاموشی چھا جاتی ہے پھر چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔ یا روشنی ہی روشنی یا پانی ہی پانی پھر انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمٹ رہے ہیں سکڑتے ہوئے سمٹتے ہوئے صرف ایک ذرّہ بن کر رہ گئے ہیں اندھیرے کا ایک ننھا سا ذرّہ۔ روشنی کی ایک چھوٹی سی کرن پانی کی ایک پتلی سی لہر۔

اس طرح ہوائی قلعے بناتے بناتے زندگی گزر جاتی ہے

آپ نے دیکھا! ایک رنگین تخیل اور دل پذیر انداز بیان نے کتنی خوبی کے ساتھ طنز کی وہ تمام تلخی بکھیر رکھی ہے جو درحقیقت اس پارے کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق خلاق کی آئینہ دار بن گئی ہے۔ ایک ادبی کارنامے کے نقاد کو شاید یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تصنیف سے مصنف کے کردار کو جانچے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جب میری نگاہ ان اوراق پر پڑتی ہے تو ان کا لکھنے والا انھیں اپنے گرد لپیٹتا ہوا میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم ہے اور آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک ناقابل بیان حزن۔ وہ بظاہر ہنستا ہے لیکن اس کی ہنسی کی بازگشت سننے والوں کے دل و دماغ پر ایک نغمۂ یاس بن کر چھا جاتی ہے پھر کون ہے جو گریہ و تبسم کے اس سیلاب میں نہ بہ جائے اور کون ہے جو اس طنز کی شیریں خلش کو اپنے دل و جگر میں جگہ نہ دے۔

کرشن چندر اس خصوصیت کے اعتبار سے اردو کے تمام طنز نگاروں میں ممتاز ہے لیکن کیسے تعجب کا مقام ہے کہ ہمارے فاضل نقادوں میں سے ایک نے بھی طنز نگاروں کے کسی تذکرے یا جائزے میں اس نوجوان فن کار کا نام تک نہیں لیا۔ ادبی ناشناسی کی اس سے عجیب تر مثال نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

اور اب کونپل

جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔ اس مجموعے کے افسانے سلیس اور سادہ اردو میں لکھے گئے ہیں اور شدھ ہندی کے نامانوس الفاظ سے عبارت کو بے کیف بنانے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اور اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض افسانے کتابی صورت میں آنے سے پہلے ادبی دنیا اور چند دیگر بلند پایہ رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ غالباً دو تین چیزیں نئی بھی ہیں۔ تاہم از کم عام ناظر کے لئے بالکل نئی ہیں۔ اشک صاحب میں یہ ایک قابل تعریف بات ہے کہ وہ اپنے مضامین پر ہمیشہ ایک کڑی نگاہ رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اور یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ جب اس مجموعے کی تدوین کا وقت آیا تو اس کے مصنف نے اکثر صفحات

دوبارہ لکھے اور ان کی پہلی طباعت اور موجودہ تالیف کے درمیانی وقفے میں اسے جو فنی یا لسانی اصلاحیں سوجھیں ان سے انھیں آراستہ کیا۔ اور اب ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ کونپل اردو کے مختصر افسانوں کے مجموعوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہے اتنا افسوس ضرور ہے کہ بعض ایسے افسانوں میں جو اچھے رسائل میں نہیں چھپے، زبان و محاورہ کی چند غلطیاں بھی نظر آتی ہیں اور بعض افسانوں کے عنوانات بھدّے اور اجنبی سے ہیں، مثلاً گوکھرو۔ ددلو وغیرہ لیکن بقول اشکؔ ' آخر ناموں میں کیا رکھا ہے ؟ ان کی جرأت کی تو یہ کیفیت ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی اردو تالیف کا نام "ڈاچی" رکھ دیا اور ڈاچی اردو زبان کا کوئی لفظ نہیں۔

بہرحال ۔۔۔ ۔۔۔ پیشِ نظر مجموعے کے گیارہ افسانوں میں سے "راج کما" کو چھوڑ کر باقی تمام کہانیاں زندگی کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔ راج کمار البتہ ایک رومانی مطالعہ ہے جو اس مجموعے میں شامل نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ اس ایک چیز نے نہ صرف کتاب کی انفرادیت کو صدمہ پہنچایا ہے۔ بلکہ اشکؔ کی ایک نہایت اہم خصوصیت کو بے رنگ کر دیا ہے۔ ہمارے نوجوان مصنفین میں سے عاشق حسین بٹالوی کے سوا اور کوئی قابلِ ذکر افسانہ نگار ایسا نہیں ہے جس نے اپنے مطالعے کا میدان عمداً اس قدر محدود کر دیا ہو جس قدر اشکؔ نے کر دیا ہے اور اس کا بڑا بھاری فائدہ اسے یہ پہنچا ہے کہ مطالعہ کی باریکی کے باعث اس کی کہانیاں پلاٹ کے لحاظ سے قریباً بے عیب ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس کا مطالعہ داخلی نہیں بلکہ خارجی ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ اپنی تمام جزئیات میں وہ زندگی اور مشاہدے سے براہِ راست متاثر ہوتا ہے۔ جزئیات نگاری افسانہ نگاری کی جان ہے اور جس فن کار نے اس پر قابو پا لیا وہ اپنے فن میں کامیاب ہے۔ اشکؔ ہندو سوسائٹی کے نچلے متوسط طبقے کی زندگی سے بے حد متاثر نظر آتا ہے۔ اس کے معاشرتی مسائل کا اس نے غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے افسانے اس کے شدید مطالعے کے شاہد ہیں۔ یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ اس نے مغربی افسانہ نگاری سے واقفیت کے باوجود اس کا اثر قبول نہیں کیا۔ اس کی کہانیاں نہ صرف گہرے مقامی رنگ میں رنگی ہوتی ہیں بلکہ خالص ہندو معاشرت کی ایسی ہو بہو تصویریں ہوتی ہیں جنھیں صرف ایک محرمِ راز ہی کھینچ سکتا ہے۔ ہمارے عام افسانہ نگاروں میں مغربی افسانوں کو اپنانے اور خود اپنے تجرباتی افق سے پار جھانکنے کی جو وبائی بیماری ہے اشکؔ اس سے یکسر محفوظ ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے اس پر اسے پورا قابو ہوتا ہے اور اسی لئے اس کی صناعی میں ایک خوش آیند جرأت بے تکلفی اور ہمواری پائی جاتی ہے۔ مجھے اس کے افسانے پڑھتے وقت بارہا ایسا محسوس ہوا ہے کہ اشکؔ ایک چابکدست کمہار ہے جو اپنے خیالات کے چاک کو گھماتے ہوئے بڑی آسانی سے اس پر ایسے ایسے نازک اور سڈول کوزے اتارتا چلا جاتا ہے جو اپنی نزاکت میں افرنگ کی بلوری صراحیوں کو پرے بٹھاتے ہیں۔

ہاں اتنا ہم بھی محسوس کرتے ہیں کہ اشکؔ اگر کسی سے متاثر ہوا ہے تو وہ منشی پریم چند آنجہانی کی ذاتِ گرامی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کے متعلق یہاں کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے لیکن ان کی اس خصوصیت سے سب لوگ واقف ہیں کہ ان کا ہر افسانہ ہماری کسی نہ کسی اخلاقی یا سماجی کمزوری کو بے نقاب کر کے ہمارے فکر اور احساس کو اس کے خلاف صف آرا کر دیتا ہے۔ اور یہ عمل کچھ ایسے غیر معلوم طریق پر سرانجام پاتا ہے کہ ہم شعوری طور پر اس تبدیلی سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اور یہ سلیقہ ان کے فن کا سب سے باریک اور اہم نکتہ ہے۔ اشکؔ میں بھی ہم بعینہٖ یہی خصوصیت پاتے ہیں۔ وہ اپنی دیکھی بھالی زندگی میں سے کوئی چبھتی ہوئی چیز چن لیتا ہے اور اسے ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ ہم اسے بظاہر کسی مقصد یا مدعا کی طرف بڑھتے ہوئے نہیں دیکھ پاتے مگر اس کے باوجود وہ اپنا مطلب حل کر لیتا ہے اور ہمارے تحت الشعور میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کا بہترین افسانہ کونپل اس کے اس شعبدے کی بہت اچھی مثال ہے سنیکری ایک ٹائپ ہے نوجوان ہندو بیوہ کا۔ سہاگ کے دنوں میں پاک دامن رہنے کے باوجود وہ اپنے بوڑھے شوہر کے شکوک سے محفوظ نہیں رہتی۔ زندگی کی اَور سب کیف مصروفیتوں میں وہ اس قدر منہمک ہے کہ دبائے جانے اور پھر ابھرنے کے موقعے پانے کے باوصف اس کی جنسی زندگی میں کوئی بحران پیدا نہیں ہوتا۔ ایک ہندو عورت کو شوہر پرستی کی ایسی سخت تربیت دی جاتی ہے کہ شعوری طور پر اس میں جنسی بغاوت کا پیدا ہونا نہایت مشکل ہے اور اس کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے دبے ہوئے جذبات و احساسات کسی اور محور کے گرد گھومنے لگ جاتے ہیں اور وہ جب زندگی کی تلخ کیفیتوں سے ذہنی طور پر فرار ہوتی ہے تو اسے اسی محور میں تسکین کا سامان میسّر آتا ہے۔ موجودہ افسانے میں زیور پہننے کا شوق اس محور کی نمایندگی کرتا ہے اور فن کار نے نہایت خوبی سے اسے ہلکی ہلکی جنسی لہروں پر جھلایا ہے۔ دیکھئے :۔

"سنیکری کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس کی تھی لیکن اس کے
بھرے بھرے ہاتھ پاؤں جوانی کی سنہری صبح کے سانچے میں ڈھلے ہوئے
معلوم ہوتے تھے۔ کنگن اس کی کلائیوں میں ایسے چپک کر رہ گئے کہ
کچھ دیر بعد ان میں سے ایک کو اسے اپنی جگہ سے کھسکانا پڑا۔
اس کی جگہ خون اکٹھا ہو جانے سے ایک سرخ حلقہ سا بن گیا تھا۔
بہت دیر تک وہ مسحور سی ہو کر اسے دیکھتی رہی پھر کلائیوں سے لٹکتے
ہوئے کلیروں اور ناک میں پڑی ہوئی بڑی نتھ کو سنبھالتی
ہوئی وہ اٹھی اور جا کر سہیلیوں کو اپنا ایک ایک گہنا اور اس کی
بناوٹ دکھانے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سنیکری کی مسرت اور خوشی کو دیکھ کر بڑی بوڑھیاں اپنے پوپلے منہ لئے ہنستیں اور اس کی خوش بختی کی تعریف کر کے اسے دعائیں دیتیں۔ بھاگ سنگھے برہمن کی لڑکی اتنے بڑے گھر جا رہی ہے۔ اتنے دھنی کے گھر! . .

لیکن گاؤں کی نوجوان لڑکیوں کو اس کی خوش بختی پر کچھ ایسا رشک نہ تھا۔ اتنے قیمتی اور خوبصورت زیور اس غریب برہمن کی لڑکی کے جسم پر دیکھ کر اگر کسی کو کچھ جلن بھی ہوتی تو یہ جان کر کہ سنیکری سوت پر جا رہی ہے۔ اور پچاس سالہ دولھا کی پہلی بیوی بھی موجود ہے اُن میں سے اکثر نے منہ بنا بنا کر کہہ دیا تھا ——— دُنیا میں سب کچھ گہنے کپڑے ہی تو نہیں ہوتے . . . . . .

سسرال آنے پر گہنے کپڑے سے سنیکری کو اور بھی محبت ہو گئی۔ لیکن وہ جب کبھی، گہنے کپڑے پہنتی تو پنڈت جی کے پاس بیٹھنے کی بجائے اپنی سہیلیوں کو اپنی شان دکھانے کے لئے بے چین ہو جاتی۔ پنڈت جی اپنے گھٹے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے خوب صورتی کے اس مجسمے کو دیکھتے اور کہتے

"تم تو سورگ کی اپسرا ہو!" اور اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ اپنے میکے جانے کے لئے مچل پڑتی۔

درحقیقت گہنے کپڑے زیب تن کرتے کرتے کچھ عجیب طرح کی کسمساہٹ سنیکری کے جسم میں پیدا ہو جاتی تھی۔ کوئی نامعلوم سی آرزو اس کے دل میں سلگنے لگتی تھی لیکن جوتشی جی سے جیسے اسے کچھ خوف سا آیا کرتا . . . . . ایک بار جب پنڈت جی اسے لینے گئے تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی ٹھیک وجہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھی لیکن اس "راج گھر" میں اس کا دم جیسے گھٹنے لگتا تھا۔ اس وقت پنڈت جی نے اس سے سونے کے بڑے بڑے منکوں کی کنٹھی بنوا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ماں نے سمجھایا تھا ——— باپ نے جھڑکیاں دی تھیں . . . . . .

لیکن پھر جب اس نے میکے جانے کی ضد کی تو پنڈت جی نے جھونک دیا ——— "وہاں کسی سے آشنائی ہے جو آئے دن اُٹھ بھاگتی ہے!" ——— سنیکری پرسن کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی ہوش و حواس اسے جواب دیتے ہوئے معلوم ہوتے تھے . . . . . وہیں کھڑے کھڑے اس کی آنکھوں میں گاؤں کے کئی سیدھے سادے نوجوانوں کی تصویریں پھر گئی تھیں جن کو وہ بھائی کہتی تھی . . . کیا اُن میں سے کسی کے ساتھ اس کی آشنائی تھی؟ دل کو ٹٹول کر اس نے اچھی طرح دیکھا لیکن کہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس نے ابھی تک کو اس روپ میں دیکھنا بھی نہ سیکھا تھا ——— وہ ضبط نہ کر سکی رو پڑی۔ جوتشی جی نے دیکھا نشانہ بہت آگے پڑا تھا۔

لیکن جب پنڈت جی نے خود ہی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اسے اس جنسی نیند سے بیدار کر دیا تو پھر اگر پرمیشری برہمنی کا وہ نوجوان لڑکا جو ہر روز دوپہر کو روٹی لینے آیا کرتا تھا اور اب تک محض ایک غریب برہمن لڑکا تھا اسے اپنے خوابوں کا راجہ نظر آنے لگا تو حیرانی کی کیا بات تھی۔ یہاں پہنچ کر افسانہ نگار نے حیرت انگیز صناعی کا ثبوت دیا ہے ؛۔

"دوسرے دن پنڈت جی صراف کی دکان سے سونے کے بڑے منکوں والی خوبصورت کنٹھی لے آئے . . . . . انھوں نے لاکھ کہا کہ اسے ذرا پہن کر دکھا دو۔ دیکھیں تو سہی تمھارے خوبصورت گلے میں کیسی لگتی ہے لیکن سنیکری چپ بیٹھی رہی . . . . جب پنڈت جی چلے گئے تو اسے پہن کر دیکھنے کے لئے اس کا من بے چین ہو اٹھا . . . . . اتنے میں نہدا لینے والی برہمن پرمیشری کا لڑکا تھالی اٹھائے ہوئے آیا ہنس مکھ، بے پروا۔ بائیس تیئیس برس کی عمر اور طبیعت میں کچھ کچھ بھولاپن۔

آشنائی! ——— اچانک سنیکری کے دل میں یہ ایک لفظ گونج اٹھا اور اس نے اس برہمن لڑکے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا بھی لیکن پھر جھٹ ہی اپنی آنکھیں جھکا لیں . . . کنٹھی کا ہک گردن کی پشت پر تھا۔ نیا ہونے کی وجہ سے اور گردن میں کنٹھی کے بالکل فِٹ آنے کے باعث وہ کوشش کرنے پر بھی اسے نہ لگا سکی۔ تب اس نوجوان نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر اسے لگا دیا۔ سنیکری کے تمام جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

اس بدقسمت ملک میں جہاں سماج کا عفریت جنسی اظہار کی ہر صورت کو بری طرح دبائے رکھتا ہے وہاں جنسی بغاوت اور اس سے پیدا ہونے والی بیداری کی کیفیت میں صنفِ مقابل کی انگلیوں کا ایک ہلکا سا لمس بھی خواہ بابعد کا ایک طوفان پیدا کرنے کو کافی ہے لیکن ہندوستانی عورت کی فطری پابندی اس ردِ عمل پر غالب آ کر اپنے آپ کو ایک بار پھر مرد کے ہوس کارانہ تفوق کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے

اتنا ضرور ہے کہ ہر نئی تحریک اس کے ادراک و احساس میں ایک نئی کشمکش کا آغاز کر دیتی ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے جب تک کہ موت یا جدائی اس کا خاتمہ نہیں کر دیتی۔ مگر نہیں۔ ایک ہندو بیوہ کے لئے سماج نے یہ آخری مخلصی بھی گوارا نہیں کی۔ زیرِ نظر افسانہ مذکورہ کشمکش کی ایک دردانگیز داستان ہے۔ اور افسانہ نگار نے اسے نا تمام چھوڑ کر فن کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ پنڈت جی کی موت کے بعد سنیکری کے ویرانۂ دل میں اپنے آپ کو پا لینے کی کونپل پھوٹی تو سہی لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اسے پنپنا بھی نصیب ہوا یا وہ اس سموم کی نذر ہو گئی جو سماجی دباؤ کے تپتے ہوئے ریگستان سے چلتی ہے اور ایسے ایسے لاکھوں شگوفوں کو آنِ واحد میں جھلس جاتی ہے۔

اشک اپنے افسانوں کے پس منظر بڑی کاوش سے تیار کرتا ہے اور انھیں کہانی کے اتار چڑھاؤ سے مطابقت دینے میں اسے بڑی مہارت حاصل ہے۔ ادب میں کم از کم فنی علامتیت کا فن کارانہ استعمال بہت دشوار چیز ہے۔ اشک اس امتحان میں بھی پورا اُترتا ہے۔ افسانے کو پس منظر پر ابھارنے اور علامتیت کی فن کارانہ امداد سے اس میں جان ڈال دینے کی ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

پہلے ایک آرزو انگیز منظر ——

"اسی طرح لیٹے لیٹے، کروٹیں بدلتے بدلتے دن ڈھل گیا۔ کمرے میں جیسے اُس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اٹھی صحن میں آئی۔ منڈیر پر ایک کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ طاق کے اوپر آگے کو بڑھی ہوئی محراب پر ایک کبوتر پنکھ پھیلائے گردن جھکائے اپنی محبوبہ کو منانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن جب وہ مستانی (؟) چال سے چلتا چلتا اُس کے پاس جاتا وہ اڑ جاتی ——

ایک طاق سے دوسرے پر۔ دوسرے سے تیسرے پر، تیسرے کو کھٹولے پر، کھٹولے سے چارپائی کے پائے پر اور پھر وہاں سے لکڑی کے جنگلے پر وہ جا جا کر بیٹھی لیکن کبوتر نے پیچھا نہ چھوڑا۔ پھر ایک زناٹے سے جو وہ اڑی ہے تو نیلے وسیع آسمان میں گم ہو گئی۔ کچھ لمحہ تک وہیں جنگلے پر کبوتر نے ایک دو چکر لگائے غٹرغوں غٹرغوں کی اور پھر وہ بھی اوپر آسمان کی طرف اُڑ گیا۔

سنیکری نے لمبی سانس بھر کر انگڑائی لی۔ پھر اس نے گھڑے کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور پھر جیسے کسی نامعلوم ترغیب کے زیرِ اثر اوپر چھت پر کھلی ہوا میں چلی گئی۔

سامنے محلّے کے پہلے سرے پر برہمن کا لڑکا اپنے پرانے مکان کی چھت پر کتاب میں دھیان جمائے چپ چاپ پڑھ رہا تھا۔ سنیکری نے بے ساختہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے من میں اُمنگ اٹھی کہ کچھ گا لے۔ کوئی ڈھولک کا پرانا گیت، لیکن وہ چُپ ٹکٹکی باندھے اُدھر دیکھتی رہی۔ محلّہ کا نیم ٹھنڈی ہوا کے لمس سے جیسے سرمست ہو کر جھوم رہا تھا۔ آسمان کی گہرائیوں میں چیلیں ایک دوسری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ سنیکری نے انگڑائی سی لی۔ اس وقت نوجوان نے اسکی طرف دیکھا۔ ساری کا پلّو اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا۔ اور اس کی بلوریں گردن میں کنٹھی کے بڑے بڑے سنہری منکے غروبِ آفتاب کی کرنوں سے کئی سورج بن کر چمک رہے تھے۔

سنیکری کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا ...."

اور اب وہ رات جب پنڈت جی مر چکے ہیں اور سنیکری کی ماں جو رسم و رواج کے بندھنوں میں اسیر ہو کر اپنی روح تک سے ناآشنا ہو چکی ہے۔ اسے تسلّی دینے اور اس کی ہونے والی بھاوجوں کے لئے اس کا زیور قابو میں کرنے کو آئی ہے اور اب ایک ڈھیلی سی چارپائی پر گٹھڑی سی بنی ہوئی پڑی ہے۔

"ساتھ لگی ہوئی بچی دودھ پیتے پیتے چھاتی منہ میں لئے ہی سو گئی تھی۔ سنیکری نے اسے الگ کیا اور کروٹ بدلی۔ اوپر آسمان میں پورنماشی کا چاند اپنی کرنوں کا تاج پہنے، پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سنیکری کے دل سے ایک آہِ سرد نکل گئی۔ ان دو برسوں میں وہ زندگی کو کتنا زیادہ سمجھنے لگی تھی۔ بستر پر پڑے پڑے اس کا دم گھٹنے لگا۔ ایک ناقابلِ برداشت سی آگ اس کے روئیں روئیں میں دھُو دھُو کر کے دہک اٹھی۔ اس کی ماں نے جنتے ہی کیوں نہ اس کا گلا گھونٹ دیا .... آنکھوں کے بھیگے ہوئے کونوں کو دامن سے پونچھ کر اس نے کروٹ بدلی۔ محلّے کے نیم پر بیٹھا ہوا چھوٹے اُلوؤں کا جوڑا اپنی کرخت آواز میں چیخ اٹھا۔ ہوا سائیں سائیں کرنے لگی اور اوپر آسمان میں ایک بڑی سی چمگادڑ اپنے پروں کا سایہ دیوار پر ڈالتے ہوئے گزر گئی ....

اور پھر جب ایک ناقابلِ برداشت جذبے کے زیرِ اثر سنیکری نے دبے پاؤں نیچے جا کر اپنا عروسی جوڑا اور اپنے تمام زیور پہنے تو۔

"ہاتھوں میں کنگن ڈالتے وقت اسے معلوم ہوا کہ وہ کتنی کمزور ہو گئی ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ گول حلقہ پھر گیا جو کبھی

کلائی پر کنگن کے پھنس جانے سے پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ آئینے
کے سامنے گئی۔ اس کے گول گول گالوں میں گڑھے پڑ چلے تھے
جبڑوں کی ہڈیاں دکھائی دینے لگی تھیں اور ابھی اس کی عمر صرف
اٹھارہ برس کی تھی۔

ایک لمبا سانس بھر کر وہ وہیں ٹرنک پر بیٹھ گئی اور اس کی
آنکھوں کے سامنے چار برس پہلے کا ایک واقعہ آگیا جب پہلی
برہمنی کے پھنس تکھ لڑکے نے اس کی کنٹھی کا ہک باندھ دیا تھا
اسی دن کی طرح ایک نامعلوم سی مسرت کی جھرجھری اس کے
تمام جسم میں دوڑ گئی۔

دور کہیں مسلمانوں کے محلے میں مرغ نے اذان دی سنیکری
چونک کر اٹھی سب گہنے اتار کر اس نے ٹرنک میں بند کئے کپڑے
تہ لگا کر رکھے اور دبے پاؤں اوپر پہنچی۔ چاند اس وقت دائیں طرف
کے اونچے مکان کی اوٹ میں چلا گیا تھا سنیکری چپ چاپ
اپنی چارپائی پر جا لیٹی۔

دوسرے دن جب ماں واپس جانے لگی اور سامان رکھا کر
اس نے سنیکری سے گہنے مانگے تو اس نے ٹال دیا۔"

آپ نے اس آخری چیز کو دیکھا! علامیت کے بل پر افسانہ نگار نے چاند کو اس اونچے مکان کی اوٹ میں کس فنکاری سے پہنچایا ہے۔ اور اس ایک اشارے سے اس نے اپنی ناتمام کہانی کو کس خوبی سے آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے —— اشک کو اس تکنیک میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ بلاشبہ قابل رشک ہے۔

ہم نے ارادتاً اس مجموعے کے صرف ایک افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔ اور یہ افسانہ اشک کے فن کی پوری نمایندگی کرتا ہے۔ آپ اسی سے اس کے اور افسانوں کی خوبیوں کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ موجودہ مجموعے میں کونپل کے علاوہ تہذیب، یہ مرد، اور قفس اعلےٰ پائے کی تخلیقات ہیں اور اشک کی تمام خصوصیات کی آئینہ دار۔ باقی افسانے اوسط درجے کے ہیں اور راج کمار بالکل ادنیٰ ہے۔

ایک بات رہ گئی۔ ایک دو مقامات پر اشک نے پریم چند آنجہانی کے تتبع میں تشبیہ و استعارہ سے اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً۔

"سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ جگت کے نانا کی بیوی دوسری
تھی اور سوتیلی ماں کے ہوتے جگت کی ماں کو کچھ زیادہ ملنے کی
امید بھی نہ تھی پھر بھی سب طرف سے ناامید ہو کر جگت کی ماں میں
جا رہی تھی۔ کنارہ کتنا بھی اونچا اور چکنا کیوں نہ ہو۔ سہارا لینے
کے لئے وہاں کوئی پکڑ ہو یا نہ ہو لیکن اور سہارا نہ پاکر ڈوبنے
والا۔ اسی طرف جاتا ہے۔"

ہم نے پریم چند کی تصانیف میں یہ استعارہ ایک سے زیادہ جگہ دیکھا ہے لیکن وہ زبان کے دھنی تھے۔ استعارہ بندی سے جس غضب کی اثر آفرینی ان کے بس میں تھی اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور غالباً نہیں ہوگی۔ ہم اشک صاحب کو یہی مشورہ دیں گے کہ اس انداز بیان کے حاصل کرنے کی بہ نسبت اگر وہ اپنی ذاتی خصوصیات کی طرف زیادہ توجہ دیں گے تو یہ بات نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کے پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ تسکین کا موجب ہوگی ◆

صلاح الدین احمد

Regd. L. No. 2482 ISSUE FOR JULY 1941 Regd. L. No. 2482

Printed & Published by Salah-ud-din Ahmad at the Gilani Press, Hospital Road, Lahore. The Title & pictures printed at the Allied Press, The Mall, Lahore Issued from the office of the Adabi Dunya Balkishen Building, The Mall Lahore

یادِ رفتگاں

یادِ چغتائی

عظیم بیگ چغتائی ۲۰ اگست ۱۹۴۱ء کو ہم سے رخصت ہوئے۔

سلطنتِ مغلیہ کے بعد پہلے تو سیاسی زوال اور پھر احیائے قومی کی تگ و دو نے اہلِ وطن کو عموماً اور اہلِ قلم کو خصوصاً کچھ اس قدر سنجیدہ بنا دیا کہ اردو کا جدید ادب ایک یوں کہئے کہ ہنسنا بھول ہی گیا۔ مغربی اثرات کے ماتحت ترقی کی نئی راہیں تو کھلیں، لیکن اردو ادب میں قہقہہ اس وقت تک باقاعدگی کے ساتھ نمایاں نہ تھا جب تک کہ چغتائی نے اپنے زعفران زار کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو اپنانا نہ شروع کر دیا۔ اردو مزاح نگاری کی اب تک جو ترقی یافتہ صورت ہمارے پیشِ نظر ہے اُس کی آبیاری میں چغتائی اولین رہنماؤں میں سب سے ممتاز درجہ رکھتا ہے کیونکہ اس کی تخلیقات کی ترجمانی کا دائرہ وسیع تر ہے۔

پنجاب میں چغتائی سب سے پہلے اپنے ایک مضمون "انگوٹھی کی مصیبت" کے ساتھ نمودار ہوا (یہ مضمون بعد کو جا کر اس کی کتاب شریر بیوی کا ایک باب ٹھہرا) ــــ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف افسانہ نگاری میں ایک ایسی شگفتگی نظر آنے لگی، جس کی تقلید مزاح نگاری میں ایک صحت مند اضافے کا باعث بنی۔

اچھے فن کاروں کی طرح چغتائی کی اپنی زندگی قریباً ہمیشہ کشمکشِ زیست اور ناسازیٔ طبع کی شکار رہی لیکن شاید وہ اپنی طبعی ہمت سے کام لیتے ہوئے گریز کے طور پر ہمیشہ ہنسی کی طرف ہی رجوع ہوا اور یوں نہ صرف خود کسی حد تک ہنستا رہا بلکہ اوروں کو بھی ہنساتا رہا۔ کیا معلوم اردو خواں طبقے کے کتنے افراد کے غم کا مداوا چغتائی کی تصانیف بنتی رہیں۔

لیکن صرف یہ ہنسنا ہنسانا ہی چغتائی کی زندگی کا کارنامہ نہیں ہے۔ معاشری لحاظ سے بھی وہ ایک مصلح اور جدید فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سلسلے میں پردے کے متعلق جو کتابیں اُس نے لکھیں وہ اُس کے شگفتہ اور صحت مندانہ نظر کی ترجمان ہیں۔

چغتائی کی مزاح نگاری ترجمانی کی وسعت کے لحاظ سے صرف بین الصوبجاتی اردو ہی کی مرہونِ نہیں بلکہ بعض دوسری دیسی زبانوں میں بھی اُس کے مضامین ترجموں کی صورت میں شائع ہوئے اور اس لحاظ سے ہندی چغتائی کے احسان کو کبھی نہ بھولے گی۔

چغتائی اپنی زندگی میں ناموافق حالات کے باوجود ہمیں ہنساتا رہا۔ اب ہم اُسے روتے ہیں!

یادِ فانی

چغتائی کے بعد ۲۷ اگست کے روز شوکت علی خاں فانی بدایونی بھی اُن سے جا ملے۔

فانی کے کلام میں موضوع کے انتخاب کا اشارہ اُس کے تخلص ہی میں موجود ہے، لیکن غزل گوئی میں جس یاس اور غم کی ترجمانی اُس نے کی۔ اُس میں ایک بلندی ہے، ایک ایسی ہی ازلی اور ابدی بلندی جو فنا کے عمل میں بھی محسوس ہوتی ہے۔

غالب کے بعد سنجیدہ غزل میں سب سے نمایاں فن کار فانی ہی نظر آتا تھا، اور غالب ہی کی طرح جہاں اُس کے کلام کی خوبیوں میں اُس کی ذہانت اور شخصیت کو بہت حد تک دخل تھا وہاں دنیا کے ذاتی تجربات ــــ تلخ حقائق نے بھی اس نشوونما میں معتد بہ حصہ لیا تھا۔ ایک فرق ہے کہ غالب کی قنوطیت میں بسا اوقات طنز کی تلخی شامل ہو جاتی تھی مگر فانی کی یاس پسندی ہمیشہ خالص یاس پسندی ہی رہی، شاید یہی وجہ تھی کہ حالی کے بعد کی اردو شاعری میں "میر و میرزا کا صحیح امتزاج اگر کہیں نظر آتا ہے تو وہ فانی ہی کا کلام ہے"، اُس میں یاس کی تلخی کے ساتھ ہی ساتھ نغمے کی شیرینی بھی ہے۔ اور اس پہلو سے شیلے کی کہاوت کہ ہمارے سب سے میٹھے گیت سب سے زیادہ دُکھ والے ہوتے ہیں فانی کی زندگی اور کلام پر پوری اترتی ہے۔

سنجیدگی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فانی اپنے کلام میں باقی رہے گا لیکن جذباتی کیفیت وداعِ فانی پر ہماری زبان کا ایک فقرہ دہراتے کو کہتی ہے۔ ــــ "اردو کے ذریعے انہوں نے بہتوں کو رُلایا، اردو اُن کو جتنا بھی روئے کم ہے" ــــ اللہ بس!

بزم ادب

(۱)

حصۂ نثر کی رنگا رنگی اس دفعہ زندگی کے تنوع سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ افسانوں میں خصوصاً آپ معمول سے زیادہ اختلاف مناظر پائیں گے۔ ایک طرف اختر انصاری اپنی نکھری ہوئی، کھلی کھلی زبان میں ایک بھولا بسرا واقعہ بیان کر رہے ہیں ایک خام ذہن کی نفسیات کا خوب جائزہ لیا ہے۔ اور ان تاثرات کو ایک ایسے پلاٹ کے تانے بانے میں سمویا ہے جو کافی حد تک انگریزی کی گھوسٹ سٹوری (روحوں کے افسانے) کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ روحانی کی اُس مقبول ؛ عام اور زندگی کی دوسری دعاوی کا تضاد ایک ایسا زاویہ ہے جو ایک ہلکی پھلکی چیز میں سنجیدگی کی گہرائی پیدا کر دیتا ہے ——— معلوم نہیں یہ واقعہ جگ بیتی ہے کہ آپ بیتی ——— لیکن

ممتاز مفتی شاید جگ بیتی کو آپ بیتی کے دلکش ملبوس میں ظاہر کرتا ہے یہاں خام ذہن کی نفسیات کو دخل نہیں، بڑوں کی باتیں ہیں، اور ان بڑوں میں ایک دو کردار تو چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، خان صاحب اور بجنوری ملازم ننھے کے علاوہ "انار" کا کردار بھی اگرچہ بظاہر خاموش سا ہے لیکن اصلاً بولتا ہوا ——— اور پھر معاشری لحاظ سے جگہ جگہ جو طنز موجود ہے وہ سیدھی سادی کہانی کے لطف میں پیچ پیدا کرتے تھے۔ ئے لطف کو دوبالا کر رہی ہے ——— اور اس لطف میں کہانی کا پس منظر بھی تمام نقوش سے ہم آہنگ ہے بلکہ ان کو روشن کرتا ہے۔

شبیر حسین رضوی کا مرکز "طیارچی" ہے ——— موجودہ جنگ نے طیارے اور طیارچی کو ہماری زندگی میں نمایاں کر دیا ہے، لیکن غالباً یہ پہلا افسانہ براہ راست اس موضوع سے متعلق ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے حسب معمول پلاٹ کے پیچ اور مکالمے کی شگفتگی کو برقرار رکھا ہے۔

یہ تو تھے خالص مختصر افسانے۔ مگر شیر محمد اختر مختصر افسانے کی اُس خاص صنف کو پیش کر رہا ہے، جو بیک وقت افسانہ بھی ہوتی ہے اور انشائے لطیف بھی، چنانچہ "افسانے کا پلاٹ" جہاں ایک کہانی کی طرح واقعات کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے وہاں ایک مضمون کی طرح خیالات اور تاثرات کا حامل بھی ہے۔ اس انداز کی چیزیں ابھی اردو میں کم ہی لکھی گئی ہیں لیکن ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ہمارے افسانہ نگار خود بخود اس طرف مائل ہو رہے ہیں اور کہانی کو محض دل بہلاوے سے ہٹا کر فکر انگیزی کی طرف لا رہے ہیں۔

افسانوں کی بات ختم ہوئی۔ اب مضامین کو لیجئے۔

سنجیدہ فرضی خطوط کا ادب دوسری زندہ زبانوں میں وافر طور پر موجود ہے۔ اردو میں ابھی اس کی کمی ہے۔ لیکن اس کمی کو ڈاکٹر باقر پنجاب کے مختلف رسائل میں پورا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر باقر کے یہ خطوط سیاسیات، اقتصادیات معاشیات وغیرہ مختلف علوم سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن انداز بیان شگفتہ اور ہلکا پھلکا، جس میں جگہ جگہ ان کی طنز نگاری سوچنے والے دماغوں کو نہ صرف متحرک کر دیتی ہے بلکہ چٹ پٹا بھی بنا دیتی ہے۔ اور اس پر ان کی ادبی چاشنی ایک اضافہ ہے ——— یہ مضمون حال سے تعلق رکھتا ہے بلکہ مستقبل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لیکن

دیوندر ستیارتھی ہمیں اپنے "دیس دیس کے گیتوں" سے ایک ایسے دُور کے ماضی میں لے جاتا ہے۔ جو محض تاریخی لحاظ سے ماضی ہے احساسات اور تجربات کے لحاظ سے اس کی حیثیت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے، اور پھر حیوانِ مطلق کی باتوں کا انطباق جس سادگی سے حیوانِ ناطق پر کیا گیا ہے، وہ بھی قابلِ غور ہے۔

ستیارتھی کا یہ بین العلوماتی مضمون اس کے تازہ مجموعے "میں ہوں خانہ بدوش" میں بھی شامل ہے، جہاں اسی طرح کے اور مضامین بھی دل و دماغ کی ضیافت کو موجود ہیں۔

(۲)

زیر نظر شمارے میں جگن ناتھ آزاد کا ایک شعر ہے ؎

ابھی آغاز ہی اک طرفہ معمّا ہے مجھے منکشف مجھ پہ ہو کیونکر مرا انجام ہنوز

اس شعر میں ضمیر "مجھے" کا مرجع اردو شاعری بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کے ارتقائی منازل میں بہت سی باتوں پر اس شعر کو چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ اردو شاعری کے راہ بہ راہ بڑھتے ہوئے قدم اس کے مفہوم سے ہم آہنگ ہیں البتہ ہمارے موجودہ خصوصاً نوجوان شعرا کا کلام صرف تنگ نظر اور عیب بین لوگوں ہی کے لئے ایک "طرفہ معمّہ ہے" جن کے پیروں تلے کوئی زمین نہیں ہوتی

جمے ہوئے قدموں والے اس اُفق کو اُس انجام کو صاف طور پر نہ سہی ایک دھندلکے میں ضرور دیکھ رہے ہیں۔ جو مستقبل کی تاریخ ادبِ اُردو آئندہ نسلوں پر منکشف کرے گی۔ گذشتہ شمارے کی بعض نظموں پر ایک ایسے کُند ذہن نے کچھ غیر مدلل اعتراضات کئے ہیں جس کے بارے میں گئے سے گئے ہینے حصۂ نظم کی بزمِ ادب میں وضاحت کی گئی تھی۔ ادب و شعر صرف فنی نقطۂ نظر ہی سے قابلِ اعتراض ہو سکتے ہیں۔ خیال پر کوئی روک نہیں لگائی جا سکتی۔ اور اس سلسلے میں اجنبیت جرم نہیں بلکہ واقعہ کہی جا سکتی ہے۔ جس کی اہمیت اگر سمجھ میں نہ آئی ہو تو اجنبیت کو دور کرنے کی کم سے کم کوشش کی جا سکتی ہے مگر ظاہر ہے کہ کوشش کے لئے شکتی کی ضرورت ہے اور شکتی بازار میں نہیں بکتی۔ اس لئے آئیے جب تک ہمیں شکتی ہے ہم زندگی کی ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

شاعر ہر ملک کے گیت گانے والے ہیں۔ ماہر القادری پپیہے سے من کی باتوں کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے۔ لیکن اُس کے گیت میں پپیہے کے کردار کی موجودگی نے ایک تخصیص پیدا کر دی ہے، ایک حد بندی ہے۔ اس کے مقابل میں قیوم نظر کے گیت کی حیثیت اگرچہ داخلی کی نسبت خارجی زیادہ ہے۔ پھر بھی اُس میں تصورات کا پھیلاؤ آخری مصرعے تک پہنچنے پر ایک مرکز سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ ع "جھوٹے ہیں سب سپنے جھوٹے"۔ یہی مصرعہ ایک خارجی چیز کو داخلی بنا دیتا ہے۔ فنی لحاظ سے گیت کی موسیقی ہیئت کی پابندی کے باوجود متنوع ہے

رفعت ہاشمی کی نظم "گاؤں کی رات" میں عنوان کے تصور کے پھیلاؤ کے باوجود ایک حد بندی ہے۔

داسی اور دیوداسی میں شاعر نے اپنے آپ کو ایک انوکھے نسائی پردے میں چھپا دیا ہے۔ یہ پردہ اس لئے اور بھی گہرا ہے کہ نظم کا ماحول دُور کے ماضی سے متعلق ہے۔ بحر کا ٹھہراؤ اور الفاظ اور محارات کی تراش مندر کے ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ لیکن الفاظ کے پردوں کے پار نازو نیاز کا جو گداز موجود ہے اس کا اظہار نظم کو دوبارہ پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے ـــــ ایک بات اور، دوسرے بند کی زمین اس نظم کو غزل بناتی بناتی رہ گئی۔

جس حلقہ بندگی کی وضاحت مختار صدیقی نے اپنے رجحان کے مطابق کی ہے اُسی کا ایک اور ترجمان اختر الایمان ہے۔ "داسی اور دیوداسی" کا شاعر اظہارِ نفس کے لئے ایک نسائی پیکر کا مرہون ہے لیکن اختر الایمان جسم سے ہٹ کر صرف ایک "نقشِ پا" سے تحریک لیتا ہے۔ "یہ نیم خواب گھاس پر اداس اداس نقشِ پا" ـــــ یہ مصرعہ جہاں مفہوم کے لحاظ سے تصور کو روشن کر دیتا ہے وہاں ترجمانی کے نقطۂ نظر سے الفاظ کی آوازکے لحاظ سے بھی قابلِ غور ہے۔

یہ نظم خالص شاعری کی ذیل میں آتی ہے، خیال کا محرک صرف نقشِ پا ہے لیکن اس کو دیکھتے ہوئے شاعر کا ذہن جس لمبے رستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اسی کا سفر ہمارے لئے بھی خیال انگیز ہے۔

لیکن عدم ایک اور ہی رستے پر چل رہا ہے۔ یہ رستہ حقایق سے لبریز ہے، اور بہت سے نوجوانوں کی آپ بیتی۔

روشن دین تنویر کی دو نظمیں آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔ "پھولوں کی وادی" آپ بیتی ہے۔ اور "ملاح کی لاش" جگ بیتی۔ "پھول ہی پھول ہیں اس وادی میں، پھول ہی پھول ہیں تاحدِ نظر، پھول ہی پھول ہوں اس وادی میں"۔ ان مصرعوں میں الفاظ کا تواتر منظر کے علاوہ شاعر کی ذہنی کیفیت کا بھی ترجمان ہے۔ فن کار نے ایک پیچ کے ذریعے سے اپنے ماضی کے بھوت کو جو ایک غیر مرئی چیز ہے۔ پھولوں کی وادی کی صورت دے دی ہے۔ جو بظاہر ایک مرئی تصویر بن جاتی ہے۔ بیانیہ خصوصیت کے باوجود یہ نظم صرف ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایک سرسراتی ہوئی پھیلتی ہوئی سی کیفیت جس سے شاعر کو اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے، ایک بیتے ہوئے اچھے دنوں کی یاد جو ایک بھوت بن کر اُس کی موجودہ الم ناک زندگی میں کبھی کبھی یوں کہئے کہ اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ "یہ تو ہے بھوت میرے ماضی کا، راستہ جس نے مرا روکا ہے" نظم کا یہ آخری شعر پہلے کے تمام شگفتہ تاثر میں ایک فکر انگیز سنجیدگی پیدا کر دیتا ہے۔

"ملاح کی لاش" میں ہم سے دُور کا منظر ہے۔ دھرتی کے کنارے کا منظر ہے، ساحل کا منظر ہے۔ لیکن سوچ آتی ہے کہ کیا یہ ملاح جس سے شاعر مخاطب ہے۔ اُس کی اپنی ہی ذات تو نہیں۔

تنویر کی یہ دونوں نظمیں جرمن شاعر ہائنے کی بعض نظموں کی طرح مافوق الفطرت کیفیات کے سطالعے ہیں۔

میراجی

آئینۂ عالم

ایران کا حسرت ناک انجام

ایران آج سے تیس چالیس سال پیشتر بالکل ان ہی حالات میں گرفتار تھا جن سے ترکی کو دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ان دونوں ممالک کو خدا نے دو ایسے رہنما دے دیئے جنھوں نے اپنی اولوالعزمی اور تن دہی سے اپنی قوم کو کم از کم اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ یہ دو رہنما اتاترک اور رضا شاہ پہلوی تھے۔ لیکن ان میں سے ایک نے اپنی توجہ صرف اپنی قوم کی معاشرتی اور تمدنی اصلاحات کی طرف رکھی اور فوجی طاقت بڑھانے کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے کہ وہ خواب جو اس نے ایران کے متعلق دیکھا تھا تشنۂ تکمیل رہا۔ اور اسے اپنی آنکھوں سے ان حالات کو دیکھنا پڑا جنہیں کوئی محبِ وطن نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن سیاسی لحاظ سے اپنی کارگزاریوں میں ناکامی کے باوجود رضا شاہ پہلوی کو ہم ایران کا مصطفےٰ کمال کہہ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی کہ دونوں کی زندگی کے ابتدائی حالات ایک دوسرے سے کافی مشابہت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ دونوں اپنے اپنے ملک میں اپنے مذہب کی عظمتِ رفتہ کی یاد زندہ کرنے کے لئے مصروف عمل تھے۔

رضا شاہ پہلوی قوم پرست ہیں۔ اور انھوں نے سارے ایران کو قوم پرستی کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اپنے خیالات پھیلانے کے لئے انھوں نے ایران میں قومی تحریک بھی شروع کی تھی جو بہت کامیاب ہوئی اور ان کے اقتدار کے قیام کا باعث بنی۔ ان کی خدمات کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ ایران کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ سنبھالتے تو آج ایران نے اتنی ترقی بھی نہ کی ہوتی جتنی کر چکا ہے۔ ایران کے شہروں میں زندگی کی وہ گہما گہمی نہ ہوتی جو نظر آرہی ہے۔ مصطفےٰ کمال کی طرح وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ ایران اگر بالکل مغربی رنگ میں نہیں تو کم از کم ظاہری طور پر رنگا جائے۔ جس کا ثبوت ایرانیوں کے لباس میں نمایاں تبدیلی ——— بے حجابی اور مغربی وضع کی عمارتوں سے مل سکتا ہے

رضا شاہ نے یہ اصلاحات رفتہ رفتہ نافذ کیں اس لیے ایران کی وہ حالت نہ ہوئی جس سے افغانستان کو سامنا کرنا پڑا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رضا شاہ تعلیم سے بالکل نابلد ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا دور حکومت ایران کے لئے بہترین دورِ حکومت ثابت ہوتا اگر موجودہ حالات رونما نہ ہوتے۔

آپ کا اصلی نام مرزا رضا خاں ہے۔ اور آپ علاقہ دماوند میں ایک غریب کسان کے ہاں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے لیکن تین سال کی عمر میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جس کے بعد آپ کی والدہ طہران آگئیں۔ اور جن مشکل حالات میں رضا خاں نے وہاں پرورش پائی وہ تعلیم کے حصول میں حائل رہے جوان ہو کر آپ فارسی کاسک فوجی دستے میں سپاہی بھرتی ہوئے۔ اس دستے کو جرأت و بہادری میں نمایاں مقام حاصل تھا اور اسے روسیوں نے تیار کیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں رضا شاہ فوج میں افسر بن گئے۔ اسی طرح ترقی کرتے کرتے آپ اس دستے کے جب اسے جنگ عظیم کے بعد مکمل ڈویژن بنا دیا گیا تو جرنیل ہوگئے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ نے طہران کی طرف پیش قدمی کی اور وزارت کا تختہ الٹ دیا۔ اور دوسری وزارت قائم کی جس میں وزارت جنگ اور سپہ سالاری کا عہدہ آپ نے خود اپنے لئے رکھا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں آپ وزیر اعظم بن گئے۔ ۱۹۲۴ء میں ملک میں جمہوری حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن فرقہ شیعہ کی مخالفت کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے لیکن عرصے کے بعد آپ نے شیعوں کو اپنا حامی بنا لیا۔ اور پارلیمنٹ سے مطالبہ کیا کہ ایران کے بادشاہ احمد شاہ کو جو اس وقت پیرس میں بغرض سیاحت مقیم تھے حکومت کے سامنے ذمہ دار نہ سمجھا جائے بلکہ ان کی ذات کو سمجھا جائے۔ پارلیمنٹ اس پر رضامند ہوگئی۔

سنہ ۱۹۲۵ء کے آخر میں آپ تخت ایران پر جلوہ افروز ہوئے اور پہلوی شاہ

بن گئے۔

۱۹۳۹ء میں آپ نے اپنے بیٹے کی شادی شاہ فاروق والی مصر کی ہمشیر شہزادی فوزیہ سے کی اور اس طرح ایران اور مصر کو محبت اور اخوت کے رشتے میں باندھا۔ ۱۹۳۷ء میں ایران کے قصر سعد آباد میں اسلامی طاقتوں کا معاہدۂ سعد آباد ہوا جس کے رو سے اسلامی ممالک کی تمدنی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کا پروگرام تیار کیا گیا تھا۔ واضح رہے یہ معاہدہ فوجی حیثیت نہیں رکھتا۔

ایران سولہ سترہ سال سے آپ کے ماتحت امن وامان اور خوش حالی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ حالات اس قدر پرسکون آ رہے تھے کہ ایسا گمان ہوتا تھا کہ یہ جنگ بھی ایران پر اثر انداز نہ ہوگی لیکن اچانک آج سے تین ماہ قبل رائٹر نے خبریں بھیجنا شروع کر دیں کہ ایران میں جرمن جاسوس حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں اور ان کی اس سازش میں بعض ایرانی زعما بھی شریک ہیں۔ ایران نے اس خبر کی تردید کر دی لیکن اس قسم کی اندیشہ ناک خبریں برابر آتی رہیں۔ ادھر برطانیہ نے ایران کو نوٹ بھیجا کہ وہ جرمنوں کی سازشوں سے اپنے ملک کو بچائے ورنہ نازی اسے بھی دیگر کمزور ممالک کی طرح اپنا غلام بنا لیں گے۔ یہ معلوم ہوتا ہے اس نوٹ کا جواب شاہ ایران نے سخت الفاظ میں دیا تھا جس کی وجہ سے برطانیہ اور روس نے ایران میں اپنی فوجیں داخل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور یک لخت ایران پر تین طرف سے حملہ کیا گیا۔ ایران میں اتنی طاقت نہ تھی کہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرتا۔ اس لئے روس اور برطانیہ کی فوجیں بہت جلد آگے بڑھتی گئیں۔ آخر ایران نے صلح کی پیشکش کی، پرانی وزارت تبدیل ہو گئی اور علی فروغی نے نئی وزارت بنا کر صلح کر لی لیکن جن شرائط پہ صلح ہوئی۔ ان میں بڑی بڑی شرائط یہ تھیں کہ ایران کے محوری باشندوں کو برطانیہ کے حوالے کر دیا جائے۔ ان کے قونصل خانے بند کر دیئے جائیں۔ اور برطانیہ کی فوجیں تیل کے بعض علاقوں میں مقیم رہیں اور جب حالات اجازت دیں تو فوجیں واپس بلالی جائیں۔ نیز ایران کا اندرونی انتظام ایرانی حکومت کے ہاتھ میں رہے۔

صلح کے ساتھ حالات پھر پرسکون ہو گئے۔ ہندوستان کے اخبارات نے اس واقعہ کے متعلق جو کچھ لکھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن مسلمانوں پر اس واقعہ کا بہت برا اثر ہوا۔ ابھی ایران کے معاہدۂ صلح کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ شاہ رضا شاہ پہلوی اپنے بیٹے کے حق میں دستبردار ہو کر اصفہان چلے گئے۔ ان کی دست برداری کے کیا وجوہ ہیں یہ شاید آئندہ واقعات سے معلوم ہو سکے لیکن جو کچھ رائٹر نے ہمیں بتایا اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی اپنے بادشاہ کے خلاف مدت سے بھرے بیٹھے تھے اور اسے تخت سے علٰحدہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ عوام میں ہر دلعزیز نہیں تھا۔ علاوہ ازیں وہ جرمنوں کا دوست تھا لہٰذا عوام نے بغاوت کی اور مطالبہ کیا کہ ملک میں آئینی حکومت قائم کی جائے۔ چونکہ بادشاہ کو یہ منظور نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنے بڑے بیٹے کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گئے۔ حیرت ہے کہ اگر رضا شاہ پہلوی عوام میں اس قدر غیر ہر دلعزیز تھے تو کیا وجہ ہے کہ رائٹر نے اس کی خبر آج سے چند سال پیشتر نہ بھیجی۔ کیا اس وقت طہران میں اس کا کوئی نمایندہ نہیں تھا جو حالات کا صحیح طور پر مطالعہ کر سکتا۔ اور اگر ایسی حالت تھی تو اس کے متعلق یہ سکوت چہ معنی دارد۔

آخر ایران کے غیر ہر دل عزیز بادشاہ تخت سے علٰحدہ ہو گئے۔ اور ان کے بجائے محمد رضا شاہ پور تخت نشین ہوئے۔ نئے بادشاہ کی عمر اس وقت صرف بائیس سال ہے۔ انھوں نے سوئزرلینڈ سے تعلیم پائی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ آئینی طور پر حکومت کریں گے۔

ایران کے متعلق تازہ ترین خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ ایرانی پارلیمنٹ سابق بادشاہ پر غداری کے جرم میں مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ خدا جانے اب آیندہ حالات کس طرح پلٹا کھائیں لیکن جس طرح ایران کی آزادی ختم ہوئی ہے اس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ اور پھر اس وقت میں جب کہ مسٹر چرچل اور صدر روزویلٹ اٹلانٹک کا اعلان کر چکے ہیں ـــــ!

تابش صدیقی

شعر

شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی
نہیں ہوتی سحر، نہیں ہوتی

(امراؤ جان ادا) مرزا رسوا

غزل

آرہے ہیں مجھے پیغام پہ پیغام ہنوز
پائے جاتا ہے دل انعام پہ انعام ہنوز

کون پوچھے ترے گلزار کا دستور ہے کیا
سب ہیں آزاد مگر میں ہوں تہِ دام ہنوز

ابھی آغاز ہی اک طرفہ معمّہ ہے مجھے
منکشف مجھ پہ ہو کیونکر مرا انجام ہنوز

بارہا جس کو ہوا سامنا نومیدی کا
مرے سینے میں وہی ہے ہوسِ خام ہنوز

اپنی قسمت ہی سے شکوہ ہے مجھے اے ساقی
ترے میخانے میں خالی ہے مرا جام ہنوز

ایک مدت سے ہے گو جلوہ ترا خواب و خیال
ہے مرا دیدۂ حیراں بہ لبِ بام ہنوز

عالمِ دل کے شب و روز تو ویران ہوئے
دیدۂ شوق میں پھرتے ہیں وہ ایام ہنوز

ایک ہی یاد شب و روز ہے دل میں بیتاب
ایک ہی نام ہے لب پر سحر و شام ہنوز

ذکرِ خلوت کدۂ دل میں ابھی تک ہے وہی
دل کی تسکین کا باعث ہے وہی نام ہنوز

راہ دشوار تو ہے آبلہ پائی کے سبب
شوق سے اُٹھتا ہے لیکن مرا ہر گام ہنوز

گرچہ آوارہ و سرگشتہ ہے مدت سے مگر
دلِ آزاد ہے مقصود میں ناکام ہنوز

جگن ناتھ آزاد

ایک گیت

پھر جاگے گُل بوٹے

سورج چمکا، چشمے پھوٹے
پھر جاگے گُل بوٹے
سوئی ہوئی تھی ندّی جاگی
جھرنا بھونرا مینا شاما
جاگے چمن کے پرانے راگی
اُن کے میت نہ اُن سے چھوٹے

پھر جاگے گُل بوٹے

پھر گذری شام آئی

اُجلے چاند نے لی انگڑائی
پھر گذری شام آئی
تیر چھپا ہے گھاؤ ہے گہرا
بیتے دِنوں کا سرکتا آنچل
بدلے ہوئے موسم کا لہرا
جھوٹے ہیں سب سپنے جھوٹے

پھر جاگے گُل بوٹے

قیّوم نظر

ہرنی

"آفائے مالسکلیم ستن ورجمنگات
ماں منیج ڈاگورِک یا ہی گرُد پرسادم
ادیا پی گھاس کول گرسنان بھگیو
من مارگ دی کتن پرستینومدی آ!"

ارے او شکاری! نتھنوں کے علاوہ میرے سارے جسم سے مانس لے کر مجھے چھوڑ دے۔ اتنا رحم کر۔ میرا بیٹا، جو ابھی گھاس نہیں کھاتا، میری راہ دیکھ رہا ہوگا!" ——— یوں ایک سنسکرت شاعر نے جس کا نام تاریخ کو یاد نہیں، کسی شکاری کے جال میں پھنسی ہوئی ایک ہرنی کی دردانگیز پکار اپنے ایک شلوک میں قلم بند کی تھی۔

مجھے یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ یہ گم نام شاعر، جس نے بظاہر ماں کے بنیادی پیار کا نمونہ پیش کیا تھا، اپنے وقت کے سماجی نظام سے غیر مطمئن ہو چکا تھا۔ یہ ہرنی کون تھی؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہرنی کے روپ میں اُس نے اپنے وقت کی غریب مخلوق کو پیش کیا تھا۔ بھوکے بیٹے کا واسطہ دے کر ہرنی نے شکاری کے دل میں رحم کے جذبے کو ابھارنا چاہا تھا۔ یقیناً شکاری نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا ہوگا جو بے درد سرمایہ دار اکثر صدیوں سے روا رکھتا آیا ہے۔

خصوصاً اس زمانے میں جبکہ ادب زندگی کی حقیقتوں سے پرے جا رہا تھا، جبکہ ادیب عوام میں مل جُل کر نہیں بلکہ اُن سے الگ تھلگ کسی سردار یا راجہ کی سرپرستی میں زندگی بسر کرتا تھا، جبکہ عوام کی بھوک، بڑھتی ہوئی غریبی اور صدیوں کی غلامی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے وہ اپنے سرپرست کی طبیعت بہلانے تک ہی اپنی تحریر کا حلقہ سمجھتا تھا، ہرنی کی یہ پکار سُنی ان سُنی کر دی گئی ہوگی۔

شاعری کی زبان جذباتی فضا میں جنم لیتی ہے۔ لفظوں میں ایک قسم کا ناچ سا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کسی لفظ کا ذاتی مطلب دب جائے اور وہ شاعر کے وجدانی ماحول میں ایک نیا ہی مطلب پا لے۔ اِس گمنام سنسکرت شاعر کا یہ شلوک سادگی اور خلوص کا ترجمان ہے۔ اور اس سادہ لباس میں اُس نے اپنے جذبے کی حرکت، بے چینی اور کسک کو ہم تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا ہے۔

ہمارے دیہاتی گیتوں میں ہرنی کی پکار نہ جانے کتنی صدیوں سے گونج رہی ہے۔ گاؤں کو ایسی بستی نہ جانئے۔ جہاں ایک سی عورتیں اور ایک سے مرد کسی نہ کسی طرح جلتی جلتی زندگی کے دن کاٹ کر چلتے بنتے ہیں۔ مصیبت میں سارا گاؤں مل کر روتا ہے، مل کر کروٹ بدلتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بھوک اور غریبی ہٹ جائے اور کھوئی ہوئی آزادی پھر نصیب ہو۔ اِن تحریکی لمحوں میں ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے جس کے مطابق صرف قسمت پر شاکر رہنے کا مسئلہ پھیکا پڑنے لگتا ہے اور یہ خیال بھی کہ امیری اور غریبی کی حدیں ہمیشہ یوں ہی بنی رہیں گی مِٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

پہلے ایک بنگالی گیت سنئے:۔

"ہرینی گھاس کھائے
شکاری تماشا پائے
آچمبی نے ماری لو شیلر گھا
تو کھون ہرینی بولے رے ———
کی شیل ماری لی بھائی تیرانداز رے!"

——— ہرنی گھاس چر رہی ہے۔ شکاری نشانہ باندھ رہا ہے۔ اچانک (اُس نے تیکھے تیر سے ہرنی کو) گھائل کر دیا۔ تب ہرنی کہتی ہے ——— کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے، او بھائی تیرانداز!

"تو نیر ہرینی آمی
کارو دھارنا ہیں واری
رکت مانس آمار جگو تیر ویری رے

کی شیل ماری ملی بھائی تیرانداز رے"!

"میں جنگل کی ہرنی ہوں کسی سے کچھ اُدھار نہیں لیتی۔ میرا لہو اور ماس دنیا کا دشمن د ہو گیا) ہے کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تونے، او بھائی تیرانداز!

"تور جلار جول نہ کھائی

تور بلیر گھاس نہ کھائی

بنادوشے بدھیل آمار پران رے

کی شیل ماری ملی بھائی تیرانداز رے"!

"تیرے تالاب کا پانی پیا ہے نہ تیرے کھیت میں گھاس چرنے گئی ہوں۔ بغیر قصور ہی میری جان لے لی ہے! کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تونے، او بھائی تیرانداز!"

"نہ کھاؤ آئی لام چھاؤ آسے دودھ

نہ دیکھی لام تار چند ر مُوکھ

نہ کہی لام سینہد سیر کتھا رے

کی شیل ماری لی بھائی تیرانداز رے"!

"نہ رجی بھر کر دودھ پلایا اپنے بچے کو، نہ رجی بھر دیکھ پائی اُس کا چاند سا مکھڑا۔ نہ رجی بھر اُس سے پیار کی باتیں کر پائی۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تونے، او بھائی تیرانداز!

"مری تاتے دُوکھ نائیں

کنتُو رے شکاری بھائی

اُوپرے دیتار کاچھے کی دیبے جواب رے؟

کی شیل ماری لی بھائی تیرانداز رے"!

"میں مر رہی ہوں، اس کا مجھے دکھ نہیں لیکن او شکاری بھائی! اوپر دیوتاؤں کے دربار میں کیا جواب دے گا! کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تونے او بھائی تیرانداز!

"جو کھون شِشو مور کھدائے سجلے

گاندی بے ماں ماں بلے

تار ڈاک دیوتار بُوکے شیچیرہ باجی بے رے

کی شیل ماری لی بھائی تیرانداز رے"!

"جب میرا بچہ بھوک سے تڑپ اُٹھے گا۔ "ماں! ماں!!" کہہ کر روئے گا۔ اُس کی پکار دیوتاؤں کے دلوں میں گونج اٹھے گی۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تونے، او بھائی تیرانداز!

"شنگیر شنگی را بھائی!

کولی اوہر بینار کھائیں

دُو دہیر شِشو را کمی تے جتنے رے!

کی شیل ماری لی بھائی تیرانداز رے"!

"او میرے ساتھیو اور بھائیو! دیکھ کر ہرن سے کہنا کہ وہ دودھ پیتے بچے کو جتن سے پالے پوسے۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تونے او بھائی تیرانداز!"

"جنمیر منو دیکھا شنا

بلو تارے آر ہو بے نا

پھرائی لو شکل شادھ رے شکاری بانے رے

کی شیل ماری لی بھائی تیرانداز رے"!

"جنم بھر درشن اور بات چیت اب پھر نہ ہو گی۔ اُسے بتا دینا اب، خاتمہ ہوا سب اُمنگوں کا کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تونے او بھائی تیرانداز!

"کون نہ کلا رے رے

اے شیل گڑلی لو رے؟

تار بنش ہوک ہر بنش رے

کی شیل ماری لی بھائی تیرانداز رے"!

"کس لوہار نے بنایا تھا یہ تیر؟ اس کا خاندان بغیر اولاد کے ہی مٹ جائے۔ کیسے تیکھے تیر سے تونے مجھے گھائل کر دیا ہے، او بھائی تیرانداز!"[1]

مجھے یہ گیت بہت پسند ہے۔ کسانوں کی زندہ اور روشن شاعری کا، جو ہندوستان کے ہر صوبے میں صدیوں سے گونج رہی ہے۔ یہ ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ ہرنی کے بول بہت جچے تلے ہیں، شکاری، جو اُسے گھائل کر دیتا ہے، کچھ جواب نہیں دیتا۔ ہرنی اسے طنزاً او بھائی تیرانداز! کہکر شرمندہ کرتی چلی گئی ہے۔ ہرنی کی زبان نہیں بولتی، دل بولتا ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ تیر بنانے والا لوہار کچھ کم ظلم نہیں کرتا۔ گیت کے آخری بند میں ہرنی اپنا سارا غصہ اُسی پر نکالتی ہے۔

صحیح بات تو یہ ہے کہ ہرنی کی پکار میں عوام کی آپ بیتی گونج اُٹھی ہے۔

---

[1] ۱۹۳۹ء میں درگا داس لاہڑی نے بانگالیر کان ڈ بنگالی گیت، نام کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک باب ہے "پرکنتر کو رگان" (راجپوت جھنگ کے گیت) اسی میں اس گیت کو جگہ دی گئی۔ یہ گیت ترپورا سے ملا تھا۔

مجھے یاد ہے ایک کسان نے کہا تھا "میری بیٹا گھائل ہرنی کی چیتا ہے اور جب تک ہم کسانوں کا ماس ہرنی کے ماس کی طرح لذیذ رہے گا، زمیندار بابو ہم پر تیر چلانے سے باز نہیں آئے گا۔"

دوسرا گیت "اُراؤں" لوگوں کا ہے جو چھوٹا ناگ پور میں آباد ہیں۔

۱۔ "ایکا ترتی ہرنی رچا!
ملنخامرلی نوں راہچا۔'
پورب ترتی ہرنی رچا
ملنخامرلی نوں راہچا۔

۲۔ ایکا ترتی سکاریس رچس!
ہرنی تیرفی توچس
پچھم ترتی سکاریس رچس
ہرنی تیرتی توچس۔

۳۔ سکاریس گالوچس
ہرنی ہی پونچھریں توچس
ہرنی کا بونگا کیرا
ہائے ادین ابٹونداکھ منجا۔"

(۱) کس طرف سے ہرنی آئی! وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے، پورب کی طرف سے ہرنی آئی۔ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔ (۲) کس طرف سے شکاری آیا! اُس نے ہرنی کے تیر مارا، پچھم کی طرف سے شکاری آیا اس نے ہرنی کے تیر مارا (۳) شکاری نے ہرنی کی دُم پر تیر مارا۔ ہرنی بھاگ گئی۔ ہائے! اُسے کتنا دکھ ہوا۔"

یہ گیت "کرما" ناچ کا ہے۔ ہر ایک بند کی دوسری اور چوتھی سطر دوبار گائی جاتی ہے۔ انتہا درجے کی خوشی میں اُراؤں لڑکے اور لڑکیاں اپنے قومی ناچ میں شریک ہوتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ اُن کے سب کے سب کرما گیت خوشی کے ترجمان ہوں۔ کتنے ہی گیت ایسے ہیں، جیساکہ اس گیت میں بھی ہے، وہ اپنی مصیبتوں کے سیدھے سادے مگر تاثیر میں ڈوبے ہوئے جذبات بیان کرتے ہیں جن پر اُن کے اپنے لہو کے داغ دیکھے جاسکتے ہیں۔

تیسرا گیت راجپوتانے سے ملا ہے۔

"مرگے بنا مرگی ایکلڑی!
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ ماہیں مرگی نے ایکلڑی۔
مرگے نے ڈھونڈن مرگی نیسری
ڈھونڈیو ڈھونڈیو بن کھنڈ چھان
مرگے بنا مرگی ایکلڑی
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ ماہیں مرگی نے ایکلڑی!"

ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو تنہا چھوڑ گیا۔ ہرنی ہرن کی تلاش میں نکلی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے جنگل چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا!

"کہیں نہ لادھیو ظلمی مرگو
ڈھونڈیا ڈھونڈیا ران کھان
مرگے بنا مرگی ایکلڑی
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ ماہیں مرگی نے ایکلڑی"

کہیں نہ ملا وہ ظالم ہرن۔ بار بار اُس نے وہ جنگل بیابان چھان مارا ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا!

"ڈھونڈت ڈھونڈت مرگی تھک گئی۔
ب کے آنکھیاں آنسو جان،
مرگے بنا مرگی ایکلڑی۔
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ ماہیں مرگی نے ایکلڑی"

ڈھونڈتی ڈھونڈتی ہرنی تھک گئی۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا!

"کھائے تر دالو مرگی ڈھے پڑی
کوئی یو دکھ سہیو نہ جائے۔
مرگے بنا مرگی ایکلڑی
مرگو چھوڑ گیو بن کھنڈ ماہیں مرگی نے ایکلڑی"

چکر کھا کر ہرنی گر پڑی یہ دکھ برداشت نہیں ہوتا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا۔

کون جانے ہرن کہاں چلا گیا تھا؟ ضرور اُسے کسی شکاری نے مار ڈالا ہو گا۔ شروع سے اخیر تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہرنی دراصل کوئی گاؤں کی عورت ہے۔

چوتھا گیت پنجاب کا ہے ——

"نہ ماریں میرے ہرن نوں ساڈی شُتی ہو جاؤ ڈار۔
ماروے راجیا ہرنیاں بھاویں ہک دو بھاویں چار"

میرے ہرن کو نہ مارنا۔ ہماری قطار سونی ہو جائے گی۔ اے راجہ! ہم

برہمنوں کو مار لے، ایک دو چاہے چاہو۔

یہ گیت نامکمل ہے۔ یہ ہرنیاں راجپوتانے کی "ہرنی" کی بہنیں ہی تو ہیں۔ یہ گیت مصیبت زدہ لوگوں کے آنسوؤں سے پیدا ہوتے ہیں اِن میں ایک ایسی ہی قسم کا سوز ہے جس کا تعلق دل سے ہے اور جو ساری فضا میں سما جاتا ہے۔

پانچواں گیت بندھیل کھنڈ (وسط ہند) کا ہے۔

"موئے مارلے جاؤ ہمارے ہرنے جن مارو!
ہم ہیں پیا کے کھیت ہمارے ہرنے جن مارو!
کون دِس کے ہو گئے سِکاری، کون دِس کے ہو گئے بہیلیا؟
کون دِس کو جاؤ ہمارے ہرنے جن مارو!
اگم دِسا کے ہیں گے سکاری پچھم دِسا کے ہیں گے بہیلیا،
پورب دِسا کو جائیں ہمارے ہرنے جن مارو!
کاہے کی ڈوری کاہے کی تانتیں؟
کاہے کی ڈوری لگاؤ ہمارے ہرنے جن مارو!
لوہے کی کھنٹیاں تانت کی تانتیں۔
ریشم کی ڈوری لگائیں، ہمارے ہرنے جن مارو!"

مجھے مار لے جاؤ۔ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ ہم تو اپنے پیا کے کھیت میں چرتے ہیں۔ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ کس سمت کے شکاری ہو؟ کس سمت کے بہیلیے ہو؟ کس سمت کو جا رہے ہو؟ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ آگے کی سمت کے شکاری ہو، پچھم کے بہیلیا ہو۔ پورب کی طرف جا رہے ہو۔ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ کس چیز کی کھونٹیاں ہیں؟ کس چیز کی تانتیں ہیں؟ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ لوہے کی کھونٹیاں ہیں آنت کی تانتیں ہیں۔ ہمارے ہرن کو مت مارو۔

چھٹا گیت بھی بندھیل کھنڈ کا ہے۔

"ارے پاہر دی! مان لے میری بات
پاہردی! مان لے میری بات
جب ہیں پاہردی پھانسی روپی
چونسٹھ کھنٹیاں گاڑیں
ہرنی کو دیتل بھی ٹھاڑی
ہرن کو بیدھو پاؤں
رام جی! ہرن کو بیدھو پاؤں!"

"ارے شکاری! میری بات مان لے۔ شکاری میری بات مان لے جب شکاری نے پھندا لگایا (اُسی نے) چونسٹھ کھونٹیاں گاڑیں، ہے رام! چونسٹھ کھونٹیاں گاڑیں ہرنی کو دکر ایک طرف کو جا کھڑی ہوئی۔ ہرن کا پاؤں پھنس گیا او بھگوان! ہرن کا پاؤں پھنس گیا۔

ٹھاڑی ہرنیا جو سمجھا رئی ——
سنو پاہردی بات
موئے مار پیرو پیا کے چھوڑ دے
ہوئیں نہ چونسٹھ رانڈ
پاہردی! ہوئیں نہ چونسٹھ رانڈ!

ہرنی کھڑی ہوئی یہ سمجھا رہی ہے —— او شکاری! میری بات سُن۔ مجھے مار ڈال۔ میرے پیا کو چھوڑ دے تاکہ ہم چونسٹھ (ہرنیاں) رانڈ ہونے سے بچ جائیں۔ او شکاری! چونسٹھ (ہرنیاں) رانڈ ہونے سے بچ جائیں۔

"ٹھاڑی ہرنیا آنسو ڈھارے ——
سُن ہرنا موری بات
تم تو بیدھے جا پھندا ہیں۔
میرو کون حال؟
ہرنا! میرو کون حال؟"

ہرنی کھڑی ہوئی آنسو گرا رہی ہے —— او ہرن! میری بات سن تُو تو اس پھندے میں پھنس گیا۔ میرا کیا حال ہوگا؟ او ہرن! میرا کیا حال ہوگا!

ٹھاڑو ہرنا جو سمجھا رہو
سُنو ہرنیا بات ——
باکے گھر کو خرچ بڑھا تو
بیچ کھان دے ماس
ہرنیا! بیچ کھان دے ماس!"

ہرن کھڑا ہوا یہ سمجھا رہا ہے۔ ہرنی! میری بات سُن، اُس کے گھر کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ اُسے میرا مانس بیچ کر گزارا کر لینے دے ہرنی! اُسے میرا مانس بیچ کر گزارا کر لینے دے!

"اِتنی سُن کے چلے پاہردی
پھانسی ڈاری کاٹ
ٹھاڑی ہرنیا آنسو ڈھارے ——

۱؎ چڑیمار یا شکاری

جوڑی ملانی بھگوان

پابرری! جوڑی ملانی بھگوان!

یہ اتنی بات سن کر شکاری آگے بڑھا اس نے پھندا کاٹ ڈالا۔ ہرنی آنسو گرا رہی ہے۔ (کہتی ہے)، بھگوان نے (پھر سے) جوڑی ملا دی۔ شکاری! پھر سے جوڑی ملا دی!

یہ وہ گیت ہیں جن میں عہدِ ماضی کی تصویریں محفوظ ہیں۔ ماضی بھی ایک آئینہ ہے جس میں ہم انسانی سیرت کی ارتقائی حالتوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس کے بغیر یہ فیصلہ کرنا کہ ہم اب تک کہاں پہنچے ہیں، ممکن نہیں۔

جنہوں نے بُدھ مت کی "جاتک" کہانیوں کا مطالعہ کیا ہے انہیں "سون مگ جاتک"[1] کی یاد آگئی ہوگی جس کی کہانی بتلاتی ہے کہ ایک بار کسی پچھلے جنم میں مہاتما بدھ ایک سنہرے ہرن کے روپ میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک دن کسی شکاری نے جال لگایا۔ باقی سب ہرنیاں اور ہرن بھاگ کھڑے ہوئے مگر ٹولی کا سردار یعنی وہ سنہرا ہرن خود جال میں پھنس گیا ——— اس کی رفیقۂ حیات دوڑی ہوئی آئی۔ بولی "تیرے بغیر اب میں کیسے زندگی کے دن گزاروں گی!" ہرن بولا "میں بہت زور لگا چکا کر پھندے سے چھوٹ جاؤں مگر تانت میرے پاؤں میں دھنستی چلی جا رہی ہے"۔ ہرنی کہنے لگی "فکر نہ کرو میں تمہیں بچا لوں گی"۔ پھر جب شکاری نزدیک آتا دکھائی دیا، وہ بولی "شکاری! مجھے تم خوشی سے مار ڈالو لیکن میرے سنہرے ہرن کو چھوڑ دو . . . یا دھرتی پر پتوں کا بستر بچھا دو جس پر ہم گر پڑیں۔ میان سے تلوار نکال کر پہلے میری گردن کاٹ لو، پھر میرے خاوند کی!" شکاری چکر میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا آدمی بھی یوں اپنے آقا کے لئے جان دینے سے کتراتا ہے . . . . اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ ہرنی انسان کی زبان بول رہی ہے۔ شکاری نے ہرن کو آزاد کر دیا ہرن نے خوش ہو کر اُسے ایک لعل دیا جو کہ اُسے چراگاہ میں پڑا ہوا ملا تھا۔ اور جیسے اُس نے اپنے گھر میں پھنسا رکھا تھا اس نے شکاری کو یہ تلقین کی کہ وہ اس سے اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرے اور شکار کا پیشہ چھوڑ دے۔

ممکن ہے "جاتک" کہانی کی پیروی میں ہی بندھیلکھنڈ کے کسانوں نے اپنے ان دونوں گیتوں کی تخلیق کی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود جاتک کہانی نے دیہاتی گیتوں کی پیروی کی ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ بندھیلکھنڈ ی گیتوں کی زبان بہت پرانی معلوم نہیں ہوتی۔ گیتوں کے جذبات ان کی زبان سے کہیں زیادہ پرانے ہوتے ہیں۔ کیونکہ وقت کے ساتھ پرانے گیتوں کی زبان بدلتی رہتی ہے۔ جاتک کہانیوں کے متعلق بعض عالم یہاں خیال کرتے ہیں کہ وہ شروع میں عام دیہاتی کہانیاں تھیں اور گیتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو ان کہانیوں میں پروئے ہوئے ہیں۔ دیہاتی گیتوں سے لئے گئے تھے۔

ساتواں گیت کونڈھ لوگوں کا ہے جو کہ گنسورا وے گری (مدراس پریزیڈنسی) میں آباد ہیں ———

"ایڑا اینوں گوڑی ویدی گنا، او پلا مبا گشاتی!
او پلا مبا گشاتی، او پلا مبا گشاتی!
آلو گوسا تانگی ڈیگاتائیں، او پلا مبا گشاتی!
گاڑیگی سولاتی ای، او پلا مبا گشاتی!
ایڑا اینوں گوڑی ویدی گنا، او پلا مبا گشاتی!"

شکاری! تم مجھ پر تیر چلاؤ گے! شکاری، او شکاری! جنگل میں دوڑتی ہوئی شکاری، میں گھاس چرا کروں گی، ارے او شکاری! شکاری، کیا تم مجھ پر تیر چلاؤ گے!

آتو نائیں میڈا آنا نائیں ای نے اونے ترے ای ماں!
ایڑا اینوں گوڑی ودی ودی گنا او پلا مبا گشاتی!
آنوں ٹاریڑا تانی کوری، او پلا مبا گشاتی!
اینوں نال گی تنجادی گنا او پلا مبا گشاتی!"

اپنے بچے کو ساتھ لئے اِدھر اُدھر گھوموں گی۔ شکاری! تو مجھ پر تیر چلائے گا؟ مجھ ہرنی پر تیر چلائے گا، ارے او شکاری! مجھے تیر سے مار ڈالے گا، او شکاری! میں دھرتی پر سو جاؤں گی، او شکاری! مجھے کھا جائے گا کیا، ارے او شکاری!

جذبات و احساسات کی کہانی، جو لوگوں کے نسل در نسل چلے آنے والے گیتوں میں پائی جاتی ہے، سطحی امتیاز سے بہت کم متاثر ہوتی ہے زبانیں الگ الگ ہیں۔ بات کہنے کا ڈھنگ بھی مختلف ہے مگر الگ الگ علاقوں کی ذہنی یگانگت صاف ظاہر ہے۔ مصیبت کی ماری کونڈھ عورت بھی خود کو اُس ہرنی سے تشبیہہ دیتی ہے جو بے قصور ہی شکاری کے تیر سے گھائل ہو کر ہمیشہ کی نیند سو جاتی ہے اور اس کے بعد شکاری اُس کے جسم کا ماس خود کھائے یا کسی کو کھلائے اِس سے ہرنی کی موت میں کچھ فرق نہیں پڑتا، ماں، موت سے پہلے ہرنی کے دل میں یوں سوالات کا اُٹھنا اس کی پیدائشی [illegible]

آٹھواں گیت یوپی کے دیہات میں گایا جاتا ہے۔

[1] دیکھئے "سون مگ جاتک" مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس کی شائع کردہ The Jataka کتاب ۵ نمبرہ ۳۹۱ میں سے کی پروفیسر ای۔ بی۔ کیول نے یہ کہانیاں بڑی محنت سے مرتب کی ہیں۔

۱۔ چھاپک پیڑ گھنا لیا
تو پت من گہ ہر
ارے راما تیہی تر ٹھاڑھی ہرنیاں
سا من اتی ان منی ہو!
۲۔ چرتے چرتے ہرنا ں
تو ہرنی سے پوُں چھی ہو۔
ہرنی کی تو ر چرنا بُھران
کی پانی بن مُرجھی اُدہو؟
۳۔ نہ ہیں مور چرنا بُھران
نہ پانی بن مرجھی اہل ہو۔
ہرنیا آج راجہ جی کے چھٹی
تو ہیں مار ی ڈرین ہو!
۴۔ مچے بیٹھی کو شلیا رانی
ہرنی ارج کرئی ہو —
رانی! مسوُ وا تو سجھ ہیں رسوئیاں
کھلریا ہمیں دیتی اُد!
۵۔ پیڑ وا سے ٹنگ بی کھلریا
ت من سمجھا اُب ہو۔
رانی! پھیری پھیری دیکھ بی کھلریا
جنُک ہرنیا جیتیٔ ہو!
۶۔ جا ہو ہرنی گھرا پنے
کھلریا ناہیں دیبیٔ ہو
ہرنی! کھلری ک کھنجڑی مڑا ہیو بیٔ
ت درا ما سو کھیل ہیں ہو!
۷۔ جب جب باجیٔ کھنجڑیا
سبد سُنی اَن کنی ہو
ہرنی ٹھاڑھی ڈہنکو لیا کے نیچے
ہرن ک بسُور ئی ہو!

(۱) ڈھاک کا چھوٹا سا پیڑ ہے ایک گھنے پتوں سے لہلہاتا ہوا۔ اُس کے نیچے ایک ہرنی کھڑی ہے۔ رام! اس کا من بہت اداس ہے۔

(۲) چرتے چرتے ہرن نے پوچھا: ہرنی! چرا گاہ سوکھ گئی ہے کیا؟ یا پانی کے بغیر مرجھا گیا ہے (تیرا من)؟

(۳) نہ میری چرا گاہ سوکھی ہے نہ پانی کے بغیر مرجھایا ہے (میرا من)۔ ہرن! آج راجہ کے (بیٹے کی) چھٹی ہے۔ آج (راجہ کے شکاری) تجھے مار ڈالیں گے۔

(۴) رانی کوشلیا مچیا[1] پہ بیٹھی ہے۔ ہرنی عرض کر رہی ہے — رانی! (میرے ہرن کا) مانس تو (تمہاری) رسوئی میں پک رہا ہے (ہرن کی) کھال مجھے دلوا دو۔

(۵) یہ کھال میں پیڑ سے ٹانگ دوں گی۔ گھوم پھر کر اُسے دیکھا کروں گی۔ رانی! دیکھ دیکھ کر اپنے من کو سمجھاؤں گی جیسے ہرن جیتا ہو!

(۶) ہرنی! جا اپنے گھر کو چلی جا۔ یہ کھال میں نہ دوں گی۔ اس سے تو ڈفلی مڑھاؤں گی (میرا) رام اس سے کھیلا کرے گا۔

(۷) جب جب ڈفلی بجتی ہے (اُس کی) آواز سُن کر ہرنی کان کھڑے کر لیتی ہے۔ ڈھاک کے نیچے کھڑی ہو کر ہرنی ہرن کی یاد میں کھو جاتی ہے۔"

یہ چھوٹا سا گیت المیہ شاعری کے کسی بھی شاہکار سے ٹکر کھا سکتا ہے۔ اسے "سوہر" گیتوں کی برادری میں جگہ ملی ہے۔ بیٹے کے جنم کی خوشی میں یہ کیوں گایا جاتا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت ممکن ہے کہ گلی محلے کی عورتیں خوشی کی ہستی میں اس گیت کے غمناک پہلو کی طرف توجہ نہ دیتی ہوں۔ مگر کوئی عورت تو ایسی بھی ہوتی ہوگی، جسے ہرن کی دردانگیز کہانی میں اپنی زندگی کا سارا غم نظر آجاتا ہوگا۔

کوشلیا اور رام کے نام اس گیت میں کیوں پروئے گئے ہیں۔ اس کی تشریح آسان نہیں۔ تاریخی ناموں کو عام گھریلو زندگی کی دھرتی پر لا بٹھانے کا رجحان بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ دیہات میں گھر گھر ساس اور سسر میں کوشلیا اور دشرتھ کا تصور کیا گیا ہے۔ پھر ہر ماں اپنے بچے میں رام کی تصویر دیکھ لے، یہ کوئی اَن ہونی بات نہیں۔ ہر صوبے میں گھریلو زندگی کے گیتوں میں رام، سیتا اور لکشمن تو کسانوں کی زندگی میں بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ مگر اس گیت میں بے رحم عورت کے روپ میں کوشلیا کا تصور ایک نامناسب رجحان کا ترجمان ہے۔

پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے لکھا ہے — ہرنی ہرن کی کھال اس لئے مانگتی تھی کہ وہ اُسے دیکھ دیکھ کر دل کو ڈھارس دے گی اور "ہرن جیتا ہے"، اس وہم کو سچ سمجھ کر ایک فرضی سُکھ محسوس کرے گی۔ کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں، جو اپنے مرحوم خاوند یا بیٹے کی چیزیں بڑی حفاظت سے رکھ چھوڑتی ہیں۔ اور

[1] ایک قسم کی پیڑھی۔

تنہائی میں انہیں دیکھ دیکھ کر ایک خاص قسم کا شکھ محسوس کیا کرتی ہیں۔ آخر ہرن کی کھال کی کھنجری بنی۔ کھنجری جب بجتی تھی، تب اُس کی آواز سے ہرنی کے دل میں محبت کی کہانی جاگ اٹھتی تھی۔۔۔۔ گیت کی ہرنی کی خاموش تڑپ انسان کے دل کو ہلا دینے والی ہے۔ یہاں ہرنی کے بہانے سے کسی عورت نے اپنی ہی تصویر لا کر کھڑی کر دی ہے۔[۱]

نواں گیت بھی یو۔پی کا ہے ــــ

یہ بھی "سوہر" گیت ہے۔ پھر ایک بار ہم ایک ہرنی کا من اُداس پاتے ہیں سیتا گربھ وتی ہے۔ آج سیتا کے بیٹا ہوگا۔ اس خوشی میں ہرنی کے پیارے رفیق حیات کو لکشمن ڈھونڈنے آئے گا۔ اور راجا کا شکاری ہرن کو مار ڈالے گا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ ہرنی کوشلیا کے پاس جا کر ہرن کی جان بخشوا لیتی ہے۔ یہاں کوشلیا کی زبان سے جو لفظ کہلوائے گئے ہیں، ہمدردی اور خلوص سے لبریز ہیں ــــ

"چھوٹ موٹ پیڑ واڈھیکو لیا

ت پتوا سے لہالہی ہو۔

راماتا ہاتر ٹھاڑھی ہرنیا

ہرن باٹ جوہٹی ہو۔"

"چھوٹا موٹا ڈھاک کا ایک پیڑ ہے۔ وہ پتوں سے لہلہا رہا ہے۔ ہے رام! اس کے نیچے ہرنی کھڑی ہے۔ وہ ہرن کی راہ دیکھ رہی ہے۔"

"بن میں سے نکلے لاہرنیا

ت ہرنی سے پوچھے ہو ــــ

ہرنی! کاہے تو ربدن ملین

کاہے منہ پی ار ہو؟"

"جنگل سے ہرن نکلا۔ اس نے ہرنی سے پوچھا ــــ ہرنی کس لئے تیرا چہرہ اداس اور پیلا پڑ گیا ہے؟"

"گئی لوں میں راجہ کے دوارِیا

ت بتیا سُن آئی ہیں ہو۔

پیارے آج چھوٹے راجا ک ہیلیا

ہرن مردئی ہیں ہو!"

"راجہ کے دروازے پر گئی تھی۔ وہاں سے بات چیت سن آئی ہوں پیارے! آج چھوٹے راجہ اپنے شکاری سے ہرن کو مروا ڈالیں گے!

"کینی بے بگیا لگوئے؟

کینی رے آئے ڈھنڈھے ہو؟

ہرنی کے کر دھنیا گربھ سے

ہرن مرواوے ہو؟"

"کس نے باغ لگوایا؟ کون (مجھے) ڈھونڈنے آیا؟ ہرنی! کس کی جوان بیوی گربھ وتی ہے کہ ہرن کو مروا دیں گے؟"

"دشرتھ بگیا لگولیں

لکھن آئے ڈھونڈھے ہو!

پیارے رگھوبر دھنیا گربھ سے

ہرن مرواوے ہو!"

"دشرتھ نے باغ لگوایا۔ لکشمن (تجھے) ڈھونڈنے آیا پیارے! رام چندر کی جوان بیوی گربھ وتی ہے (اسی کے لئے) ہرن کو مروا ڈالیں گے۔"

"کر جوڑی ہرنی عرج کرے ــــ

سُن کوشلیا رانی ہو!

رانی سیتا کے ہوئی ہیں نندلال

ہم ای کچھ دی ہب ہو!"

"ہاتھ جوڑ کر ہرنی عرض کر رہی ہے ــــ سنو، کوشلیا رانی! آج رانی سیتا کے بیٹا ہوگا۔ مجھے کچھ دو!"

"سونوا مڑھئی یوں دُہو سِنگوا

بھوجنوا تل چاؤ رہو

ہرنی بھگتوا جودھیا کے راج

نسچے بن چرہو ہو!"

"سونے سے مڑھاؤں گی (تیرے ہرن کے) دونوں سینگ! کھانے کو دوں گی، تل اور چاول۔ ایودھیا کے راج (کا) سکھ بھوگ، ہرنی! اور بے فکر ہو کر جنگل میں گھوم پھر!"

ہرن بچ گیا یہی کافی ہے۔ ہرن کے سینگ سچ مچ سونے سے مڑھائے گئے تھے یا نہیں، اس کی ہمیں پروا نہیں۔ ایک گہرا احساس جو کوشلیا کے لفظوں میں موجود ہے، ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ زندگی میں رحم اور ہمدردی نے اپنی جگہ بالکل ہی گنوا نہیں دی۔ کمینگی اور تنگ دلی کا گھیرا تو ہے۔ مگر زندگی کے کیچڑ سے بھی ایک کنول کھل اٹھتا ہے، جس کی خوشبو سے آدمی کی زندگی میں ایک احترام ایک بلند پایہ جذبہ، جس سے متاثر ہو کر ہم تمام جانداروں کے درمیان ایک خاص قسم کی یگانگت محسوس کرتے

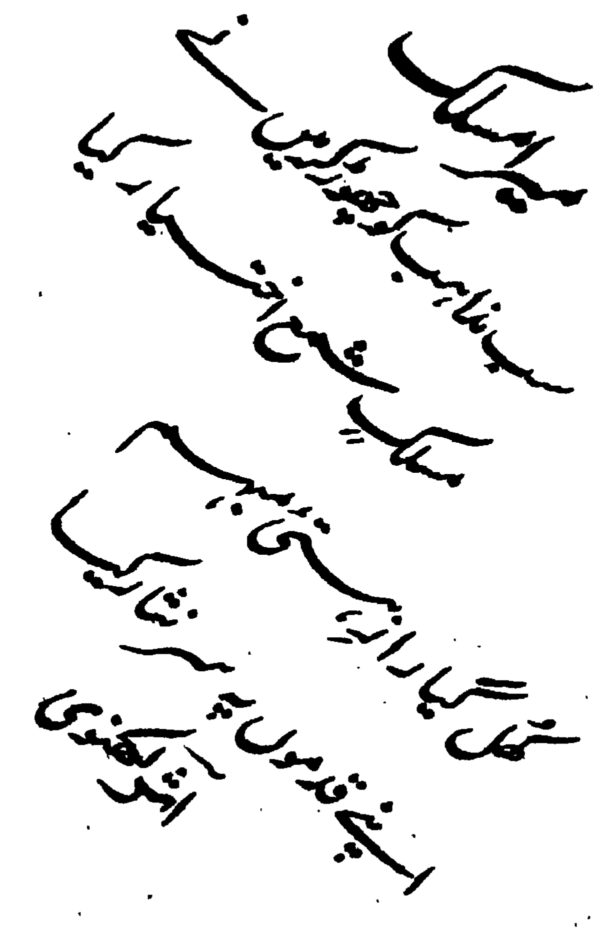
[۱] "کویتا کومدی دگرام گیت"

ہیں، بیدار ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی دیہاتی زبانوں کا اضافی مطالعہ بہت اہم ہے۔ اُن صوبوں میں بھی، جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے یا جہاں کی زبانوں میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، کتنے ہی فارسی اور عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ بار بار مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ زبان کے متعلق ہمارا تعصب سرے سے سطحی یا وربناوٹی ہے۔ لوگ یہ دیکھ کر کسی لفظ کا استعمال نہیں کرتے کہ اُس کا حسب نسب، جنم استھان یا مذہب کیا ہے، بلکہ ہر لفظ اُن کی زبان پر اُسی طرح آتا ہے، جیسے دھرتی پر کوئی پودا اُگتا ہے۔

تلاش کرنے پر ہرنی کے گیت دوسری زبانوں میں بھی مل جائیں گے..... ہندوستان کے طول و عرض میں ہرنی کی پکار گونج رہی ہے، مگر سوال تو یہ ہے کیا ہمارا وطن یوں ہی بیکس رہے گا؟ کیا ہماری قوم یوں ہی منہ بسورتی رہے گی؟ شکاری بھائی "کب تک اس کا پیچھا کرتا رہے گا؟ کب ناچے گی ہرنی خوشی میں آکر؟......

دیویندر ستیارتھی



گاؤں کی رات

چار سو جلوہ فگن خاموش ظلمت کے چراغ
وحشتِ ادراک غم سے سینۂ انجم میں داغ
زلفِ شب مارِ سیہ کی طرح سرتاپا غضب
ہاں مگر سلطانِ صحرا بُوم کا دل باغ باغ
آہ! یہ بستی ہے یا تاریک زندانِ مہیب
ستمِ قاتل سے جہاں بھرپور ہستی کا ایاغ
اک بلائے ناگہانی ذرّہ ذرّہ کو محیط
اُلفتِ کرب و بلا زیبائشِ حُسن فراغ
دولتِ گم گشتگی ہر کاروانِ عقل و ہوش
شعلہ ساماں منزلِ حُسن و محبت بے سراغ
ہر فغانِ نیم شب اک شعلۂ مینا نشیں
کیوں نہ ہو صد چاک شاعر کا دلِ وحشی دماغ

رفعت ہاشمی

ایک غزل اور ایک نظم

غزل

پیمانۂ حیات کو بھرتا چلا گیا
میں کام عمر بھر یہی کرتا چلا گیا

رکھی نہ جب کوئی خلش و خند سے غرض
مثلِ صبا چمن سے گذرتا چلا گیا

خونِ دل و جگر سے لیا کام رنگ کا
کب نقشِ زیست یونہی ابھرتا چلا گیا

جب اُس کے روبرو رہا آئینۂ جمال
دل مثلِ زلفِ یار سنورتا چلا گیا

اک اک قدم کے اُٹھنے سے کٹتا گیا سفر
جینے کے ساتھ ساتھ ہی مرتا چلا گیا

ہیں بے نیازِ سود و زیاں عشق بازیاں
میری یہی تھی جیت کہ ہرتا چلا گیا

آخر میں سمجھ ہی گیا زندگی کا راز
جب ہر ادائے ناز پہ مرتا چلا گیا

انتظار

شفق کے نور سے روشن ہے کہسار اب بھی
کھڑا ہے سامنے وادی میں اک چنار اب بھی
اُسی سرور سے بہتے ہیں کوہ کے چشمے
سنہری چاند سے راتوں کو کیف بار اب بھی
سحر کو گاتے ہیں اب بھی کسان کے نغمے
شرارِ شب سے چمکتے ہیں رہگزار اب بھی
وہی پہاڑ پہ ریوڑ بھری چراگاہیں
وہی طیور سے آباد شاخسار اب بھی
چناری اب بھی رواں ہے اُسی ترنم سے
بکھیرتی ہیں فضائیں وہی خمار اب بھی
اُسی حیات پہ قائم ہے جھیل کا منظر
حریمِ کوہ میں بستا ہے اک دیار اب بھی
کسی پہاڑی حسینہ کے انتظار میں یاں
سنہری رات کو آتا ہے اک سوار اب بھی

. . . .

رہینِ دردِ محبت رہے شباب کے دن
تمام روح کی دنیا ہے سوگوار اب بھی
تری حیات میں ملتے تھے اس چٹان پہ ہم
اِسی مقام پہ کرتا ہوں انتظار اب بھی

دُعَا

دن رات دعائیں مانگتا ہوں مگر بے کار۔ نمازیں پڑھتا ہوں اور دامن پھیلا پھیلا کر خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہوں، لیکن سب بے سود۔

آرزوئیں پامال ہیں اور تمنائیں ناکام! زندگی محرومیوں اور بے نصیبیوں کی ایک داستان ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی "دعا" نے "اثر" کے ساتھ ایک مستقل دشمنی ٹھان رکھی ہے۔

پھر یہ نہیں کہ کبھی دعا قبول ہی نہیں ہوئی۔ ہوئی ہے اور بارہا ہوئی ہے۔ اور ایک دفعہ تو ایسی ہوئی ہے کہ ..... بس اب کیا کہوں! خدا کی شان بڑی ہے! وہ چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اُس کی رحمت جوش میں آ جائے تو بگڑے کام خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اُسی کا ابرِ کرم تھا جس نے ایک دفعہ میری بیکسانہ دعاؤں پر اثر کی بارشیں کر دی تھیں، اور عاجزانہ التجاؤں پر قبول و پذیرائی کے دروازے کھول دیئے تھے۔ میں اپنے معبود کی اُس بے پایاں بندہ نوازی کو عمر بھر دل سے نہیں بھلا سکوں گا۔

میں اُس وقت تیرہ چودہ سال کا ایک نحیف، کمزور اور ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ اس عمر کے لڑکے عام طور پر اچھے خاصے ہوشیار ہوتے ہیں لیکن میں ایسا نہ تھا۔ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور سب سے اچھا طالب علم خیال کیا جاتا تھا۔ مگر وہ ہوشیاری اور عیاری جس کو ذرا نرم لفظوں میں دنیاوی سوجھ بوجھ کہہ سکتے ہیں۔ مجھ میں نام کو بھی نہ تھی۔ اس کی وجہ کچھ تو میری وہ فطری سادہ لوحی تھی جس نے اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے اور کچھ وہ حالات جن کے ماتحت میں نے تربیت پائی تھی۔ میں (بقول کسی کے) بھونرے میں پلا تھا۔ زندگی کے تیرہ چودہ سال گھر کی چار دیواری کے اندر گزار دیئے تھے۔ الہ آباد کے صرف دو چار محلوں اور بازاروں سے واقف تھا۔ بہادر گنج میں رہتا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دارا گنج کہاں ہے اور لوکر گنج کدھر ہے۔ پڑوس میں رہنے والے لڑکوں سے ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی، نہ اسکول کے ساتھیوں کے ساتھ کہیں آ جا سکتا تھا۔ غرضکہ میری دنیا بہت محدود تھی اور اس محدود دنیا کے باہر جو لامحدود دنیا ادھر سے اُدھر تک پھیلی ہوئی تھی، اُس سے میں بالکل بیگانہ تھا۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے گھر سے ذرا دُور نکل جاتا تو ایک نامعلوم سی ہیبت دل پر طاری ہو جاتی اور سڑک پر چلنے والا ہر شخص ایک ہوا معلوم ہوتا۔

تو یہ تھا میں! اُس وقت جب میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔ اس سے کوئی دو سال پہلے، یعنی جب میں گیارہ بارہ برس کا تھا اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، تو ایک مرتبہ اپنے نانا کے ساتھ بنارس گیا جہاں میری ایک بیوہ خالہ رہتی تھیں۔ اُن کو مرے ہوئے اب دس سال سے اوپر ہوتے ہیں، لیکن میرے دماغ کے کسی گوشے میں اُن کی آنکھوں سے مسلسل ٹپکنے والے آنسوؤں کا منظر اب بھی ایک دردناک یاد بن کر محفوظ ہے۔ میں نے اُن کی آنکھوں کو ہمیشہ آنسوؤں سے تر دیکھا۔ وہ رونے کی اس قدر عادی ہو چکی تھیں کہ مجھ سے بات کرتیں تو محض احساسِ محبت سے بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ میں نانا کے ساتھ بنارس گیا تھا وہ مجھے بنارس پہنچا کر کہیں اور جگہ چلے گئے اور چند روز بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ میں بنارس سے الہ آباد واپس کس کے ساتھ جاؤں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت جب یہ مسئلہ درپیش تھا۔ خالہ نے میری بلائیں لیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "میرا لعل اب آٹھویں درجے میں آ گیا ہے۔ دو برس بعد دسواں پاس کرے گا۔ پھر الہ آباد سے اکیلا بنارس آ جایا کرے گا۔"

لیکن میں نے دسواں درجہ پاس کرنے سے چند ماہ قبل ہی اپنے آپ کو الہ آباد سے بنارس اور بنارس سے الہ آباد تک تنہا سفر کرنے کے قابل محسوس کیا۔ اسکول میں پانچ چھ دن کی چھٹی ہوئی تو اماں کی خوشامد کر کے خالہ کے ہاں جانے کی اجازت حاصل کر ہی لی۔

اماں نے چلتے وقت مجھے چھ روپے دیئے ——— چار روپے دونوں طرف کا کرایہ اور دو روپے اوپری خرچ کے لئے۔ گھر سے اسٹیشن جاتے ہوئے راستے میں میں نے طے کیا کہ یہ دو روپے صاف بچا لاؤں گا اور الہ آباد آ کر ایک عمدہ سا بٹنوں کا سٹ خریدوں گا۔ اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ گاڑی کی روانگی میں ابھی بہت دیر ہے۔ گھر سے کھانا کھا کر چلا تھا۔ "ٹی اسٹال" پر کیک اور انڈے مجسم دعوتِ کام و دہن بنے ہوئے رکھے تھے، اُن کو دیکھتے ہی بھوک لگ آئی۔

بٹنوں کے سٹ کا خیال نہ رہا۔ سیدھا سٹال پر گیا اور چائے کی ایک پیالی طلب کی۔ کیک اور انڈے کے متعلق یہ تو میں طے کر چکا تھا کہ ان دونوں میں سے صرف ایک چیز کھاؤں گا۔ مگر ابھی یہ فیصلہ کرنا باقی تھا کہ کون سی چیز کھائی جائے۔ میں اس سلسلے میں اپنے دل سے مشورہ کر ہی رہا تھا کہ سٹال والے نے کہا، "کچھ کھائیے گا صاحب؟ کیک؟ پیسٹری؟ انڈا؟"

میں نے جواب دیا، "ہاں ایک انڈا اور ایک کیک کا ٹکڑا۔"

اُس نے ایک پرچ میں ایک اُبلے ہوئے انڈے کی قاشیں اور دوسری میں کیک کے تین چار ٹکڑے رکھ کر دونوں پرچیں میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے اتنا کب مانگا تھا؟ اب اس سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بھئی ہمیں کیک کا صرف ایک ٹکڑا چاہئیے۔ بڑی ذلت کی بات ہوگی۔ غرض کہ کیک کے سب ٹکڑے کھانے پڑے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اُن کے کھانے میں بڑا لطف آیا۔ اتنا کہ مجھے سٹال والے سے کوئی شکایت نہ رہی۔ اِس ناشتے کی قیمت مجھے تقریباً آٹھ آنے دینی پڑی۔

سٹال سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے اپنے دل میں کہا، بٹنوں کا سٹ تو ڈیڑھ روپے میں بھی خریدا جا سکتا ہے۔ اب میں ایک پیسہ خرچ نہیں کروں گا اور اس رقم کو بالکل محفوظ رکھوں گا۔"

روانگی کا وقت قریب آیا تو گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ پلیٹ فارم پر خوانچے والوں کا ہجوم شروع ہوا۔ ایک مٹھائی والے کی ٹوکری میں گلاب جامنیں نظر پڑیں۔ شیرے میں تر اور نہایت سُرخ! جیسے دہکتے ہوئے انگارے! دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ مٹھائی والے کو بلانا بھی نہیں پڑا۔ وہ میری للچائی ہوئی نظروں کو دیکھ کر خود ہی میری طرف آگیا۔

"کچھ مٹھائی دوں میاں؟"

"ہاں، کیا کیا چیز ہے؟"

"بالوشاہی — قلاقند — امرتی — گلاب جامن — اندرسے کی گولیاں —"

"اچھا، گلاب جامن دو۔"

"کتنی دوں؟ سیر بھر؟"

"نہیں، پاؤ بھر دے دو۔"

میرا ارادہ تھا کہ صرف ایک آنے کی لوں گا لیکن اُس نے سیر بھر کہا تو مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آئی کہ نہیں، ایک آنے کی دو۔ ناچار پاؤ بھر مانگ لی۔ سیر بھر چیز کے مقابلے میں پاؤ بھر کچھ ایسی زیادہ کم اور حقیر نہیں ہوتی!

گلاب جامنوں کو مزے لے لے کر کھایا اور اُس کے بعد اپنی حماقت پر افسوس کرنے لگا۔

راستے میں بڑے زور کی پیاس معلوم ہوئی۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو پانی کی جستجو میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک شخص مسافروں کو اوک سے ٹھنڈا جل پلا رہا تھا۔ میرے لئے اوک سے پینا ناممکن تھا۔ گلاس بھی نہیں تھا کہ اُس میں لے کر پی لیتا۔ اتنے میں ایک سوڈے برف والا تیزی کے ساتھ جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس کو آواز دی اور وہ قریب آیا تو اس سے کہا، "ایک بوتل کھول کر لاؤ۔"

"کون سی؟" اُس نے سوال کیا۔

مجھے لیمینڈ اور جنجر دو نام آتے تھے۔ سوچ رہا تھا ان دونوں میں سے کون سا نام لوں کہ اُس نے کہا، "وِمٹو؟"

میں نے کہا، "ہاں، وہی!"

پینے کے بعد میں نے ایک چونّی اُس کو دی۔ خیال تھا کہ یہ ڈھائی آنے واپس کرے گا، لیکن اُس نے کہا، "دو آنے اور دیجئے۔" حجت کرنا میرے لئے باعثِ شرم تھا، اس لئے بلا تامّل جیب سے دوّنی نکال کر اس کو دے دی۔

باقی تمام سفر اپنے اوپر لعنت بھیجنے میں صرف ہوا۔

بنارس پہنچا ہوں تو دو روپے میں سے ایک روپے کا صفایا ہو چکا تھا۔ میں نے حسرت کے ساتھ بٹنوں کے اُس سٹ کو یاد کیا جو اب میری دسترس سے بہت دور تھا۔ لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور عزم کیا کہ اب جو ایک روپیہ باقی ہے اُس میں سے ایک کوڑی خرچ نہیں کروں گا، اور الٰہ آباد پہنچ کر کچھ دنوں تک پیسے جمع کروں گا، اور پھر جب دوبارہ اپنے پاس دو روپے اکٹھے ہو جائیں گے۔ تو ایک عمدہ سا بٹنوں کا سٹ خریدوں گا۔

لیکن میں اس عزم کو نبھانے میں کامیاب نہ ہوا۔ دو ہی دن کے اندر وہ ایک روپیہ میری جیب سے نکل کر بنارس کے سوداگروں کی متاع بن گیا۔

اب میرے پاس بنارس سے الٰہ آباد تک کا ٹکٹ خریدنے کے لئے دو روپے تھے۔ اُن کو میں کسی صورت سے خرچ نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ دو دن تک بالکل کوئی چیز نہیں خریدی۔ نہ خریدنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب جیب میں پیسے تھے تو وہ اچھلتے تھے اور قدم قدم پر کچھ نہ کچھ خریدنے کو جی چاہتا تھا۔ اب جیبیں خالی تھیں تو جی بھی نہ چاہتا تھا۔ غرضکہ دو دن نہایت سکون کے ساتھ گزرے

مگر تیسرے دن صبح یہ خیال آیا کہ بنارس سے چلتے وقت خالہ بھی تو مجھے کچھ دیں گی۔ یہ میرے دل کی آواز تھی جو مجھے بہکا کر غلط راستے پر ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے جواب میں کہا، "ضروری نہیں کہ وہ مجھے کچھ دیں ممکن ہے

دیں، ممکن ہے نہ دیں۔" دل نے کہا "نہیں ضرور دیں گی۔ تمہاری اماں تو کبھی کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹنے دیتیں۔ روپوں کے علاوہ کپڑا لتا بھی دیتی ہیں۔"

میں نے کہا، "اماں کی بات دوسری ہے۔ وہ ایک بیرسٹر کی بیوی ہیں اور اُن کے دو بیٹے لاٹ صاحب کے دفتر میں ملازم ہیں۔ خالہ بے چاری بیوہ ہیں اُن کے چار جوان بیٹے مر چکے ہیں اور پانچواں اپاہج ہے۔ وہ محلے کی بچیوں کو پڑھا کر دو وقت کی روٹی کھاتی ہیں۔ اُن کے پاس اتنا کہاں کہ وہ مجھے کچھ دیں۔" دل نے کہا، "نہیں، وہ ضرور تمہیں کچھ نہ کچھ دیں گی۔ دو روپے نہیں تو ایک روپیہ تو ضرور ہی دیں گی۔ تمہارے پاس کرائے کے جو دو روپے ہیں ان میں سے ایک روپیہ تم بے دھڑک خرچ کر سکتے ہو۔" میں نے کہا "خرچ تو میں کر لوں، اور میرا جی بھی یہی چاہتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر خالہ نے کچھ نہ دیا تو؟ پھر میں کیا کروں گا؟ بنارس سے الہ آباد تک کیسے پہنچوں گا؟ دل نے یقین دلایا، "وہ دیں گی، کم سے کم ایک روپیہ تو ضرور ہی دیں گی۔"

یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ گلی میں سے ایک پاٹ دار آواز آئی: "چاٹ! دہی بڑے کی چاٹ!"

میں نے اپنے دل کے مشورے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

پھر ظاہر ہے کہ جب ایک دفعہ روپیہ بھنا لیا گیا تو چونسٹھ پیسوں میں سے ایک پیسے کا بھی بچنا ناممکن تھا۔ آدمی چھت پر سے گرتا ہے تو زمین پر آ کر ہی دم لیتا ہے۔

چھ دن کے قیام کے بعد میں بنارس سے رخصت ہونے لگا تو میری جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ چلتے وقت خالہ نے مجھے گلے لگایا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگیں "میرا لعل اتنے دنوں کے بعد آیا اور میں اُسے کوئی اچھی چیز بھی تو نہیں کھلا سکی — میرے پاس رکھا ہی کیا ہے!" اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ زمین میرے قدموں کے نیچے سے نکل گئی۔

گھر سے اسٹیشن تک کا راستہ اس طرح طے کیا جس طرح ایک مجرم قید خانے کی کوٹھڑی سے پھانسی کے تختے تک کا راستہ طے کرتا ہے۔ اُس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے، میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا ہوں، میرے ماں باپ مر چکے ہیں اور عزیز و اقارب سب ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

اسٹیشن پہنچ کر بنارس سے الہ آباد تک کا آدھا ٹکٹ لیا۔ اس کے علاوہ اور صورت بھی کیا تھی!

اور اُس وقت میرے دل سے ایک دعا نکلی: "معبود! میرے حال پر رحم کر۔ میری بے چارگی اور بے بسی پر ترس کھا۔ میں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ اس مصیبت کو تو ہی ٹال سکتا ہے۔" اس کے بعد میں نے نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں اور اپنے آپ کو خدا سے قریب تر محسوس کرتے ہوئے کہا: "اللہ میاں! میں اب پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گا۔ کبھی بھول کر بھی قضا نہیں کروں گا۔ اور بغیر وضو کے بھی کبھی نہیں پڑھوں گا۔ میں پکا وعدہ کرتا ہوں۔ اللہ میاں! آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہ کروں گا۔ اگر کوئی گناہ کروں تو تم اسی وقت مجھے جان سے مار ڈالنا۔ بس اس وقت مجھے بچا لو۔ مجھ سے کوئی ٹکٹ نہ مانگے، اور اگر مانگے تو مجھے بارہ سال سے زیادہ کا نہ سمجھے!....."

اسی طرح دعا مانگتا، خدا کے سامنے گڑگڑاتا اور خوف کے مارے تھر تھر کانپتا پلیٹ فارم تک پہنچ گیا۔ شاید میری دعا قبول ہو رہی تھی، کیونکہ گیٹ پر مجھ سے کسی نے ٹکٹ نہ مانگا۔ گاڑی تیار تھی۔ ایک بالکل خالی ڈبہ نظر آیا۔ اُسی میں بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ خالی ڈبے میں ٹکٹ چیکر کے آنے کا امکان بہت کم ہے۔ بہت دیر تک اس ڈبے کے ایک کونے میں چوروں کی طرح سہما ہوا بیٹھا رہا۔ اور بار بار خدا سے التجا کرتا رہا: "اس وقت مجھے بچا لو اللہ میاں! میں پکا وعدہ کرتا ہوں آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہ کروں گا۔ کبھی بغیر وضو کے نماز نہیں پڑھوں گا....."

یکایک چار پانچ آدمی ڈبے میں داخل ہوئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حالانکہ وہ سب کے سب بے ضرر مسافر تھے اور اُن میں سے ایک بھی ٹکٹ چیکر نہ تھا۔ مگر عجیب قسم کے لوگ تھے وہ! صورتوں سے بالکل وحشی اور جنگلی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے قد نہایت لانبے تھے اور جسم نہایت چوڑے چکلے! آنکھیں ڈراؤنی اور چہرے سیاہ! میلی میلی شلواریں اور بھدے بھدے کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ غالباً سندھ یا پنجاب کے کسی علاقے کے لوگ تھے، کیونکہ جب انہوں نے بیٹھ کر باتیں کرنی شروع کیں تو اُن کی زبان اردو نہ تھی وہ بہت کم بولتے تھے مگر جب بولتے تھے تو چاروں پانچوں بیک وقت بول اٹھتے تھے اور اس کے بعد پھر کچھ دیر کے لئے بالکل خاموش ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مٹی کی ایک ہانڈی میں بہت سے کنکر اور روڑے بھر لئے ہیں اور وقتاً فوقتاً اُسے دونوں ہاتھوں میں لے کر زور سے ہلا دیتا ہے۔

گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی روانہ ہوئی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اطمینان کا سانس لوں، ایک ٹکٹ چیکر چلتی گاڑی پر سوار ہو کر ڈبے میں آن موجود ہوا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری جان نکل گئی!

وہ سیدھا میرے پاس آیا اور بولا "ٹکٹ!"

میں نے کہا، "میرا ٹکٹ میری اماں کے پاس ہے۔ وہ زنانے درجے میں ہیں" خدا کی جناب میں میری دعا قبول ہو رہی تھی جبھی تو اتنا اچھا جواب خود بخود میری زبان پر آ گیا۔

اس نے ذرا سخت نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"الٰہ آباد!" میں نے جواب دیا۔

"اچھا" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس "اچھا" کا مطلب صاف طور پر یہ تھا: "گھبراؤ نہیں صاحبزادے! الٰہ آباد کے اسٹیشن پر تمہاری خبر لوں گا۔"

پھر وہ پیٹ کر ان چاروں پانچوں کے پاس گیا۔ جو وحشیوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے ٹکٹ کے لئے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر وہ بدستور ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

"ٹکٹ لاؤ" اس نے نہایت تند لہجے میں کہا۔

انہوں نے حد سے زیادہ بھدی اردو میں جواب دیا جس کا خلاصہ یہ تھا: "ہم میں سے وہ شخص جس کے پاس ہم سب کے ٹکٹ ہیں پانی پینے گیا تھا۔ گاڑی یکایک روانہ ہو گئی اور وہ بھاگ کر کسی دوسرے ڈبے میں بیٹھ گیا۔"

ٹکٹ چیکر نے ان کی بات کا یقین نہیں کیا۔ اس نے غصے میں آ کر ان کے خلاف نہایت سخت الفاظ استعمال کئے، اور جب اچھی طرح اپنے غصے کا اظہار کر چکا تو وہیں ان کے پاس جم کر بیٹھ گیا تاکہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکنے تو دوبارہ ان سے ٹکٹ کا مطالبہ کرے۔ وہ وہاں بیٹھا ہوا اپنی قہر آلود نظروں سے ہر دو تین منٹ کے بعد ان کی طرف دیکھتا تھا۔ مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بدستور ایک دوسرے کو وحشیوں کی طرح گھورنے میں مصروف تھے۔

گاڑی تیزی کے ساتھ اڑی چلی جا رہی تھی، اور میری دعا عرش کی جانب محو پرواز تھی۔ "آج مجھے بچا لو اللہ میاں! میں آئندہ پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گا کبھی بھول کر بھی قضا نہیں کروں گا۔ اور بغیر وضو کے کبھی نہیں پڑھوں گا۔ میں تمہارا بہت ہی فرمانبردار بندہ ہوں اللہ میاں!......"

گاڑی ایک اسٹیشن پر پہنچ کر ٹھہر گئی۔ ٹکٹ چیکر نے بعد اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ان وحشیوں پر ایک کڑی نظر ڈالی جو اب اور بھی زیادہ خوفناک انداز میں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ پھر اس نے گرج کر کہا "کہاں ہے وہ تمہارا ساتھی؟ بلاؤ اسے اور ٹکٹ دکھاؤ۔"

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صرف ایک دوسرے کو اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھتے رہے۔

ٹکٹ چیکر آگ بگولا ہو گیا، اور اپنی جگہ سے اٹھ کر انتہائی غضبناک لہجے میں بولا، "بدمعاش کہیں کے! میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔ ٹھہر تو جاؤ۔ تم نے سمجھا کیا ہے!" اور اسی طرح غصے کی آگ برساتا ہوا گاڑی سے اتر گیا۔

میں ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ "اب پولیس آئے گی"، میں نے اپنے دل میں کہا، "اور ان سب کے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں گا۔ اُف، خدا کی پناہ! اللہ میاں! رحم کرو۔ مجھے بچا لو۔ میں تمہارا بہت ہی فرماں بردار بندہ ہوں۔ آج مجھے بچا لو میں عمر بھر کوئی گناہ نہیں کروں گا......!"

اور وہ بدمعاش جنہوں نے ٹکٹ چیکر کو غصہ دلا کر میری مصیبت میں اضافہ کیا تھا اسی طرح خون آلود نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ البتہ کنکروں سے بھری ہوئی ہانڈی کو کبھی کبھی زور سے ہلا دیا جاتا تھا۔

گارڈ نے سیٹی دی، اور ہمیں ہمارے ڈبے کے سامنے آ کر ہری لالٹین دکھائی۔ مگر قبل اس کے کہ گاڑی رینگنا شروع کرے ٹکٹ چیکر واپس آ گیا۔ وہ تنہا تھا —— اس کے ساتھ کوئی پولیس کا آدمی نہ تھا۔

اس نے بیٹھتے ہی اپنے غضب ناک لہجے میں بولنا شروع کیا۔ "میں آج تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ سمجھے تم؟ بدمعاشو! ڈاکوؤ! تم نے مذاق سمجھا ہے! میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا! حرام زادے کہیں کے! بدمعاش!...."

گاڑی رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ ٹکٹ چیکر کی زبان بھی اسی قدر تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ بے ٹکٹ مسافروں کی شرر بار آنکھیں اور میری عاجزانہ دعائیں غیر معمولی شدت کے ساتھ مصروف عمل تھیں۔

کنکروں سے بھری ہانڈی ایک دفعہ بہت زور کے ساتھ ہلی سا بھی میں اس جھنکار کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ان چاروں پانچوں آدمیوں میں سے ایک شخص یکایک اپنی جگہ سے اٹھا۔ کوئی چمکدار چیز بجلی کی طرح فضا میں لہرائی اور ٹکٹ چیکر کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ دوسرے لمحے میں وہ سب کے سب اس پر پل پڑے۔ انہوں نے اس کو ہاتھوں میں اٹھایا اور کھڑکی کے راستے سے باہر پھینک دیا۔

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اکبارگی سب کی نظریں میرے اوپر جم گئیں۔ میں اپنی اُس

وقت کی حالت کو بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن چند لمحوں میں میں احساس سے بالکل عاری ہو گیا تھا، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میں لازمی طور پر خوف اور دہشت کے احساس سے مر گیا ہوتا۔

وہ سب میرے قریب آئے، اور اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا، "تم کہاں جاتے ہو؟"

مجھ میں بولنے کی طاقت نہ تھی، مگر منہ سے کسی نہ کسی طرح "الہ آباد" کا لفظ نکل ہی گیا۔

وہ تقریباً ایک لمحہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا: "تم کسی کو یہ بات بولو گے؟"

"نہیں، میں کسی سے نہیں کہوں گا" میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ جواب دیا۔

"اگر تم کسی کو بولے تو . . . ."

"نہیں ــــ نہیں ــــ میں کسی سے نہیں کہوں گا" میں نے اُسے یقین دلایا۔

وہ پھر تقریباً ایک لمحہ مجھے گھورتا رہا۔ اُس کے بعد وہ سب کے سب میرے پاس سے چلے گئے اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔

اور تب مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ میرا دل اس طرح دھڑک رہا تھا گویا سینے کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اس حالت میں اپنی دعاؤں کو بالکل بھول چکا تھا (دعاؤں کی اب ضرورت بھی نہ تھی)

اسٹیشن آیا اور گاڑی رُکی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب ٹکٹ چیکر اپنی نیلے رنگ کی وردی پہنے ہوئے نظر آئے گا اور اچھل کر ڈبے میں آن موجود ہوگا۔ لیکن فوراً خیال آیا کہ ٹکٹ چیکر اب کہاں! وہ تو یہاں سے دُور، جنگل کے سناٹے اور رات کی تاریکی میں ریل کی پٹڑی کے برابر کہیں پڑا ہوگا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ٹکٹ چیکر نہ آیا اور گاڑی پھر چل پڑی۔

تھوڑی دیر میں الہ آباد کا اسٹیشن آیا۔ میں اپنی جگہ سے سہما ہوا اُٹھا اور چاہا کہ اُن خونی درندوں سے نظر ملائے بغیر ڈبے سے نکل جاؤں جو اب پھر مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ بھی میرے ساتھ ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے پلیٹ فارم پر آ کر گیٹ کا رخ کیا تو میرے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

گیٹ میں سے گزرتے وقت میں نے اپنا ٹکٹ جیب سے نکالا۔ ریل کے ہولناک واقعے کے بعد میں اس کو بھول ہی گیا تھا۔ مجھے یہ بات بالکل یاد نہیں رہی تھی کہ میرے پاس صرف آدھا ٹکٹ ہے اور مجھ سے پورے ٹکٹ کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے ٹکٹ گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلکٹر کو دیا، اور ٹکٹ دے کر آگے بڑھ جانے کی بجائے اُس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے ٹکٹ کو دیکھا۔ اور پھر مجھے دیکھا۔ سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالنے کے بعد اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"یہ آدھا ٹکٹ کیوں ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

"میرا تو آدھا ہی ٹکٹ لگتا ہے" میں نے کہا۔

"نہیں، تمہارا پورا ٹکٹ لگے گا۔ آدھے ٹکٹ کے دام دو"

قبل اس کے میں ٹکٹ کلکٹر سے کچھ اور کہوں، وہی شخص جس نے ریل میں خون کیا تھا آگے بڑھا اور اپنی جیب سے روپے نکالتے ہوئے بولا۔ "آدھا ٹکٹ کا دام کتنا ہوگا؟"

ایک دوسرے ٹکٹ کلکٹر نے نصف ٹکٹ کی قیمت اور شاید اُس کے ساتھ کچھ تاوان بھی وصول کیا، اور ایک رسید کاٹ کر اُس کو دی۔ پھر میرے خونی محسن نے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ نکالا، گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلکٹر کو دیا، اور مجھے ہاتھ سے پکڑے ہوئے پھرتی کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر وہ مجھ سے علیحدہ ہو گیا۔ میں نے ایک تانگہ خالی دیکھا اور جلدی سے اُس پر بیٹھ گیا۔

وہ دور سے کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ میں بھی کنکھیوں سے اُس کو دیکھتا رہا۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا۔ مجھے بے انتہا تھکن محسوس ہوئی ــــ جسمانی اور دماغی تھکن! میں تانگے کی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

اور پھر مجھے اُس دعا کا خیال آیا جو چند گھنٹے پیشتر میں نے خدا سے کی تھی میری دعا قبول ہو گئی تھی!

معبودِ حقیقی نے میری فریاد کو سن لیا تھا۔ اس نے میری عاجزانہ التجاؤں پر قبول و پذیرائی کے دروازے کھول دئے تھے۔

اور اب! اب یہ حال ہے کہ دن رات دعائیں مانگتا ہوں گریہ و زاری نمازیں پڑھتا ہوں، اور دامن پھیلا پھیلا کر خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہوں، لیکن سب بے سود! آرزوئیں باطل ہیں اور تمنائیں ناکام! زندگی محرومیوں اور بے نصیبیوں کی ایک داستان ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ "دعا" نے "اثر" کے ساتھ ایک مستقل دشمنی ٹھان رکھی ہے!

اختر انصاری

داسی اور دیو داسی

دیو داسی بنی یک جنبشِ لب سے داسی

یعنی وہ چھوکری جو ناچتی ہے مندر میں گھورتی رہتی ہے جس کو کوئی بے حس مورت
جس کی ہر لغزشِ پا کو کوئی پتھرائی نظر داد دیتی ہو، مگر داد ہو بیداد صفت
جس کے قامت کے لچکنے میں جوانی ڈھل جائے اور ہو ڈھل کے قیامت کی دلیلِ قربت
وہ جوانی جو ہو مورت سے تھرک کر طالب بند آغوش میں ہو جیسے کلی کی نکہت
جس کا لہرا کے بہک جانا ہو دل کا نوحہ روتی حسرت سے تبسم کی کرے جو خلقت

یہ صفات اس کو ملیں جو کہ تھی دل کی داسی

جس کی ہر بات میں تھی رنج و محن سے رخصت جس کی پیشانی پہ ہنس ہنس کے سحر بیٹھ گئی
جس کی نظریں تھیں کہ ہنستی ہوئی مے کی لہریں جس کی پلکیں تھیں کہ مے بار نظر بیٹھ گئی
جس کے رخسار پہ مَن ہونے کا دھوکا کھا کر ناگن اک اُڑی مگر تھام کے سر بیٹھ گئی
جس کی چاہت سے وہ خاموش محبت اُگی ہالہ بن نکلی تو پھر گردِ قمر بیٹھ گئی
جس کے ہر ناز پہ ہو جاتے تھے صدقے قرباں چاندنی جو تھی مگر آپ کے گھر بیٹھ گئی

اس کے سینے پہ کیا طعنے نے زخم کاری
پہنچ کے آغوشِ تمنا میں جو مچلی، ہاری

مختار صدیقی

آپ بیتی

شاید آپ یہ سمجھتے ہوں کہ آپ بیتی اس واقعہ کو کہتے ہیں جو اپنی ذات پر بیتے۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ آپ بیتی ایک ایسا واقعہ ہے جو آپ ہی آپ آپ کے علم کے بغیر آپ کی رضامندی کے بغیر آپ کی خواہش کے بغیر آپ پر بیتنے کا فیصلہ کرلے اور بیت جائے۔ اور آپ کو قطعی سمجھ نہ آئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یا کچھ ہو بھی رہا ہے یا نہیں۔ اور پھر دفعتہً آپ پر انکشاف ہو کہ جو کچھ ہوا چاہتا تھا وہ ہو چکا۔ اور آپ کی اپنی ذات پر ہوا۔ نیز اس کی اہمیت کا احساس بھی آپ کو ہونے لگا۔

اگرچہ وہ واقعہ مجھ پر بیتا تھا۔ لیکن میں اُس کے وقوع سے قطعی بے خبر تھا۔ گویا میں اُس مریض کی طرح تھا جسے کلوروفارم سنگھا کر لٹا دیا گیا ہو۔

یہ ناگہانی اُفتاد ایک بیوی تھی۔ میری بیوی۔ میری منکوحہ بیوی۔ اگر پانچ منٹ پہلے مجھ سے کوئی بیوی کی بات کرتا تو میں اُسے پاگل سمجھ کر ہنس دیتا لیکن اب۔ اب وہ میرے سامنے چوکی پر برقعے میں لپٹی ہوئی گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس اجنبی سی میلی سی گٹھڑی کو کیا کروں۔ اور یہ تمام واقعہ صرف اس لئے ہوا کہ مجھے اناروں سے محبت تھی۔ میرا مطلب ہے وہ انار جو کھائے جاتے ہیں۔

اس واقعے کی ذمہ داری زیادہ تر چار اصحاب پر عاید ہوتی ہے مسجد کا مُلّا جس کی بغل میں میں رہتا تھا۔ اُس صحت افزا بستی کا میونسپل کمشنر قربان علی میرا بجنوری نوکر ننھا اور ــــــ وہ میری ہونے والی بیوی اور ان کے علاوہ ٹماٹو چٹنی کی اک اُبلتی ہوئی بوتل۔

اُس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اُس کے وقوع کے لئے سب سے پہلے نگونی کے معلق پُل کو ٹوٹنا پڑا اور سرکار اس کی مرمت کے لئے چار ہزار روپیہ کی منظوری پر مجبور ہوئی اور تعمیر کا کام ایک ایسے انجنیئر کے سپرد کیا گیا جس کا ایمان تھا کہ بیاہے ہوئے سب اوورسیئر نکمے ہوتے ہیں۔ قصہ کوتاہ اس سلسلے میں دو ماہ کے لئے مجھے نگونی جانا پڑا۔

نگونی ہمالیہ میں ایک اونچے ڈھلان پر آباد ہے جہاں چیل کے درخت اور اُن کے لمبے لمبے سایوں میں تپ دق کے سینی ٹوریم بکثرت ملتے ہیں۔ جہاں یا تو آٹھ آنے ایک روپیہ ماہوار کرایہ کے مکانات ملتے ہیں یا تیس چالیس روپے والی کوٹھیاں۔ آٹھ آنے ماہوار پر جو مکان مجھے ملا۔ وہ ایک گہری کھاڑی کے کنارے پر واقع تھا۔ پتھر کی پانچ فٹ اونچی چار دیواری پر سلیٹوں کی محرابی چھت تھی۔ ایک پہلو میں ایک چھوٹا سا کھڑکی نما دروازہ مکان میں جانے آنے کا واحد راستہ تھا۔

اُس مکان کے متعلق تین باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ ایک تو بکری بن کر داخل ہونا۔ دوسرے چارپائی پر پڑے پڑے یاد رکھنے کی کوشش کرنا کہ کھڑے ہوئے تو سر پھوٹ جائے گا اور تیسرے بھولنے کی کوشش کہ اس کمرے کے چاروں کونوں میں کیسے کیسے کیڑے مکوڑے رینگ رہے ہیں تو صاحب دو ایک ہی دن میں مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ اگر اُسی مکان میں رہائش رہی تو نگونی کے معلق پل کو تعمیر کرنے کے لئے کسی اور سب اوورسیئر کی خدمات کی ضرورت پڑے گی۔ معلوم ہوتا ہے اُن دو ایک دنوں میں میری شکل و صورت میں نمایاں تبدیلی ہو گئی۔ ورنہ خان صاحب کو کیا پڑی تھی کہ وہ مجھ پر ترس کھاتے۔ بلکہ انہیں یہ معلوم ہی کیسے ہوتا کہ میں اک دکھی مسافر ہوں۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔ انہوں نے میرے لئے ایک ایسا کمرہ خالی کروا دیا جس میں سونے کے علاوہ اٹھنا بیٹھنا بھی ممکن تھا۔ وہ کمرا علی کی مسجد سے ملحق تھا اور وہ مسجد اور کمرا خان صاحب نے خود بنوائے تھے۔ اس کے بعد حسن اتفاق سے مجھے وہ بجنوری نوکر ننھا مل گیا۔ جس کا سابقہ مالک تپ دق سے مر چکا تھا۔ اس سے پہلے نہ تو مجھے کسی ایسے کمرے میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا جو مسجد سے ملحق ہو اور مسجد کے نام پر وقف ہو اور نہ کسی باتونی بجنوری سے سابقہ پڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ہنسی خوشی رہنے لگا اور نگونی کے معلق پل کی مرمت ہونے لگی اور مجھے یہ خیال بھی نہ آیا کہ ایک انوکھی آپ بیتی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

دو ایک دن کے بعد خان صاحب آئے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔

دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں سرخ ابھرے ابھرے گالوں کے اوپر غروب ہو رہی تھیں۔ اُن کا پلاسا سرخ چہرا اور اس کے اوپر خضاب سے رنگی ہوئی دو ایک لٹیں جن کے تلے سپید صوری کھوپڑی ننگی نظر آتی تھی دیکھ کر بے اختیار مجھے وہ تصویر یاد آ گئی جو ٹماٹو چٹنی کی بوتل پر چسپاں ہوتی ہے۔ ایک بڑے سے ابھرے ابھرے ٹماٹر کے چہرے پر دو لکیروں سی آنکھیں اور سر پر دو ہرے پتے۔ بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کے بعد خاں صاحب کو دیکھ کر ہنسی کو ضبط کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ اور اسی بات پر ہم دونوں گہرے دوست بن گئے۔

خاں صاحب نے اپنی موٹی موٹی انگلیاں اُن د... ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے کہا: کیوں میاں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ جی لگ گیا تمہارا؟ — خوش تو ہو نا؟

ان کے سرخ سرخ گالوں کو دیکھ کر مجھے اپنے من بھاتے انار یاد آ گئے۔ میں نے اس نیت سے کہ کوئی دلچسپ بات کہوں جواب دیا۔ جی آپ کی نوازش ہے — خاں صاحب میری خوشی کا کیا ہے۔ بس ایک خوشگوار مقام ہو۔ ایک میں ہوں اور ایک انار۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اُس پلیٹ کی طرف اشارہ کیا جس میں انار کے دانے پڑے تھے۔ اور بس میری جنت مکمل ہے۔ اگر ان کے گال مسرت سے ابھرے نہ ہوتے اور آنکھیں غروب نہ ہو چکی ہوتیں تو یقیناً وہ میرا اشارہ دیکھ لیتے اور میری طرف دیکھ کر تعجب سے "انار؟" نہ کہتے۔

"جی ہاں مجھے انار سے محبت ہے" میں نے پلیٹ میں پڑے ہوئے انار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ لیکن انہوں نے میری بات نہ سمجھی۔

"آئیں — محبت بھی ہو گئی" وہ بولے اس سپید صوری سمندر میں مد و جزر اٹھا۔ دو آنکھیں نا اُمید سی ڈوبنے لگیں اور وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے ہنستے ہوئے ان کا جسم یوں جھولتا اور جھومتا تھا گویا سڑک کوٹنے والا انجن چل رہا ہو۔ انار کی محبت کبھی کسی کو کبھی کیوں نہ ہو۔ ایک انار صد بیمار۔ ہی ہی ہی ہی۔ ہا ہا ہا۔ انہیں ہنستے ہوئے دیکھ کر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ اب میں خوب جانتا ہوں کہ جہاں ہنسی آئی سوجھ بوجھ مفقود ہوئی یعنی جس چیز پر آپ ایک بار ہنس لیں اس کے متعلق سوچنا ہمیشہ کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ تو ہنستے ہوئے باہر چلے گئے لیکن صاحب ان کی ہنسی کے انداز پر، اس دلی مسرت پر جو اُن کی ہنسی سے عیاں تھی اور اُن کی بظاہر بے معنی بات پر میں بھی اس قدر ہنسا اس قدر ہنسا کہ مجھے خیال بھی نہ آیا کہ آخر انار کی محبت پر ہنسنے سے ان کا مطلب کیا تھا اور وہاں تو ایک انار کی بجائے اناروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جو تپ دق کے مریضوں کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔

اسی محلے میں نگوڑی کا وہ مشہور بوڑھا رہتا تھا جس کی پھلوں کی دکان کے علاوہ ایک حسین بیٹی بھی تھی۔ اس کا نام انار تھا اور وہ دوسرے پھلوں کے ساتھ ساتھ انار بھی بیچتا تھا جسے چھوٹے موٹے آدمی خریدنے کی توفیق نہ رکھتے تھے جس کا حسن اس علاقے میں ضرب المثل بن چکا تھا۔ جس کے کئی ایک بیمار تھے جس کے لئے کئی صاحب حیثیت کنگال ہو چکے تھے۔ وہ انار۔ جو بڑے بڑے پیغام رد کر چکی تھی۔ وہ انار۔ جو ہر ایک کی ہونا پسند کرتی تھی اور کسی ایک کا ہو رہنا گوارا نہ کرتی — ان سب باتوں کے متعلق مجھے قطعی کچھ معلوم نہ تھا۔ انار سے میں صرف یہی سمجھتا تھا کہ ٹکے ٹکے ملتے ہیں اور مریضوں کے لئے مہلک نہیں بلکہ مفرح ہیں۔

مجھے ان باتوں کی خبر بھی کیسے ہوتی۔ دن بھر تو میں کام پر رہتا۔ شام کو ناگ کنٹھ سیر کو چلا جاتا۔ اور شام ہی سے سانپوں کے ڈر کے مارے دروازے بند کر کے پڑ رہتا۔ اور کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے سو جاتا۔ اس کے علاوہ چھٹی کے دن صبح سویرے اپنا تھیلا سنبھالا۔ تھرموس بوتل لٹکائے اور سوٹی پکڑے قرب و جوار میں کسی قابل دید مقام کی طرف چل نکلتا۔ اور شام کو تھکا ہارا واپس آ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑتا — اور پھر اگلے دن آنکھ کھلتی۔

اس کمرے میں مجھ سے کوئی ملنے نہ آتا تھا۔ صرف خاں صاحب کبھی کبھار دو ایک منٹ کے لئے آ جاتے۔ لیکن انہیں دیکھ کر بے ساختہ مجھے ہنسی آ جاتی اور سوجھ بوجھ غائب ہو جاتی اور وہ مسجد جس کے زیر سایہ میں رہتا تھا وہ تو گویا مجھ سے کوسوں دور تھی۔ باقی رہا ننھا۔ اُس نے ایک دو مرتبہ مجھ سے ادھر اُدھر کی بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے اُسے مذاق میں ٹال دیا۔ "ننھے میاں پہلے طعام پھر کلام" اور پھر بافراغت انار کھانے اور کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا تو جناب نگوڑی کے متعلق مجھے انار کے بھاؤ کے سوا اور کسی بات کا علم نہ تھا۔ صبح سویرے ننھا میرے لئے دو انار خرید لاتا۔ پھر وہ پکانے، ریندھنے میں لگ جاتا اور میں اخبار پڑھ کر نگوڑی کے پل پر پہنچ جاتا۔ دوپہر کو ننھا میرا کھانا دیں لے آتا۔ شام کو میں ناگ کنٹھ سے گھومتا ہوا واپس آتا اور کھانا کھا کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ ان حالات میں بھلا اگر دو لوازم کی باتوں کے متعلق میں جان بھی کیا سکتا تھا۔ پہلے پہل ننھے نے مجھے اتنے انار

کھاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ بابوجی آپ انار بہت کھاتے ہیں" میں نے دو ایک دانے منہ میں ڈال کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "بھئی انار سے محبت جو ہوئی" اس کے لبوترے چہرے پر سلوٹیں سی پڑ گئیں۔ آنکھیں ناچنے لگیں۔ دو موٹے موٹے ہونٹ بٹوے کے منہ کی طرح سمٹے۔ "چیز بھی تو لاجواب ہے" وہ یوں بولا گویا کچی گری چبا رہا ہو۔ "لاجواب!" میں نے مسکرا کر جواب دیا اور پیار سے اُن دانوں کی طرف دیکھنے لگا جو میں نے ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے پھر شاید اس لئے کہ کوئی دلچسپ بات کہہ کر ایک خوش مذاق آقا ہونے کا ثبوت دوں میں نے کہا۔ "ننھے میاں جسے انار سے محبت ہو، وہ اس کے سوائے اور کر ہی کیا سکتا ہے کہ انار خرید کر انہیں کھائے۔ کیوں! کیسی کہی!" وہ ہنسنے لگا۔ "جی جی۔ کھوب طریقہ ہے موحبّت جتانے کا۔ انار کی محبت میں انار کھاؤ۔ ہی ہی ہی ہی"۔ اُس کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی کو روکنے کے لئے میں نے کہا "ننھے میاں۔ اب تم کھانا تیار کرو۔ پہلے طعام پھر کلام۔ کیوں ٹھیک ہے نا!" "بالکل ٹھیک بابوجی" وہ بولا اور ہی ہی ہی کر کے ہنستا ہوا باہر چلا گیا اگر میں ننھے سے باتیں کرنے کا عادی ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ اُن سستے اناروں کے علاوہ وہاں ایک مہنگا انار بھی قابلِ فروخت ہے اور وہ قندھاری انار سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس صورت میں یہ واقعہ ہوتا ہی نہ اور آج یہ آپ بیتی سنانے کی نوبت نہ آتی۔

خیر اُس دن کے بعد جب بھی میں ننھے کو انار لانے کو کہتا تو اس کے لبوترے چہرے پر جُھریاں سی پڑ جاتیں آنکھیں ناچتیں اور دو موٹے موٹے ہونٹ سمٹتے اور "خوب طریقہ ہے صاحب! ہم سمجھتے ہیں"! یہ اُس کے منہ کی سلوٹیں سمٹ سمٹ کر کہتیں اور وہ بازار کی طرف چلا جاتا۔ اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ وہ کمبخت یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میرا سستے انار خریدنا۔ گویا اُس مہنگے انار کو مائل کرنے کے لئے صرف ایک تمہید تھی۔

اصل میں وہ خود اُس مہنگے انار کا بیمار تھا۔ فرصت کا وقت اُس پھل بیچنے والے بوڑھے کی دہلیز پر بیٹھ کر گذارتا۔ اُس کے ساتھ باتوں میں ہر وقت میرا ہی ذکر رہتا۔ بات بات پر اناروں سے میری رغبت کا قصہ لے بیٹھتا اور اُسے چھیڑتا رہتا۔ اور وہ بھی اُس کی باتیں خوب سنا کرتی اور میرے متعلق پوچھتی رہتی۔ آتے جاتے مجھے اپنے دروازے کی درزوں سے دیکھا کرتی اور حیران ہوتی کہ میری محبت کا اظہار صرف سستے انار کھانے تک کیوں محدود تھا جبکہ وہ مہنگا انار بھی خریدا جا سکتا تھا۔ لیکن میں ان باتوں سے قطعی ناواقف رہا۔ شاید اسی بات پر وہ چڑھ گئی کہ قندھاری کے ہوتے ہوئے لوگ سستے اناروں کی کیوں پسند کریں۔ بات بھی تو ٹھیک تھی۔ مختصر یہ کہ میری اس بے نیازی اور بے خبری سے خود انار کو بیمار کی جستجو ہوئی۔

اُنہیں دنوں ایک پولیس والا برخاست ہو کر آیا اور اس مسجد کا ملّا بن گیا جس کے ملحقہ کمرے میں میں رہتا تھا یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ اُس واقعہ کو تکمیل دینے کے لئے ایک پولیس والے کو برخاست ہو کر ملّا بننا پڑا۔ ایک تو تھا وہ پولیس مین دوسرے مسجد کا ملّا اور تیسرے پیدائشی طور پر ذرا لنگڑا تا بھی تھا۔ اب آپ خود ہی سمجھ لیں کہ وہ کس قسم کا انسان ہوگا۔ پولیس مین سے تو خیر میں بے حد ڈرتا ہوں البستہ مجھے ملاؤں کے متعلق یہ تجربہ نہ تھا کہ انہیں جھک کر سلام کرنا چاہیئے اور السلام علیکم کہتے ہوئے آواز زیادہ تر حلق کی گہرائی سے نکالنی چاہیئے اور اگر نماز کی عادت نہ ہو تو کچھ نہ کچھ مسجد میں تیل کے لئے پیش کرنا از حد ضروری ہے میری اس لاعلمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملّا جی بگڑ گئے۔ پہلا نکتہ جو انہوں نے پیدا کیا وہ واقعی قابلِ داد تھا۔ "دیکھو بھئی دیکھو کیسا زمانہ آیا ہے مسجد کے پہلو میں رہنا اور نماز کے پاس نہ پھٹکنا گویا چراغ تلے اندھیرا"۔ یہ بات قابلِ داد اس لئے تھی کہ اگرچہ چراغ تلے اندھیرا ہوا ہی کرتا ہے لیکن اُس نے لوگوں کو یقین دلا دیا کہ واقعی یہ بات قابلِ تعزیر تھی یعنی چراغ تلے اندھیرا قابلِ اعتراض مان لیا گیا اس کے بعد نہ جانے کیسے اُس نے یہ سُن پائی کہ مجھے انار سے رغبت ہے۔ چونکہ دل ہی دل میں وہ خود انار بیمار تھا۔ گو وہ لاحول پڑھ پڑھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کا عادی تھا کہ اس کے دل میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں اس لئے وہ مجھ سے اور بھی بگڑ بیٹھا اور اس قدر بگڑا کہ ایک دن تسبیح اٹھا کر خان صاحب کے پاس جا پہنچا اور کہنے لگا۔ "دیکھئے جناب عجیب زمانہ آیا ہے کہ مسجد کے پہلو میں کافر بسنے لگے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے وہ یہ قطعی بھول گیا کہ اس کا اپنا حجرہ بھی مسجد کے ہی پہلو میں ہے۔ خان صاحب کو اس بات پر ایسا مزا آیا۔ ایسا مزا آیا کہ وہ ٹماٹو کی بوتل چھلکی، وہ آنکھیں بار بار غروب اور طلوع ہوئیں، اور وہ سڑک کوٹنے والا انجن جھولنے لگا۔ غرض کہ خاں صاحب اس بات پر اتنا ہنسے کہ ملّا صاحب اپنا سا منہ لے کر چلے آئے۔ اگر خاں صاحب ہنسے بغیر اس کی بات سُن لیتے تو یقیناً وہ بات مجھ تک پہنچ جاتی اور یہ واقعہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا اور یوں ناگہاں مجھ پر ایک جیتی جاگتی بیوی نازل نہ ہو سکتی۔ لیکن ان باتوں کا نہ مجھے علم نہ ہوا اور بات بڑھتے بڑھتے بڑھتی ہی گئی۔

بات یہ ہوئی کہ میرے کمرے کے پچھواڑے میں۔ (اس گریبنے) فاصلے پر جو کوٹھی ویران پڑی تھی اس میں ایک نئے وکیل مسٹر رے آ بسے اور چونکہ وہ تھے صاحبِ ذوق اس لئے انہوں نے چوری چھپے انار کی تجارت شروع کر دی۔ آپ جانتے

ہی ہیں کہ پہاڑوں میں مکانات یہاں وہاں نیچے اوپر ایک دوسرے سے ہٹ کر ہوتے ہیں اور مکانوں کی چار دیواریاں ہوتی ہی نہیں اور ہر جگہ سے ایک نہ ایک پگ ڈنڈی یہاں سے وہاں چلی جاتی ہے میرے کمرے سے بھی ایک ایسی ہی پگڈنڈی رے صاحب کی کوٹھی تک چلی گئی تھی۔ اسی راستے انار مسٹر رے تک آیا جایا کرتی تھی۔ ایک دن صبح سویرے جب وہ مسٹر رے کی کوٹھی سے آ رہی تھی تو غالباً اس شوق کے مارے کہ دیکھوں تو یہ سستے اناروں کا متوالا کس حال میں ہے وہ میرے دروازے کے پاس ٹھہر گئی اور دروازوں سے جھانکنے لگی۔ اس دوران میں کہیں ملا صاحب جو اذان دینے چبوترے پر چڑھے تو انہوں نے انار کو وہاں کھڑے دیکھ لیا پھر کیا تھا۔ انہوں نے ایک ہنگامہ مچا دیا اور کئی من گھڑت چشم دید واقعات سنا دیئے۔ دوپہر تک انہیں ان باتوں پہ خود بھی یقین ہو چکا تھا۔ اور اس حد تک کہ جمعہ کی نماز میں مسجد کے پہلو میں حرام کاری کا مسئلہ خطبے میں لے بیٹھے اور اپنی چشم دید باتیں بطور مثال پیش کرنے لگے جن میں میری اور انار کی مثال پیش پیش تھی۔ اس روز خاں صاحب تو وہاں تھے نہیں اس لئے مسجد میں یہ قرار پایا کہ میرے افسر یعنی انجنیئر صاحب کو مل کر مجھے معطل کر دیا جائے اور اگر انجنیئر صاحب نہ سنیں تو قربان علی سے کہہ سن کر گنگونی کی میونسپل حدود سے مجھے باہر نکال دیا جائے۔

اگرچہ اس روز سارے شہر میں اس بات کا چرچا تھا لیکن ایک میں تھا جو قطعی بے خبر رہا۔ البتہ یہ میں نے ضرور دیکھا کہ لوگ میری طرف دیکھ دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا رہے ہیں۔ چند ایک نے تو طنزاً کچھ نہ کچھ انار کے متعلق کہا اور اس قدر زور سے کہا کہ میں سن سکوں۔ دو ایک نے کان پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کیا "سو ہنے دانے نے اناراں دے، عاشق ایوں پھرے نے جیویں کتے نے بزاراں دے" دو ایک مرتبہ میں یہ سن کر ٹھٹکا لیکن پھر خیال آیا کہ بھلا ان ٹکے ٹکے بکنے والے اناروں کے متعلق کوئی کیا طعنہ دے گا۔ اس لئے حسب معمول جھومتا ہوا اپل سے گھر تک آ پہنچا۔ گھر آیا تو دیکھا کہ اناروں کی پلیٹ خالی پڑی ہے۔ میں نے ننھے کو آواز دی "میاں دو انار تو لے آنا — سنا تم نے!" اس روز اس کے ملبوترے چہرے پر خوف سا طاری تھا۔ کہنے لگا "بابو جی — آپ کو معلوم ہے . . . . . !" میں نے اس کی گھبراہٹ کو دیکھ کر یا شاید اس خیال پر کہ اِدھر اُدھر کی کوئی فضول بات نہ چھیڑ بیٹھے۔ میں نے کہا "ننھے میاں۔ معلوم مالوم سب کچھ ہے ہمیں۔ صرف ہمارے انار ختم ہو گئے ہیں۔ لپک کر دو انار لے آؤ" پہلے اس نے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر کہنے لگا "لیکن بابو جی اس بڈھے دکاندار سے تو نہ لاؤں گا میں" اُسے یوں گھبرائے ہوئے دیکھ کر حسب عادت میں ہنس پڑا

جانے کون سی معمولی سی بات پر پریشان ہو رہا تھا میں نے ازراہِ مذاق کہا "ارے میاں کیا نہیں جانتے ہم سبھی کچھ جانتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ آج جمعہ ہے اور تم ننھے میاں ہو اور ہم ہم ہیں۔ اور ہمارے انار ختم ہو گئے ہیں۔ بس تم دوڑ کر انار لے آؤ" یہ سن کر وہ مایوس سا ہو گیا لیکن اس کی آنکھیں یوں ناچنے لگیں۔ گویا وہ اس مایوسی کا متمنی تھا۔ کہنے لگا "تو صاحب وہاں سے لے آؤں۔ اس اوپر والے بازار سے" "چاہے قندھار سے لاؤ لیکن لے آؤ" میں نے لاپروائی سے جواب دیا اور وہ مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

اتفاق سے اس وقت انار اپنے دروازے میں کھڑی تھی ننھے کو جاتے دیکھ کر اس نے اُسے گھر بلا لیا اور پوچھنے لگی "کہاں جا رہے ہو ننھے!" "انار لینے اور کہاں؟" ننھے نے تن کر جواب دیا۔ "ابھی انار کھانے کا شوق نہیں گیا" وہ بولی۔ ننھے میاں بھی اس انار کے دانے کو دیکھ کر چہکے اور اپنی ڈینگ مارتے ہوئے لگے اپنے آقا کی تعریف کرنے "ابھی ہمارے بابو صاحب کو سمجھا کیا ہے انہوں نے۔ بڑے آئے ہیں شہر بدر کرنے والے۔ واہ" "لیکن انہیں معلوم بھی ہے" وہ بولی "لو یہ اور سنو" ننھے نے جواب دیا "کیا انہیں مالوم نہیں؟ سب کچھ معلوم ہے۔ پر وہ کیا پروا کرتے ہیں۔ ان باتوں کی؟" "سچ" وہ بولی "ہاں ہاں اور نہیں تو کیا جھوٹ؟" اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ آواز مدھم ہو گئی۔ "ننھے واقعی انہیں میرا خیال ہے؟" "اور تو کیا ویسے ہی تفریحاً صبح شام پیٹ میں انار دانہ بھرتے رہتے ہیں؟" اُس نے جواب دیا۔

یہ جواب سن کر وہ بیتابانہ پوچھنے لگی "لیکن وہ مجھ سے ملتے کیوں نہیں؟" اس بات پر ننھا گھبرا گیا۔ اب کیا جواب دے۔ اپنے آقا کی عزت کا سوال درپیش تھا۔ وہ آقا جو اس کا اپنا آقا تھا۔ لیکن آخر وہ بجنوری تھا۔ کمبخت کو ایسی سوجھی کہ بس حد ہی کر دی۔ ایک پراسرار انداز میں منہ پر انگلی رکھ کر بولا "اس میں بھی اک بھید ہے"۔ اُس کے اس فرضی خود ساختہ بھید نے انار کے دل میں ایک اور چنگاری سلگا دی۔ ایک تو وہ بے نیاز نوجوان۔ اور دوسرے ایک دلچسپ بھید بس یوں سمجھ لیجئے کہ اُس آپ بیتی کی آخری کڑی بھی مہیا ہو گئی۔

اگلے دن مجھے صاحب نے بلا بھیجا۔ کہنے لگے "ول ول بابو۔ تم مسجد کے پاس رہتا ہے" "جی صاحب مسجد کے پاس" "ول تم نے مسجد کو نپاک کیا۔ مطلب یہ کہ مسجد کو بُرا کیا تم نے" "مسجد کو بُرا کیا" اُن کا عجیب سا سوال تھا۔ میں نے جواب دیا "صاحب میں نے تو کبھی مسجد میں قدم بھی نہیں رکھا" "شاباش شاباش۔ سو رائٹ۔ دیکھو مسجد کو بالکل بُرا نہ کرو۔ سمجھا نہیں ہم رپورٹ کرے گا۔ سمجھا" صاحب سے جان چھوٹی تو میں سوچنے لگا کہ اس قلندر کو آج سوجھی کیا

کہ سہد کو نلپک کرنے کا قصد لے بیٹھا ـــــ پھر خیال آیا کہ بھئی۔ آج دو گھونٹ زیادہ پی لی ہوگی بے چارا ہضم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس خیال سے مجھے تسلی سی ہو گئی۔ اور میں گھر جا کر اطمینان سے سو رہا۔

انجینئر صاحب سے مایوس ہو کر دہ قربان علی سے ملے۔ قربان علی ایک صاحبِ ذوق جوان تھے۔ گورا چٹا جسم اور چھیڑ دینے والی آنکھیں ہنس کر کہنے لگے بھائی جب تک محلے میں ایک قابلِ فروخت انار ہے لوگ خریدیں گے۔ بس جھگڑا ختم بلکہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ وہ مسٹر سے اور گپتا کی بجائے ایک مسلمان کے گھر آتی جاتی ہے۔ ارے میاں۔ باپ کو کوئی اعتراض نہیں۔ وہ خود بھی یہی چاہتی ہے۔ پھر اس میں ہمارا تمہارا کیا نقصان۔ باقی رہا مسجد کے ساتھ کا قضیہ، مان لیا کہ وہ ولیم سب اوورسیئر مسجد کے ملحقہ کمرے میں رہتا ہے۔ لیکن وہ بھی تو مسجد کے پڑوس میں رہتی ہے۔ اُسے کیوں نہیں نکالتے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

اس وقت تقریباً نو بجے ہوں گے۔ وہ سب مسجد کے باہر چوگان میں کھڑے بحث کر رہے تھے۔ انار بھی دروازے کی درزوں سے لگی کھڑی تھی اور یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ عین اس وقت حسبِ معمول میں بھی پل پر جاتے ہوئے وہاں سے گزرا۔ میں نے دور سے قربان علی کو دیکھا اور ایک السلام علیکم پھینک کر اپنی طبعی بے نیازی سے آگے چل پڑا۔ مجھے مطلقاً یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت وہ سب وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے۔ اور مجھے دیکھ کر سب خاموش کیوں ہو گئے تھے۔ اور ملا کی لنگڑی ٹانگ گھڑی کے پنڈولم کی طرح کیوں ہل رہی تھی۔ میں نے دو ایک قدم اٹھائے تھے کہ قربان علی نے آواز دی۔ "سب اوورسیئر صاحب! ذرا بات تو سنئے۔" "فرمائیے۔" میں نے سوٹی گھماتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے"؟ "کس معاملے میں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اُن کی آنکھیں ناچنے لگیں۔ کہنے لگے "یعنی۔۔۔۔ تو یوں سمجھ لیجے ـــــ میرا مطلب ہے فرض کر لیجیے کہ ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ اُسے اعتراض نہیں اس کے باپ کو اعتراض نہیں، اکثر لوگوں کے پاس آتی جاتی ہے، لوگوں کو بھی اعتراض نہیں تو صاحب اگر کسی مسلمان کے پاس آنے جانے لگے ـــــ تو آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟" "مجھے؟" میں نے کہا۔ "مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے آپ؟" ملا نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو جھلاتے ہوئے کہا۔

"کہہ تو رہا ہوں" وہ بولے۔ اور پھر مسکرا کر کہنے لگے "کیا یہ سچ ہے کہ آپ انار خریدتے ہیں"۔ "انار؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "ہاں ضرور خریدتا ہوں۔ کیوں نہ خریدوں۔" اس بات پر مجمع پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ غصے میں بھرا ہوا تو میں تھا ہی۔ انہیں خاموش دیکھا تو سلام علیکم کہہ کر پل کی طرف چل پڑا۔ اور سوچنے لگا کہ یہ کیا بکھیڑا ہے۔ چار ایک قدم کے بعد میں نے ایک بلند قہقہے کی آواز سنی۔ قربان علی کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ "بہت دلیر نوجوان ہے خدا کی قسم تم اسی سلوک کے لائق ہو" اور وہ پھر ہنسنے لگا۔

اس روز قربان علی کی باتیں سن کر ملا کی لنگڑی ٹانگ جھولتی ہوئی دیکھ کر اور دوسروں کی سرگوشیاں سُن کر شاید میں یہ سمجھ لیتا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ شاید مجھے یہ بھی سوجھتی کہ اُن ٹکے ٹکے بکنے والے اناروں کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے جسے انار کہا جا سکے اور اُس نرالے انار کی خریداری مجھ پر بھی تھوپی جا سکتی ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں جب پورے دو ماہ کے بعد گھر جانے کا خیال دل میں سما رہا ہو۔ جب انار کلی اور مال روڈ کا نقشہ آنکھوں میں پھر رہا ہو۔ جب دفتر کے وسیع کمرے کی خوش گپیاں کانوں کو سنائی دے رہی ہوں۔ جب کوئی ملازم خوش اسلوبی سے اپنا کام سرانجام دینے کے بعد ترقی کے خواب دیکھ رہا ہو۔ یعنی جب کوئی مستقبل میں کھویا ہوا ہو تو حال دھندلا پڑ جاتا ہے اور ایسی ویسی باتوں پر دھیان دینا ناممکن ہو جاتا ہے اسی سے اُس روز میرے لئے ان عام روزمرہ کی تفصیلات کے متعلق کچھ سوچنا قطعی ناممکن تھا۔ نگوڑی کا پل مکمل ہو کر معلق کر دیا گیا تھا۔ اور اگلے روز میں واپس لاہور جا رہا تھا۔ اس لئے قربان علی کی وہ خوبصورت لڑکی اور وہ دلیر نوجوان میرے لئے چنداں دلچسپ نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں سیٹی بجاتا چھڑی گھماتا، جاگتے میں لاہور کے خواب دیکھتا ہوا پل پر جا پہنچا۔

دوسرے دن جب میں اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ خاں صاحب اور قربان علی کمرے میں داخل ہوئے۔ خان صاحب کا سیندھوری چہرہ خوشی سے پھول رہا تھا۔ اور آنکھیں گویا تھی ہی نہیں یعنی ٹماٹو چٹنی کی بوتل مزے میں چھلک رہی تھی۔ وہ کہنے لگے۔ ارے واہ میاں کیا کہتے ہیں تمہارے۔ تم نے وہ کر دکھایا جو بڑے بڑے رئیس نہ کر سکے۔ شیر آپ ہی پنجرے میں بند ہونا چاہتا ہے۔ پہلے تو اُن کی بے معنی باتیں سُن کر مجھے غصہ سا آیا لیکن پھر انہیں ہنستے دیکھ کر میں بھی ہنس دیا۔

وہ بولے۔ میاں اب تو وہ خود چاہتی ہے۔ پھر دیر کس بات کی بس آج ہی ہو جائے یہ نیک کام ہے بھی تو وہ انار کا دانہ۔" "ہیں؟ انار کا دانہ؟" بے ساختہ

بیت کر منہ سے نکل گیا" کون انار کا دانہ؟" ہی ہی ہی ہی" وہ قہقہہ مار کر ہنستے "تمہارا من بھاتا انار ہی ہا ہا ہا ہا"

"نہ جانے کیوں اس وقت مجھے وہ ٹماٹو کی چھلکتی ہوئی بوتل کڑوی سی لگی۔ جی میں آیا کہ ان دونوں اصحاب کو دروازے سے باہر دھکیل دوں لیکن پھر خیال آیا کہ نگوٹی میں میرا آخری دن ہے۔ جاتے ہوئے لوگوں سے بگاڑ ــــ میں خاموش ہو رہا۔

قربان علی خاں صاحب سے کہنے لگے "میں سمجھتا ہوں انہیں" لیکن خاں صاحب ہنستے ہوئے چلائے" واہ میرے شبیر نگوٹی کا شہر" قربان علی بولے، سب اور میر صاحب بات یہ ہے کہ ــــ کہ یعنی فرض کیجئے کہ ایک حسین لڑکی ہے"۔

فرض کر لیجئے! میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ کیوں فرض کر لیں ہم۔ ہم نے تو کوئی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی وہاں۔ پھر فرض کرنے کا مطلب۔ فرض کر لو۔ گویا میں طالب علم تھا اور وہ ریاضی کا پروفیسر لیکن اتفاقاً میری نگاہ گھڑی پر جا پڑی۔ لاری چھوٹنے میں صرف پانچ گھنٹے باقی تھے تو صاحب جان چھڑانے کے لئے میں نے جی کہہ دیا۔ اس پر وہ بولے "ہاں تو اس کا باپ اسے بیچتا ہے اور وہ بخوشی بکتی ہے"۔ تو میں کیا کروں۔ میں نے سوچا۔ میں کوئی دلال ہوں کہ ان باتوں سے واسطہ رکھوں ــــ لیکن جی میرے منہ سے خواہ مخواہ نکل گیا۔ "حسن کا یہ عالم ہے کہ سارا علاقہ اس پر تلا ہے"۔ پڑا مرے میں نے سوچا"۔ کئی لوگوں نے پیغام بھیجے۔ بڑے بڑے رئیسوں نے لیکن اس نے کسی کا ہدیہ پسند نہ کیا"۔ "ہوں" میں نے غصہ دباتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کہنے لگے تو صاحب اسی محلے میں ایک نوجوان آ بسا۔ اور اس لڑکی سے محبت کرنے لگا۔ ہی ہی ہی ہی۔ ٹماٹو چٹنی کی بوتل چھلکی، کیسے نہ ہوتا عاشق؟ ادھر جوانی ادھر حسن اور خدا کی قسم وہ انار کا دانہ اور یہ انار کا دیوانہ۔ ہا ہا ہا ہا۔ جب دو شنگرفی گال ابھر ابھر کر آپ کو گدگدائیں۔ دو آنکھیں مداری کے روپے کی طرح کبھی گم اور کبھی ظاہر ہوں تو چاہے آپ غصے سے بھرے بیٹھے ہوں۔ آپ کے لئے ہنسی کو ضبط کرنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو جائے گا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ قربان علی صاحب بولے ہاں تو۔ دونوں کا ملاپ نہ ہو جاتا ہے۔ رات کو ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ لوگ آوازے کستے ہیں لیکن وہ دلیر نوجوان کسی کی پروا نہیں کرتا۔

"شیر شیر" خاں صاحب چلانے لگے۔

"ٹھیک" میں نے بھی بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"اب وہ لڑکی" قربان علی بولے "اس نوجوان سے بیاہ کرنا چاہتی ہے۔ یعنی صرف یہی نوجوان اس کو اس گناہگارانہ زندگی سے بچا سکتا ہے۔ سوچئے اور میر صاحب۔ ذرا سوچئے۔ آج تک اس نے نہ جانے کیسے کیسے بڑے آدمیوں کے پیغام رد کئے ہوں گے۔ بڑے بڑے رئیسوں کو اس سے محبت تھی لیکن وہ ان سب کو الو بنا کر ٹھکرا دیتی تھی۔ لیکن اب اب وہ خود اس نوجوان سے بیاہ کرنا چاہتی ہے"۔

اس کے بعد وہ دفعتہً خاموش ہو گئے۔ اس گہری خاموشی اور ان دونوں کی معنی خیز نگاہوں سے میں کچھ گھبرا سا گیا۔ "تو پھر" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھ کر پوچھا۔

"پھر! ہا ہا ہا ہا ہی ہی"۔ دو شنگرفی تودوں میں ایک آنکھوں کا جوڑا چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگا۔

"میرا مطلب ہے" قربان علی بولا "میرا مطلب ہے آپ کی اس معاملے میں کیا رائے ہے؟"

"میری رائے۔ میری رائے کا اس بات سے واسطہ؟"

"کیوں نہیں" خانصاحب بولے "سب کام تمہاری رائے سے کیا جائے گا"۔

"لیکن رائے کا مطلب؟ لڑکا راضی لڑکی راضی۔ رائے؟" عجیب معاملہ تھا۔ بے ڈھنگ بکھیڑا۔

"میرا مطلب ہے اُن کی شادی کے متعلق" قربان علی نے کہا۔

"لڑکے کو فوراً شادی کر لینی چاہئے" میرا مطلب ہے یعنی اگر اس نوجوان کی جگہ میں ہوتا تو فوراً بیاہ کر لیتا"۔

"واہ واہ۔ واہ واہ" خاں صاحب چیخنے لگے۔ "تم سے یہی توقع تھی واہ رے میرے شیر!"

قربان علی آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے۔ "اور پھر ابھی آئے ہم۔" کہہ کر خاں صاحب کا ہاتھ پکڑ باہر نکل گئے۔

اُن کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا اور لاحول پڑھ کر بستر باندھنے لگا۔ لاحول تو پڑھنا ہی تھا۔ ایسی بے معنی باتیں میں نے کبھی نہ سنی تھیں۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک قافلے کی صورت میں لوٹے۔ قربان علی، خاں صاحب۔ وہ لنگڑا ملا۔ وہ ایک نوجوان محلے دار اور ایک برقعہ پوش عورت اندر آ کر وہ بے تکلفی سے اس چٹائی پر بیٹھ گئے جو کمرے میں بچھی ہوئی تھی۔ انہیں

اس طرح آتے دیکھ کر مجھے از سرِ نو غصہ آ گیا۔ جی میں آیا کہ سب کو باہر نکال کر دروازہ بند کر لوں لیکن ــــــ اتنے لوگوں کو اپنے گھر سے نکالنا زرا دل گردے کا کام ہے۔ اور میں۔ خیر چھوڑیئے اس بات کو۔ اپنی بے بسی محسوس کر کے میں نے خاموش رہنا تو درکنار اُن کی آمد پر دلچسپی محسوس کرنے کا جواز پیدا کر لیا۔ جانے کون ہے وہ دلیر نوجوان جس کا تذکرہ کر رہے تھے وہ۔ اُدھر وہ لنگڑا ملا نکاح کی رسم ادا کر رہا تھا اور ادھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کر دیکھیں تو وہ دلیر نوجوان کون ہے۔ انہیں نوجوانوں میں سے کوئی ایک ہو گا۔

جب ایجاب قبول کا وقت آیا اور ملا نے آنکھوں میں مسکرا کر پوچھا بابو جی آپ کو فلاں کی بیٹی اور فلاں کی پوتی کو اپنی زوجیت میں لینا قبول ہے تو میرے کان کھڑے ہوئے۔ دیکھیں وہ نوجوان کون ہے ــــــ

عین اسی وقت خاں صاحب کھی کھی کھی کر کے ہنسے۔ "عجب تماشا ہے"۔ وہ بولے۔ لڑکی دل سے چاہتی ہے۔ لڑکا تیار ہے۔ تو اس سوال کا مطلب۔ ہا ہا ہا ہا۔" اُس ٹماٹو چٹنی کی چھلکتی ہوئی بوتل سے ایسے چھینٹے اڑے کہ تمام صاحبان ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ لنگڑا ملا بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ بس پھر کیا تھا۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ بابو جی آپ کو مبارک ہو۔ خدا آپ کو اس نیک کام کا صلہ دے۔ مبارک ہو۔ اس وقت مجھے ہوش آیا اور معلوم ہوا کہ وہ نوجوان میں ہی تھا اور وہ میرے نکاح کی رسم ادا ہو رہی تھی اور وہ برقعہ پوش میری ہی بیوی تھی۔ غصے سے میرا منہ لال ہو گیا لیکن اپنا منہ لال کرنے کے سوا اب اور میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ نکاح کی رسم ادا ہو چکی تھی۔ خاموش رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

"صاحبان" خاں صاحب بولے "دعا کیجیے کہ خدا کرے ان کی باہمی محبت یونہی قائم رہے اور یہ پھولیں پھلیں"۔ "آمین!" وہ سب چیخنے لگے خاں صاحب بولے "لڑکی کی طرف سے جہیز کے لئے میں ایک ہزار روپے کی حقیر رقم پیش کرتا ہوں۔ جس سے ایک تھیلی میرے سامنے آ گری"۔ مرحبا خاں صاحب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے وہ سب چلے گئے۔ صرف خاں صاحب میں اور وہ رہ گئے۔

خاں صاحب نے جھک کر میرے کان میں کہا "مبارک ہو انار اب تمہاری ہے"۔ "انار" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ انہوں نے مسکرا کر اُس برقعہ پوش کی طرف اشارہ کیا۔ اور خود باہر نکل گئے۔ غصے سے میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ اور وہ کمبخت برقعے میں لپٹی ہوئی چوکی پر گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس اجنبی سی میلی سی گٹھڑی کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر کھاڑی میں پھینک دوں اور خود کہیں بھاگ جاؤں وہ لاری جس میں مجھے جانا تھا۔ انارکلی اور مال روڈ سب باتیں میرے ذہن سے نکل چکی تھیں اور میں غضب میں آ کر اس میلی سی گٹھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ معاً اُس نے برقعہ اٹھایا۔ رنگوں کا ایک طوفان اٹھا۔ دو کالی کالی آنکھوں نے میری طرف دیکھا۔ ایک لطیف مسکراہٹ کمرے میں تیرنے لگی۔ کمرے میں جو رنگین تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں کالے نیلے دھبے سے دکھائی دینے لگیں۔ میرے ہاتھ سے ٹائم ٹیبل چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔

مجھے پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرانے لگی اور پھر اُس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ نہ جانے اس وقت تھا کہاں سے آ ٹپکا۔ اس کا منہ مسکراہٹوں سے لدا ہوا تھا۔ آنکھیں ناچ رہی تھیں "مبارک ہو۔ بابو جی" اُس نے چوری چوری انار کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "انار کھائیے بابو جی۔ یہ لیجئے" اُس نے اُس پلیٹ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جس میں انار کے دانے پڑے تھے۔ "انار کھائیے"۔ اس نے دہرایا! در پیشتر اس کے کہ میں وہ دانے اٹھاتا پلیٹ میرے سامنے سے اٹھا کر "کھائیے بھی نا" کہتا ہوا کمرے سے باہر بھاگ گیا۔ انار نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے نگاہیں جھکا لیں۔

ممتاز مفتی

شعر

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی بدایونی

نقشِ پا

یہ نیم خواب گھاس پر اُداس اُداس نقشِ پا
کچل رہا ہے شبنمی لباس کی حیات کو
وہ موتیوں کی بارشیں ہوا میں جذب ہو گئیں
جو خاکدانِ تیرہ پر برس رہی تھیں رات کو

یہ رہروانِ زندگی خبر نہیں کہاں گئے
وہ کونسا جہان ہے ازل نہیں ابد نہیں!
دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب
یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں!

ہے مرکزِ نگاہ پر چٹان سی کھڑی ہوئی
اُدھر چٹان سے پرے وسیع تر ہے تیرگی
اسے پھلانگ بھی گیا تو اُس طرف خبر نہیں
عدم خراب تر ملے نہ موت ہو نہ زندگی!

ہزار بار چاہتا ہوں بندشوں کو توڑ دوں
مگر یہ آہنی رسن یہ حلقہ ہائے بندگی
لپٹ گئے ہیں پاؤں سے لہو میں جذب ہو چکے
میں نقشِ پائے عمر ہوں فریب خوردۂ خوشی۔

کوئی نیا افق نہیں جہاں نظر نہ آ سکیں
یہ زرد زرد صورتیں یہ ہڈیوں کے جوڑ سے
فضا کے بازوؤں میں کاش اتنی تاب آ سکے
دکھا سکیں وہ عہدِ نو ہی زندگی کے موڑ سے!

اختر الایمان

ایک خط

(اپنے لندنی دوست کے نام)

یہ آواز تم تک بہت دیر سے پہنچی ہے لیکن تمہارا تقاضا ہے کہ یہ آواز تم تک ضرور پہنچائی جائے۔ حالات بدستور ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان ابھی صدیوں تک کروٹ نہیں لے گا۔ میں نے ریڈیو پر سُنا۔ ہٹلر کہہ رہا تھا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ تمام جرمن قوم خدائے قدوس کے سامنے حاضر ہو کر التجا کر رہی ہے کہ وہ اُسے تنازع البقا میں مدد دے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا۔ اِس وقت جب کہ منشائے ایزدی قوموں کی قیمت کو جانچ رہا ہے۔ جرمن سپاہی عدالت ایزدی میں حاضر ہے، تمام تقریروں میں جوش و خروش کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ چیز یہاں نایاب ہے۔ تم سُن کر ہنسو گے ہمارا ایک قومی لیڈر ایک دن اسٹیج پر کئی ہزار کتابی کیڑوں کے سامنے کہہ رہا تھا کہ اگر اُس کے سامنے اقبال کا کلام اور پاکستان کی حکومت پیش کی جائے اور کہا جائے کہ وہ اپنے لئے ان میں سے ایک چیز انتخاب کرے تو وہ اقبال کے کلام کو پاکستان پر ترجیح دے گا۔ جذبہ نہایت ارفع تھا اور تم اقبالی ہونے کی وجہ سے یہ بات سُن کر کرسی سے اچھل پڑے ہوگے لیکن جانتے ہو اِس قومی لیڈر نے اقبال کا کس قدر مطالعہ کیا تھا؟ اس نے اس مجمع میں اقبال کا ایک مصرعہ یوں پڑھا تھا۔

چین و عرب رہے، ہملا ہندوستاں

اور صرف یہی لنگڑا مصرعہ پڑھا تھا۔ بس اسی سے اندازہ لگا لو کہ پاکستان کو اقبال کے کلام کے عوض ٹھکرانے والوں کے جذبات کس قدر صداقت پر مبنی ہیں۔ خیر یہ تو ادنیٰ لطیفہ ہے تم حسب معمول کہہ دو گے۔ سب لوگ عروض تو نہیں جانتے۔ ہندوستان کا چہیتا گویا سہگل بھی تو غالب کے اشعار کے ساتھ بدسلوکی کیا کرتا ہے۔ لیکن یہاں لغزش شاعری تک ہی محدود نہ تھی مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس تھا۔ ہندی مسلم کی قسمت پر سوچ بچار کے لئے لاکھوں آدمیوں کا ایک پریشان انبوہ ہر روز ظفر پارک میں تین دن جمع ہوتا رہا۔ لیکن قائدوں کی سست رفتاری کا یہ عالم تھا کہ دس سال قبل جس خیال کو وضاحت سے اقبال مرحوم نے پیش کیا تھا اور پانچ چھ سال سے ہم تم کیمبرج، آکسفورڈ اور لندن میں جس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے ہیں۔ اسی خیال کو زبانی زبانی اس پریشان ہجوم کے سامنے ۱۹۴۰ء میں پیش کر دیا گیا اور کسی خدا کے بندے نے اُن سے یہ نہ کہا کہ قبلہ اب اس خیال کو خیالی دنیا سے نکال کر کچھ عملی شکل بھی اس کی مرتب کریں۔ پاکستان کا تخیل موجود ہے لیکن ابھی تک وہ قوتیں بروئے کار نہیں آئیں جو مخلصانہ طور پر اس کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں۔ ہندی مسلمان صحیح قیادت کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک طرف ہندو ہمسائے سے خائف ہے اور دوسری طرف فرنگی آقا سے مرعوب ہے۔ اور نہیں سمجھتا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ نیلس مجھ سے ملنے آئی تو اُس نے ہماری سرگرمیوں پر عجب انداز میں تبصرہ کیا۔ کہنے لگی "لندن میں تم ہمیں اسلامیات اور اسلامی سیاست پر اس قدر واضح انداز میں لکچر دیتے تھے کہ ہمیں تمہارا قائل ہونا ہی پڑتا تھا لیکن یہاں آ کر اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے وہ تو سب مضحکہ خیز ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ تمہیں کون سی چیز یہاں کی اسلامی سیاست میں مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔

کہنے لگی "یہی ایک پاکستان کا قصہ لو۔ تم مسلمان تو بچوں کی طرح ہو۔ ملک کے مختلف حصوں کو اسی طرح سمجھتے ہو جیسے انارکلی میں کسی دُکان پر کھلونے پڑے ہوئے ہوں اور بغیر سوچے سمجھے مچل رہے ہو کہ یہ کھلونا بھی تم لو گے وہ کھلونا بھی تم لو گے۔ یہ مانا کہ کھلونے تمہیں پسند ہیں لیکن بہرحال یہ کھلونے تمہارے نہیں اور اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ہونے چاہئیں تو پہلے تو تمہیں یہ معین کرنا چاہئے کہ کون کون سے کھلونے تمہارے ہونے چاہئیں اور پھر ذرا اپنی جیب ٹٹولو کہ اِن کھلونوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے دام بھی پاس ہیں یا نہیں۔ ملک صرف اتنا کہہ دینے سے اپنائے نہیں جا سکتے کہ وہ تمہارے ہیں۔ ہم نے تم سے بھیک مانگ کر ہندوستان حاصل نہیں کیا تھا جو ہم بھیک مانگنے پر

تمہیں واپس کر دیں، اور اس کا جو حصہ تمہیں پسند ہو وہی واپس کر دیں۔ سب سے پہلے تمہیں ہم کو یقین دلانا ہوگا کہ فلاں فلاں حصہ درحقیقت تمہارا ہے اور اس کے بعد یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم اس کو حاصل کر سکنے کے اہل ہو۔

میں نے کہا۔ فلس یہ تو ممکن ہے کہ ہم عنقریب تم پر یہ ثابت کر دیں کہ فلاں فلاں حصہ بالکل اسی طرح ہمارا ہے جس طرح سوڈیٹن لینڈ جرمنوں کا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ کیسے ثابت کرنا ممکن ہوگا کہ ہم اس کو حاصل کر سکنے کے اہل ہیں؟

فلس بولی۔ یہی تو مسئلے کا اہم حصہ ہے میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ کھلونوں کی قیمت ادا کرنے کے لئے کھرے سکے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ سکے قوم کا وہ خونِ عزیز ہوتا ہے جو فتح کی دیوی کے قدموں پر بہایا جاتا ہے۔ اس قربانی میں بڑے چھوٹے اور بوڑھے بچے کی تمیز نہیں کی جاتی۔ سب آدمی ہیر ہینلائن (Herr Henlein) کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتے کہ بیس سال تک صرف بیلچوں سے پریڈ کرنے کے بعد رات کی رات میں سوڈیٹن لینڈ پر قبضہ کر لیں۔ فنلینڈ کی طرف دیکھو محض ملک کا ایک حصہ محفوظ رکھنے کے لئے انہوں نے دیکھتے دیکھتے پندرہ بیس ہزار آدمی قربان کر دیئے ہیں۔ اس کے برعکس اپنی حالت کا جائزہ لو۔ اول تو تمہارے قایدین بیک وقت مختلف سمتوں میں کھڑے ہو کر مختلف آوازوں سے چلا رہے ہوتے ہیں۔ - -

- - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - قوموں کی موت و حیات کی کشمکش میں چندسو، چند ہزار بلکہ لاکھوں جانوں کا تلف ہو جانا ایک بالکل قدرتی امر ہے۔ اور جو قوم اس راز کو نہیں سمجھتی اُس کے لئے سربلندی مقدر نہیں کی گئی۔ تم سے تو سرحد کے قبائلی ہی بہتر انسان ہیں۔ ہر روز اُن کے جتھے گھروں سے شادیانے بجاتے ہوئے نکلتے ہیں۔ شام کو بھاری فوجوں سے نبرد آزمائی کرتے ہیں اور کافی طور پر مسلح نہ ہونے کی وجہ سے اُن میں سے کئی مر جاتے ہیں لیکن جب کوئی جتھا مالِ غنیمت لے کر واپس پہنچتا ہے تو نعرۂ تکبیر کی آوازوں سے پہاڑیوں کے دامن گونج اُٹھتے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اُسی رات کو انہی قبائلیوں کے ڈیروں میں کئی نوعمر لڑکیاں بیوہ ہو گئی ہیں اور کئی بچے یتیم رہ گئے ہیں۔ جتھے سے واپس آنے سے کامیاب افراد اور مشین گنوں اور سنگینوں سے اُلجھ کر ختم ہو جانے والے شہیدوں کے لئے یکساں طور پر خوشی منائی جاتی ہے۔ میں تو جب ان خبروں کو پڑھتی ہوں تو مجھے اقبال کے وہ شعر یاد آ جاتے ہیں جن کا ترجمہ تم نے ہمیں لندن میں سنایا تھا۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

میں تو سمجھتی ہوں سرحدیوں سے بہتر اقبال کے فلسفۂ حیات کو کسی نے نہیں سمجھا اور یا یہ کہ اقبال نے قبائلیوں کی زندگی سے بہتر اور کسی زندگی کو نہیں سمجھا۔ تم لوگ تو ابھی تک پریشان بھیڑوں کا ہجوم ہو جو لاٹھی کے سے گھبرا کر بھاگنے لگتا ہے اور بندوق کی آواز سُن کر سہم جاتا ہے۔

فلس تو یہ کہہ کر چل دی اور میں سوچتا رہا کہ ان غیر ملکیوں اور بالخصوص آزاد ملکوں کے باشندوں کا نظریۂ حیات ہم سے کس قدر مختلف ہے۔

ہاں انگلستان میں یہ سب کچھ ممکن ہے۔ وہاں تم جبری بھرتی سے انکار کر سکتے ہو۔ ہاؤس آف کامنز کی دلچسپ بحثیں میں نے بھی پڑھی تھی اور یہ دیکھ کر متعجب نہیں ہوا تھا کہ حکومت نے ایک کامنر کے سوال کے جواب میں اعتراف کر لیا ہے کہ فرنگی اپنی سرزمین پر گورے اور کالے سے یکساں سلوک کرنے پر مجبور ہے اگر گورا یہ کہہ کر بھرتی ہونے سے انکار کر سکتا ہے کہ اُس کا ضمیر جنگ کرنے پر اُسے ملامت کرتا ہے تو کالے کو بھی یہ حق ہے کہ وہ بھرتی ہونے سے حسبِ خواہش انکار کر دے۔ لیکن ان کالوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وہ فرنگی کی اپنی زمین پر بس رہے ہیں۔ کالوں سے چھینی ہوئی فرنگی کی زمین یعنی اس غلام آباد میں آزادہ روی کے ان حقوق سے ہر ایک کالا محروم کر دیا گیا ہے۔ تم وہاں بھرتی ہونے سے انکار کر رہے ہو لیکن یہاں کالے بھرتی ہونے کے لئے ترس رہے ہیں اور انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ کالوں کے خون کی ارزانی ضرب المثل ہے۔ لیکن یہاں تو یہ قصہ ہے کہ اب اس خون کو خریدنے کے لئے کوئی تیار ہی نہیں۔ - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - کالوں کا خون کوئی اتنی اہم چیز نہیں جس کی حفاظت کے لئے ہندوستانی اپنے آپ کو تیار کر لیں۔ میں جب عراق کے مختلف مدارس میں گیا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ادنیٰ جماعت سے کے

اعلیٰ جماعت کے طلبا تک سب فوجی لباس میں ملبوس تھے۔ بغداد میں ایک معلم سے میں نے اس کی وجہ دریافت کی۔ بولا۔

"اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے ہم جہاد کی سپرٹ کو بچپن ہی سے بچوں کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے طلبہ کے لباس میں تلوار اور بندوق شامل نہیں لیکن فوجی لباس سے بھی ایک خاص نفسیاتی اثر پڑتا ہے اور وہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فوجی تنظیم اور یک جہتی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اور جب وہ اعلیٰ مدارج میں پہنچتے ہیں تو ہم انہیں بندوق اور تلوار بھی دے دیتے ہیں۔ اور تجربے سے ہم پر یہ واضح ہوا ہے کہ فوجی تنظیم کے بغیر مدارس میں پڑھتے ہوئے بچوں کی نسبت وہ بچے جلد اور بہتر سپاہی بنتے ہیں جو فوجی نظام والے مدارس سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ لیکن آپ فوجی تنظیم اور فوجی نظام پر اس قدر مصر کیوں ہیں؟ مدارس کا منتہائے مقصد صرف یہی تو نہیں ہوتا۔

اس پر بغدادی معلم کچھ جھنجھلا گیا کہنے لگا "مل گاندھی کے ملک میں بسنے والوں کا مقصدِ حیات ہم سے ضرور مختلف ہوگا لیکن اسلامی حکومت کے مدارس کا نظام تو صرف فوجی ہو سکتا ہے، اگر شیر دنیا میں روباہ بازی کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، اگر بھینسے کو سینگ اس لئے نہیں دئے گئے کہ وہ اُن کو کٹوا کر گدھا بن جائے اور اگر شاہین کو پنجے اس لئے نہیں دئے گئے کہ وہ اُن کو توڑ کر چڑیوں میں مل جائے تو مسلمان کو بھی جہاد کی تعلیم اس لئے نہیں دی گئی کہ وہ ظلم و ستم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ اور جب آپ جہاد کے قابل ہیں تو پھر آپ فوجی تنظیم کے کس طرح منکر ہو سکتے ہیں۔ فوجی تنظیم کے بغیر جہاد ممکن ہی کس طرح ہے۔ آپ دیکھتے نہیں جن قوموں سے فوجی تنظیم ختم ہو چکی ہے وہ ظلم و ستم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے قابل نہیں رہے یہی حال اُس مسلمان کا ہے جو اپنے بچوں کو فارسی، عربی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے علاوہ کئی علوم و فنون کی تعلیم تو دیتا ہے لیکن انہیں جہاد کی تعلیم نہیں دیتا اور انہیں جہاد کے لئے تیار نہیں کرتا۔ جہاد کا یہ مفہوم نہیں کہ تم خواہ مخواہ لوگوں سے اُلجھتے پھرو۔ یہ فرنگی کی تعبیر ہے۔ جہاد نام ہے حق و باطل میں کشمکش کے وقت حق کے نام پر جان لٹا دینے کا۔ لیکن اگر تم سرے سے جہاد ہی کے قابل نہیں تو حق و باطل کی تمیز کیوں کرنا چاہو گے۔ تم خود ہی کہو غلامی کی زندگی میں تم دن میں کئی مرتبہ اُس حق کا اعلان کر سکتے ہو۔ جس کو تم حق سمجھتے ہو۔ جہاد کی سپرٹ سے بیگانگی نے تمہیں حق پرستی کی سپرٹ سے بیگانہ بنا دیا ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے سکول سے وہ جسم لے کر باہر نکلیں جو حق و باطل کی تمیز کرتے وقت اپنے ضمیر کو اس لئے کچل کر رکھ دے کہ وہ باطل سے نبرد آزمائی نہیں کر سکتا۔ ضمیر کے بغیر کھوکھلے جسموں سے ابوبکر اور حسین پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دنیا میں یزیدوں کی کمی نہیں۔ حق کو قائم رکھنے کے لئے حسین پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب تم جہاد کے قابل ہو اور فوجی تنظیم پیدا کر لو۔

سنا تم نے بغدادی مدرس کا نظریہ تعلیم ہم سے کس قدر مختلف ہے۔ میں نے یہی نظریہ اپنے کالج کے سامنے پیش کیا تو ایک کہنہ مشق استاد بولے:۔

"باقر صاحب آپ کیا کرتے ہیں مسلمان بچے بادشاہوں کی اولاد ہیں آپ ان کو کوچبانوں کی وردی پہنانا چاہتے ہیں۔"

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہہ دیا "تبدہ ممکن ہے بہت سے بچے بادشاہوں کی اولاد ہی ہوں لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے ان بچوں اور ان کے باپ داداؤں کو کوچبانوں کی وردی پہننے والے فرنگی سے کم از کم سوا سو سال سے جوتے پڑ رہے ہیں۔"

اس پر پروفیسر موصوف جھنجھلا کر خاموش ہو گئے۔ اور خاموش ہونے کے سوا چارہ ہی کیا تھا نہ اُن کے پاس بندوق تھی نہ میرے پاس پستول تھا۔ کہ ہم باتوں کے علاوہ لاتوں سے بھی ایک دوسرے کا بھوت نکال سکتے۔ یہ بے بسی یہاں عام ہے اور دوسرے ملکوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے یاد ہے جس دن ہم تم دونوں پارلیمنٹ سٹریٹ لندن میں لیبران رفرانس کا صدر (Lehman) کا جلوس دیکھ رہے تھے تو سپاہی کے منع کرنے کے باوجود ایک نوجوان لڑکی اپنی جگہ سے دو تین بار ہل گئی تھی اور آخری مرتبہ جب سپاہی نے درشتی سے اُسے روکا تو وہ سپاہی کے ایک تھپڑ لگا کر آگے چل دی تھی اور سپاہی متبسم ہو کر صرف یہ کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔

Lady Hay taca you manners at School

(خاتون تمہیں سکول میں اطوار سکھائے جاتے ہیں)

جانتے ہو یہاں کیا ہوتا ہے۔ ایک جہاد سے نابلد نوجوان دیوالی کے ہجوم میں انارکلی میں پھنس گیا تھا۔ ایک تھانیدار دونوں ہاتھوں سے اُسے پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا اور اس بیچارے نے مجبور ہو کر کہہ دیا۔ تھانیدار صاحب اب دیوار کے پار تو نہیں جا سکتا، اس پہ افسر کی آنکھوں میں

خون اتر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نوجوان نے اُس کے باپ کو قتل کر دیا ہے اور وہ ابھی اس کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ اور اُس نے بغیر سوچے سمجھے نوجوان کو اس قدر زدوکوب کیا کہ اُس کا سر چکرانے لگا۔ وہ غنیمت ہے کہ چند لوگوں نے اُسے بچا لیا ورنہ افسر ایک سپاہی کو حکم دے چکا تھا کہ نوجوان کو فلاں فلاں دفعہ کے ماتحت ہتھکڑی لگا لو۔ کہو اگر یہ حالات ہوں تو ضمیر کی آواز کس قدر بلند کی جاسکتی ہے! اور اُس شریف آدمی کو کیا کہو گے جو ڈھنڈورچی سے ناگوار ڈھنڈورا سُن کر محض اس لئے خاموش ہو جاتا ہے کہ اُس پر اعتراض کرنا حکومت کے اقتدار کی تحقیر کے مترادف ہے، اس میں ہنسنے کی کونسی بات ہے؟ حامد (یہی ہمایوں کے مدیر) انار کلی سے گزر رہے تھے۔ دو ڈھنڈورچی ڈرامائی انداز میں لوگوں کو متنبہ کر رہے تھے کہ فسادات کے سلسلے میں عوام کو مظاہرے کرنے والے اجتماعات سے دور رہنا چاہیئے کیونکہ ایسے موقعوں پر حکومت گولی چلانے پر مجبور ہو جایا کرتی ہے۔ جانتے ہو یہ ڈھنڈورا سُن کر حامد نے کیا اثر قبول کیا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے عوام کو حکومت چوہے سمجھتی ہے اور گولی کی بلی سے ڈرا کر خائف کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ حامد ہمیشہ اپنے آپ کو عوام کا ایک جزو سمجھتے ہیں (یہ میری ذاتی اطلاع ہے) اس لئے انہیں اس ڈھنڈورے کو سُن کر بہت طیش آیا۔ لیکن اس طیش کا سلسلہ صرف طیش آنے تک ہی محدود تھا۔ بغدادی سکولوں میں تعلیم نہ پانے والا ہتنا ہندوستانی مسلمان اپنے جذبات کی تلخی سے اپنے دل و دماغ کو گداز نہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا، کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

ہاں ہم ملی درسگاہ میں کام کرتے ہیں تم بے قرار ہو کہ ملت کے تحفظ و بقا کے لئے ہم طلبہ میں جذبات پیدا کرنے کے علاوہ عملی تدابیر کی نشر و اشاعت کیوں نہیں کرتے۔ کاش تم بھی ایک دن یہاں طالب علم کی حیثیت سے آئے ہوتے تاکہ تمہیں معلوم ہو سکتا کہ ملی درسگاہوں میں ملت کا مفہوم کیا رہ گیا ہے، دو سو طلبہ میرے سامنے بیٹھے تھے، میں نے بر سبیل تذکرہ عَبْدُ الْمُطَّلِب کا تلفظ پوچھا تو صرف ایک لڑکے کو تلفظ معلوم تھا اور مزید استفسار پر اُس نے بھی یہ کہہ دیا کہ عبدالمطلب محمدؐ کے چچا تھے (در حقیقت دادا تھے)۔ کہو جس ملی درسگاہ میں نوجوانوں کی جہالت کا یہ عالم ہو وہاں کون کون سے پہاڑ کو کھود کر جوئے شیر لائی جائے۔ میری فہمائش پر ایک طالب علم نے نہایت غصے کی حالت میں مجھ سے کہہ دیا" آپ ہمیں ہماری جہالت پر تو کوستے ہیں لیکن قصور کس کا ہے؟ ہمارے ماں باپ تو بارہ سال سے ہمیں ملی درسگاہوں میں بھیج رہے ہیں لیکن ملت کے معلموں کو یہ کبھی احساس بھی نہیں ہوا کہ کتابوں کو رٹانے کے سوا ان کی تربیت کرنا بھی ضروری ہے۔ آپ لوگوں کو اپنے ذاتی دھندوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ آپ نصاب کی مدراس کے علاوہ کسی اور طرف بھی توجہ کر سکیں"۔

اِس پر ایک اور طالب علم بظاہر میری رأت کے لئے کھڑا ہوا لیکن اُس نے مظلومیت کا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا۔ بولا صاحب آپ اساتذہ کو بھی ناحق کوستے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ بارہ سال آپ نے ملی درسگاہوں میں گذارے ہیں لیکن آپ اس امر کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ یہ ملی درسگاہیں ملت کے اُن غمخواروں کے ہاتھوں میں ہیں جنہوں نے اپنی مجلسوں کو ذاتی اغراض کے لئے میدانِ پیکار بنا رکھا ہے۔ ملی درسگاہوں کا فرضِ اولین ملت کے نوجوانوں کو وہ تعلیم دینا تھا جو انہیں مفید انسان بننے میں مدد دیتی لیکن یہ تو تب ممکن تھا جب ملت کے نام نہاد بہی خواہوں کے دل بھی اس جذبے سے معمور ہوتے۔ اور وہ اساتذہ کو اِس کام کے لئے آمادہ اور مجبور کرتے لیکن یہاں تو سارا کام ہی ٹھیکداری کا سلسلہ ہے۔ ہمارے اساتذہ صرف کارندوں کا کام دے رہے ہیں اگر بکری اچھی ہو جائے یعنی طالب علم زیادہ داخل ہوں اور نتیجہ اچھا نکل آئے تو مالک خوش کسان بالائی حق الکسناداض۔ بھلا جن درسگاہوں میں عین حیات صرف طلبہ کی تعداد اور امتحان کا نتیجہ رہ گیا ہو وہاں ملت کے افراد کی تربیت کیا ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ بیچارے استاد ہیں ہی کس شمار میں۔ اگر طلبہ منافقانہ تعلیم کی وجہ سے ان کی پتلونیں نہیں اتار لیتے تو انہیں یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کوئی قومی کارکن پیچھے سے ان کا کوٹ پکڑ کر درسگاہ سے باہر نہ نکال دے۔ اساتذہ کا کام خودی اور خودداری کی تعلیم دینا............ ہے لیکن جو جہلا کی تعریض و تادیب کے بعد طلبہ کے سامنے آئیں اُن کے پاؤں خود لڑکھڑا رہے ہوتے ہیں وہ ہم کو ادب و احترام سے کس طرح آشنا کر سکتے ہیں.....،

بات بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے لڑکے کو خاموش کرا دیا۔ لیکن ایک عرصے تک اُن حقائق پر غور کرتا رہا جو ان طالب علموں کے پیش نظر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شہنشاہیت کے اثرات سرکاری اداروں سے گذر کر نہ صرف ملی اور قومی درسگاہوں تک پہنچ چکے ہیں بلکہ اُن پر قابض ہو چکے ہیں یہاں تک کہ شہنشاہی استبداد کے جابرانہ مظاہروں کی جو مثالیں ملی اداروں میں نظر آتی ہیں۔ وہ سرکاری اداروں میں بھی نظر نہیں آتیں۔ کیونکہ شہنشاہی استبداد اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے بسا اوقات کمینہ پن سے محترز رہتا ہے۔ لیکن غلاموں کے اداروں میں جب

فہنشاہیت کی تمثیل سٹیج کی جاتی ہے تو اس ڈرامے کے ازاد غلامانہ ذہنیت کی وجہ سے سفلہ پن اور رذالت کے زینے سے آخری سیڑھی تک نیچے اُتر آتے ہیں۔

ہم مسلمانانِ افرنگی مآب چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سِرّ دین اند ایں ہمہ اہلِ کین اند اہلِ کین اند ایں ہمہ
کرگساں را رسم و آئیں دیگر است
سطوتِ پروازِ شاہیں دیگر است

اقبال

دو قطعات

محمد باقر

لطفِ تبسم سے نکھرا ہے جہاں
آ ملے ہیں ستارے میں بکھری ہوئی ہے زندگی
چاندنی سے روپہلی بجلیاں
گوندتی ہیں ذرے ذرے میں روپہلی ان کی ہنسی
اپنی آنکھوں میں لئے بیٹھا ہوں میں ان کی ہنسی

عکسِ خام ہے خلش بے اندماں
بے نیازی ہے مداوا ہے مرجھائی ہوئی
تمنا مضمحل ہے یاد آ جانے کا حال
ایسے یعنی ہی سے یاد آ جانے کا حال
ذہن پر شکل چھا جاتی ہے دھندلائی ہوئی

سحر رام پوری

خلل

(ایک ذہنی تصوّر)

کس محبت سے نظر بھر کے ہے دیکھا تو نے
آہ تو کون ہے اے راہ میں جانے والی
راہ کو غیرتِ فردوس بنانے والی
میرے احساس کے تاروں کو ہلانے والی

مجھ کو عجلت ہے کہ دفتر کو روانہ ہوں میں
مری رگ رگ میں تو کس وقت اُتر آئی ہے
حادثہ کیسا مری راہ میں تو لائی ہے
بن کے سیماب مری روح میں لہرائی ہے

اب میں دفتر کو چلوں یا ترا جوبن دیکھوں
اے مری راہ کی رنگین رکاوٹ کچھ بول
اور بھی دیکھ گرہ دل کی ذرا اور بھی کھول
مسکراہٹ سے مری روح کے پردوں کو ٹٹول

آہ مجبور ہوں تو چل میں یہیں ٹھہروں گا
تیرے مہکے ہوئے گیسو مری قسمت میں کہاں

تیرے ہنستے ہوئے ابرو مری قسمت میں کہاں
ترے انفاس کی خوشبو مری قسمت میں کہاں

میں پجاری ہوں فقط دور سے دیکھوں گا تجھے
جب تک آنکھوں سے نہ اوجھل ہو ترا جسم حسیں،
جب تک آتا ہے نظر تیرا لباس رنگیں
موڑ وہ دور کا جب تک کہ تو مڑ جاتی نہیں

لیکن اے جانِ نظر کیوں نہ ترے ساتھ چلوں
وقت پر آگے بھی دفتر کو میں کب جاتا ہوں
راہ کے ایسے ہی حالات سے دب جاتا ہوں
دیکھ کر چاند سے ہر چہرے کی چھب جاتا ہوں

بعض اوقات تو رستے میں ہی رہ جاتا ہوں
آگے جاتا ہوا پیچھے کو پلٹ آتا ہوں

عدم

افسانے کا پلاٹ

ماں نے کل ہی مجھ سے کہا۔ "بیٹا تم دن رات بیٹھے لکھتے رہتے ہو اور کہتے ہو کہ میرے افسانے اچھے اچھے رسالوں میں چھپتے ہیں مگر آج تک تمہیں کچھ ملا بھی ہے — دس پندرہ اگر اور آجایا کریں تو تمہارے بال بچوں کے اخراجات ہی چل نکلیں"

میں جواب دینے کو ہی تھا کہ ابا جان حقے کا کش لگاتے ہوئے بولے "اسے دے گا بھی کون ہے — لیکن فنکار کی محنت چند سکوں سے ادا نہیں ہوسکتی" پھر معاً ایک کہانی سنانے لگے۔ ایک مصور کسی بادشاہ کے دربار میں اپنی ایک تصویر پیش کر گیا — بادشاہ اس شاہکار کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے اشرفیوں کی ایک تھیلی مصور کو انعام میں دینے کا حکم دیا — مگر مصور نے وہ تصویر بادشاہ کے ہاتھ سے چھین کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ مصور دربار سے لوٹ آیا — لوٹتے ہوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ میں زر و مال کا بھوکا نہ تھا۔ تصویر کی قیمت ڈال کر میری محنت برباد کر دی گئی۔ میں تو بادشاہ کے منہ سے تصویر کی تعریف سننے کا خواہشمند تھا مگر —"

بادشاہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ خود اس کی تلاش میں نکلا۔ اس نے مصور کو ڈھونڈھ لیا مگر اس حالت میں کہ اس کی لاش محل کے باہر پڑی تھی اور تصویر کا ایک پرزہ وہ سینے سے لگائے ہوئے تھا — "ابا جان نے پھر ایک لمبا کش لگایا۔ مجھے آج پہلی بار معلوم ہوا کہ ابا مجھے محض خبطی ہی نہیں سمجھتے — گھر کا سارا انتظام اماں جان کو کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے میری کاوشوں کے نتیجہ کو مادی رنگ میں دیکھنا چاہا اور ابا جان — وہ عملی طور پر زندگی سے الگ ہو چکے ہیں۔ اس لئے انہیں چند چاندی کے مزید سکوں کے آجانے سے چنداں خوشی نہیں ہوتی۔ وہ تو اس سے زیادہ خوش ہیں کہ ان کا بیٹا ایک فن کار ہے۔

خیالات کی پرواز اکثر اقتصادیات کے دھندلے بادلوں میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ میرے لئے یہ تجربہ کوئی نیا نہیں بعض دفعہ اس دھند میں پھنس کر خیال آتا ہے کہ اس سے تو گھاس کاٹتے تو اچھا تھا۔ ایک بہت بڑے ادیب تو پنواڑی بننے تک تو مجبور ہو گئے تھے لیکن خدا بھلا کرے آل انڈیا ریڈیو کا کہ بچ گئے۔ مگر ادب کے شہ پارے بیچنے سے بھی تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ بعض بڑے بڑے ادیب اسی پر گذارہ کرتے ہیں۔ بیان کا حق الخدمت نہیں بلکہ محض بسر اوقات کا ذریعہ ہے۔ لیکن پھر بھی جب کوئی کہتا ہے کہ فلاں صاحب نے آٹھ دس روپے کے لئے اپنا افسانہ دیا تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا افسانہ دس روپے کی مالیت کا تھا۔ افسانہ — جگر پارہ، انمول موتی، فن کار کی شخصیت کا آئینہ دار۔ ایک ایک لفظ اگر جواہرات اور موتیوں سے تولا جائے تو بھی اس کی قیمت ادا نہیں ہوسکتی — اور پھر جب خود فنکار اس خرید و فروخت کا اعلان اپنے مضامین میں کریں تو مجھے شرم آتی ہے۔ روح بک سکتی ہے؟ جذبات کی قیمت ڈالی جاسکتی ہے؟ اور — اور شخصیت کے پرزے چند پیسوں میں خریدے جاسکتے ہیں؟ مگر ہوتا ایسا ہی ہے اور علی الاعلان ہوتا ہے — فن کا بیچنا میرے نزدیک گناہ ہے کفرانِ نعمت،

میرے لئے ادب ایک سرور ہے جسے میں خود زندگی دے کر حاصل کرتا ہوں۔ میری زندگی ہی ادب ہے۔ میں دفتر میں اتنے سالوں کی ملازمت کے بعد بھی معمولی تنخواہ کا کلرک ہوں اور یہی کی وجہ میری موجودہ حالت ہے۔ میرا دماغ تخیل کی سرزمین میں کسی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ وہ بلندیوں کی طرف اُڑ رہا ہوتا ہے مگر میرے ہاتھ کاغذ پر چند "دفتری" فقرات لکھنے میں معروف — اس بلندی اور پستی کا نتیجہ میری "سروس بک" پر موجود ہے تنبیہہ، بلیک مارک، موقوفی اور برطرفی کی دھمکیاں اور آخری بات یہ ہے کہ تنخواہ ترقی معکوس کی طرف مائل ہے۔ بیوی بچے، والدین، ان کی مالی بدحالی، میری پریشانی اور صحت کی خرابی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود جب میں چند سطور لکھ لیتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا میں خود خالق ہوں — اپنے افسانوں کے کرداروں کا خالق — ایک دوست نے میرے ایک افسانے کے متعلق مجھے لکھا۔ "مجھے آغا خیر و بر میرا ایک کردار اپنی رشک بھری زندگی کے باوجود بے چارہ نظر آتا ہے اور مجھے اس کی بے چارگی پر اس سے بہت ہمدردی ہے" —

میری مخلوق سے مجھے ہمدردی ہے ۔۔۔ مگر خدا کی مخلوق ۔۔۔ اُن سے اُسے کہاں ہمدردی۔

میں خالق ہوں ۔۔۔ کرداروں کی تخلیق کے لئے رات دن سرگرداں رہتا ہوں۔ خدا کی مخلوق میرا خام مواد ہے میں اُن کے دلوں میں جھانکتا ہوں اور وہاں سے اپنے کرداروں کے لئے زندگی لاتا ہوں۔ اس کے باوجود بعض دفعہ خود میری زندگی بے کیف ہو جاتی ہے بھوک کا بھکاری خود میرا روپ لے لیتا ہے۔ میں بھوک کے کرب و بلا میں مبتلا ہو جاتا ہوں ۔۔۔ بلکتے ہوئے بچے جو ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہ پاکر تڑپتے ہیں وہ خود میرے بچے بن جاتے ہیں، اُن کی ماں اگر اس حالت میں بھی باہر نکلے تو کسی زردار کی ہوس کا شکار بن سکتی ہے۔ جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو اپنی بیوی ۔۔۔ اوہ! ۔۔۔ یہی میری زندگی ہے اور یہی کردار یہی زندگی لے کر صفحۂ قرطاس پر آتے ہیں ۔۔۔ اور پھر میں اپنے ان کرداروں کو دنیا کی نعمتوں سے مالا مال بھی کر دیتا ہوں، اُن کے لئے عیش و عشرت کے دروازے کھول دیتا ہوں ۔۔۔ اور جب وہ اُن نعمتوں سے متمتع ہو جاتے ہیں جن کے لئے وہ ترستے تھے اور جن کے نہ ملنے کی وجہ سے وہ بغاوت پر آمادہ ہوئے تھے تو میں پھر ردِ عمل کا تماشا کرتا ہوں ۔۔۔ میں خدا کی طرح انہیں "سرکشی میں سرگرداں" نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اُن سے ہمدردی کرتا ہوں۔ خود ہی ہمدردی نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی اُن سے ہمدردی کرنے پر مجبور کرتا ہوں۔ بھلا خالق اپنی ایسی مخلوق کو چند سکوں کے عوض بیچ سکتا ہے؟ ۔۔۔

"آج شام کو چائے ساتھ پئیں گے" عزیز کا رقعہ ملا۔ عزیز اور محبت خاں میرے ان دوستوں میں سے ہیں جو مجھے ایک فن کار سمجھ کر نوازتے ہیں ۔۔۔ ذاتی طور پر وہ اس زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کی زمینوں کی پیمائش کے لئے محکمۂ مال نے علیحدہ عملہ رکھا ہوتا ہے۔ انہیں اس زمانے میں بھی اپنی جاگیرداری اور غیر منصفانہ تقسیمِ زمین پر فخر ہے اور اب بھی ان حقوق کو اپنا خاندانی حق اور وجۂ تفاخر سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود مجھ ایسے "خراباتی" سے انہیں حسنِ ظن ہے ۔۔۔ ہاں تو میں وقت پر اُن کے ہاں موجود تھا۔ اپنے ایک نوجوان رئیس اور زمیندار کی آمد کے سلسلے میں یہ دعوت تھی سا اپنے اور معززِ مہمان کے حسبِ حال دعوت بہت زیادہ پُر تکلف تھی۔

گفتگو کا موضوع چائے، مٹھائی، پیسٹری، کیک اور پھل سے نکلتا ہوا سیاسیات کے بارونق باغ میں جا پہنچا۔ جہاں سے پھر گریز کیا گیا ۔۔۔ اب ہم سرحد کی زندگی میں داخل ہو چکے تھے۔ ہماری محفل میں آج کا مہمان ایک وجیہہ، خوبصورت اور سرو قد نوجوان تھا۔ اس کا بارعب اور حسین چہرہ، خوبصورت مونچھیں، سڈول جسم، سفید و سُرخ رنگ اور پھر نوجوانی ۔۔۔ شباب اپنے جوبن پر ۔۔۔ اپنے گاؤں کا مالک، ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا ہمارا معززِ مہمان رائفل اور پستول سے مسلح اپنے خادموں کی ایک پوری فوج کے ساتھ مورچے سے حملہ آوروں پر فائر کر رہا تھا۔ کئی ڈاکو زخمی ہو گئے ۔۔۔ مگر اس وقت وہ کرسی پر دراز بڑے مزے سے چائے کی پیالی لبوں سے لگائے مسکرا رہا تھا، سفید اور خوبصورت ہاتھ، کلائی پر سونے کی گھڑی ۔۔۔ یہی ہاتھ رائفل کے "گھوڑے" پر پیغامِ اجل بن جاتے ہیں حسین ہاتھ اور کتنی طرح سے موت کا پیغام لاتے ہیں ۔۔۔

مہمان اب میزبان نواز بن گیا۔ عزیز، محبت خاں اور میں تینوں کو سیر کی دعوت دی گئی۔ میزبان کی کار موجود تھی۔ اور ہم کار میں تھے۔

تن ڈھانکنے کو کھدر کی ایک دھوتی اور معمولی کرتہ کافی ہے۔ لیکن لباس کی موجودہ شکل اُس ابتدائی شکل سے کس قدر مختلف ہے۔ پہلے محض ضرورت تھی اور اب نمائش، ہماری زندگی میں ہمارے افعال کا بیشتر حصہ خود نمائی کا مرہونِ منت ہی ہوتا ہے۔ لباس کی نمائش کا مظاہرہ ہر روز مال، مکلوڈ روڈ، نسبت روڈ۔ لارنس گارڈن اور خدا جانے کہاں کہاں ہوتا ہے ہماری جمالیاتی تسکین میں بھی یہی نمائش زیادہ حصہ لیتی ہے۔ ورنہ حسن محض تو ان دیکھے ہی فنا ہو جاتا ہے۔

ہم بھی متمنی تھے کہ کوئی ہمیں دیکھے ۔۔۔ پیادہ پا جوتیاں چٹخارتے ہوئے تو لوگ ہمیں ہر روز دیکھتے ہیں بعض دفعہ تو ستم ظریفوں نے حد کر دی تانگے پر خود سوار ہیں، جگہ نہیں سواریاں پوری ہیں۔ مگر راستے میں مل گئے تو زور سے آواز دی۔ "جمیل صاحب! آیئے تشریف لایئے" "شکریہ" ہم نے اکثر شرمسار ہو کر جواب دیا۔ اُن کی خود نمائی ہمیں شرمندہ کرنے کے لئے تھی۔ مگر اس پر بس نہیں ہوتا "آیئے نا! کہاں جا رہے ہیں آپ" ۔۔۔ "سیر کو۔ ذرا شملہ پہاڑی تک ۔۔۔۔"

"خوب۔ خوب! مجھے تو اُدھر ہی جانا ہے"

حد ہو گئی! تانگہ سواریوں سے بھرپور مگر ہمیں دعوت دی جا رہی ہے پھر آپ اُدھر جا رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارا وہاں جانا ناممکن ہے۔ کہاں اُدھر اور کہاں ہم"

لیکن آج ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہمیں بھی دیکھے۔ تانگے پر سوار رہنے

ہالو! ہم موٹر میں سوار ہیں ٹیکسی کی موٹر یا کرائے کا تانگہ نہیں بلکہ ایک معزز دوست کی کار میں۔ جسے ہم جہاں چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ تمہاری طرح نہیں کہ اچھرے تک تانگہ گیا اور بس —— مگر آج ہمارے جانے والے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ انور روز کہتا تھا کہ میں باقاعدہ لارنس، جاتا ہوں۔ سکندر ہونٹ کے گرد چکر کاٹتا ہوں۔ سلیم نے تو منٹگمری ہال کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ وہ ساقی سیمیں کے مشاہدے کا مشتاق تھا —— امجد تو کاسمو پالیٹن کلب کا "خوکیدار" تھا۔ وہ عشق کے معاملے میں خود بھی ہمہ گیر نظریے کا پابند تھا۔ اور اسے ہی ہندوستان کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا۔ قیوم کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ وہ شام کے بعد کافی دیر تک جمخانہ کے کلب میں ٹھہرا رہتا لیکن آج یہ سارے کہاں گئے —— اُن کی وہ پابندی اوقات کدھر گئی اور اسمبلی چیمبر کے گرد طواف کرنے والے نعیم بھی آج غائب تھے۔ جو آنے والے اسمبلی انتخابات کے لئے اپنے آپ کو ایک امیدوار خیال کرتے تھے اور حفظ ماتقدم کے طور پر اسمبلی چیمبر کے گرد گھوم کر تقریر کی مشق کیا کرتے تھے۔

میکلوڈ روڈ۔ ایبٹ روڈ۔ منٹگمری روڈ اور مال سے ہوتے ہوئے ہم لارنس گارڈن میں تھے۔ شام کا اندھیرا، درختوں کے سایوں سے اور بھی تاریک ہو رہا تھا۔ اس میں بجلی کے قمقموں کی مدھم روشنی، شفاف سڑک جس پر ہماری موٹر جا رہی تھی۔ ہم باغ کے چکر کاٹ رہے تھے۔ کار آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ بڑی سڑک پر ہم روانہ ہوئے —— ایک تانگہ ہمارے آگے چلا جا رہا تھا۔ اس میں ایک نوجوان عورت اور ایک مرد بیٹھے تھے۔ سیاہ رنگ کی باریک ساری میں ایک سُرمئی ناگن بیٹھی تھی۔ غازہ اور سرخی چہرے کو اور بھی جلا دے رہے تھے۔ نوجوان کار کو دیکھ کر اپنی جگہ پر پہلو بدلنے لگا۔ شاید اُسے اپنا کمتری کا احساس ہو رہا تھا۔ کار کی بتی کی روشنی نے ان دونوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا —— آنکھیں چندھیا گئیں۔ تانگے پر حُسن یوں رسوا ہوتا پھرے —— موٹر کے سامنے تانگے کی حیثیت ہی کیا ہے؟

"کاسمو پالیٹن کلب" کے پاس سے ہم گزر رہے تھے۔ سبزہ زار کو بجلی کے قمقموں نے روشن کر رکھا تھا۔ بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ کرسیوں پر مختلف حصوں میں مختلف قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ کہیں مرد اور عورتیں، کہیں صرف مرد، کہیں صرف عورتیں۔ جہاں صرف عورتیں تھیں وہ تھیں ادھیڑ عمر کی، ورنہ جوانی کو خودنمائی کی ہوس زیادہ ہوتی ہے۔ سفید وردی پہن کر اور سر پر پٹی باندھے سبک رفتار "بوائز" بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ کاسمو پالیٹن کلب —— خالص ہندوستانی کلب ہے۔ مگر نقل انگریزی کلب کی، ہر بات ویسی ہی اشام کو ٹینس اور شام کے بعد اکل و شرب کے وہی طریقے جو انگریزی کلبوں میں ہوتے ہیں —— یہ وہ طبقہ ہے جسے ہندوستان میں پیدا ہونے پر افسوس ہے

جمخانہ کے گرد گھومتی ہوئی کار منٹگمری ہال کے قریب آ کر رُکی۔ منٹگمری ہال ایک انگریزی کلب ہے۔ لارنس باغ کے شروع ہوتے ہی یہ کلب واقع ہے۔ جہاں ہندوستانی کو ممبر نہیں بنایا جاتا، اس کے تمام ممبر امپیریل سروس کے افسر ہوتے ہیں۔ حکومت کی باگ ڈور ان کے ہی ہاتھوں میں ہے۔ ہندوستان کی زمین سونا اگلتی ہے اس سونے سے "منٹگمری کلب" چلتے ہیں اور اس کے بعد سونا اگلنے والی زمین کی حالت کا نظارہ میونسپلٹی کے باغوں کی سیر کرنے سے ہوتا ہے جہاں ہندوستان کے باشندے سبز سبز گھاس کے "مخملیں" فرش پر دن بھر بھیک مانگنے کے بعد محو خرام ہوتے ہیں۔ انہیں باغات میں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں اور گوبر کے کیڑوں کی طرح جلد جلد بڑھتے ہیں —— ملں تو ہماری موٹر وہاں آ کر رُکی —— فوجی بینڈ بج رہا تھا تاکہ پینے والوں کو اور سرور آ جائے فاتح قوم ہمیشہ بینڈ بجاتی مفتوح ملک میں داخل ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے یادگار کے طور پر یہاں بینڈ بجتا ہے ——

"باغ کے تاریک کونوں میں حسن کی روشنی ملے گی" ہم میں سے کسی نے کہا۔ ہم پیدل سفر کر رہے تھے۔ ہم نے تاریک کونوں کا رُخ کیا، اُن کا خیال درست نکلا۔ باغ کے منتظمین کتنے سمجھ دار تھے انہوں نے ہر ایسے تاریک کونے میں ایک بنچ بچھادی تھی، خمیدہ درختوں کے جھنڈ میں جہاں رات اور بھی تاریک معلوم ہوتی تھی —— ان تاریکیوں میں کتنی روشنیاں نمودار ہوتیں —— بے تاب اور منتظر نگاہیں انہیں تاریکیوں میں کسی نرگسی کو ڈھونڈ نکالتیں۔ خاموشی میں گفتگو، زبان سے نہیں بلکہ ہاتھوں اور لبوں سے کی جاتی ہزار ارمان بھرے دل اور تاریکی —— ہمارے قہقہے اکثر کے ارمانوں میں حارج ہوتے رہے

ہوٹل کے ایک کمرے میں ہم چاروں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ شام کا جہان اب میزبان تھا۔ بھنا ہوا مرغ اور کوفتوں کی طشتریاں ہمارے سامنے رکھی تھیں۔ ہم سادہ غذا کھا رہے تھے۔ بے تکلف ہو کر حیاتین معلوم کر کے علم طب نے بنی نوع انسان پر بڑا احسان کیا۔ سادہ غذا میں حیاتین کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے امیر لوگ اب سادہ غذا کھانے لگے ہیں۔ اس کا اثر ان کی صحت پر بھی اچھا ہوتا ہے

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کھانا کھاتے وقت زور زور سے ہنسنا کھانے کو

ہضم کر دیتا ہے۔ ہم مزے مزے لے کر کھاتے اور خوب کھل کھلا کر ہنستے رہے۔ حکما کا قول ہے کہ جینا کھانے کے لئے نہیں بلکہ کھانا جینے کے لئے ہے اور ہنسی جینے میں مدد دیتی ہے۔

سونے کے کمرے میں دو چارپائیاں تھیں، مگر سونے والا ایک ـــ اس کی طرف اشارہ کئے جانے پر جواب ایک سرد آہ میں ملا ـــ جوانی میں دوسری خالی چارپائی کا خیال بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

لالٹین کی مدھم اور بدبودار روشنی میں بیوی بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی روز کی طرح دال اور چاول موجود تھے۔ پاس ہی بچے گرمی کی وجہ سے تڑپ رہے تھے، بیوی اُن کو تھپکیاں دے رہی تھی،

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا"

"کیوں کہیں سے کھا آئے ہیں آپ"؟

"نہیں ـــ" مجھے سچ بولتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔

میرے ساتھ والی چارپائی خالی تو نہیں تھی مگر اس پر ایک کی بجائے کئی سو رہے تھے۔ لاہور میں جگہ کی قلت کے باعث بچوں کے لئے علیحدہ علیحدہ چارپائیوں کا انتظام مشکل سے ہی ہو سکتا ـــ میزبان کو جس کی حسرت تھی وہ مجھے میسر ـــ مگر اس حسرت سے بدتر حالت میں، کاش میں بھی ایک آہ سرد بھر سکتا ـــ

بھادوں کا مہینہ ہے۔ کئی دنوں سے بارش نہیں ہوئی۔ ہوا بند ہے حبس اتنا کہ خدا کی پناہ، بچے بے چین، جگہ تنگ، ایسے میں نیند کہاں ـــ میرا دماغ خیالات کے ہجوم سے پر ہو گیا میں سوچنے لگا۔ شام کی پر لطف صحبت بار بار یاد آ رہی تھی، مگر اب ـــ میرا سر چکرانے لگا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں مجسم افسانہ بن گیا ہوں۔ میرا رُواں رُواں افسانوں کا پلاٹ ہے۔ خیالات کا ہر دھچکا گویا افسانے کا نکتہ عروج تھا۔ میں سوچتا ہی گیا۔ . . .

لالٹین کی مدھم روشنی میں میری پنسل کاغذ پر کار کی رفتار سے زیادہ تیزی سے چل رہی تھی ـــ ایک، دو، تین ـــ دس، میں نے دس افسانوں کے پلاٹ سوچ لئے تھے۔ میرا دماغ ابھی تک موٹر کی برق رفتاری کے ہمراہ تھا۔ حسن، عشق، رومان، قدرت کی فیاضیاں، تہذیب دشمن، ارتقا ـــ کیا باقی رہ گیا تھا۔ میرے ان افسانوں کی تکمیل کے بعد مجھ پر یہ طعنہ نہ رہے گا کہ میں ہمیشہ زندگی کا تاریک پہلو ہی پیش کرتا ہوں۔ اب تو میں روشن پہلو دیکھ رہا تھا ـــ

"میں نے کہا جی! اگر کوئی شخص پنکھے سے ہوا کرتا تھا"۔ اماں نے کل ٹھیک تو کہا تھا آپ افسانوں کی قیمت کیوں نہیں لیتے؟"

"اونہہ! بیہودہ!" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی ہو" میں ابھی تک یادداشت لکھ رہا تھا۔

"پرویز ننگے پاؤں سے ننگا ہے۔ آج اس کا پاؤں زخمی ہو گیا ہے۔ دن بھر درد سے چلاتا رہا ـــ"

پرویز میرا لاڈلا بچہ ـــ ننگا ہے ـــ درد سے دن بھر چلاتا رہا ـــ میں کیا لکھ رہا تھا ـــ قدرت کی فیاضیاں، رومان، تہذیب کا ارتقا ـــ گو میں فنکار ہوں۔ آرٹ کی قیمت نہیں ڈالی جا سکتی مگر انسان تو آرٹ سے زیادہ قیمتی ہے ـــ درد، میرا بچہ ـــ" مجھے لالٹین کی روشنی گھومتی ہوئی دکھائی دینے لگی ـــ میرا سر پھر چکرانے لگا۔ بیوی میرے منہ کی طرف تک رہی تھی۔

"لیکن میرا ا ـــ صول ـــ ل ـــ میں، میں ـــ اچھا ـــ یہ افسانہ ـــ معاوضہ ـــ" لالٹین میں تیل کم رہ گیا تھا بتی مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

شبیر محمد اختر

یہ تمنا مری

مشاہدات سے مایوس ہو چکا ہوں میں

تخیلات کی دنیا بسا رہا ہوں میں

تخیلات سے [illegible] لیے وہ

مجسم بیداری میں خواب [illegible] ہوں میں

بیچارہ وہ تبسم حقیقت [illegible] ہوں میں

سعید احمد اعجاز



ایک غزل اور ایک گیت

غزل

بفیضِ بخیۂ گُل جامہ تار تار ہُوا
مرے جنُوں کا سبب جلوۂ بہار ہُوا

بقدرِ شکستِ تمنا بھی تھا متاعِ شوق
وہ دل جو نذرِ ستم ہائے روزگار ہُوا

رضائے دوست مری بندگی پہ ہے موقوف
یہ اختیار بصد جبر اختیار رہُوا

فریبِ شوق ہی تکمیلِ شوق ہے شاید!
یقین وعدہ نہ تھا پھر بھی انتظار رہُوا

نمودِ حسن ہے کیا خندہ ہائے جیبِ گُل،
غرض جنوں سے کچھ اندازۂ بہار ہُوا

خودی ہے حاصلِ عرفانِ بےخودی ساقی!
وہ ہوشیار نہیں ہے جو ہوشیار ہُوا

نویدِ شوق سہی اور دردِ دل ہے تابش
وہ ایک بار ہُوا یا ہزار بار ہُوا

محمد مسعود الحسن تابش دہلوی

گیت

من کی باتیں بول
پپیہے! من کی باتیں بول

ڈوب گئے آکاش کے تارے
نیند سے جاگے پنچھی سارے
پھوٹ بہے کرنوں کے دھارے
اک ہم ہیں برہا کے مارے۔ دل ہے ڈانواڈول
پپیہے! من کی باتیں بول

برکھا رُت کا روپ نرالا
اُٹھلی پھواریں بادل کالا
بجلی کا کوندا متوالا
ٹوٹ گئی بوندوں کی مالا تو بھی موتی رول
پپیہے! من کی باتیں بول

مست گھٹا کی دیکھی چھل بل
دھرتی ہے پانی کی چھاگل
کھلتی کلیاں، اُٹھتی کونپل
کتنی سندر، کتنی کومل۔ اب تو آنکھیں کھول
پپیہے! من کی باتیں بول

رومان

مشہور افسانہ نگار اور شاعر ریونل نے رسالہ زمین پر پھینک دیا سیمی براؤن جو ایک مشہور فرم کا گماشتہ تھا اور جو کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ حیرت سے اُچھل پڑا۔

"کیا ہے ریبو؟" اُس نے آگے کو جھکتے ہوئے پوچھا "کسی نافہم نقاد نے تمہارے مضامین پر دست درازیاں کی ہیں کیا؟"

"اب اس دنیا سے رومان اُٹھ گیا۔ رومان کی موت واقع ہو گئی۔ رومان انگیز دور زندگی ختم ہو گیا۔ افسوس"! ریونل نے آہستہ آہستہ کہا۔ جب ریونل آہستہ بولتا تو وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور متین معلوم ہوتا۔ اس نے رسالے کو پھر اٹھا لیا اور ورق الٹنے لگا۔

"دیکھو سیمی، یہ تو تم جیسا کور دماغ بھی سمجھ لے گا" اُس نے سنجیدگی سے کہا "یہ ملک کا ایک معتدر جریدہ ہے۔ چوٹی کے شاعروں کے رنگین کلام اور نامور مصنفین کے شاہکار اس میں شائع ہوا کرتے تھے ——— اور اب اس اشاعت کو دیکھو ——— دوران جنگ میں جنگی جہازوں میں کوئلہ جھونکنے کے طریقوں پر ایک طویل مضمون ——— بال اسٹریٹ کلب کے لئے نئے ممبر بنانے کی تجویز، عشق و عاشقی اور کورٹ شپ کے اصولوں پر ایک لمبی کہانی، بیکہ پر ایک معرکۃ الآرا نظم، دوسی بیکہ جس پر پریسیڈنٹ کا نشانہ چوک گیا تھا، غور فکر یہی ہیں اس اشاعت کی چند نمایاں سرخیاں اور بس اور بالکل اخیر میں پورے سترہ صفحے کا اڈیٹوریل جس میں خود اپنے ہی کارناموں اور اس رسالے کی عام مقبولیت کی ڈینگ ماری گئی ہے۔ سیمی اب تم ہی بتلاؤ کہ اس میں رومان کا کوئی بھی عنصر ہے؟ نہیں نہیں، میں سچ کہتا ہوں یہ تمام مضامین بلکہ خود یہ رسالہ رومان کا قاتل اور رومانی زندگی کا دشمن ہے"۔

کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب چمڑے کی آرام کرسی پر سیمی لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھورے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے جسم کا رنگ ان چار سگریٹوں کے تمباکو کے رنگ سے مل جاتا تھا جو اُس کی صدری کے جیب سے باہر جھانک رہے تھے ہلکے بادامی رنگ کے اُس کے جوتے تھے۔ خاکی موزے اور آسمانی رنگ کی قمیص اس پر برف کی طرح سفید اور خشخشا کالر۔ کالر پر ایک سیاہ تتلی آکر بیٹھ گئی تھی۔

سیمی کے چہرے میں کوئی بھی خاص یا غیر معمولی بات نہ تھی ——— گول تھا۔ بھلا معلوم ہوتا تھا اور گلابی رنگ کا تھا۔ اُس کے دل اور اُس کی نگاہوں میں رومانوں کے لئے کوئی بھی جگہ نہ تھی۔

ریونل کے اس کمرے کی کھڑکی کہن سال درختوں والے ایک پرانے باغ میں کھلتی تھی۔ یہ کمرہ دوسری منزل پر تھا اور اُس کا مکان اینٹ کی بلند دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ دیوار کے اُس جانب اُس کے مکان کے عین مقابل ایک پرانی عمارت تھی جو قریب قریب پیڑ پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمانہ قدیم کا کوئی قلعہ ہوگا۔ اس میں ایک بوڑھا رہتا تھا جسے اس کہنہ عمارت سے بے حد محبت تھی اور وہ کسی بھی قیمت پر اسے اپنے سے جدا کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا ——— اتنی پرانی عمارت کا بس اسی قدر رومان تھا!

ہفتے میں کوئی دو تین بار سیمی ریونل کے مکان پر دکھائی دیتا تھا۔ وہ ریونل کے خاص مصاحبوں میں سے تھا۔ اُس کے آبا و اجداد اہل دول اور صاحب عزت گذرے تھے لیکن اُس کے کاروبار نے اُسے تباہ و برباد کر دیا تھا اور اب وہ ایک فرم کا ادنیٰ گماشتہ تھا۔ رومان کی موت پر وہ ایک آنسو بھی گرانے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ ریونل کے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب چمڑے کی کرسی پر بیٹھنا اُسے بہت بھاتا تھا اور ریونل کو بھی اُس کی صحبت پسند آتی تھی۔ وہ اس کی الجھن چڑی گہری بے معنی باتوں کو پسند کرتا تھا۔ اُسے اُس پر کافی اعتماد اور بھروسہ تھا اور وہ اپنے دل کا بوجھ اُس پر اتار سکتا تھا۔

"میں بتاؤں کہ آج تم اس رسالے پر اس قدر برہم کیوں ہو رہے ہو؟" سیمی نے مسکراتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے نے تمہارے کسی مضمون یا نظم کو شائع نہیں کیا اور یہی تمہاری خفگی کا باعث ہے۔ کیوں سچ ہے نا یہی بات؟"

"نہیں تمہارا یہ گمان قطعی غلط ہے۔ یہ دیکھو اسی اشاعت میں میری ایک دلچسپ نظم شائع ہوئی ہے کہو تو پڑھ کر سنا دوں"!

"اچھا تو سناؤ" ابھی ابھی سیمی نے کھڑکی کے باہر درختوں کا دیکھل اور اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

ریجوئل ہرکولیس" سے بڑا نہیں تھا کوئی بھی، نہ ہے کمزوریاں ہر انسان میں موجود ہیں۔ اُس میں بھی تھیں" اُس نے رسالے میں اپنی نظم بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

"بھئی۔ یہ تو بہت ہی خوب نظم ہے" سیمی نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"پانچ بند ابھی اور ہیں" ریجوئل نے انتہائی اطمینان کے لہجے میں کہا۔ "ہر بند کے بعد کچھ وقفہ ضروری ہے"

"ہاں۔ ہاں۔ تو وہ بقیہ بند بھی پڑھ ڈالو۔ میرے کہنے کا یہ مطلب کب تھا کہ تم اب آگے نہ پڑھو اور تم تو جانتے ہی ہو کہ نظمیں نہ تو مجھے پسند ہیں اور نہ میں زیادہ سمجھتا ہی ہوں۔ خیر وہ بھی پڑھ ڈالو!"

ریجوئل نے لمبی سانس لی اور رسالہ زمین پر گرا دیا۔

"ٹھیک ہے" سیمی نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا "اب کسی اور وقت سنوں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ پانچ بجے میں نے ایک شخص سے ملنے کا وعدہ کیا ہے"

درختوں کے درمیان سے اُس پرانی عمارت کی ایک کھڑکی صاف نظر آتی تھی۔ ریجوئل نے دیکھا کہ اُس کھڑکی میں جو سفید کپڑے لہرا رہے ہیں۔ اُن میں رومان اور رومان انگیز شعریت کی دیوی چھپی ہوئی ہے۔ ریجوئل نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تو وہ شبنم کی طرح نئی اور پاک تھی اور انگور کے بیلوں جیسی نازک۔ وہ کھڑکی پر کھڑی ایک شہزادی کی طرح باغ کی فرحت بخش ہوا سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ شاعروں کے تخیل کے رنگ برنگی پھولوں کے ہر پھول سے زیادہ وہ خوبصورت تھی۔

رومان کے دلدادہ ریجوئل کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ اُسے یہ محسوس ہونے لگا کہ اُس کے مکان کے نیچے سے گزرنے والی گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ اب محبت کے کیف آفریں نغموں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اخبار فروخت کرنے والے لڑکوں کی کرخت صدائیں کوئل کی دلکش کوک بن گئی ہیں ـــ اور وہ خود ایک نائٹ ہے جو تلوار۔ تھیلا اور بانسری لے کر اُس مجسمۂ حسن و خوبی کی طرف مائل ہو گیا ہے۔

رومان اسی طرح اکثر اینٹ اور پتھروں میں جھلک اٹھتا ہے۔

شام کے چار بجے ریجوئل نے پھر باغ کے اُس پار دیکھا۔ اُسے کھلی ہوئی کھڑکی پر چار گملے رکھے ہوئے نظر آئے جن میں گلاب کے بڑے بڑے پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ پھر آئی اور آ کر اُن پھولوں پر جھک گئی جس کے سرخ پھول اُس کے رخساروں کے مقابل پھیکے معلوم ہونے لگے وہ ریجوئل کی کھڑکی کی جانب دیکھنے لگی لیکن ریجوئل سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوڑ کر اندر چلی گئی۔ کھڑکی پر صرف گلاب ہی رہ گئے۔

"یقیناً ان گلاب کے گملوں کا وہاں رکھا جانا کوئی مطلب رکھتا ہے اور ضرور یہ کوئی خفیہ اشارہ ہے"۔ ریجوئل نے اپنے تئیں سوچا "اس میں کچھ نہ کچھ راز ضرور ہے۔ ممکن ہے اُس نے اس کی "چار گلاب" کے عنوان کی مشہور نظم پڑھی ہو اور اس نظم نے اس کے دل میں جگہ کر لی ہو۔ اور یہ چار گملے اُسی کا جواب ہوں اُسے ضرور علم ہوگا کہ ملک کا مشہور و معروف شاعر ریجوئل اُس کے مقابل والی عمارت میں رہتا ہے۔ رسالوں میں اُس نے میری تصویریں بھی ضرور ہی دیکھی ہوں گی۔ اُف۔ یہ رومان بھرے پیغام جوان گملوں کے ذریعہ مجھے دئیے جا رہے ہیں۔ یونہی بے مصرف نہ جائیں گے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں محبت کا جواب محبت سے دوں گا۔ ضرور دوں گا۔ ریجوئل نے دیکھا کہ ان چار گملوں کے پاس ایک اور چھوٹا گملا بھی ہے۔ اُس نے دوربین نکالی اور کھڑکی کے پردوں کی آڑ لے کر دیکھا ـــ مٹر کا پودا تھا!

الماری سے اُس نے وہ کتاب نکالی جس میں پھولوں اور پھلوں کے ذریعے کلام کرنے کے طریقے اور خفیہ اشارے درج تھے۔

مٹر! ـــ "ملاقات ہوگی" ـــ اوہ۔ میرا خیال بالکل درست تھا۔ رومان کبھی بھی ادھورا نہیں رہ سکتا۔ جب وہ آتا ہے تو اسی طرح اور انہیں چیزوں کے ساتھ آتا ہے" ریجوئل مسکرا پڑا۔ عاشق مسکراتا ہے جب وہ اپنے تئیں فتحیاب سمجھتا ہے لیکن عورت کی مسکراہٹ اس کی فتحیابی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مرد کی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ عورت کی جنگ شروع ہوتی ہے۔ "آہ۔ اُسے مخاطب کرنے کے لئے کھڑکی پر چار گلاب رکھنے کا خیال کس قدر دلکش اور دلچسپ ہے۔ اُف۔ کس قدر عقلمند ہے وہ ـــ اب تو ملاقات یقینی ہے!"

ریجوئل انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی ـــ "شاید سیمی براؤن ہوگا" ریجوئل نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سیمی کے اندر داخل ہوتے ہی ریجوئل مسکرا دیا۔ اس زبردست انقلاب سے سیمی بے خبر نہ رہ سکا۔ وہ حیرت سے ریجوئل کی طرف دیکھنے لگا۔

سیمی کھڑکی کے قریب اپنی جگہ پر چلا گیا۔ باغ کے اُس پار وہ کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے گھڑی دیکھی اور فوراً ہی چھڑی اور ٹوپی اُٹھالی ـــ چار بج کر بیس منٹ ہو گئے۔ اُف اُس نے زیر لب کہا میں اب نہیں رک سکتا۔ دوست مجھے معاف کرنا۔ مجھے معاف کرنا۔ مجھے ساڑھے چار بجے ایک شخص سے

ملنا ہے۔" "تو پھر تم یہاں آئے ہی کیوں تھے؟" رینوئل نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تو سمجھتا تھا تم اپنے وقت کا باقاعدہ حساب رکھتے ہو گے۔" یسمیؔ جو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا دفعتاً رک گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ہلکے گلابی سے سرخ ہو گیا "تم جاننا ہی چاہتے ہو تو لو سنو میں اگر اس وقت یہاں نہ آتا تو مجھے یہ معلوم ہی نہ ہو سکتا کہ مجھے اس سے ساڑھے چار بجے ملنا ہے۔ وہ سامنے پرانی عمارت دیکھتے ہو اس میں ایک بوڑھا رہتا ہے اور اس کی خوبصورت آنکھوں اور سنہرے بالوں والی لڑکی بھی مجھے اس سے محبت ہے اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن وہ بوڑھا مجھے پسند نہیں کرتا اور لڑکی کو مجھ سے ملنے نہیں دیتا لیکن اس سے ہوتا ہی کیا ہے۔ وہ اُسے گھر میں بند تھوڑا ہی کر سکتا ہے۔ دیکھو ایڈنا کی کھڑکی یہاں سے صاف دکھلائی دیتی ہے۔ جب وہ باہر جاتی ہے تو مجھے اشارے دے جاتی ہے۔ آج وہ ساڑھے چار بجے مجھ سے ملے گی۔ مجھے یہ راز تم سے پہلے ہی کہہ دینا چاہئے تھا لیکن میں جانتا تھا کہ تم .....!

"کیسے اشارہ پاتے ہو تم؟" پھیکی مسکراہٹ سے رینوئل نے پوچھا۔

"گلاب!" یسمیؔ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج چار گلاب رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے "بلیک اسٹریٹ میں چار بجے"۔"

"لیکن مٹر کا، کا کیا مطلب ہے؟" ریحان کی اڑتی ہوئی چادر کو پکڑتے ہوئے رینوئل نے دریافت کرنے کی ہمت کی۔

"ساڑھے!" یسمیؔ نے باہر جاتے ہوئے کہا "اچھا اب کل ملوں گا!"

(ترجمہ از اُو ہنری)

سید منظر کاظمی

شعر

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

میر تقی

دو نظمیں

ملّاح کی لاش

مچھلیاں سب پکڑنے دُور گئے
تیری کشتی لرزتی ہے تنہا
اُٹھ کہ دریا بُلا رہا ہے تجھے
تو کنارے پہ یوں پڑا ہے کیا

تیرے ساتھیوں نے پانی میں
دیکھ وہ کتنے جال ڈالے ہیں
جیسے جذبات نوجوانی میں
تُند تیکھے بلند بھالے ہیں

کیا تو یہ سوچتا ہے اے ملّاح؛
تو بھی صرف اک غریب مچھلی ہے
اور کیا اور کیا ہے اے ملّاح؛
تو بھی اک بدنصیب مچھلی ہے

کوئی مچھلی پکڑنے والا ہے
آج جس نے پکڑ لیا ہے تجھے
کتنا مضبوط جال ڈالا ہے
کتنا کس کر جکڑ لیا ہے تجھے!

پھولوں کی وادی

پھول ہی پھول ہیں اس وادی میں۔
پھول ہی پھول ہیں تا حدِ نظر
اے خداوندِ گل و لالہ تجھے
مری دلجوئی ہے کیوں مدِ نظر!

پھول ہی پھول ہیں اس وادی میں
کیا مرے واسطے یہ محفل ہے؟
ایک ہی لمحہ فقط ایک ہی پل
کیا مجھے عیش کا حق حاصل ہے!

پھول ہی پھول ہیں کیا پھول ہیں پھول!
خواب سا پھولوں کی اک وادی کا!
میں نے جو باغ کبھی سوچا تھا
کیا یہی باغ ہے وہ شادی کا؟

پھول ہی پھول ہوں اس وادی میں
ہو نہیں سکتا فقط دھوکا ہے
یہ تو ہے بھوت مرے مرضی کا
راستہ جس نے مرا روکا ہے

روشن دین تنویر

طیارچی

ثریا نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے اور باہر کی طرف دیکھنے لگی — زمین سے آسمان تک گہری اور غلیظ تاریکی کا ایک سیلاب امنڈ رہا تھا — سیاہ گھٹائیں فضا میں منڈلا رہی تھیں — مدِ نظر تک سیاہی سی سیاہی نظر آتی تھی، پائیں باغ کے چھوٹے بڑے درخت — سڑک کے دونوں جانب بنگلوں کی قطاریں۔ بنگلوں کے درمیان کی اونچی نیچی زمین۔ ہر چیز سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی — جیسے کوئی سوگوار مجمع خاموش اور بے حس و حرکت کسی ماتمی جلوس کا منتظر ہو۔

کبھی کبھی کوئی موٹر ادھر سے گذر کر چشمِ زدن کے لئے سکوت اور تاریکی کے اس طلسم کو توڑ دیتا تھا۔ ہارن کی آواز خاموش فضا میں بلند ہو کر غائب ہو جاتی تھی — درختوں کی چوٹیوں پر موٹر کے برقی لیمپ کی روشنی دوڑتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ جیسے کسی غم نصیب کے دل میں کسی بھولے ہوئے واقعہ کی یاد مسرت کی لہر دوڑا دے۔ پائیں باغ کی دیوار پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد روشنی نمودار ہوتی — گھٹتی۔ بڑھتی سمٹتی اور غائب ہو جاتی تھی۔

دیر تک ثریا اس منظر کو دیکھتی رہی — وہ محسوس کر رہی تھی کہ میں اس ماحول کا ایک جزو ہوں۔ جس کے غیر متوقع خطلے نے اُن فتنوں کو دفعتہً جگا دیا تھا جو عرصے سے تحت الشعور کی تاریک گہرائیوں میں محوِ خواب تھے۔ ثریا ان کو پھر اپنے دل میں دفن کر دینا چاہتی تھی۔ ان مردہ امیدوں کا گلا گھونٹ دینا چاہتی تھی۔ جنہوں نے زندہ ہو کر کروٹیں لینا شروع کر دیا تھا اس لئے کہ زمانے کی رفتار کو پلٹ دینا اس کے لئے ممکن نہ تھا — لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ خیالات ضمیر کی گرفت سے آزاد ہو کر عہدِ ماضی کے اس خوشگوار دور کی طرف جا رہے تھے۔ جب وہ آزاد تھی — اور اپنی زندگی کی بازی لگا کر ہار نہ چکی تھی — خیالات کی اس کشمکش سے گھبرا کر اس نے کھڑکی بند کر دی اور میز کے قریب آ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔

آئینے کی صاف و شفاف سطح پر حسن و شباب کا ایک دلکش مرقع نظر آنے لگا۔ گندمی رنگ۔ کتابی چہرہ نشۂ شباب میں ڈوبی ہوئی رسیلی آنکھیں جن میں دلی جذبات کے سوگوار جلوے تڑپ رہے تھے۔ باریک اور دلکش ساخت کے مرجانی ہونٹ — قدرت کے حسین ترین سانچے میں ڈھلے ہوئے گداز بازو جو شانوں تک برہنہ تھے۔ لمبی صراحی دار گردن جس نے اُس کے حُسن میں شاہی وقار اور دبدبہ پیدا کر دیا تھا۔ شانوں پر بکھری ہوئی چمکدار سیاہ زلفیں جن کی بعض آوارہ لٹیں گردن اور رخساروں پر لپٹ گئی تھیں۔

خود بخود بلا کسی ظاہری سبب کے ثریا کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جیسے کسی گہرے زخم کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہوں۔ باریک اور برف کی طرح سرد انگلیاں رینگ رینگ کر دل میں چٹکیاں لینے لگیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے — اس کی نگاہیں اٹھیں اور ایک تصویر پر جم گئیں جو آئینے کے قریب سنہرے فریم میں رکھی ہوئی تھی — ثریا کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی دوڑ گئی — آنکھیں غصے سے چمکنے لگیں — تصویر کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا تبسم تھا جس کو وہ کبھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ ابرو کھنچ کر بل کھا گئے تھے۔ ہونٹوں پر طنز آمیز مسکراہٹ کے آثار تھے — جیسے وہ اس کا اور اس کے ساتھ ساری کائنات کا دل ہی دل میں مذاق اُڑا رہا ہو — بالکل اسی طرح رشید اس کو مسکرا مسکرا کر دیکھا کرتا تھا۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں سوزن کاری کا سامان لے کر اس کے قریب بیٹھی ہوتی تھی...... وہ محسوس کرتی تھی کہ صیاد خوبصورت پرندے کو پنجرے میں قید کر کے اپنی کامیابی پر خوش ہو رہا ہے۔

عموماً ایسے معاملات میں صنفِ نازک کی منطق بالکل الٹی ہوا کرتی ہے۔ لیکن ثریا کو اس امر میں امتیازی خصوصیت حاصل تھی۔ اُس کی عادت تھی کہ اپنی غلطی کو دوسرے کے سر تھوپ کر خود اپنی مظلومیت پر آنسو بہانے لگے۔ چنانچہ ایک عرصے سے اس کو یہ خیال بے چین کر رہا تھا کہ

رشید نے اس کے ساتھ شادی کر کے اس کو بہت بڑا فریب دیا ہے۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ ازدواجی زندگی کے متعلق جو رنگین خواب اس نے دوشیزگی کے زمانے میں دیکھے تھے۔ وہ حقیقت کے میزان پر پورے نہ اترے۔

اس کے مزاج کی برہمی لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔ آخر وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی ــــ پورے چار سال شادی کو ہو چکے تھے ــــ اس دوران میں ان میں ایک دفعہ بھی ان بن نہ ہوئی۔ بظاہر دونوں انتہائی مسرت اور ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے ــــ لیکن ثریا خوش نہ تھی۔ ــــ وہ اپنے دل میں ایک خلا سی محسوس کرتی تھی ــــ ایک مبہم اور پراسرار پیاس۔ جو اس کو ہر وقت بے چین رکھتی تھی ــــ رشید اس کا پجاری تھا اس پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں جوشِ مسرت سے چمک اٹھتی تھیں ــــ ہونٹوں پر مسکراہٹ لہرانے لگتی تھی۔ باتیں کرتے وقت اس کا لہجہ نرم اور جذباتِ محبت کی بے قراریوں سے گرانبار ہو جاتا تھا۔ اور جب کچہری جاتے وقت وہ برابر کھڑی ہو کر اس کی ٹائی میں گرہ لگاتی تھی تو رشید کے بازو اس کے گرد حائل ہو جاتے اور دیر تک وہ اس قید سے آزاد نہ ہو سکتی تھی ــــ یہ سب کچھ تھا لیکن وہ اور رشید ایک نہ ہو سکے تھے ــــ وہ اب تک اس کے لئے ایک معمہ تھا ــــ شروع شروع میں اس نے کوشش کی کہ اپنی اور رشید کی ہستی کو ایک دوسرے میں سمو کر ایک کر دے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ رشید بدستور معمہ بنا رہا۔ آسمان کے بلند ترین مرکز پر جھلملانے والا ایک ستارہ۔ رسائی سے باہر۔ دلکش، شوق انگیز۔ مگر بعید از فہم اسرار سے لبریز ــــ وہ اس کو سمجھنا چاہتی تھی ــــ اور ناکام ہو کر جھلا اٹھتی تھی۔

رشید ایک خاموش طبیعت کا انسان تھا جوش و خروش سے بالکل معرا ــــ مسکراتا تھا مگر اس کی مسکراہٹ کبھی قہقہوں میں تبدیل نہ ہوتی تھی ــــ محبت کرتا تھا مگر اس کی محبت میں اضطراب اور بے قراری کا نام تک نہ تھا۔ وہ خوش ہو یا ناخوش بولنے میں اس کی آواز کبھی بلند نہ ہوتی تھی۔ انتہائی حالتوں میں بھی اس کے غصے کی نمود کبھی طنز آمیز گفتگو کی حد سے نہ بڑھتی تھی ثریا اکثر سوچا کرتی تھی کہ وہ ایسے سمندر کے مانند ہے جس کی دلفریب اور پرسکون سطح کے نیچے ہولناک گہرائیاں پوشیدہ ہوں ــــ اور خود ثریا بحر و ارض کے مثل تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر ہو جاتی تھی جس کی زندگی قہقہوں، آنسوؤں، محرومیوں اور مسرتوں کا ایک دلکش مجموعہ تھی جس کی رگ رگ میں زندگی کی طوفانی موج دوڑتی پھرتی تھی۔

اکثر تنہائی میں ثریا کو یہ خیال پریشان کرتا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن کیوں نہیں۔ ناولیں پڑھ پڑھ کر اس نے ازدواجی زندگی کا جو نقشہ اپنے لئے تیار کیا تھا اس کی تمام ظاہری دلفریبیاں میسّر تھیں۔ رشید آئی۔ سی۔ ایس تھا۔ ایک بڑے شہر کا سٹی مجسٹریٹ ہونے کی وجہ سے افسرانِ اعلیٰ کی صف میں جگہ پا یا تھا۔ وہ خود شہر کے اعلیٰ طبقے میں ہر دلعزیز تھی۔ کوئی دعوت کامیاب نہ سمجھی جاتی تھی جس میں وہ موجود نہ ہو۔ جہاں پہنچ جاتی تھی لوگ سر آنکھوں پہ جگہ دیتے تھے۔ جو اس کی ملاقات کا شرف رکھتے تھے اس کے گرد پروانہ وار جمع رہتے تھے ــــ جو اتنے خوش نصیب نہ تھے وہ تعارف کی امید میں تھوڑے فاصلے پر کھڑے اس کی بذلہ سنجیوں پہ دور سے ہنستے اور جب وہ ان کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتی تھی تو ادب کے ساتھ جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ کئی دفعہ ہز اکسیلینسی گورنر کی دعوت میں بھی شریک ہو چکی تھی۔ اور ایک دفعہ ان سے باتیں بھی کی تھیں ــــ بڑے بڑے حکام کی بیویاں دعوت کے موقعے پر اس سے مشورہ کرتی تھیں اور میزبانی کا ہنر سیکھتی تھیں۔ کنواری لڑکیاں اس کی رفتار و گفتار کو انتہائی شوق کے ساتھ نقل کرتی تھیں۔

یہی وہ زندگی تھی جس کے خواب اس نے دیکھے تھے اور جن کی تکمیل کے لئے اس نے رشید کے ساتھ شادی کی تھی۔ تاہم وہ خوش نہ تھی۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس وسیع اور عظیم الشان دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ اجنبی مجمع میں گھری ہوئی ــــ بخلاف اس کے اگر اس کی شادی جمیل کے ساتھ ......

ثریا دفعتہً چونک پڑی۔ رشید خوابگاہ کے دروازے پر کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا!۔

"یہ فرش کی پیمائش کیوں ہو رہی ہے؟ کوئی خاص وجہ ہے؟" اس نے اندر آ کر دریافت کیا اور ٹوپی اتار کر ایک کوچ پر پھینک دی۔

"کچھ نہیں ــــ دل گھبرا رہا تھا" ثریا نے ٹوپی کو سلیقے سے میز پہ رکھتے ہوئے جواب دیا "آج آپ کو اتنی دیر کیوں ہو گئی؟"

"تو کیا بے قراری میرے ہی فراق میں تھی؟"

"میں نے تو یہ نہیں کہا"

"میں سمجھا شاید ...."

"خدا نہ کرے۔"

"ثریا!"

"جی"

"آج مزاج کیوں برہم ہے؟ کوئی غریب بڈھے خرانٹ افسروں کے ساتھ سر کھپا کر تھکا ماندہ گھر واپس آئے تو اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے —— نہ آؤ بھگت۔ نہ دلجوئی؟"

"تو پھر میں کیا کروں آپ تو آتے ہی جلی کٹی سنانے لگے۔"

"ٹھیک —حسب معمول میری ہی غلطی نکلی۔ خیر جانے دو۔ معافی مانگتا ہوں۔ آؤ اب صلح ہو جائے۔"

یہ کہہ کر رشید نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا اور کوچ پر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

"کتنی جلدی گُصّہ" (غصّہ) آجاتا ہے میری ثریّا کو" اس نے ثریّا کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ حسب عادت مسکرا رہا تھا —— اپنے مخصوص طنز آمیز انداز میں —— ثریا کی نظریں جھک گئیں۔ رخسار تمتما اُٹھے۔ سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

"صیّاد پنجرے میں پرندے کو دیکھ دیکھ کر ملکیت کے غرور سے مسکرا رہا ہے" ثریا نے سوچا اور سوچتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن اس نے رشید کے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے ہٹایا نہیں۔ —— یہاں تک کہ ان کے ہونٹ باہم پیوست ہو گئے۔

"اور ہاں۔ یہ تو بتاؤ تمہارے مہمان صاحب کب آرہے ہیں"۔ رشید نے ثریا کے چہرے کو اپنی گرفت سے رہا کرتے ہوئے پوچھا "خط میں کوئی تاریخ بھی لکھی تھی؟"

"کل گیارہ بجے کی ٹرین سے آجائیں گے" ثریا نے جواب دیا۔

"ان کے قیام کا انتظام کر دیا؟"

"ہاں، انتظام کون سا کرنا تھا۔ ڈرائنگ روم کے برابر والے کمرے میں رہیں گے۔ ایک ہفتہ تو رہنا ہی ہے۔"

"بس؟"

"ہاں —— لڑائی پر جانے کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ زیادہ نہیں ٹھہر سکتے۔"

"اوہ! ٹھیک ہے۔ ان کو تو شاہی کمیشن مل چکا ہے۔ طیّارچی ہیں نا؟"

"جی۔"

سلسلۂ گفتگو یہیں تک پہنچا تھا کہ دیوار کی گھڑی نے گیارہ بجانا شروع کیا۔ رشید نے اٹھ کر شیروانی اتاری اور ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بٹن دبا دیا —— کمرے میں تاریکی چھا گئی۔

(۲)

"ثریا! میرا آنا تم کو ناگوار تو نہیں ہوا؟"

"ناگوار؟ یہ کیسے؟"

"مجھے آنا نہیں چاہیئے تھا —— اب ہمارے اور تمہارے راستے الگ الگ ہیں لیکن لڑائی پر جانے سے قبل میں ایک دفعہ تم کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں پلٹ کر آنا ہو یا نہ ہو۔"

"خوب کیا جو تم چلے آئے۔ نہ آتے تو مجھے شکایت رہتی۔"

ثریا نے ظاہری سکون کے ساتھ جواب دیا لیکن دل پر برچھیاں چل رہی تھیں —— چاہتی تھی کہ جمیل کے شانے پر سر رکھ کر خوب روئے اور اس طرح اس کو جنگ پر جانے سے روک لے۔

"شکریہ!" جمیل نے جواب دیا اور خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

"یہ لڑائی پر جانے کا خبط تم پر کیوں سوار ہوا —— کسی نے روکا نہیں؟"

"کون روکتا ثریا؟"

اب ثریا کے خاموش ہونے کی باری تھی —— اس نے گھبرا کر جمیل کے چہرے سے اپنی نگاہیں ہٹالیں اور سر جھکا کر انگلیوں کے پور چٹکانے لگی —— وہ محسوس کر رہی تھی کہ جمیل کی نگاہیں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا نبضیں تیز ہو گئیں —— ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے اصلی جذبات کا راز معلوم کر لے۔

"اگر اس کو معلوم ہو گیا تو؟" اُس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ خوش ہوگا..... یا..... میری حالت پر افسوس کرے گا؟..... ایسا تو نہیں کہ..... وہ....."

ثریا کانپ اٹھی —— کیسا خوفناک خیال تھا اور کس قدر ذلیل..... جمیل نیکی کا فرشتہ ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کر سکتا جو اس کو نہ کرنا چاہیئے" اُس نے اپنے دل کو سمجھایا۔

"جمیل، لکھنؤ کے بعد تو اس شہر میں تمہارا دل کیسا لگے گا" اس نے دفعۃً خاموشی سے متوحش ہو کر کہا۔

"مجھے شہر سے....."

"ہاں۔ ہاں" ثریا جمیل کے جواب کو تاڑ کر بول اٹھی "میرا مطلب ہے تمکینیا شہریت تو نام کو بھی نہیں۔ کوئی بازار بھی اچھا نہیں ہے میں اس طرف سنّل تھنوں

کسی قدر رونق رہتی ہے۔"

جمیل سمجھ گیا تھا کہ ثریا ذاتیات کے ذکر سے دور رہنا چاہتی ہے لہذا اسٹیشن سے آتے وقت اُس نے جو کچھ دیکھا اس پر اظہار خیال کرنے لگا۔ ثریا نے اطمینان کی سانس لی اور احسانمند نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر جوش و انہماک کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوگئی۔

لیکن ابھی چند ہی منٹ گذرے تھے کہ اس کو یہ فضول گفتگو ناگوار گزرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ جمیل کچھ اپنا حال بیان کرے۔ اس کے دن کیوں کر گزرتے ہیں۔ کیا مشاغل ہیں۔ کن لوگوں سے ربط ضبط ہے۔ اور اگر اسی سلسلے میں گزری ہوئی باتوں کی طرف اشارے کنائے بھی ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں —— لیکن دل ڈرتا تھا۔

"خیر چھلے میں ڈالو اس شہر کو۔ یہ بتاؤ کہ زبیدہ تو اچھی ہے —— مجھ کو یاد کرتی ہے یا نہیں؟" اُس نے دفعتہً پوچھا۔

جمیل سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر نگاہیں چُرانے لگا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے گھر والے اس کے سامنے اس خیال سے کہ اس کو صدمہ نہ ہو۔ ثریا کا ذکر نہ کرتے تھے۔ خصوصاً اس کی چھوٹی بہن زبیدہ تو بھول کر بھی اس کا نام نہ لیتی تھی۔

"کیوں بولتے کیوں نہیں، کیا زبیدہ مجھ کو یاد نہیں کرتی؟" ثریا نے بضد ہو کر پوچھا۔

"یاد تو ضرور کرتی ہوگی مگر میرے سامنے نہیں" جمیل نے جواب دیا۔

"اوہ!" ثریا نے کہا اور خاموش ہوگئی۔ اس کا چہرہ احساسِ خجالت سے سرخ ہو گیا تھا۔

جمیل اس کی طرف دیکھ کر جوشِ الفت سے بے قرار ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ثریا کا دل بہت نازک ہے۔ پہلے کا زمانہ ہوتا تو اب تک اُس نے لاکھوں شکائتیں کر ڈالی ہوتیں —— اور زبیدہ سے لڑنے پر تیار ہو جاتی۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے —— وہ اس ظاہری سرد مہری کی شکایت بھی نہیں کر سکتی تھی، اس لئے کہ رشتۂ الفت اُس نے خود توڑا تھا۔

"ثریا!" اس نے ایسی آواز میں پکارا جو کانپ رہی تھی لیکن ثریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ناراض نہ ہو ثریا" اس نے جوشِ الفت میں ثریا کا ہاتھ پکڑ کر کہنا شروع کیا "میں نے کسی کو منع نہیں کیا —— بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی تمہاری باتیں کرے ...... تمہاری شرارتیں۔ لڑائیاں۔ روٹھنا۔ منانا۔ بیان کرے ... گھر والے چونکہ میرے دل کا راز جانتے ہیں اس لئے میرے سامنے تمہارا ذکر نہیں کرتے۔ یوں آپس میں ضرور تمہارا ذکر کرتے ہوں گے —— بھلا تم کو کون بھول سکتا ہے"۔

آہستہ آہستہ ثریا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا —— اور سمٹ کر بیٹھ گئی —— اس کی غزالی آنکھوں میں اشک بھر آئے تھے —— ہونٹ کانپ رہے تھے —— قریب تھا کہ رو پڑے۔ لیکن بڑی کوشش سے ضبط کیا۔ جمیل اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اور گو ثریا کی یہ غمگین تصویر اس کے دل کے ٹکڑے کئے دیتی تھی تاہم اس نے اپنی دل کی گہرائیوں میں مسرت اور انبساط کو آہستہ آہستہ رینگتے پایا۔ ثریا کو اس کا رنج تھا کہ جمیل اور اس کے گھر والے اب اس کا ذکر نہیں کرتے —— یہ بات اس کی خوشی کے لئے کم نہ تھی۔

کیا ثریا کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی اس کی محبت چھپی ہوئی ہے؟ ...... کیا وہ اب بھی اس کو وہی اپنا جمیل سمجھتی ہے؟

دونوں اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے خاموش بیٹھے تھے کہ خانساماں نے آکر کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ دونوں خاموشی کے ساتھ اُٹھے اور بغیر ایک دوسرے کی طرف دیکھے ہوئے خانساماں کے ساتھ چلے گئے۔

اسی روز سہ پہر کے وقت ثریا اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی سوچ رہی تھی —— اس کا دل اس ہنگامہ خیز انکشاف کے اثر سے تھرا رہا تھا۔ اُس کو اب بھی جمیل سے ویسی ہی محبت ہے جیسی پہلے تھی —— ورنہ کیوں جمیل کی آواز سنتے ہی اُس کی روح مائل بہ رقص ہو جاتی —— کیوں اُس کے قرب سے اُس کا دل دھڑکنے لگتا اور اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہی مغلوبیت اور سپردگی کی کیفیت طاری ہو جاتی؟ رشید بھی اس سے محبت کرتا تھا —— اور ہر ممکن طریقے سے خاطرداری اور دلجوئی کرتا تھا۔ اس کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا —— لیکن اس کی ان باتوں کا اس پر کوئی خاص اثر نہ ہوتا تھا —— بلکہ کبھی کبھی تو وہ چڑ جایا کرتی تھی۔ مگر جمیل کی زبان سے اپنا نام سن کر اس کا دل جوشِ مسرت سے لرزنے لگتا تھا۔

دفعتہً ثریا کا دل بیٹھ گیا —— وہ جمیل سے محبت کرتی تھی اور اپنی زندگی ہمیشہ کے لئے رشید کے ساتھ وابستہ کر چکی تھی! —— آج پہلی دفعہ اس کو معلوم ہوا کہ اس کا دل جس چیز کی ہر وقت جستجو کیا کرتا تھا وہ کیا ہے —— وہ چیز اس کو مل سکتی تھی —— مل رہی تھی —— لیکن اس نے خود قبول نہیں کیا ...... اس کے ہونٹوں پر زہر خند کے آثار پیدا ہو گئے ——

آنکھوں میں موتی کی طرح اشکوں کے قطرے چمکنے لگے ——— تقدیر کا یہ بھی کیا خوب طنز تھا کہ اُس نے اپنی زندگی خود اپنے ہاتھوں برباد کی ——— وہ جانتی تھی کہ ایک آئی۔سی۔ایس کے ساتھ شادی ہونے پر اس کو وہ سب کچھ مل جائے گا جو وہ چاہتی تھی ——— مجلسی زندگی ——— شہرت ——— ہردلعزیزی ——— عزت اور اثر ——— اسی لئے ماں کی زبان سے رشید کی نسبت کا ذکر سنتے ہی اس نے شرم سے گردن جھکا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تھا ..... وہ جمیل کی محبت کو ایک کھیل سمجھتی تھی ——— یا ——— بیکاری کا ایک دلچسپ مشغلہ ——— واقعات نے بتا دیا کہ محبت صرف ایک دفعہ ہوتی ہے ——— مگر افسوس اس وقت جب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا

خود بخود اس کو جمیل پر غصہ آنے لگا ——— وہ مرد تھا۔ اور عمر اور تجربے میں اس سے زیادہ ——— اس کو لازم تھا کہ اس کی رہبری کرتا ——— اور اس کو رشید کے ساتھ شادی کرنے سے باز رکھتا ———

"اگر وہ زور دیتا تو ممکن نہ تھا کہ میں اس کو مایوس کر سکتی"۔ اس نے سوچا "لڑکیاں کیا نہیں کرتے۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ سو سو ترکیبیں کرتے ہیں اور بعض تو زبردستی پر اتر آتے ہیں اور اپنی محبوبہ کو مجبور کر کے زبردستی شادی کر لیتے ہیں ——— اگر جمیل کو واقعی مجھ سے محبت ہوتی ...... لیکن اُس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی ——— تجرد پسند کیوں ہو گیا ہے؟ ..... محبت تھی ضرور مگر کمزور ....."

ثریا کی نظروں میں جمیل کے ساتھ اپنی وہ آخری ملاقات پھرنے لگی جب اس نے رشید کے ساتھ اپنی نسبت کا ذکر کیا تھا۔

وہ چائے کی ضیافت کے بعد جمیل کو خانہ باغ میں لے گئی تھی ——— دیر تک دونوں خاموش پہلو بہ پہلو ٹہلتے رہے۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی" دفعتہً ثریا نے جمیل سے کہا۔

جمیل ٹھہر کر اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھنے لگا کہ وہ شرما گئی اور نگاہیں موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

"میں جانتا ہوں جو کچھ تم کہنا چاہتی ہو" ثریا نے جمیل کو کہتے ہوئے سنا۔

"کیا؟" اُس نے پوچھا اور جھک کر ایک پھول توڑنے لگی ——— اس کا دل خود بخود دھڑکنے لگا تھا۔

"یہی کہ ہماری شادی کب ہوگی" جمیل نے جواب دیا

ثریا کانپ اُٹھی۔ رہی سہی ہمت نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ دل ڈوبنے لگا چہرہ زرد ہو گیا ——— جمیل اس کی یہ متغیر حالت دیکھ کر گھبرا گیا

اُس نے اپنا بازو پھیلا کر اس کو سنبھال لیا اور انتہائی نرمی اور پیار کے لہجے میں پوچھا

"کیا ہے ثریا! یہ کیا حالت ہے؟"

"میں تھک گئی ہوں جمیل" ثریا نے نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے کہیں لے چل کر بٹھا دو"۔

آہستہ آہستہ، محبت اور نرمی کے ساتھ اس کے گرد اپنا بازو حائل کئے ہوئے ——— جمیل نے اس کو لے جا کر ایک بنچ پر بٹھا دیا اور خود بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔

"ثریا اگر تم کو وہ بات کہنے میں دکھ ہوتا ہے تو نہ کہو" اس نے جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں انتظار کر سکتا ہوں"۔

"نہیں جمیل" ثریا نے نحیف آواز میں جواب دیا "کہنا ہی پڑے گا ——— میری شادی ہو رہی ہے!"

"کیا!"

"ہاں ——— بات چیت طے ہو چکی ہے!"

خاموشی ——— جمیل بے حس و حرکت ایک لاش کی طرح اپنے مقام پر بیٹھا رہا ——— ثریا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس کا منہ دیکھ رہی تھی ——— اور نظروں ہی نظروں میں رحم کی درخواست کر رہی تھی۔

"کس کے ساتھ؟" جمیل نے چند منٹ کے بعد پوچھا ——— اُف اُس کی آواز کیسی بھیانک اور ڈراونی تھی! جیسے رات کے وقت کسی تیرہ و تاریک مقبرے کی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی بازگشت!

"کوئی رشید صاحب ہیں" ثریا نے نیچی نظروں سے جواب دیا۔ "حال ہی میں آئی۔سی۔ایس پاس کر کے ولایت سے واپس آئے ہیں"۔

"تم کو یہ رشتہ پسند ہے؟"

"میری سنتا کون ہے ——— کسی نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا۔ پہلے ہی سب کچھ طے کر لیا"۔

"کسی کے طے کر لینے سے شادی نہیں ہو سکتی ——— یہ بتاؤ تم کو یہ رشتہ پسند ہے یا نہیں؟"

"میں والدین کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی"۔

پھر خاموشی ——— ثریا سر جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی ——— لیکن وہ جانتی تھی کہ جمیل کی نگاہیں اس کے چہرے پر لوٹ رہی ہیں ——— وہ اس کے راز کو معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"ثریا!" اچانک جمیل نے مُہرِ سکوت کو توڑ کر کہا۔

ثریا نے گردن اٹھا کر جمیل کی طرف دیکھا اور دم بخود رہ گئی ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمیل کئی برس کی طویل علالت سے لاغر ہو گیا ہے ——— چہرے پر خون کی ایک چھینٹ بھی نظر نہ آتی تھی ——— آنکھوں سے یاس ٹپک رہی تھی ——— کسی غیر مرئی ہاتھ نے ثریا کا دل اپنے آہنی پنجے میں زور سے مسل دیا ———

"اور ہم نے جو خواب . . . ." جمیل نے کہنا شروع کیا تھا کہ ثرّیا نے بے چین ہو کر اس کے مُنہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"جمیل مجھ پر رحم کرو ——— میں والدین کے حکم سے مجبور ہوں۔ اُن کو دکھ دے کر اپنی تعلیم کو بدنام نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے بھول جاؤ۔"

"اچھی بات ہے ثریا ——— تمہاری یہ آخری ضد بھی پوری کروں گا۔" جمیل نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر جواب دیا "میں تم کو بھول جانے کی کوشش کروں گا ——— لیکن اگر نہ بھول سکا تو . . . ."

"تو؟" ثریا نے سہم کر پوچھا۔

"وقت آنے پر خود معلوم ہو جائے گا۔"

یہ تمام واقعات متحرک تصاویر کی طرح قریا کے دماغ سے گذر رہے تھے ——— اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ——— مستقبل کی بھیانک۔ اجاڑ اور بے کیف تصویر اس کی نظروں میں پھرنے لگی۔ منزل کس قدر دور تھی ——— خیال کی رسائی سے باہر ——— نگاہوں سے اوجھل ——— اور راستہ کیسا ——— سنسان ——— تھکا دینے والی یکسانیت سے گھرا ہوا۔ اس کا دل کانپ اٹھا۔

"نہ معلوم ابھی زندگی کے کتنے سال باقی ہوں" اس نے سوچنا شروع کیا "یہ طویل مدت کیونکر بسر ہو گی؟ . . . . مکر و فریب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کب تک قائم رہے گا۔ مجھے خوش رہنا ہو گا ——— دل روئے گا اور ہونٹ ہنسیں گے طبیعت زندگی سے اُچاٹ ہو گی ——— لیکن دعوتوں، جلسوں ——— اور پارٹیوں میں شریک ہونا ہو گا . . . . اف!"

"کیوں؟" دفعتہً اس کے دل نے پوچھا اور سینے میں بغاوت کی چنگاریاں سلگ اٹھیں۔ "کیوں؟"

اس کے ارد گرد ہر طرف مسرت اور شادمانی تھی ——— ہر شخص خوش اور مطمئن تھا ——— پھر وہ کیوں اس عام شادمانی سے محروم رہے؟ وہ کیوں

ج
نش
بولے

ثریا اُٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی ——— "کیا جمیل میرے جانے سے ناراض ہے؟" اس نے سوچا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی ——— لیکن چہرہ پرچھائیں کی طرح دھندلا معلوم ہو رہا تھا ——— چند منٹ پس و پیش کرنے کے بعد وہ چُپ چاپ چلی گئی۔

رشید ڈرائنگ روم میں ایک کوچ پر نیم دراز تھا۔ پیر فرش پر تھے اور آنکھیں چھت سے لگی ہوئی تھیں۔ ثریا کی آہٹ پا کر اُٹھ بیٹھا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ شاید جمیل صاحب کے ساتھ تم بھی لڑائی پر چلی گئیں ———" رشید نے نیم باز آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہی خون کو کھولا دینے والی طنز آمیز مسکراہٹ۔ وہی کاہلی کے رنگ میں ڈوبا ہوا انداز گفتگو! ثریا جل بھُن کر کباب ہو گئی ——— دل چاہتا تھا کہ کوئی ایسا جواب دے جس کو سُن کر رشید تلملا اُٹھے لیکن ضبط کر گئی۔ دل کا چور اس کو رشید کی خوشامد اور دلجوئی پر مجبور کر رہا تھا۔

"اچھی رہی ——— الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" اُس نے ایسے دلفریب تبسم کے ساتھ کہا جو خاص موقعوں کے لئے مخصوص تھا "غائب تو خود تھے ——— اور الزام مجھ کو دیا جا رہا ہے۔"

"یہی تو ہوتا ہے دنیا میں" رشید نے سیگرٹ ہونٹوں میں دبا کر جواب دیا "اپنی بلا دوسرے کے سر ٹالنے ہی میں خوشی کا راز پنہاں ہے ——— جب تک انسان اپنے ضمیر کو دھوکا دینا نہیں سیکھتا اس کو خوشی نصیب نہیں ہوتی۔"

"خیر معمّے بیان کر کے اصل بات نہ ٹالئے" ثریا نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا "بتائیے آپ کہاں غائب تھے دوپہری ہے۔ جس جگہ بیٹھ کے بی بی وہی بیجا نہ بنے! ——— اور ہاں یہ تمہارے مہمان صاحب گئے؟ چھت پر چھتری لے کر پھاندنے کی مشق تو نہیں کر رہے ہیں؟"

ثریا حیران تھی کہ رشید آج کیسی باتیں کر رہا ہے ——— وہ اپنی عادت کے خلاف جمیل کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے وہ بڑی بڑی آنکھیں چمکنے لگیں جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چھپی ہوئی سب کچھ دیکھ رہی ہوں ———

"جی نہیں ——— آپ کی طرح پولیس کے اشارے پر بے گناہوں کو سزا دینے کے لئے تعزیرات ہند پڑھ رہے ہیں۔"

دھوبی کا گھاٹ

جس شخص کے ملبوس کی قسمت میں لکھی ہے
کرنوں کی تمازت
رشک آتا ہے مجھ کو
اُس پر

کیوں صرف اچھوتا
انجان، انوکھا
اک خوابِ بشاشت!
کیوں صرف تصوّر
بہلاتا ہے مجھ کو؟

کیوں صبحِ شبِ عیش کا جھونکا
بن کر
رخسار کی بے نام اذیت
سہلاتا ہے مجھ کو؟
کیوں خوابِ فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے؟
کیوں گیسوئے پیچیدہ و رقصاں
نمناک نہیں ہے
اشکِ دلِ خوں سے؟
کیوں اُس کی حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی؟

ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
ہے وہم نظر کا

اور صبحِ شبِ عیش کو گیسو کا مہکتا ہوا جھونکا
مرہونِ سحر کا
ہوتا ہی نہیں ہے۔

کیوں دھوئے نہ پیراہنِ آلودہ کے دھبّے
مخمورِ مسرّت!
کرنوں کی تمازت
بن جائے نہ کیوں رنگِ شبِ عیش کا اک عکسِ مسلسل؟

مجبورِ اذیت!
تُو مان لے، اس عکس کا منظر
دیتا ہے تجھے جامِ جمشیدہ کی سی لذّت،
کیوں سوچ رہا ہے
جو جھوٹا ہے یہ پیالہ؟
کیا آج زمانے میں کہیں دیکھی ہے تو نے
دوشیزہ مسرّت؟

پھیلے ہوئے ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
ہے زیست کے گیسو کی حرارت
اِس شخص کو پیراہنِ آلودہ کے دھونے ہی سے روزی
ملتی ہے جہاں میں
تُو اس پہ نظر کر۔

میراجی

دنیائے ادب

نئی سوز میں، نئے موضوع نئے اندازِ بیان ـــــ شاعری میں ان سب کی آمد ضرورت کی پابند ہے۔ ابتدائی انسان کی ضروریات محدود تھیں، اس لئے اس کی شاعری بھی محدود رستوں ہی پر گامزن ہوئی۔ یا یوں کہئے کہ اُس کی نظر اپنی محدود ضروریات کے دائرے میں شعریت کی تلاش کر سکی۔ پیٹ بھر کر اپنی ہمدم کے ساتھ فراغت سے لطف اندوز ہونا، پیٹ بھرنے کے لئے خوراک کی فراہمی اور ڈر ـــــ مظاہرِ فطرت سے ڈرنا، اپنے ہم جنس دشمنوں سے ڈرنا، بس یہی موضوعاتِ سخن تھے۔ اشتہا اور خوف کے دو متوازی خطوط کا درمیانی فاصلہ ابتدائی انسان کی شاعری ہے۔ جوں جوں ارتقائی منازل طے ہوتی گئیں اور تہذیب و تمدن کی الجھنوں سے انسان کو واسطہ پڑا توں توں اُس کے تخیل کا ستارہ پھیل کر اپنی اڑتی ہوئی گرد سے خیال کے آسمان میں ایک کہکشاں بناتا گیا۔ تہذیب و تمدن کی آمد نے نہ صرف احساس و جذبات میں ایک غیر محدود تنوع پیدا کر دیا بلکہ ہر قسم کے احساس و جذبات کی ادبی تسکین کے بعد ذہن ہر طرح کے فطری اور غیر فطری رستوں پر گامزن ہونے پر یہ سوچنے لگا کہ اب کون سے نقطے کو منزلِ مقصود بنایا جائے۔ اور شاید یہیں سے متخیلہ کی ابتدا ہوئی۔

ذیل میں راجہ مہدی علی خاں کی دو نظمیں بھی تخیل کی ایسی ہی پرواز ہیں ہیں شاعر کا ذہن شاید اپنے گرد و پیش کے حقیقت افروز ماحول سے تنگ آ کر ایک معکوس انداز میں گریز کی کیفیت سے ہم آہنگ ہوتا ہے،

اصلاً یہ نظمیں طنز ہیں، معاشرت پر، پرانے خیالوں کو نیچا دکھانے کے لئے فن کار نے ایک نیا اور اونچا رستہ چُنا ہے۔ دونوں نظمیں بظاہر منظر ہیں مرقعے، لیکن اس محض تصوریت سے احساس اور خیال کو بھی حرکت ہوتی ہے۔ پہلے نظمیں دیکھ لیجئے۔

جنّت کی سیر

جنّت کی دیوار پہ چڑھ کر
میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے
جنّت کے پُرکیف نظارے،

دودھ کی جھیل کے پاس اک مُلا
چورن کے اک پیڑ کے نیچے
حلوے کے اک ڈھیر پہ بیٹھا
سر کو جھکائے اونگھ رہا تھا۔

ملاقات

کھٹ! کھٹ! کھٹ
جنّت کا دروازہ کھولو!
مولانا!
دیکھنے والا کوئی نہیں
آدھی رات ہے مولانا
کھٹ! کھٹ! کھٹ!
ہاں ہاں میں شیطان ہوں بیشک
آپ کا خدمت گار پُرانا
مولانا!
کھٹ! کھٹ! کھٹ!
چوری چوری
آپ کے ہاں
رات کو دانے آیا ہوں۔
جنّت کا دروازہ کھولو ـــــ مولانا!

ادبِ لطیف ستمبر [illegible] راجہ مہدی علی خاں

جنّت کی سیر کا ماحول پھیلا ہوا ہے۔ اس تصویر میں وہی باتیں [illegible]
گرد و پیش سب ہی کچھ ہیں اور جہاں دودھ کی جھیل [illegible]
ـــــ ان چیزوں سے جنّت کے تصور میں [illegible]
ہمارے تحت شعور میں [illegible]
طنز یہ تاثر کو ابھارا گیا ہے [illegible]
پہلے ہی دو مصرعوں [illegible]

خدنگ سکول کی یاد آجاتی ہے اور ملا سکول کا نامعقول مدرس اور شاعر اور شیطان دونوں طالب علم بن جاتے ہیں۔

دوسری نظم "ملاقات" نفسی لحاظ سے زیادہ پیچیدہ ہے جنت کے عام تصور میں روایت کی رو سے نیک بندوں کی خدمت کرنے والے اور غلمان اور حوریں ہوں گی۔ لیکن شاعر کی نظر میں مولانا، خواہ یہ مولانا کوئی ملا ہو یا کوئی ریاکار لیڈر، نیک بندہ نہیں ہے۔ ایک نا پسندیدہ فرد ہے۔ جو اس دنیا میں شیطانی افعال کا ہی مرتکب ہوتا رہا اور اسی لئے اب شاعر اُسے ایک خیالی جنت میں پہنچا کر شیطان کو اس کے دروازے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ نظم کی طنز کو "خدمت گار پانا" کے دو الفاظ ہی اچھی طرح نمایاں کر دیتے ہیں "چوری چوری آدھی رات ہے" اور "کھٹ کھٹ، کھٹ" کا صوتی تاثر یہ تینوں چیزیں مل کر ماحول کی تخلیق اور ترجمانی میں معاون بنتی ہیں۔

مافوق الفطرت تخیل کے یہ دو مطالعے راجہ مہدی علی خاں کی شگفتہ تخلیق ہیں۔

اور ذیل کی دو تضمینیں اسد ملتانی کی ذہانت کا اظہار کر رہی ہیں جن پر کچھ کہنا لاحاصل ہے کہ سیدھی سادی لطف اٹھانے کی بات ہیں

ریڈیو

(شیخ ناسخ سے معذرت کے ساتھ)

ہے ریڈیو حضورِ مصلے کے سامنے — یا زہرہ نغمہ زن ہے ثریا کے سامنے
بالکل بجا ہے صاف اگر یہ بھی ہم کہیں — بے جان بولتا ہے مسیحا کے سامنے

(حکیم مومن سے معذرت کے ساتھ)

ریڈیو ہو تو گوشۂ خلوت — خامشی آشنا نہیں ہوتا
یہ مرے پاس ہوتا ہے گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہمایوں ستمبر ۱۹۳۵ء — اسد ملتانی

بہاؤ اور تکرار کے لحاظ سے آزاد انصاری اپنے کلام میں عموماً ایک اچھا فن کار ثابت ہوتا ہے۔ ذیل کی نظم "عشقِ خود اعتماد" میں نہ صرف تکرار کی دلچسپی موجود ہے بلکہ بہاؤ کا زور بھی پوری طرح نمایاں ہے۔ نظم کے مصرعوں میں نثر کے فقروں کی سی صفائی تاثر میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن اس مجموعی تاثر کو حاصل کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ [illegible] پر ایک غیر معمولی قدرت ضروری ہے ہیئت کی [illegible] یہ نظم نیا رنگ رکھتی ہے۔ جس [illegible] ہے وہ ہماری شاعری کے پہلے پرانے روایتی [illegible] ہماری جدید شاعری میں بھی خال خال ہی دکھائی [illegible] کے سامنے ہیں [illegible] سکتا۔

وہ ایک چٹان کی مانند ہے۔ اگر نباتات کو کسی بیل کو ضرورت ہو تو وہ اس چٹان سے لپٹ جائے۔ یہ اپنی خودداری میں کسی طرح کا فرق نہ آنے دے گی۔ مرد اور عورت کی مساوات کے لحاظ سے یہ نظم ایک انتہائی صورت ہمارے پیش نظر کرتی ہے اور جو لوگ سمجھتے ہیں کہ مرد اور عورت کی مساوات شاید شعریت کی قاتل ثابت ہوگا انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ شعریت کی تلاش اور اُس کا حصول فن کار کے زورِ طبیعت پر منحصر ہے۔ اور زورِ طبیعت کے لحاظ سے آزاد انصاری ہمیشہ ایک کامیاب شاعر رہا ہے۔

عشقِ خود اعتماد

کوئی قدرِ مذاقِ بے وفائی کر نہیں سکتا — کوئی ناآشنا سے آشنائی کر نہیں سکتا

اگر واقع میں اب تم ہوئے ضبطِ جور مائل ہو — تو میں اس ضبط کی ہمت فزائی کر نہیں سکتا
اگر واقع میں اب تم جبر کی منطق کے قائل ہو — تو میں اس جہل کی مدحت سرائی کر نہیں سکتا

اگر یہ سچ ہے تم نادانِ کار بے وفائی ہو — تو یہ بالکل غلط میں بے وفائی کر نہیں سکتا
اگر یہ سچ ہے تم آمادۂ بے اعتنائی ہو — تو پھر یہ جھوٹ میں بے اعتنائی کر نہیں سکتا

اگر تم قصدِ کارِ کج ادائی کرنے والے ہو — تو کیا میں عزمِ کارِ کج ادائی کر نہیں سکتا
اگر تم مجھ سے جی بھر کر ڈھٹائی کرنے والے ہو — تو کیا میں تم سے کچھ بڑھ کر ڈھٹائی کر نہیں سکتا

اگر تم عازمِ ناآشنائی ہونے والے ہو — تو کیا میں تم سے ترکِ آشنائی کر نہیں سکتا
اگر تم ساعیٔ باہم جدائی ہونے والے ہو — تو کیا میں سعیٔ باہم جدائی کر نہیں سکتا

اگر تم پیکرِ جنگ آزمائی بن کے آئے ہو — تو کیا میں ہمتِ جنگ آزمائی کر نہیں سکتا
اگر تم دشمنِ صلح و صفائی بن کے آئے ہو — تو کیا میں نفیٔ ہر صلح و صفائی کر نہیں سکتا

اگر اب تم ڈھٹائی ہی کی مجھ سے ٹھان بیٹھے ہو — تو میں کیوں چُپ رہوں کیا ڈھٹائی کر نہیں سکتا
اگر اب تم لڑائی ہی کی مجھ سے ٹھان بیٹھے ہو — تو میں کیوں طرح دوں کیا میں لڑائی کر نہیں سکتا

میں اصنامِ حسیں کے ناز اٹھانے کو تو حاضر ہوں — پر اُن کی چوکھٹوں پر جبہ سائی کر نہیں سکتا
میں اہلِ حُسن کی قیمت بڑھانے کو تو حاضر ہوں — پر اُن سے وصل کی خاطر گدائی کر نہیں سکتا

اگر میں فرض کر لوں قید و بندِ غم مقدر ہے — تو کیا میں کوئی تدبیر رہائی کر نہیں سکتا

اگر میں مان لوں میرا مقدر نارسا تو ہے تو کیا میں کچھ علاجِ نارسائی کر نہیں سکتا

اگر کوئی مرا مشکل کشا بننے سے منکر ہے تو کیا میں اپنی خود مشکل کشائی کر نہیں سکتا
اگر کوئی مرا حاجت روا بننے سے قاصر ہے تو کیا میں اپنی خود حاجت روائی کر نہیں سکتا

مری ہمت مجھے خود ناخدا بننا سکھائے گی بلا سے کوئی میری ناخدائی کر نہیں سکتا
مری منزل مجھے خود ڈھونڈ کر اپنا پتا دے گی بلا سے کوئی میری رہنمائی کر نہیں سکتا

جہاں آزادؔ اب میرا نیازِ عشق فائز ہے
وہاں کوئی عزیز دلربائی کر نہیں سکتا۔

ہمایوں اگست ۱۹۴۲ء ——— حکیم آزاد انصاری

خیالاتِ پریشاں

دیوداروں کے تُرش رُو پتّے جھڑ کے پیوندِ خاک ہو بھی چکے
جھیل کی لُٹ چکی ہے شادابی کب سے میداں میں پہنچی مرغابی
ہر طرف نرم برف جمنے لگی سربرآوردہ ندی تھمنے لگی
چیختی ہے ہوا گذرتی ہوئی
کوہساروں کے پار اترتی ہوئی
میں ہوں اور اک بسیط تنہائی بے کراں لا بسیط تنہائی
راہ بھولا ہوا ہوں منزل کی کیا کہوں کیا ہے کیفیت دل کی
اشک آنکھوں سے بہتے جاتے ہیں کتنے افسانے کہتے جاتے ہیں
سانس رکتا ہے لڑکھڑاتا ہوں
ذرّے ذرّے سے خوف کھاتا ہوں
ایک شفّاف ٹکڑا بادل کا یا کوئی پرزہ زرّیں آنچل کا
دُور افق کے قریب لہرایا آرزوؤں نے دام پھیلایا
میں نے چاہا کہ اپنی بات کہوں ہو سکے گر تو اس کے ساتھ چلوں
میری رفتار برق وار نہ تھی
اور اُسے تابِ انتظار نہ تھی
برف کے اک وسیع میداں پر اب کھڑا ہوں شکستہ حال و جگر
راستہ ہے نہ رہنما کوئی میرے پہلو سے گُم ہے سایہ بھی
شام کی زردی آئی جاتی ہے مردنی بن کے چھائی جاتی ہے

آزاد انصاری

سلہ میں لفظ "پرزہ" یہ معنی ٹھیک ادھ کرنے دیو کو قابلِ ترک نہیں سمجھتا۔

دم بخود ہے ہوا سرکتی ہوئی
روح ہے یا بہارِ رفتہ کی

تالیق اگست ۱۹۴۲ء قیوم نظر

آریہ جب پہلے پہل ہندوستان میں پہنچے تو انہیں دو چیزوں سے سابقہ پڑا۔ جنگل اور جنگلی حبشیوں کو تو انہوں نے مار بھگایا اور وہ ملک کے دُور افتادہ حصّوں میں جا چھپے، لیکن جنگل کے جادو سے بچ نکلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ نہ صرف اُن کی تہذیب کا گہوارہ جنگل ہی بنے بلکہ ان کے تمام بنیادی خیالات کی نشو و نما جنگلوں کی تنہائی اور گہرائی میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے خیالات میں کسی جنگل کے اتھاہ ساگر کے ایسا عمق پایا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ زندگی کا ڈھب بدلا، گاؤں بنے، بڑھ کر قصبے بن گئے۔ قصبے پھیلے پھولے اور شہروں کے آثار نظر آنے لگے اور پھر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے یہ دور دراز سے آئے ہوئے باشندے مناظرِ فطرت سے دور ہوتے گئے۔ لیکن نسلی تجربے کے لحاظ سے اب بھی وہ تاثرات جو انہیں جنگلوں میں حاصل ہوئے ان کے لاشعور میں موجود ہیں۔ یہ نسلی تجربات اب بھی ادب کے ذریعے سے ظاہر ہوتے ہیں قیوم نظر کی اوپر کی نظم شاید ایک ایسا ہی نسلی تجربہ ہے۔ اس میں جنگل کا بیان جس انداز سے کیا گیا ہے اُس سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا شہر، شہری اور بہتر کوئی چیز ہی نہیں، آبادیاں عنقا کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آریاؤں کو جنگل کے مختلف جلووں میں جو ہم آہنگی انسانی احساسات سے محسوس ہوئی ہوگی، اُس کا عکس بھی اس نظم میں موجود ہے۔ بظاہر اس میں ہر منظرِ فطرت محض بیانیہ معلوم ہوتا ہے لیکن ہر خارجی چیز کی کچھ نہ کچھ داخلی اہمیت بھی ہے، "بادل کا شفاف ٹکڑا" ——— صرف بادل کا ٹکڑا ہی نہیں ہے۔ اور یہی حال غیر شاداب جھیل، چیختے ہوئے گذرتی ہوئی ہوا، آخر میں سرکتی ہوئی دم بخود ہوا، سربرآوردہ ندی، میدان میں پہنچی ہوئی مرغابی، دیوداروں اور ترش رو پتّوں کا ہے۔ یہ سب کسی ناٹک کے کردار ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ خوف دلاتے ہوئے ذرّے، شام کی زردی، نرم برف، اور بسیط تنہائی ——— یہ سب کچھ ان کرداروں کے (یا شاعر کے) دل کی کیفیت کی ترجمانی کو موجود ہیں۔

اردو کے جدید شعرا میں بہت کم شاعر ایسے ہیں جو اپنی نظموں میں ایک گہری فضا کی تخلیق کی طرف توجہ دیتے ہیں، اس نظم میں خواہ کوئی کیفیت پیدا ہوئی ہو کیفیت یا فضا تیار ہو جاتی ہے وہ بھی غور کے لائق ہے۔ وہی فضا ہمیں ان کرداروں کے دل کی کیفیت کا صحیح احساس دلاتی ہے۔

نقد و نظر

غالب کی زندگی اور غزلیں (انگریزی)

از عبداللہ انور بیگ ایم۔اے۔ ایم۔او۔ایل۔ایل۔بی۔ ایڈوکیٹ لاہور
ناشران: اردو اکیڈمی لوہاری دروازہ لاہور۔ سائز ۱۶ انگریزی مجلد مصور
قیمت — درج نہیں ہے۔

یہ کتاب بزبان انگریزی ہے — دیباچہ میں مصنف لکھتا ہے

(ترجمہ)

اس زمانے میں جب کہ دنیا کی طاقتیں مختلف باشندگان کرۂ ارض میں سمجھوتے کے لئے شدت سے کام کر رہی ہیں۔ ادب اور انسانی خیال کی ترقی کا مطالعہ اتنا ہی سبق آموز ہے جتنا کہ پر لطف ...... دنیائے ادب کی نظم کی کتابیں "انسانیات" کے مطالعہ کے لئے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ نیز انسان کی فطرت اور روحانیت کے مطالعے کا مقصد بھی پورا ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد مصنف کو افسوس ہے کہ (ترجمہ) "مشرقی ادیبوں نے ادبیات عالم میں اپنا جائز مرتبہ نہیں پایا فقط اس لئے کہ ان کی کاوشیں مغربی قوموں کے سامنے پیش نہ کی جا سکیں" چنانچہ اس بے انصافی کی دادرسی کی غرض سے یہ کتاب وجود میں لائی گئی۔ غالب پر ہاتھ صاف کرنے کی وجہ مصنف یوں بیان کرتا ہے۔

(ترجمہ)

"غالب آخری مغل شہنشاہ کے عہد میں اردو کا شاعر اعظم تھا.... اپنے کلام کے انسانی پہلو کے لئے اسے بالخصوص پسند کیا گیا ہے اگرچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ زندگی کے بارے میں شاعر (غالب) ایک [illegible] نظریہ رکھتا ہے اور اس کی شاعری اشیاء کی دو [illegible] مدد کرتی ہے خاص طور پر اس وقت جب کہ [illegible] انقلاب اور تعمیر نو کی فکر میں ہیں مگر جہاں تک اس کے فن — بلاغت، حسن تخیل، اظہار کی پاکیزگی اور [illegible] — کا تعلق ہے شاعر نے کمال کی

بلندی حاصل کی ہے (۱) جو یقیناً ایک عرصے تک باعث کشش رہے گی۔"

اس طویل دیباچے اور غالب کی شاعری پر اس عجیب وغریب "انسانیاتی" تنقید کے بعد اخبار "سول ملٹری گزٹ" لاہور کے ایک انگریز ایڈیٹر مسٹر ای۔سی روم کی لکھی ہوئی ایک مختصر تمہید ہے۔ روم صاحب تمہید کو حسب ذیل طریق سے شروع کرتے ہیں:-

(ترجمہ)

"مسٹر عبداللہ انور بیگ کو تعارف کی حاجت نہیں، مگر کسی وجہ سے جس کو وہ خود ہی بہتر جانتے ہیں انھوں نے مجھے اپنی کتاب (غالب کی زندگی اور غزلیں) کی تمہید لکھنے کو کہا ہے۔ میں اردو سے ایک ادیب کی طرح نہیں بلکہ فقط ایک جرنلسٹ کی حیثیت سے واقف ہوں۔ اسی قدر جس قدر کہ ایک ایسے شخص سے توقع کی جا سکتی ہے جس نے اپنی زندگی کے کئی سال ہندوستان میں گزارے ہوں۔"

اور اس کے بعد زیادہ تر مصنف کی تعریف کے پل باندھے گئے ہیں اور ترجمے کی خوبی کو سراہا گیا ہے۔ مگر اردو شاعری کے متعلق روم صاحب کی صاف گوئی ان سب پر غالب ہے!۔

اصل کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک میں غالب کی زندگی کے حالات درج ہیں اور دوسرے میں کلام کا کہیں کہیں سے ترجمہ۔ پہلے حصہ میں کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے اور چونکہ مصنف کی انگریزی دانی سے یہاں کوئی واسطہ نہیں۔ اس لئے اس حصے پر کچھ لکھنا بے سود ہے۔ دوسرا حصہ نہ صرف غور طلب اور بحث طلب ہے۔ بلکہ استعداد عامہ کو ایسی دعوت تحریف ہے کہ اس پر جتنا کچھ لکھا جائے کم ہوگا کیونکہ یہی حصہ کتاب کا اہم حصہ ہے۔ اور اسی سے مسٹر عبداللہ انور بیگ ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل۔ایل۔بی ایڈوکیٹ لاہور کے علمی جوہر ایسے کھلتے ہیں اور ادبی کمالات کچھ اس طرح چمک اٹھتے ہیں کہ ہوش و خرد کے طوطے اڑ جاتے ہیں!

غالب اردو زبان کا ایک عظیم الشان اور عالی مقام شاعر ہے۔ اس کا

رتبہ کسی طرح شیکسپیر، گوئٹے، ہوریس اور ورجل سے کم نہیں۔ مگر جہاں ادبائے عالم کی صفِ اوّل میں غالب کا شمار ہے وہاں یہ امر بھی مسلم ہے کہ اغلاق یا ابہام اور مشکل پسندی غالب کی شاعری کے ویسے ہی اہم عنصر ہیں جیسے بعض دیگر شعرائے عالم مثلاً بلیک، بیریڈتھ، کیٹس، شیلے، ملارمے وغیرہ کی شاعری کے اور اس کی شرح آسان نہیں۔ غالب ہی اردو زبان کا ایک ایسا شاعر ہے جس کا کلام شارحین کی عزت افزائی سے دوبالا ہوگیا ہے۔ اکثر غالب کے کلام کی شرح ناممکن سی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی جِدت کاری کثرت سے "مجموعہ نگاری" کی طرف مائل ہوتی ہے جس میں نقالی یا تفصیلی نقاشی کی مینا کاری نہیں ہوتی بلکہ اپنی تصاویر کو مہارت اور اعلے درجہ کی فن کاری کے ذریعے یک جا کر کے یا بذریعہ اشارات ایک بسیط اور بلند اجمالی تصویر کی تخلیق کی جاتی ہے۔ واقعے کے بیان پر اکتفا کی بجائے غالب کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کیفیات اور حسیات کی تصاویر سے واقعے کو پیدا کیا جائے۔ اسی لئے ایسے اشعار کی شرح نہیں کی جا سکتی اور اسی لئے محض لغوی حیثیت پر توجہ مرکوز کرنے سے شعر مہمل نظر آنے لگتا ہے۔

جن باتوں پر غالب کے کلام کے عیوب و محاسن منحصر ہیں ان میں سب سے اہم اس کی فارسی اور مشکل پسندی کے علاوہ محاورات کا جا اور بے جا استعمال ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ترجمہ ناممکن اگر نہیں تو اتنا دشوار ضرور ہے کہ ایک اچھے خاصے ادیب کی دسترس سے باہر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کا مترجم ایک جوئے شیر ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا جوئے شیر جسے نہ صرف اردو اور فارسی زبانوں کے محاورات، صنائع لفظی، رعایات، تراکیب اور بندشوں پر عبور ہو بلکہ جو انگریزی (یا کسی اور) زبان پر بھی اس قدر حاوی ہو کہ متذکرہ خصوصیات کو اس زبان میں ہم وصف طریقوں سے نبھا سکے۔ ورنہ وہی حشر ہوگا جو اردو کی ایک مشہور مثل "بندر کے ہاتھ استرا" کے ساتھ ازلی طور پر منسوب ہے!

اس کے بعد تنقیداً ایک اور مشہور مثل پر ختم کی جا سکتی ہے: ——— "کیا جانے زعفران کا بھاؤ" ——— ! اور اب مترجم صاحب کے ترجموں کی بہار ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ غالب کے کلام کی قسمت کیسے چمکائی گئی ہے!

(۱) آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے

صفحہ

Cognizance may spread its net of hearing to any extent

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

The Phoenix is the object of our Universe of thought

مرحبا! کیا سلیس ترجمہ ہے! مدعا عنقا ہونے کی کیا خوب تفسیر ہے! اس کے بعد جو یہ کہیے کہ "مدعا عنقا" ہونا ایک محاورہ ہے۔ اور عالمِ تقریر کے معنی اندازِ بیان ہیں اس پر تین حرف [illegible] ورنہ ایک ہفت زبان [illegible] انھیں نظر انداز کر سکتا تھا!

(۲) بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا

صفحہ ۸۴

[illegible] even in captivity I have my feet on fire

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

The ring of my chain is a hair that hath seen fire

ہفت زبانی کا یہ ایک زبردست شاہکار ہے کہ "آتش زیرِ پا" بمعنی "پیر کے نیچے آگ" "آتش دیدہ" بمطلب "آگ کو دیکھے ہوئے" اور "حلقہ" برائے "چھلا" استعمال ہوئے ہیں۔

(۳) لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز

صفحہ ۸۵

Still I am learning lessons in the school of the grief of the heart,

لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

[illegible] is only this that (soft) went and (hell) was.

ہفت زبانی کا یہ بھی ایک نادر کرشمہ ہے! "ہنوز" کو لفظ "تاہم" سے خوب بدلا ہے "رفت" و "بود" کا کیا بلیغ ترجمہ فرمایا ہے۔ "اور گیا" اور "تھا" کے ترجمے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ شاید بیچارے غالب نے انھیں بے وجہ استعمال کر دیا ہوگا!

(۴) سادگی و پُرکاری بے خودی و ہشیاری

صفحہ ۸۶

[illegible]

حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

[illegible] (heart's) daring.

فاضل مترجم نے کیا خوب اس شعر کا مطلب سمجھا اور سمجھایا ہے۔ "سادگی" کو جناب "ہنرمندی" کہتے ہیں اور "بے خودی" کو "وجد" ——— "ہشیاری" کو "بیداری" ——— اور "تغافل" کو "خمار آلود کاہلی"! اور سخن دانی یہیں نہیں ختم ہوتی ہے۔ "جرأت آزما پایا" کو جناب "پرکھتے ہوئے پایا گیا" سمجھے ہیں! انتہا کمال یہ ہے کہ خطوط وحدانی میں اپنی طرف سے "عاشق" کے لفظ کا اضافہ کر کے مصرع کو چار چاند لگا دیئے ہیں ——— اس کا تو ذکر ہی فضول ہے کہ پہلے مصرع میں جو حروفِ عطف ہیں ان کا ترجمے میں کہیں پتہ نہیں۔ اس شعر کا جو مطلب اس ترجمے سے نکلتا ہے۔ وہ یہ ہے :-

سادگی۔ ہنرمندی۔ وجد اور بیداری
حسن اپنی خمار آلود کاہلی سے عاشق کے حوصلے کو پرکھتا ہوا پایا گیا۔

فاضل مترجم کی شان میں گستاخی کی کسے جرأت ہو سکتی ہے جو یہ کہے کہ مصرع اولیٰ میں جو متضاد صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان کی موجودگی میں حسن کی تغافل شعاری ایک جرأت آزما کام ہے خارجی کا محرنہیں۔ مگر ہم نے حسن کو اس معاملہ میں بھی یکتا پایا۔ یعنی کہ بہ یک وقت ان سب صفات کا مظاہرہ کرنا حسن کے لئے اپنی جرأت کی آزمائش تھی!

(۵) غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
صفحہ ۸۹
The bud is going to blossom again, today we saw,

خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

Our heart turned into blood — having lost it, found it.

"دل" کا جو فاضل مترجم نے "خون میں تبدیل ہو گیا" کہہ کر خون کیا ہے اسے تو جانے دیجئے مگر یہ "Having lost it, found it" کیا بلا ہے؟ انگریزی زبان کی کونسی ترکیب اور کونسا محاورہ ہے۔ خواہ ترجمہ صحیح بھی مان لیا جائے!

(۶) عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
صفحہ

When am I to present the heat of the essence of thought

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

With the mere [illegible]

صحرا گیا، تمام تر راکھ ہو گیا ہے! یہ ترجمہ فاضل مترجم کی غمازی کرتا ہے۔ ترجمہ کچھ اس طرح کیا گیا ہے :-

عرض کیجئے	Am I to present
جوہر	of the essence
اندیشہ	thought
گرمی	heat
کہاں	where
کچھ خیال	mere thoght
وحشت	wildness (!)
صحرا	the Sahara
جل گیا	has become all ashes (!)

دیکھا آپ نے ترجمہ کرنے کا کیا گُر ہے۔ اور یہ کس قدر آسان کام ہے!

(۷) گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
صفحہ ۹۵
Although I am mad, but why should I be deceived by (my) friend?

آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا
She holds hidden in her sleeve a dagger, openly a lance in her hand.

کس نفاست سے یارِ آستین کو معشوق بنا دیا گیا ہے۔ اور معانی کے لحاظ سے تو انگریزی ترجمے پر غور ہی نہ کیجئے!

(۸) فنا تعلیم درسِ بے خودی ہوں اس زمانے سے
صفحہ ۸
I have been taught mortality by the teachings of selflessness since —

کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
Majnun was writing "L-A" on the wall of the school.

لام۔ الف کا ترجمہ "L - A" کیا تیر بہدف کا حکم رکھتا ہے! اور انگریز تو اس "A - L" کو خوب سمجھ جائیں گے!

(۹) سلطنت دست بدست آئی ہے
صفحہ ۱۲۳
Kingdom has passed from hand to hand

جام مے خاتم جمشید نہیں

The Cup of wine is not the ring of Jamshed

یہ ایک ہفت زبان ہی کا حصہ ہو سکتا ہے کہ "خاتم" کا ترجمہ "انگشتری" یا "چھلا" کرے۔ عربی نوازی کی داد عرض ہے!

(۱۰) بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گر چہ عمر خضر

صفحہ ۱۴۹ In futility passes life, even if it be that of Khizr

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

His Holiness would also say tomorrow, "What did we do?"

اس شعر میں مترجم معراج کمال کو پہنچ گیا ہے "حضرت" آپ کی زبان میں "ہز ہولی نس" ——— یعنی پاپائے روم وغیرہ ——— کو کہتے ہیں! اور "What did we do" کی فصاحت اور بلاغت کو کیا کہئے۔

(۱۱)

صفحہ ۱۷۲ ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر

Faith is checking me while Infidelity is pulling me

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

The Kaaba is behind me, the Ecclesia is before me

اس آگے پیچھے اور کھینچ تان سے کیا لطف پیدا کر دیا ہے!

"چیکنگ می ——— پلنگ می" مار کر انگریزی اور اس فصیح بلیغ اور بامحاورہ ترجمے کی سند ایک اور مشہور انگریزی داں ہندوستانی کے قول سے ملتی ہے۔ یہ بزرگ دکان دار تھے اور ایک انگریز گاہک کو آپ یہ کہنا چاہتے تھے کہ "لینا ہو تو لو۔ ورنہ نہ لو" چنانچہ ارشاد گرامی ہوا کہ "ٹیک ٹیک ـ نو ٹیک۔ نو ٹیک" یعنی ——— "Take, take — no take, no take!"

سارے ترجمے اسی دل فریب انداز میں اور ان ہی خوبیوں سے مزین ہیں! یہ دو چار مثالیں مشتے نمونہ از خروارے کا حکم رکھتی ہیں۔

اردو ادب پر اس سے بڑھ کر ظلم آج تک نہ ہوا تھا۔ آج تک کسی کو جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ خواہ مخواہ تصنیف اور تالیف کے گھمنڈ میں آکر اردو شاعری کے شہ پاروں کا یوں ستیاناس کرے جیسا اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ فاضل مترجم کو معلوم ہونا چاہئے کہ اردو لغت ابھی صفحۂ وجود سے ناپید نہیں ہوئی ہے۔ اور بازار میں غالب کے کلام پر عمدہ سے عمدہ اور ارزاں شرحیں موجود ہیں جن سے استفادہ کر کے ایک نااہل بھی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔ فاضل مترجم کا فرض تھا کہ ترجمے سے پہلے اردو لغت سے کسی قدر آشنائی پیدا کر لیتا اور اگر سب نہیں تو کم از کم ایک شرح تو ضرور دیکھ لیتا۔

اگر فاضل مترجم یہ نہ کر سکتا تھا یا وہ اپنے آپ کو لغت اور شرح سے بالاتر یا بے نیاز سمجھتا ہے تو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ بے وجہ اردو ادب کو بدنام کرے۔ خواہ وہ کتنا ہی متبحر عالم ہو اور تصنیف و تالیف کے جواز میں اس کے پاس کتنی ہی ڈگریاں ہوں۔ اور وہ غالب کے علاوہ اردو کے دوسرے شعرا کو بھی انگریزی زبان میں "استاد امام دین" بنانے پر تلا بیٹھا ہو۔

ناشران کو بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ جس متاع دل بہا کی بدولت وہ روٹی کھاتے ہیں اس کی خدمت ان کا فرض ہے اور اس سے دشمنی کر کے یا اس کو شدید نقصان پہنچا کر وہ اپنی کمائی کسی طرح حلال نہیں کر سکتے۔

اخیر میں اردو کے ادبی حلقوں بالخصوص انجمن ترقی اردو دہلی سے استدعا ہے کہ وہ جلد از جلد اردو ادب کی اس تکلیف دہ حق تلفی کے تدارک کا سامان کریں۔ مہمل ترجموں کا رواج پڑ گیا تو کوئی تعجب نہیں کہ دوسرے ممالک میں جو اردو کی رہی سہی قدر ہے۔ اور بدیسیوں کو اردو سے جو تھوڑی بہت دلچسپی ہے۔ وہ سب جاتی رہے گی۔ اردو ادیبوں کو ان کا جائز مرتبہ دلانا تو رہا الگ۔

جمیل احمد ناخدا

شعر

[illegible]

داغ

Printed & Published by Salah-ud-din Ahmad at the Mercantile Press, Chamberlain Road, Lahore. The Title & pictures printed at the Allied Press, The Mall, Lahore. Issued from the office of the Adabi Dunya Balkishen building, The Mall, Lahore

THE ADABI-DUNYA

ادبی دنیا

FEBRUARY 1942

Price As. 8

INDIA'S PREMIER MAGAZINE

[illegible]

ایڈیٹر صلاح الدین احمد

فلم سازی کی تاریخ میں ایک سنہری ورق کا اضافہ!

شالی مار پکچرس کا نادر شاہکار

ایک رات

مرد اسے بھلا نہیں سکیں گے

اور

عورتیں اسے بھولنے کی جرأت نہیں کر سکیں گی

گیت پنڈت آنند، حسرت، وفا
موسیقی ایس۔ کے۔ پال

ڈائرکشن
ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد

مکالمے صلاح الدین احمد
ایڈیٹر "ادبی دنیا"

اداکاران: پرتھوی راج۔ نینا۔ گلاب۔ کے۔ این سنگھ۔ فیروزہ۔ راج کماری۔ شکلا۔ ایچ پرکاش۔ یوسف سلیمان۔ نذیر بیدی۔ بی بی۔ اور ممتاز وغیرہ۔

شالی مار پکچرس پاسٹا روڈ دادر بمبئی

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ فروری ۱۹۴۲ء

جلد ۱۹ — نمبر ۱۱

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک و وی پی پانچ روپے، ممالک غیر سے دس شلنگ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

باہتمام صلاح الدین احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپا دفتر ادبی دنیا ... لاہور سے شائع ہوا

ایک اور اشارہ

کتب خانہ ادبی دنیا نے وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اچھی کتابوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے چنی ہوئی کتابوں کی تازہ بتازہ فہرستیں ادبی دنیا میں شائع کی جائیں گی تاکہ ناظرین ادبی دنیا کو اپنے مقبول رسالے ہی کے ذریعے سے ہر قسم کی اچھی کتابیں بہ آسانی مہیا ہو سکیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی فہرست شائع ہو کر مقبول خاطر ہو چکی ہے۔ اس دفعہ کتب خانہ ان فہرستوں کی دوسری قسط آپ کے پیش نظر کر رہا ہے موجودہ فہرست میں التزاماً وہی کتابیں درج کی گئی ہیں جو خواتین اور بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید ہو سکتی ہیں۔ حسب معمول اس انتخاب کی ضمانت بھی ادارہ ادبی دنیا کا نام ہے

منیجر کتب خانہ لاہور

نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت	نام کتاب و مصنف	قیمت
خواتین کے لئے		آئینہ جمال نظمیں	۱۲ر	تاریخ ہند کی کہانیاں	
		صنعت اور خانہ داری		پہلا حصہ ۲ر دوسرا حصہ	۵ر
ناول اور افسانے		گلدستہ کروشیا فاطمہ بیگم انور علی	ع		
عورتوں کے افسانے۔ کوثر چاندپوری	ہر	عصمتی کروشیا	ہر	**تفریح اور معلومات**	
تحفے اور دیگر افسانے۔ حجاب امتیاز علی	ہر	بیوی کی تعلیم۔ خواجہ حسن نظامی	ہر	تعلیمی کھیل	۳ر
خانم مرزا عظیم بیگ چغتائی	للعہ	اولاد کی شادی	عسہ	سمندر کا عجائب خانہ	۸ر
شریر بیوی ،،	ہر	مشرقی اور مغربی کھانے	ع	ایورسٹ کی کہانی	عہر
شام زندگی راشد الخیری	عہر	مذاقیہ کھانے	۶ر	**نظمیں**	
شب زندگی دو حصے ،،	عہر	**متفرق**			
ماہ عجم ،،	۹ر	محبت نامے۔ مترجمہ پروفیسر رام سروپ کوشل	۷ر	بچوں کی نظمیں	۴ر
شاہین و دراج ،،	۸ر	دب زریں۔ حجاب امتیاز علی	۸ر	بچوں کے اسمٰعیل	
ناشوں کا شہر مسز عبدالقادر	ہہر	نغمات موت ،،	۶ر	مرتبہ سعید انصاری پرنسپل مدرسہ جامعہ	۱۵ر
نرملا۔ منشی پریم چند	ہر	**بچوں کے لئے**		بچوں کی رباعیاں	۱ر
یوسف نجمہ۔ عبدالحلیم شرر	ہر	**قصے کہانیاں**		**ڈرامے**	
بنات النعش۔ مولوی نذیر احمد مرحوم	ہہر	ولائتی نتھی راشد الخیری	۶ر	انار کلی امتیاز علی تاج	سہر
یاسمین مرزا محمد سعید	ہر	دادا لال بجھکڑ ،،	۸ر	ریڈیو ڈرامے فضل حق قریشی	عہر
نظمیں		بچوں کا انصاف (ڈراما)	۳ر	منتوش ۸ر مینا حکیم احمد شجاع	۸ر
آئینہ حرم۔ محترمہ ز۔ خ۔ ش کی نظمیں	۶ر	مرغی اچمیر چلی۔ محترمہ رقیہ ریحانہ	۲ر	ہملٹ مترجمہ عنایت اللہ دہلوی ۸ر، فادسٹ اگسٹے	عہ
صبح خاموش نظمیں	۶ر	نبیوں کے قصے	۵ر	چند ڈرامے نور الٰہی محمد عمر ۸ر، چند ڈرامے نور الٰہی محمد عمر	۸ر

منیجر کتب خانہ ادبی دنیا دی مال۔ لاہور


چلو چائے پئیں
خاندان کے پینے کی چیز
ہندوستانی چائے
ایک گھریلو بیوی جب دوسرے گھریلو بیوی سے بیٹھ کر بات چیت کرتی ہے تو کہتی کہ چلو چائے پئیں۔ گھر کے چھوٹے بڑے کاموں کے بعد تازہ دم ہونے کیلئے چائے ایک ضروری شئے ہے۔ آپکو یقین کرنا چاہئے کہ اس طرح دو عورتوں کا مل کر چائے پینا آج کل ہندوستانی گھروں میں عام رواج ہو گیا ہے۔ آپ بھی ہمیشہ اپنے دوستوں سے چائے پر ملاقات کیجئے۔
اس اشتہار کو کاٹ کے اپنا نام پتہ اور پیشہ لکھ کر کمشنر فور انڈیا۔ انڈین ٹی مارکیٹ ایکسپینشن بورڈ۔ پی۔ او بکس نمبر ۲۱۷۲ کلکتہ کے پاس بھیج دیں۔ تو آپ کو بغیر کسی خرچ کے ایک با تصویر انگریزی کتاب جسکا نام "جب عورتیں ہاں کہتی ہیں" روانہ کیجائیگی اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ خاندان کے پینے کے لئے چائے میں کتنی خوبیاں ہیں۔
IK 164
انڈین ٹی۔ مارکیٹ۔ ایکسپینشن بورڈ نے شائع کیا۔

بزم ادب

کاغذ کی قلت نہیں، نایابی کا اندیشہ ناک احساس یوں تو روزناموں کو بھی ہے اور ماہناموں کو بھی، لیکن ظاہر ہے کہ ماہنامے علم و ادب کے تعمیری پہلو کے نمائندے ہیں اور تعمیری عناصر زندگی کے پُر امن دور سے تعلق رکھتے ہیں، جنگ کا زمانہ اخبارات کو منزوتیا زندہ رکھنے پر مجبور ہے، رسائل زندگی کے لئے اگر بذاتِ خود تگ و دو کرنا چاہیں تو کر لیں، چنانچہ اس دَور میں پھسے ہوئے سانس اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ادبی دنیا آج کسی قدر دیر سے آپ کے پیشِ نظر ہے، اس بے قاعدگی کے سلسلے میں کسی بھی امکانی کوشش کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اور توقع ہے کہ آپ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں گے۔

اس دفعہ سالنامہ تو ایک دُور کی بات محسوس ہو رہا ہے لیکن سالنامے کے ملتے جلتے ہوئے مضامین زیرِ نظر شمارے ہی سے ترجمانی کے لئے بے تاب ہیں، اور اس لحاظ سے حجم کی کمی معیار کی بلندی سے یقیناً پوری کی جا سکتی ہے ۔۔۔ عصمت چغتائی کے افسانے "تل" کی شرارت نہ صرف الفاظ بلکہ بین السطور میں بھی نمایاں رہنے، اگرچہ تل ایک لفظی نقطے کی حیثیت سے موجود ہے، لیکن اس ننھی سی جان نے پھیل کر تمام کہانی میں جو گز بھر زبان کی صورت اختیار کی ہے وہ توجہ کے لائق ہے، نفسی اُلجھنوں کے علاوہ مکالمے کی بے ساختگی اور حقیقت پسندی بعض جگہ کردار نگاری کا کام نہایت خوبی سے کرتی ہے، ۔۔۔ یہ کہانی تو اپنی فنی خوبیوں کے علاوہ نوعی خصوصیت کی بنا پر بھی دلکش ہو سکتی ہے، لیکن "گندے انڈے" میں اختر اورینوی نے جس تلخ اور حقیقت پرستانہ ماحول کی ترجمانی کی ہے وہ اپنی جگہ آپ قائم ہے، اس کہانی میں آغاز کے بعد قاری عنوان کو بھول جاتا ہے لیکن انجام تک پہنچ کر جس چابکدستی سے فن کار نے بکھرے ہوئے خطوط کو اکٹھا کر کے ایک نقطے کی صورت دی ہے۔ اس سے کہانی کی مجموعی ترتیب اور ساخت میں ایک ایسی بلندی پیدا ہو گئی ہے جو اردو افسانوں میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

اوپر کی دونوں کہانیوں میں نفسی اور واقعاتی مشاہدے کا امتزاج ہے، لیکن سیّد علی عباس حسینی کی کہانی "میلا گھومنی" بظاہر صرف واقعاتی مشاہدے کا اظہار کرتی ہے، حقیقت میں اس افسانے کے واقعات اور کردار جن نفسیاتی لہروں کے حامل ہیں، وہ جدید طرز نگارش کے بے باک رجحان کی ترجمان ہیں، لیکن افسانہ نگار نے اپنی فن کاری سے اُن چبھنے والی باتوں کو جس انداز سے میٹھے نشتر کی حیثیت دے دی ہے۔ وہ بھی لائق ستائش ہے۔

مضامین میں مختار صدیقی کا مختصر لیکن موضوع کے لحاظ سے مکمل مقالہ لاہور کی مشہور ادبی انجمن حلقۂ اربابِ ذوق کے ایک اجلاس میں یادِ فانی کے طور پر پڑھا گیا تھا۔ "خالی جیبیں" امجد حسین کی انشائے لطیف ہے جس کے اردو لباس میں یہ معلوم کرنا ذرا دشوار ہے کہ کہاں ہیزلٹ کی بات ختم ہوتی ہے۔ اور امجد حسین کی بات شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیں تو بات کی دلچسپی سے غرض ہے بولنے والے سے نہیں۔

(۲)

حصۂ نظم مختصر تو ہے لیکن زندگی اور انسانی ذہانت کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہوئے کچھ اتنا مختصر بھی نہیں، کہیں نذیر مرغوب ایک تخیّلی فضا میں کھویا ہوا ہے، کہیں قیوم نظر موجودہ جنگی دور سے تحریک لیتے ہوئے تاریخ عالم کا احاطہ کر رہا ہے، کہیں محمد راشد فضلِ من دنو کے مسئلے میں ایک نئی نفسیاتی لہر کو ایک نئی ادبی صورت میں ظاہر کر رہا ہے، کہیں اختر الایمان اسی بات کو زندگی کی ایک بنیادی حقیقت کے آئینے میں دکھا رہا ہے، کہیں میراجی اپنی افتاد کو لئے ہوئے موجود ہے۔ اور کہیں وشوامتر عادل ایک ذہین نوجوان کے نیرنگِ فطرت اور شکستِ تصوّر کو نہایت لطیف کنایوں سے ظاہر کر رہا ہے، وشوامتر عادل کی نظم "خلا کے" میں پس منظر محض ایک دلکشی یا زینت کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنی بلاغت کے باعث نظم کا لازمی فن کارانہ جزو ہے، "شبخون" میں چھوٹے بڑے مصرعے شاید طیاروں کی اڑان کا عکس ہیں، "موت" کا ابہام شاید اس بنیادی حقیقت کی بے پایاں گہرائی کا مظہر ہے، اور "افتاد" میں ۔۔۔۔ لیکن اب آپ ان افسانوں کو پڑھئے، ان مضامین کو دیکھئے اور اِن نظموں پر غور کرتے جائیے۔

میراجی

خاکے

(۱)

فسردہ شام کی تنہائی پھیلتی ہی گئی
بکھر بکھر کے بڑھاتی ہوئی سکوں کے ہاتھ۔
چمکتے کانچ کا گلدان تھا ——— کنارے پہ
سفید پھول کی گردن جھکی — جھکی ہی رہی
سکوت ریشمی پردوں کی نرم لہروں کو
تھپک تھپک کے سُلاتا رہا، سُلاتا رہا،
کھڑی ہوئی وہ دریچے کے پاس دیکھتی تھی
ردائے آبِ افق ——— تیرتی ابابیلیں،
میں اُس کے پاس کھڑا اپنے دل میں سوچتا تھا
مرے قریب مگر پھر بھی کتنی دور ہے تو،
کمر کا خط مرے بازو کو اک بُلاوا ہے،
جوان، گرم، تنومند ہاتھ بڑھ کے اگر
خمِ کمر سے جو چھُونے لگا تو کیا ہوگا؟
کھنچے رہے مگر احساس کی ستار کے تار
اور ان کی گود میں خاموش، درد کا مارا،
اُداس گیت محبت کا تھرتھراتا رہا۔

(۲)

فسردہ شام کی تنہائی پھیلتی ہی گئی
بکھر بکھر کے بڑھاتی ہوئی سکوں کے ہاتھ۔
میں اس کے پاس کھڑا تھا، مگر وہ تنہا تھی،
پھر انتظار تھا کس کا اگر وہ تنہا تھی ؟
اُفق پہ ابر کے ٹکڑے تھے سرد آئینے
انہی پہ اُس کی نظر تلخ انجماد بنی
جھلک رہا تھا بھیانک مہیب، تیرہ و تار
جہاں کے مذہب و رسم و رواج کا اک بھوت
جو بار بار لپکتا تھا، دانت پیستا تھا۔
وہ ڈر گئی، وہ تو عورت تھی، اُس نے کچھ نہ کہا،
پرے، کھجور کے اُوپر، خموش گول سا چاند
اُبھر رہا تھا، ابھرتا رہا، اُبھرتا رہا۔

(۳)

مری تڑپتی ہوئی رُوح پھڑپھڑاتی ہے،
نحیف، زیست سے عاری ہے، پر بھی ٹوٹے ہوئے
مگر یہ رینگتے لمحوں کی چیونٹیاں چپ چاپ
لپٹ لپٹ کے اسے بار بار چوستی ہیں،

(۴)

برہنہ جسم ہے اور اجنبی فضا، بستر —
خزاں میں فرشِ گلستاں کا ایک آئینہ،
"ذرا نظر تو اٹھاؤ" ——— نگاہیں ملتی ہیں،
"بکھر بھی دو حسیں بال" ——— لو بکھرتے ہیں،
"لپٹنے بھی دو مجھے" ——— میں لپٹتا جاتا ہوں،
کوئی بھی روک نہیں ہے، کوئی بھی روک نہیں،
فسردہ رات کی تنہائی اب سمٹتی ہے،
سمٹ سمٹ کے سکڑتی ہوئی، سکڑتی ہوئی
یہ مجھ سے کہتی ہوئی ——— کل یہاں نہ آئیں گے

وشوامتر عادل

فانی کی غزل گوئی

"برکفِ جامِ جنون و برکفِ سندانِ عقل
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن"

موجودہ غزل گوشعرا میں سب سے زیادہ خامہ فرسائی اصغر اور جگر پر علی الترتیب ہوئی ہے اور فانی کی حینِ حیات میں ان پر چند معاندانہ تنقیدوں سے قطع نظر کچھ وسیع جائزے اور وہ بھی نقائص کو اجاگر کرنے کے روپ میں حضرت عندلیب شادانی نے لکھے ہیں۔ ورنہ عام طور پر لکھنے والوں کی توجہ زیادہ تر اصغر اور ان سے کمتر جگر پر رہی ——— ان مقالات میں صرف ضمنی طور پر ہی فانی و حسرت کے نام اِن کی مختصر خصوصیات کے ساتھ آتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود فانی کو موجودہ غزل کا صاحب طرز شاعر سمجھا جاتا رہا ہے۔

وہ اسلام نگر ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ بدایوں، بریلی اور علی گڈھ میں تعلیم پائی۔ مگر زندگی لکھنؤ، آگرہ، اٹاوہ اور حیدر آباد میں بسر کی۔ تمام عمر پریشانیوں میں کٹی۔ اس لئے طبعی تشائم پسندی نے خارجی واقعات سے اور بھی جلا پائی۔ نتیجہ یہ کہ تخلص کی رعایت سے مضامین کی بندش اور ترکیب کی تاثیر بھی ناامیدی، یاس، حزن و ملال اور فنا پر ہی مرکوز رہی۔ چونکہ کہتے ہیں دل کی اُبھری چوٹ خون دینے لگتی تھی لہٰذا کلام میں جن حلقہ بندیوں کی وضاحت ہے وہ بھی از حد جاں خراش ہیں۔ ہمارے ہاں بہتر تنقید کی شخصیت اعلیٰ کا کلام جس میں کبھی تو کسی لڑکی سے ناکام محبت ڈھونڈی جاتی ہے اور کبھی میلانِ ہم جنسی کے آثار مہیا کئے جاتے ہیں، اپنی بے پایاں المناکی کی بدولت فرد نظر آتا ہے۔ اُن کی بد دماغ ذہانت، اور دنیا سے بیزاری نعوی تشائم کے ساتھ شاید تلخ خارجی واقعات کے پرتو بھی اشعار میں ڈھال لیتی ہے تحلیل نفسی کے طور پر ممکن ہے ایسے بہت سے پہلو نکل آئیں جو اُن کی دَور کے ماضی سے متعلق زندگی کو ہمارے اور قریب لے آئیں۔ مثلاً کبھی جگہ تو یہی شدید جذباتی انفشار (OBSESSION) ہے جو گوئٹے کی نوجوان ورتھر کی داستانِ غم میں کسی کسی جگہ پیدا ہے۔ عام احساسِ کمتری اور ذہنی اختلال کے اشارے تو بہت مل سکیں گے۔ گر مصیبت یہ ہے کہ اس طرح ایک تو یہ مطالعہ بڑا کٹھن کام ہے اور دوسرے ہمارے سخن فہم اس عضویاتی کانٹ چھانٹ کو کب خاطر میں لائیں گے۔ ابھی تو ایک من چلے نے میلانِ ہم جنسی کے ہی اشارے جمع کئے تھے کہ دھوم مچ گئی اور یار لوگوں نے "ماحول کا نتیجہ" کہہ کر ایک ایسی قول فیصل قسم کی توجیہ پیش کی کہ کیا کہنے ——— تو میر کی المناکی نے ہر دو کے لئے اپنی ازلی دل کشی قائم رکھی ہے۔ چنانچہ میر کی طرح جب فانی کی تشائم پسندی نے بھی خارجی واقعات کو ہم آواز دیکھا تو لازم ہوا کہ ان کی شاعری واردِ اتی رنگ اختیار کر جائے۔ چنانچہ اِس حزن و ملال کے واقعات مختلف بہروپ یا اُن کے لازمی نتائج نے ہی ان کے وجدان کو اپنا بے دام آلۂ کار بنائے رکھا۔

جہاں تک اِن مختلف اقسام کے بہروپ کا تعلق ہے یہ مختصراً غم کی اہمیت، انتہائی یاس پسندی اور بلاکشی کہے جا سکتے ہیں۔ باقی رہے اِس حزن و ملال کے لازمی نتائج تو یہ اتنے وقیع ہیں کہ ان کی شاعری کی کل کائنات یہی ٹھہرتے ہیں۔ عام طور پر یہ موت کی آرزو، زندگی کو الزام اور نہ آنے والی موت کو تہمت گرداننا، یونانی حکما کے پہلے دور کی مثل جب زندگی ناقابلِ برداشت ہو جائے تو خودکشی کو مذہبًا حلال اور اخلاقًا موقعہ کی بات سمجھنا ——— اور پھر موت، سکراتِ موت اور موت کے بعد کے حالات کے تبصروں پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ لازمی طور پر کفن، میت، گور، نزع اور ہچکیوں سے متعلق مضامین خواہ مخواہ آ ہی جاتے ہیں۔

یہ تو ہوئی ان کے شعری کارناموں کی مفہوم کے لحاظ سے کانٹ چھانٹ ——— اب عمومی حیثیت کو لیجئے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فانی کی

پاس پسند طبیعت کے لئے لازماً میر کی المیہ شاعری کافی دل کشی رکھتی تھی۔ وہ تیکھا انداز بیان، وہ پراسرار غم کی لٹ چھنکاتی بدلی، وہ کومل بحریں اور الوکھی بندش کے نشتر ان کی طبیعت میں کافی گہرا سوا گت پاتے تھے۔ لیکن موجودہ غزل کی تجدید کے ساتھ ہی غالب کی بے مثال عظمت کا آفتاب بھی طلوع ہو چکا تھا۔ چنانچہ یہ تاثر بھی قبول کر لیا گیا۔ اور میر کا قنوطا اور غالب کا فکر و خیال ایک اور روپ میں فانی کی غزل میں اجاگر ہوتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس روپ میں دونوں رنگوں کے پردے کہیں تو اتنے ہلکے ہیں کہ اصل چھپنے والے سامنے آجاتے ہیں اور ہم وثوق کے ساتھ بزعم خویش کھری کھری یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہاں فانی نے غالب کی شدید تقلید کی ہے اور یہاں سختی سے میر کی ـــــ اور جہاں کہیں یہی پردے ذرا بھاری ہیں اور انفرادی بانعان انہیں اور بھی دبیز کر دیتی ہے تو ہمیں فانی یاسیات کے امام کی حیثیت سے نظر آنے لگتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر کی گھلاوٹ اور سادگی سے پیدا کی ہوئی تاثیر یہاں آ کر کہیں کہیں خاص غالب کے رنگ میں رچ گئی اور کہیں کہیں غالب اور میر کے درمیان درمیان رہی جسے آپ فانی کے انفرادی رنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پہلی عرضداشت کی مثالیں ملاحظہ ہوں دوسری کی مثالیں وضاحت طلب نہیں ـــــ

دل وقف تپش ہے ملئے مگر وجہ تپشِ دل کوئی نہیں
بسمل ہوں، مگر کیوں بسمل ہوں، فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

دل حاصل حیات ہے اور دل کا حاصل — وہ بیدلی کہ جان تمنا کہیں جسے
بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی — یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

حاصل علم بشر جہل کا عرفاں ہونا — عمر بھر عقل سے سیکھا کئے ناداں ہونا
چار تکبیر عناصر پہ ہے زنداں موقوف — وحشت عشق و نا سلسلہ جنباں ہونا!

مگر اس محمل کی لیلیٰ یعنی ان کا تشائم غالب کی نسبت میر سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ غالب کا حزن آزادہ روہے۔ اس بیزاری میں مخصوص فعل ہلاکت آفرینی بھی ہے اور گہرائی بھی اسی لئے طنز اس کا مخصوص حربہ ہے مگر میر و فانی کے ہاں بقول ملہر القادری ایک قسم کی انفعالیت کا حامل ہے جیسے غم اٹھانا تو قسمت میں بدا ہی ہو مگر یہ نشتر دل پہ لینے والا ایک طرح سے نادم ہو اپنی کمزور مدافعت پر یا زندگی کی ضرورت سے زیادہ فاعلانہ قوت پر۔

تاہم ان کے رنگ سخن کے متعلق کوئی ایسی بحث ارتقا کے تعین کے ساتھ نہیں کی جا سکتی جس سے معلوم ہو سکے کہ کب تک غالب کی دست نگری اور اسی قماش کی اپنی کوششیں جاری رہیں۔ اور رفتہ رفتہ کب تک رنگ سخن سمجھتے سمجھتے ایک خاص انداز کا حامل بن گیا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ پہلے پہل ان کے کلام میں ایک طرف تو غالب کی سی فارسیت، اضافتوں کی بھرمار اور بوجھل تراکیب کا غلبہ تھا۔ تو دوسری جانب محاورے کی روز مرہ رعایت بھی ہاتھ باندھے نظر آتی تھی اور لطف زبان کا بھی کافی خیال رکھا جاتا۔ نئی تراکیب کی تراش کے معاملے میں غزل گوؤں کو اتنی ہفتخوانی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ کہ غالب کے بعد بھی الا ماشاء اللہ یہ ایسی اوپر سے لائی ہوئی بلاؤں کو اپنا گھر بنائیں۔

خصوصاً فانی تو اس معاملے میں کافی محتاط رہے۔ کیونکہ ان کے صنائع عام طور پر پرانی ڈگر کے تھے ان میں جدت طرازی اور انفرادی تاثیر علیحدہ امر ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ فانی کی غزل گوئی کے متعلق مجموعی بحث تھی۔ اب اگر غزلوں کا خاص مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عام تاثیر یا حزن و ملال کے علاوہ ان کے کلام میں دو باتیں خاص حیثیت رکھتی تھیں۔ ایک تو فنا اور موت سے متعلقہ مضامین اور دوسرے اس بیزاری کا لازمی قرار یعنی متصوفانہ باتیں یا زندگی کے متعلق نقطہ ہائے نظر ـــــ جہاں تک فنا اور موت کی باتوں کا تعلق ہے۔ فانی نے موت کی آرزو۔ موت کی آمد نزع کی کیفیت اور حتیٰ کہ موت کے بعد کی خود ایجاد کیفیات کو بھی نہیں چھوڑا یہی ان کا محبوب موضوع تھا جو زندگی کے بے پناہ مصائب اور غم کی غیظ ڈھند سے کچھ فراہیش کرتا تھا۔ موت کو انہوں نے اصل زندگی سمجھا۔ اور یہ زندگی جو دیوانے کا خواب تھی اس کی صحیح تعبیر موت ہی انہوں نے دیکھی جانچی اور پرکھی۔ یہی احساس ان کے لئے طمانیت کا باعث تھا اگر ذہن اذیت کوشوں کے لئے طمانیت شرمندہ معنی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار مثالیں ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ نزع سے وہ اکتساب کیف کے متمنی تھے۔ سکرات مرگ کی ضرب المثل تکلیف اور جان کنی کا مشہور عذاب انہیں عین راحت دکھائی دیتا تھا کیونکہ اس تھوڑی سی اذیت کے بعد زندگی کا پرانا خوفناک گھاؤ مندمل ہوتا معلوم ہوتا تھا۔ اسی لئے جان دے چکنے کے بعد یک گونہ طمانیت کا احساس پیدا ہے۔ یہ موت "خواہ جینا حرام ہو جائے" کی شق میں ہی کیوں نہ آئے تاہم سکون کی حامل ضرور تھی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موت کے بعد کا مفروضہ چین کبھی کبھی ان کے تصورات کو اتنا گدگدا سکتا تھا کہ ان کے ذہن میں وہ تمام آسودہ خیالات جاگ اٹھتے تھے جو ایک کشمکش سے پر زندگی کے بعد آرام کی گھڑیوں کی سنگت کر سکتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھی اس خیال کے خوفناک عفریت بھی بیدار ہو جاتے

تھے کہ اگر مر کے بھی چین نہ پایا تو کیا ہوگا۔ اس چین نہ پا سکنے کی توجیہہ خواہ محبوب کے تربت پر آ نکلنے کی پرانی بات ہو یا قیدِ ہستی کے بعد قیدِ تربت کی غیر محسوس داب ـــــ اور اس موت کے بعد کی زندگی میں چین نصیب نہ ہونے کی وجہ شعوری خوف بھی تھا۔ سطحی پہلو تو یہ ہے کہ اس زندگی میں سکھ نہ دیکھا تو وہ زندگی کونسے سکون کی حامل ہوگی اور تحلیل نفسی کی رُو سے یہ توجیہہ ہو سکتی ہے کہ حیات بعد الممات کا اعتقاد ماں کی کوکھ کی زندگی سے اِس دنیا میں آنے کے ایک عکس پر مبنی ہے۔ پیدائش انسان کے لئے "خوف" کا پہلا تجربہ ہے۔ اسی لئے یہ عمل خوف کے احساس کا نمونہ اور ماخذ ہے اسی خوف کے تاثر نے زندگی ہستئی زندان بنے رہائی کو ایک اور زندان کی قید کا احساس دلایا۔ ایک محبس میں پہلے پہل خوف کا شعوری ماخذ تھا پھر اس محبس کی بے پناہ مشقتیں اور لرزہ دال مصیبتیں اس خوف کو اور جلا دیتی رہیں۔ حتیٰ کہ اس قید خانے سے چھٹکارا موت میں نظر آیا۔ وقتی طور پر تسکین ہوئی کہ "درد کی دوا پہنچی"، مگر وہ زندگی کے ساتھ کا زائیدہ خوف حیات بعد الممات کو بھی اسی گہری بدلی کے سائے میں دیکھ سکا جس نے یہاں کی زندگی کو بھی تاریک کیا تھا۔ یہ حصہ اس انداز نظر سے بڑا جاں خراش ہے۔ اور یہاں "خوف" اپنی تمام تر شدت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک مثال سنیئے:۔

چھوٹے جب قیدِ ہستی سے تو آئے کنجِ تربت میں
رہا ہوتے ہیں ہم یعنی بدل دیتے ہیں زنداں کو

مگر کبھی یہی چیز عارفانہ گداز میں ڈوب کر بیک وقت کیف اور شدید المناکی کی مظہر بھی بن نکلتی تھی ؎

جینے کی حدیں ملتی ہیں کہیں؟ اے اہلِ ہوس آگے بڑھ
منزل کا نشاں ہے ہر منزل آرام کی منزل کوئی نہیں!

زندگی کے متعلق ان کے نقطہ ہائے نظر وضاحت طلب نہیں وہی خواب ہے دیوانے کا، معمہ، دکھ بھری کہانی۔ بے حوصلگی "تمام بات پہیلی ایسی بس وہی بوجھے جس کو بجھائے۔ ہاں اس سلسلے میں جبر و اختیار کے مسئلے کو جو انہوں نے چھیڑا ہے تو اس پر کچھ عرض کرنا لازم آتا ہے۔ تحلیل نفسی کے ماہر اسے مجلسی احساس کمتری کہیں گے۔ جو ان پر شروع سے لے کر آخر تک مسلّط ہے۔ مگر احساس کمتری کی یہ انفعالیت جب جبر و قدر پر کچھ کہتی سنتی ہے تو اس کا روئے سخن اپنی بے مائگی یا سوختہ بختی بمقابلہ قدرت اور زندگی کے بے پناہ فاعلانہ اقتدار کی طرف ہوتا ہے۔ "جبر" کا مترادف مفہوم ہمارے ذہنوں میں "ظلم" ہے۔ مگر اصطلاحاً یہ قدرت کے فاعلانہ غلبہ کے نزدیک کوئی چیز کہی جا سکتی ہے۔ فانی زندگی کو تو تہمت اور الزام سمجھتے ہی تھے۔ انہوں نے قدرت کے جبر کی تو توجیہہ نہ کی مگر اپنے اختیار کو بھی اسی دھارے میں بہا دیا۔ اُٹھنا بیٹھنا تو مشیّت ایزدی کے بغیر نہیں ہو سکتا مگر اُٹھتے بیٹھتے ہم اپنے اختیار سے ہیں۔ اسی لئے زندگی کی اُلجھنوں سے تنگ آ کر اور اس جبر و قدر کے گھیرے سے اکتا کر انہوں نے بھی تصوّف کی آڑ لی۔ اور صرف یہی حصہ کلام دوسری یاسیّہ شاعری سے متمیّز ہے۔ یہاں موت اور اس کے تعلقات نہیں۔ زندگی کے بے پناہ ملال نہیں، بلکہ خالص "نظر" کی باتیں ہیں۔ اور یہی دوسری راہِ فرار تھی جو ان کو اپنی عام افتادِ طبع سے مل سکتی تھی۔

مگر یہ "فرار" دوسرے غزل گو شعرا کے ہاں بھی عام ہے۔ عمر کی ڈھلتی چھاؤں کے ساتھ ہمارے غزل گو ایک ایسی ذہنی افتاد کی آڑ لینا چاہتے ہیں جو نو عمری کی ہیجانی زندگی کی بہ نسبت قدرے آسودگی کی حامل ہو۔ اور وہ پختہ کار باتوں کی طرف مائل ہوتے ہوتے اسی الوہیت میں کم از کم گفتار کی حد تک گھل مل جانا چاہتے ہیں جو پرانے دنوں میں سنیاس آشرم سے متعلق تھی۔ یہ افتاد عشق و محبت سے ایک قسم کی سیری کی حامل بعض حالتوں میں اس لئے نہیں کہی جا سکتی کہ اس میں سیری کا مخصوص کھــــرا پن نہیں ہوتا بلکہ یہ وہی مجاز سے حقیقت یا کم سے کم آدرش کے زینے تک کی چڑھائی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ذہنی قویٰ اس سیڑھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپ چکے ہوتے ہیں۔ اسی لئے استاد سے استاد غزل گو کا "دورِ آخر" اس کے درمیانی دور سے عام قاری کے لئے کہیں پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں ایک شاعرِ منفرد نظر آتا ہے اور وہ اصغر ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اصغر کے لئے آدرش آخری زینہ نہیں بلکہ پہلی سیڑھی ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں عام شعرا کے آخری دور والا پھیکا پن یا ذہنی تھکن مفقود ہے۔ اسی لئے اصغر کے ہاں کی الوہیت، متصوفانہ انداز اور آدرش کی پوجا کے مضامین آسودگی کے ضامن نہیں۔ بلکہ تڑپ کی لہر رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے جو ان کا "پرکاشِ پریم" اور "انوار آفرینی عارفانہ گداز کی حامل ہے، جب کہ باقی کے شعرا مثلاً مانی جائسی، بیخود اور سائل، حسرت اور جگر تک تصوّف سے آسودگی چاہتے ہیں۔ خصوصاً فانی تو اس سلسلے میں کافی بصیرت افروز ہیں

ـــــ خود ہی خیال فرمائیے کہ ایک اذیت پرست ذہن جس میں بیٹھے ہی بیٹھے زندگی کے بے پناہ مصائب اور موت کے آلودہ تصورات کے متعلق خیالات کا ایک طوفان جاگ اٹھتا تھا کس طرح متصوفانہ آدرش سے ہم آہنگ ہو کر ایسے بھی اشعار کہہ لے گا کہ

گو جلوۂ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے، نظارے میں شامل کوئی نہیں

شاید یہ انہی آلام سے بدلے کی مٹھاس تھی جو ان کے ذہن کو اپنے کیف میں گم کر کے تلخیوں کا اظہار وقتی طور کے لئے طاق پر رکھ دیتی تھی ـــــ مگر جبر و قدر والے حصے میں بھی ان کے آلام کی چیخ موت کی تمنا یا تلخ نوائی کے سانچے میں ڈھل کر خون جانے کی بجائے فغانِ زیر لبی تک رہ جاتی تھی۔ ایسے اشعار میں آلام کی لپک تیز چکاچوند کی بجائے دھندلی دھندلی دمک کی حامل ہے مثلاً

فانیؔ ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

ـــــ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑی کاوش سے شعر کہتے تھے۔ اور جو کچھ کہتے خاص اثر اور جذبے کے ماتحت کہتے۔ تاثیر اُن کا خاص جوہر تھا علوِ فکر اور مضمون آفرینی ہو نہ ہو۔ چنانچہ جب تک المیہ شاعری دلوں کو تڑپا سکتی ہے اور ذہنوں میں وہی آتشکدے بھڑکا سکتی ہے جو اس شاعری کے خالقوں کے دماغ میں تھے اس وقت تک فانیؔ کا نام ایک لازوال اہمیت رکھتا ہے ـــــ ذیلی باتوں کے لئے تو بقول ان کے ؎

بن گئے منہ میں اتنی باتیں دل کا پتہ کیا خاک ملے
جس نے دل کی چوری کی ہے ایک اسی کا نام نہیں

مختار صدیقی

شعر

پھر موجِ ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

میرؔ تقی

مجبوری

بتاؤ، تم نے مجھے کس لئے نوازا تھا!
حجاب میری نگاہوں سے کیوں اٹھایا تھا!
تصورات کی دنیا میں رہ گئے ہم تم،
شباب و شعر کے دھارے پہ بہ گئے ہم تم
کبھی نہ بھول کر اُس وقت یہ خیال آیا
کجا غریب کی دنیا، فضائے قصر کجا!
ہوا نہ دھیان کہ ہے آسماں وہی سر پر
وہی ہیں شام و سحر اور وہی ہیں شمس و قمر
وہی سماج، وہی دست و پا کی زنجیریں
وہی ہیں گردنیں اب بھی، وہی ہیں شمشیریں
غریب قصرِ امارت کو ڈھا نہیں سکتا
میں تم کو چاہ تو سکتا ہوں، پا نہیں سکتا

سلیمان اریب

شبخون

کالی، اندھی رات، بھیانک
پھیلی پھیلی خاموشی کا
کالا جادو، اس میں اچانک
اک ہنگامہ، سیل بلا ہے،
ذرہ ذرہ کانپ اٹھا ہے

بڑھتے چڑھتے جنوں کے سہارے
مثلِ شہابِ ثاقب پل میں
آئے، گئے، برسا کے شرارے
نقشِ پا ہے نہ راہگذر ہے
ویرانی تا حدِ نظر ہے

دوڑ رہے ہیں وحشی گھوڑے
ہیبت ناک گھنی تاریکی
مار رہی ہے آتشیں کوڑے
راج محل پیوندِ زمیں ہیں
شعلے ہیں، اور ان کے مکیں ہیں

وحشی گھوڑے مگر ہیں فسانے
وقت نے جن سے تراش لئے ہیں
اُلٹے سیدھے لاکھ بہانے
خواہشِ سیم و زر بھی نہیں ہے
فاقہ کشی کا ڈر بھی نہیں ہے

چمکی خوں آشام سیاہی
چیخیں، آہیں، ہچکیاں، نالے
وحشت سے لپٹی ہے تباہی
خاک کے ہر سو ڈھیر کھڑے ہیں
زندہ مردے جن میں گڑے ہیں

اسکندر، چنگیز، ہلاکو
یکساں تھا ان سب کی نظر میں
چشمۂ حیواں، چشمۂ باکو
اب بھی وہی ہے فطرتِ آدم
بربادی میں ہے عظمتِ آدم

قیوم نظر

تل

"چودھری ––– اے چودھری ––– سنو –––"
گنیش چندر چودھری چُپ تھا۔
"شش –––"
"...... کیا بھینگر کی طرح شی شی کرے جا رہے ہو۔ مجھے ہیں تھک گئی ہوں چپکی بیٹھے بیٹھے ––– کہ –––"
"مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا ––– واہ ––– ساری پیٹھ تختہ ہو گئی ––– ہائے رام ––– ہنک ––– ہنک –––"
"ٹیچ ٹیچ –––"
"مجھے سردی لگ رہی ہے –––"
چودھری چُپ۔
"یہاں ––– یہاں نیچے کولہوں میں چیونٹیاں سی کاٹ رہی ہیں۔"
"دیکھ رانی دس منٹ بھی نہیں ہوئے اور تو تھک گئی –––"
"اور کیا ––– کوئی میں مٹی کی بنی ہوں کواہ –––" رانی نے اپنے موٹے ہونٹ پھیلائے اور مصنوعی سنگِ مرمر کی چوکی سے نیچے پھسل گئی۔
"چڑیل ––– کہتا ہوں سیدھی بیٹھ ––– حرامزادی –––"
چودھری نے رنگوں کی تھالی اسٹول پر پٹخی اور رانی کے کندھے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے۔
"تو ––– تو ––– تو پھر لو –––" وہ زمین پر لمبی لمبی لیٹ گئی
چودھری جل کر کوئلہ ہو گیا ––– اُس کا جی چاہا رانی کے چکنے چکنے سیاہ گالوں پر کھڑی کھڑی تھپیاں مارے۔ مگر وہ جانتا تھا پھر تو وہ بالکل ہی قابو سے باہر ہو جائے گی اور بہانہ کر کے رونے چیخنے لگے گی۔ اور پھر وہ تصویر جس کے لئے وہ اتنی جان مار رہا تھا نامکمل رہ جائے گی۔
"دیکھ تھوڑی دیر اور بیٹھی رہ ––– اور پھر –––" چودھری نرمی سے بولا
"تھک گئی نا –––" وہ لوٹ کر چیت ہو گئی۔
"تھک گئی! ––– اور جو سڑک پر دن بھر گوڑ بیٹھتی تھی تو نہیں تھکتی تھی ––– کتیا کہیں کی۔" چودھری کو پھر غصہ چڑھا۔
"کون بیٹھتا تھا گوبر ––– تم بیٹھتے ہو گے ––– واہ کیسے سانڈوں کے سے طعنہ دیتے ہو –––" وہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور چودھری کو یقین ہو گیا کہ آج کا دن تو گیا ہاتھ سے۔
"اچھا دیکھ گھڑی رکھی ہے یہ ––– بس آدھ گھنٹہ ––– سمجھی –––"
"آدھ گھنٹہ نہیں ––– بس چھ منٹ –––" وہ چوکی پر چڑھتی ہوئی بولی۔ بات یہ تھی چھ سات سے زیادہ تو اُسے گنتی بھی نہ آتی تھی۔ اور چودھری خوب جانتا تھا کہ چھ منٹ کے بہانے وہ اُسے آدھ گھنٹہ جمائے رکھے گا۔
رانی نے کمر کو کھینچ کر لمبا کیا اور بھاری پھولدار مٹکی جھٹکے سے کاندھے پر رکھی اور بیٹھ گئی۔ مگر کتنی دیر کے لئے!
"ٹھیک ہے نا –––"
"ہاں –––" چودھری جلدی سے جھک گیا۔
"دیکھ تو –––"
"ہاں ہاں ٹھیک ہے –––"
"دیکھ تو –––"
"ہاں ہاں ٹھیک ہے –––"
تھوڑی دیر خاموشی سے برش چلتے رہے۔ رنگ پر رنگ دوڑتے رہے۔ مگر کوئی ڈیڑھ منٹ بھی نہ گذرا تھا کہ رانی نے لمبی سی سانس لی۔
"ہا ––– بس چودھری ––– ہو گئے چھ منٹ –––"
"ہوں ہنک –––" وہ جلدی جلدی کبھی اُسے اور کبھی ادھ بنی دھبوں والی تصویر کو دیکھنے لگا۔
"سردی لگ رہی ہے۔ چدرا اوڑھ لوں –––"
"نہیں –––"
"آ ––– آ ––– ئے ––– جاڑا ––– ––– وہ کتیل کی طرح رونے لگی۔ چودھری چپ –––

"کمر —— کمر —— میری کمر —— چودھری جی ——"

اصل میں آج وہ شرارت پر تلی ہوئی تھی۔

"چدر —— چدر —— میری چدر ——"

چودھری چپ ——

"ہوں —— کہہ رہی ہوں میں تھک گئی۔ اب یہ ہنڈیا ٹیڑھی ہوں ہاں نہیں تو ——" چودھری جلدی سے مڑا وہ یہ تصویر مکمل کرنے کے لئے ہنڈیا عجائب خانے سے مانگ کر لایا تھا۔ اگر رانی توڑ دے تو بس سمجھ لو رانی کی کھوپڑی کی خیر نہیں۔

"تو پھر تھک جو گئی —— جوں کاٹ رہی ہے چودھری ——"

وہ اپنے گھنے ہوئے بالوں کو الجھانے لگی۔ اور وہ پھولدار شکی نیچے لٹکا دی۔

چودھری نے پیر دور دور رکھ لئے آنکھیں گھما کر لٹو کی طرح باہر نکال لیں اور غصے سے اس کے چہرے کا گوشت پھڑکنے لگا۔ اس کی چتکبری چھدری ڈاڑھی کشتی کے بادبان کی طرح لہرانے لگی جیسے بڑا بھاری طوفان آنے پر سفید سفید بادبان ہلتے ہیں۔ اور اس کی گنجی چکنی کھوپڑی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔

"لیکے کمر تو دکھ گئی ——" رانی نے ڈر کر جلدی سے اپنی نشست ٹھیک کر لی —— اور پھر وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اوہو —— ہو —— ہو بردر ——" وہ ہونٹ بجا بجا کر ڈکرائی۔

"و —— ود —— ود —— کوئی مر بھی جائے تو بھی —— رو رو —— برر ر"

چودھری نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورا —— جب کبھی بھی وہ رونے لگتی تھی تو چودھری کے رخساروں کی مچھلیاں پھدکنے لگتیں اور ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہونے لگتا۔ اور برش ہاتھوں میں پھلجھڑی کی طرح ناچنے لگتے طشتری کے سارے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ایک خلا میں تبدیل ہو جاتے۔ اور اسے کچھ نہ سوجھتا۔ اور یہ کرب کی حالت اس پر جب تک طاری رہتی جب تک اس کے دماغ میں چبھتا ہوا کانٹا نہ نکل جاتا۔ اور رانی کی حرکتیں اس وقت کانٹے نہیں بھالے بن کر اس کی ہستی کے آر پار نکل جا رہی تھیں۔

ہر ذی روح پر چودھری کے اس دورے کا پورا پورا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ رانی نہ بچ سکی۔ اس نے پھر اپنے پیٹ کو اندر پچکایا اور ہونٹوں سے پھرکنی کی سی آوازیں نکالتی ہوئی سیدھی ہو بیٹھی۔

تھوڑی دیر تک دنیا پھر اپنے محور پر گھومتی رہی۔ چودھری کا برش سپاٹ سے بھرتا رہا۔ رنگ کی تھالی گندی اور بدشکل ہوتی گئی۔ لیکن ——

"چودھری!" اس دفعہ رانی پیار سے بولی۔ چودھری کی بغل میں جیسے چوہا سا کودا۔ دنیا کے محور کا ایک پہیہ ذرا اچکا —— جانے بھی محور میں پہیے لگے ہوتے ہیں یا نہیں —— لیکن ہوا کچھ نہ کچھ ضرور!

"چودھری تم نے یہ دیکھا ہے ——"

چودھری کے کندھے جھر جھرائے۔ اور چکنی ڈلی کی شکل کی کھوپڑی میں پسینے کے دانے پھوٹ نکلے۔ وہ پھر بولی!

"یہ دیکھو —— یہ کالا تل! —— یہ دیکھو گردن سے ذرا نیچے —— اور نیچے —— ذرا الٹی طرف ——" ایک ہاتھ سے پھولدار شکی پکڑ کر وہ ہونٹ لٹکا کر اپنی گردن سے نیچے جھانکنے لگی۔

"دیکھا ہے یہ —— تل —— اور —— تم تو دیکھ رہے ہو چودھری" وہ بن کر شرمانے لگی۔ "واہ مجھے شرم آتی ہے۔"

"سیدھی بیٹھ ——" چودھری غرایا۔

"اوں —— بڑے آئے —— بھلا کوئی کسی کا تل بھی دیکھتا ہوگا اور جب وہ ایسی بری جگہ ہو —— ہی —— ہی —— ہی ——" وہ اترائی —— "بری جگہ ہے —— تل —— تم نے دیکھ تو لیا۔ بولو ——"

"میں نے تل ول کچھ نہیں دیکھا اور نہ دیکھوں" —— بدمزاجی بڑھی

"ہوں —— جھوٹے —— سراسر کانڑی آنکھ کر کر کے دیکھ رہے ہیں۔ اور —— ہی —— ہی ——" وہ آوارہ عورتوں کی طرح اٹھلائی۔

"رانی!"

رانی نے صرف ناک اچکا دی۔

چودھری مغلوب ہو کر کاٹھ کے خالی ڈبے پر بیٹھ گیا ——

"تجھے معلوم ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں ——"

"ہائے رام —— کوئی ... کتنے بڑے؟" وہ بھی ٹھکی لگا کر آگے جھک گئی۔

"میں تیرے باپ بلکہ دادا برابر ہوں —— اور تو —— تو بتا تو کتنی ہو گی؟ —— پندرہ برس سے آگے نہیں اور تجھے یہ بدمعاشی کی باتیں کس نے سکھائیں" چودھری دادا برابر تو کیا اس کے باپ برابر بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ذرا معاملہ کو دبانے کے لئے کہہ دیا تھا اس نے۔

"اوں ــــ بدمعاشی کی باتیں تم کرتے ہو کہ تل دیکھتے ہو ــ ایسی بری جگہ تو تل ہے ــ" وہ آہستہ آہستہ تل ٹٹولنے لگی۔

"ذرا سی چھوکری ــ"

"ذرا سی چھوکری ــ ذرا سی کا ہے سے ہوں واہ ــ ذرا سی کہتے رہتے ہو ــ ذرا سی ہوتی تو ــ"

"تو؟ ــ تو ــ تو کیا؟"

"رتنا کہتا ہے جس کی چھاتی پر یہ تل ہوتا ہے وہ ــ وہ ــ"

"رتنا؟ ــ یہ رتنا کو کیا معلوم تیرے کہاں کہاں تل ہیں ــ"

"میں نے دکھایا تھا ــ" وہ تل کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔

"تو نے ــ تو ــ تو ــ تو نے رتنا کو دکھایا تھا تل ــ"

چودھری کا پھر خون کھلبلایا اور بغلوں میں چوہے پھدکے اور گالوں کا گوشت ہلا ــ پھر برش پھلجھڑی کی طرح تھرکنے لگے اور رنگ ملنے شروع ہوئے

"آ ــ تو ــ واہ ــ اس نے دیکھ لیا تو میں کیا کرتی ــ"

"کیسے، کیسے دیکھ لیا ــ تل اس نے جبکہ تو ــ" چودھری کی بتیسی ڈھیلے کواڑوں کی طرح بجنے لگی۔

"نہا رہی تھی میں تو اس نے ــ" اس نے ٹکی سنبھالی اور نشست پر بیٹھنے لگی۔

"تو نہا رہی تھی ــ اور ــ وہ آ گیا ــ حرامی پلا ــ"

"ہاں تلیا پر نہا رہی تھی ــ مجھے اکیلے ڈر لگا کہ کوئی آ نہ جائے اس لئے میں اسے سنگ لے گئی ــ کوئی آ جاتا تو ــ میں نہا رہی تھی ــ شلوکہ بھی دھویا ــ"

"تجھے ڈر لگا کہ کوئی آ نہ جائے اس لئے تو اسے لے گئی ــ"

"ہاں ــ" اس نے بھولپن سے فیصلہ کیا۔

"رانی ــ" وہ آگے بڑھا ــ

"ہاں ــ میں نے اس سے کہہ دیا تھا اُدھر مُنہ رکھیو ــ مگر ــ"

"مگر؟ ــ"

"مگر وہ دور بیٹھا رہا ــ پھر میں نے کہا رتنا میرے تل ہے بڑی بُری جگہ ــ" وہ بولا نہیں تو میں نے کہا تو نہیں دیکھتا تو مت دیکھے ــ ہاں بھئی مجھے کیا! ــ کیوں چودھری ــ؟"

"پھر تو کیسے کہتی ہے اس نے تل دیکھا؟"

"ہاں پھر میں ڈوبنے جو لگی۔ پانی اِتا اِتا گہرا تھا۔" وہ تل سے ذرا نیچے انگلیاں رکھ کر بولی۔

"قطامہ!" چودھری برش پھینک کر کلوی کی طرف چلا ــ

"ہائے رے رام ــ پھر ــ پھر سنو تو ــ چودھری ــ تو کیا میں ڈوب جاتی؟!"

"تجھے تیرنا نہیں آتا ــ کتیا! رات دن ہودی میں ڈبکیاں لگاتی تھی تب نہ ڈوب مری ــ"

"واہ ــ واہ میں کیوں ڈوبتی ــ میں ــ میں تو تل دکھا رہی تھی ــ"

"تو نے تل دکھانے کے لئے بہانہ کیا تھا ــ!" چودھری نے پتلی سی مچھی ہوا میں نچائی۔ وہ اب مسکرا رہا تھا۔

"ہائے رام ــ مجھے ــ دھوتی تو اوڑھ لینے دو ــ چودھری جی"۔ وہ بندریا کی طرح اُچک کر کھاٹ کے اوپر جا کھڑی ہوئی۔

"جو تم مارو گے تو سڑک پر بھاگ جاؤں گی چودھری پھر تمھے شرم آئے گی ــ میں کہہ دوں گی چودھری ــ چودھری ــ" بُڈھا ٹھٹک گیا ــ "کیا کہہ دے گی ــ"

"میں کہہ دوں گی چودھری کہتا ہے کہ ــ میرا تل ــ اُم اُم ــ"

"لچی!" چودھری پاگل گیدڑ کی طرح ناچ اُٹھا۔ رانی سمجھ گئی کہ تیر نشانے پر بیٹھا!

"سب سے کہہ دوں گی ــ سنا چودھری؟ مار دو تم مجھے ــ مار کے بھی دیکھ لو ــ واہ ایسے کیوں گھور رہے ہو ــ اتنی تو چھوٹی ہوں میں ذرا سی چھوکری ــ بڑے خراب ہو تم ہی ــ" وہ ہلکے ہلکے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

چودھری سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک دفعہ کو جی میں آیا اُٹھ کر تصویریں تو لگا دے آگ اور رانی کو اتنا کوٹے اتنا کوٹے کہ کچومر بنا دے مگر پھر اُسے وہ نمائش یاد آ گئی جس میں اسے پانچ ہزار کا انعام ملنے والا تھا۔

ایک تو اس کا سر ویسے ہی گھوم رہا تھا۔ وہ تصویر تو بنانے لگا تھا۔ اور ہزاروں ہی تصویریں بنا کر چھوڑ دیں۔ اس نے کھلتے ہوئے گلاب کا شرمایا ہوا رنگ ٹھٹھہ مارتا ہوا سبزہ ناچتا تھرکتا آبشار بھی بنایا تھا۔ اس نے سرد آہوں اور بھینی خوشبو تک کو رنگ میں سمو کر رکھ دیا تھا۔ دور دور کے ملکوں کی ننگی اور آراستہ پیراستہ عورتیں بھی اس کے سامنے [illegible]

بیٹھنے کا فخر حاصل کر چکی تھیں۔ مگر یہ چلبلی گوار چھوکری جسے اُس نے موری کی غلاظت سے اٹھا کر اپنے آئندہ شاہکار کے لئے چُنا تھا۔ اُس کے قابو میں نہ آئی۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ لتھیڑنے پر بھی وہ اُس کے جسم جیسا مسالہ نہ تیار کر سکا اُس نے بیاہی میں صندلی گھول کر اس میں ذرا سا نیلا رنگ ملا دیا پھر بھی اُس کے رنگ کی چمک آبنوسی صندلی۔ نیلی اور کچھ بادامی لہر لئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر تھی۔ آج اس کا رنگ سرمئی ہو تو دوسرے دن اس میں شفق کی سی سُرخی پھوٹنے لگتی ۔۔۔۔ اور پھر کبھی بالکل اچانک اُس کا جسم ختم ہوتی ہوئی رات کی طرح کچھ اُودی اُودی گھٹاؤں سے ملنے لگتا اور کبھی نہ جانے کہاں سے اس میں سانپ کے زہر کی سی نیلاہٹ جھلکنے لگتی۔

اور آنکھیں بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتیں اُس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتار کا سا سیاہ رنگ گھول کر تیار کر لیا ۔۔۔ لیکن پھر اُسے پتلی کے گرد لال لال ڈورے نظر آئے ۔۔۔ خیر وہ بھی ہُوا، پھر اُن ڈوروں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جھنجلا گیا اور ڈھیر سا رنگ بے کار کیا۔ لیکن اُس کے غصے کی جب تو انتہا ہی نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں وہ سیاہ کولتار جیسی پتلیاں سبز ہونے لگیں ۔۔۔ اور ہوتے ہوتے دو زمرد کی ڈلیوں کی طرح ناچنے لگیں۔ پتلیوں کے آس پاس کا میدان دودھیا سفید ہو گیا اور ڈورے قرمزی ہو گئے ۔۔۔ اُف! وہ سر پکڑ کر جھومنے لگا ۔۔۔ اور اوپر سے یہ باتیں۔

"مچھر کاٹ گیا ۔۔۔" وہ بچوں کی طرح منمنائی۔

آج چودھری نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ گھُنّی سادہ جلئے گا اور بولے گا ہی نہیں۔

"اتنے مجھے کاٹتے ہیں کہ کیا بتاؤں ۔۔۔ یہ مچھر ۔۔۔"

"چودھری چُپ!"

"تمانے رے کیسے کاٹتے ہیں ۔۔۔ یہ مچھر ۔۔۔" اُس نے موٹی سی ایسی بازاری گالی بکی جو کچھ عام بھی نہیں۔

چودھری اچھل پڑا! گالی یعنی یہ لڑکی ہو کر اتنی موٹی گالی جانتی ہے! وہ خود سوائے چند بالکل زبان زد گالیوں کے ایک بھی گہری قسم کی گالی نہ جانتا تھا۔ اُس نے کبھی گالیوں کے مسئلے پر غور ہی نہیں کیا۔ ماں بہن کی گالی تو شاید مار و غیرہ کو بھی نہ آتی ہو گی۔ وہ بھی صرف چند مخصوص الفاظ استعارے کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں محض منہ زوری!

"یہ تو نے گالیاں کہاں سیکھیں؟" وہ مڑ گیا۔

"کونسی ۔۔۔ یہ ۔۔۔" اُس نے پھر بھولپن سے گالی دہرائی

"رانی!" وہ بھبکا!

"چَنن نے دی تھی ایک دفعہ مچھروں کو ۔۔۔ اُس کی کھولی میں بھی بہت مچھر ہیں ۔۔۔" وہ بات ٹالنے لگی۔

"اُس کی کھولی! ۔۔۔ تو اُس کی کھولی میں بھی گئی تھی ۔۔۔"

"ہاں وہ لے گیا تھا کہ چل گڑدھانی کھائے گی۔"

"پھر گڑدھانی کھائی تو نے؟"

"کہاں؟ گڑدھانی تھی بھی نہیں جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر اب لا دیتا ہے ۔۔۔"

"تجھے چَنن گڑدھانی لا دیتا ہے ۔۔۔"

"ہاں اور کھیلیں" وہ مشکی پر نقش و نگار ٹٹولنے لگی۔

"اور کھیلیں ۔۔۔!" چودھری جانتا تھا کہ وہ بے کار حیرت زدہ ہو رہا ہے۔ رانی گڑدھانی پر فریفتہ تھی وہ چَنن کی کھولی چھوڑ موری میں کتے کے جبڑوں میں سے گڑدھانی نکال کر کھا سکتی تھی۔

"میں نے تجھے پیسے دئیے پھر بھی تو چَنن کی گڑدھانی لیتی ہے۔"

"اوں میں کب لیتی ہوں۔ میں کوئی منگتی ہوں۔ وہی دیتا ہے کہتا ہے چل کھولی میں ۔۔۔ مجھے تو وہ آپ برا لگتا ہے۔ ایسی بڑی بڑی مونچھیں ہیں ۔۔۔ مجھے تو چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ خُون ۔ خون ۔۔۔"

وہ ناک سکیڑ کر پھڑپھڑانے لگی جیسے کسی نے اُس کی ناک میں بتی کر دی ہو۔

"ذرا بیٹھ کھجا لوں ۔۔۔ چودھری ۔۔۔!" پھر چودھری پر وہ دورانی کیفیتیں چھانے لگیں۔ بھیجے میں نالیاں سی بجنے لگیں اور گال اوپر نیچے کودنے لگے پانچ ہزار روپے کھنن کھنن اس سے دور ننھے ننھے تاروں کی طرح ناچ ناچ کر بھاگنے لگے۔ بھورا کالا سرمئی اور پیلا سب رنگ ایک دوسرے سے دست بگریباں ہونے لگے۔ اور کھوپڑی پر آبلے سے اُبھر آئے۔

اب سوال یہ تھا تصویر بنائے یا پاگل ہو جائے۔ اگر یہی چال رہی تو وہ دن دور نہ تھا جب وہ سچ مچ کپڑے پھاڑ کر سڑک پر باولے کتے کی طرح لوٹ لوٹ کر اپنا سوکھا مارا جسم چھیل ڈالے اور اپنے دہکتے ہوئے سر کو تلیا کے پانی میں ڈبو دے۔

یونہی اُس کے قدم تلیا کی طرف اُٹھ گئے۔ تلیا دور نہ تھی۔ عموماً وہ وہاں گھنٹوں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کو سطحِ آب پر تھرکتے ناچتے دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔ آہ وہ شاعر تھا ——— پیدائشی شاعر! وہ دنیا میں تو رہتا تھا مگر دنیا سے کتنا دور۔ بڈھا تو وہ نہ تھا ——— مگر جوان بھی اُسے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ اُس نے داڑھی بے پرواہی کی وجہ سے چھوڑ رکھی تھی اور وہ کچھ یونہی سی کھچڑی ہو چلی تھی۔

"اوہ! پھر اُس کی بغلوں میں کوئی چیز پھڑپھڑائی ——— رانی کے ہنسنے کی آواز ایک بھرائی ہوئی مینڈک کی آواز کے ساتھ آئی۔ مینڈک ہی ہوگا۔ اور کیا۔ برسات ——— خیر برسات تو دور تھی ——— مگر نہیں مینڈک نہیں بلی خرخرائی ہوگی ——— بلی تو کیا ہاں کچھ ہوگا ضرور ———

لیکن جب اُس کی پارسا آنکھوں نے رانی کو رتنا کے سنگ پانی میں چہلیں کرتے دیکھا تو تھوڑی دیر کے لئے وہ اسے بھی اپنے تخیل کا فریب سمجھا۔ تخیل اُسے چھیڑنے کے لئے نئے نئے بہلاوے تراشا کرتا تھا۔ اور آج تو حد کردی۔

لیکن جب وہ آگے بڑھا تو ہنسی کے زمزمے رُک گئے اور دو حیرت زدہ سنگ مرمر کے سے مجسمے آنکھیں پھاڑنے لگے۔ کس قدر صاف تھا وہ مجسمہ! بالکل بال بال صاف۔ رتنا کے پٹھوں کا اُبھار پانی سے بھیگی ہوئی اُس کی لمبی چوٹی ——— قریب قریب میٹھی ہوئی دو آنکھیں ——— اور رانی کی اُلجھی ہوئی چوٹی ——— وہ سرمئی خیالی صندلی کافوری اور نیلے رنگ کی آمیزش سے بنا ہوا جسم اور تل بس ——— وہ تل! اُبھرا ہوا ——— گولی کی طرح چودھری کے سینے میں آکر کھٹ سے لگا ——— ایک طرف کو سرکتا بچتا رتنا تو نکل گیا۔ اور بھاگا دھوتی اٹھا کر۔ اور رانی دلبری سے کھڑی چھپ چھپ کرتی رہی۔ چودھری کو معلوم ہوا کوئی اُسے جھولے میں ڈال کر لمبی لمبی پینگیں دے رہا ہو۔

"تل دیکھ رہے ہو میرا ——— بڑے بڑے ہو جی ———" وہ منانے کے لئے اٹھلانے لگی۔ چودھری شکر ہے کہ گھٹنے کے کنارے آکر سنبھلا۔

"باہر نکل ———"! اُس نے اُس ننھے چودھری کو پرے دھکیل کر کہا۔ جو ڈوبتے ڈوبتے ڈوبتا جا رہا تھا۔

"اوں تم مارو گے ———" وہ پانی میں سے اوپر اُبھر آئی۔

"آج تجھے ادھیڑ کر نہ ڈال دیا ہو تو میرا نام چودھری نہیں ——— چودھری نے خود کو یقین دلایا کہ یہ وہی ترچھو کری تھی جو کچھ نہیں مینڈکی کی طرح چل رہی تھی۔

"عورت پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آئے گی ہے" چودھری سلگ گیا۔

"ننگی عورتوں کو پیٹتے ہو بلے ——— واہ ———" وہ اور اوپر اُبھری ———

"شرم نہیں آتی ———" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور پانی اُس کے ٹخنوں تک آ رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی اسی لئے ذرا اکڑ کر باتیں کر رہی تھی۔

"اوں ——— جاؤ ———" وہ شرمانے لگی۔

چودھری کے ہاتھ سے وہ لچکتی ہوئی ٹہنی گر گئی۔ اور اُس کا قد کئی انچ لمبا ہو گیا۔ اُس کے بازو پھول گئے اور بھیجے میں سُرسُریاں سی رینگنے لگیں۔ بھوبل کے انبار کو ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوئی سیاہ آندھی بہلانے گئی۔ اور ر چنگاری بھڑکی ——— دھڑ دھڑ دھڑ ——— شعلے لپکنے لگے ——— اُس کی آنکھیں بھوکی چیلوں کی طرح سیاہ اُبھرے ہوئے تل پر جھپٹیں اور ——— اوہ گھن سے جیسے وہ تل ایک سیاہ چٹان بن کر اُس کے ماتھے سے ٹکرایا۔ ایک دم وہ لوٹ پڑا اور پٹے ہوئے کتے کی طرح بھاگا۔ کدھر اپنے کمرے میں پلنگ کی طرف۔ اسی دن اُس نے رتنا کو نکال دیا ——— وہ بہتیرا کہتا رہا کہ وہ لنگوٹ پہنے تھا مگر چودھری پر تو بھتنا سوار تھا۔ وہ ساری رات خیالات کی فوج کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ کوئی چیز اُس کے جسم میں برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھی ——— مگر سوراخ ہو ہی نہ چکتا تھا ——— جیسے کوئی چٹان راستے میں آگئی ہو ———

آج اُسے اپنی تصویروں میں لگانے کو رنگ مل رہے تھے۔ کتھئی میں ذرا سی نیلاہٹ ملا دینے سے بالکل وہی ——— وہی بھیگا ہوا صندل کی تہ جیسا گہرا اور جیتا جیتا رنگ بن گیا ——— اور آنکھوں کے لئے بھی بس سیاہی میں ہلکی سی سبزی ——— نہیں اُوداہٹ یا شاید سرمئی رنگ اور پھر گلابی کوٹ ——— جہاں آنکھیں ختم ہوتی ہیں نا۔ اُس نے چاہا آئینے میں اپنی صورت دیکھے۔ لیکن آئینہ تو جانے اُس نے کب سے نہیں دیکھا تھا ——— ایک مصور کو آئینہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں آئینے میں دیکھنے کے لئے ہوتا ہی کیا ہے؟ اُس کا آئینہ تو دوسری تصویریں تھیں جن میں چہرہ تو چہرہ اُس کی روح کا کونا کونا نظر آتا تھا۔ اُس کا دل اور دماغ سب ہی کچھ تو رنگوں میں سمویا ہوا سامنے موجود تھا۔

پھر بھی اُس نے چاہا کہیں اپنی صورت دیکھے! اُس نے ایک ٹین کے ڈبے کو جس میں اُس کے رنگ دور دور کے شہروں سے آیا کرتے تھے جھٹک کر جھاڑا ——— دو جھینگر پھدک کر اُس کی ناک پر ٹھپکا کھاتے اڑ گئے ——— مکڑی کا جالا اُس نے کہنی سے جھاڑ کر اُس میں اپنا منہ دیکھا ———

پہلے تو اُسے کچھ نظر نہ آیا ——— جیسے سمندر کی تہ میں تاریک تاریک جھاڑ اور پھندے سے ہوتے ہیں ——— یا جیسے آنکھوں میں کہیں گھس جاتی

یں تو پھیلا پھیلا دکھائی دیتا ہے ویسا دکھائی دیا —— پھر ایک بھیانک ڈاڑھی
ہر پیاسی پیاسی آنکھیں دکھائی دیں —— اوہ یہ وہ خود تھا! وہ! وہ ——
ہو —— مگر ایسا تو کبھی تھا ہی نہیں —— ایسا! اُس نے ٹین کا ڈبہ اوندھا
یا اور بغیر آئینے کے اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے ڈاڑھی تو
خیر نظر آئی اور ایک آنکھ بند کرنے سے تھوڑی ہی کالے دھبے والی ناک
اور پھیلی ہوئی مونچھ دکھائی دی ——

مونچھ! —— اگر قینچی ہوتی تو وہ —— ذرا —— ذرا سا مونچھ کو ویسا کر دیتا —— رانی کہتی تھی چتن کی مونچھوں سے چھینکیں آنے لگتی ہیں —— فوں —— فوں —— وہ خود بھی ناک بجانے لگا۔ یہ تو خیر معلوم تھا کہ رتنا لنگوٹ پہنے تھا —— کیا عجب دھوتی بھی ہو —— پہنے ہو —— یا پہننے والا ہی ہو کر وہ آ گیا —— مگر یہ چتن اور اُس کی گڑدہانی!

اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کمرے کی دیواریں گڑدہانی کی بنی ہوئی ہیں۔ اور وہ اُسے بھینچے ڈال رہی ہیں —— وہ ایک لیسی ہوئی مکھی کی طرح گڑدہانی کے ایک بڑے سے ڈھیر پر چپکا ہوا ہل رہا ہے۔ جب وہ ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا اور ٹانگیں شل ہو گئیں تو وہ اسٹول پر ٹک گیا —— پردہ ہٹا کر اُس نے اپنی ادھوری محنت کو دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے داغ دھبے گھومنے لگے اور ایک دم ٹھہر گئے —— شانے پالش کئے ہوئے چمڑے کی طرح چمکنے لگے اور آنکھوں میں نیلی ہری کالی روشنیاں گھومنے لگیں —— اور تل!
یہ تل کہاں سے آیا —— سانپ کی طرح گول کنڈلی مارے ابھرا ہوا تل!
ٹک ٹک ٹک ٹک گھڑی کی طرح اُس کا دل ہلنے لگا۔

وہ ایک دم اُٹھا اور اُس کے پیر رانی کی کوٹھڑی کی طرف اُٹھ گئے گندی میلی چھوٹے سے دروازے کی گھٹی ہوئی کوٹھڑی! وہ کل ہی اسے اونچا کرے گا —— نہیں —— اونچا نہیں —— وہ جو دوسرا کمرہ ہے۔ جس میں خالی ڈبے پڑے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ وہ اندھیرے میں بڑھنے لگا —— اس کا دل اب بھی گھڑی کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کوٹھڑی کی سیاہی گھلی ہوئی کالونچ کی طرح اُس کے چاروں طرف لپٹ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ چارپائی سے ٹکرائے اور —— پھر ان کے جھولے میں دھنس گئے —— اُس نے جلدی جلدی سارا پلنگ ٹٹول ڈالا مگر رانی وہاں نہ تھی!

سارے بدن پر جیسے بچھوؤں نے لپٹ کر چٹکنا شروع کیا —— موٹے موٹے قہقہے لگاتے ہوئے بچھوا —— اور پھر گڑدہانی کی سیلیں کی سیلیں اُس پر ٹوٹ پڑیں۔

صبح اُس نے چاہا رانی کی چٹیا اٹھا کر اُس سے پوچھے حرامزادی یہ رات کو کہاں گئی تھی —— مگر کوئی کہے گا کہ وہ راتوں کو اُس کا پلنگ کیوں ٹٹولتا ہے۔

وہ چپکا کام کرتا رہا اور رانی بھی آج نہ بولی۔ وہ چاہتا تھا کچھ تو بولے شاید رات کے اُڑنے کا کچھ پتہ چلے مگر وہ منہ بنائے روٹھی بیٹھی رہی۔

"کیوں کیا تھک گئی؟ ——" اُس نے اُسے مٹکی رکھتے دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔ آج وہ اس سے لڑنا نہ چاہتا تھا۔

"اور کیا —— میں مٹی کی بنی ہوں؟ ——" وہ اپنی کمر دونوں ہاتھوں سے دبانے لگی۔

چودھری کا جی چاہا کوئی نرم سی بات کہے۔ مگر اُسے اپنا انداز بدلتے ذرا شرم آئی۔

"لے بس اب سستا چکی ——" وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ لڑے گی اور —— خیر۔ مگر رانی نے مٹکی اٹھا کر پھر جسم کو ویسے ہی اکڑا لیا۔

آج رنگ تنتنا اُٹھے۔ جو رنگ لگاتا منہ چڑانے لگا —— آج اُس نے سوچا تھا تل بھی بنا دے گا۔ یونہی —— تصویروں میں کیا تل نہیں ہوتے مگر رنگوں کے مزاج بگڑے دیکھ کر وہ ٹال گیا ——

جب رانی اٹھ کر چلی تو گڑدہانی کا ٹکڑا اُس کی دھوتی میں سے گر پڑا اُسے خبر بھی نہ ہوئی مگر چودھری کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کے سر پہ سائبان ٹوٹ پڑا۔

"یہ —— گڑدہانی ——!" اُس نے غصے سے جھاگ اُڑانے شروع کئے۔ پہلے تو وہ رُکی کہ اٹھا لے۔ مگر چودھری کے تیور دیکھ کر وہ چل دی۔

"تم کھا لو ——" اُس نے غرور سے گردن اٹھا کر کہا۔

چودھری پر پھر گرگٹ کا بھتنا سوار ہو گیا —— وہ رانی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا —— اور پھر ایک دم جوتے کی ایڑی سے اُس نے گڑدہانی کو زمین پر رگڑ کر پیس ڈالا ——

دوسرے دن رانی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس نے دو چار کپڑے لینے کی تکلیف بھی تو گوارا نہ کی۔ جیسی آئی تھی ویسی ہی پھر مٹ کیچڑ میں رُلنے کے لئے چل پڑی۔

چودھری کی تصویر نامکمل ہی رہ گئی! پانچ ہزار روپے ایک سیاہ دھبے کی صورت میں اُس کے دماغ پر جم گئے —— سیاہ دھبہ جیسے ننھا

سا اُبھرا ہوا تل — مگر کتنی بڑی جگہ تھا یہ سیاہ جلا ہوا نشان — بالکل چودھری کے کلیجے میں!

اُس کے بعد وہ اور بھی پریشان رہنے لگا — ڈر کے مارے وہ کسی سے کہتا بھی نہ تھا کہ رانی بھاگ گئی۔ اُسے ڈر لگتا تھا کہ کہیں کوئی کہے نہ کہ آخر بھاگ گئی تو کیا ہوا۔ وہ کیوں مرا جاتا ہے۔ لہٰذا دن گذرتے گئے، وہ تصویریں بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اب کوئی مچھ پچھ آنے میں بھی اُس کی تصویریں نہ لیتا تھا کیونکہ وہ اس قدر بھدے ڈراؤنے سیاہ بھورے اور کالے رنگ شفق اور پھولوں میں بھرنے لگا تھا کہ لوگ اُسے اُلو سمجھنے لگے۔ اُس کے سارے رنگ گڈ مڈ ہو کر خلا میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اس کے بعد اور بھی غیر دلچسپ واقعات پیش آنے لگے۔ لوگ رانی کے متعلق اس سے بار بار پوچھتے، وہ کہہ دیتا نہ جانے کہاں گئی۔ مگر لوگ ایسے سیدھے سادے جواب کو کب پسند کرتے ہیں؟

"چودھری رانی کو بیچ آیا"

"ایک سوداگر آیا تھا سو کئی ہزار دے کر لے گیا"

"رانی سے بُرا تعلق تھا — ناجائز — کہیں پار کر دیا"

جتنے منہ اُس سے دونی باتیں۔ چودھری کی زندگی اندھیری کوٹھڑی بن گئی۔ معلوم ہوتا تھا دنیا اُسے تل کے کھا جانا چاہتی ہے۔ یہی نہیں لطف زندگی تو جب آیا جب رانی ایک چھوٹی سی خون آلود گٹھڑی ایک الگ سے راستے میں رکھتی ہوئی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔ فوراً گاؤں پر چڑھائی ہوئی — اور چودھری کے رہے سہے حواس گم ہو گئے۔ رانی کے غائب ہونے کا عقدہ بالکل آسانی سے کھل گیا اور چودھری ہکا بکا مُنہ پھاڑے رہ گیا — اُف اُس کی ساری عمر کی پاکبازی اور نیک نیتی یوں ناانصافی اور اندھا دھند کے ہاتھوں کھل گئی — مگر وہ جانتا تھا کہ خدا کو خواہ مخواہ کا اس سے بیر نہیں، وہ ایسے صاف بچ جائے گا جیسے — جیسے سب بے گناہ بچ جاتے ہیں۔ سانچ کو آنچ کہاں — مگر کاش وہ شریک جرم ہی رہتا — تو پھر وہ مجرم ہی رہتا — یوں تو وہ مجرم تھا ہی آخر اُس نے پیدا ہو کر کونسا کم جرم کیا تھا۔

ہاں تو کاش وہ شریک جرم رہتا۔ قید بھگتتا — مصیبتیں دکھ درد بپتا — دنیا بھر کی ذلتیں مگر اسے معلوم ہوتا تو وہ ہنس ہنس کر گود میں لپک لیتا اُسے پتہ ہوتا کہ وہ یوں چھوٹے گا تو وہ کیوں گڑگڑا کر خدا کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کر کے دعا مانگتا — ہاں یہ تو تھا کہ — ذرا تِل — ہاں۔ خیر!

مگر خدا کیا اپنے بندوں کی کمزوری کو نہیں جانتا۔ اسی نے یہ ساری کمزوریاں انسان کے پیچھے لگا دی ہیں — مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ جب رانی سے بازپرس ہوگی اور سرکاری وکیل چاروں طرف سے چودھری کو منطق کے جال میں گھیرے گا تو وہ یہ داؤں چلے گی — اور یوں اُسے آزاد — یا دوسرے معنوں میں برباد کر دے گی۔

"چودھری کا نہیں تھا —" اُس نے بھری کچہری میں حلف اٹھا کر کہہ دیا۔

"چودھری تو ہیجڑہ ہے —" اُس نے لاپروائی سے کہا — "رتنا سے پوچھو یا چنن سے — اب مجھے کیا معلوم — واہ!" وہ اپنی پرانی ادا سے اٹھلائی۔

ایک خاموش گرج اور چمک کے ساتھ سیاہ پہاڑ چودھری کی ہستی پر پھٹا اور دور — سیاہی میں اور بھی سیاہ گول — ابھرا ہوا نقطہ پھرکی کی طرح گھومنے لگا —!

چودھری اب بھی سڑک کے کنارے بیٹھا کوئلے سے لکیریں کاڑھا کرتا ہے۔ لمبی تکونی — گول — جیسے جلا ہوا داغ —!

عصمت چغتائی

طلب

یہ کیوں جاننا چاہتی ہو؟ یہ کیوں پوچھتی ہو؟
بنی کیوں ہو دشمن مری — اور اپنی؟
جگاتی ہو سوتے ہوئے بھوت مجھ میں!
لو! — وہ کسمسائے، وہ انگڑائیاں لے رہے ہیں۔
جو نکلی ہے دھارا مرے دل سے اب رہ گئی ہے گلے میں اٹک کر
مرے لفظ تک گل چکے ہیں،
نہ ہاتھوں میں باقی ہے حرکت!
میں مجبور سا ہو رہا ہوں کہ ہٹ جاؤں کچھ دور تم سے،
نہ دیکھوں تمہاری طرف میں۔
تمہارے گلابی بدن سے مرا جسم ہے خوف کھاتا،
لرزتا ہے اور سنسناتا۔
تمہارے چمکدار، گلرنگ بازو،
لو، نیلے ہوئے جا رہے ہیں،
سیہ اور نیلے۔
مجھے ڈر ہے ڈس لیں گے مجھ کو! الگ مجھ سے رکھو!
مجھے تک رہی ہو میڈوسا کے سر کی طرح تم!

میں پاگل ہوا جا رہا ہوں!
ہٹا لو، ہٹا لو، مرے جسم سے اپنی نظریں ہٹا لو۔
میں تحلیل ہو جاؤں گا، اور کھو دوں گا اپنے کو،
مل جاؤں گا تم میں، بس ہو کے رہ جاؤں گا ایک ذرہ
تمہاری خودی کا!
یہ انجام میرا!
مرا جسم کیا تم کو کافی نہیں ہے؟
مرے ہونٹ اور میرے بازو؟
ہے احساس میں میرے شعلوں کی تندی،
غضب ناکیاں ہیں مرے سینگوں کی،
ہے شبنم کی ٹھنڈک، تراوٹ گلوں کی۔
لچک ان میں خوابوں کی ہے اور نرمی،
یہ سب تم کو دے دوں گا — لیکن
ہوسناکیاں اُف تمہارے بدن کی،
مجھے چاہتا ہے! مجھے مانگتا ہے!

محمد راشد فضلی

خالی جیبیں

(ہیزلٹ سے بہ معذرت)

خالی جیب رہنا اگر نقصان دہ نہ ہوتا تو کوئی بری بات نہ تھی۔ نقصان دہ ہونے کے باوجود بھی پچھلے دنوں سے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ خالی جیب پڑھے لکھے نوجوان طبقے میں ضرورت سے زیادہ ہی مقبول ہو رہی ہے۔ ایک نہیں، دو نہیں، کئی رنگین سوٹ اور فلیٹ پہننے والوں کو کندھے اچکا کر جیبوں پر ہاتھ مارتے ہوئے یہی کہتے سنا ہے ——— "او مائی گاڈ، بٹوا مرا تو میز پر ہی رہ گیا۔ دینا یار ایک اکنی" ——— ایک آدھ نوجوان کا بٹوا اگر ڈرائنگ روم کی میز پر دھرا رہ جائے تو بات طول نہ پکڑے۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ بٹوے کی جگہ ہی ڈرائنگ روم کی میز بن گئی تو ——— اگر ایسا ہوا (جیسا کہ اس فیشن کے اپنائے جانے سے خطرہ ہے) تو ہمارے اقتصادی نظام کی چول کچھ ٹھیک نہ بیٹھے گی۔ ان لوگوں کے کام تو نکلتے ہی رہیں گے آپ نے اکنی نہ دی مجھ سے مل گئی۔ لیکن یہ فیشن اگر بری طرح اثر انداز ہو گا تو ایک اور ہی طرف، ہم میں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو محض ہماری بھری جیبوں سے دو وقت کی روٹی نکالتا ہے۔ جیبیں خالی ملیں تو غریبوں کی محنت اکارت جاتی ہے۔ مایوس ہو جاتے ہیں، حوصلہ شکنی ہوتی ہے محنت اکارت جائے ہمیں افسوس نہیں۔ ہمارے سامنے آئے دن لاکھوں کی محنتیں اکارت جاتی ہیں۔ مگر جہاں آرٹ کی توہین ہوتی ہو اُسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ آرٹسٹ کی حوصلہ شکنی ہم سے نہیں دیکھی جاتی۔ جیب کترا سننے میں عام آتا ہے، دیکھنے میں کم لیکن پھر بھی وہ ایک بڑا آرٹسٹ ہے ولایت میں سنتے ہیں کہ اس آرٹ کی قدر ہے۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ اس آرٹ کی ترویج و اشاعت کے لئے بعض ماہرین نے ایسے ادارے بھی کھول رکھے ہیں جہاں اس فن کی باقاعدہ تعلیم ملتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں تو اس سے غفلت ہی برتی جا رہی ہے۔ آرٹ بُرا نہیں۔ کم سے کم یہ تو ہے کہ جیب کترا ہو کا نہیں مرتا۔ یہ کیا کہ ایک تصویر بناؤ اور اسے دربدر لئے پھرو کہ شاہکار کی قیمت پڑے۔ نقادوں سے اُلجھو، ناشروں سے جھگڑو۔ بڑے لوگوں کی جوتیاں جھاڑو۔ یہاں نہ خوشامد، نہ جھگڑا۔ اس آرٹ میں معاوضہ تو پہلے ملتا ہے اور معلوم بعد میں پڑتی ہے۔ اب تصور فرمائیے کہ آج اگر سبھی جیبیں خالی ہو جائیں تو اس آرٹ کا کیا حشر ہے۔ جیب کترے ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں اور ڈھاکے کے جولاہوں کی طرح وہ بھی ایسے غائب ہوں جیسے محاورہ تراشا جانے سے کچھ عرصہ پیشتر گدھے کے سر سے سینگ غائب تھے۔ جیب کترے نہ ہوتے تو اس پیشے نے فنی لحاظ سے بیسویں صدی کے آرٹ میں جو اضافہ کیا ہے ہم اس سے محروم رہ جاتے۔ اس قصے پر خاک ڈالئے۔ آرٹ ترقی کرے نہ کرے اسے بھی چھوڑیئے۔ اس پر غور کیجئے کہ خوش پوش بے کار نوجوانوں کی تعداد اور بڑھ جاتی۔ ہمیں پوچھیے تو ہماری خوشی اسی میں ہے کہ جیبیں بھری بھری ہوں اور جیب کترے دن دُونی رات چوگنی ترقی کریں۔

یوں بھی اگر آپ کو فن "جیب تراشی" سے کوئی دلچسپی نہ ہو (انسانی ہمدردی سے قطع نظر، جو آپ کو یقیناً ہے) تو بھی خالی جیب رہنا گویا ریل گاڑی میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرنا ہے، اور واضح تشبیہ لیجے ——— جیسے کسی غیر ملک میں پاسپورٹ کے بغیر سیاحت کرنا ——— قدم قدم پر روک، طرح طرح کے شبہات، جائز و ناجائز پکڑ دھکڑ ——— اور داخلی طور پر ——— دل کی دھڑکن کی تیزی، چہرے کی رنگت کا اتار چڑھاؤ، اور ایسی ہی ہزاروں دقتیں اور مصیبتیں ہیں جن سے دوچار ہونا پڑتا ہے پیشتر اس کے کہ یہ دقتیں اور مصیبتیں گنوائی جائیں ایک بات ہمیں واضح کر دینی چاہیئے اور وہ یہ کہ خالی جیب سے مراد وہ جیب نہیں جو قطعی غربت کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ ایسی جیبیں تو محنت مزدوری سے بھری جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے اشتراکی بھائی ایسی ہی جیبیں بھرنے کے لئے خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ یہاں تو افلاس بھی ایک اصطلاحی مفہوم ادا کرتا ہے۔ ہمارا اشارہ تو اس جیب کی طرف ہے

جو محض اتفاقیہ طور پر، غیر عمداً یا یونہی حسن اتفاق سے خالی ہو جاتی ہے اور پھر جس کے جلد ہی بھرے جانے کی توقع بھی ہوتی ہے۔ ہم تو اس کیفیت کی بات کرتے ہیں کہ آپ کے ذرائع کلیتہً ختم ہو چکے ہیں اور آپ کچھ نہ کچھ خرچ کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ دل تڑپ تڑپ اُٹھے کہ کچھ روپیہ تو خرچ کیا جائے اور جہاں روپے پیسے کی لُوٹ، اور اس کے مزید ملنے کی امید، دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔ ہمیں تو وہ تعویق مدِ نظر ہے جو آپ کی جیب کی آخری کوڑی کے نکل جانے سے لے کر جیب میں دوسری قسط کی پہلی کوڑی کے پڑنے تک قائم رہتی ہے۔ یہ غیر متوقع اور ناخوشگوار وقفہ بے شمار الجھنوں، تنگ دستی، اضطراب اور نہ جانے کتنی ذہنی کوفت اور گوناگوں کیفیات سے بھرپور ہے۔

آپ نے شاید کم غور کیا ہو کہ صبح سویرے ناشتے کا نہ ملنا بھی ایک مصیبت ہے۔ بلکہ ایک کڑی آفت ہے۔ آپ رات بھر میٹھی نیند سوئے ہیں خراٹوں سے قریب پڑے ہوئے نوکر کا دم ناک میں کئے رکھا ہے اور آپ نہیں جانتے کہ اُس نے آپ کی اس نادانستہ حرکت پر کتنی بار "مربھی سسرے" کہا (اگر آپ کا نوکر بجنوری ہے تو) تو اس "خراٹے دار نیند" میں آپ نے سنہری خواب بھی دیکھے ہوں گے (خراٹوں کی آواز سے انسان ہی بھاگتے ہیں۔ سنہری خواب چمپت نہیں ہوتے) اور ان خوابوں میں دو ایک خواب من و سلویٰ کے بھی ہوں گے — مرغ کے کباب اور بھنے ہوئے تیتر اور بٹیر — آپ صبح اُٹھتے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے گرم بستر پر جماہیاں لے رہے ہیں۔ آپ نے ابھی تک صرف رات کا بچا ہُوا سگرٹ کا ٹکڑا ہی سلگایا ہے۔ آنکھیں نیم وا ہیں۔ دھیرے دھیرے کش لگائے جا رہے ہیں آپ کا نوکر (یہاں بجنوری ہونے کی کوئی تخصیص نہیں) ٹھٹھرتا ہوا قریب آتا ہے۔ خراٹوں کا ذکر نہیں کرتا۔ کہتا ہے — "بابوجی۔ آج ناستہ —" اور رک جاتا ہے۔ آپ کو نہ جانے کیا محسوس ہوتا ہے۔ سگرٹ کے کش نہیں لگتے۔ آنکھیں نیم وا ہو جاتی ہیں۔ آپ سوچتے ہیں کہ گھر میں ناشتے کا اللہ والی ہے۔ دن بھر کے پروگرام پر ایک دھندلکا سا چھا جاتا ہے۔ اس وقت آپ یقیناً یہی سوچتے ہیں کہ آپ نے سوتے وقت کس کا منہ دیکھا تھا۔ اس کشمکش میں ہیں کہ کیا کریں کیا نہ کریں اگر ناشتے کی تلاش میں نکلیں تو ناشتے کا وقت ہی اس تلاش کی نذر ہو جائے۔ گلی کی نکڑ پر آپ کھڑے نہیں ہو سکتے، منہ سے جھاگ نکالنا تو خیر بڑا کام ہے۔ ہاتھ پھیلا کر گال کو زمین سے ٹیکے ہوئے آپ زمین پر بھی تو نہیں کہہ سکتے کہ — "اللہ ہی دے گا۔ محتاج کو دے جا" — اور کسی ساہوکار کے ہاں ڈاکہ — یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے دل گردے کی ضرورت ہے اور یہاں دونوں غائب تو اس وقت آپ اس سٹے باز کی طرح ہوں گے جس کے داؤ لگاتے وقت بھاؤ میں چند کوڑیاں ہی گر جائیں اور اس کشمکش میں ہو کہ چکا دے یا رکھ لے۔

اب آپ کا پیٹ اتنا تنگ نہیں کر رہا جتنا اس پاس کھڑے نوکر کا چہرہ جو یہ کہہ رہا ہو — "کہئے بابو صاحب اس مکھن اور روٹی والے کو کیا جواب دوں جس نے ادھار دینے سے انکار کر دیا ہے؟" — یہاں ڈرامائی کیفیت کی شدت اور بڑھ جاتی ہے اور آپ کو کوئی بہانہ نہیں سوجھتا مکھن والے کو آخر کیا جواب دیا جائے — ہنسی میں ٹال دیا جائے، ناک بھوں چڑھائی جائے، غصے میں لال پیلا ہو جائے، یا مسکرا کے بے نیازی سے سگرٹ سلگا لیا جائے۔ ایسے موقعے پر ایک چونی کا مل جانا جو کسی وقت پھٹی ہوئی جیب سے فرار ہو کر کوٹ کے استر میں پناہ گزیں ہو چکی ہو، یا کسی ایسی اٹھنی کا ہاتھ لگنا جو صندوق کی دیوار کے ساتھ چپکی پڑی ہو اور اس وقت سے چپکی پڑی ہو جب آپ مٹھی بھر ریزگاری یونہی صندوق میں پھینک دیا کرتے تھے، یا کسی ایسے نوٹ کا مل جانا جو خطوں میں پڑا رہ گیا ہو، ایک ایسی عیاشی ہو گی جو کسی نواب واجد علی شاہ کو بھی نصیب نہ ہوئی ہو۔ لیکن یہ سب خواب ہے — سراب — جو حضرات خالی جیبوں سے کھیلے ہیں وہ ہنس رہے ہوں گے کہ کتنی پیاری پیاری بے پایاں باتیں ہو رہی ہیں! انہیں یقین ہے کہ لکشمی دیوی ان ہی موقعوں پر تو ستایا کرتی ہے۔ اور آج تک کبھی کوئی چونی، اٹھنی یا روپیہ یوں نہیں ملا۔ ایسی صورت حال پیدا ہونے سے پیشتر ہی کوئی جیب نہیں جو ٹٹولی نہ جائے، کوئی ملفہ نہیں جو الٹ نہ دیا جائے۔ اور کوئی کونہ نہیں جو چھان پھٹک سے بچے۔ ان موقعوں پر تو چھپے ہوئے سکے خود بخود ہی اچھل پڑا کرتے ہیں۔

آپ کی آنکھیں کمرے کا جائزہ لیتی ہیں۔ کوئی واشتہ نظر آئے جو بکار آ سکے۔ کوئی دادا کی رکھی رکھائی پرانی گھڑی جس کا ڈائل پیلا پڑ چکا ہو۔ کوئی سونے چاندی کا چھلا کوئی برتن، کسی دوست کی کوئی سائنس کی کتاب ہی سہی کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ناشتے کا سامان مہیا کر سکے — مایوسی! — چاروں کونوں میں مایوسی بھی کھڑی ہے۔ عین اس وقت کباڑیے کی آواز آپ کے کان میں پڑتی ہے۔ آپ کی حالت اُس ہیروئن کی سی ہو جاتی ہے جو بدمعاش کے چنگل میں ہو اور اس کا ہیرو قلعے کی دیوار کو پھاند کر باندھ جائے "پیاری — پیاری" کہتا ہوا بھاگا آ رہا ہو۔ کباڑیے کی آواز — "کیا کوئی پھان ایسا بوتل؛

لیا کوئی پرانی ردی دینے لا۔ لیا کوئی پرانے کوٹ، پرانے بوٹ، لیا کوئی چھان بورا بوتل" ـــــ یہ بار بار دہرائے جانے والے الفاظ آپ کے لئے ایک پیغام لئے ہوئے ہیں۔ آواز کہتی ہے ـــــ "چاہو تو ناشتے کا سامان کر لو، ہم جا رہے ہیں" ـــــ کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کوٹ کی جگہ آپ ابلتی چائے اور بھاپ چھوڑتے ہوئے زرد زرد انڈے دیکھتے ہیں۔ آپ کی بھوری ٹوپی چاکولیٹ کا کیک بن جاتی ہے۔ آپ کے پرانے بوٹ جو آپ بارش میں پہنا کرتے ہیں، ڈبل روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑے نظر آنے لگتے ہیں۔ اب ایک طرف پیٹ کے لئے ناشتہ اور دوسری طرف ذلت کا گڑھا اور یاس کی دلدل۔ آپ ڈرتے ہیں کہ کسی ہمسائے نے دیکھ لیا تو؟ حالانکہ آپ کے ہمسائے کی بیوی سرِ آنکھوں ستاویں سیروں چھان بورا پھیری والے کے پاس بیچا کرتی ہے اور دو پیسے فی سیر کی بجائے اڑھائی پیسے فی سیر کے لئے گھنٹوں جھگڑتی رہتی ہے اور جب آپ کا ہمسایہ نوکری میں چھان بورا ڈالے خود نیچے اترتا ہے تو وہ سیڑھیوں میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور پھیری والے کو کم تولنے پر جا بجا ٹوکتی رہتی ہے۔ اور وہ کئی بار آپ کے ہمسائے کے پرانے بوٹوں کے بدلے نئے چینی کے پیالے اور شیشے کے گلاس لے چکی ہے اور کئی بار پشاوری پنکھے بھی لئے ہیں۔ مگر پھر آپ سوچتے ہیں کہ ایک ہی آپ کا دادا اور ایک ہی اس کی نشانی ..... اپنا پرانا کوٹ اور کباڑیئے کو دیا جائے اور وہ اسے الٹ پلٹ کے بیسیوں بار دیکھے ..... کتنا حقیر فعل ہے ..... کتنا حقیر تخیل ..... آپ الجھن میں ہیں۔ "لیا کوئی چھان بورا بوتل" کی صدا فضا میں گونجتی ہر اور اپنی لرزش آپ کے ذہن میں چھوڑتی ہوئی گم ہو جاتی ہے۔ آپ کی ذرا سی لغزش اور کم ہمتی نے ایک سنہری موقعے کو ہاتھ سے گنوا دیا اور آپ بغیر ناشتے ہی کے رہ گئے۔

ناشتے کا نہ ملنا اپنی جگہ ہے لیکن دوپہر کے کھانے کا نہ ملنا بھی کچھ کم کڑی آفت نہیں۔ اس آفت کو ٹالنے کے لئے آپ ایک "قربانی کا بکرا" ڈھونڈ سکتے ہیں۔ مگر ناشتے کے معاملے میں گنجائش نہیں اور اس لئے وہ آفت اپنے رنگ میں ممتاز ہے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت آپ کا کوئی دوست دعوتِ ولیمہ کا رقعہ بھی بھیج سکتا ہے اور اگر آپ کا دوست شکاری ہے تو عجب نہیں اس وقت چند مرغابیاں ہی آپ کی خدمت میں پہنچ جائیں۔ لیکن یہ توقع تب ہونی چاہیئے۔ جب آپ کو یقین ہو کہ آپ کے دوست کو یہ اطلاع نہیں کہ آپ خالی جیب ہیں اور دوپہر کے کھانے نے آپ کے خلاف ہڑتال کر رکھی ہے۔ اسے چھوڑیئے اگر

تخیل کو ایک اور فضا میں پرواز کرنے دیجئے۔ اگر اس وقت کوئی لاولد چچا مر جائے اور اپنے تمام مربعوں اور کوٹھیوں کی ملکیت آپ کے نام منتقل کر جائے ـــــ یا آپ شاعر ہیں تو کسی والیِ ریاست کے وظیفے کا پروانہ پہنچ جائے ـــــ یا اگر آپ نے جو گئے سال ٹکٹ خریدا تھا اس پر کئی ہزار کی لاٹری کے نکل آنے کا تار آ جائے ذرا اور تصور فرمایئے "اگر" کے بغیر ہی کام چل جائے تو ...

ہاں تو باتیں ہو رہی تھیں کھانا نہ ملنے کی۔ آپ ایک دوست کے ہاں اس وقت جا دھمکتے ہیں۔ جب آپ جانتے ہیں کہ وہ دوپہر کا کھانا کھایا کرتا ہے۔ آپ آواز لگاتے ہیں۔ نوکر نیچے آتا ہے اور کمرہ کھول دیتا ہے اور کہتا ہے ـــــ "آپ بیٹھیں۔ میاں ساجد ابھی آتے ہیں" آپ مسکراتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں ..... میاں ساجد شریف آدمی ہیں اور ان کے والد تو بے حد شریف۔ نیک دلوں کی اولاد نیک دل ہی ہوا کرتی ہے ..... مہمان نوازی تو اس گھرانے کی خصوصیت ہے ..... میاں ساجد کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی اس حرکت سے آپ کو کتنی نفرت ہے کہ وہ ہر تیسرے روز نیا سوٹ پہن کر اور نئی ٹائی لگا کر کالج جاتے ہیں۔ اکڑ اکڑ کے چلتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ طالب علم ہیں اور مغرور بھی۔ آپ کو مغرور لوگوں سے نفرت ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ دنیا بھر کے تھانیداروں سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر اس وقت تو ساجد بے حد متواضع اور شریف الطبع انسان ہیں۔ کالج میں ویسے ہوں گے، آپ کو کالج سے کیا مطلب؟

آپ اور آپ کی قل ہو اللہ پڑھتی ہوئی آنتیں ہمہ تن انتظار بن جاتی ہیں۔ آپ نے ٹھان رکھی ہے کہ بس میاں ساجد کھانے کا ذکر چھیڑیں ابھی آپ مسکرا دیں گے۔ انہی باتوں پر غور ہو رہا ہے کہ میاں ساجد بلند آواز میں نوکروں کو کوستے ہوئے نیچے اترتے ہیں۔ سگرٹ کی چاکلیں کھا رہے ہیں آپ مسکراتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں صورت حال کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں ـــــ "معاف کیجئے گا۔ دیر ہو گئی میں کھانا کھا رہا تھا"

آپ کی قل ہو اللہ پڑھتی ہوئی آنتیں فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہیں!

"کیوں آج کہاں بھول پڑے"؟

آپ چاہتے تو ہیں کہ اس وقت بھاگ جائیں مگر آپ مسکرا دیتے ہیں۔

"یونہی چلا آیا" میں نے کہا "کئی دن سے ...

ون سکے اں بھی ہو آئیں۔"

میاں ساجد سنگترے کے چھلکے باہر پھینکتے ہیں۔ تپائی پر ٹانگیں رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور گھنٹہ بھر کے لئے آپ کو ہنسنا اور ہنسانا پڑتا ہے۔

اصل میں یہ سب باتیں اپنے "یکہ تاز" کے تجربے میں آسکتی ہیں۔ جو کسی ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم ہو اور کسی.... بلڈنگ کے ایک ایسے کمرے میں رہتا ہو کہ پورے کمپس کے لئے نصف کہیں اس کے علاوہ پاس کی مسجد کے غسل خانوں میں نہا لیا کرتا ہو۔ بیوی بچوں سے بے نیاز ہو۔ ایسے کردار میں ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ ہر مہینے کے پہلے دس دن بعد دوپہر دفتر سے ٹکٹ شاپ بلا ناغہ جائے یا دودھ پیتا ہے اور آخری بیس دن اسے فضول خرچی سمجھتے ہوئے قطعاً ترک کر دیتا ہے۔ اور اگر مہینہ اکتیس کا ہو جائے یا اگر مزید ستم یہ ہو کہ کم اتوار کو آن پڑے تو مہینے کا آخری دن چوبیس گھنٹوں کی بجائے تیس دن کا معلوم ہوتا ہے۔

ہاں تو مقصد خالی جیب کے مصائب بیان کرنا تھا۔ تصور فرمائیے کہ موسلادھار بارش ہو رہی ہے کڑاکے کی سردی ہے آپ اکڑے جا رہے ہیں ـــــ ٹھنڈی ہوا اور آپ کی جیب نے آپ کی زبان پر سنگین رکھ دی ہے کہ خبردار کہیں تانگے والے کو پکارا! آپ کوٹ کا کالر اونچا کئے گردن سکیڑے اور ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں دبائے سائیکل سٹینڈ کے نیچے ٹہل ٹہل کر سائنس کے لحاظ سے بارش پر غور کرنے لگتے ہیں ہاں اگر آپ سائنس پڑھے ہوں تو۔

ایک اور کیفیت ملاحظہ ہو ـــــ آپ اپنے کمرے میں بیٹھے کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ کتاب کا عنوان کوئی بھی ہو سکتا ہے مثلاً "دولت کمانے کے طریقے" یا "کامیابی بکتی ہے" یا "گھر بیٹھے روپیہ کمائیے" یا ـــــ "ہر مرغی سونے کا انڈا دے سکتی ہے" ـــــ اتنے میں میاں ساجد آپ کے کمرے کا دروازہ بوٹ کی ٹھوکر سے کھولتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ آپ سرخ ٹائی لگائے اور سفید گول بٹنوں والا نیلا سوٹ پہنے ہوئے ہیں۔ آپ ماتھے پہ رکھی ہوئی فیلٹ کو پیچھے سرکا کے بیٹھ جاتے ہیں اور سگریٹ کا کش لگا کر راکھ کو خاکدان میں گراتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہتے ہیں۔

"تانگے والا باہر کھڑا ہے ایک چونی دینا یار۔ میرے پاس پانچ کا نوٹ ہے۔"

آپ چپکے سے وہ چونی نکال دیتے ہیں جو آپ نے لانڈری سے کپڑے لانے کے لئے کئی دنوں سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔

ہم تو جھنجھلا اٹھتے ہیں جب کبھی خالی جیب ہونے کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ عجیب کڑھب صورتِ حال ہوتی ہے۔ غضب خدا کا آپ کوئی لاٹری کا ٹکٹ نہیں خرید سکتے جس پر آپ کی قسمت کو قلابازیاں لگانے کا موقع مل سکے اور آپ کم از کم اس آئے دن کی کوفت سے نجات پانے کی توقع کر سکیں۔

اور دیکھئے ـــــ آپ کے نام ڈاکیہ ایک خط لاتا ہے لیٹر بکس یا ڈیوڑھی یا زینے میں پھینک جانے کی بجائے کنڈی کھٹکھٹاتا ہے، کیونکہ خط بیرنگ ہے! آپ اسے چھڑانا چاہتے ہیں۔ ہم ڈاکئے نہیں لیکن پوچھتے ہیں ـــــ "صاحب! آپ کی جیب میں اڑھائی آنے ہیں؟" آپ ٹھٹھر جاتے ہیں اور لفافے میں کسی اینڈ کمپنی کا چیک مسکراتا ہے۔ آپ کی مزاج پرسی کرتا ہے اور ساتھ ہی معذرت چاہتا ہے کہ ملاقات نہیں ہو سکتی اور اگر خط محبت نامہ ہو تو پھر.... آپ پتہ لکھنے والے کا خط بھی پہچان جائیں ـــــ لمبی لمبی مرمریں انگلیاں، لمبے لمبے سرخ ناخن آپ کی آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ آپ غور کرتے ہیں۔ آپ کا اشتیاق اور بڑھ جاتا ہے محبت نامہ ہی ایک ایسی چیز ہے جو خالی جیب ہوتے ہوئے بھی تسکین کا باعث ہو سکتا ہے لیکن افسوس اس وقت آپ یہ تسکین نہیں پا سکتے۔ آپ کونے پر لکھے ہوئے "ب۔ س" پر انگلی پھیرتے ہیں۔ ٹکٹکی بندھ جاتی ہے مسکراتے ہوئے گلابی ہونٹ آپ کے سامنے ہیں۔ گول گول چہرہ۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ سبھی کچھ آپ دیکھ رہے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں ـــــ کیوں جی۔ ہمارے لئے ایک پانچ پیسے کا ٹکٹ نہیں لگ سکتا تھا؟ گلابی ہونٹ مسکراتے ہیں۔ آواز آتی ہے ـــــ "صاحب آپ بھول گئے کہ میں عورت ذات ہوں۔ ٹکٹ خریدنے کہاں ڈاک خانے تک ماری ماری پھرتی" ـــــ آپ لفافے پر لگی ہوئی مہروں کو چھو بھی سکتے ہیں۔ اسے ہاتھوں میں لے کر دبا بھی سکتے ہیں۔ اور ہماری نظر بچا کر اگر چاہیں تو چوم بھی سکتے ہیں مگر کسی حالت میں اسے کھول نہیں سکتے ـــــ بے بسی کی کتنی اشتعال انگیز کیفیت ہے ـــــ ذہنی اور جسمانی کوفت کی معراج ـــــ اڑھائی آنے سی رقم مانگتے شرم محسوس ہوتی اور دس روپے کوئی دیتا نہیں۔ ایسے موقعوں پر آپ چاہتے ہیں کہ سوشلسٹ بن جائیں یا.... یا کلیجہ میں خنجر گھونپ لیں ـــــ کہاں کہاں آپ خالی جیب کا مرثیہ کہیں گے۔ ہر قدم پر اس کا امکان ہے۔

ذہنی اور جسمانی مشکلات خالی جیب کا تقیہ تو ضرور ہیں لیکن آپ

نہیں بھول سکتے کہ خیالات کی بلند پروازی بھی خالی جیب ہی کی خصوصیت ہے۔ آپ کے ذہن میں کسی بھی ہوائی قلعے کی تعمیر ہو، خالی جیب اس تصور کو سہارا دیتی ہے اور محل کھڑا کرنے میں بجلی کی سی سرعت سے آپ کی مدد کرتی ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ عنقریب آپ ایک عدد سانبر کا بوٹ خریدیں گے۔ ایک سوٹ سلوائیں گے —— سبزی مائل سیاہ دھاریوں والا۔ دعوتوں میں آپ سلوا پہن کر جائیں تو آپ سے محض اس لئے کوئی بات نہیں کرتا کہ ہر دیکھنے والا یا تو آپ کو کسی ہائی سکول کا فارسی معلم تصور کرتا ہے یا پھر اردو کی اخباری دنیا کا نمائندہ۔ آپ حق لگتی کہیں کہ دونوں قسمیں باتیں کرنے کے لائق ہیں؟ . . . آپ کی منگنی ہو چکی ہے۔ آپ اپنے نسبتی بھائیوں سے اس لئے کتراتے ہیں کہ آپ کے کوٹ کی کہنیاں پھٹ چکی ہیں۔ اور جب آپ سانبر کا بوٹ اور سبزی مائل سیاہ سوٹ پہنیں گے تو آپ اپنی منگیتر کے ہر رشتہ دار کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مل سکیں گے۔ . . . اور سوٹ کے ساتھ کالر کا ہونا بھی لازمی ہے۔ وہ بھی آپ خرید لیں گے —— اور منگیتر کے لئے کوئی تحفہ —— ایلکنسن ہیر آئل —— اونہہ! —— ایوننگ ان پیرس! ——

آنے والی رقم میں سے پچاس فی صدی کتابوں کے خریدنے پر صرف کیا جائے گا۔ کتابیں مانگی جائیں تو آپ پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اگر اپنی خرید ہوں تو سہولت یہ ہے کہ جو بزرگ ہر آٹھویں روز آپ کی کتابوں کی تلاشی لینے آتے ہیں۔ ہر ان پڑھی کتاب کو بھی پڑھی سمجھ لیتے ہیں۔

آپ کو نیموا اور چھیمو کا خیال آتا ہے —— ان کے لئے کھلونے . . . مٹھائی . . . . انہیں سیر بھی کرائیں گے . . . . اور بھاوج کے لئے مچھلی کے پکوڑے . . . ستیا کے لئے چاندی کے خوبصورت کانٹے . . . .

ایک اور پہلو۔ ریڈیو سٹیشن پر بھیجا ہوا آپ کے کسی ڈرامے کا مسودہ (جس کے دوبار نشر ہونے پر آپ کو چالیس روپے کا چیک ملنے کی امید تھی) شکریے اور افسوس کے ساتھ واپس آ جاتا ہے —— یا کسی رسالے میں بھیجی ہوئی کہانی (جس کا آپ نے معاوضہ طلب کیا تھا) ناقابل اشاعت کے فارم کے ساتھ لوٹ آتی ہے۔ اب آپ سوچتے ہیں کہ آپ ہی کم درجے کے ادیب ہیں یا ریڈیو والے اور رسالوں کے ایڈیٹر کور ذوق۔ آپ الجھ کیوں گئے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ریڈیو والے اور رسالوں کے ایڈیٹر اور ذوق سلیم دو متضاد چیزیں ہیں۔ ریل کی پٹڑی کی دو لائنیں ہیں جو ملتی نظر آتی ہیں لیکن کبھی ملتی نہیں اور جہاں تک آپ کی تخیلات کا تعلق ہے —— سبحان اللہ!

امجد حسین

شعر

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

غالب

موت

"کون آوارہ ہواؤں کا سبکسار ہجوم؟
"آہ احساس کی زنجیر گراں ٹوٹ گئی
"اور سرمایۂ انفاس پریشاں نہ رہا
"میرے سینے میں الجھنے لگی فریاد مری
"زنگ آلود محبت کو تجھے سونپ دیا،
"کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
"ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ نگاہوں کا چراغ"
"اس قدر ہوش سے بیگانہ ہوئے جاتے ہو!
"تم چلی جاؤ، یہ دیوار یہ کیا ہے رقصاں
"میرے اجداد کی بھٹکی ہوئی روحیں تو نہیں؟
"پھر نگاہوں پہ امنڈ آیا ہے تاریک دھواں
"ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ یہ مایوس چراغ
"آج ملتا نہیں افسوس پتنگوں کا نشاں
"میرے سینے میں الجھنے لگی فریاد مری
"ٹوٹ کر رہ گئی انفاس کی زنجیر گراں،
"توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
"اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا!"
"جی الجھتا ہے مری جان پہ بن جائے گی"!
"تھک گیا آج شکاری کی کماں ٹوٹ گئی!
"لوٹ آیا ہوں بہت دور سے خالی ہاتھوں
"آج امید کا دن بیت گیا، شام ہوئی
"زندگی، آہ یہ موہوم تمنا کا مزار
"میں نے چاہا بھی مگر تم سے محبت نہ ہوئی"
"کہہ چکے اب تو خدا کے لئے خاموش ہو!"

"ایک موہوم سی خواہش تھی فلک چھونے کی
"زنگ آلود محبت کو تجھے سونپ دیا
"سرد ہاتھوں سے مری جان مرے ہونٹ نہ سی!
"گر کبھی لوٹ کے آجائے وہی سانولی رات
"خشک آنکھوں میں جھلک آئے شب سوختنی،
"زلزلہ، اف یہ دھماکا یہ مسلسل دستک
"بیکراں رات کبھی ختم بھی ہوگی کہ نہیں!
"اف یہ تاریک فضاؤں کا المناک سکوت
"میرے سینے میں دبی جاتی ہے آواز مری
"تیرگی، اف یہ دھندلکا مرے نزدیک نہ آ
"یہ مرے ہاتھ پہ جلتی ہوئی کیا چیز گری!
"آج اس اشک ندامت کا کوئی مول نہیں
"اب تو احساس کی زنجیر گراں ٹوٹ چکی،
"اور یہ میری محبت بھی تجھے جو ہے عزیز
"کل یہ ماضی کے گھنے بوجھ میں دب جائیگی!
"کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو
"کیا خبر وقت دبے پاؤں چلا آیا ہو،
"زلزلہ، اف یہ دھماکا یہ مسلسل دستک'
"کھٹکھٹاتا ہے کوئی دیر سے دروازے کو
"اف یہ تاریک فضاؤں کا المناک سکوت
"کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو
"توڑ ڈالے گا یہ کمبخت مکاں کی دیوار
"اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا"!

اختر الایمان

میلہ گھومنی

کانوں کی سُنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں۔ اپنے ہی دیس کی داستان ہے، گاؤں گھر کی بات ہے۔ جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے رکھئے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا! ۔۔۔

دو بھائی تھے چتو منو نام، کہلاتے تھے پٹھان، مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا، اور دادیہال سیدواڑے میں۔ ماں پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کاج کرنے آتی تھی، ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لئے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چتو اور منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر تقویٰ بجنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چتو منو کی پرورش کے لئے کچھ کھیت دیئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے۔ اچھے ہاتھ پاؤں نکالے۔ چتو ذرا سنجیدہ تھا، ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا۔ اور ہم سن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا، اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لئے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چتو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی، ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آکر ایک دن اُس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ نکالے لجاتی سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی، تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا اُس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں توڑ دیں گے۔ اس نے آہستہ سے کہا "تو میں کیا کر سکتی ہوں، آپ ہی چتو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑے سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنانخانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہیں دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی۔ اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے صورت شکل دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اسی کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیدانی بی ان درزی کے حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی دلہن سدھاری تھی۔ اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیّدانی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا "اچھا گھر میں رہو اور کام کرو، دو چار دن میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کر دوں گی۔"

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے فوراً ہی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے اس کی تاریخ یوں بیان کی "راویان صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کنجڑن، کنجڑن سے درزن اور اب سیّدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔" ایک صاحب نے پوچھا

[1] یہ لفظ میں نے بنایا نہیں ہے بلکہ یوپی کے دیہاتوں میں عام طور پر رائج ہے۔ اور جس طرح کی عورت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح کی ایک عورت اس کہانی [illegible]

اور اس کے بعد ؟ - وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولیں "خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑ جائے گی!"

میر صاحب جب گھر میں آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفا کے گھر میں! وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلے میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اُسے معصیت کی طرف دھکیلتے ہیں پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا ہے اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی سی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلا کر انہوں نے اسے نادر شاہی حکم دے دیا کہ "ہم نے منو کی نسبت طے کر دی، اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہو گا۔" بے چاری جولاہن کو چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی، اس لئے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔

جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی، لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انہیں کا دیا ہے، چنو کی نوکری انہیں کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوتی میں کھیت بھی انہیں کے ہیں۔ پھر لالچ بھی تھا۔ اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے۔ غرض گھر آئی اور اس نے رات کو منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اُسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا، جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا، دلھن کو شہانا جوڑا اور چند چاندی کے زیورات اُن کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دیئے اور دلھن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتنے لگے، بیتتے گئے، مہینے ہوئے، ایک سال ہونے کو آیا، مگر منو اور اُس کی دلھن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی جھٹکے میں اچھے ہو گئے۔ کہ دفعتاً ایک دن پھر جولاہن روتی بسورتی پہنچیں ... پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے۔ اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتارتا ہے، اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید یہ عادت نہ پڑنے پاتی، جولاہن سوائے "ممتا" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دے دیا "آج سے یہیں رہو، گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر نہ تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑہ ادھڑ جائے گا!" ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا!" غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی۔ اور تاڑی بند ہو گئی۔ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی، اور تاڑی بند ہونے کے چھ مہینے بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار رہنے لگا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں اور منو بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیئے تو انہوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھلتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انہوں نے کلّہ بہ کلّہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی، جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کے اٹھا اور لڑکھڑا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات دی کہ وہ ہائے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمار داری میں مشغول رہیں لیکن بلغم کے ساتھ اب تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر گور میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا اور بین ہونے لگے۔ ساس بہو میں اسی میں مقابلہ تھا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ دن تو اس طوفان میں طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آ کر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلاب غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتہ

زابست ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتہً چنو کی بیوی قبل از وقت، مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جملا بن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدہ کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ حسب معمول بیان ہوئے تنہائیوں کا ذکر چھیڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخ روئی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انہوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا۔ اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک کیل کی طرح بجھتی رہیں، پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کے بیٹے سے بولیں "چل رے گھر چل! اپنا مانگ میں سیندور میرے سامنے بھر دینا وہ اب تیری بیوی ہے۔ میں خوش، میرا خدا خوش!" — چنو نے ماں کا کہنا کیا مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا اور اپنے چاروں بچے سمیت اسی گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو مہینے بیتے، تین مہینے بیتے، اگر چوتھے مہینے چنو کی کمر میں اچک آ گئی۔ اکڑنا، بر رنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ ہم سن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے۔ ان کو دکھایا۔ انہوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دنوں اثر رہا۔ بدقسمتی سے حکیم جی ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے بس چنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔

ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا، مگر افیون کی خشکی نے دبوچا۔ بی مینا بیگم مانگتی ہیں دودھ، گھی، مکھن، ملائی، اور یہ چیزیں چار روپے کی نوکری میں کہاں نصیب؟ لگا کیسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور ٹھیس کھانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا وہ بھادیں نہ سماتا۔ اور افیون کی لت پڑ ہی چکی تھی۔ وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی اٹھنے لگی۔

ایک دن چنو ہی کے سلسلے میں جب پو پھٹا باندی ہو رہی تھی اور ماتا پڑنے والے ہی تھے کہ چنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلے میں حاضر تھا۔ ڈیلیا پر تن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور وہ تڑاقا ہوا کہ جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کے اٹھا، مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے اماں! ارے اماں!" چیختا دوڑا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا، دم گھٹا جا رہا تھا، مگر پاؤں پٹنے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا، سنبھلتا، پھسلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بکری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بے دم گر پڑا اور اسی کی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو!" کہتی ہوئی دوڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا "اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا!" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کنبہ کا میلو گھو منے الہ آباد چلی گئی!

سید علی عباس حسینی



تار کا پتہ: ہمدرد دہلی — ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب سرپرست ہندوستانی دواخانہ

کی

تین تیر بہدف دوائیں

نمبر ا۔ سم سم } مردانہ قوت کی لاثانی دوا ہے۔ بچپن اور جوانی کی غلط کاریوں کی ایک مفید ترین دوا ہے۔ ہزارہا مریضوں پر تجربہ کرنے کے بعد یہ دوا ہندوستانی دواخانہ کو عطا کی گئی ہے ترکیب استعمال ایک قرص سوتے وقت دودھ کے ساتھ قیمت پندرہ قرص ۱۲ر

نمبر ۲۔ اکسیر باہی } جو لوگ جوان ہو کر جوانی کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتے یا بڑھاپا آجانے کی وجہ سے ازکار رفتہ ہو چکے ہیں ان کے لئے یہ دوا اکسیر کا حکم رکھتی ہے اور اس کے چند روزہ استعمال سے بجلی کی طرح جسم میں حرارت دوڑنے لگتی ہے۔ ترکیب ایک یا دو قرص صبح و شام دودھ کے ساتھ استعمال کریں قیمت ۳۲ قرص کی ایک شیشی ۲ر

نمبر ۳۔ اکسیر نسوانی } جو عورتیں سیلان الرحم (رطوبت جانا) کے مرض میں مبتلا ہیں اور گھل گھل کر اپنی زندگی کے دن گذار رہی ہیں۔ علاج کرتی ہیں اور فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک مرتبہ اس دوا کو استعمال کر دیکھیں کہ اس کے چند روزہ استعمال سے برسوں کا مرض کس طرح رفع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ترکیب دو قرص رات کو سوتے وقت دودھ کے ساتھ کھائیں تیل اور ترش اشیا سے پرہیز قیمت ایک شیشی ۸۰ قرص ۲ر

ملنے کا پتہ:۔ **مینیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی**

دی سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ

آپ ہمارے ہاں ہوم سیونگ سیف اکاونٹ کھول کر ہماری انشورنس سکیم سے فائدہ اٹھایئے

ہول لائف اور اینڈومینٹ پالیسی طبی معائنے کے بغیر جاری کی جاتی ہیں

قسط کی شرح کم سے کم ہے ——— معقول بونس کا اعلان کیا گیا ہے

خواتین کی زندگی کا بیمہ بغیر کسی زائد خرچ کے کیا جاتا ہے

تفصیلات اور پراسپکٹس کے لئے سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ کی کسی شاخ کو لکھئے یا ذیل کے پتے سے طلب فرمایئے

سکرٹری دی ڈیپازیٹرز بینیفٹ انشورنس کمپنی لمیٹڈ

بروس سٹریٹ فورٹ بمبئی

ایس سی کپٹن

منیجر

ایس آر چار یوالہ

سب ایجنٹ پنجاب اور صوبہ سرحد برانچز

دو غزلیں

(۱)

راگنی دل کی بہت گائی گئی ہے پہلے
تاہم اختر جو تجھے کہنا ہے تو بھی کہہ لے
زندگی بھر کی اذیت ہے یہ جینا یارب!
ایک دو دن کی مصیبت ہو تو کوئی سہہ لے
ناز فرما ہے تمنائے جواں یوں دل میں
جیسے دوشیزہ کوئی صحنِ چمن میں ٹہلے
بہت خاموش ہو کیوں اے شبِ غم کے تارو
کوئی قصہ ہی سناؤ کہ ذرا جی بہلے
بزمِ انجم ہمہ تن گوش ہے اس وقت اختر
اپنی ناکام محبت کی کہانی کہہ لے

(۲)

محبت کی سوزش سے خالی ہے سینہ
یہ جینا بھی ہے کوئی جینے میں جینا
یہ ساون کی رنگینیوں کا مہینہ!
خوشی کے بھنور میں ہے غم کا سفینہ
امنگ اپنے دل میں ہے جیسے چمن میں
کھڑی مسکراتی ہو کوئی حسینہ
محبت بھرا دل بھی کیا شے ہے یارب!
کبھی سنگِ خارا، کبھی آبگینہ
یہ شبنم ہے اختر کہ فرطِ حیا سے
جھلکتا ہے گل کی جبیں پر پسینہ

اختر

گندے انڈے

"یار آج وانا پور رجمنٹ اور ٹاؤن اسپوٹنگ کا میچ ہے۔" کلّو نے عیدو نانبائی سے کہا۔

"سچ کہو یار کلّو کام تو سالا سودن کا ہے۔ ہم میچ ضرور دیکھیں گے۔ کمروا کو دکان پہ بٹھا دیں گے۔" عیدو بولا

دس بجے دن کو عیدو نانبائی کی دکان کے سامنے باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ سن رسیدہ لوگ، جوان، چھوکرے۔ نانبائی کی دکان محلے بھر میں بہ یک وقت کلب، ریڈنگ روم اور کونسل ہال کی حیثیت رکھتی تھی۔

کلّو اس حلقے میں سب سے زیادہ باخبر شخص تھا۔ یہاں اس کی حیثیت صدر کی سی تھی۔ محلے میں اس کا اثر تھا۔ کلّو اور عیدو لڑکپن کے دوست تھے۔ اس ادھیڑ عمر میں بھی ان کی نبھی جا رہی تھی۔ عیدو نیں پشت سے نانبائی تھا اور اس نے اپنے بیٹے قروا کو بھی اسی کام پر لگایا تھا۔ مگر وہ ذرا کھلنڈرا تھا۔ لونڈوں کے ساتھ لٹو، پتنگ بازی، تاش میں وقت گزارتا رہتا تھا۔ کلّو کا باپ حقہ مرمت کیا کرتا تھا۔ اس کی تو اچھی گذر گئی۔ رئیسوں کے یہاں پہنچ تھی۔ وہ حقہ چڑھانے میں بھی ماہر تھا۔ اس کام میں اسے فن کاری کا درجہ حاصل تھا۔ تمباکو کی قسمیں، چلم کے اقسام، سرپوش کے سائز، حقوں کے انواع، حقہ نوشوں کے مزاج کی نوعیت، موسم کا اثر حقہ اور اس کے متعلقات پر، ان سب باتوں کے متعلق "میر صاحب" کی واقفیت حیرت انگیز تھی۔ وہ محلہ کیا شہر بھر میں "حقہ والے میر صاحب" کے نام سے خاص و عام میں مشہور تھا۔ جب تک اس کی کمر خم نہیں ہوئی تھی وہ اپنے محلے کے اکھاڑے میں استادی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ لکڑی، لاٹھی، گدکا، بنگنیٹھا، بنوٹ، تلوار، رومالی ہر فن میں وہ طاق تھا۔ سن کے دیکھنے کے قابل تھا۔ اپنے بیٹے کلّو کو بھی اس نے اپنے فنون سکھانے چاہے لیکن وہ لڑکپن سے شریر اور بھگوڑا تھا۔ اسے دنگل، بھیڑے کی لڑائی، بٹیر بازی، فٹ بال میچ اور نوٹنکی کا شوق تھا۔ محرم کے اکھاڑوں میں نام پیدا کرنے کے لئے اس نے باپ سے لکڑی، گتکا، تلوار کے ہاتھ تو سیکھ لئے لیکن حقے کے فن سے اسے نفرت تھی اور ہمیشہ رہی۔ "میر صاحب" پر بڑھاپا طاری ہوتا گیا اور پھر سگرٹوں کی وہ دھواں دھار ہوئی کہ حقے کی گرم بازاری سرد پڑ گئی اور میر صاحب کا پیشہ ماند پڑ گیا۔ کلّو اپنے دوست عیدو نانبائی کی روٹیاں بیچ کر اپنے کنبے کا پیٹ پالنے پر مجبور ہو گیا۔ مگر اس کا خیال اونچا تھا اور اس کی ناک اس کے خیال سے بھی زیادہ اونچی تھی۔ وہ صرف افسروں کی کوٹھیوں پر جا کر پاؤ روٹیاں اور کیک فروخت کیا کرتا تھا۔ پھر شام کو بنگلوں کی خبریں خوب نمک مرچ لگا کر دکان پر سناتا۔

"یار عیدو! ہم تو لاکھ برس گلیوں میں پھر کر در بدر روٹیاں نہ بیچیں اللہ کی قسم کوٹھیوں پر جو عزت ہے سو کہیں نہیں! باورچی، بیرا، مالی، خانساماں سب بھلے سے بولے ہیں اور میم صاحب بھی ہنس ہنس کر بات کرے ہیں..."

"ایں بھائی کلّو میم صاحب لوگ بھی....؟" رحمو باورچی حیرت اور حسرت سے آنکھیں مٹمٹانے لگتا۔ "ارے رحموا اب کا!" کلّو سرپرستانہ انداز میں کہتا۔ "ولایت کے صاحب لوگ تو یہاں سے بہت چلے گئے تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اب تو بنگالی بابو کی چلتی بنتی ہے۔ ایک آدھ اپنے دیس کے لوگ بھی ہیں کچھ مسلمان ہیں کے [illegible] افسر ہو گئے ہیں مگر [illegible] اچھے ہوشے ہیں سرکاری ٹھاٹھ باٹھ ہے سرکاری پہ کافی زور دیتے ہیں۔"

شبراتی قلعی گر معاملہ فہمی کے ساتھ اپنا چند [illegible] اور عیدو [illegible] کے دو تین کش لگاتار لے کر قروا کو پکارنے لگتا۔ ہر دس بارہ منٹ کے بعد وہ اپنے بیٹے کے شجرہ نسب کے متعلق نئی نئی تحقیقات کا اعلان

کرتے ہوئے اُسے آواز دیا کرتا تھا مگر اُس کا سعادت آثار فرزند ہمیشہ مفقود الخبر ہی رہتا۔

. . . .

"ہم تو اپنے شہر کے ماڈن اسپوٹنگ کی طرف ہیں۔ یار عیدو۔ رجمنٹ والے سالے بوٹ پہنے کھیلے ہیں۔ سالے کرنٹے!" کلّو نے کرنٹے اس طرح کہا کہ وہ دنیا بھر کے کرنٹوں کا گلا گھونٹ کر ہی تو جیسے رکھ دے گا۔

"اُوستاد! کہو تو حربہ ہتھیار ساتھ رکھ لیں۔ پولیس سالا کیا کرے گا!" رمضیان گاڑیبان نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔

"نہیں رے رمضیان! ہم نہتّے سالے گوروں پر بھاری ہیں" کلّو نے اپنے آبائی فن کے زعم میں کہا۔

"نہیں بھائی لڑائی بھڑائی ٹھیک نہیں۔ گورا چمڑا ہی حاکم ہے۔"

خیراتی درزی نے اپنی نوکیلی داڑھی ہلاتے ہوئے رو پہلے بیضوی چشمے کے اوپر سے مشورہ دے کر اپنی اہمیت ثابت کرنی چاہی۔

"ہاں کھلیپھ! ٹھیک بات ہے۔" عیدو نے تائید کی۔

"ارے اِن کرنٹوں کی مرمّت تو کلکتہ میں ہووے ہے کلکتہ میں۔ محمڈن اسپوٹنگ کے میچ میں جُما کھان اور سالویان سالے حرامجادوں کو ایسا لیتاوے ہیں، اتنا بھتر مارے ہیں کہ بتھری بھور۔ یس ویری وَل دُم کی راہ سے نکل جاوے ہے۔" جمع پر اُس کے کلکتہ رٹرنڈ ہونے کا رعب پڑا اور خود اُس کے جذبۂ انتقام کو تسکین ہوئی۔ بات یہ تھی کہ کوٹھیوں پر وہ صاحب لوگوں سے اکثر جوتوں کی ٹھوکریں اور ہنٹر کی مار کھا چکا تھا۔ جلی ہوئی پاؤ روٹی یا باسی کیک سپلائی کرنے پر اُس کی ایسی تواضع اکثر ہوئی تھی۔ مگر محلّے میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے وہ صاحب اور میم صاحب لوگوں کی بہت بڑائی کیا کرتا تھا۔ کلّو کی اپنی طاقت اور باپ کی اُستادی کے سبب محلّے والوں میں اُس کی قدر تھی اور وہ اس قدر میں ہمیشہ اضافہ کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اُس میں ترقی کرنے کی زبردست خواہش پائی جاتی تھی۔ شاید یہ نوجوانی کی لاپروائی کا نفسی کفارہ تھا۔

"بھائی ہم لوگ کبھی محمڈن کا میچ نہیں دیکھا۔" عیدو نے بڑی حسرت سے کہا۔

"ارے یار عیدو! ہم بھی کیا آدمی ہیں۔ کلیّے چٹرجی بابو کی کوٹھی پہ ریڈیو کا کھبر تھا کہ محمڈن اسپوٹنگ اور موہن بگان کا میچ ہیاں ہو گا۔ ہم بھول گئے تم سب کو کہے کو۔"

"آئیں محمڈن کا!" ہر طرف سے حیرت زدہ آوازیں آئیں۔ "ہاں ہاں! محمڈن اسپوٹنگ کا میچ۔ موہن لگان سے۔" کلّو نے نہایت تیقن سے کہا۔

"ہاتھ لاؤ اوستاد! سچ! محمڈن کا میچ؟" رمضیان گاڑیبان تو آپے سے باہر ہُوا جا رہا تھا۔

"ارے یار کلّو کب ہے میچ۔ جلدی سے بتاؤ نہ!" عیدو نے بیقراری سے دریافت کیا۔ اور اُسے خیال آیا کہ اس روز بھی قمروا کو دُکان پر بیٹھانا پڑے گا۔ "ارے الّو کا پٹھا کھب بھیس کا جنا حرامجادہ سوّر کا بچہ! دن بھر لٹّو کھیلے گا رے۔ !ارے کمروا! کہاں گیا رے!۔ دو گھڑی تو دکان پر بیٹھا کر کس ساہت کا پیدا ہے رے......"

عیدو کی نسلی تشریحات اور جنسی انکشافات کا سلسلہ ذرا لمبا جا رہا ہے اور اُدھر یاروں کے پیٹ میں محمڈن اسپورٹنگ اور موہن کے میچ کی تاریخ جاننے کے لئے چوہا کود رہا تھا۔

"ارے جانے دو عیدو بھائی۔ لڑکا ہے لڑکا..... ہاں اُستاد کب ہے میچ۔! یار کسمت کھلی ہے۔" رمضیان نے دریافت کیا۔

"آج لیبر ع شِلڈ کا فائنل ہے اور کل بس کل محمڈن کا چلی میچ ہے۔ سُنا ہے لڑائی کے لئے چندہ جمع ہو گا۔ سرکاری سکرٹری کے افسر کبیر صاحب کہہ رہے تھے!"

"کیا کہیو بھائی! کل؟ ایں کل!۔ تو سرکاری میچ ہوا نہ!" عیدو بولا

"تو اور کا! کبیر صاحب بولے۔ میاں کلّو! تم کو تو میچ کا بہت شوق ہے۔ محمڈن کا میچ ہو گا اور آٹھ آنہ فی کس ٹکٹ! ہم کہا کہ سرکار کی چندگی چاہیے میچ تو جرور دیکھیں گے۔ بھائی! یہ سپرڈنٹ صاحب بہت اچھے ہیں۔ ہر دم کہیں، لڑکے کو پڑھاؤ لڑکے کو پڑھاؤ۔ انہیں کے کہے سُنے سے تو اُسگروا کو ہم پڑھنے کو بٹھا دیا۔ کون جانے شبراتی میاں کسمت کے بیچ ہم سب کا دن اُسگروا کے بہانے ہی پلٹ جائے۔ میر صاحب کے گُذری پر کے مَن نواب صاحب بات چیت کیا کرتے تھے۔ کیسی گُدر بات تھی۔ اور آج یہ دن ہے۔ پاک پروردگار کی گُدرت۔ اللہ اُس کی سان دیکھو۔ نواب صاحب کی دیوڑھی بھی آباد نہیں رہی اور کل کے بھیس آج کے رہیں بن گئے ہیں۔ اللہ کی گُدرت ہماسا کس گنتی میں ہیں

اور اُس کو قسمت پلٹتے بھی دیر نہیں۔"

خیراتی درزی اور شبراتی قلعی گر نے حمدا رسول کی بات سُن کر متاثر ہونے کی کوشش کی۔ اللہ اور پیر پیغمبر کی باتیں جب ہوں تو ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔ "ہاں بھائی۔ پاک پروردگار سب کا مالک، جو چاہے کرے" شبراتی نے پھیپھڑوں کی گہرائی سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ اُس کی چندیا کچھ زیادہ چمک اُٹھی۔ "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارا" خیراتی درزی نے اپنی نوکیلی داڑھی کو سر کے ساتھ داہنے بائیں وجدانی انداز میں جنبش دی۔ رمضانی کچھ اُکتا سا گیا اور اعصابی تناؤ کو دور کرنے کے لئے اُس نے گلی کی طرف نگاہ کی جہاں بھاری سینے والی ایک عورت ترکاری کا ٹوکرا اٹھائے تیزی سے جا رہی تھی۔ رمضانی نے ایک انگڑائی لی اور بولا۔

"تو اُستاد آٹھ آنے پچیس پیچ کی"۔ اُس کے ذہن میں چوک کے محاذ پر پیشہ کرنے والی کسبیاں تھیں۔ وہ پیچ اور کسبیوں میں موازنہ کر رہا تھا اور عیدو، قمرو اور اصغرا کے مستقبل کا مقابلہ کر کے اپنے دوست کلو سے جل رہا تھا۔

"آٹھ آنے کی کا ہستی ہے۔ پیچ کے کھلاڑی ملک میں نامی۔ سات سمندر پار تک ان کے نام کا ڈنکا بجے ہے۔ جو ہو سو ہو پیچ تو جرور دیکھا جائے اور بات جب ہے کی محلے سے ساری پارٹی چلے۔" حامی تو سب نے بھر لی مگر اٹھنی جیسے حلق میں اٹکی جاتی ہو۔ عیدو تو کیک کے ساتھ اُسے کوشش کر کے نگل گیا۔ شبراتی اور خیراتی اُس کی خلش بری طرح محسوس کرتے رہے۔ رمضانی نے اُسے وقتی طور پر ٹن سے اڑا دیا اور اُس کے تعاقب میں خود بھی خیالات کی فضا میں پرواز کرنے لگا اور کلو صاحبوں کے بنگلوں کے درمیان گھومنے لگا۔ اٹھنی ذرا سخت تھی۔

. . . .

کلو کو پیچ دیکھنے کا بے حد شوق تھا مگر آٹھ آنے خرچ کر کے پیچ کر دیکھنا اُسے بھی اکھر رہا تھا۔ اس کے لئے آٹھ آنے کی رقم بہت تھی۔ جب سے بڑے بڑے ہوٹل کھل گئے تھے۔ "ٹریجس"، "ڈانس"، "گرانڈ ہوٹل" وغیرہ، پرانے طرز کے نانبائیوں کی دکانیں پیچھے کر رہی تھیں۔ کلو کو یہ بات کبھی سمجھ نہ آئی کہ صاحب لوگ اور اُن کے نقال بابو لوگ اونچی دکانوں اور کمپنیوں پر کیوں ریجھے رہتے ہیں۔ پکانے والے تو ہر جگہ نانبائی ہی ہوتے ہیں۔ کلو کی طبیعت میں اُبھرنے کی خواہش بہت تھی۔ اس نے بھی ٹوکری اور خوانچہ ترک کر دیا اور گرانڈ ہوٹل کی نقل میں ایک بڑا سا بکس بنوا لیا تھا جس کی کریم پینٹ سے اُس نے "سیٹی بیکری" بہت ہی نمایاں پھولدار خط میں لکھوایا تھا۔ پہلے پہل جب وہ "سیٹی بیکری" لکھا ہوا بکس اٹھا کر کوٹھیوں کو طواف کے لئے چلا تھا، تو وہ اپنا سر کتنا اونچا محسوس کر رہا تھا اور اس کی گردن کی رگوں میں فخر و انبساط کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اُس روز اُس نے بہت سے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ چلتے پھرتے کے خواب۔ اُس نے یہ شیخ چلی کے سے خواب نہایت سنجیدگی سے دیکھے تھے۔ شیخ چلی ہمیشہ سنجیدہ ہی ہوتا ہے۔ اُس کی سنجیدگی ہی تو دُنیا والوں کے لئے مزاح اور اُس کے لئے درد و سوز پیدا کرتی ہے۔ اُس نے ایک کیک سے ابتدا کی اور کیک کے اوپر کیک رکھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کا اپنا ایک بہت بڑا گرانڈ ہوٹل بن گیا۔ اُسی روز اُس نے یہ بھی طے کر لیا کہ اصغرا کو پڑھا لکھا کر وہ افسر بنائے گا۔ اُس نے محلے کے مدرسے میں اپنے بیٹے کو بٹھا دیا اور اُس کے مکتب کے وقت مولوی صاحب اور محلہ والوں کا منہ بھی میٹھا کیا۔ مگر ہوا یہ کہ کلو سے مدرسے کے مولوی صاحب کا ماہانہ مشاہرہ بھی ٹھیک سے نہ چل سکا۔ پہلے تو اُس نے جوش میں بڑی باضابطگی دکھائی لیکن جب بڑے ہوٹلوں کے مقابلے میں اُس کا بیوپار گرنے لگا تو مہینے خالی جانے لگے۔ مولوی صاحب تقاضا تو نہ کرتے تھے لیکن جس مہینے میں مشاہرہ نہ ملتا وہ اصغرا کو بری طرح پیٹتے۔ حالانکہ وہ تیز اور شوقین لڑکا تھا۔ اظہارِ خیال کا یہ طریقہ خاصا پُر اثر ہوتا ہے۔ مگر پیٹنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جب خالی مہینوں کی تعداد زیادہ ہونے لگی تو مولوی صاحب کلو سے اکثر کہنے لگے۔ "میاں کلو اصغرا نہایت کند ذہن ہے۔ بالکل کندۂ ناتراش۔ اس کے ساتھ سر کھپانے سے کیا فائدہ۔ مدرسے سے ہٹوا لو اس بچے کو"۔ کلو اس کا مطلب ٹھیک وہی سمجھا جو مولوی صاحب سمجھانا چاہتے تھے مگر اس کی اپنی حالت تو یہ تھی کہ "سیٹی بیکری" کا بکس محض نام ہی کا رہ گیا تھا۔ یوں محلے والوں پر تھوڑا رعب ضرور پڑتا رہتا تھا۔ وہ تو اب بنگلوں پر انڈے اور جوزے سپلائی کیا کرتا تھا اور وہ بھی چُپ چاپ۔ "سیٹی بیکری" کی مینجری سے گر کر وہ مرغی والا ہرگز کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اُس نے کلکتے جا کر بھی قسمت آزمائی کر دیکھی۔ کلکتہ لاکھ بڑا سہی لیکن ساری دنیا تو اُس میں سما نہیں سکتی۔

"پانی چلے گی تو پھر میرا جانا بھی جروری ہے"، کلو نے سوچا "ہم محلے کے [?] بات ہی کا ہے کو نکالا"۔ اب مگر اب تو وقار کا سوال تھا۔ کچھ ہو جائے ناک اونچی رہے۔ دن بھر کلو نے اپنے ذرائع سے انڈے اور چوزے

جمع کرائے۔ انہیں بڑا کر کوٹھیوں اور بنگلوں پر گیا اور جتنا ہو سکا کل پرسوں کے وعدے پر ادھار بیچ آیا۔ پھر بھی آدھے کے قریب انڈے اور چوزے بچ ہی رہے۔ اس تجارت میں اس کا اجارہ تھوڑا ہی تھا۔ بہر حال اُسے باورچیوں اور بیروں کی خوشامدیں کرنی ہی پڑتی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ ٹیڑھی کھیر ہندوستانی میم صاحبائیں ہوتی ہیں۔ ان کی کچ کچ سے عاجز تھا۔ ایک تو دام ساڑھے، مول مولائی کرنے میں وہ چمر چٹ ہوتیں، دوسرے خریداری کم کرتیں اور سب بالطرہ یہ کہ انڈے اگر گندے ہوں گے تو واپس کئے جائیں گے، دام کٹے گا، خریداری بند کی جائے گی وغیرہ کا الٹی میٹم۔ اب مصیبت یہ کہ زیادہ ہندوستانی افسر ہی مقرر ہوتے جا رہے تھے اور ان کی بیویاں بیگم صاحب یا مہارانی تو ہوتی نہیں۔ بلکہ نقلی میم صاحب لوگ بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہر بات میں اُن کا دخل ضروری۔ دھوبی، حجام، مہتر، سے وہ مُنہ لگیں۔ روٹی والے، پھل والے، مُرغی والے، انڈے والے کا دین و دنیا خراب اُن سے۔ نوکر، چپراسی، باورچی بلکہ خود اُن کے صاحبوں کی روح ہر وقت لرزتی رہتی ہے۔ محلے کی رونق، گھر کی ڈکٹیٹر۔ ولائتی میم صاحبائیں ٹھوکریں تو لگاتی تھیں مگر ان سے پیسے بھی خوب ملتے تھے۔ اور جو پیسے کافی ملیں تو بڑے بڑے افسر بھی صاحب بہادروں کی ٹھوکر کھانے کو تیار رہتے ہیں۔ لیکن اب تو پیسوں پر مُہر تھی اور کچھ کچھ منت کی۔

شام کو کلو کی پارٹی نے دانا پور رجمنٹ، اور ٹاؤن کلب کا میچ دیکھا۔ مقابلہ برابر کا رہا اور دوسرا کھیل پرسوں پر ملتوی کر دیا گیا کیونکہ دوسرے دن محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کے درمیان چیریٹی میچ تھا۔ پارٹی نے کرنٹوں کو خوب گالیاں دیں اور ہندوستانی ٹیم کا دل خوب چیخ چیخ کر بڑھایا۔ آج کے میچ نے کل کے میچ کے لئے سب کو اور بے قرار کر دیا۔ رات گئے تک عیدو کی دُکان پر میچ کے متعلق رائے زنی ہوتی رہی اور کل کے بارے میں قیاس آرائیاں۔ شاید سوتے میں بھی سبھوں نے فٹ بال میچ ہی کے خواب دیکھے ہوں گے۔

. . . .

صبح ہوتے ہی کلو پھیری میں نکل گیا۔ بکری ہو نہ ہو وہ سیٹی بیکری کا بکس اٹھا کر ایک گشت ضرور کر آتا تھا۔ اس کام سے اُس کی شخصیت کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ اس سے علیحدہ ہونا سخت اذیت رساں ہوتا۔ اب عقل کی رہبری میں نہیں بلکہ ایک اندرونی مطالبے کے ماتحت وہ صبح کا گشت کیا کرتا تھا۔ آج خواہ مخواہ [illegible] انڈے اور چوزے کے تقاضے کا تقاضا بھی سویرے سے شروع کیا۔ ویسے وہ عموماً تقاضے میں مصلحتاً نرم تھا۔ مگر آج وہ ذرا مجبور تھا۔ کل اُس نے خیراتی درزی سے روپے قرض لے کر انڈے اور چوزے مول لئے تھے۔ وعدہ ایک ہی روز کا تھا۔ میچ کے بہانے خلیفہ آج ضرور تقاضا کرتا۔ کلو یا تو اپنے یار عیدو سے قرض لیا کرتا تھا یا خیراتی سے۔ کسی تیسرے کے سامنے اُس نے کبھی ہاتھ نہیں پسارے محلے میں آخر اُس کی ایک عزت تھی۔ روزمرہ کے خرچ کے سلسلے میں وہ عیدو کا پہلے ہی سے کافی مقروض تھا۔ میچ کے لئے اُس سے آٹھ آنے مانگنا قطعی ناممکن تھا۔ غرض خیراتی کا قرض ادا کرنے اور محمڈن کا میچ دیکھنے کے لئے آج کسی طرح اُسے خریداروں سے اپنے دام وصول لینے تھے۔ بیوی نے آتے وقت گھر کے خرچ کے لئے پیسوں کا مطالبہ الگ کیا تھا۔ خیر، وہ تو روز کا معاملہ ہے۔ اُسے ٹالا بھی جا سکتا تھا۔ مجبوری کا نام صبر وہ غریب تو اب عادتاً صبر و شکر کی عادی ہو گئی تھی۔

پہلے تو کلو نے بیکری کا سودا بیچنا چاہا مگر جس دکان میں ہفتے ہفتے چیزیں نہیں بِکتیں بھلا وہاں کا باسی تو اسی سودا کیا خاک کوٹھیوں اور بنگلوں پر بکے کبھی کبھار۔ چپراسی، مالی، بیرے بسکٹ، نان ختائی لے لیا کرتے تھے۔ اب جہاں جہاں چوزوں اور انڈوں کے دام باقی تھے کلو نے تقاضا بھی شروع کیا۔ مگر جواب میں اُسے باورچیوں اور ملازموں کی ڈانٹیں سُننی پڑیں۔

"کیا ہلڑ کرتے ہو جی۔ کل سودا بیچا اور آج سر پر سوار۔"

"کانک ٹک ہے۔ اب کبھی تم سے سودا نہیں لیا جائے گا۔" "جاؤ جاؤ کل پرسوں لے جاؤ گے۔" یہ سب تو انکار کی نرم قسمیں تھیں۔ اس سے بھی زیادہ گرم باتیں اور تلخ جھڑکیاں کلو کے خیر مقدم کے لئے ارزاں کی گئیں۔ دوپہر ڈھل گئی مگر اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ بھلا اتنا جلد بھی کہیں تقاضا کیا جاتا ہے۔ جن بنگلوں کے باشیوں کو مہینے مہینے آنے والے بلوں کی عادت ہو وہ کل سودا اور آج دام سے بگڑ نہ جائیں تو اور کیا۔ یہی کلو عموماً ہفتے ہفتے پر حساب صاف کرایا کرتا تھا۔ آج اُس نے لاکھ اپنی ضرورت دکھائی، احتیاج کا رونا رویا مگر کسی کی خاطر اصول کیوں بدلے جائیں۔

جس کوارٹر سے کلو دانستہ طور پر گریز کر رہا تھا آخر کار اُسے وہاں بھی جانا پڑا۔

"سیٹی بیکری! انڈا والا سرکار!" کلو نے صدا لگائی۔

"ہاں ہاں، ارے رحمت اسے روکو روکو! دنیا کتنی بے ایمان ہوتی جا رہی ہے۔

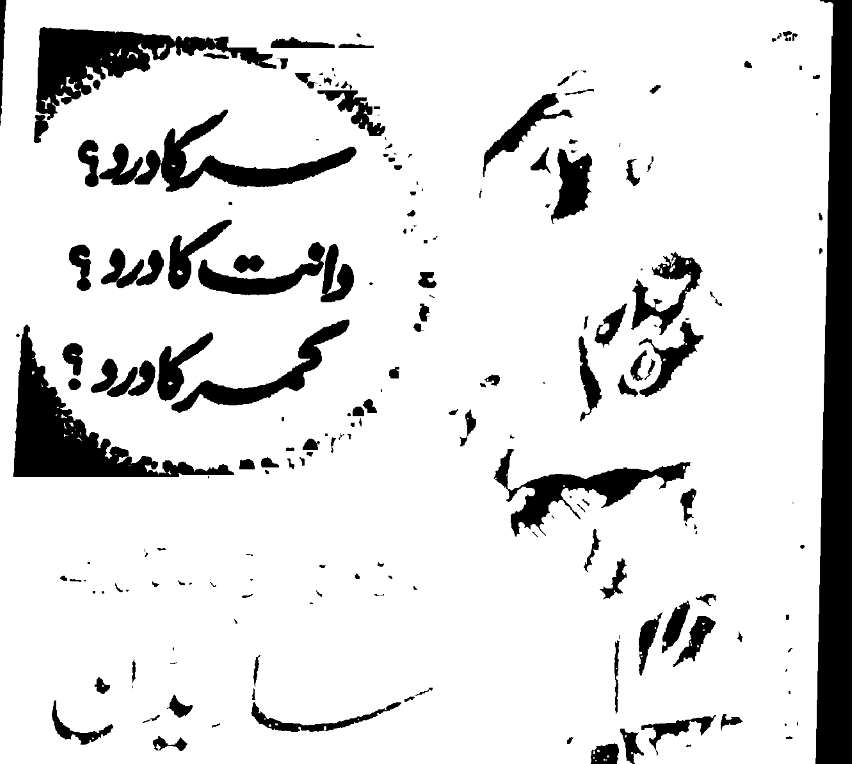
یہ بدمعاش سمجھتے ہیں کہ محنت کمال ہے۔ بے ایمانی شیطانی سے خوب لوٹو۔
رحمت! دیکھو پینٹری میں انڈے رکھے ہوئے ہیں۔ کل یہ ایک درجن انڈے دے گیا تھا۔ رات کو تین انڈے گندے نکلے۔ سب واپس کر دو! میم صاحب نے خفگی کے ساتھ نوکر کو ہدایات دیں۔
نوکر سات انڈے لئے باہر نکلا۔ اور تنبیہ کے طور پر اُس نے بھی کلّو کو بڑی بھلی سنائی۔
"مجبوراً تین انڈا ہم دے جئیں گے۔ ایک درجن پہلے کا دام مل جاتا سرکار!"
"پہلے آٹھ انڈے بھی گندے نکلے تھے۔ کل تو میں کہلانا بھول ہی گئی تھی۔ تم لوگ بے ایمان ہوا کرتے ہو!۔ نو آنے درجن انڈے! آگ کا مول اور اُس پر یہ اندھیر! جب لو تو آدھے انڈے گندے۔ لے جاؤ اپنے انڈے واپس!" میم صاحب اب خود دروازے پر آ گئی تھیں۔
"سرکار تین انڈا ہم دے جائیں گے۔ ایک درجن پہلے کا دام دے دیا جاتا اور اس کو بھی رکھ لیجئے۔ باورچی کا بدمعاشی ہوگا۔ حضور گندا انڈا رکھ دیا گیا ہے" کلّو نے عرض کی۔ رحمت اندر جا چکا تھا۔
"اُس ایک درجن کہاں کا؟ چار پہلے کے اور دو کل کے اچھے نکلے تھے۔ تمہارے آدھے درجن کی قیمت نکلی۔ لے جانا کسی روز۔ تم لوگ تو فقیر کی طرح لٹک جاتے ہو۔ ہم لوگ کہیں بھاگے جاتے ہیں!"
"سرکار آج بہت کام تھا۔ آٹھ آنہ بھی دے دیجئے۔ ایک آنہ پہلے کے حساب کا باقی رہے گا۔"
"دیکھو تو! ساڑھے چار آنے کو نو آنے بناتا ہے۔ مجھے پڑھاتا ہے! کیسے جھوٹے یہ کمینے ہوتے ہیں! بیچتے وقت تو سو طرح سے وعدے کرتے ہیں اور دام لیتے وقت کیسی ڈھٹائی پر اُتر آتے ہیں۔"
"حضور! گندا انڈا ہے دیکھئے ہم جھوٹ نہیں دیں گے۔"
"تو کیا میں جھوٹ بولتی ہوں! جاؤ نہیں ملیں گے پیسے!"
"سرکار ہم انڈا کے پیٹ میں گھس کر دیکھے جاویں۔ اگر ایسا سودا بیچا کریں تو دیوالہ ہو جائے۔ سب کوٹھی پر بیچے ہیں ایسا کہیں نہیں ہو رہا ہے!" کلّو نے تنگ آ کر کہا اور میم صاحب بس آپے سے باہر ہو گئیں۔
"رحمت! رحمت! نکالو اس کو یہاں سے۔ بدتمیز! جھوٹا! بدمعاش! پاجی! گستاخ! جھوٹ بولتے شرم بھی نہیں آتی۔ عہد کر کر کے کہتے ہیں۔ یہ کمینے۔ خدا کا بھی خوف نہیں!"

خدا کا نام درمیان میں آتے ہی کلّو کے رونگٹے ذرا دیر کے لئے کھڑے ہوئے۔ لیکن ضرورت کی مار سخت ہوتی ہے۔ خدا کو کسی طرح بہلایا جاتا ہے۔ کلّو نے معاہدہ تو ضرور کیا تھا کہ گندے انڈوں کے دام نہ لے گا۔ مگر اُس نے اپنے ضمیر کو یوں تسکین دی۔ غرض کے بندے پیٹ کے مارے جو نہ معاہدہ کر لیں۔ اور پھر کیا ضرور کہ میم صاحب سچ ہی بول رہی ہوں۔ ضمیر کے نشتر سے بچ کے اب ذرا وہ دلیر ہو کے بولا۔ "نہیں! ہم تو ایک درجن کا دام لیں گے۔" یہ آخری دروازہ تھا۔ میم صاحب کلّو کی ہٹ دھرمی سن کر بے حد برافروختہ اور چراغ پا ہو گئیں۔ کل کے گندے انڈے سرے پر ذرا ٹوٹے ہوئے باورچی خانے میں رکھے تھے۔ انہیں وہ اُٹھا لائیں اور کلّو کے سامنے رکھے ہوئے انڈوں پر زور سے پٹک دیا۔ کئی انڈے ٹوٹ کر بھرکس ہو گئے۔ زردیاں اور سفیدیاں لت پت ہو کر پھیل گئیں۔ کلّو کے دل میں ہلکا سا درد پیدا ہو کر غصّے کی لہروں میں ڈوب گیا۔
کلّو کا سینہ اپنے قہر کی آگ سے آپ پھنک رہا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ ان سارے بنگلے اور کوٹھیوں کے رہنے والوں کے سر پر دنیا بھر کے گندے انڈے لا کر پٹک دے۔
اگست کا آفتاب اُس کے منہ پر پڑ رہا تھا۔ سہ پہر ہو چلی تھی۔ سارے پہر کلّو کے دماغ میں عنکبوتی خیالات جالے بنتے رہے۔ غصّے سے اُس کی کن پٹیوں میں گرم گرم خون دوڑ رہا تھا۔ اُس نے ایسا محسوس کیا کہ دنیا میں ہر طرف اچھے انڈوں اور گندے انڈوں کے درمیان جنگ ہو رہی ہے۔ اُس نے ایک غیر واضح سی ہمدردی گندے انڈوں کے لئے محسوس کی۔ گندے انڈے جیت گئے۔ مگر آخر میں جھنجھلا کر اچھے انڈے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ بڑی زبردست ٹکر ہوئی۔ ساری دنیا چھلکوں، زردیوں اور سفیدیوں میں خلط ملط ہو کر غرق ہو گئی۔ ہر سو ایک زردی ... [illegible]
"میاں کلّو! بس آج اصغر! ... جاؤ! تمہارے لڑکے ... [illegible] خراب کر دیتے ہیں۔ یہ لونڈا شیطان کا بچہ ہے ... [illegible] ہم نہیں رکھتے اسے مدرسے میں۔ دیکھو ... [illegible] اور کیا بدتمیزی کرتا تھا۔"
مدرسے کے مولوی صاحب ... [illegible]
اصغر کا کان پکڑ لا اور اُسے پیٹتا ہوا گھر لے چلا۔ کلّو کے اعصاب ... [illegible] تک تناؤ نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ اُس نے اپنا بھوت اپنے بیٹے پر اُتارا۔ اصغر بے طرح پٹا۔ کلّو کے دل میں ... [illegible]

کی موج اُس کی شخصیت کی گہرائی سے اُٹھی۔ اصغروا اب افسر نہیں بنے گا۔ بے چارا اصغروا! اُسے ترس آنے لگا جیسے اُسے میم صاحب کے تو ڑے ہوئے انڈوں پر ترس آیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ شاید وہ اپنے پر بھی ترس کھا رہا ہے اپنی زندگی بھر کی نامرادی اُسے بہت بھاری معلوم ہوئی اس وزن سے بچنے کے لئے اُس نے پھر اصغروا کو پیٹنا شروع کیا۔ کلو کو زوروں سے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اُسے سرسری طور پر یاد آیا کہ گھر میں کچھ نہیں اور بیوی پھر پیسے مانگے گی۔ اُس کا غصہ اور بھڑک اٹھا اصغروا پر مار زیادہ تیزی سے پڑنے لگی اور بیوی کے مطالبے کو اُس کے قلب کی گہرائیوں میں خاموش بٹھا دینے کے لئے کلو نے اصغروا کو گالیاں بھی دینی شروع کیں۔ اب وہ گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ بیوی نے بڑھ کر بچے کو چھڑانے کی کوشش کی۔ کلو کے دل میں پھر ایک ہوک سی اُٹھی۔ اس کا غصہ دھیما پڑنے لگا۔ لیکن اب زیادہ دیر تک نہیں چل سکا۔ اب رسوائی اور نامردی اس کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ پارٹی! میچ! مدرسہ! اصغروا!

کلو نے محسوس کیا کہ اصغروا، وہ خود، اُس کی بیوی اور محلے کے لوگ، سب کے سب محض انڈے ہیں۔ گندے انڈے!

اختر اُرینوی



چاندنی کا جادو

چاند آیا ساگر میں نہا کر
ساتھ لئے تاروں کی پریاں
ناچتا پھرتا ہے اب گھر گھر
صحن کے اندر صحن کے باہر

سیم کے دھارے، چاند کی کرنیں
بہتی چلی آتی ہیں اُفق سے
رُکتی نہیں ہیں، تھمتی نہیں ہیں
ناچ رہی ہیں، جھوم رہی ہیں
موج ہوا پر فرشِ زمیں پر
نُور میں ڈھل کر، گر کے اُبھر کر

نیلے حسیں ساگر میں یکایک
کا اک طوفان اُٹھا ہے

قافلہ قافلہ کرنیں ۔ لہریں
لوٹ مچانے نکلی ہیں تن کر،
رات کی گہری خاموشی میں
شمعیں لے کر چلتی، پھسلتی،
اور آکاش کا سندر دیوتا
دیکھ رہا ہے ساری چالیں

دوشیزائیں ٹولیاں باندھے
آگے پیچھے ہاتھ پکڑ کر
پہن کے جھلمل کرتے جوڑے
کاکل کھولے سینہ تانے
ہاتھوں میں کرنوں کے بھالے
صاف، چمکتے، تیز، نکیلے
کولھوں کو مٹکا مٹکا کر

بڑھتی چلی آتی ہیں سراسر

میرے گھر میں رتھ سے اُتر کر
چندر دیوتا آیا چھپ کر
دُور تھی اُس کی راہ اندھیری
یعنی پہاڑی کی پگڈنڈی،
گھاس میں لیٹی ہوئی چپ چپ سادہ
اُس کے پاؤں کی آہٹ سُن کر
جاگ اُٹھی گھبرا کے اچانک
اُجلی چادر اُس نے بچھائی
اور میرے گھر تک پہنچایا
چندر دیوتا رتھ سے اُتر کر
چھپ کر میرے گھر میں آیا

نذیر مرغوب

اُفتاد

اپنے اک دوست سے ملنے کے لئے آیا ہوں،
ایک دو بار تو زنجیر ہلائی میں نے
لیکن آواز کوئی آئی نہیں،
گھر پہ موجود نہیں! ـــ سویا ہوا ہے، دن میں؟
اور اک بار ہلاؤں زنجیر!
پھیڑ دوں سونی گلی میں وہی گستاخ صدا
راہ تکتے ہوئے جس پر مجھ کو
رات میں بھونکتے کُتّے کا گماں ہوتا ہے؟
لیکن اک لمحہ ٹھہر جاتا ہوں
سوچتا ہوں کوئی بھولی بھٹکی
مہر کوچہ سے نکل آئے گی
خمِ دیوار پہ سائے کی مانند رواں
اور اک لمحہ گذر جائے گا اُس منظرِ رنگین کے جلوے کا تماشہ کرتے،
ایک پل ایسے بھی کٹ جائے گا۔
لیکن افسوس [illegible] سامنے دروازہ ہے
[illegible] کھلتا ہی مقدر میں لکھا ہے شاید
[illegible] میں کیا راز کی باتیں ہیں نہاں

ابھی کھولوں ـــ کوئی ان دیکھی، انوکھی صورت
سامنے بُت بنی استادہ نظر آجائے،
اور شاید کسی ہلتے ہوئے دروازے کا تختہ یہ الم ناک حقیقت سمجھائے
ابھی دہلیز کو کرتے ہوئے پار
زندگی سے تری افسوس! ہمیشہ کے لئے
کوئی رخصت ہوا، رخصت ہوا، معدوم، ـــ عدم!
بند ہوتا ہوا، کھلتا ہوا دروازہ ہے!
ہاں یہی منظرِ لبریزِ بلاغت اب تو
آئینہ خانے میں آنکھوں کے جھلکتا ہے مدام۔

بند ہوتا ہوا دروازہ نظر آتا ہے۔
بند ہوتے ہوئے دروازے کے پردے میں سے مجھے
پھیلتی وسعتِ چالاک نے بہکایا ہے۔
یہی وسعت مرے ماضی کے گھروندے میں بھی تھی
مگر اک مرکزِ بے نام و نشاں، سُن، خاموش!
ایک دلہن سی، لجاتی ہوئی، شرماتے ہوئے بل کھاتی
اور سمٹی چلی جاتی ہوئی مرکز کی طرف۔

گرم بستر پہ تڑپتا ہوا دل بول اُٹھا۔
بند ہوتے ہوئے دروازے کے جادو نے مجھے
پھیلتی وسعتِ نمناک میں اُلجھایا ہے۔

پھیلتی وسعتِ نمناک ہے اک دامِ خیال، —
بند ہوتا ہوا دروازہ کسی کالے کا پھن بنتا ہے،
بین سے تیر کے پھل کی طرح تھرّاتی ہوئی
زخم کو لاتی ہوئی، تیکھی صدا آتی ہے
جس میں پوشیدہ ہے، آسودہ ہے ستمِ قاتل،
لیکن احساسِ سماعت ہی نہ تھا مجھ کو، مرے کانوں میں
ایک ہی گونجتی، جھلاتی ہوئی، تلخ صدا آتی تھی:
بند ہوتا ہوا دروازہ ترے سامنے کیوں آیا ہے؟

بین کے نغمے سے چونکا اُٹھا،
پھن کو پھیلائے ہوئے جھومنے، لہرانے لگا،
آنکھ تو مست ہے، اب بھی اُسی منظر کی طرف مائل ہے،
اور بوسیدہ، فتادہ تختے

بازوؤں کی طرح کھلتے ہیں، — لپٹ جاتے ہیں
گرم بستر پہ پڑی لیٹی ہوئی بیسوا دہلیز کی گردن میں حمائل ہو کر،
جو بھی آتے ہیں بس اُس کے پاؤں
روندتے روندتے دہلیز کو بڑھ جاتے ہیں،
اور پھر تیرگی — نادان کا، جاہل کا دماغ —
جس میں بھرّائی ہوئی سرد صدا گونجتی ہے
جسم کے نور کو کھا جاتی ہے،
اور بوسیدہ، فتادہ تختے
چوستے ہونٹوں کی مانند مرے گرم لہو کو پل میں
اپنی رگ رگ میں سمو لیتے ہیں، چلاتے ہیں!
ایک وحشت کے فسوں میں کھو کر
میں بھی بن جاتا ہوں اک چیخ — المناک صدا!
تیر کے پھل کی طرح چھوٹ کے تھرّاتی ہوئی!

اب خلش، درد، تڑپ، رسوائی،
بند ہوتے ہوئے، کھلتے ہوئے دروازے میں!

میراجی

دنیائے ادب

دستنبوی غالب

۱۸۵۷ء میں مئی کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان میں غدر عظیم برپا ہوا۔ اس وقت مرزا کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی تھی۔ اس عمر میں وہ زمانے کا نشیب و فراز بہت کچھ دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ مرزا نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی ایک مختصر روداد لکھی۔ اس میں صرف اپنی سرگذشت اور مشاہدہ بیان سے کام رکھا اور نام اس کا دستنبو رکھا جس کا اظہار مرزا کے بہت سے خطوط میں ہے۔

بخوبی خیال رہے کہ یہ امر مبالغہ نہیں بلکہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ دستنبو کے متعلق جو عبارتیں مرزا کے خطوط میں پائی جاتی ہیں ان سبھوں کو اکٹھا کر دیا جائے تو یقیناً ایک مستقل کتاب علیحدہ ضخامت میں اصل دستنبو سے بڑی بن سکتی ہے۔ لہٰذا محض نہایت ضروری اقتباسات ذیل میں دیئے جائیں گے کیونکہ ڈر ہے کہ مضمون کی ضخامت اصل کتاب کے لحاظ سے کہیں زیادہ نہ ہو جائے۔

وجہ تصنیف مرزا مورخ نہ تھے۔ وہ غدر کے ایام میں اپنے گھر کے اندر ہی رہے انہوں نے غدر میں حصہ بھی نہیں لیا تھا۔ پھر انہوں نے دستنبو کیوں لکھا۔ اس کا جواب اُن کے ایک ہی خط سے مل جاتا ہے جس کو انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام اس وقت لکھا تھا جبکہ دستنبو کا مسودہ آگرہ میں چھپنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ چنانچہ اس خط میں لکھا ہے:۔

"صاحب، کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل توجہ فرماؤ۔"

([illegible] جلد اول)

صاف بات یہ ہے کہ مرزا کو انگریزوں کی طرف سے اس وقت سے پنشن ملتی تھی جبکہ اُن کی عمر تقریباً ۹ سال کی تھی۔ چونکہ مرزا کے چچا نواب نصراللہ بیگ خاں انگریزی سرکار کے نوکر تھے۔ اُن کی وفات پر انگریزوں نے نواب صاحب کے متعلقین کی پنشن مقرر کر دی تھی اور مرزا کو باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار پنشن کے ملتے تھے جو کہ اپریل ۱۸۵۷ء تک مرزا کو برابر ملے تھے اور بعد کو یہ پنشن پھر برابر جاری ہو گئی تھی۔

غدر کے وقت میں دلّی اور گرد و نواح کے بہت سے مسلمان نیز سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ بھی باغی ٹھہرائے گئے تھے۔ مرزا کا تعلق بادشاہ بہادر شاہ کے یہاں سے بہت زیادہ تھا۔ اس لئے انگریزوں نے مرزا کو بھی باغی یا باغیوں کا طرفدار شمار کیا۔ چنانچہ ان کی انگریزی پنشن بند ہو گئی تھی بادشاہ بہادر شاہ کے یہاں کا سارا نقشہ بدل گیا تھا پس بادشاہ سلامت کے یہاں سے جو کچھ ملتا تھا وہ بھی بند ہو گیا تھا۔ علاوہ بریں اُن کی آمدنی کے دیگر ذرائع بھی مسدود ہو گئے تھے۔

قصہ کوتاہ وہ سخت مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ چنانچہ اپنی بریت، حصول پنشن اور حصول خلعت دربار کی غرض سے مرزا نے دستنبو کو لکھا۔ میرے نزدیک مذکورہ بالا عبارت میں "جان اُلجھی ہوئی ہے"! اور "بہت سے حصول مطالب" وغیرہ کی یہی اصل تفسیر ہے۔

مزید براں یہ امر بھی مخفی نہ رہے کہ دستنبو میں جو کچھ مواد ہے وہ ایسا ہے اور ایسے پیرائے پر لکھا گیا ہے کہ جس سے مرزا کی بے گناہی ثابت ہو اور کسی قسم سے یہ بدگمانی نہ ہو کہ وہ انگریزوں کے بدخواہ یا کہ وہ باغیوں کے خیر خواہ رہے۔

وجہ تسمیہ کتاب دستنبو لفظاً ٹھیٹ فارسی زبان کا ہے۔ اس کے معنی ہیں: "سونگھنے کا گلدستہ یا ترمیوہ جو سونگھا جائے۔"

چونکہ مرزا کا مقصد تھا کہ میں باغیوں کا چاپلوس نہ سمجھا جاؤں بلکہ انگریز کی نگاہ میں اچھا سمجھا جاؤں چنانچہ اسی لئے انہوں نے اپنی روداد کا نام دستنبو رکھا تھا ورنہ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مرزا اپنی ایسی کتاب کا نام دستنبو رکھتے جس میں کہ غدر کے حالات اور ذاتی مصائب کا بیان ہو۔

دستنبو کے باب میں کسی کا ایک لطف آمیز شعر یہ ہے:-

یار دستنبو بہ دستم داد و دستم بو گرفت ٭ آنچہ دستنبو کرد دستم بوز دستنبو گرفت

مرزا نے دستنبو کے آخر میں یہ لکھا ہے:-

این نامہ را پس از انجام بدان دستنبو سے نام نہادہ آمد و دست بدست و سوئے بسوئے فرستادہ آمد تا دانشوران را روان پروردو دل گستران را دل از دست بردامید کہ این دانش دستنبوئے بدست بزدانیاں گلدستہ رنگ و بوئے و در دیدہ اہرمن منشان آتشین گوئے باد زراج۔

زنیسان کہ ہمیشہ در روانی ہائیم سرچشمہ راز آسمانی مائیم
لختے زِ دسا تیر بود نامۂ ما سامان ششم بہ کاروانی ہائیم

گھبراہٹ اور عجلت مرزا کے خطوط سے ہی ظاہر ہے کہ ۱۱ر جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد غدر سے تعلق رکھنے والے بہت سے واقعات مرزا کے مشاہدے میں آئے لیکن ان کو مرزا نے قلمبند نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ مرزا گھبرا گئے تھے جیسا کہ میر مہدی حسین مجروح کو ایک خط[1] مورخہ ۸ر اگست ۱۸۵۸ء میں لکھا ہے:-

"صاحب ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی کو تمام کیا، دفتر بند کر دیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے ۱۵ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

مرزا نے دستنبو میں ۱۵ مہینے کا جو حال لکھا ہے وہ بہت زیادہ نہیں ہے وہ اگر زیادہ لکھنے کے منتظر رہتے احالات زیادہ لکھتے تو ممکن تھا کہ مرزا سے لغزشیں ہو جاتیں اور جن مطالب کے حصول کی غرض سے کتاب لکھی وہ مطالب فوت ہو جاتے اور موقع ہاتھ سے جاتا رہتا۔ کیونکہ ۱۱ر جنوری ۱۸۵۸ء کو دلی سے مدرشل لا اُٹھ گیا تھا اور اس کے بعد ہی دوسرے انتظامات شروع ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ پنشن داروں کے پنشن کی بابت انگریزی دفتر میں جانچ پڑتال ہو رہی تھی اور مرزا کے پنشن کی بابت بھی کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی تھی۔ جیسا کہ مرزا کے اُس خط[2] کے اقتباس سے ظاہر ہے جس کو کہ انہوں نے ۸ر اگست ۱۸۵۸ء کو میر مہدی حسین مجروح کے نام لکھا تھا:-

"پنشن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی اُس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتہ کا دن ساتویں اگست کی۔ مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر نے بلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کئے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے۔ تردد اگر ہے تو اس میں ہے کہ ۱۵ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں۔ یا صرف آئندہ کو مقرر ہوتی ہے۔"

خطوط غالب میں مرزا کا ایک خط نمبری ۴۴ بنام منشی ہرگوپال تفتہ ہے وہ غالباً ۷ اور ۲۳ر اگست ۱۸۵۸ء کے درمیان کا ہے اس میں مرزا نے دستنبو کے معاملے میں اہتمام اور عجلت کا حال یہ لکھا ہے:-

"چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا۔ اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو طرز تحریر کیا ہو گی اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہو گا۔"

دستنبو کے معاملے میں عجلت کی ایک وجہ بقول مرزا یہ بھی ہے کہ ایک صاحب نے اس کے چھپوانے کا قصد کیا لہذا یہ کام ان کے ساتھ ہی ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ میر مہدی حسین مجروح کو مرزا نے اپنے ایک خط محررہ ملہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں اس امر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:-

"میاں کیا باتیں کرتے ہو میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا۔ منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے تھے سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست ان کو میرے گھر لے آیا۔ انہوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اُس کو میں نے لکھا اُس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ ۸ر فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں پچیس روپے چھاپے خانے میں بطریق ہنڈوی بھجوا دیئے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا اجازت

[1] خط نمبر ۲۹۶ (خطوط غالب)

[2] خط نمبر ۱۰۴ (خطوط غالب)

ہے۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔ بھائی میں نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے اکیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمہ میں اس کی اطلاع دی ہے۔ امین الدین خاں کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا، ان کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے کہاں تک تحریر موقوف نہ کرتا۔ منشی امید سنگھ اندور جانے والے تھے اگر ختم کر کے مسودہ ان کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون!"

فارسی قدیم میں کیوں

مرزا نے ۱۷ر اگست ۱۸۵۸ء کے خط نمبر ۴۳ میں مرزا تفتہ کو لکھا ہے "اب ایک امر سنو۔ میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی فارسی قدیم میں لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی انگریزی ہندی جو ہیں وہ لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً تمہارا نام منشی ہرگوپال۔ منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا۔ اس کی جگہ شیوا زبان لکھ دیا ہے۔"

خیال رہے کہ نظم سے مراد یہاں وہ اشعار ہیں جو کہ دستنبو کے متن میں متفرق طور سے آئے ہیں۔ اس سے وہ قصیدہ مراد نہیں ہو سکتا جو کہ دستنبو میں شامل ہے اور فارسی کے علاوہ عربی الفاظ پر بھی مشتمل ہے کیونکہ اس کی نسبت خود ہی مرزا نے خط نمبر ۳ بنام مرزا یوسف علی خاں عزیز میں یہ لکھا ہے۔

"اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔"

مرزا نے اصل دستنبو کو فارسی قدیم میں لکھا ہے ممکن ہے کہ

اس بات کا لگاؤ اس امر کے ساتھ ہو جو دوہ تصنیف کے متعلق کہا گیا ہے یعنی یہ کہ مرزا یہ جتلانا چاہتے تھے کہ میں بالکل علمی و ادبی آدمی ہوں، باغیانہ حرکت سے میرا کچھ لگاؤ نہیں۔

خیر جو ہو سو ہو۔ مرزا نے دستنبو میں جو فارسی لکھی ہے۔ اس کی بابت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو بھی لکھا ہے۔

"اگر دستنبو کو سراسر غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے اور یہ بھی جانو گے کہ وہ تحریر تمہاری اس تحریر سے سو برس پہلے کی ہے"۔

آگرہ میں کیوں چھاپا ہُوا

غدر کے بعد دہلی کے بہت سے کاروبار تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ دہلی کے آباد ہونے کی نوبت بھی بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔ پس مرزا نے اس کے چھپنے کا اہتمام آگرہ میں کیا تھا کیونکہ اس وقت دہلی میں مطبعوں کی جو کیفیت تھی اس کا اظہار مرزا ایک خط مرقومہ ۷ر اگست ۱۸۵۸ء میں یوں کرتے ہیں۔

"یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں کہ ایک ہے اس میں کاپی نگار خوشنویس نہیں ہے"۔

فارسی قصیدۂ تہنیت

مرزا نے ایک فارسی قصیدہ ستمبر ۱۸۵۸ء میں جناب ملکہ معظمہ کی تعریف میں لکھا۔ اس میں فتح ہند کی مبارکباد لکھی اور اس کو دستنبو کے شروع میں شامل کرنے کا خیال بعد کو ہوا۔ چنانچہ اس کے متعلق پہلے مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھا۔

"ہاں صاحب ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے۔ میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے۔ تہنیت فتح اور عملداری شاہی سے مناسبت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک الگ کاغذ پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر خیال میں آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے۔ یہ یعنی چھاپا ہوئی اگر یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل جلد ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔ آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ منشی شیو نرائن صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں اور پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں۔ جب کتاب چھپ چکے تو

[1] بمطابق خطوط غالب۔ مرزا کے ایام میں عام دستور تھا کہ کتاب کے شروع میں لوگ حمد و نعت لکھا کرتے تھے۔ مرزا کی کتابوں میں حمد و نعت نہیں مگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ... نہیں کیونکہ اس میں عربی کا شمول ہو جاتا اور کتاب اس ... ہے۔ بنام خدا وند بیروزگر ٭ مہ و مہر ساز و شب و روز گر

[2] خط نمبر ۴۵ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۸۵۹ء (خطوط غالب)، [3] خطوط بنام مہدی حسین مجروح مورخہ ۲ر فروری ۱۸۵۹ء اور ۱۰ر اکتوبر ۱۸۵۸ء و خط بنام سید یوسف مرزا مورخہ ۱۸ر اگست ۱۸۵۹ء (خطوط غالب)، [4] بنام منشی ہرگوپال تفتہ (خطوط غالب)

[5] خط مورخہ ۱۲ر ستمبر ۱۸۵۸ء (خطوط غالب)

چھپ جائے۔ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب کے اور لگایا جائے پہلے کتاب سے۔ دوسرے یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو اور پہلے صفحے پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں اس طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ قصیدہ در مدح جناب ملکۂ انگلستان خلد اللہ ملکہا۔ میرا نام کچھ ضرور نہیں کتاب کے پہلے صفحے پر تو ہوگا۔"

قصیدے کے باب میں اس کے سوا ظریفانہ انداز میں منشی نبی بخش حقیر کو یہ لکھا تھا۔

"بھائی جان! میں نے ایک قصیدہ جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے۔ ساٹھ شعر ہیں، چھ صفحے یعنی تین ورق پر چھپ کر دستنبو سے پہلے شیرازہ میں شامل کر دیے جائیں تو کتاب کو قصیدہ سے عزت اور قصیدہ کو کتاب کے سبب سے شہرت ہو جائے گی۔ کل جناب مرزا صاحب کو یہ خط لکھ چکا ہوں یقین ہے کہ وہ آپ سے کہیں گے اور آپ مرزا صاحب اور مرزا تفتہ اور منشی شیو نرائن صاحب اس خواہش کو منظور اور اس قاعدے کو مقبول کریں گے۔ اور جب باتفاق تم چاروں صاحب ... کر دو گے تو گویا باجلاس کونسل اس قانون کا اجرا منظور ہو جائے گا اور امید وار ہوں کہ اجرائے قانون سے پہلے مجھ کو منظوری کی اطلاع ہو جائے تاکہ مسودہ اس قصیدے کا بھیج دوں مہتمم مطبع کو اگر کچھ تامل ہو تو پھر نہ بات آسان ہے۔"

مرزا کی جیسی خواہش تھی اسی طرح قصیدہ چھپا اور دستنبو کے شروع میں شامل ہوا ہے۔ لیکن یہ امر مخفی نہ رہے کہ دستنبو کے بعد کے ایڈیشنوں میں قصیدے کو اخیر میں شامل کیا گیا ہے۔

پہلے ایڈیشن میں قصیدے سے تعلق رکھنے والا پہلا صفحہ صرف قصیدے کے عنوان والی عبارت کے لئے وقف ہے۔ اور وہ اس صورت میں مندرج ہے۔

قصیدۂ برگزیدہ | در مدح خداوند روئے زمین سایۂ جہاں آفریں حضرت قدر قدرت ملکہ معظمہ انگلستان خلد اللہ ملکہا۔

بالعدل والاحسان۔
مشتمل بر تہنیت فتح۔
ہندوستان[2]

مرزا جب کہ دستنبو کا مسودہ آگرے بھیج چکے تھے تو تہنیت کے علاوہ بعض اور عبارتوں کو دستنبو میں داخل کرنے کے لئے منشی ہرگوپال تفتہ اور منشی شیو نرائن کو لکھا تھا۔ القصہ دستنبو کے معاملے میں مرزا نے بے حد دلچسپی لی تھی۔ پس ادبی حیثیت سے اس کتاب کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

مزین جلدیں | مرزا نے دستنبو کی سات جلدوں کو خاص طور سے مزین کرایا اور ان کی تیاری میں بارہ روپے صرف کئے ان میں سے تین کی لوحیں زریں اور چار کی لوحیں سیاہ قسم کی ہوئیں مگر مرزا کی خواہش یہ تھی کہ دو کی لوحیں زریں پانچ کی سیاہ قلم کی ہوں۔

ان جلدوں کو مرزا نے انگلستان اور ہندوستان کے حکام بالا کی خدمت میں بھیجا جس سے ان کو بہت فائدہ ہوا۔

خاتمہ میں اشتہار | مرزا کی خواہش تھی کہ دستنبو کے آخر میں یہ عبارت چھاپی جائے: "نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے۔ اس کو میں نے مطبع مفید خلائق میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبان مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔

علاوہ بریں مرزا نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا۔

اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیو نرائن کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔"

القصہ اسی تحریر کا ثمرہ ہے کہ دستنبو کے اخیر میں یہ عبارت درج کی گئی تھی۔

"اس کتاب کو بغیر اجازت مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں۔ فقط"

---

[1] خط مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۹ء [2] ہندوستان بلا واؤ درج ہے۔ [3] خطوط مورخہ ۲۸ اگست و ۲۳ ستمبر ۱۸۵۹ء [4] خط مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۹ء [5] خط محررہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۹ء بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر [6] خطوط بنام ... بے خبر مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۵۹ء لغایۃ ۱۳ جنوری ۱۸۶۰ء [7] بنام منشی ہرگوپال تفتہ نمبر ۴۹ محررہ ستمبر ۱۸۵۹ء

(ادیب دسمبر ۱۹۴۰ء)

مہیش پرشاد



سوز ناتمام

(دوسرا ایڈیشن)

عاشق بٹالوی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ

اس کا پہلا ایڈیشن دس ماہ کی قلیل مدت میں ختم ہو گیا۔ اہلِ ذوق کے اصرار پر اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے جو پہلے ایڈیشن کے تمام افسانوں کے علاوہ، پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے کے ایک مبسوط مقدمے پر مشتمل ہے۔

ایک رائے

"عاشق صاحب نے حیاتِ بشری کے نشیب و فراز اور معاشرتی کشمکش کے فلسفوں کو جس خوبی سے ادا کیا ہے اس کی داد نہ دینا جرم ہے۔"

مینجر کتب خانہ ادبی دنیا دی مال لاہور

سحرِ فرانس

جو فرانس کے افسانہ نگار گائی ڈموپساں کے بائیس دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے

جس کا ترجمہ طاہر قریشی بی اے بی ٹی نے کیا ہے۔ تعارف جناب عاشق بٹالوی بی اے ایل ایل بی نے سپردِ قلم کیا ہے۔ اور موپساں کی افسانہ نگاری پر ایک مبسوط محققانہ مقالہ حضرت شاہد احمد بی اے آنرز ایڈیٹر ماہنامہ "ساقی" دہلی کے قلم کا رہینِ منت ہے

اعلیٰ درجے کی کتابت و طباعت دلکش۔ سرورق خوشنما جلد ضخامت سوا تین سو صفحات۔ ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ کتاب میں مصنف و مترجم کی تصویریں شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

علاوہ ازیں افسانے: فردوسِ خیال ہے۔ پریم بتیسی حصہ اول و دوم ہے۔ نظارے در منٹو کے افسانے ہیں۔ دانہ و دام ہے۔ ... شعلے عصمت چغتائی کے افسانے ... صنوبر کے سائے ہے۔ میری ناتمام محبت ہے۔ طلسمِ خیال ہے۔ اندھی دنیا ہے۔ چوپال ... محبت اور نفرت ہے۔ ہیبت ناک افسانے ہیں۔

سب کتابیں ملنے کا پتہ

مینجر کتبخانہ ادبی دنیا لاہور